ماہنامہ

جاسوسی ڈائجسٹ کراچی

اگست
2006

دلکش کراچی

اپنے عنوان کی طرح بے شمار دلکش و دل ربا رنگوں سے سجا تازہ شمارہ خریدنا نہ بھولیں

جاسوسی ڈائجسٹ

11 — چیخی فکشن چیخی — مدیر اعلیٰ
قارئین کی کرم فرمائیاں، کج ادائیاں
نادر و نایاب اشیاء کے سلسلے، عزائیتیں اور شکایتیں

18 — خون اور پانی — مریم کے خان
جنگ عظیم کے پس منظر میں لکھی گئی تحریر..... ہر شخص بقا ہستی کی جنگ جیت لینا چاہتا تھا

63 — تعاقب — مرزا ظفر بیگ
لمحہ لمحہ سنسنی خیز موڑ اختیار کرتی ایک پُر تجسس و تیز رفتار تحریر

71 — قاتل گیت — سیرین راض
موسیقی کا شوق رکھنے والے شائقین کے لیے ایک قاتل دھن کا انتخاب

81 — جوابی احسان — شگفتہ پروین
ایک انو کے قتل کی روداد جس کی منصوبہ بندی میں کوئی سقم نہیں تھا

84 — مستقبل شناس — ایچ اقبال
اسرار و حقیقت کے تانے بانے میں الجھی ہوئی داستان، ستارہ شناس راؤ پرویز کی مہم جوئی

131 — نیا گوشوارہ — شکیل صدیقی
جعل سازی کے فن سے آشنا افراد کی کرشمہ سازیاں

139 — انجام الانجام — لبنیٰ زبیر
مہم جوئی کا شوق رکھنے والے افراد کے لیے ایک دلچسپ پُر خطر سفر کی روداد

جلد 36 • شمارہ 08 • اگست 2006 • زرِ سالانہ 450 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 35 روپے • سعودی عرب 12 ریال یا مساوی
E-mail: Jdp group @ hotmail.com (021) 5802551 فیکس (021) 5386783 • فون: 74200 کراچی 229 پوسٹ بکس نمبر خط و کتابت کا پتا:

مدیر اعلیٰ: معراج رسول
مدیر: لبنیٰ خیال
مصور: شاہد حسین

152 — دیوی — طاہر جاوید مغل
ظلم و ستم اور جبر کی بھٹی میں کندن ہو جانے والی ایک معصوم دوشیزہ کا ماجرائے روح شکن

195 — قاتل خواب — احمد صغیر صدیقی
ایک وکیل اور ڈاکٹر کے مابین ہونے والے خونیں انجام کی آنکھ مچولی

204 — بیوہ — محمود احمد مودی
ایک شوہر کے قتل سے شروع ہونے والی کہانی جس کی بھی قاتل گردانی جا رہی تھی

220 — مور کا پنکھ — کاشف زبیر
شگفتہ فقروں سے آپ کے لبوں پر ہنسی بکھیر دینے والا سرورق کا پہلا خوبصورت رنگ

254 — زنجیر — منظر امام
طاقت کے نشے میں چور پرستوں کی کارروائیاں جو ہر جگہ اپنا اختیار چاہتے تھے

276 — طلسم تماشا — نشور ہادی
حصول محبت اور ہوس محبت میں گرفتار کرداروں کی کشمکش کا عبرت آموز ماجرا

317 — اسماء الحسنیٰ — ایس ایم قادری
دین اسلام کی روشنی میں مسائل کا حل، سائلین کے سوال ایس ایم قادری کے جواب

.... — پکنک نیوز — ادارہ و قارئین
دنیا بھر سے اخبار و رسائل سے لطیف چٹکلے، اقتباسات، گدگدیاں، مسکراہٹیں اور قہقہے سب آپ کے لئے

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول • مقام اشاعت: C-63 فیز II ایکس ٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا، مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی۔ تار کا پتا "جاسوسی" کراچی

حکمتِ جیدی

مدیرانہ

عزیزانِ من..... السلام علیکم!

2006ء کا آٹھواں شمارہ حاضرِ خدمت ہے۔ اگست کا مہینہ ہماری آزادی کا مہینہ ہے۔ آپ سب کو جشنِ آزادی مبارک ہو۔

آزادی بہت بڑی نعمت ہے اور اس کا درست اندازہ وہی اقوام لگا سکتی ہیں جو کسی نہ کسی طور بیرونی قوتوں کے زیرِ نشیں ہیں۔ دوستو! اظہارِ خیال کے لیے موضوعات تو بہت ہیں لیکن اس وقت سب سے اہم مسئلہ اسرائیل کی لبنان پر لشکر کشی ہے۔ رہائشی علاقوں پر کی جانے والی بمباری کے نتیجے میں ہونے والی تباہی دیکھ کر دل خون کے آنسو رو رہا ہے، ایک افسردگی ہے جو چہار سو چھائی ہوئی ہے۔ ان دگرگوں حالات کو دیکھتے ہوئے ہم یہی دعا کر سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں میں ایک بار پھر وہی روح پھونک دے کہ وہ کسی بھی محاذ پر ناکامی سے دور رہیں۔ ان کی کوششیں پیہم جدوجہد کامیابی کی منزلیں طے کرے۔ اقوامِ عالم میں عالمِ اسلام کو عزت و توقیر کی نگاہوں سے دیکھا جائے۔ فی الحال ان کشیدہ و تکلیف دہ حالات کو دیکھتے ہوئے ہمیں یہ اشعار یاد آ رہے ہیں۔

یہ دل ہے اور یہ زخم یہ آنکھیں ہیں اور یہ تم
یہ شہر دیکھ لو تو یہ بازار دیکھنا
جاناں! مسافتِ شبِ ہجراں طویل ہے
زندہ بچو تو صبح کے آثار دیکھنا

☆☆☆

اس ماہ فریدہ احمد خان سکھر سے انعام یافتہ تبصرے کے حقدار قرار پائے ہیں۔ لکھتے ہیں۔ "جوالائی کے سرورق کے بارے میں صرف اتنا کہوں گا کہ یہ جون کے سرورق سے زیادہ مختلف نہیں۔ پچھلی بار ایک آدمی خنجر لیے کھڑا تھا تو اس بار پستول لیے کھڑا ہے۔ پچھلی بار حینۂ عالم اس کی پشت سے نمودار ہوئی تھی تو اس بار حینۂ عالم ترچھی نظر، نیم وا ہونٹ نم آنکھوں کے ساتھ بولے کے پیٹ سے نمودار ہو رہی ہے۔ جھونپڑی کی جگہ ایک پرانی عمارت دکھائی دے رہی ہے۔ پچھلی بار زور زور سے ہنسنے والے آدمی کا منہ خوف سے کھل گیا ہے۔ سرورق کو بس ٹھیک ہی جان کر آگے بڑھے۔ فہرست کو سرسری دیکھا۔ سید سرمد مشتاق صاحب کرسیِ صدارت پر ستارے کی طرح جگمگا رہے تھے۔ سارے تبصرے پڑھے ثمینہ حیات جی، آپ کے تبصرے پر بہت ہنسا ہوں۔ تبصرے میں کچھ رعایت برتیں، ایسا نہ ہو کہ..... خیر۔ دل نے کہا دیوی پر دستک دوں پر پھر کہانیوں کو ترتیب وار پڑھنے کی ٹھانی۔ مودی انکل کی دفینہ کو ایک ہی نشست میں پڑھا۔ کہانی تو بلاشبہ لاجواب تھی پر اس کا اینڈ کچھ ادھورا ادھورا سا محسوس ہوا۔ ایسا لگا کہ کچھ رہ گیا ہے، کیا رہ گیا ہے یہ اندازہ لگا نہ سکے۔ مدیحہ شاہ کی مریض کا مرکز بھی دولت ہی تھی۔ ڈاکٹر قاسم شاہ دولت کے حصول کے لیے اپنی ہی فیملی کا دشمن بن گیا اور بڑی چالاکی سے پہلے اقبال وارثی پھر محمود ہاشمی اور اصغر کو موت کی نیند سلا دیا۔ اللہ بخشے ڈاکٹر سہیل کو جس نے بروقت آنکھیں کھولیں اور باقی فیملی اس کی مضرت سے بچ گئی۔ دورِ حاضر کی ترجمانی کرتی بہترین تحریر تھی۔ جمالی صاحب اس مرتبہ مال مفت لائے۔ زاہد گردیزی کا کی عدالت بھی پُر اثر تحریر تھی۔ جب شہزاد نے جانا کہ بس وہ چند دن کا مہمان ہے تو اس نے بگڑے معاشرے کو اپنے طور پر ٹھیک کرنے کی ٹھانی اور قتل و غارت کرتا چلا گیا۔ ایچ اقبال صاحب کی مستقل شناس کی یہ قسط قدرے تیز رہی۔ احمر کی انٹری غیر متوقع طور پر ہوئی۔ بڑی رازداری برتتے ہوئے پرویز سے مل گئی اور پرویز سے اظہارِ محبت بھی ہو گیا۔ رازداری سے دونوں چھپ چھپ کر ملتے بھی ہیں پھر ایک شک ابھر کر سامنے آتا ہے کہ احمر کے حوالے سے راجو اور عندلیب، پرویز سے کوئی بات چھپا رہے ہیں۔ ادھر سامعہ سے پری پلان ملاقات کے دوران بازرگان کی انٹری نے تجسس میں اضافہ کر دیا ہے۔ ہر سلسلے وار کہانی کی قسط ایسے مرحلے پر ختم ہوتی ہے کہ پورے ایک مہینہ انتظار کی سولی پر لٹکائے رکھتی ہے۔ کاشف زبیر کی نیش زن بھی خوب رہی۔ سچ کہتے ہیں جب کوئی مصیبت میں ہوتا ہے تو خدا بہت یاد آتا ہے۔ ڈاکٹر وجد کو بھی خدا اس وقت یاد آیا جب وہ مصیبت میں پھنسا۔ صرف خدا ہی نہیں اسے ہر وہ شخص یاد آیا جس کے ساتھ اس نے ناروا سلوک روا رکھا لوگ مرنے کے بعد قبرستان لے جائے جاتے ہیں وہ خود قبرستان گیا اور خود ہی قبر میں گرا۔ اپنی فورٹ کہانی دیوی پر آئے اگر میں دیوی پر تبصرہ لکھنے بیٹھوں تو کاغذ کم پڑ جائیں گے۔ بس اتنا کہوں گا کہ دیوی کا حرف حرف سطر سطر صفحہ صفحہ تعریف ہے۔ ہم بس دعا کرتے رہتے ہیں کہ شانی مصیبتوں کے بھنور سے نکلے۔ اب تو بیچاری ایسی پھنسی ہے جہاں اس کا بچا کھچا خون بھی دو ٹکے چوس چوس کر ڈکاریں لے رہے ہیں۔ امید کی جاتی ہے کہ باہر کا ضمیر بیدار ہو گا اور وہ شانی کو رستم کے ساتھ اس مصیبت سے نکالنے کی کوئی راہ نکالے گا۔ میرے خیال میں جس قسط میں شانی ان مصیبتوں سے چھٹکارا پائے گی وہ قسط دیوی کی آخری قسط ہو گی پر اگر شانی کو بڑھاپے تک لے جایا گیا تو کہانی کا ٹیوسٹ کچھ اور بھی ہو سکتا ہے۔ عمیر شاہ کی استاد کوئی خاص تاثر نہ چھوڑ سکی۔ مرزا ظفر بیگ کی الزام بہترین کہانی تھی، گاڈ فرے کے قاتل تک پہنچنے تک کہانی نے اپنے حصار میں جکڑے رکھا۔ ثمر جمالی کی عزم نو بے بس عاشق کی کہانی تھی جسے محبوبہ اس لیے چھوڑ گئی کیونکہ دولت اس کا ساتھ چھوڑ گئی تھی، بوکھلاہٹ میں عاشق نے ڈاکے کی واردات کر ڈالی اور انجام بہت برا ہوا۔ سرورق کے پہلے رنگ میں نسرین حسام کے بچوں نے بہت متاثر کیا۔ میاں بیوی کا اگر ایک دوسرے پر اعتماد بحال ہو تو وہ گھر جنت کہلاتا ہے مگر جہاں اعتماد کا فقدان ہو اس کا گھر جہنم بن جاتا ہے۔ بغیر تحقیق و تصدیق کے جذبات میں آ کر کوئی بھی فیصلہ کرنا عقل کے

خلاف ہوتا ہے۔ سرمد نے بھی یہی کیا لیکن آفرین ہے وفا کی صورت شبانہ پر کہ اس نے نہ بے وفائی کی اور نہ عقل کا دامن چھوڑا۔ اس نے صبر پر قناعت کی۔ صبر کی ہی بدولت ثمر بھی ہنا ملا۔ قابل تعریف تحریر تھی۔ دوسرے رنگ میں غلام قادر صاحب کا نام فریب راہ کے ساتھ جگمگا رہا تھا۔ غلام قادر کا نام دیکھ کر ہی دلچسپی سے کہانی کا آغاز کیا۔ مزاح کے رنگ میں رنگی محبت کے لطیف جذبوں کو اجاگر کرتی اس اچھوتی تحریر نے مزاح میں خوشگوار اثرات مرتب کیے۔ غلام قادر صاحب سے التماس ہے کہ آئندہ بھی ایسی ہی ہلکی پھلکی مزاحیہ جملوں پر مبنی کہانی دے دیا کریں۔ سب کرداروں سے پوری طرح انصاف کیا گیا۔ کہانی کا انجام بھی اطمینان بخش تھا۔ سب سے آخر میں سرورق کے تیسرے رنگ رضوانہ منظر کی رہائی سے لطف اندوز ہوئے۔ سیاست، سیاست داں، پولیس اور پریس کے گرد گھومنے کے، تو حرص، ہوس اور محبت کو بیچ کرتی ہوئی لازوال تحریر دل کو بھا گئی۔"

سرمد مشتاق کی شکایت کوٹلی آزاد کشمیر سے۔ "پانچ جولائی کو جاسوسی ہمارے ہاتھ میں تھا۔ ٹائٹل پچھلی بار کی طرح عجیب یعنی منفرد سا تھا۔ ٹائٹل کرل غالباً نہیں بلکہ یقیناً ایک آنکھ سے معذور ہے اس لیے اس کی سائیڈ سے تصویر چھاپی گئی تھی۔ اس کے پیچھے یا تو افغانستان کے کھنڈرات تھے یا پھر ثمینہ حیات ملاحظہ فرما کر دیوی پڑھی۔ طاہر جاوید صاحب سے ہمیں ایک گلہ ہے کہ انہوں نے رستم کو جمالی کے ہیرو صاحب ہیں کہانی کی اس قسط میں انہیں ایسی حالت میں دکھایا ہے کہ اسے پڑھ کر کراہیت محسوس ہونے لگی۔ طاہر صاحب کو چاہیے تھا کہ وہ رستم کو ایسی حالت میں بالکل نہ دکھاتے" بہرحال وہ ایک لکھاری ہیں اور ہم صرف ایک قاری۔ دفینہ جاسوسی کے پہلے صفحات پر محمود احمد مودی کے قلم سے دل موہ لینے والی تحریر تھی جس میں لالچ، پیار، مزاح اور جاسوسی سب کو شامل کیا گیا تھا لیکن اس کا انجام وہی کہ کسی کے ہاتھ کچھ نہ آیا۔ مریض ہم نے صرف وقت گزاری کے لیے پڑھی کہانی میں بہت الجھاؤ تھے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ کہانی کو ایک ہی نشست میں لکھا گیا تھا۔ مال مفت محمد ابراہیم جمالی کے قلم سے ایک دل گداز تحریر تھی۔ تھی اور ایڈ چور نکلے اور صرف چوری نہیں بلکہ بے وقوف چور۔ زاہد گردیز کا لکھاریوں کی دنیا میں نیا نام ہے جنہوں نے کسی شک وشبے کے بغیر جاسوسی کو عدالت کی صورت میں خوبصورت تخلیق دیا۔ شمار کو اگر پتا ہوتا کہ وہ بالکل تندرست ہے تو وہ معاشرے کو سیدھا کرنے کے لیے الٹا طریقہ اختیار نہ کرتا۔ پرانا پیشہ شکیل صدیقی صاحب کے قلم سے ایک زبردست تحریر تھی جو مخلص ڈاکٹر رحمدل جیسے ہزاروں لوگ ہمارے معاشرے میں بس رہے ہیں جو اندر سے کچھ اور باہر سے کچھ ہوتے ہیں اور جو حسد کی آگ میں ایسے جل رہے ہوتے ہیں کہ وہ اپنی حسد کی آگ کو ٹھنڈا کرنے کے لیے کسی بھی حد کو پار کر سکتے ہیں۔"

سرمد علی تلہ گنگ سے لکھتے ہیں۔ "جاسوسی حسب معمول چار تاریخ کو ملا۔ سرمد مشتاق صاحب کا جامع تبصرہ واقعی انعام کا حقدار تھا۔ ہماری طرف سے دلی مبارکباد۔ اس بار دل باغ باغ ہوگیا کہ عقل میں اپنی صنف کی ہی حکمرانی تھیں چڑیلیں بالکل غائب تھیں۔ شاید کوئی اپنی بدتمیزی سے یہ احساس دلانا چاہ رہا تھا کہ ہم بھی موجود ہیں کوئی ہماری طرف بھی دھیان دے خیر چھوڑیے۔ عقل سے فارغ ہو کر سیدھے چل پڑے دیوی جی کے درشن کرنے جن کا ہمیں پورا مہینہ شدت سے انتظار رہتا ہے۔ شانی کی مشکلات تو پاکستان کی مشکلات کا روپ دھار چکی ہیں جو ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتیں۔ رستم کی حالت پر بے حد افسوس ہوا۔ مستقبل شناس اب آہستہ آہستہ پھل پھول رہی ہے۔ اب پتا نہیں بازرگان اپنی بیٹی پرویز داؤد کا راز کھولے گا یا نہیں۔ دفینہ ایک سبق آموز تحریر تھی۔ جس میں مدیحہ شاہ نے انسانی ذہن کی کمتری اور برتری کا بڑی خوبصورتی سے تقابل کیا ہے۔ مال مفت ایک سبق آموز تحریر تھی اگر سب لوگ اپنی ذمے داریاں خوش قانون کے ہاتھ بہت لمبے ہوتے ہیں کوئی بھی جرم کر کے قانون سے بچ نہیں سکتا۔ عدالت بھی ایک سبق آموز تحریر تھی۔ مریض ایک اچھی تھی۔ سب خزانے کے لیے تگ ودو کرتے رہے اور آخر میں خزانہ کسی دوسرے کے ہاتھ لگ گیا۔ لالچ کا انجام ہمیشہ کچھ ایسا ہی ہوتا ہے۔ مریض ایک اچھی تحریر تھی۔ جس میں مدیحہ شاہ نے انسانی ذہن کی کمتری اور برتری کا بڑی خوبصورتی سے تقابل کیا ہے۔ مال مفت ایک سبق آموز تحریر تھی جس سے سبق ملتا ہے کہ قانون کے ہاتھ بہت لمبے ہوتے ہیں کوئی بھی جرم کر کے قانون سے بچ نہیں سکتا۔ عدالت بھی ایک سبق آموز تحریر تھی اگر سب لوگ اپنی ذمے داریاں خوش اسلوبی سے نبھائیں تو ایسی نوبت ہی نہ آئے۔ پرانا پیشہ میں برن پیارے کے ساتھ بہت برا ہوا۔ اس نے بڑی مشکل سے کین اور میس سے جان چھڑائی تھی کہ مانیک پیچھے پڑ گیا۔ اس پر تو یہ محاورہ ہی صادق آتا ہے کہ آسمان سے گرے کھجور میں اٹکے۔ کاشف زبیر میرے فیورٹ رائٹر ہیں وہ اپنی ہر تحریر میں چاہے وہ سنجیدہ ہو یا پُرمزاح، اصلاحی مقاصد پیش نظر رکھتے ہیں اور ہمارے معاشرے کی سماجی برائیوں کو غیر محسوس طریقے سے بے نقاب کر دیتے ہیں اس مرتبہ بھی انہوں نے نیش زن کی صورت میں ایک سبق آموز کہانی تحریر کی۔ خود غرض انسان واقعی کوئی دوست نہیں بنا پاتا کیونکہ دوستی تو دوسروں کی خاطر خود کو مٹا دینے اور قربانی کا نام ہے جو لوگ دوسروں کے لیے قربانی نہیں دے سکتے وہ کبھی اچھے دوست نہیں بنا سکتے۔ ان کا انجام پروفیسر رحمدل جیسا ہوتا ہے۔ استاد دمیر شاہ کی ایک دلچسپ تحریر تھی۔ اس کے انجام نے یقین دلا دیا کہ استاد ہمیشہ استاد ہی رہتا ہے کوئی شاگرد چاہے کتنا ہی چالاک اور ہوشیار کیوں نہ ہو جائے وہ استاد ہی رہتا ہے۔ الزام بہت ہی الجھی ہوئی تحریر تھی لیکن آخر کار پیٹر اسٹیل نے اپنی ذہانت اور بہادری سے خود کو بے قصور ثابت کر ہی دیا۔ عزم نو میں قسمت کو زیر نہیں کر سکتا۔ ایچ جی ویلز کی مولی اور کس باغ کے گجرے ہیں۔ ابن مقبول جاوید احمد صدیقی اتو یہ نام ہے آپ کا یا پورا شجرہ۔ انکل آپ ان کے نام پر سنسر کی قینچی کیوں نہیں چلاتے؟ انصافی اقرا بخاری تمہاری عقل شریف پر ماتم کرنے کو جی چاہ رہا ہے تم نے تو رحیم یار خان میں رہ کر میرا نام ہی ڈبو دیا۔ ارے بھئی ایسٹ کا جواب چقمرے دینا ضروری ہے۔ عبدالعزیز پٹھان! اتنا مختصر سا تبصرہ کچھ اچھا نہیں لگا۔ اس بار محمود احمد مودی دفینہ کے ساتھ حاضر ہوئے کہانی میں سسپنس مروج پر تھا۔ حیرت تو مجھے یہ ہوئی کہ جب مونا مل گیا یعنی اس کا سراغ لگ گیا تو عین موقع پر دوسرے لوگ پہنچ گئے اور ان بچاروں کی آنکھوں کے سامنے تمام سونا لے اڑے۔ مستقبل شناس کی یہ قسط تو واقعی جاندار رہی۔ ایچ اقبال صاحب کی گرفت کہانی پر مضبوط رہی۔ اس کے بعد دیوی کے پاس پہنچے معلوم ہوا کہ شانی ایک نئے چکر میں پھنس گئی ہے۔ تاؤ شاہ تو بتا نہیں اگلے پچھلے حساب پورے کرے گا اس سے آخر خاندانی دشمن جو ہیں شانی کے وارث۔ پلیز انکل عقل جی رستم کو اس قدر ذلیل وخوار مت کریں اور شانی کب اس مصیبت سے نکلے گی۔ رنگوں میں پیلا رنگ کچھ نے خاصا متاثر کیا۔ نسرین حسام نے ایک سبق آموز کہانی لکھی اور ایک اہم بات کی جانب توجہ مبذول کروائی ہے۔ وہ یہ کہ ہر قدم اٹھانے سے پہلے عقل سے کام لیں اور بنا سوچے سمجھے ... کوئی بھی ایسا قدم مت اٹھائیں جس پر بعد میں پچھتانا پڑے۔ دوسرا رنگ واقعی خوبصورت تحریر تھی۔ تفریح کے ساتھ ساتھ نصیحت بھی موجود تھی۔ ساجد نے اور صنم نے اپنی عقل ودانش کے ذریعے رخشی کو بے نقاب کیا۔ ورنہ وہ تو بڑی عیار نکلی تھی گمراہ نے میں کیا تھا؟ یہ سمجھ میں نہیں آیا مجھے۔ کیا رشوت یا پھر کچھ اور تیسرا رنگ رہائی بھی اچھی کاوش تھی دوستوں میں سے ہی دشمن نکل آتے ہیں اور بظاہر ہمدرد نظر آنے والے لوگ درحقیقت بھیڑیے سے کم نہیں ہوتے۔"

آغا سید علی تقی بخاری سیالکوٹ سے پہلی دفعہ لکھتے ہیں۔ "سات جولائی کا دن اور رات گیارہ کا عمل مزید طرہ یہ کہ بجلی ندارد۔ ایسے میں جاسوسی لیے چھوٹا بھائی داخل ہوا گویا جاسوسی اندھیرے میں نور بن کر چمکا مگر اس کا چمکنا بے سود ہی گیا۔ جاسوسی کی محفل میں دوستی کا ہاتھ پہلی مرتبہ بڑھا رہا ہوں۔

زیادہ ہی خوبصورت لگ رہی تھی۔ لگتا تھا بادلوں کے پیچھے سے چودھویں کا چاند جھانک رہا ہے۔ اپنی دے مجموعی طور پر ٹائٹل کو پاسنگ مارکس مل گئے۔ سرمد مشتاق صاحب آپ کے ذہن شریف کی صابن دانی میں پہلے ہی اتنا بھوسا بھرا ہوا ہے اس میں بھلا کچھ اور کیسے سما سکتا ہے اور ذاکر انکل ٹائٹل ہم جیسے لوگوں کے لیے بناتے ہیں۔ آپ براہ کرم اسے دیکھنے سے اجتناب کیا کریں۔ سلمان شاہ تو سستی کے ریکارڈ توڑ رہے ہیں۔ ڈیئر یہ اکیسویں صدی ہے اس میں جو جھک گیا وہ پیچھے رہ گیا۔ رانا محمد نثار آپ تو صنف نازک سے بھی زیادہ نازک ہیں۔ اتنا لمبا نام لکھتے ہوئے اگر آپ کے ہاتھ تھک جاتے ہیں تو اختصار سے کام لے لیا کریں۔ افتخار حسین اعوان تعلیم سے اتنی محبت بھی اچھی نہیں کہ بڑھاپے میں بھی اس کا پیچھا نہیں چھوڑ رہے۔ محمد نثار احمد میرے بھولے بھالے بھائی آپ کو اتنا بھی نہیں پتا کہ سکھوں اور پٹھانوں میں کون سی بات مشترک ہوتی ہے۔ دہی بھئی جو آپ میں بھی ہے۔ ثمینہ حیات ویڈانٹ آپ نے اکیلے ہونے کے باوجود صنف کرخت کو بہت اچھی طرح سنبھال لیا۔ وقار احمد شیخ نے تو بے وقوفی کے تمام ریکارڈ توڑ دیے ایک طرف تو موصوف کہہ رہے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب کے تبصرے میں ضروری لوازمات منفرد تھے اور دوسری طرف انکل کو مکھن بھی لگایا جا رہا ہے کہ ان کے منتخب کردہ تبصرے کی اچھائی میں کوئی شک نہیں ہوتا۔ ڈیئر آپ کے ذہن شریف کی صابن دانی بالکل ہی خالی لگ رہی ہے۔ اپنے بھائی بندوں سے تھوڑا سا بھوسا ہی لے کر اس کو فل کر دیں۔ ملک ریاض آصف آپ انسانوں کو جانوروں سے ملا کر کیا ثابت کرنا چاہ رہے ہیں یہی نا کہ آپ میں تہذیب وتمیز کی شدید کمی ہے جب کہ اس کے برعکس جہالت اور بے وقوفی آپ کے ذہن شریف کی صابن دانی میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ محمود احمد مودی کی تحریر دفینہ پڑھی انداز تحریر سے تو یہ تحریر نجمہ مودی کی لگ رہی ہے۔ اپنی دے اس قسم کی تحریریں اتنی زیادہ پڑھنے کو مل چکی ہیں کہ اب ان میں کوئی خاص دلچسپی محسوس نہیں ہوتی۔ بہرحال ایڈ خلاف توقع دیا جس کی وجہ سے ہم اس تحریر کو پاسنگ مارکس دینے میں کامیاب ہو گئے۔ غلام قادر اپنے مخصوص انجھے انجھے انداز میں فریب راہ لے کر آئے۔ دلچسپ انداز بیاں کی وجہ سے کہیں بھی بوریت نہیں ہوئی۔ واقعات تو عام سے تھے۔ نسرین حسام کی حیرت اثر تحریر پھر دل کو بھا گئی۔ حسام بٹ اور نسرین حسام کا انداز تحریر بالکل ہی ایک جیسا ہے۔ رضوانہ منظر کی رہائی بس گزارے لائق رہی ایڈ تو بالکل ہی فضول تھا۔ دیوی ہمیشہ کی طرح شاندار رہی۔ شانی پر ہونے والے ظلم وستم نے خون کے آنسو رلا دیا۔ کہانی کی سب سے خوبصورت بات اس کے حقیقت سے قریب تر واقعات ہیں۔ طاہر جاوید عقل نے تحریر پر کافی مضبوط گرفت رکھی ہوئی ہے۔ مستقبل شناس بھی اچھی جا رہی ہے لیکن حقیقت سے دور مار دالی قسم کے واقعات کہانی کو غیر دلچسپ بنا رہے ہیں۔ مختصر تحریروں میں استاد مزمل نو بنیش زن اور پرانا پیشہ شاندار رہیں۔"

رحیم یار خان سے مونا خان کا تبصرہ۔ "اس ماہ کا شمارہ ہمیں چھ جولائی کو ملا سرورق پر نظر پڑی تو بس دیکھتے ہی رہ گئے۔ انکل اگر میں آپ کو سچی سچی بتاؤں تو سرورق میری سمجھ سے بالاتر تھا۔ کچھ پتا نہیں کہ لڑکی لڑکے کے پیٹ سے برآمد ہو رہی ہے یا لڑکا لڑکی کی پیٹھ سے نکل رہا ہے اور ہاتھ میں پستول اٹھائے موصوف سرورق کے ایک طرف موجود کسی اسمگلر نما بندے کے منہ سے گولی مارنے کے موڈ میں دکھائی دے۔ غور سے دیکھنے پر معلوم ہوا کہ اسمگلر نما بندہ صہیب اختر مرحل عرف کامل ہے۔ خیر خیر جی اشتہاروں کو نظر انداز کرتے ہوئے ہم سیدھا چینی نکتہ چینی میں پہنچے جہاں سرمد مشتاق کرسی صدارت پر ڈیرا جمائے لالی پاپ کھا رہے تھے مگر تبصرہ تو واقعی جاندار تھا کافی جامع اس لیے میری طرف سے منوں ٹنوں کے حساب سے مبارک وصول کریں۔ صہیب اختر ساحل بزرگو ویسے کس کلاس کے ہیرو دیے ہیں آپ نے...؟ سنا ہے آپ پٹھان ہیں اور ہم بھی اسد جلال! بس تھوڑی سی کوشش کے بعد آپ بھی مفت خور کا اعزاز پا سکتے ہیں۔ رانا نثار آپ بڑے شریف لگ رہے ہیں مگر خیر کچھ عرصے کے بعد آپ کے بھی "پر" نکل آئیں گے اپنے باقی بے وقوف ساتھیوں کی طرح۔ افتخار حسین اعوان آپ کچھ زیادہ ہی پھول کر کپا ہوئے جا رہے ہیں۔ آرام سے رہیے ورنہ ہم آپ کو کانوں چنے چبوا دیں گے۔ انکل ایم اے شور کوئی جو تھوڑی سی عقل آپ کے پاس ہے وہ بھی کھولی۔ حافظ محمد بلا حیدر! اتنا بڑا نام رکھ کر آخر آپ کو کون سے تمغے مل جائیں گے۔ محمد عماد احمد اگر آپ کے کھٹارا دماغ کے خالی ڈبے میں تھوڑی سی بھی عقل موجود ہے تو پلیز اپنی بونگیاں بند کر دیں۔ عقیل احمد تکتہ چینی محفل کو آپ یکالی محفل سمجھیں اور اپنی تمام تر صلاحیتوں کے ساتھ جلوہ افروز ہوا کریں۔ وقار احمد شیخ! آپ کا تبصرہ تو واقعی اچھا تھا۔ اب زیادہ اترائیے گا نہیں۔ ملک ریاض آصف! کیوں جی باگڑ بلے صاحب آپ کو بلیوں کی یاد کیونکر ستانے لگی۔ زیادہ پھیلنے کی ضرورت نہیں ہم دیکھ لیں گے آپ کو کہ آخر آپ کس کھیت کی مولی اور کس باغ کے گجرے ہیں۔ ابن مقبول جاوید احمد صدیقی اتو یہ نام ہے آپ کا یا پورا شجرہ۔ انکل آپ ان کے نام پر سنسر کی قینچی کیوں نہیں چلاتے؟ انصافی اقرا بخاری تمہاری عقل شریف پر ماتم کرنے کو جی چاہ رہا ہے تم نے تو رحیم یار خان میں رہ کر میرا نام ہی ڈبو دیا۔ ارے بھئی ایسٹ کا جواب چقمرے دینا ضروری ہے۔ عبدالعزیز پٹھان! اتنا مختصر سا تبصرہ کچھ اچھا نہیں لگا۔ اس بار محمود احمد مودی دفینہ کے ساتھ حاضر ہوئے کہانی میں سسپنس مروج پر تھا۔ حیرت تو مجھے یہ ہوئی کہ جب مونا مل گیا یعنی اس کا سراغ لگ گیا تو عین موقع پر دوسرے لوگ پہنچ گئے اور ان بچاروں کی آنکھوں کے سامنے تمام سونا لے اڑے۔ مستقبل شناس کی یہ قسط تو واقعی جاندار رہی۔ ایچ اقبال صاحب کی گرفت کہانی پر مضبوط رہی۔ اس کے بعد دیوی کے پاس پہنچے معلوم ہوا کہ شانی ایک نئے چکر میں پھنس گئی ہے۔ تاؤ شاہ تو بتا نہیں اگلے پچھلے حساب پورے کرے گا اس سے آخر خاندانی دشمن جو ہیں شانی کے وارث۔ پلیز انکل عقل جی رستم کو اس قدر ذلیل وخوار مت کریں اور شانی کب اس مصیبت سے نکلے گی۔ رنگوں میں پیلا رنگ کچھ نے خاصا متاثر کیا۔ نسرین حسام نے ایک سبق آموز کہانی لکھی اور ایک اہم بات کی جانب توجہ مبذول کروائی ہے۔ وہ یہ کہ ہر قدم اٹھانے سے پہلے عقل سے کام لیں اور بنا سوچے سمجھے ... کوئی بھی ایسا قدم مت اٹھائیں جس پر بعد میں پچھتانا پڑے۔ دوسرا رنگ واقعی خوبصورت تحریر تھی۔ تفریح کے ساتھ ساتھ نصیحت بھی موجود تھی۔ ساجد نے اور صنم نے اپنی عقل ودانش کے ذریعے رخشی کو بے نقاب کیا۔ ورنہ وہ تو بڑی عیار نکلی تھی گمراہ نے میں کیا تھا؟ یہ سمجھ میں نہیں آیا مجھے۔ کیا رشوت یا پھر کچھ اور تیسرا رنگ رہائی بھی اچھی کاوش تھی دوستوں میں سے ہی دشمن نکل آتے ہیں اور بظاہر ہمدرد نظر آنے والے لوگ درحقیقت بھیڑیے سے کم نہیں ہوتے۔"

ملکہ کوہسار سے نور الہدیٰ کے جوابات۔ "حسب معمول اس دفعہ بھی جاسوسی چار جولائی کو ملا۔ ارے یہ کیا اس دفعہ تو ذاکر انکل نے تین چوتھائی حصے پر بدصورتی یعنی صنف کرخت کو پھیلا دیا ہے اور صرف ایک چوتھائی حصے پر خوبصورتی یعنی میری صنف کو جگہ دی۔ بہرحال اس وجہ سے تو سرورق کی ملکہ کچھ

سرورق عجیب سا تھا۔ ڈریکولا منہ کھولے آگ برسا رہا تھا۔ درمیان میں لڑکی منہ کھولے مجسمۂ حیرت بنی ہوئی تھی۔ لڑکی تصویر میں نظر آنے والی اکلوتی آنکھ کے گوشے سے قدرے اوپر دیکھ رہی تھی۔ اس کے ساتھ قدیم طرز تعمیر کی کوئی عمارت نظر آ رہی تھی اور نیچے کچھ ہریالی۔ اشتہارات اور فہرست پر طائرانہ نظر ڈالنے کے بعد ہم بن بلائے مہمان کی طرح داخل محفل ہوئے۔ ارے! یہ تو میدانِ کارزار نکلا جہاں شدید گرمی کے باوجود سرد جنگ اوج ثریا تک پہنچی ہوئی تھی۔ پہلے سرد مشتاق صاحب کو مبارکباد۔ تبصرہ واقعی اچھا تھا۔ تمام محفل پر مرد اجارہ داری کا فی منظم تھی۔ ثمینہ حیات صنفِ نازک کی نمائندگی کر رہی تھیں۔ کاشف زبیر کی نیش زن عمدہ کہانی تھی۔ پروفیسر رچرڈ ایلی بین ایملی سے بدسلوکی کرتا ہے۔ اس کے باوجود ایملی نے خود کو رچرڈ پر قربان کر دیا۔ محمود احمد مودی کی دفینہ بھی اچھی تھی۔ مرزا ظفر بیگ کی الزام اچھی تحریر تھی۔ شکیل صدیقی کی پرانا پیشہ عمدہ کاوش تھی۔ برن کرائے کا قاتل اور بنا کے مشق میں گرفتار ہو جاتا ہے اور تمام غلط کام چھوڑ دیتا ہے۔ کیبن نائی کرائم رپورٹر اسے بلیک میل کرتا ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ جرائم کی دنیا میں انسان داخل تو ہو سکتا ہے لیکن واپسی کا کوئی راستہ نہیں ہوتا۔ مالِ مفت محمد ابراہیم جمالی کی کہانی بھی پسند آئی۔ عمیر شاہ کی استادمحترم تحریر تھی۔ شرفو استاد واقعی تجربہ کار اور اصولوں کا پابند نظر آتا ہے۔ یہی دو باتیں کسی بھی کام میں کامیابی کی ضمانت سمجھی جاتی ہیں۔ زاہد گردیز کی عدالت عجیب کہانی تھی۔ شہزاد ہپنوٹیزم کی وجہ سے اسپتال میں داخل ہوتا ہے جہاں اسے غلطی سے ہم نام شہزاد کی الکٹروکینسر کی رپورٹس دے کر کہا جاتا ہے کہ اس کی زندگی زیادہ سے زیادہ آٹھ روز کی ہے۔ وہ اس غلط فہمی میں نیک کام کے جنون میں یہ کام کرتا چلا گیا۔"

عمران یوسف زئی کی شمولیت سانگھڑ سے۔ "اس بار جاسوسی تین جون کو ملا۔ انتہائی شدید گرمی کا وقت تھا۔ سرورق پر گھاس کے میدان میں واقع ایک جھونپڑی کی جانب رخ کیے اس شخص کی کمر پر ایک خاتون کا چہرہ؟ نیچے ایک شخص احمقوں کی طرح ہنستا دکھائی دیا۔ مجموعی طور پر اس بار سرورق کوئی خاص تاثر پیش نہ کر سکا۔ چینی نکتہ چینی میں پرانے دوستوں کی عدم شرکت کی وجہ سے مٹھاس کم ہوتی جا رہی ہے شاید پرانے دوستوں کو اس سے بہتر کوئی کام ہاتھ آ گیا ہے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے دیوی پڑھی۔ مجھے تو اب شانی انتہائی بے وقوف اور احمق لگنے لگی ہے جو چوہدری بشیر کی حقیقت جاننے کے باوجود اسی سے چمٹی پڑی ہے۔ مستقبل شناس میں کہانی کے سر پیر کا پتا نہیں چل رہا ہے۔ راؤ صاحب خود گمن چکر بنے ہوئے ہیں راجو کا کردار اچھا ہے۔ اقبال صاحب برائے کرم کہانی کو اس کے درست ٹریک پر لے آئیں ورنہ قارئین بور ہو جائیں گے۔ سرورق کے تینوں رنگ بہترین تھے خصوصاً تیسری کہانی کو پڑھ کر ذہن میں آیا "ہوس کے غلاموں کا عبرتناک انجام۔" مختصر کہانیوں میں تک دیلوٹ کی پالی کی چوری خاص مزہ نہ دے سکی....."

فہد علی کوٹلی آزاد کشمیر سے شاملِ محفل ہوتے ہیں۔ "ماہ جولائی کا شمارہ حسبِ معمول 4 تاریخ کو مل گیا۔ کیوں کہ اس مرتبہ ہم نے بھی محفلِ دوستاں و دشمناں میں شرکت کی جسارت کی تھی۔ ٹائٹل کی ایک انفرادیت یہی تھی کہ ذاکر انکل نے پچھلی مرتبہ (ماہ جون) میں ٹائٹل گرل کو ایک صاحب کی پیٹھ پر پینٹ کر دیا تھا اور اس مرتبہ ماہ جولائی کے شمارے میں ایک آنکھ سے محروم ٹائٹل گرل کو ایک صاحب کے سامنے والے حصے پر پینٹ کر دیا۔ شاید پچھلے شمارے کے ٹائٹل پر کسی صنفِ نازک یا شاید ثمینہ حیات صاحبہ نے اعتراض کیا ہو کہ یہ کیا ہماری صنف کو مخالف صنف کی پیٹھ پر بنا دیا اور پھر ذاکر انکل نے ان کا اعتراض دور کرنے کے لیے ثمینہ حیات صاحبہ کی آنکھ سے محروم تصویر پینٹ کر دی۔ مجموعی طور پر ٹائٹل ہمارے سر سے گزر گیا سوائے ثمینہ حیات صاحبہ کی تصویر کے۔ اشتہارات کو نظر انداز کر کے دسترخوان یعنی فہرست میں پہنچے۔ یہاں پر قسم قسم کی لذیذ ڈشیں یعنی کہانیاں سجی ہوئی تھیں۔ ان کو دیکھ کر منہ میں پانی بھر آیا لیکن صبر کا دامن پکڑے ہوئے ہم اپنی پسندیدہ سے پسندیدہ محفلِ دوستاں و دشمناں میں وارد ہوئے۔ سرمد صاحب کا انعامی تبصرہ پڑھا پسند آیا۔ انعام حاصل کرنے پر مبارکباد قبول کیجیے۔ پھر طاہر جاوید مغل صاحب کے شاہکار دیوی کا رخ کیا جہاں شانی پر مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹے ہوئے ہیں اور رستم کی بے بسی۔ مغل صاحب پلیز رستم کو اتنا بدحال اور بے بس نہ دکھائیں ہم سے دیکھا نہیں جاتا۔ ہمیں بہت دکھ ہوتا ہے۔ کہانی کے مدوجزر بہت خوبصورت ہیں۔ کہانی میں سسپنس و تجسس کی بھرمار ہے۔ بعض اوقات تو پڑھنے والوں کو اپنی سانسیں رکتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ دوسری سلسلے وار کہانی ایچ اقبال کے قلم سے مستقبل شناس پڑھی پسند آئی۔ اس کے بعد سرورق کے رنگوں کا رخ کیا جہاں پہلے رنگ میں نسرین حسام اپنی شاہکار کہانی پھولے ہوئے موجود تھیں۔ کہانی پڑھی پسند آئی۔ کہانی کے مناسبت سے کہانی کا نام پھول پسند آیا۔ واقعی حامد نے پھول کا کردار ادا کر کے سرمد اور شبانہ کی زندگی میں زہر گھول دیا۔ جب سرمد کی آنکھوں پر شک کی پٹی بندھ گئی تو اسے کچھ (حقیقت) نظر نہ آیا۔ دوسرا رنگ غلام قادر کے قلم سے لکھا گیا۔ فریب راہ پر ٹھا، اچھا لگا۔ اس کہانی میں دو دلوں کی محبت کے درمیان حائل رکاوٹوں کی عکاسی کی گئی تھی۔ تیسرا رنگ رضوانہ منظر کی تحریر "رہائی" تھی زبردست تھی۔ رضوانہ منظر میری پسندیدہ رائٹر ہیں۔ اس کے بعد محمود احمد مودی کے ہاتھوں لکھا گیا ناول دفینہ اسی شمارے کے اولین صفحات کی زینت بنا جو زبردست تھا پسند آیا۔ کہانی کا ٹیسٹ زبردست تھا۔ کہانی میں سسپنس کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا اور کہانی تیز رفتار تھی۔ ارسلان اور شگفتہ کا منگی کردار ناپسندیدہ تھا کیونکہ یہ دونوں خزانہ اکیلے اکیلے ہی ہضم کرنا چاہتے تھے۔ مختصر کہانیوں میں زاہد گردیز کا کے قلم سے اچھوتے موضوع پر لکھی گئی تحریر عدالت پسند آئی۔ اس کہانی میں شہزاد بیچارے پر بہت ترس آیا جو اپنی عدالت میں لوگوں کے فیصلے کرتا رہا اور اسپتال والوں کی غلطی پر قصہ بھی آیا جن کی وجہ سے شہزاد اس حال کو پہنچا۔"

بہاولپور سے بشریٰ انعمل کی حاضری۔ "عجیب و غریب تاثر لیے جولائی کا جاسوسی ملا۔ سرورق پر ایک خوبصورت لڑکی کے سر پر پستول بردار مجھے ایک حیرت زدہ دہشت زدہ مرد کا خاکہ مکان نما عمارت کے کھنڈرات۔ اپنی محفل میں داخل ہوئے ہائیں ہمیں چینی کی چھاؤں میں دوسرے نمبر پر بٹھا دیا۔ چینی بڑی مہنگی ہو گئی ہے پھر بھی ہمیں چینی جیسی مٹھاس سے محروم نہیں کرتے۔ گرمی نے تو اب رنگ دکھانا شروع کر دیا ہے گزر ہی جائے گی اس گرمی کا اپنا الگ مزہ ہے۔ سرمد مشتاق پہلا انعام مبارک ہو سنبھل کے کہیں خوشی سے کرسی سے نیچے نہ گر جائیں خود کو قابو میں رکھیں ویسے تبصرہ اچھا تھا۔ محمود احمد مودی کی دفینہ پڑھ کر لگا کہ تین دوست ہوں گے اور کسی علاقے میں خزانے ڈھونڈنے جائیں گے۔ اس میں ایک ہوٹل کے کھنڈر میں سے دادا کے زمانے کا خزانہ ڈھونڈنے کا تذکرہ تھا۔ خان صاحب بڑے ذہین تھے ویسے ہمارا خیال بھی ادھر ہی گیا تھا کہ خزانہ حوض کے آس پاس ہی ہو گا۔ ویسے ہمارا یہ بھی خیال تھا کہ خزانہ کا تذکرہ ہو گا خزانہ موجود نہ ہو گا لیکن یہ کیا خزانہ مل گیا آخر میں بالکل کہانیوں کی طرح ڈاکو آئے اور لوٹ کر چلتے بنے۔ مستقبل شناس کی چوتھی قسط پڑھنے کو ملی۔

راؤ صاحب نے ہوش دیکھا کی میں ایک منظر دیکھا اور دیوانگی میں تبدیل ہو گئے۔ شکر ہے کہ احمری نے ان سے رابطہ کر لیا ورنہ ہم نے تو نانا شہ پڑھ لی تھی عندلیب اور راجو جیسے دوست مل جائیں تو کیا بات ہے۔ دیوی میں شانی نے اتنی مشکلات جھیل کر بالآخر رستم سیال کو دیکھ لیا کہ حالات کس طرح ایک بہادر شخص کو غم سے دیوانہ کر دیتے ہیں۔ شانی کا تجزیہ رستم کے بارے میں ہماری رائے میں بالکل درست ہے۔ شانی مہارانی سے تو کرانی بنا دی گئی۔ کچھوں میں دوست نما کچھوا کا ذکر تھا جس طرح کچھوا ڈنگ مارنے سے باز نہیں آتا۔ اس طرح بدفطرت شخص یا دوست موقع ملنے پر نقصان پہنچانے سے باز نہیں آتا۔ فریب راہ عام سے واقعات کے ذریعے کہانی نے ایک خوبصورت رنگ دھار لیا۔ سادگی سے واقعات بیان کر دیئے اور چالاکی سے اپنے فائدے حاصل کر لیے۔ ہیرو صاحب نے روشن برقرار رکھی اور جو کچھ راز رکھنے کو کہا گیا جس میں اپنا فائدہ تھا۔"

عمران صفدر ملک چشمہ بیراج میانوالی سے لکھتے ہیں۔ "اس ماہ کا شمارہ 4 جولائی کو ملا۔ گرمی کی شدت کے باعث سرِ شام ہی گھر سے نکلا اور مارکیٹ کی طرف روانہ ہوا۔ سرورق پر نگاہ دوڑائی تو حیرت کے سمندر میں غوطہ زن ہوا کیونکہ حسینہ کے ہونٹوں کے درمیان دو دانت جھانک رہے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے تازہ قلفی کھائی ہو اور کوئی میدانما آدمی حسینہ کے سر کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے کسی صاحب کے ٹب جیسے کھلے منہ میں کودنی مار رہے ہیں اس کے بعد اشتہارات کے زینے طے کرتا ہوا محفلِ یاراں میں پہنچا۔ سرمد مشتاق صاحب مبارک ہو اس کے علاوہ عمار احمد اور افتخار حسین اعوان کے تبصرے قابلِ ستائش تھے۔ اس کے علاوہ ثمینہ حیات صاحبہ بال بکھیرے سر میں مٹی ڈالے ہونٹوں کی طرح ادھر ادھر چکراری تھیں مگر کوئی ہم صنف نظر نہ آئی افسوس بہت بے آبرو ہو کر تیرے کوچے سے ہم نکلے۔ دفینہ پڑھی۔ نزدیکی رشتوں کو زک پہنچا۔۔۔ کے ارسلان کو کچھ نہ ملا۔ مودی صاحب کی اچھی تحریر تھی۔ مستقبل شناس پڑھی۔ راؤ پرویز صاحب اور احمر کا پراسرار ملاپ پسند آیا پھر دیوی کی طرف آیا تو مغل صاحب نے کلیجا کاٹ کے رکھ دیا۔ کیونکہ سارے ہی مثبت کرداروں کو مغل صاحب نے ملی میں ملا کے رکھ دیا ہے اب اگر رستم کی جگہ کسی نئے کردار کو جگہ دے دیں تو شاید کہانی میں وہی رنگ لوٹ آئے۔ اس کے علاوہ مدیحہ شاہ کی مریض اچھی تحریر تھی اور عمیر شاہ کی استاد زبردست تحریر رہی۔"

عبدالحکیم سے حافظ محمد بلال حیدر کا تبصرہ۔ "اس دفعہ رسالہ تین جولائی کو ملا۔ ٹائٹل پر نظر دوڑائی تو ایک طرف شاید کوئی گھنا گھر موجود تھا جو اپنی پوری ہیبت کے ساتھ سر اٹھائے کھڑا تھا۔ چینی نکتہ چینی میں پہنچے تو دہری خوشی ملی۔ ایک تو اپنا تبصرہ دیکھ کر دوسرا اپنی صنف کو اس بار بھرپور انعام لیتے دیکھ کر۔ بہت مبارک ہو سرمد صاحب۔ اپنے ابے سے دم ضرور کر دالنا آج کے دور میں نظر لگتے دیر نہیں لگتی۔ ثمینہ حیات اس دفعہ دانت چباتی نظر آئیں کہ بے وقوف مجھ سے پہلے آ گئے۔ ثمینہ صاحبہ اپنی معقول نے تو آدھی گھاس کھالی تھی۔ اب ہیبت والا آدھی گھاس میرے خیال میں آپ کے لیے کاٹنے آیا ہو گا۔ ویسے فکر کی بات نہیں بھائیوں نے بہن کا حصہ ضرور رکھا ہو گا۔ اس کے بعد پہنچے دیوی میں آخر کار شانی قادر، حشام کے ہتھے چڑھ ہی گئی۔ یہاں جگہ جگہ شانی کو نڑپانے کا سامان تھا اور سب سے زیادہ حیرت ہمیں وہاں رستم کی موجودگی سے ہوئی۔ ہم تو سمجھ رہے تھے۔ رستم آزاد ہے اور کسی نئی منصوبہ بندی کے لیے پر تول رہا ہے لیکن وہ تو خود دشمنوں کے قبضے میں ہے۔ اس کے بعد استاد پڑھی ڈیلپ تحریر تھی۔ نالائق شاگردوں کا یہی انجام ہونا چاہیے۔ اس کے بعد دفینہ پڑھی۔ یہ کیا پچ پچ خزانہ نکل آیا۔ ہم تو سمجھ رہے تھے کہ بے چارے اندھیرے میں ناک ٹوٹیاں مار رہے ہیں لیکن بے چاروں کے ساتھ ہوا بہت برا۔ سراغ کسی نے لگایا اور خزانہ کوئی لے گیا۔ ان تینوں کے دلوں میں تھوڑا لالچ ضرور تھا اور پھر آپ کو تو پتا ہے کہ لالچ کا انجام ہمیشہ برا ہوتا ہے۔ اس کے بعد رنگ پڑھے۔ انکل جی رنگوں کا معیار تھوڑا بلند کریں۔ تین چار مہینوں سے رنگ رنگ دار نہیں، پھیکے رنگ آ رہے ہیں۔ آخری رنگ کچھ اچھا تھا۔"

ساگر ملک چشمہ بیراج سے۔ "جاسوسی ڈائجسٹ ملا۔ جولائی کے مہینے میں سندھ دریا کے ساحل پر ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا میں بیٹھ کر پڑھنا شروع کیا اس مرتبہ تو کہانیاں لاجواب تھیں۔ دیوی بہت شاندار جا رہی ہے۔ اس کہانی کو پڑھ کر آنکھوں میں نمی آ جاتی ہے۔ مختصر کہانیوں میں عدالت اور استاد نمبر دن رہیں۔ بہت خوبصورت کہانیاں تھیں۔ مالِ مفت اور پرانا پیشہ دوسرے نمبر پر رہیں جب کہ نیش زن تیسرے نمبر پر رہی۔ انکل اس بات کی طرف تھوڑی سی توجہ دیں کہ کافی عرصے سے ڈاکٹر عبدالرب بھٹی اور نواب صاحب کی کہانیاں شامل نہیں ہو رہیں آخر کیا وجہ ہے؟ (کوئی وجہ نہیں ہے۔ ان کی کہانیاں بھی آپ کو جلد پڑھنے کو ملیں گی۔) غزلوں کے لیے بھی کچھ صفحات مختص کریں۔ میں آپ کو کہانیاں لکھ کر بھیجنا چاہتا ہوں آپ کی کیا شرائط ہیں (مختصر ہوں) اور کس ایڈریس پر لکھ کر بھیجوں۔" (جس ایڈریس پر یہ خط لکھا ہے۔)

شان احمد لشکری کی ناپسندیدگی محمد پور دیوان سے۔ "ماہ جولائی کا جاسوسی چھ تاریخ کو ملا۔ گزشتہ دو تین ماہ سے سرورق پر خواتین کی جگہ کم ہوتی جا رہی ہے جو کہ بہت اچھی بات ہے یہ اور بھی اچھی بات ہو گی اگر ذاکر انکل غیروں پہ کرم اپنوں پہ ستم والی پالیسی ترک کر کے صنفِ وجاہت کو بھی ان کا حق دے دیں ان کو بھی سرورق پر وجاہت بھرے انداز میں پیش کریں۔ انکل آپ "دلکش" کی کچھ زیادہ ہی پبلسٹی نہیں کر رہے یا پھر پہلے بھی آپ نے جاسوسی کے بعد سسپنس، پاکیزہ اور سرگزشت کی بھی ایسی ہی پبلسٹی کی تھی۔ سرورق کے بعد ہمیشہ کی طرح اشتہارات کو اپنا دشمن نمبر ایک سمجھتے ہوئی چینی نکتہ چینی کی خبر لینے کا ارادہ کیا۔ اس مرتبہ آزاد کشمیر سے سرمد مشتاق انعام کے مستحق ٹھہرے اس لیے انہیں انعام کی بہت بہت مبارکباد۔ باقی تبصروں میں پرانے ساتھیوں کی کمی رہی۔ ابتدا دیوی سے کی۔ دیوی میں جو کچھ شانی جیسی نرم دل اور حساس خاتون کے ساتھ ہو رہا ہے اسے پڑھنا حساس دل والوں اور نرم و نازک جذبات رکھنے والوں کے لیے کسی قیامت اور عذاب سے کم نہیں۔ نادر حشام اور چوہدری بشیر جیسے لوگ انسان بنتے ہوئے گویا اپنی توہین محسوس کرتے ہیں اور اپنے آپ کو (نعوذ باللہ) خدا سمجھنے ہیں مگر اس حالت میں وہ جانور تو کیا بلکہ درندوں سے بھی بدتر نظر آتے ہیں۔ طاہر صاحب نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ رستم شانی کی محبت میں ذلیل ہو چکا ہے مگر میرے خیال میں عام آدمی کی بھی اتنی تذلیل اور توہین اچھی نہیں ہوتی۔ محبت تو پھر بھی وقار، عظمت اور بلندی کی علامت ہے۔ رنگوں میں یوں لگتا ہے کہ اب کی بار رنگوں میں رنگ کے بجائے بھنگ ڈالی گئی تھی۔ پہلے رنگ پھول کو نسرین حسام نے تحریر کی شکل دی۔ یہ تحریر کہانی کے بجائے نفسیات کا مضمون زیادہ لگی۔ حد سے زیادہ لفاظی نے کہانی کا ذائقہ خراب کر دیا۔ بہرحال کسی نہ کسی طرح پڑھ ہی لی۔ دوسرے رنگ فریب راہ کے بارے میں اب میں کیا کہوں۔ غلام قادر۔ احمد اقبال اور نواب صاحب کی تحریروں کو پڑھ کے مجھے ایک عجیب سا قصہ آتا ہے۔ لگتا ہے کہ ان تین

مصنفین نے اپنے یکسانیت بھرے اندازِ تحریر کو نہ بدلنے کی قسم کھا رکھی ہے۔ غلام قادر صاحب کا سونے پر سہاگا الجھن بھرا انداز بھی ساتھ ہے۔ پلیز قادر صاحب خدارا اپنے اندازِ تحریر اور موضوع میں ورائٹی لائیے۔ البتہ تیمر ارنگ رضوانہ منتظر کا رہائی ان کے مئی کے شمارے میں لکھے گئے رنگ سے قدرے بہتر تھا مگر ایک بوریت سیاست کی ضرور تھی۔ اس مرتبہ مختصر تحریروں نے رنگوں کے مقابلے میں بہتر معیار قائم کیا۔ کاشف زبیر کی تحریر نیش زن میں یہ سبق تھا کہ جو دوسروں کو اذیت دیتا ہے اگر چہ اسے وقتی طور پر فائدہ حاصل ہوتا ہے مگر اس کا انجام بھیانک ہوتا ہے جیسا کہ چرڈ کا ہوا۔ شکیل صدیقی کی پرانا پیشہ میں برن نے جس طرح ساری زندگی دوسروں کو قتل کیا اس کے بدلے قسمت نے اسے باوجود تائب ہونے کے دوبارہ پرانے پیشے کی جانب آن دھکیلا۔ مال مفت استاد ہونے کی ترجمانی کی اور راجو اپنے زخم میں مارا گیا۔ مرزا ظفر بیگ کی کہانی کے شکل میں لکھے گئے الزام کو منانے کے لیے پیٹر نے ذہانت سے کام لیا مگر اس کے لیے اسے بڑی محنت کرنا پڑی۔ نئے مصنف زاہد گردیز کا کی عدالت میں شہزادی انسانیت تو قابلِ تعریف اور قابلِ تقلید تھی مگر برے لوگوں کو مارنے کا نظریہ غلط تھا کیونکہ برائی تب ختم ہوتی ہے جب اس کی جڑوں پر وار کیا جائے جس کے لیے یقیناً محنت کرنی پڑتی ہے مگر اس محنت کے اثرات لازوال ہوتے ہیں۔"

ملک حسنین دانش چک 88 شمالی سے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں۔ "ٹائٹل کو منفرد تو نہیں البتہ عجیب ضرور کہہ سکتے ہیں کیونکہ ہم تو اسے سمجھنے سے قاصر رہے شاید یہ کوئی بھوت پھیلا تھی۔ انواع و اقسام کی نیل پر پہنچے تو سرمد صاحب کو سویٹ ڈش بنے پایا۔ سرمد صاحب یہ صابن کا استعمال ذرا کم کیا کریں کہیں آپ کا ذہن واقعی صابن دانی نہ بن جائے۔ مبارک ہو تبصرہ قابلِ تحسین تھا۔ افتخار حسین صاحب آپ نے تو حسینوں کے دل ہی توڑ دیے اگر وہ ٹیک اپ میں ذرا لوئی لگتی ہیں تو پھر ابھی کیسے لگیں گی۔ ملک ریاض آصف صاحب آپ کا کہا سر آنکھوں پر مگر لاتوں کے بھوت باتوں سے کہاں مانتے ہیں ارے۔ رے۔ رے ثمینہ جی آپ کہاں بھاگی جا رہی ہیں ہماری بصیرت تو واپس کرتی جائیں ادھار مانگی چیز پر بھلا اس طرح قابض ہوتے ہیں۔ ویسے آپس کی بات ہے آپ کے پاس کوئی چیز اپنی بھی ہے۔ تڑپتی مچلتی شانی سسکتا ہوا اور گھٹتا ہوا رتم سیال دیوی اپنے کلائمکس کے عروج پر نظر آئی۔ اس دفعہ یقیناً ہماری طرح بہت سی آنکھوں میں منے کی بے بسی اور رتم کی بے بسی پر آنسو آئے ہوں گے۔ مستقبل شناس میں راؤ پرویز محبت کی پینگوں میں جھولتے نظر آئے۔ اس قسط میں اسٹوری تھوڑی سلو رہی۔ ابتدائی صفحات پر مودی صاحب کی دفینہ ایک عام سی تحریر تھی۔ دولت کے لالچ میں کس طرح انسان انسانیت کی سطح سے گر جاتا ہے اس کی عکاس اچھی کاوش تھی۔ انجام کچھ ادھورا سا محسوس ہوا۔ اب کچھ بات مختصر کہانیوں کی ہو جائے۔ مدیحہ شاہ کی مرینہ ایک دولت کے کدو سب اسی انجام کے مستحق تھے لیکن جزا و سزا کا اختیار تو صرف اسی قادر مطلق کو ہے۔ نیش زن ایک بدفطرت اور بدخصلت شخص کی کہانی جو سانپ کی طرح اپنی گندی فطرت سے مجبور تھا۔ بیگ صاحب کی الزام ذہانت سے بھرپور زبردست تحریر تھی۔ صدیقی صاحب کو آخر کار اپنا پرانا پیشہ اختیار کرنا پڑا۔ عزمو ایک بوڑھے کی عبرت آموز کتھا جو خود کو جوان سمجھ رہا تھا۔ تیمور شاہ کی استاد ایک شاہکار تھی۔ اپنے فن میں ماہر ایک استاد کی دلچسپ روداد نے دھوکا دی قطعاً پسند نہیں تھی۔ سرور حق کے رنگوں میں غلام قادر کی غریب راہ زبردست رہی بلکہ چھلکے انداز میں ایک چنچل تحریر جس نے بالکل بور نہ ہونے دیا۔ پہلا رنگ پھولوں کی طرز کی اسٹوری جس کا انجام آغاز سے پہلے نظر آ رہا تھا۔ تیمر ارنگ رہائی بھی کچھ خاص متاثر کن نہیں تھا۔

وقار احمد شیخ اپنے جامع تبصرے کے ساتھ کوٹ غلام محمد سے حاضر ہیں۔ "جولائی کے ابر آلود خوشگوار موسم میں "جاسوسی" کا ساتھ نصیب ہوا۔ ٹھنڈی و معطر خوشگوار ہواؤں کے ساتھ کچھ بھٹکی ہوئی بوندیں مزاج کو فرحت بخش رہی تھیں، ایسے میں اپنے عزیز ساتھی کو بھیگنے سے بچانے کے لیے دامن میں چھپائے گھر کی راہ لی۔ نارنجی رنگ کے بھڑکتے ہوئے سرورق سے مزین جاسوسی شوقِ تجسس کو ہوا دے رہا تھا۔ سرورق پر ایک بلیک شیڈ شخص چیختے ہوئے آدمی کے حلق میں فائر کرنے کا ارادہ رکھتا ہے جس کے کپڑوں سے ایک نازنین حسینہ کا ادھورا چہرہ جھلک رہا ہے۔ سرورق حقیقتاً جاسوسی طرز کا ہے۔ اشتہارات کو بھلاتے ہوئے فہرست کو شرف بخشتا ہے گرا لک ڈیزائنر نے نہایت خوبصورت انداز میں منفرد لک کے ساتھ ترتیب دیا تھا۔ چینی نکتہ چینی میں سب کی طرح انکل بھی لوڈ شیڈنگ و گرمی کے حوالے سے شکوہ کناں تھے، بہرحال اب تو موسم بہتر ہو چلا ہے۔ سرمد مشتاق انعام یافتہ قرار دیے جانے پر مبارکباد قبول فرمائیے۔ حماد احمد حیرت ہے آپ یہ قدر مشترک نہ پہچان پائے حالانکہ دیگر ساتھی بخوبی جان چکے ہیں۔ صہیب اختر ساحل آپ کی بات سے ہم متفق ہیں، پہلی حقیقتاً سادہ دل ہوتے ہیں، بے وقوفی والی بات تو محض چھیڑنے کے لیے تھی ویسے ہمارے کئی دوست پٹھان ہیں اور ان کی وفا شعاری اور غیرت مندی ہمارے نزدیک قابلِ ستائش ہے۔ ثمینہ حیات جی، آپ کا خیال غلط ہے، سرمد مشتاق اور ملک ریاض کو آپ کی پسندیدہ ندا ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ انعمی اقرا بزرگ نہایت جہاندیدہ ہوتے ہیں، بچوں کو ان کے تجربے سے فائدہ اٹھانا چاہیے، آپ کو بھی اپنی امی سے اتفاق کرنا چاہیے۔ ابتدائی صفحات پر مودی صاحب دفینہ تلاش کر رہے تھے۔ کہانی کی ابتدا نہایت تجسس خیز تھی لیکن غیر ضروری طوالت اور اختتام نے بور کیا۔ مدیحہ شاہ مرینہ کے علاج میں مصروف عمل تھیں، یہ انہیں طرز کی اس کہانی کا مرکزی خیال اچھا تھا لیکن اندازِ تحریر نے کہانی کو غیر دلچسپ بنا دیا۔ ابراہیم جمالی اس مرتبہ مال مفت سمیٹ رہے تھے، ہلکے پھلکے انداز کی اس تحریر..... نے بوریت کو دور کرنے میں مدد دی۔ زاہد گردیز کا نے ایک انوکھی عدالت سجائی جس میں شہزادے نے منصف کا کردار ادا کیا لیکن اس کے تمام تر فیصلے اپنی پسندی پر مبنی تھے، شہزادہ کا انجام جان کر مزید دکھ ہوا۔ مستقبل شناس کی چوتھی قسط شاندار رہی۔ راؤ پرویز کے ساتھ اس کے قریبی ساتھیوں کا کھیلے جانے والا کھیل ذہن کو الجھا گیا، اس اسرار کو جاننے کے لیے اگلی قسط کا انتظار رہے گا۔ شکیل صدیقی نے برن سے پھر پرانا پیشہ شروع کرا دیا۔ سچ ہے برائی کی طرف جانے کے کئی راستے ہیں لیکن واپسی ہر ایک کو نصیب نہیں ہوتی۔ کاشف زبیر نیش زن لیے موجود تھے، ڈاکٹر چرڈ جیسی قابلِ نفرین ہستی کے انجام پر دل افسردہ ہو گیا، کاش وہ اپنی صلاحیتوں کے ساتھ شخصیت کو بھی نکھارنے کی کوشش کرتا۔ تیمور شاہ نے اپنے آپ کو استاد ثابت

کرنے کی کوشش کی اور کسی حد تک کامیاب بھی رہے۔ مرزا ظفر بیگ الزام لگاتے نظر آئے، کہانی بہت زبردست انداز میں لکھی گئی اور کہیں بھی بوریت کا شکار نہیں ہونے دیا۔ ثمر عباس کا عزم تو کچھ خاص پسند نہیں آیا۔ سرورق کا پیلا رنگ نسرین حسام نے تحریر کیا۔ رفتہ رفتہ دلچسپی قائم کرتی یہ تحریر شک جیسے زہریلے موضوع پر لکھی گئی۔ سرمد کا کردار قابلِ رحم تھا جسے بے اعتباری کے بچھو نے کاٹ کر اس کی زندگی میں تلخیاں بھر دی تھیں۔ غلام قادر کی بھائی فریب راہ پہلے نمبر پر قرار پائی، مختلف موضوعات کو ایک کہانی میں سمیٹ کر معاشرتی مسائل اجاگر کرنا غلام قادر کا مخصوص انداز ہے۔ رضوانہ منتظر کی رہائی بالکل بھی پسند نہیں آئی، کہانی کو زبردستی گھسیٹا گیا جس سے جگہ جگہ کئی جھول محسوس ہوئے۔ لطائف و کارٹون مزیدار تھے۔"

شہباز ریاست علی "اوباڑو" سے لکھتی ہیں۔ "حسبِ معمول جاسوسی ہمارے دل کی دھڑکنوں کو تہ و بالا کرنے کے لیے تین تاریخ کو آن پہنچا۔ سرورق اپنی فطری روایات کو برقرار رکھتے ہوئے بہت منفرد سا تھا۔ لگتا ہے ذاکر انکل انگریزی اور ہارر مووی کچھ زیادہ ہی دیکھنے لگے ہیں۔ کم از کم مجھے تو ایسا ہی محسوس ہوا۔ سرورق کے پیچ و خم کے بعد اپنی محفل "ہاؤ ہو" میں بڑی شان سے پہنچے۔ سرمد مشتاق صاحب کا انعام یافتہ تبصرہ دیکھا پڑھا اور سوچا، کیا خوبصورت انداز بیاں ہے۔ لفظ کا چناؤ بھی دلچسپ تھا۔ مبارکباد تو دینی ہی پڑے گی۔ ذرا قبول فرمائیے۔ صہیب جی کوئی مجھے کسی بھی القابات سے پکار لے میری صحت پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا..... کیونکہ مجھے ان کو منہ توڑ جواب دینا آتا ہے۔ تبھی تو یہ لوگ بعد میں تلملاتے رہتے ہیں۔ ثمینہ حیات کا دلکش انداز بھی ہمارے سن کو خوب بھایا۔ نئے عدیل چوہدری کچھ زیادہ ہی اچھل کود کر رہے تھے۔ خیال رہے یہ شرلیوں کی محفل ہے۔ اپنا کرتب سرکس میں جا کر دکھائیں۔ باقی تبصرے بھی ٹھیک ٹھاک ہی تھے مگر ابن مقبول ایڈوکاٹ راحمہ اپنے جامع تبصرے سے چھائے رہے۔ کہانیوں کی طرف بڑھے تو سلسلے وار کہانی مستقبل شناس اپنی مخصوص اسپیڈ سے جاری و ساری ہے۔ اس مرتبہ الجھاؤ زیادہ رہا۔ ایکشن کی بھی کمی تھی۔ انکل ہم ذرا تمہرے مار دھاڑ کے شوقین، راؤ پرویز یہ سیدھا سادہ بندہ..... پلیز..... انکل راؤ پرویز کو بھی کرائے کے کچھ داؤ سکھا دیں۔ ویسے مستقبل شناس یوں بھی بہت اچھی ہے۔ طاہر جاوید مغل کی دیوی اک نئے موڑ پر پہنچ چکی ہے۔ پاروں طرف سے شانی پر مصیبتوں کے بادل منڈلا رہے ہیں۔ اب ہم چلتے ہیں اپنے موسٹ فیورٹ رنگوں کی طرف..... رنگوں میں تو ہماری جان ہے۔ جب رنگ ہماری پسند کے مطابق ہوں تو پھر کیا ہی کہنے۔ پہلا رنگ پھول جس میں مصنف نے اپنے قاری کو یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ مشکل سے مشکل وقت میں بھی سچائی کا دامن ہاتھ سے مت چھوڑیے اگرچہ سرمد نے سب کچھ دھوکے میں کیا لیکن پھر بھی اس کو کیے کی سزا ملی۔ کہانی کا اینڈ پرفیکٹ تھا جس کو پڑھ کر مزہ آیا۔ دوسرے رنگ میں صنم عرف "ببول کے درخت" کی دیدہ دلیری پسند آئی ہر لڑکی کو صنم کی طرح منصوبہ کردار کا حامل ہونا چاہیے۔ کہتے ہیں پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں..... اسی طرح ہر لڑکی کی فطرت بھی مختلف ہوتی ہے۔ کچھ رخشی کی طرح برائی کا سورج بھی ہیں۔ اچھائی کی جیت اور برائی کی ہار ازل سے ابد تک جاری رہے گی۔ کہانی کا پلاٹ اور کردار بہت جاندار تھے جنہوں نے لمحہ بھر کے لیے بھی بور نہیں ہونے دیا۔ تیسرے رنگ رہائی میں مصنف نے چالباز سیاست داں کے کرتوت سے پردہ اٹھایا۔ ثمر عباس صاحب نئے انداز سے آئے اور عزمو کے ساتھ چھا گئے۔ الزام مرزا ظفر بیگ کی سپر ہٹ کا وش رہی..... جیسے جیسے ہم کہانی کو پڑھتے گئے۔ ویسے ہی ہماری آنکھیں تجسس سے پھیلتی گئیں..... آخر دم تک ہم اسی سوچ میں گم رہے کہ آیا قاتل ہے کون۔ مگر اس کے برعکس پیٹر اسٹیل نے عمدگی سے کیس کو مکمل کیا..... اور فریک کو پکڑا..... ہم اش اش کہہ اٹھے۔ تیمور شاہ کے قلم سے لکھی ہوئی استاد دو پودوں کی کہانی تھی۔ ہر کام کے کرنے کا کوئی نہ کوئی اصول ہوتا ہے اگر اصولوں پر عمل پیرا ہو کر کام انجام دیا جائے تو کامیابی یقیناً اس کا ساتھ دیتی ہے۔ عمیر انکل اچھا اور بہترین لکھنے پر دیل ڈن..... دنیا لوگوں کا ہجوم ہے۔ اس ہجوم میں ہر شخص دوسرے سے مختلف عادات و خصائل کا مالک ہوتا ہے۔ نیش زن میں ڈاکٹر چرڈ نے اپنے عمل و فعل سے ہمیشہ دوسروں کو ستایا۔ ان ہستیوں کو بھی دکھ کی گہرائیوں میں دھکیلا جنہوں نے ڈاکٹر کو ہمیشہ سکھ پہنچانے کی کوشش کی۔ عدالت کو پڑھ کر ہم بہت دکھی ہوئے۔ ذرا سی بے اعتباری سے اچھے بھلے شخص کی زندگی برباد ہو گئی۔ سب سے بیسٹ محمود احمد کی اسٹوری دفینہ رہی۔ جس نے آخر تک تجسس کی ڈور کو تھامے رکھا۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا اس رسالے کی سب سے اچھی کہانی رہی۔ محمود انکل ویری نائس، ویری گڈ، ویل ڈن۔ ہم بہت خوش ہوئے۔"

ان قارئین کے اسمائے گرامی جن کے محبت نامے شاملِ اشاعت نہ ہو سکے۔

اللہ دتہ صابر، سینٹرل جیل ساہیوال۔ فیصل اقبال، گوجرانوالہ۔ محمد احمد اقبال، سرگودھا۔ ملک نعمی شیر علوی، خوشاب۔ صنم بلوچ، ڈی جی خان۔ ساجد، بہاولنگر۔ فہد علی، آزاد کشمیر۔ ایم اختر نیا، فیصل آباد۔ رانا عبداللہ، ملتان۔ ملک عبدالودود، آزاد کشمیر۔ طارق محمود، فیصل آباد۔ ابن مقبول جاوید احمد صدیقی، راولپنڈی۔ صہیب اختر ساحل، مردان۔ زمیر وزیر وزیر، لاہور۔ عدیل چوہدری، چک ۳۸۔ رحمٰن علی تصور، صوابی۔ محمد غفار، کراچی۔ شہباز عمرانی، سعید آباد۔ ملک جنید ثاقب بلہ، گنگ۔ جمر نا، ملتان۔ محمد اقبال، کھاریاں۔ محمد نواز حیدر، ایمن آباد۔ واجد علی چوہان۔ دیپالپور۔

قارئین! چینی نکتہ چینی کے لیے مخصوص صفحات کا کوٹا تمام ہوا۔ آئندہ ماہ تک کے لیے اجازت دیجئے۔ بشرطِ زندگی پھر ملاقات ہوگی، محبتوں، چاہتوں، مہربانیوں اور شکایتوں کے اسی صدر راہے پر..... خدا حافظ!

انتباہ

جاسوسی ڈائجسٹ میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بہ صورتِ دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔

* تمام اشتہارات نیک نیتی کی بنیاد پر شائع کیے جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں ادارہ کسی بھی طرح ذمے دار نہ ہوگا۔

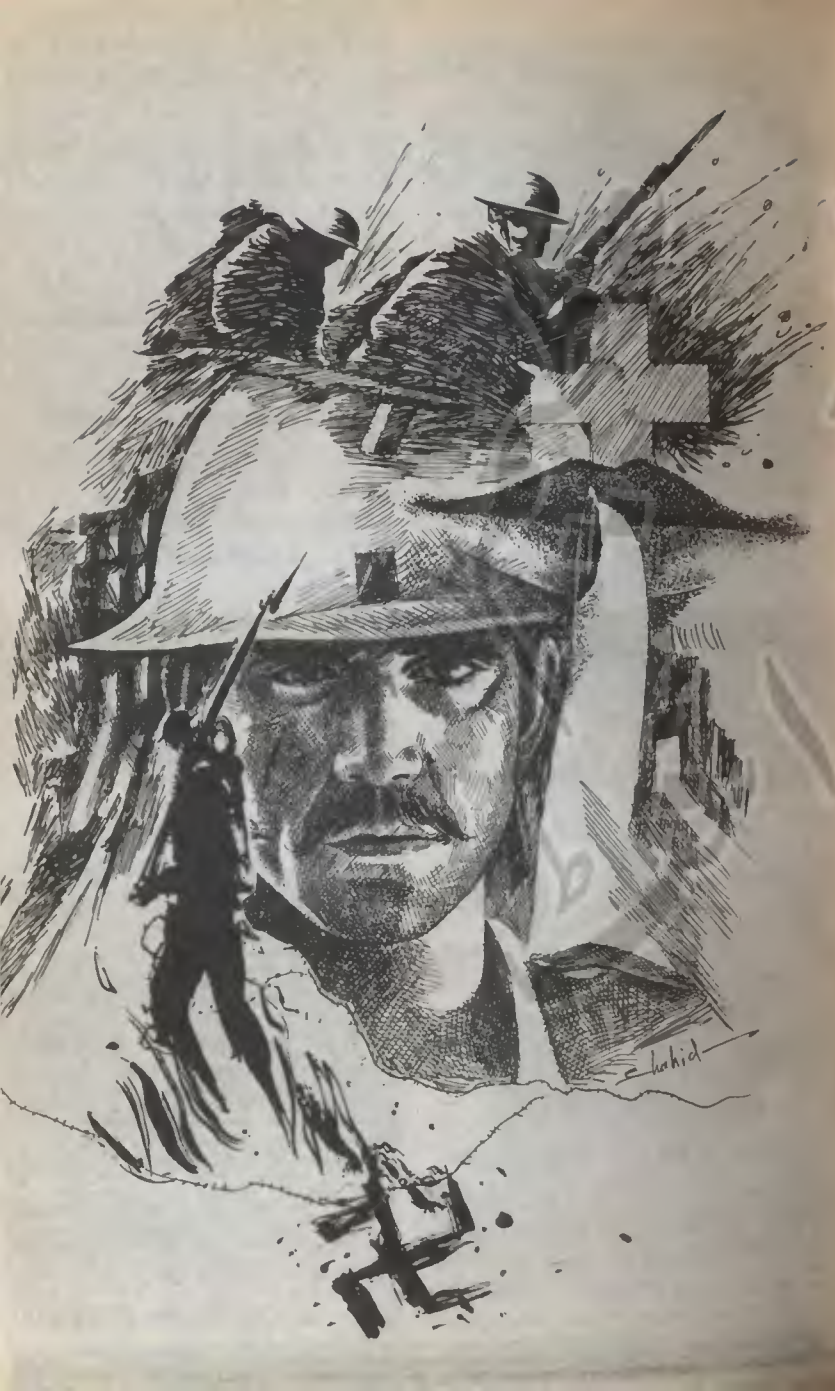

خون اور پانی

مریم کے خان

کسی بھی ملک کی سرحدوں پر جب بھی زندگی کے سلسلے کو توڑا جاتا ہے تو گھروں میں جگمگاتی روشنیاں تیرگی میں بدل جاتی ہیں۔ ہرے بھرے کھیت، قحطِ آب کی نذر ہو جاتے ہیں۔ درختوں سے پرندوں کی ڈاریں اڑ کر گمنام جزیروں کا رخ کر کے واپسی کا راستہ بھول جاتی ہیں۔ فضاؤں میں امن کی جگہ جنگ اور دھوئیں کے زخم پھیلنے لگتے ہیں۔ اور وطن پرستوں کی آہنی صفیں دشمنوں کے خوفناک و خونیں ہتھیاروں سے کھوکھلی ہو کر رہ جاتی ہیں۔

جنگ عظیم کے پس منظر میں لکھی گئی تحریر۔۔۔ ہر شخص بقائے حیات کی جنگ جیت لینا چاہتا تھا

زمان خان کی نظروں کے سامنے ایک جنگی طیارے نے غوطہ لگایا اور اس سے نکلے بموں نے دو شرمن ٹینکوں کو بکھیر کر رکھ دیا۔ اس کے چاروں طرف ایک طرح سے قیامت برپا تھی۔ طیاروں کی تیز گونج، گولیوں کی تڑتڑاہٹ اور بموں کے لرزہ خیز دھماکوں کے ساتھ مرنے اور زخمی ہونے والے انسانوں کی چیخ و پکار جاری تھی۔ دس منٹ پہلے وہ پُرسکون انداز میں صحرا میں محوِ سفر تھے کہ اچانک ہی جرمن طیارے بلائے ناگہانی کی طرح نازل ہو گئے۔ وہ اتنی نیچی پرواز کر کے آئے تھے کہ جب تک بالکل سر پر نہ پہنچ گئے ان کے آنے کا پتا نہیں چلا تھا۔

درجن بھر نازی طیارے ایک دوسرے سے الگ ہو کر فضا میں بلند ہوئے اور پلٹ کر غوطہ لگاتے ہوئے عین ان کے اوپر اپنے پروں تلے بموں کا بوجھ ہلکا کر دیا۔ سو پاؤنڈز وزنی بم سنسناتی آواز کے ساتھ برسے اور پلک جھپکنے میں شعلے بھڑک اٹھے تھے۔ بمباروں کی ایک ٹکڑی اپنا کام کر کے اوپر اٹھتی تو اس کے عقب میں دوسری فارمیشن حملے کے لیے تیار تھی۔ قافلے والے اولین حملے کے لیے بھی تیار نہیں تھے۔ قافلے کی دو واحد طیارہ شکن گنیں ٹرکوں پر بار تھیں۔ ان میں سے ایک ٹرک پہلے حملے کا نشانہ بن چکا تھا اور دوسرے ٹرک پر نصب طیارہ شکن گن کو اس کا عملہ تیار کر رہا تھا۔ البتہ شرمن ٹینکوں پر لگی محدود فائر والی مشین گنیں طیاروں پر گولیاں برسا رہی تھیں۔ قافلے میں دس عدد شرمن ٹینک بھی شامل تھے۔ ان میں سے دو اولین حملے کا نشانہ بن چکے تھے۔ مزید دو ٹینک اگلے حملے میں کام آ گئے۔

جرمن طیاروں کا انداز اور سرعت سے کیا جانے والا حملہ دیکھتے ہی زمان خان کے ذہن میں خیال آیا تھا کہ یہ حملہ سو فیصد درست اطلاع کی وجہ سے ہوا ہے۔ یا تو کسی جرمن آبزرور طیارے نے بلندی سے انہیں صحرا میں سفر کرتے دیکھ لیا تھا یا پھر ان کے قافلے میں کوئی جرمن جاسوس تھا۔ طیارے چار چار کی ٹکڑیوں میں حملہ کر رہے تھے۔ ہر حملے میں انہوں نے نصف بم گرائے تھے اس لیے جب تیسری ٹکڑی نے بھی اپنا مہلک بوجھ قافلے پر ہلکا کر دیا تو پہلی ٹکڑی پھر سے بم برسانے کے لیے تیار تھی۔ چھ شرمن ٹینک، بارہ بڑے ٹرکوں میں سے سات ٹرک اور متعدد چھوٹے ٹرک اور گاڑیاں شعلوں کی زد میں تھیں یا پرزے پرزے ہو کر بکھر گئی تھیں۔ اس کھلے اور ہموار صحرا میں چھپنے کی کوئی جگہ نہیں تھی۔ پہلی ٹکڑی نے اپنے باقی ماندہ بم بھی پھینکے اور مشین گنیں سنبھال کر پناہ کے لیے دیوانہ وار بھاگتے انسانوں پر گولیاں برسانے لگیں۔

بیس ایم ایم کی مہلک دو مشین گن کی گولی ایک انچ موٹی فولادی پٹی کو پھاڑ کر گزر جاتی تھی۔ انسانی جسم اس کے سامنے کوئی حیثیت ہی نہیں رکھتا تھا۔ انسان کٹ کٹ کر گرنے لگے۔ ہر طرف ریت خون سے سرخ ہو رہی تھی۔ شعلے، آگ، خون اور دھواں چاروں طرف بس یہی تھا۔ بموں کے دھماکوں سے اُڑنے والی ریت نے رہی سہی کسر پوری کر دی تھی۔ چند گز سے آگے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔

زمان خان اس جیپ کے پاس کھڑا تھا جس پر وہ سفر کر رہا تھا اور اب تک حملے میں اسے خراش بھی نہیں آئی تھی حالانکہ اس نے چھپنے یا پناہ لینے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس کا ڈرائیور تارہ سنگھ دس قدم..... بھاگ سکا تھا۔ اس کے بعد ایک تباہ ہونے والے ٹینک کا فولادی ٹکڑا اس کے سر پر لگا تھا اور وہ وہیں وفات پا گیا تھا۔ عقبی نشستوں پر بیٹھے چار سپاہی نہ جانے کہاں تھے۔ زندہ بھی تھے یا مر چکے تھے۔ واحد بچ جانے والی طیارہ شکن گن سے چند ایک راؤنڈ فائر ہوئے تھے کہ دو بموں نے اس ٹرک کے بھی پرخچے اُڑا دیے۔

صرف دو شرمن ٹینک باقی بچے تھے جن پر لگی مشین گنیں مدافعت کر رہی تھیں مگر یہ طیاروں کے خلاف غیر مؤثر تھیں۔ ان کی حرکت پذیری محدود تھی اور جس رینج میں یہ فائر کر سکتی تھیں جرمن طیارے اس حد سے پلک جھپکنے میں گزر جاتے تھے۔ زمان ایک ٹینک کی طرف بڑھا۔ اس میں قافلے کا کمانڈر میجر پارکر تھا۔ روانگی کے وقت زمان نے اسے تجویز پیش کی تھی کہ بڑے ٹرکوں اور ٹینکوں کو پھیلا کر رکھا جائے تاکہ کسی فضائی حملے کی صورت میں انہیں نشانہ بنانا آسان نہ ہو مگر پارکر نے یہ تجویز مسترد کر دی تھی۔ اسے ٹینکوں کی کلاسیکی فارمیشن پسند تھی لہٰذا قافلے میں سب سے آگے دس شرمن ٹینک پانچ پانچ کی دو قطاروں میں پاس پاس چل رہے تھے جبکہ بھاری ٹرک عقبی حصے میں ایک قطار میں تھے۔ ان پر اسلحہ، ایمونیشن، سامان رسد اور اس صحرا میں سب سے اہم شے پانی لدا تھا۔ درجن بڑے ٹرکوں کے علاوہ بیس عدد چھوٹے ٹرک تھے جن میں سے ہر ایک میں چالیس سپاہی سوار تھے۔ درجن بھر جیپیں اور دوسری گاڑیاں تھیں۔

جہاں تک نظر جاتی تھی، زمان خان کو ایک بھی پہیوں پر چلنے والی چیز صحیح سلامت نظر نہیں آ رہی تھی۔ وہ دھوئیں اور ریت کے غبار سے گزرتا ٹینک تک پہنچا۔ اس کا مشین گن ٹاپ پر اوندھے منہ پڑا تھا۔ ایک گولی اس کے شانوں کے درمیان سے گزر گئی تھی۔ جرمن طیارے اب بھی جھپٹ رہے تھے۔ گولیاں بچ جانے والے افراد کا لہو چاٹ رہی تھیں۔ زمان خان نے مردہ سپاہیوں کو ایک طرف دھکیلا اور خود مشین گن سنبھال لی۔ ٹینک اس طرح کھڑا تھا کہ گنر درست طریقے سے طیاروں کو نشانہ بنا نہیں سکتا تھا۔ زمان نے چلا کر ڈرائیور کو ٹینک کی سمت بدلنے کو کہا۔ ڈرائیور جو شاید اب تک سکتے میں تھا، چونکا۔ اس نے ٹینک کو حرکت دی۔ زمان نے مشین گن کی نال اوپر کی اور سامنے سے گزرتے طیارے پر برسٹ مارے مگر طیارہ نکلتا چلا گیا۔ ایک طیارہ دائیں طرف سے گولیاں برساتا آ رہا تھا۔ زمان نے ٹینک کو دائیں طرف مڑنے کو کہا۔ ٹینک آہستگی سے دائیں طرف گھومنے لگا۔ زمان کی انگلیاں ٹریگر پر جم گئیں۔ گولیاں طیارے کے پہلو اور پر پر لگیں اور فوراً ہی اس سے دھواں اٹھنے لگا تھا۔ زخمی طیارے نے بلند ہونے کی کوشش کی لیکن پھر اس کی ہمت جواب دے گئی اور وہ منہ کے بل ایک دھڑ ادھڑ جلتے ٹرک میں جا گھسا۔ گویا اپنی لگائی آگ میں کود گیا۔ دھماکے سے طیارے اور ٹرک دونوں کے پرزے بکھر گئے تھے۔

زمان کے پاس فتح کا جشن منانے کا وقت نہیں تھا۔ اس نے مشین گن پر گولیوں کا نیا باکس لگایا اور پھر سے جرمن طیاروں کو نشانہ بنانے کی کوشش کرنے لگا مگر ایک طیارے کی تباہی نے ان کے حوصلے پست کر دیے تھے۔ طیارے اپنا بیشتر ایمونیشن صرف کر چکے تھے۔ سب سے بڑھ کر ان کا حملہ انتہائی کامیاب رہا تھا۔ اس کا ثبوت قافلے کے جلتے ہوئے ٹینک، گاڑیاں اور چاروں طرف بکھری لاشیں تھیں لہٰذا انہوں نے واپسی کا فیصلہ کر لیا۔ ایک ایک کر کے وہ فضا میں بلند ہوئے اور فارمیشن بناتے ہوئے شمال مغرب کی طرف آسمان پر غائب ہو گئے۔ نزدیکی ٹینک سے اٹھنے والا دھواں براہِ راست زمان کی طرف آ رہا تھا اور اس کے لیے سانس لینا دشوار ہو رہا تھا۔ کھانستے ہوئے وہ نیچے اترا اور ڈرائیور والے خانے سے ٹینک کے اندر جھانکا۔

''میجر کہاں ہے؟''

''میں یہاں ہوں۔'' پارکر کی آواز آئی۔

''سر! کیا آپ باہر آ کر قافلے کا حال دیکھنا پسند کریں گے؟'' زمان خان کے لہجے میں طنز تھا۔

☆☆☆

بارہ نومبر 1942ء کے دن اسکندریہ سے روانگی کے بعد ان کا بیشتر وقت سفر میں گزرا تھا۔ عام طور سے بارہ گھنٹے کے سفر کے بعد وہ بارہ گھنٹے آرام کرتے تھے۔ کیپٹن زمان خان دو روز قبل ہی ہندوستان سے دو سو افراد پر مشتمل دستے کے ہمراہ اسکندریہ کی بندرگاہ پر اترا تھا۔ اس کے دستے کے

نصف سے زیادہ ارکان ایک اور کمپنی میں شامل کر کے بحری راستے سے یورپ کی طرف روانہ کر دیے گئے تھے جہاں جنگ عظیم دوم پورے عروج پر تھی اور نازی جرمن یورپ کے بیشتر حصے میں قابض ہونے کے بعد روس میں پیش قدمی کر رہے تھے۔ ہر محاذ پر افرادی قوت کی اشد ضرورت تھی۔ فرانسیسی اور برطانوی فوج کا بیشتر حصہ جرمنوں کی قید میں جا چکا تھا۔ اُدھر ایشیا میں ایک بہت بڑی انگریز فوج جاپانیوں کے سامنے ہتھیار ڈال چکی تھی لہٰذا فوج کی کمی کو پورا کرنے کے لیے اپنی کالونیوں سے برطانیہ بے دریغ فوجی بھرتی کر رہا تھا۔ خاص طور سے ہندوستان بھرتی کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ پہلی جنگ عظیم میں بھی انگریزوں نے لاکھوں ہندوستانیوں کو جنگ کا ایندھن بنایا تھا اور دوسری جنگ عظیم میں بھی لاکھوں سپاہی جوان اور افسر گوروں کی آپس کی جنگ میں قربان ہونے کے لیے جا چکے تھے۔

زمان خان پشاور کے ایک جج ثنا اللہ خان کا بیٹا تھا۔ ثنا اللہ خان ان چند اولین پختونوں میں سے ایک تھا جس نے برطانیہ جا کر قانون کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی۔ زمان خان اس کی پانچویں اولاد تھا اور اس نے باپ کے کہنے پر فوج میں شمولیت اختیار کی تھی لیکن ایسا کرتے وقت اس نے سوچا نہیں تھا کہ اسے انگریز کے مفادات کی جنگ بھی لڑنا پڑے گی۔ آرمی آفیسر ہونے کے ناتے وہ مکمل کر اپنے سیاسی عزائم کا اظہار نہیں کر سکتا تھا لیکن اندر سے وہ دل و جان سے تحریکِ پاکستان کا حامی تھا۔ قرارداد پاکستان پیش ہوتے ہی اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ جب پاکستان وجود میں آئے گا وہ اس کی فوج میں شامل ہو گا۔

دہرہ دون میں ٹریننگ کے بعد اسے انڈین رائفلز میں کمیشن ملا تھا لیکن بعد میں اس نے اپنا تبادلہ کیولری میں کرا لیا۔ بکتر بند مشینوں سے اسے شروع سے دلچسپی تھی۔ 1942ء میں اس کی رجمنٹ آسام میں تھی جہاں جاپانی حملے کا خدشہ روز بروز بڑھتا ہی جا رہا تھا مگر اس سال کے وسط میں اسے اشارے ملنا شروع ہو گئے تھے کہ اس کے دستے کو افریقہ روانہ کر دیا جائے گا۔ اگرچہ فوجی اور جنگی خبروں پر سخت سنسر شپ تھی۔ اس کے باوجود انہیں اطلاعات ملتی رہتی تھیں۔ یورپ میں اتحادیوں کو بے بس کرنے کے بعد اب جرمن افریقہ میں پیش قدمی کر رہے تھے۔ لیبیا پر اٹلی کا قبضہ تھا جو جرمن اتحادی تھا۔ اس کے توسط سے جرمن فوج رومیل کی قیادت میں افریقہ میں داخل ہوئی اور پھر سیلاب کی طرح چاروں طرف پھیلنے لگی۔ مغرب میں اس کا ہدف جبرالٹر تھا تو

گھر صحرا سے بدتر ہے

جو اولاد نہیں ہے

آج بھی ہزاروں گھرانے اولاد کی نعمت سے محروم سخت پریشان ہیں۔ اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہوں کیونکہ مایوسی تو گناہ ہے۔ نقص چاہے خاتون میں ہو یا مردانہ جراثیم کا مسئلہ ہم نے دیسی طبی یونانی قدرتی جڑی بوٹیوں سے ایک خاص قسم کا بے اولادی کورس ایجاد کیا ہے جس کے استعمال سے آپ کے آنگن میں بھی خوشیوں کے پھول کھل سکتے ہیں آپ کے ہاں بھی خوبصورت بیٹا پیدا ہو سکتا ہے آج ہی گھر بیٹھے ہم سے فون پر رابطہ کریں اور بذریعہ ڈاک وی پی (V.P) بے اولادی کورس منگوا لیں۔

رجسٹرڈ

المُسلم دارُالحکمت

ضلع و شہر حافظ آباد ـــــ پاکستان

0300-6526061
0547-521787
0547-522468

اوقات فون: صبح 9 بجے سے دوپہر 2 بجے تک، عصر 4 بجے سے رات 11 بجے تک

آپ ہمیں صرف فون کریں۔ بے اولادی کورس آپ تک پہنچانا ہمارا کام ہے۔

مشرق میں اس کی نظریں نہر سوئز پر مرکوز تھیں کیونکہ ان دو کناروں پر قبضہ کر کے جرمن پورے بحیرۂ روم پر قابض ہو جاتے۔ مشرقِ بعید کی کالونیاں آرام سے جاپان کے حوالے کر دینے والے برطانوی مصر کے دفاع کے لیے سر دھڑ کی بازی لگائے ہوئے تھے۔ سر ان کا تھا اور جسم غلام اقوام کا۔

نومبر کے آغاز میں زمان خان اور اس کی پلاٹون کو مصر روانگی کا حکم مل گیا تھا۔ وہ بہ عجلت ایک بحری جہاز پر کلکتہ سے سوار ہوئے اور رکے بغیر اسکندریہ جا کر دم لیا ہی تھا کہ زمان خان کی پلاٹون کو تتر بتر کر کے مختلف جگہوں پر روانہ کر دیا گیا۔ زمان خان اور اس کے ساتھ تقریباً پچاس افراد کو میجر پارکر کی کمپنی میں شامل کر کے لیبیا میں ایک محاذ کی طرف روانہ کر دیا گیا تھا۔ روملی کے دستے طوفانی رفتار سے مصر کی جانب پیش قدمی کر رہے تھے۔ اسے روکنے اور اُلجھانے کے لیے برطانوی فوج نے جابجا محاذ بنائے تھے مگر اس کی یہ حکمتِ عملی مؤثر ثابت نہیں ہو پائی تھی۔ جرمن اِدھر اُدھر کے محاذوں پر اُلجھنے کے بجائے پیش قدمی کو ترجیح دے رہے تھے۔ اگر راہ میں اتحادی فوج حائل ہو جاتی تو اس سے کترا کر نکل جاتے۔ اگر ایسا کرنا ممکن نہ ہوتا تو اپنے ساتھ موجود اطالوی فوج کو جنگ پر لگا دیتے اور خود پیش قدمی جاری رکھتے۔ اِدھر اُدھر بکھری اتحادی فوج سے زمینی جنگ کے بجائے وہ صرف فضائی حملوں سے اسے تباہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ یہ ساری صورتِ حال زمان خان کے علم میں مصر پہنچتے ہی آ چکی تھی۔ اسکندریہ کے شراب خانے برطانوی فوج سے بھرے ہوئے تھے اور پارٹیوں میں کھلے عام جنگ کی صورتِ حال پر بحث ہوتی تھی۔ میجر پارکر سے اپنی پہلی میٹنگ میں اس نے زور دیا تھا کہ انہیں فضائی حملے کی طرف سے زیادہ چوکنا رہنا چاہیے۔

میجر پارکر بھی انڈین کیولری سے تعلق رکھتا تھا اور وہ انسٹرکٹر بھی رہا تھا لہٰذا اسے فضائی معرکوں کی نسبت زمین پر لڑی جانے والی جنگ سے زیادہ دلچسپی تھی۔ دوسرے وہ متعصب قسم کا گورا تھا۔ ہندوستانیوں کے بارے میں اس کا خیال تھا کہ وہ حقیر اور کمتر نسل کے لوگ ہیں جن کی زندگی کا مقصد ہی انگریزوں کی غلامی کرنا ہے۔ ممکن ہے یہی مشورہ اسے اس کا ہم وطن سیکنڈ اِن کمانڈ کیپٹن جونز دیتا تو وہ اسے قابلِ اعتنا سمجھتا بھی مگر زمان خان کی بات سن کر اس نے حقارت سے کہا۔

''اگر تم اتنے ہی بزدل ہو تو تمہیں ہندوستان سے آنے سے ہی انکار کر دینا چاہیے تھا۔''

فوجی تربیت نے زمان خان کو خاصا ٹھنڈے مزاج کا بنا دیا تھا مگر بزدلی کا طعنہ سن کر اس کا پٹھان خون رگوں میں کھول گیا۔ اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

''سر! میں نے پسپائی کا حکم نہیں دیا اور نہ ہی میں پسپائی کو فتح قرار دیتا ہوں۔ میں نے ممکنہ حفاظتی انتظامات کی بات کی ہے۔ جرمنوں کی فضائیہ زمین پر حملے کرنے میں مہارت رکھتی ہے۔''

''میں نے تمہیں یہاں دشمنوں کا قصیدہ پڑھنے کے لیے نہیں بلایا ہے۔'' زمان خان کی بات نے پارکر کو آتش زیرِ پا کر دیا تھا۔ جرچل نے فرانس سے انگریز فوج کی رسوا کن پسپائی کو الفاظ کے الٹ پھیر سے فتح بنا دیا تھا۔ زمان خان نے اسی طرف اشارہ کیا تھا۔

''میں نے یہ بتانے کے لیے تم سب کو بلایا ہے کہ میں جس دستے کا انچارج ہوتا ہوں' اس کے ایک ایک فرد سے مکمل اطاعت چاہتا ہوں۔''

''یس سر! سب سے کہا تھا۔'' زمان خان نے اس وقت سمجھ لیا تھا کہ اس افسر کی ماتحتی میں اس کے لیے آئندہ بھی نازک مقامات آتے رہیں گے۔ میجر پارکر کی زیرِ کمان ایک بھان متی کے کنبے کی طرح جوڑ جاڑ کر بنائی گئی کمپنی تھی جن میں اکثریت افریقی نژاد باشندوں کی تھی جنہیں برطانیہ کے افریقی مقبوضات سے بھرتی کیا گیا تھا۔ زمان خان سمیت پچاس ہندوستانی تھے جن میں صرف دو مسلمان تھے یعنی زمان خان اور اس کا اردلی گل شیر، باقی سکھ تھے یا پھر ہندو۔ انگریزوں کے علاوہ فرانسیسی رضا کار بھی اس دستے میں شامل تھے۔ ان کے علاوہ آسٹریلیا کی پانچ عدد نرسوں اور دو ڈاکٹروں پر مشتمل میڈیکل ٹیم بھی تھی۔ یہ سب نرسیں حسین اور جوان العمر تھیں مگر زیادہ تر اپنے خیمے میں محدود رہا کرتی تھیں۔ انہیں کمپنی کے لوگوں سے گھلنے ملنے کی ممانعت تھی مگر اکثر میجر پارکر کے خیمے میں جمنے والی محفلوں میں ان کی شرکت لازمی ہوا کرتی تھی۔

روانگی کے دوسرے دن رات جب زمان خان رفع حاجت کے لیے نزدیک ہی گیا تھا تو اس کی پنڈلی پر کسی زہریلے کیڑے نے کاٹ لیا تھا۔ واپس آتے آتے درد سے اس کا برا حال ہو گیا۔ اس نے طبی مقاصد کے لیے مخصوص خیمے کا رُخ کیا۔ وہاں موجود ڈاکٹر نے کسی قدر سرد مہری سے اس کا معائنہ کیا اور نرس کو آواز دی۔ ''شیلا! پیاز کا سرکہ لے آؤ۔''

شیلا خیمے کے اندرونی حصے سے برآمد ہوئی۔ نرس کے مخصوص یونیفارم میں اس کے وجود کی دلکشی نمایاں تھی۔ سنہری مائل سرخ بال اور نازک سا ناک نقشہ تھا خاص طور سے اس کی ہلکی سی نیلی آنکھیں تاثرات سے بھرپور تھیں۔ عمر اکیس بائیس برس سے زیادہ نہیں تھی۔ اس نے زمان خان کی طرف دیکھا اور مسکرائی۔ ''کیپٹن! ڈنک کہاں لگا ہے تمہیں؟''

زمان نے اپنا پاؤں آگے کر دیا۔ شیلا نے روئی میں تر کر کے پیاز کا سرکہ ڈنک والی جگہ پر لگایا۔ نہ جانے یہ دوا کا اثر تھا یا شیلا کے نازک ہاتھوں کا۔ زمان نے فوری طور پر درد میں افاقہ محسوس کیا۔ ''تھینک یو نرس! یہ درد بڑا ظالم تھا۔''

''صحرا میں پائے جانے والے کیڑوں کا زہر بہت درد کرتا ہے۔'' شیلا نے مزید سرکہ لگا کر زخم پر رکھا۔ ''میں خود بھی صحرا کی رہنے والی ہوں۔ وہاں ہمارا واسطہ آئے دن زہریلے کیڑوں سے پڑتا تھا۔''

''آسٹریلیا میں صحرا ہوتے ہیں؟'' زمان نے بناوٹی حیرت سے کہا حالانکہ اسے معلوم تھا کہ آسٹریلیا کا بڑا رقبہ صحرا پر مشتمل ہے۔ شیلا کھلکھلا کر ہنس دی۔

''کیپٹن! تم کس دنیا میں رہتے ہو۔ یہ بات تو جغرافیہ پڑھنے والا ایک بچہ بھی جانتا ہے۔''

''بشرطیکہ وہ بچہ کسی آزاد اور ترقی یافتہ ملک میں رہتا ہو۔'' زمان نے کسی قدر تلخ لہجے میں کہا۔ ''ہندوستان میں بچوں کو یہ نہیں پڑھایا جاتا ہے۔''

شیلا کچھ دیر خاموشی سے کام کرتی رہی پھر آہستہ سے بولی۔ ''دیکھنے میں تم ہندوستانی نہیں لگتے۔ وہ تو کالے یا سانولے رنگ کے ہوتے ہیں۔''

''سب نہیں ہوتے۔ ان میں بھی سفید لوگ ملتے ہیں۔ میرا تعلق ایک پٹھان قبیلے سے ہے۔ ہم سرخ و سفید ہوتے ہیں۔''

سرکے سے تر روئی ہٹا کر شیلا نے ایک جاذب پٹی اس کے زخم پر چپکا دی تاکہ وہ رفتہ رفتہ زخم کا زہریلا مواد چوستی رہے۔ ''کل صبح روانگی سے پہلے آ کر پٹی بدلوا لینا۔''

''شکریہ شیلا!'' زمان بولا اور بادلِ ناخواستہ وہاں سے چلا آیا۔ ان چند لمحوں میں وہ شیلا سے انسیت محسوس کرنے لگا تھا لیکن اسے پسند یا محض جنس کی قربت کی خواہش نہیں کہا جا سکتا تھا۔ شیلا اس کے نامعلوم احساسات کو اچھی لگی تھی۔ صبح روانگی سے پہلے اس نے پٹی تبدیل کرا دی تو تبدیل کرنے والی نرس نے زخم دیکھ کر کہہ دیا تھا۔ ''اب اس کی ضرورت نہیں پڑے گی کیپٹن!''

مگر زمان خان اس کے باوجود شیلا سے ملنے کی امید میں میڈیکل ٹینٹ میں جا پہنچا تھا۔ حسبِ توقع شیلا ڈیوٹی پر تھی اور باقی نرسیں میجر پارکر کے خیمے میں تھیں۔ اس قسم کی محفلوں میں کیپٹن جونز اور بعض گورے لیفٹیننٹ بھی شریک ہوتے تھے لیکن کبھی بھی زمان خان یا کسی دوسرے سفید فام کو میجر نے دعوت نہیں دی تھی۔ شیلا نے پٹی اتار کر زخم دیکھا اور مسکرا کر بولی۔

''کیپٹن! میرا خیال ہے تمہیں صبح ہی بتا دیا ہوگا کہ اب پٹی کی ضرورت نہیں ہے۔''

''بتایا تو تھا۔'' زمان نے اعتراف کیا۔ ''لیکن میں نے سوچا ایک بار اور پٹی کرا لینے میں کیا حرج ہے؟''

''ضرورت نہیں ہے۔ زخم خشک ہو چکا ہے۔'' شیلا نے بتایا۔ ''اب مزید ضرورت نہیں ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ پھر میں تم سے ملنے اور کس بہانے سے آؤں؟'' وہ سادگی سے بولا تو شیلا شرما گئی۔

''میں آٹھ بجے ڈیوٹی پر آتی ہوں۔ اس سے پہلے آف ہوتی ہوں۔''

''یعنی سفر میں ملاقات ہو سکتی ہے۔''

''یہ ممکن نہیں ہے کیونکہ ہم نرسز جس وین میں سفر کرتی ہیں اس میں کوئی اور نہیں آ سکتا ہے۔''

''تم میجر پارکر کی محفل میں نہیں جاتیں؟'' اس نے آہستہ سے پوچھا۔

وہ دوا کے ڈبے رکھنے لگی۔ ''مجھے شوق نہیں ہے۔ شراب میں پیتی نہیں۔'' اس نے کچھ دیر بعد جواب دیا۔ ''حالانکہ میجر نے کئی بار دعوت دی۔''

''میجر ایسے کسی شخص کو پسند نہیں کرتا جو اس کی کسی بات کو رد کر دے۔''

''میں نے کب کہا کہ وہ مجھے پسند کرتا ہے۔'' شیلا دھیمے لہجے میں بولی۔ ''ڈونٹ مائنڈ کیپٹن! مجھے کام کرنا ہے۔''

''اوہ! کیوں نہیں۔'' زمان گڑبڑا کر اٹھ گیا۔

چوتھے دن وہ ایک مستقر پر رکے تھے۔ وہاں سے پانی اور ایندھن کا ذخیرہ لے کر آگے روانہ ہوئے تھے۔ چھٹے دن وہ لیبیا کے اندرون صحرا میں محوِ سفر تھے۔ طرابلس شمال مغرب میں بارہ سو میل کے فاصلے پر تھا اور یہ علاقہ جرمنوں سے بھرا پڑا تھا۔ زمان نے ایک بار پھر میجر پارکر سے اصرار کیا تھا کہ کم سے کم قافلے کی فارمیشن ہی بدل دے مگر میجر نے ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے اس کی تجویز اڑا دی تھی۔ چھٹے روز بھی وہ اسی انداز میں محوِ سفر تھے۔ انہیں لیبیا اور چاڈ کی

سرحد کے پاس ایک جگہ پہنچا تھا اور ابھی مزید چار دن کا سفر باقی تھا۔ برطانوی فوج وہاں پر جرمن اور اطالوی فوج سے نبرد آزما تھی جو وسطی افریقہ تک رسائی حاصل کرنا چاہتی تھی۔ جرمنی کو جنگ جاری رکھنے کے لیے جن وسائل کی ضرورت تھی وہ وسطی افریقہ میں کثرت سے موجود تھے۔ اگرچہ اتحادیوں کی تمام تر توجہ نہر سوئز کو بچانے پر مرکوز تھی مگر وہ جرمنوں کو نئے وسائل حاصل کر کے جنگ میں تیزی لانے کی اجازت دینے کو تیار نہیں تھے۔

روانگی کے دو گھنٹے بعد ہی جرمن طیارے نازل ہو گئے تھے اور جب پندرہ منٹ بعد اپنا ایک ساتھی گنوا کے واپس گئے تو پیچھے صرف آگ و خون رہ گیا تھا۔ میجر پارکر ٹینک کے ریڈیو سے ہیڈ کوارٹر رابطہ کر کے مدد حاصل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس پر لعنت بھیج کر زمان خان تباہی کا اندازہ لگانے لگا بلکہ یہ دیکھنے لگا کہ بچا کیا کیا ہے۔ صرف دو شرمن ٹینک سلامت بچے تھے۔ بارہ بڑے ٹرکوں میں صرف ایک سلامت نظر آ رہا تھا۔ چھوٹے ٹرکوں میں سے بھی بیشتر تباہ ہو چکے تھے۔ کمپنی کی سب اہم گاڑی یعنی کمیونیکیشن وین بھی تباہ ہو چکی تھی۔ اب صرف چند چھوٹے ریڈیوز سے تھے جو ٹینکوں اور بعض دوسری گاڑیوں پر لگے تھے لیکن یہ طویل فاصلے تک کام نہیں کرتے تھے۔ زمان خان نے پانی کے ٹینکرز دیکھے وہ بھی تباہ ہو چکے تھے۔ ایندھن کے ٹینکرز بھی نشانہ بن چکے تھے۔ ان سے اٹھنے والے شعلے آسمان سے باتیں کر رہے تھے۔ زمان نرسوں والی وین تلاش کر رہا تھا۔ وہ قافلے کے درمیانی حصے میں تھی۔ اسے زندہ اور سلامت افراد کم نظر آ رہے تھے۔ بیشتر مر چکے تھے یا زخمی تھے۔ آخر اسے وین نظر آ گئی لیکن اس حالت میں کہ اس کا اوپری حصہ بم سے اُڑ گیا تھا اور وہ پہلو کے بل گری ہوئی تھی۔ زمان کا دل رک سا گیا۔ نرم و نازک اور حسین شیلا کا وجود اس وین کی طرح شکستہ اور بکھرا ہوا ہوگا۔ یہ سوچ کر اسے جھرجھری آ گئی۔ اس نے ڈرتے ڈرتے وین میں جھانکا لیکن اندر کوئی نہیں تھا۔ نہ تو لاش اور نہ کوئی زندہ آدمی۔ شاید نرسیں بم گرنے سے پہلے وین سے نکل گئی تھیں۔ زمان کے دل میں امید جاگ اٹھی۔ وہ دیوانہ وار شیلا کو تلاش کرنے لگا۔ ایک ایک سے نرسوں کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ اسے نہ اپنے عہدے کا خیال تھا اور نہ یہ خیال کہ اس تباہی کے بعد بچنے والوں کو نہ اپنا ہوش تھا اور نہ نرسوں کا۔ کسی نے نرسوں کو نہیں دیکھا تھا۔ وہ خود شیلا کو پکارنے لگا۔

''کیپٹن!'' اچانک اسے شیلا کی آواز آئی اور پھر وہ آ کر زمان سے لپٹ گئی۔ وہ رو اور کانپ رہی تھی۔ ''خدا کا شکر ہے تم محفوظ ہو۔''

زمان کو جتنی خوشی اسے صحیح سلامت دیکھ کر ہوئی تھی اتنی ہی خوشی اس کے الفاظ سن کر ہوئی۔ وہ اس کے بچنے پر خدا کا شکر ادا کر رہی تھی۔ ''تمہاری ساتھی کیسی ہیں؟''

''صرف ہلڈا بچی ہے۔'' وہ رونے لگی۔ ''ڈاکٹر بھی مارے جا چکے ہیں۔ بس ہم دو ہی زخمیوں کو دیکھ رہے ہیں۔''

زمان ان کی مدد کرنے لگا۔ بچنے والے زخمیوں کو ایک جگہ لا رہے تھے۔ شیلا اور ہلڈا ان کو دیکھ رہی تھیں۔ ان کے علاوہ چند اور افراد تھے جنہوں نے فرسٹ ایڈ کورسز کر رکھے تھے اور خود بھی بچ گئے تھے۔ زخمیوں کو ریت پر بستر اور چادروں پر لٹایا جا رہا تھا۔ ان میں سے بیشتر شدید زخمی تھے۔ انہیں گولیوں اور بموں کے ٹکڑے لگنے سے زخم آئے تھے۔ زخمیوں میں سے نصف جلے ہوئے بھی تھے۔ زخمیوں کے علاج کے لیے کچھ نہیں تھا۔ بمباری نے ادویات والی گاڑی بھی تباہ کر دی تھی۔ چند میڈیکل فرسٹ ایڈ باکس تھے لیکن ان سے صرف معمولی زخموں کا علاج ممکن تھا۔ بیس ایم ایم کی خوفناک گولیاں اور بموں کے ٹکڑے لگنے سے زخمی ہونے والوں کا علاج نہیں کیا جا سکتا تھا پھر بھی شیلا اور ہلڈا ہر ممکن کوشش کر رہی تھیں۔

زمان خان نقصان کا جائزہ لینے لگا۔ ہزار میں سے بمشکل دو سو افراد زندہ بچے تھے۔ ان میں سے بھی صحیح سالم افراد کی تعداد سو سے بھی کم تھی۔ سو سے اوپر زخمیوں میں سے بیشتر اتنے زخمی تھے کہ انہیں فوری طور پر طبی امداد نہ ملتی تو ان کے موت کے منہ میں جانے کا قوی امکان تھا۔ زمان سمجھتا تھا' موت ان کا مقدر بن چکی ہے۔ کسی بھی جگہ سے ہزاروں میل کے فاصلے پر اس صحرا میں کہیں سے بھی مدد آنے اور جلد آنے کا قطعی امکان نہیں تھا۔ اگر میجر پارکر ہیڈ کوارٹر سے رابطہ کر بھی لیتا تب بھی فوری مدد آنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ زخمی اتنی دیر میں مر جاتے۔ ان کے زخم بگڑ جاتے یا خون بہہ جاتا۔ زمان خان ٹینک کی طرف لپکا۔ میجر پارکر ستا چہرہ لیے باہر کھڑا تھا۔ وہ خالی آنکھوں سے چاروں طرف پھیلی تباہی کو دیکھ رہا تھا۔

''میجر! رابطہ ہوا؟''

میجر پارکر نے نفی میں سر ہلایا۔ ''ٹینک کا ریڈیو اس قابل نہیں ہے کہ ہیڈ کوارٹر سے رابطہ ہو سکے۔''

''کمیونیکیشن وین بھی تباہ ہو چکی ہے۔''

''یسوع۔'' میجر پارکر کراہا۔

''آٹھ ٹینک، سارے بڑے ٹرک اور بیشتر چھوٹی گاڑیاں بمباری میں تباہ ہو چکی ہیں۔''

''کیپٹن! مجھے بتاؤ کہ بچا کیا ہے؟'' میجر پارکر نے غرا کر پوچھا۔

زمان خان نے سرسراتے لہجے اور سپاٹ آواز میں اسے بچ جانے والی چیزوں اور انسانوں کے بارے میں بتایا۔ یہ جان کر میجر پارکر کی حالت مزید خراب ہو گئی تھی کہ پانی اور ایندھن کا ذخیرہ تباہ ہو چکا تھا۔ صحرا میں ان کے بغیر سفر کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ لوگ رفتہ رفتہ ان کے گرد جمع ہو رہے تھے۔ ان کے چہروں پر سوال تھا کہ اب کیا ہوگا؟ میجر نے سب سے پہلے انہیں بچ جانے والی گاڑیاں اور سامان جلتے ملبے سے نکالنے کا حکم دیا کہ مزید کسی چیز کو نقصان نہ ہو۔

''سر! ان لاشوں کا کیا ہوگا؟'' زمان خان نے چاروں طرف بکھری لاشوں کی طرف اشارہ کیا۔

''انہیں دفن کرنا ہوگا۔ ہم انہیں ایسے ہی چھوڑ کر نہیں جا سکتے۔''

زمان نے چالیس افراد کا ایک گروپ لے کر انہیں قبریں کھودنے پر لگا دیا۔ قبریں کیا بس ایک لمبی سی چھ فٹ چوڑی اور تین فٹ گہری قبر بنائی جانے لگی۔ جیسے جیسے قبر کی کھدائی ہو رہی تھی لاشوں کو لا کر ان میں ڈال کر اوپر سے مٹی ڈالی جا رہی تھی۔ ریت کھودنا آسان تھا اس لیے چار گھنٹے میں وہ اس کام سے فارغ ہو گئے اور ان چار گھنٹوں میں مرنے والوں کی تعداد میں تقریباً چالیس افراد کا اضافہ ہو چکا تھا۔ یہ سب شدید زخمی تھے۔

سہ پہر چار بجے تک تباہ شدہ قافلے سے گاڑیاں، اسلحہ اور رسد کا بچا کھچا سامان نکال لیا گیا تھا۔ واحد بڑا ٹرک جو بچ گیا تھا اس پر راشن لدا تھا۔ پانی محض اتنا تھا کہ کل صبح تک چل سکتا تھا۔ اس کے بعد صحرا کی خوفناک گرمی میں وہ کس طرح گزارا کرتے' یہ سوال ہر ایک کے ذہن میں تھا۔ تباہ شدہ واٹر ٹینکر کے نچلے حصے میں سوراخ کر کے بچا کھچا پانی حاصل کر لیا گیا تھا جو مشکل سے دس بارہ گیلن تھے۔ اتنے پانی کے ساتھ وہ کوشش کرتے تو دو دن سفر کر سکتے تھے۔ اس کے بعد وہ اس اتحادی فوج تک پہنچ جاتے جس کی مدد کے لیے انہیں روانہ کیا گیا تھا۔ حالات نے پلٹا کھایا۔ وہ جن کی مدد کے لیے جا رہے تھے' اب ان کی مدد کے طلب گار تھے۔

''سر! میرا خیال ہے ہمیں رکے بغیر روانہ ہو جانا چاہیے۔'' زمان نے مشورہ دیا۔ ''رات بھر میں ہم خاصا سفر طے کر سکتے ہیں اور کل دن میں آرام کر سکتے ہیں۔ میں نے سنا ہے صحرا میں سفر کرنے والے ایسا ہی کرتے ہیں۔''

میجر پارکر نے سر ہلایا۔ ''اب ہمارے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے کہ جلد از جلد اپنی فوج سے جا ملیں ورنہ.....''

''سر! ہمیں تمام گاڑیاں لے جانے کے بجائے صرف اتنی گاڑیاں لے جانی چاہئیں جتنی ضرورت ہو۔ فاضل پیٹرول ہم ذخیرہ کر کے لے جا سکتے ہیں۔''

تباہی نے میجر پارکر کے ہوش ٹھکانے لگا دیے تھے اس لیے وہ زمان خان کا ہر مشورہ مان رہا تھا۔ تقریباً تیس شدید زخمیوں کو دو ٹرکوں پر سوار کر دیا گیا تھا۔ معمولی زخمی اور باقی افراد تین ٹرکوں پر سوار تھے۔ ایک ٹرک اور ایک جیپ چھوڑ دی گئی تھی۔ بعض بڑے ٹرکوں کے ایندھن کے ذخیرے محفوظ تھے۔ ان کا تیل نکال لیا گیا۔ جن شرمن ٹینکوں کے ڈیزل کے ڈرم محفوظ تھے انہیں بھی اتار لیا گیا تھا۔ یہ راستے میں کام آتے۔ شام ڈھلنے تک انہوں نے آرام کیا تھا۔ سب ہی بے حد تھکے ہوئے تھے خاص طور پر شیلا اور ہلڈا سب سے زیادہ محنت کرنے کی وجہ سے ٹرک کے تپتے فرش پر ہی بے خبر سو گئی تھیں۔ جیسے ہی سورج مغربی اُفق پر جھکا وہ آگے چل پڑے۔ میجر پارکر اور زمان خان ایک ہی جیپ میں تھے۔ ڈرائیونگ سیٹ زمان نے سنبھال رکھی تھی۔ کمیونیکیشن وین تباہ ہونے سے وہ سب سے کٹ گئے تھے۔ مدد کے لیے پیغام بھیجنا ممکن نہیں رہا تھا۔ بس یہی امید تھی کہ پانی ختم ہونے سے پہلے وہ اپنی فوج سے جا ملیں۔ سفر کے دوران ان کی پُرامید نظریں آسمان پر تھیں کہ شاید اتحادی فوج کا کوئی جہاز گزرے اور وہ اسے مدد کے لیے اشارہ دے سکیں مگر یہاں پر کوئی ایسا محاذ نہیں تھا جس پر اتحادی طیارے حملہ کرتے۔ شمالی افریقہ پر حملہ کرنے والے طیارے جبرالٹر سے پرواز کرتے تھے اور ان کی حد زیادہ سے زیادہ طرابلس یا بن غازی تک تھی۔ اندرون افریقہ حملہ کرنے کی اہلیت نہیں تھی۔ مصر سے جو طیارے اُڑتے تھے' وہ بھی زیادہ سے زیادہ جرمنوں کی پیش قدمی کرنے والے دستوں پر بمباری کرتے' انہیں روکنے کی کوشش کرتے تھے۔

رات بھر وہ تیز، فراٹے سے سفر کرتے رہے۔ صحرا کی ریت پر گاڑیوں کی رفتار سست تھی۔ پھر انہیں ریت کے ٹیلوں اور پھسلتی ریت کی وادیوں سے گزر کر گزرنا پڑتا تھا۔ صبح سورج طلوع ہونے اور گرمی کے آغاز تک انہوں نے سفر جاری رکھا تھا۔ ان کے پاس چند خیمے بچے تھے جو نرسوں اور افسران کے لیے لگا دیے گئے تھے۔ باقی جوانوں کو ٹرکوں میں

ہی آرام کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ راستے میں وہ صرف اس وقت رکتے تھے جب کوئی زخمی دم توڑ جاتا تھا۔ صبح تک وہ درجن بھر مرنے والے زخمی دفنا چکے تھے۔ ناشتا کر کے سب ہی مردوں کی طرح پڑ گئے تھے البتہ شیلا اور ہلڈا جو سفر کے دوران ہی آرام کر چکی تھیں، ایک خیمے میں زخمیوں کی مرہم پٹی کر رہی تھیں۔ زمان خان بھی ناشتا کر کے خیمے میں سو گیا تھا۔ شدید گرمی کے عالم میں چھاؤں میں سونا بھی آسان نہیں تھا لیکن اسے پھر بھی نیند آ گئی۔ شام کے قریب اس کی آنکھ کھلی۔ باہر خاصی چہل پہل تھی۔ کھانا بن رہا تھا اور ایک طرف چند افریقی جوان زمین کھود رہے تھے۔ زمان خان نے گہری سانس لی۔ شاید چند زخمی اور چل بسے تھے۔ وہ ان کے لیے کچھ کر بھی نہیں سکتے تھے۔ شیلا روتی آنکھوں کے ساتھ خیمے کے باہر ایک پیٹی پر بیٹھی تھی۔ زمان خاموشی سے اس کے پاس بیٹھ گیا۔

''چھ زخمی اور مر چکے ہیں۔'' شیلا نے اسے آہستہ سے بتایا۔

''ان کا یہی مقدر ہے۔'' زمان کے لہجے میں تلخی تھی۔ ''یورپ کے سیاسی خدا بے دریغ اپنے مفادات کی جنگ پر ان نوجوانوں کو قربان کر رہے ہیں جن کی کالج جانے اور ہنسنے کھیلنے کی عمریں ہیں۔ یہ اپنے وطن سے دور نامعلوم قبروں میں دفن ہوتے جا رہے ہیں۔''

''جنگ نازیوں نے مسلط کی ہے۔'' شیلا مدافعانہ لہجے میں بولی۔

''تیسری دنیا کی بندر بانٹ میں جب ایک طاقتور ملک کو اس کا حصہ نہیں ملے گا، وہ تو جنگ ہی کرے گا۔''

''میں نے کہا نا یہ سیاسی ناخداؤں کی جنگ ہے جس میں عوام مارے جا رہے ہیں۔''

''شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو کیپٹن! لیکن سوال یہ ہے کہ اب کیا ہوگا؟''

''دو ہی باتیں ممکن ہیں۔ یا تو ہم بھی اس صحرا میں دفن ہو جائیں یا شاید بچ کر نکل جائیں۔''

''کیپٹن! تم زیادہ ہی مایوس ہو رہے ہو۔'' شیلا نے اس کی طرف دیکھا۔

''تم مجھے حقیقت پسند بھی کہہ سکتی ہو۔'' زمان نے نرمی سے کہا تھا۔

''کافی پیو گے؟''

''لاؤ۔ شاید اس کی گرمی اس گرمی کو مار دے۔''

''کولڈ کافی ہے۔ میرے پاس ایسی کافی بھی ہے جو سادہ پانی میں گھل کر تیار ہو جاتی ہے۔'' شیلا نے کہا اور اپنے خیمے میں جا کر کافی کے دو مگ تیار کر کے لے آئی۔ چھ بج رہے تھے۔ سورج غروب ہونے کے قریب تھا مگر صحرا کی تپش میں خاص فرق نہیں پڑا تھا۔ رسد والے ٹرک کے سائے میں وہ ریت پر بیٹھ گئے۔ ''اب صرف بیس زخمی ہیں۔ ان کو اگر کل تک مدد نہ ملی تو ان کی جانوں کو بھی خطرہ ہو جائے گا۔ باقی معمولی زخمی ہیں۔ ان کے زخم ٹھیک ہو رہے ہیں۔''

''یعنی ہمارے پاس ایک سو بارہ افراد ہیں۔''

''پتا نہیں لیکن جب پوری کمپنی مسلح ہونے کے باوجود فضائی حملے میں ڈھیر ہو گئی تو یہ ایک سو بارہ افراد دشمن کے خلاف کیا کر سکیں گے۔''

''بے بی! جنگ میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ بعض اوقات چند افراد وہ کر جاتے ہیں جو پوری کمپنی اور بریگیڈ نہیں کر پاتے ہیں۔''

''زمان! کیا تمہیں اپنے گھر والے یاد آتے ہیں؟''

''بہت..... میری ماں، بابا، میرے والد، بھائی، میری چھوٹی بہنیں سب یاد آتے ہیں۔''

''اور بیوی..... وہ یاد نہیں آتی؟''

''نہیں۔'' زمان نے نفی میں سر ہلایا۔

''سچ سچ! کیا تمہیں اس سے محبت نہیں ہے؟''

''نہیں، کیونکہ وہ ابھی آئی نہیں ہے۔''

شیلا کے چہرے کا رنگ بحال ہو گیا۔ وہ دل سے ہنسی تھی۔ ''تو یوں کہو نا کہ تمہاری ابھی شادی نہیں ہوئی ہے۔ کیا تم لوگ شادی صرف اپنے لوگوں میں کرتے ہو؟''

''ہاں۔'' زمان نے صاف گوئی سے کہا۔ ''بلکہ ہمارے ہاں خاندان سے باہر شادی کرنے کا رواج بھی کم ہے۔ قبیلے سے باہر تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''

''اچھا۔'' شیلا بجھ گئی، پھر اس نے کہا۔ ''کھانا کھا لو۔ کچھ دیر میں روانہ ہونا ہے۔''

زمان نے اپنا کھانا لیا اور ایک طرف بیٹھ کر کھانے لگا۔ اس دوران میں روانگی کی تیاری ہو رہی تھی۔ میجر پارکر نے اسے طلب کیا تھا۔ وہ اس کے پاس پہنچا۔ ''یس سر!'' اس نے سیلوٹ کیا۔

''کیپٹن! ہمارے پاس پانی کی پوزیشن خطرناک ہے۔ مشکل سے صبح تک چل سکے گا۔ اس کے بعد سارا دن بغیر پانی کے سفر کرنا ہوگا۔ ہمارے ساتھی افریقی دستوں کے سربراہ لیفٹیننٹ کالنگا کا کہنا ہے کہ ہمیں میدان جنگ تک پہنچنے کے بجائے جنوب میں واقع ایک پرانی برطانوی فوجی چوکی تک

پہنچنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ وہاں سے ہمیں پانی مل سکتا ہے۔ اس کے بعد ہم اپنا سفر جاری رکھ سکتے ہیں۔''

''چوکی یہاں سے کتنی دور ہے؟''

''کوئی ساڑھے سات سو میل جبکہ ہماری منزل ابھی بارہ سو میل کے فاصلے پر ہے۔''

''یعنی ہم کسی صورت پرسوں صبح سے پہلے وہاں نہیں پہنچ سکتے۔'' زمان نے سوچ کر کہا۔

''چوکی تک جانے کے لیے بیس گھنٹے درکار ہیں یعنی ہم وہاں کل چار بجے تک پہنچ سکتے ہیں۔''

زمان نے کالنگا کو بلایا۔ اس کا تعلق زائر سے تھا لیکن اس کا قبیلہ چاڈ اور لیبیا کی سرحد تک پھیلا تھا اور وہ اس سارے علاقے سے اچھی طرح واقف تھا۔

''لیفٹیننٹ! کیا تم چوکی کے محل وقوع سے واقف ہو؟'' زمان نے سرد لہجے میں پوچھا۔ ''صحرا میں غلطی کی سزا جانتے ہو؟''

''موت۔'' کالنگا نے جواب دیا۔ وہ ساڑھے چھ فٹ قامت کا تنومند جوان تھا۔ ''لیکن میں اس سارے صحرا کے ایک ایک حصے سے واقف ہوں۔ میں آنکھ بند کر کے بھی آپ کو اس چوکی تک لے جا سکتا ہوں۔ تین سال پہلے میں پورے ایک برس تک وہاں رہا تھا۔''

''اب اس چوکی کی کیا پوزیشن ہے؟'' میجر پارکر نے پوچھا۔ ''مشن کے بارے میں بریفنگ میں اس چوکی کا کوئی ذکر نہیں تھا۔''

''جناب! یہ چوکی چاڈ کے باغی قبائل پر نظر رکھنے کے لیے بنائی گئی تھی۔ اب مجھے نہیں معلوم کہ اسے برقرار رکھا گیا ہے یا نہیں لیکن ایک بات میں یقینی طور پر جانتا ہوں۔ اس چوکی سے ہمیں پانی مل جائے گا۔''

میجر پارکر نے زمان اور جونز کی طرف دیکھا۔ ''تم لوگوں کی کیا رائے ہے؟''

غالباً میجر اپنے فیصلے سے چوکی کا رُخ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ مشن پلان میں تبدیلی کی ذمے داری اس پر عائد ہوتی تھی۔ زمان نے سر ہلایا۔

''میرا خیال ہے ہمیں پہلے چوکی کی طرف جانا چاہیے۔''

''سر! ہمارے پاس اتنا ایندھن نہیں ہے۔'' کیپٹن جونز نے اعتراض کیا۔

''سر! اصل مسئلہ پانی کا ہے۔'' زمان نے کہا۔ ''پانی مل جانے سے ان بیس افراد کی جان بچ سکتی ہے جو شدید زخمی ہیں۔ ممکن ہے چوکی سے ان کے علاج کے لیے کچھ مل جائے۔''

میجر پارکر نے کیپٹن جونز کے اعتراض کو رد کرتے ہوئے چوکی کی طرف جانے کا حکم دیا تھا۔ چوکی سطح سمندر سے کوئی ڈھائی ہزار فٹ کی بلندی پر تھی۔ جیسے جیسے وہ سمندر سے دور جا رہے تھے دن میں گرمی اور رات میں ٹھنڈ بڑھ رہی تھی۔ بحیرۂ روم کی معتدل آب و ہوا دور رہ گئی تھی۔ خشک اور بغیر صحرائی آب و ہوا حاوی آ چکی تھی۔ نقشے کے مطابق وہ اس وقت ساحل سے کوئی بارہ سو میل کے فاصلے پر تھے۔ قافلہ سورج ڈوبتے ہی چل پڑا تھا۔ سردیوں کا موسم ہونے کی وجہ سے دن چھوٹا ہو رہا تھا اور رات بڑی تھی۔ سورج ساڑھے چھ بجے کے قریب غروب ہو کر کوئی ساڑھے سات بجے طلوع ہوتا تھا۔ رات نو بجے تک سردی اتنی ہو چکی تھی کہ انہیں گرم جرسیاں نکال کر پہننی پڑی تھیں۔ تھرمامیٹر درجۂ حرارت دس درجہ سینٹی گریڈ بتا رہا تھا جبکہ دن میں درجۂ حرارت اڑتالیس درجہ سینٹی گریڈ تھا۔ فرق حیران کن تھا۔ زخمیوں کو سردی سے بچانے کے لیے کمبل اڑھا دیے گئے تھے۔ اس رات بھی دو زخمی مزید دم توڑ گئے تھے۔ میجر پارکر کی ہدایت پر ہر ممکن تیز رفتاری سے سفر کیا جاتا رہا مگر راستے میں دو بار ٹائر پنکچر ہونے اور ایک بار زخمیوں کی تدفین کی وجہ سے ڈیڑھ گھنٹا ضائع ہوا تھا پھر ریت پر سفر کرنے سے رفتار پہلے ہی سست تھی۔ جب انہوں نے صبح دس بجے پڑاؤ ڈالا تو اس وقت تک پانچ سو میل کا فاصلہ طے کیا تھا اور ابھی ڈھائی سو میل کا فاصلہ باقی تھا۔ میجر نے اعلان کیا کہ وہ بارہ بجے دوبارہ روانہ ہوں گے تاکہ شام سے پہلے چوکی تک پہنچ سکیں۔ پانی تقریباً ختم ہو چکا تھا۔ صرف زخمیوں کے لیے تھوڑا پانی تھا تاکہ وہ پانی کی کمی سے مر نہ جائیں۔ ان کے علاوہ سب پیاسے تھے۔ خود زمان نے صبح سات بجے اپنی چھاگل میں موجود پانی کا آخری قطرہ حلق سے اتارا تھا اور جب سورج بلند ہوا تو حلق میں کانٹے سے چبھنے لگے تھے۔ آرام کے وقفے میں سب خاموش تھے۔ ان کے ذہنوں میں پانی کی سوچ تھی۔ اگر وہ لیفٹیننٹ کالنگا کی مفروضہ چوکی تک نہ پہنچ سکے تو ان کا کیا حشر ہوگا۔ پانی ان کی زندگی کا سوال بن گیا تھا۔ اگر جواب نفی میں آیا تو آگے سوائے دردناک موت کے کچھ نہیں تھا۔ زمان نرسوں والے ٹرک کے پاس آیا۔ شیلا زخمیوں کو دیکھ رہی تھی۔ حتی الامکان ان کے زخموں کو صاف کر رہی تھی۔ ہلڈا خود بھی حوصلہ ہار کر ایک طرف نڈھال پڑی تھی۔ زمان نے مسکرا کر شیلا کو حوصلہ دیا۔

''کیپٹن! کیا تمہیں یقین ہے کہ ہم شام تک پانی والی جگہ پہنچ جائیں گے؟''

''نہیں، لیکن اتنا یقین ضرور ہے جب خدا نے ہمیں جرمنوں کی بمباری سے بچایا ہے تو وہ آگے بھی ہمیں محفوظ رکھے گا۔''

''ان زخمیوں کے بارے میں کیا خیال ہے جو اپنی جان ہار گئے۔'' شیلا تلخی سے بولی۔ ''کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ موت ہمارا مقدر بھی بنے گی۔''

''اتنا مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ کالنگا اس علاقے سے اچھی طرح واقف ہے۔ ہمارے پاس نقشے اور کمپاس ہیں۔ ہم درست راستے پر جا رہے ہیں۔ اگلے چھ گھنٹے کے سفر میں ہم چوکی تک رسائی حاصل کر لیں گے اور وہاں میٹھے پانی کا کنواں ہے۔''

''پتا نہیں میرا دل کہہ رہا ہے کہ کم سے کم میں اس صحرا سے زندہ واپس نہیں جا سکوں گی۔'' شیلا کے لہجے میں مایوسی تھی۔ ''میرے مقدر میں یہیں دفن ہونا ہے۔''

''مستقبل انسان کی نظروں سے پوشیدہ ہے۔ اس کے مقدر میں کیا ہے یہ صرف اوپر والا جانتا ہے۔ انسان کو کبھی بھی مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ اللہ نے اس کے لیے کہاں کامیابی رکھی ہے' یہ وہ نہیں جانتا۔''

''تم مسلمان خدا پر بہت بھروسا کرتے ہو۔'' شیلا بولی۔ ''میرے پاپا کے فارم میں انڈونیشیا سے آئے ہوئے مزدور کام کرتے ہیں۔ اتنے صابر اور اپنی قسمت پر بھروسے کرنے والے لوگ میں نے نہیں دیکھے۔ ان میں سے ایک شخص کی حادثے میں دونوں آنکھیں ضائع ہو گئیں لیکن وہ ہمارے فارم پر ایسے کام کرتا ہے جیسے آنکھ والے دوسرے مزدور کرتے ہیں۔''

''ہاں اسے تم تربیت کا اثر بھی کہہ سکتی ہو۔ ہم مسلمانوں کو بچپن سے اللہ سے روشناس کرایا جاتا ہے اور جب ہم عملی زندگی میں قدم رکھتے ہیں تو خدا ہماری زندگی کے ایک لازمی اور ناقابلِ جدا حصہ بن چکا ہوتا ہے۔''

شیلا نے بے بسی سے اس کی طرف دیکھا۔ ''میں نے خدا کو کبھی اس طرح محسوس نہیں کیا حالانکہ میں بچپن سے مشن اسکول میں رہی ہوں۔ اب بھی میں ایک مشنری ادارے سے وابستہ ہوں۔''

زمان خان مذہب پر بحث نہیں کرتا تھا اس لیے وہ شیلا سے نہیں کہہ سکا کہ تم لوگ خدا کو اس وجہ سے محسوس نہیں کرتے ہو کیونکہ تم نے اس کی شخصیت کو دھندلا دیا ہے۔

''شیلا! یہ تمہارے احساسات کا دھوکا ہے۔ یہ بتاؤ کہ جب تم پر کوئی ناگہانی آفت آتی ہے تو تم بے ساختہ کسے پکارتی ہو؟''

''خدا کو۔'' شیلا حیران ہوئی۔ ''تم صحیح کہہ رہے ہو۔ یہ شعور کا دھوکا ہے۔ لاشعوری طور پر خدا ہمارے اندر بھی بسا ہوا ہے۔''

''شیلا! تم اسے پکار کر دیکھو۔ وہ تمہاری ضرور سنے گا۔''

''میں اس سے جو مانگوں گی ملے گا؟'' شیلا نے عجیب سے لہجے میں پوچھا۔

''کسی نہ کسی صورت میں ضرور ملے گا۔'' زمان نے یقین سے کہا۔

بارہ بجے وہ دوبارہ چل پڑے تھے۔ درجۂ حرارت اس وقت بھی پینتالیس درجے سینٹی گریڈ تھا اور عقب سے ہوا کے تیز جھونکے مٹی اڑا رہے تھے۔ گزشتہ دن کی نسبت آج گرمی کی شدت کم تھی۔ دن میں سفر کرنے سے رفتار تیز ہو جاتی تھی کیونکہ رات کو منظر اتنا واضح نہیں ہوتا تھا اور رفتار سست رکھنی پڑتی تھی۔ ہموار جگہوں پر رفتار ساٹھ میل فی گھنٹا تک بھی پہنچ جاتی تھی۔ تین بجے کے قریب ہلکا سا طوفان آیا۔ مٹی اتنی شدت سے اڑی کہ چند گز آگے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ مجبوراً سفر روکنا پڑا۔ نصف گھنٹے بعد جب طوفان گزر گیا تو وہ آگے روانہ ہوئے۔ شام چھ بجے تک دو سو میل سے زائد کا فاصلہ طے کر چکے تھے اور اب چوکی پچاس میل کے فاصلے پر رہ گئی تھی۔ پیاس سے سب کا برا حال تھا مگر یہ امید بھی تھی کہ اب پانی زیادہ فاصلے پر نہیں رہا' جب سورج کی روشنی مغربی اُفق سے تقریباً معدوم ہو چکی تب انہیں چوکی نظر آ گئی۔ یہ کسی قدر بلند... تھی اور شاید اسی وجہ سے اسے چوکی کے طور پر منتخب کیا گیا تھا کہ اس سے چاروں طرف نظر رکھی جا سکتی۔ ریت نے چوکی کے گرد جا بجا کوہان نما ٹیلے بنا دیے تھے۔

''اس کا دروازہ مشرق کی طرف ہے۔'' کالنگا نے فصیل کی طرف اشارہ کیا۔

وہ گھوم کر چوکی کی فصیل کے مین گیٹ کی طرف جانے لگے۔ مین گیٹ کیا بس ایک خلا تھا۔ اس کے دونوں طرف کوئی میٹر بھر موٹی اور دو میٹر اونچی کچی مٹی سے بنی دیوار تھی جس نے پوری چوکی کا احاطہ کر رکھا تھا۔ یہ احاطہ کوئی چار پانچ ایکڑ کے رقبے پر پھیلا تھا۔ اس کے وسط میں چوکی کی عمارتیں تھیں۔ احاطے کی حالت بتا رہی تھی کہ چوکی برسوں سے ویران پڑی ہے۔ احاطے میں بھی ریت کے کوہان نما ٹیلے بن گئے۔ عمارتیں خستہ حال اور ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھیں۔ انہیں

مٹی کے گارے اور پتھروں کی مدد سے تعمیر کیا گیا تھا۔ گاڑیوں کی روشنی میں عمارتوں کی ویرانی بھی صاف نظر آ رہی تھی۔ نہ کوئی سامان تھا اور نہ ہی کوئی ذی روح تھا۔ فوجی ٹارچیں لے کر چوکی میں پھیل گئے تھے۔ میجر پارکر نے گاڑیاں عقبی حصے میں لے جانے کا حکم دیا۔ ایک عمارت کو صاف اور محفوظ پا کر وہاں زخمیوں کو منتقل کیا جانے لگا۔ زمان کی نظریں اس کنوئیں کی کھوج میں تھیں جہاں سے انہیں میٹھا پانی مل سکتا تھا۔ اس نے کالنگا کا بازو پکڑا۔

''کنواں کہاں ہے؟''

کالنگا نے چاروں طرف دیکھا اور بولا۔ ''مجھے یاد ہے وہ چوکی کے شمال میں تھا۔''

کالنگا طاقتور ٹارچ کی روشنی میں کنوئیں کا سراغ لگانے لگا مگر وہاں سوائے ریت کے اور کچھ نہیں تھا بقول کالنگا کے کنواں تھا۔ خاصی دیر بعد بھی وہ کنوئیں کا سراغ نہیں لگا سکے تھے۔ زمان کا خیال تھا کہ کنواں ریت تلے چھپ گیا تھا۔ میجر پارکر ان کی طرف آیا۔

''کنواں کہاں ہے؟ کیا فوج جاتے ہوئے اسے اپنے ساتھ لے گئی تھی؟''

''سر! میرا خیال ہے وہ ریت کے نیچے چھپ گیا ہے۔'' کالنگا نے کہا اور اپنی رائفل کی سنگین اتار کر ایک ڈنڈے کے سرے پر باندھ کر سنگین ریت میں مار مار کر کنواں تلاش کرنے لگا۔ میجر پارکر غرایا۔

''اس طرح کنوئیں کا پتا چلے گا۔ اس میں ریت بھر چکی ہوگی۔''

''ایک فوجی اصول ہے۔ جب کوئی جگہ چھوڑو تو ہر شے تباہ کر دو سوائے پانی کے ذریعے کے۔'' کالنگا نے نرمی سے کہا۔ ''برطانوی فوجی بھی اسی اصول پر عمل کرتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ کنوئیں کو محفوظ بنا کر گئے ہوں گے۔''

اسی لمحے اس کی سنگین کسی ٹھوس شے سے ٹکرائی۔ کالنگا نے ایک افریقی کو اشارہ کیا اور وہ بیلچے سے ریت ہٹانے لگا۔ ایک فٹ کے بعد ایک تختہ نکلا تھا۔ سب تیزی سے پیچھے ہٹ گئے۔ سب کنوئیں کے اوپر کھڑے تھے۔ بیلچے سے ریت ہٹائی جاتی رہی اور کنوئیں کا دہانہ واضح ہوتا چلا گیا۔ کنواں تقریباً ایک گز قطر کا تھا۔ اس کی پتھروں سے بنی منڈیر تھی جس پر لکڑی کے مضبوط تخت رکھ کر کنوئیں کو مٹی سے محفوظ کر دیا گیا تھا۔ اوپر رکھے پتھر ہٹا کر تختوں کو ایک طرف کر کے کالنگا نے اندر سرچ لائٹ کی روشنی پھینکی تو بے تابی سے کئی سر کنوئیں پر جھک آئے۔ سرچ لائٹ کی روشنی تہ تک جا رہی تھی اور وہاں سوائے سفید چمکتی ریت کے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ ان کے منہ سے مایوسی بھری آوازیں نکل گئیں۔

''یہاں تو پانی نہیں ہے۔'' میجر پارکر نے کہا۔

''ایک منٹ سب چپ ہو جائیں۔'' کالنگا نے کہا اور کان لگا کر سننے لگا تھا پھر اس نے پُرجوش انداز میں کہا۔ ''پانی ہے۔ میرے کان سن رہے ہیں۔ اندر کہیں پانی بہہ رہا ہے۔ ایک منٹ میں نیچے جاتا ہوں۔''

چند منٹ بعد کالنگا جیپ سے بندھی رسی کے سہارے نیچے جانے کے لیے تیار تھا۔ اس نے اپنی قمیص اتار دی تھی۔ صرف پتلون اور جوتے تھے۔ جوتے بھی اس نے احتیاطاً پہنے تھے کہ اندر کسی سانپ بچھو سے ملاقات نہ ہو جائے۔ ایک چاقو اور ایک عدد پستول اس کی بیلٹ میں تھا۔ پانی چیک کرنے کے لیے وہ ایک مگ بھی لے جا رہا تھا۔ ایک لوہے کی سلاخ کی مدد سے چرخی کنوئیں کے اوپر نصب کی گئی تھی۔ رسی اس چرخی سے گزار کر جیپ سے باندھی گئی تھی۔ جیسے ہی کالنگا اندر لٹکا، جیپ آہستہ آہستہ آگے آنے لگی۔ زمان جیپ کو کمانڈ کر رہا تھا۔ وہ کالنگا پر نظر رکھے جیپ کو ہاتھ کے اشارے سے آگے آنے کو کہہ رہا تھا۔ کنوئیں کی تہ کوئی پچیس تیس فٹ نیچے تھی۔ جیسے ہی کالنگا کے پاؤں تہ سے لگے رسی ڈھیلی پڑ گئی مگر کالنگا نے رسی اپنی بیلٹ سے الگ نہیں کی تھی۔ اس نے سب سے پہلے دستی لائٹ سے کنوئیں کا جائزہ لیا۔

''یہاں پانی نظر نہیں آ رہا ہے لیکن میں اس کے بہنے کی آواز سن رہا ہوں۔''

''پہلے دیکھو دیواروں میں ایسا کوئی سوراخ تو نہیں ہے جس میں کوئی کیڑا چھپ سکے۔'' زمان نے کہا۔

کالنگا اب دیواروں کو دیکھ رہا تھا۔ نیچے کنوئیں کا قطر کافی تھا۔ کوئی آٹھ نو فٹ اس کی تہ پر کافی ریت جم چکی تھی۔ جب کالنگا کو اطمینان ہو گیا کہ اس کے پیروں تلے سے زمین نکل جانے کا کوئی امکان نہیں ہے تو اس نے رسی بیلٹ سے الگ کر دی اور خود دیواروں سے کان لگا کر سننے کی کوشش کرنے لگا کہ پانی بہنے کی آواز کہاں سے آ رہی ہے۔ درحقیقت سوائے کالنگا کے یہ آواز کسی نے نہیں سنی تھی۔ آخر اس نے تعین کر لیا کہ آواز کہاں سے آ رہی ہے۔

''میرا خیال ہے ان پتھروں کے پیچھے پانی بہہ رہا ہے۔ مجھے پتھر نکالنے والے اوزار دیے جائیں۔'' کالنگا نے چلا کر کہا تھا۔

ایک کینوس کے تھیلے میں مذکورہ اوزار لے کر زمان خان خود بھی کنوئیں کی تہ میں پہنچ گیا کیونکہ خونزدہ جونز نے نیچے جانے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ اس سے پہلے میجر پارکر کسی اور کو حکم دیتا، زمان نے رضاکارانہ طور پر اپنی خدمات پیش کر دی تھیں۔ کالنگا اسے دیکھ کر مسکرایا۔ ''میں کسی کی مدد کی ضرورت محسوس کر رہا تھا کیپٹن!''

''میرا بھی یہی خیال تھا۔ یہ دو آدمیوں کا کام ہے۔'' اس نے تھیلا نیچے اُلٹ دیا۔ اس میں ہتھوڑی، چھینی اور چھوٹی کدالیں تھیں۔ ''آواز کس طرف سے آ رہی ہے؟''

''اس طرف سے۔'' کالنگا نے اشارہ کیا۔ زمان ہلکی سی آواز محسوس کر رہا تھا مگر یہ اتنی ہلکی تھی کہ وہ پوری توجہ مرکوز کرنے پر سن سکا تھا۔ اسے حیرت تھی کہ پچیس تیس فٹ کی دوری سے کالنگا نے یہ آواز کس طرح سن لی تھی۔ ''یہ آواز تو بہت ہلکی سی ہے۔''

''ہاں، لیکن میری سماعت تیز ہے۔ اپنے قبیلے میں مجھے تیز سماعت رکھنے والا کہا جاتا تھا۔ جب ہاتھی ہمارے کھیتوں پر حملہ کرنے آتے تھے تو سب سے پہلے مجھے پتا چل جاتا تھا۔''

زمان نے دیوار سے کان لگایا۔ اسے محسوس ہوا کہ پانی اس دیوار کے پیچھے ہے۔ اس وقت زمان کو یہ معمولی سی آواز دنیا جہاں کی موسیقی سے زیادہ دلکش لگ رہی تھی۔ وہ دونوں مل کر باری باری پتھروں پر ضرب لگانے لگے۔ کالنگا نے دستی لائٹ اس طرح رکھی تھی کہ اس کی روشنی پتھروں پر پڑ رہی تھی۔ جہاں جہاں مسالا لگا تھا وہاں ضرب لگا رہے تھے۔ چند ضربوں کے بعد ہی مسالا جھڑنے لگا۔ پندرہ منٹ کی کوشش کے بعد وہ پہلا پتھر نکالنے میں کامیاب رہے تھے۔ اس کے پیچھے سخت مٹی تھی۔ پہلا پتھر نکالنا تھا کہ باقی پتھر بے حد آسانی سے نکل گئے اور پتھر نکلتے ہی مٹی کا ایک بڑا سا تودہ اندر آ گرا تھا۔ وہ بوکھلا کر پیچھے ہٹے۔ اب پانی بہنے کی آواز واضح تھی۔ زمان نے دستی لائٹ کا رُخ ظاہر ہونے والے خلا کی طرف کیا تو اندر ایک چھوٹی سی سرنگ تھی۔ یہ بھی پتھروں سے بنی تھی۔ اس سرنگ کے اوپر پتھروں سے پانی کی پتلی سی دھار برآمد ہو کر تہ میں جمع پتھروں کے ڈھیر میں غائب ہو رہی تھی۔ کالنگا نے بے تابی سے مگ آگے کر کے اس میں پانی جمع کیا۔ پہلے اسے سونگھا پھر دیکھا اور چلایا۔ ''میٹھا پانی..... پینے کے قابل ہے۔''

زمان نے اس مگ لے کر تصدیق کی۔ واقعی پانی میٹھا اور تازہ محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے چلا کر اوپر سے پیالے اور بوتلیں مانگیں۔ اس دوران میں جبکہ اوپر سے یہ چیزیں آئیں، کالنگا اور زمان باری باری مگ میں پانی بھر کر پیتے رہے۔ ان کا بس چلتا تو اس ٹھنڈے میٹھے پانی کا ایک قطرہ بھی ضائع نہ ہونے دیتے۔ دو دو مگ پی کر ان کے اندر توانائی آ گئی تھی۔ اوپر سے کین اور المونیم کے بڑے بڑے پیالے اتارے گئے۔ انہوں نے پانی پیالوں میں جمع کر کے دس دس لیٹرز والے کین میں جمع کرنا شروع کر دیا۔ زمان اور کالنگا نے کین بھر بھر کر اوپر بھیجنا شروع کر دیا۔ پہلے دو مگ پانی کے بعد انہوں نے ایک قطرہ بھی نہیں پیا تھا۔ یہ پانی نصف لیٹر تھا۔ جب تک سب اتنا ہی پانی نہ پی لیتے انہیں اس کا حق نہیں تھا۔ اگلے تین گھنٹے تک وہ یہی کام کرتے رہے پھر ان کی جگہ دوسرے لوگ آ گئے۔

بارہ بج چکے تھے۔ میجر پارکر نے چوکی کے اطراف میں پہرے دار لگا دیے تھے۔ باقی افراد کھاپی کر سو رہے تھے۔ پہرے داروں کے قہقہے بتا رہے تھے کہ پانی مل جانے سے سب بے حد خوش تھے۔ اگرچہ زمان کا تھکن اور نیند سے برا حال تھا لیکن میجر پارکر نے اسے جونز کے ساتھ میٹنگ میں طلب کر لیا تھا۔ اس نے زمان سے پوچھا۔

''کافی پیو گے۔ بلک پیو گے کیونکہ تم شراب نہیں پیتے۔ اپنی مدد کرو۔'' اس نے کونے میں رکھے کافی کے تھرماس کی طرف اشارہ کیا۔ اس نے اپنے لیے خیمہ لگوایا تھا۔ زمان کافی کی ضرورت محسوس کر رہا تھا۔ اس نے مگ میں اپنے لیے کافی نکالی۔ اس میں چینی ملائی اور اوپر سے خشک کریم ڈالی۔

''جنٹل مین! یہ میٹنگ آیندہ کی حکمت عملی پر غور کرنے کے لیے بلائی ہے۔'' میجر پارکر نے کہا۔ ''کیپٹن زمان! سب سے پہلے تم پانی کی پوزیشن واضح کرو۔''

''سر! پانی ایک گھنٹے میں تیس لیٹرز کے حساب سے جمع ہو رہا ہے۔ ہمارے پاس دو ہزار لیٹرز جمع کرنے کی گنجائش ہے۔ چوبیس گھنٹے میں ہم سو سات بیس لیٹرز پانی حاصل کر سکتے ہیں۔''

''لیکن ہم زیادہ دیر یہاں نہیں رک سکتے۔ کیپٹن جونز! ایندھن کی کیا پوزیشن ہے؟''

''سر! ہمارے پاس اتنا ایندھن ہے کہ تمام گاڑیاں زیادہ سے زیادہ دو سو میل تک جا سکتی ہیں۔'' جونز نے جواب دیا۔

میجر نے میز پر پھیلے نقشے کی طرف دیکھا۔ ''ہمیں جس جگہ تک پہنچنا ہے وہ مقام یہاں سے پانچ سو میل کے فاصلے پر ہے۔ ہم تین سو میل پہلے اپنا ایندھن ختم کر چکے ہوں گے۔''

''میری تجویز ہے سر!'' زمان نے سوچ کر کہا۔ ''ہمیں زخمیوں اور کچھ افراد کو ان کی دیکھ بھال کے لیے اس جگہ چھوڑ کر باقی افراد کے ساتھ جانا چاہیے۔ میرا خیال ہے کہ دو

ٹرک اس کام کے لیے کافی ہوں گے۔ ٹینکوں کے لیے ایندھن کافی ہے۔ اس صورت میں ہم کل ہی یہاں سے روانہ ہو سکتے ہیں۔''

''یہ اچھا پلان ہے۔ اس پر غور کیا جا سکتا ہے۔'' کیپٹن جونز نے فوری طور پر تائید کی تاکہ میجر اس سے بھی اس مسئلے کا حل دریافت نہ کرے اور اس کے پاس فی الحال کوئی حل نہیں تھا۔ دو بجے تک پلان پر غور ہوتا رہا اور طے ہوا کہ وہ صبح دس بجے یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔ جان چھوٹنے پر زمان خدا کا شکر ادا کرتا فوری طور پر سونے کے لیے روانہ ہو گیا۔ اس کے لیے بھی خیمہ لگایا گیا تھا۔ سردی سے بچنے کے لیے کمبل بھی تھا۔ پورے ایک ہفتے بعد وہ پوری طرح بے فکر ہو کر سویا تھا۔ ایک، سپاہی اس کی پانی سے بھری چھاگل اس کے سرہانے رکھ گیا تھا۔ صبح اس کی آنکھ کھلی تو موسم بدستور سرد تھا کیونکہ آسمان پر گہرے بادل تھے۔ لگتا تھا کہ بارش ہو گی۔ زمان جانتا تھا کہ اگر بارش ہو گئی تو ان کا سفر تاخیر کا شکار ہو جائے گا۔ پانی مٹی میں جذب ہو کر اسے بے حد نرم کر دے گا جس میں گاڑیوں کے ٹائر دھنس جاتے۔

صبح کی روشنی میں اس نے پہلی بار چوکی کی عمارات کو بغور دیکھا تھا۔ یہ کل تین عمارتیں تھیں۔ ان میں سے مرکزی اور جنوبی عمارتیں اصل میں پتھر سے بنے غار تھے جنہیں بہتر بنا کر عمارتوں کی صورت دے دی گئی تھی۔ ان کے اوپری حصوں میں مٹی اور پتھروں کی مدد سے نئے کمرے بنا کر ان کے اوپر لکڑی کے شہتیروں کی چھت دے دی گئی تھی۔ ان کے نیچے غاروں میں کمرے بنے تھے البتہ تیسری عمارت جو کنوئیں کے پاس تھی اسے تعمیر کیا گیا تھا۔ اس کے عقب میں لوہے کے پائپوں اور سیمنٹ کی شیٹوں سے بنائے گئے وسیع شیڈز تھے جن کے اندر گاڑیوں کو پارک کیا جاتا تھا۔ ان میں سے بیشتر اب ناپید تھے۔ تیز ہوائیں اڑا کر لے گئی تھی۔

چوکی کی چار دیواری میں اٹھارہ مقامات پر مورچے بنے تھے۔ وسطی عمارت کے اوپر آبزرویشن پوسٹ تھی جہاں سے اردگرد کے سارے علاقے پر دور تک نظر رکھی جا سکتی تھی۔ چار دیواری کے علاوہ چوکی کے اندر بھی ریت سے بھری بوریوں اور کچی مٹی سے بنے مورچے تھے یعنی دشمن چار دیواری کے اندر بھی گھس آئے تب بھی اس کا مقابلہ کیا جا سکتا تھا۔ حملہ آور فوج اگر بڑی توپیں یا ٹینک استعمال نہ کرے تو اس کے لیے چوکی پر قبضہ کرنا آسان نہ ہوتا۔ زمان کنوئیں کی طرف آیا جس کے باہر دس دس لیٹرز والے بے شمار کین پانی سے بھرے رکھے تھے۔ گویا پانی جمع کرنے کا کام ساری رات جاری رہا تھا۔ سپاہیوں کو دو دو لیٹرز والی چھاگلیں بھر کر دی جا رہی تھیں۔ یہ ان کا چوبیس گھنٹے کا کوٹا تھا۔ زمان نے اپنی چھاگل لی۔ کالنگا وہیں تھا۔

''سر! میرا خیال ہے کہ آج شام تک ہم خاصا پانی جمع کر لیں گے۔''

''یہ پانی مشن پر جانے والے ٹرکوں میں جمع کرو۔ دس بجے روانگی ہے۔'' زمان نے کہا اور مرکزی عمارت کی طرف آیا۔ زخمیوں کو وہیں رکھا گیا تھا۔ رات ایک زخمی اور چل بسا تھا لیکن باقی سترہ ابھی بقیدِ حیات تھے۔ شیلا اسے دیکھ کر کھل گئی۔ ''ہم ابھی یہاں سے جا رہے ہیں۔''

''تم... کیا تم رک نہیں سکتے۔'' شیلا نے التجا کی۔

''شیلا! ہم یہاں لڑنے کے لیے آئے ہیں سوائے بارہ افراد کے جو کسی قدر زخمی ہونے کی وجہ سے جنگ میں شریک ہونے کے قابل نہیں ہیں اور چار دوسرے افراد کے باقی سب جا رہے ہیں۔ میں تمہیں خدا حافظ کہنے آیا ہوں۔''

شیلا کے ہونٹ لرزنے لگے۔ ''میں..... میں تمہارا انتظار کروں گی۔''

''میں واپس آنے کی کوشش کروں گا لیکن.....'' زمان نے اس کی طرف دیکھنے سے گریز کیا۔ ''اگر واپس نہ آ سکا تو مجھے بھول جانا۔''

''نہیں۔'' شیلا اس سے چمٹ گئی۔ ''میں تمہیں نہیں بھول سکتی۔''

''شیلا! مجھے جانا ہے۔'' زمان نے گھڑی دیکھی۔ ''ابھی مجھے ناشتا بھی کرنا ہے۔''

''چلو میں بھی ناشتا کرتی ہوں۔ میں نے بھی ناشتا نہیں کیا ہے۔''

سپاہیوں میں ناشتا بٹ چکا تھا۔ پھیکا دلیا، اُبلے ہوئے انڈے، مونگ پھلی اور کافی۔ وہ ناشتا لے کر ایک طرف آ گئے۔ صبح کے گہرے بادل اب ہلکے ہو رہے تھے اور بارش کا امکان کم ہوتا جا رہا تھا۔ ناشتے کے دوران وہ ایک دوسرے کو اپنے اپنے بارے میں بتاتے رہے۔

''تمہارا ملک خوبصورت ہے۔ کیا میں اسے دیکھ سکتی ہوں؟'' شیلا نے اشتیاق سے پوچھا۔

''ملک سب کے خوبصورت ہوتے ہیں۔ شیلا! تم میرے ملک دیکھ سکتی ہو لیکن وہاں رہ نہیں سکتیں۔''

''زمان! میں ہر اس جگہ رہ سکتی ہوں جہاں تم رہ سکتے ہو۔'' شیلا نے اپنا ہاتھ زمان کے ہاتھ پر رکھ دیا ایک عہد کی علامت کے طور پر۔ ایک ان کہا سا وعدہ تھا جو احساس کی

طرح شیلا کے ہاتھ سے زمان کے وجود میں سرایت کر گیا تھا۔ اس نے یقین کر لیا اور جوابی احساس سے شیلا کو اپنے یقین کا یقین دلایا۔ وہ اب تک محبت کے کرشموں کے بارے میں سنتا آیا تھا۔ آج اس نے تجربہ کر لیا کہ کیسے بن کہے دو افراد ایک دوسرے کی بات جان جاتے ہیں۔ اچانک اسے اپنے پاس کسی کی موجودگی محسوس ہوئی تھی۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔

''کیپٹن! کیا تم چلنے کے لیے تیار ہو؟'' میجر پارکر کا لہجہ سرد تھا۔

''بس میجر سر!'' اس نے کھڑے ہو کر سیلیوٹ کیا۔

''او کے ناؤ گو! تم ٹرک اے میں سوار ہو گے۔''

''سر! کیا ہم پیچھے رہ جانے والوں کی حفاظت کا مناسب بندوبست کر کے جا رہے ہیں۔''

''ہم اس سلسلے میں زیادہ نہیں کر سکتے۔ بہرحال چار افراد اور کچھ اسلحہ رہے گا یہاں پر۔ اینڈ ناؤ مود!'' سپاہی بھاگتے دوڑتے ٹرکوں میں سوار ہو رہے تھے۔ ہر ٹرک میں بیس افراد کی گنجائش تھی۔ چھ افراد میجر پارکر کی جیپ پر سوار تھے اور ہر شرمن ٹینک پر عملے کے تین ارکان کے علاوہ دو دو سپاہی اوپر بیٹھے تھے۔ ٹرکوں کے پیٹرول ٹینک پوری طرح بھر لیے گئے تھے اور ٹرک رکے بغیر ہزار میل کا فاصلہ طے کر سکتے تھے۔ فاضل ٹائرز بھی چڑھا دیے تھے۔ پانی اور راشن کا ذخیرہ تھا۔ تمام بھاری اسلحہ وہ ساتھ لے جا رہے تھے۔ دس بجے ٹرک اور ان کے عقب میں ٹینک چوکی سے نکلے اور کسی قدر شمال مغرب کی طرف روانہ ہو گئے۔ ٹرک اے زمان کی کمانڈ میں تھا جبکہ ٹرک بی لیفٹیننٹ کالنگا کے زیرِ کمان تھا۔ ذرا آگے جانے کے بعد زمان نے کھڑکی سے جھانک کر چوکی کی طرف دیکھا تھا۔ اسے شبہ ہوا تھا کہ آبزرویشن پوسٹ میں ایک سفید وجود کھڑا تھا۔ اگلے ہی لمحے ریت کا ایک ٹیلا اس کے اور چوکی کے درمیان حائل ہو گیا۔

صبح دس بجے تک تین سو لیٹرز پانی جمع ہوا تھا جو وہ سب کا سب اپنے ساتھ لے آئے تھے۔ یہ پانی ان کے ڈیڑھ دن کے لیے کافی تھا۔ ٹرک گل شیر چلا رہا تھا۔ وہ مشکل سے بیس اکیس برس کا نوجوان تھا۔ گزشتہ ایک سال سے زمان کے اردلی کے طور پر کام کر رہا تھا اور اس سے خاصا بے تکلف تھا۔ زمان اسے محاذِ جنگ پر نہیں لانا چاہتا تھا مگر اس کی ضد سے مجبور ہو کر لے آیا تھا۔ اس نے کہا تھا۔ ''صاحب! جہاں آپ اُدھر ہم۔''

مگر موجودہ صورتِ حال میں زمان بھرے سے پچھتا رہا تھا کہ کیوں اسے ساتھ لایا۔ یہ خوبرو نوجوان اسے اپنے بھائیوں کی طرح عزیز تھا۔ گل شیر نے اچانک کہا۔

''صاحب! ایک بات کہوں اپنے میجر صاحب کے بارے میں؟''

''ہاں کہو۔''

''صاحب! میجر اچھا آدمی نہیں ہے۔ اچھا سپاہی بھی نہیں ہے۔ اتنے لوگوں کی موت کا ذمے دار ہے۔ صاحب! یہ شیلا بی بی کو بھی بری نظر سے دیکھتا ہے۔''

زمان چونک گیا۔ ''تمہیں کیسے پتا چلا؟''

''صاحب! ہم نے خود دیکھا۔ یہ شیلا بی بی سے کچھ کہہ رہا تھا پر وہ انکار کر رہی تھی پھر اس نے شیلا بی بی کا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کی پر انہوں نے چھڑا لیا۔ صاحب میں اسے مار دیتا۔''

''گل شیر! احمقانہ باتیں مت کرو۔'' زمان نے سختی سے کہا تھا۔ ''تم نے یہ باتیں کسی اور کے سامنے تو نہیں کی ہیں خاص طور سے کسی ہندو سکھ سے۔''

''نہیں صاحب! میں ان لوگوں سے بات ہی نہیں کرتا ہوں۔''

زمان نے گہری سانس لے کر اپنے اشتعال پر قابو پایا۔ شیلا نے اسے یہ بات نہیں بتائی تھی۔ شاید اسی لیے کہ وہ غصے میں آ کر کوئی حماقت نہ کر گزرے۔ اس نے گل شیر کو حکم دیا۔

''تم یہ بات اور کسی سے نہیں کہو گے۔''

''جیسا حکم صاحب!'' گل شیر نے جواب دیا اور اسٹیئرنگ کاٹ کر ٹرک کو ڈھلان سے اتارنے لگا۔

دو بجے وہ ذرا دیر کے لیے رکے تھے۔ گرمی کی شدت سے سب ہی تیزی سے پانی استعمال کر رہے تھے۔ لنچ کے بعد وہ دوبارہ روانہ ہو گئے۔ اس بار زمان خان کا ٹرک آگے تھا۔ اس کے عقب میں جیپ تھی اور اس کے پیچھے ٹرک اے اور اس کے پیچھے دونوں ٹینک تھے۔ ایک ڈھلان پر سخت جدوجہد کے بعد ٹرک چڑھا کے گل شیر اسے دوسری طرف اتارنے کی تیاری کر رہا تھا کہ زمان نے اسے رکنے کو کہا۔

''گل شیر رک جاؤ۔'' زمان نے دوربین آنکھوں سے لگائی۔ اس کا شک یقین میں بدل گیا۔ تقریباً ایک کلومیٹر کے فاصلے پر ایک جیپ حرکت کر رہی تھی اور اس کا رُخ ان سے کسی قدر بائیں جانب تھا۔ ''گل شیر! ٹرک پیچھے کر فوراً۔''

گل شیر نے پھرتی سے ٹرک کو ریورس گیئر میں ڈالا۔ ٹرک تیزی سے ڈھلان پر واپس آیا۔ گل شیر نے بریک لگا کر اسے قابو کیا۔ ٹرک واپس آتے دیکھ کر پورا قافلہ رک گیا تھا۔ زمان خان ٹرک سے کود کر جیپ کی طرف لپکا۔

''میجر! سامنے سے ایک جیپ آرہی ہے۔ اس کا رُخ ہمارے قدرے بائیں طرف ہے۔ میرا خیال ہے جیپ پر سوار افراد نے میرا ٹرک نہیں دیکھا تھا۔''

''اوہ.....'' میجر پارکر نے کہا۔ پھر وہ سب ڈھلان کی طرف بڑھے۔ اوپری کنارے پر اوندھے منہ لیٹ کر میجر نے دوربین سے جیپ کا معائنہ کیا جو ان کے کسی قدر نزدیک آگئی تھی۔ ''اطالوی.....'' میجر کے منہ سے نکلا۔ ''یہ اطالوی فوجی ہیں۔''

زمان خان دوربین سے عقب کا جائزہ لے رہا تھا۔ ''یہ لوگ اکیلے ہی ہیں۔ دور دور تک کوئی دوسری گاڑی یا انسان نظر نہیں آرہا ہے۔''

''کیپٹن! اس جیپ کے افراد کو زندہ گرفتار کرنا ہے۔'' میجر پارکر نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ''میں خطرے کی بو سونگھ رہا ہوں۔ یہ اس طرف سے آرہے ہیں جس طرف ہمیں جانا ہے۔''

زمان نے جیپ لی اور بارہ افراد منتخب کیے۔ وہ ڈھلان کے ساتھ ساتھ جیپ چلاتا اس طرف جانے لگا جس طرف ڈھلان کے دوسری طرف جیپ کا رُخ تھا۔ وہ جیپ ڈھلان کے بتدریج نزدیک ہوتی جارہی تھی۔ زمان نے ایک بار جائزہ لے کر اندازہ لگایا کہ وہ ڈھلان کے گھومتے کٹاؤ کے اوپر آنا چاہ رہے تھے کیونکہ اس مقام پر ڈھلان نسبتاً کم تھی۔ اس نے جیپ کی رفتار تیز کی اور اس کٹاؤ تک پہنچ گیا۔ اس نے جوانوں کو کٹاؤ میں پھیلا دیا اور اطالوی جیپ کے نزدیک آنے کا انتظار کرنے لگا۔ اس کے ساتھ کالنگا کا ایک جوان تھا جو اطالوی جانتا تھا۔ جب جیپ کٹاؤ سے چند گز دور رہ گئی تھی تو زمان کی ہدایت پر سیاہ فام نے اطالوی میں چلا کر کہا۔

''خبردار! رک جاؤ۔ ہمیں چاروں طرف سے گھیر لیا گیا ہے۔''

اس کے ساتھ ہی زمان کے جوانوں نے تین طرف سے بلند ہو کر اپنی رائفلیں جیپ والوں پر تان لیں۔ یہ تین افراد تھے جنہوں نے موقع کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے ہاتھ بلند کر دیے تھے، ڈرائیور نے ہاتھ تو اوپر نہیں کیے تھے لیکن اس نے ہاتھ اسٹیئرنگ کے اوپری حصے کی طرف کر لیے تھے۔ زمان کے حکم پر جوان گھیرا تنگ کرتے ہوئے جیپ کے نزدیک آنے لگے۔ برطانوی فوج کی وردیاں دیکھ کر اطالوی سپاہیوں کے چہرے تاریک پڑ گئے تھے۔ ڈرائیور کے ساتھ بیٹھا شخص اپنے بیچ سے لیفٹیننٹ لگ رہا تھا۔ اس نے ہونٹوں پر زبان پھیر لر لہا۔

''ہمیں مارنا مت۔ ہم ہتھیار ڈال رہے ہیں۔''

زمان کے جوانوں نے بہ آسانی ان کے ہتھیار لے لیے اور انہیں سروں پر ہاتھ رکھ کر گھٹنوں کے بل ریت پر بٹھا دیا۔ ان کی تلاشی لی اور کاغذات سمیت ملنے والی ہر شے قبضے میں لے لی۔

''انہیں لے کر آؤ۔'' زمان نے حکم دیا اور جیپ لے کر واپس میجر کی طرف آیا۔ ''سر! مشن مکمل ہوا۔ تین اطالوی اور ایک جیپ ہاتھ لگی ہے۔'' اس نے رپورٹ دی۔ میجر پارکر نے کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا تھا۔

چند منٹ بعد تینوں اطالوی قیدی اور ان کے پاس سے برآمد ہونے والے کاغذات اور اسلحہ میجر کے سامنے تھے۔ لیفٹیننٹ البردلو، سارجنٹ زیکو اور سارجنٹ روینو۔ ان کے پاس سے تین خودکار جرمن ساختہ مشین گنیں، ایک اسنائپر رائفل اور ایک اسٹینڈ پر رکھ کر چلائی جانے والی بھاری مشین گن ملی تھی۔ قیدیوں کی حالت سے لگ رہا تھا کہ وہ پیاسے ہیں۔ ان کے پاس پانی نام کی کوئی چیز نہیں ملی تھی۔ میجر نے ترجمان کے توسط سے پوچھا۔

''تم لوگ کہاں سے آرہے ہو۔ باقی فوج کہاں ہے؟''

''ہم RAWAD رواد کے میدانِ جنگ سے آرہے ہیں اور باقی فوج کا ہمیں نہیں پتا۔''

''جرمن کہاں ہیں اور کتنے ہیں؟''

''ہمیں نہیں معلوم۔'' لیفٹیننٹ البردلو نے کمزور لہجے میں کہا تھا۔ ''کیا ہمیں پانی مل سکتا ہے؟''

''کیوں نہیں۔'' میجر پارکر مسکرایا۔ اس نے اپنی چھاگل سے پانی اس کے ڈھکن نما چھوٹے سے گلاس میں ڈال کر اس کی طرف بڑھایا لیکن اس سے پہلے کہ لیفٹیننٹ گلاس لیتا، اس نے اُلٹ کر پانی ریت پر گرا دیا۔ البردلو کی حالت دیکھنے والی تھی۔

''یہ کیا کیا تم نے۔'' اس نے چلّا کر کہا۔

''اس سے کہو کوئی معلومات نہیں ہے تو پانی بھی نہیں ہے۔'' میجر نے ترجمان کی طرف دیکھا۔

''خدا کے لیے۔'' لیفٹیننٹ البردلو نے منت کی۔ اس کے ساتھیوں کی حالت بھی قابلِ رحم تھی۔ وہ نہایت گرسنہ نظروں سے چھاگل کی طرف دیکھ رہے تھے۔

''جرمن کہاں ہیں؟'' میجر دھاڑا۔

''وہ ان اطراف میں کہیں ہیں۔'' لیفٹیننٹ البردلو نے حوصلہ ہار دیا۔ وہ جلدی جلدی بتانے لگا۔ ''رواد RAWAD کی جنگ میں ہم نے اتحادیوں کو شکست دے دی تھی۔ ان کے بہت کم لوگ زندہ بچے لیکن اس جنگ میں ہمارا پانی کا ذخیرہ بھی تباہ ہو گیا۔ اب ہم پانی کی تلاش میں جنوب کی طرف جارہے ہیں۔''

''جنوب..... کہاں؟'' زمان نے بے تابی سے پوچھا۔

''پتا نہیں جناب! لیکن کوئی پرانی برطانوی پوسٹ تھی جہاں سے ہمیں پانی مل سکتا ہے۔''

''میرے خدا! یہ اسی طرف جارہے ہیں۔'' زمان نے میجر کی طرف دیکھا۔

''تم اکیلے کیوں ہو؟'' میجر نے پوچھا۔ اسے بھی فکر لاحق ہو گئی۔

''جرمن ہم اطالویوں کو پانی نہیں دے رہے تھے۔ ہم پانی کی تلاش میں ان سے بچھڑ گئے لیکن ہماری منزل ایک ہی ہے۔ ہم بھی اسی طرف جارہے ہیں۔'' لیفٹیننٹ البردلو نے جواب دیا۔

''تم لوگوں کی تعداد کیا ہے؟ اسلحہ کتنا ہے؟'' زمان نے پوچھا۔

''پلیز پہلے مجھے پانی دو۔ میں اب بولنے کی ہمت بھی نہیں کر پا رہا ہوں۔'' البردلو نے التجا کی۔ زمان نے میجر کی طرف دیکھا اور اس کی رضامندی پا کر چھوٹے گلاس میں پانی البردلو کی طرف بڑھا دیا جسے وہ نہایت بے صبری سے پی گیا۔ اس نے چھاگل کی طرف دیکھا۔ میجر درشت انداز میں بولا۔

''جلدی کرو۔ ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔''

''جرمن اور اطالوی سپاہی ملا کر ایک کمپنی ہے۔'' البردلو نے بادلِ ناخواستہ بتایا۔ ''کمپنی کی کمان کرنل بوٹر کر رہا ہے۔ وہ بہت سفاک آدمی ہے۔''

''اسلحہ کیا ہے؟'' زمان نے گلاس میں دوبارہ پانی ڈالا مگر البردلو کی طرف بڑھایا نہیں۔

''ایک ٹینک ہے لیکن اس میں زیادہ گولے نہیں ہیں البتہ چار ہلکی توپیں اور ساڑھے پانچ انچ کے مارٹرز ہیں۔ بھاری مشین گنیں ہیں۔ چار بکتر بند ہیں جن پر مشین گنیں ہیں۔''

زمان جانتا تھا کہ جرمن کمپنی میں چھ سو افراد ہوتے ہیں اور ان کے پاس اسلحہ بھی زیادہ تھا۔ اگر وہ ان سے پہلے چوکی تک پہنچ جاتے تو چوکی پر قبضہ کرنے میں چند منٹ لگتے۔ چوکی سے زیادہ فکر اسے شیلا کی تھی۔ اس نے جرمنوں کے بارے میں سن رکھا تھا کہ عورتوں کے لیے ان کی سفاکی عروج پر پہنچ جاتی تھی۔

''سر! ہمیں فوری طور پر واپس جانا ہوگا۔'' اس نے کہا۔

لیکن میجر پارکر کے تاثرات سے لگ رہا تھا ایک کمپنی کا سن کر وہ تذبذب میں پڑ گیا ہے۔ جرمن نہ صرف تعداد میں ان سے چھ گنا زیادہ تھے بلکہ بہتر طور پر مسلح بھی تھے۔ ان سے مڈبھیڑ کا مطلب شکست تھا۔ چوکی کے دفاع کے لیے جن صلاحیتوں کی ضرورت تھی وہ خود کو ان سے محروم پاتا تھا۔ محض سو افراد اور تھوڑے اسلحے کے ساتھ یہ کام اس کے لیے بے حد مشکل تھا۔ اسے سوچتے دیکھ کر زمان نے بے تابی سے کہا۔

''میجر سوچو مت۔ ایک ایک لمحہ قیمتی ہے۔ اگر جرمن ہم سے پہلے وہاں پہنچ گئے تو نہ صرف چوکی پر قابض ہو جائیں گے بلکہ نہایت آسانی سے ہمیں شکست دے دیں گے۔''

''ہم ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔'' میجر پارکر کا لہجہ کمزور تھا۔

''کر سکتے ہیں سر! اگر ہم نے چوکی پر قبضہ رکھا تو ہم جرمنوں سے بہت زیادہ بہتر پوزیشن میں ہوں گے۔ جرمن پیاسے ہیں اور پانی پر ہمارا قبضہ ہوگا۔ ہم ان سے سودے بازی کر سکتے ہیں۔''

کیپٹن جونز خاموش تھا اور اس کے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ بھی جرمنی کا سامنا کرنے کے خیال سے لرز رہا ہے۔

''سر! ہم جرمنوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ ہمیں چوکی کی طرف نہیں جانا چاہیے۔''

''اور جنہیں چوکی پر چھوڑ آئے ہیں ان کا کیا ہوگا؟'' زمان تیز لہجے میں بولا۔

''کیپٹن! میرے پیشِ نظر تیس کے مقابلے میں سو افراد کی جان کی اہمیت زیادہ ہے۔'' میجر پارکر نے پُروقار لہجے میں کہنے کی کوشش کی۔ وہ اپنی بزدلی کو منطق کے پیچھے چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔

لیفٹیننٹ کالنگا سامنے آیا۔ ''سر! آپ.... بھول رہے ہیں۔ ہمارے پاس نہ تو زیادہ پانی ہے اور نہ ہی اتنا ایندھن کہ ہم صحرا میں زیادہ دور تک سفر کر سکیں۔ ہمارا چوکی پر واپس پہنچنا لازمی ہے ورنہ ہم جرمنوں کے ہاتھوں نہ سہی پیاس سے ضرور مر جائیں گے۔''

کالنگا کی بات نے میجر پارکر اور کیپٹن جونز کو مجبور کر دیا تھا کہ وہ چوکی کی طرف جانے کا فیصلہ کریں۔ چند لمحے بعد دونوں جیپوں میں زمان اور کالنگا دس سپاہی لے کر بے حد تیزی سے چوکی کی طرف جارہے تھے۔ جیپیں صحرا میں ٹرکوں اور ٹینکوں کی نسبت زیادہ تیزی سے سفر کر سکتی تھیں۔ ان کے پاس چار بھاری مشین گنیں اور دو عدد مارٹرز بھی تھے۔ انہیں

چوکی پہ پہنچتے ہی مورچے بنانے تھے۔ وہ تین بجے نکلے تھے اور زمان خان سارے راستے گل تیر کو رفتار بڑھانے کو کہتا رہا تھا۔ چوکی تک جلد پہنچنے کے جنون میں انہوں نے خطرناک حصوں میں بھی رفتار کم نہیں کی تھی۔ جو فاصلہ انہوں نے آتے ہوئے چار گھنٹوں میں طے کیا تھا وہی واپسی پر ڈھائی گھنٹوں میں طے ہو گیا تھا۔ چوکی کے اردگرد کوئی فوج یا نقل و حرکت کے آثار نہ پا کر زمان نے سکون کا گہرا سانس لیا تھا۔

☆☆☆

شیلا آبزرویشن پوسٹ کے اوپری حصے میں کھڑی زمان کے ٹرک کو جاتے دیکھ رہی تھی۔ اسے احساس بھی نہیں تھا کہ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں۔ اچانک کسی نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ یہ لیفٹیننٹ ٹونر تھا۔ ان چار افراد میں سے ایک جنہیں چوکی کی حفاظت کے لیے یہاں چھوڑا گیا تھا۔ اس کے چہرے پر خباثت اور آنکھوں میں شیطان ناچ رہا تھا۔ شیلا نے ناگواری سے اس کا ہاتھ ہٹا دیا۔ وہ ڈھٹائی سے بولا۔

''ڈیئر رومت! کیا ہوا جو تمہارا محبوب چلا گیا۔ ہم تو ہیں نا۔'' شیلا اس کی بات جواب دیے بغیر جانے لگی تو اس نے پلٹ کر شیلا کا بازو تھام لیا۔ ''مت بھولو پوسٹ کا انچارج اب میں ہوں اور وہ لوگ شاید واپس نہ آئیں۔''

شیلا نے اسے دیکھا۔ ''یہ مت بھولو لیفٹیننٹ کہ وہ واپس بھی آسکتے ہیں۔'' شیلا کٹیلے لہجے میں کہہ کر اپنا بازو چھڑا کر نیچے چلی آئی۔ جو سپاہی معمولی زخمی تھے انہیں کنوئیں سے پانی بھرنے کے کام پر لگا دیا گیا تھا۔ شیلا نے یہ بھی دیکھا کہ ان سے اسلحہ لے لیا گیا تھا اور چوکی میں مسلح افراد صرف لیفٹیننٹ ٹونر اور اس کے تین ساتھی تھے۔ حتیٰ کہ اندر کمروں میں جو اسلحہ رکھا تھا وہ بھی ہٹا دیا گیا تھا۔ شیلا کے ذہن میں خطرے کی گھنٹی بجنے لگی تھی۔ اس نے ہلڈا سے کہا تو وہ بے پروائی سے بولی۔ ''وہم ہے تمہارا۔ ان لوگوں نے کیا کرنا ہے۔''

''مجھے ٹونر اور اس کے ساتھیوں کے ارادے اچھے نہیں لگ رہے ہیں۔ انہوں نے سارا اسلحہ اپنے قبضے میں لے لیا ہے۔'' یہ سن کر ہلڈا بھی فکرمند ہو گئی پھر اس نے آہستہ سے کہا۔

''فکر نہ کرو۔ میں نے دو پستول اپنے پاس چھپا کر رکھے ہیں۔ ان میں سے کسی نے شرارت کی تو بھگتے گا۔''

صبح آئے بادل گیارہ بجے تک مکمل طور پر غائب ہو چکے تھے۔ اس وقت گرمی اپنے عروج پر تھی۔ پانی میسر آنے سے زخمیوں کی حالت بہتر ہو گئی تھی لیکن انہیں علاج کی اشد ضرورت تھی خاص طور سے ایک زخمی جس کے پیٹ میں گولی لگی تھی وہ قریب المرگ لگ رہا تھا۔ دو دن گزرنے کے باوجود اس کے زخموں سے خون رس رہا تھا۔ شیلا اس کے لیے فکرمند تھی۔ اس لڑکے کی عمر بیس سال سے زیادہ نہیں تھی۔ جنگ کا یہ عفریت زیادہ تر نوجوانوں کی قربانی لے رہا تھا۔ بے شمار نوجوان شیلا کے سامنے دم توڑ چکے تھے لیکن رچ نامی اس نوجوان سے اسے خاص انسیت محسوس ہو رہی تھی۔ وہ اسے اپنے بھائی کی طرح لگتا تھا۔ اس وقت بھی وہ اسے چمچ سے گلوکوز اور دودھ کا آمیزہ پلا رہی تھی۔ رچ نے غور سے اسے دیکھا۔

''سسٹر! تم بہت خوبصورت ہو۔''

''شکریہ رچ!'' وہ مسکرائی تھی۔ ''تم بھی بہت اچھے ہو۔''

''سسٹر! ٹونر سے ہوشیار رہنا۔ وہ بدنام آدمی ہے۔ جنگ سے پہلے اس پر ساتھی عورتوں کو ہراساں کرنے کے الزام میں کیس چل رہا تھا۔ میں نے سنا ہے جنگ کی وجہ سے اسے معافی مل گئی تھی۔''

''تم فکر نہ کرو رچ! میں اپنی حفاظت کرنا جانتی ہوں۔''

''کیا بکواس کر رہا ہے یہ میرے بارے میں۔'' اچانک ٹونر سامنے آیا تو شیلا بوکھلا گئی۔

''پلیز ٹونر! یہ زخمی ہے۔ میں اس کی طرف سے معافی مانگتی ہوں۔'' شیلا اس کے سامنے آگئی تھی۔

ٹونر نے اسے اوپر سے نیچے تک دیکھا۔ ''تم معافی کیوں مانگ رہی ہو۔ تم کہو تو میں ویسے ہی اسے معاف کر دوں لیکن بے بی تمہیں میرے کام آنا ہوگا۔''

شیلا نے اسے بے بسی سے دیکھا۔ ''اچھا ابھی تم جاؤ۔ مجھے ان زخمیوں کو دیکھنا ہے۔''

''بے بی! میں تمہارے کمرے میں تمہارا انتظار کروں گا۔ اگر تم ایک گھنٹے تک نہیں آئیں تو میں آجاؤں گا۔ ممکن ہے اس صورت میں ان لوگوں کو کوئی فری شو دیکھنے کے لیے مل جائے۔''

''حرامزادے!'' رچ بولا۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن شیلا نے اسے زبردستی لٹا دیا۔ ٹونر بے غیرتوں کی طرح ہنستا چلا گیا تھا۔ شیلا نے آہستہ سے کہا۔

''تم فکر نہ کرو۔ میں اس سے نمٹ لوں گی۔''

''کاش میرے پاس ایک پستول ہی ہوتا۔'' رچ نے اپنے ہونٹ کاٹے۔

شیلا اوپر سے مسکرا رہی تھی۔ حوصلہ دکھا رہی تھی لیکن اندر

سے مارے فکر کے اس کا برا حال تھا۔ ٹونر کے لہجے میں دھمکی نہیں یقین تھا۔ وہ اس کے کمرے میں انتظار کر رہا ہوگا۔ اس وقت دوپہر کے تین بجے تھے۔ سارے مریضوں کو کھانا کھلا کر اس نے ہلڈا کو تلاش کیا۔ اسے ٹونر کنوئیں کے پاس غسل کرتا نظر آیا۔ وہ بے حد قیمتی پانی بے دردی سے بہا رہا تھا جیسے اسے جواب دہی کا کوئی خوف نہ ہو۔ وہ عریاں تھا اس لیے شیلا نے اس طرف جانے سے گریز کیا۔ وہ اندر آگئی۔ ہلڈا اسے راشن والے حصے میں نظر آئی۔ وہ دلیہ تیار کر رہی تھی۔ اس نے نمکین دلیے میں خشک گوشت کے ٹکڑے بھی شامل کیے..... تھے ساتھ ہی رات کے کھانے کے لیے آلو اُبال رہی تھی۔

''کیا بات ہے شیلا!'' ہلڈا اس کے چہرے کی پریشانی دیکھ کر بولی۔ ''رچ ٹھیک ہے نا؟''

''ہاں رچ ٹھیک ہے لیکن مجھے لگ رہا ہے میری خیریت نہیں ہے۔'' شیلا تھکی ہوئی سی اس کے پاس بیٹھ گئی۔ ''ٹونر نے مجھے کمرے میں بلایا ہے۔ اگر میں نہیں گئی تو وہ زبردستی پر اتر آئے گا۔''

ہلڈا چند لمحے اسے غور سے دیکھتی رہی۔ ''شیلا! مجھے معلوم ہے تم کیپٹن زمان کو پسند کرتی ہو لیکن یہ وقت نہیں ہے۔ تم ٹونر کی بات مان لو۔ بعد میں.....''

''کبھی نہیں۔ میں کبھی خود کو اس کے حوالے نہیں کروں گی۔'' شیلا طیش میں آگئی۔ ''چاہے مجھے اس کے لیے اپنی جان ہی کیوں نہ دینی پڑے۔''

''تمہارے جان دینے سے ٹونر کا کیا بگڑے گا لیکن زمان کا سوچو۔''

''یہ سب اس کے لیے ہی ہے۔ میں خود کو اس کی امانت سمجھتی ہوں۔''

''میں تمہارے لیے کیا کر سکتی ہوں؟'' ہلڈا کے لہجے میں خلوص تھا۔

شیلا نے کہا۔ ''ہلڈا! تم نے کہا تھا تمہارے پاس پستول ہیں۔ مجھے ان میں سے ایک دے دو۔''

''شیلا! ایک بار پھر سوچ لو۔ ہم لڑکیاں جو میدانِ جنگ میں جانے سے پہلے کنواریاں تھیں، واپسی پر ان میں سے کوئی کنواری نہیں ہوتی ہے۔''

''پلیز ہلڈا! مجھے مجبور مت کرو۔''

''ٹھیک ہے۔ تم یہ دلیہ دیکھو میں آتی ہوں۔'' ہلڈا اسے چمچ تھما کر بولی۔ وہ دس منٹ بعد آئی تو اس کے پاس اعشاریہ بائیس کا چھوٹا پستول تھا۔ ''یہ چلانے میں آسان ہے۔'' ہلڈا بولی۔

''فکر مت کرو۔'' شیلا نے پستول لپیٹ لیا۔ ''مجھے مشین گن تک چلانی آتی ہے اور میرا نشانہ بھی برا نہیں ہے۔ دس گز کے فاصلے سے آدمی کا دل چھید سکتی ہوں۔''

''پلیز شیلا! کوشش کرنا ایسی کوئی نوبت نہ آئے۔'' ہلڈا روہانسی ہو رہی تھی۔

''میں کیا کر سکتی ہوں ہلڈا! جب سے زمان سے ملی ہوں کسی اور مرد کا تصور میرے لیے جہنم سے کم نہیں ہے۔''

شیلا باہر نکلی۔ ابھی وہ سوچ رہی تھی کہ کیا کرے۔ اسے ٹونر آتا نظر آیا۔ اس کے تیور خراب تھے۔ ''ڈیڑھ گھنٹا ہو چکا ہے۔''

''مجھے مریضوں کو دیکھنا تھا۔'' شیلا نرمی سے بولی۔ ''وہ میری ذمے داری ہیں۔ ابھی بھی دو مریضوں کی پٹیاں بدلنی ہیں۔''

''گولی مارو انہیں، مرنے دو۔'' ٹونر بے رحمی سے بولا۔

''لیفٹیننٹ! اگر وہ مر گئے اور ہم بچ گئے تو کیا ان کے بارے میں ہم سے نہیں پوچھا جائے گا۔ اس وقت میں کیا کہوں گی کہ تم نے مجھے مجبور کیا تھا۔ میں مریضوں کو چھوڑ کر تمہاری دلجوئی کروں۔''

ٹونر چند لمحے اسے گھورتا رہا۔ ''شیلا! اگر تم بہانہ نہیں کر رہی ہو تو اچھی بات ہے لیکن میں تمہیں اس کام کے لیے ایک گھنٹے سے زیادہ وقت نہیں دے سکتا۔'' وہ ایک جھٹکے سے مڑا اور چلا گیا۔ شیلا زخمیوں والے کمرے میں آگئی۔ دونوں میں سے ایک لازماً زخمیوں والے کمرے میں موجود رہا کرتی تھی کہ نہ جانے کس وقت کس مریض کو ان کی ضرورت پڑ جائے۔ رچ اب سو رہا تھا۔ کچھ زخمی جاگ رہے تھے اور آنکھیں کھولے چھت کی طرف گھور رہے تھے۔ ان میں سے بیشتر مایوس اور ناامید تھے۔ ہلڈا اور شیلا کی کوششیں بھی انہیں زندگی کا یقین دلانے میں ناکام رہی تھیں۔ وہ جانتے تھے کہ ڈاکٹر اور دواؤں کے بغیر وہ زیادہ دن زندہ نہیں رہیں گے۔ شیلا نے پستول اپنے اسکرٹ میں چھپا رکھا تھا۔ اس نے دو زخمیوں کی پٹیاں بلاوجہ تبدیل کیں۔ اس دوران میں ہلڈا وہاں آگئی۔ وہ بھی پریشان لگ رہی تھی۔

''ابھی ٹونر کے ساتھی آئے تھے۔ وہ کہہ رہے کہ رات میں..... ان کے ساتھ.....'' ہلڈا بولتے بولتے رک گئی تھی۔

''یہ لوگ درندے ہیں۔'' شیلا غصے سے بولی۔ ''کاش میجر ان کو چھوڑ کر نہ جاتا۔''

''ان حالات میں سب ہی درندے ثابت ہوتے۔'' ہلڈا تلخی سے بولی تھی۔ ''تم میجر پارکر کو کم سمجھتی ہو۔''

شیلا نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ''تو کیا میجر بھی.....؟''

''ہاں وہ مہذب درندہ ہے۔ اپنی حیثیت کی آڑ میں شکار کرتا ہے۔''

''ہلڈا! ہمیں ان سے نمٹنا ہوگا۔'' شیلا نے اپنے اسکرٹ کو تھپکا۔

''ہم کیا کر سکتے ہیں۔ اگر ان کو مار دیا تو ہمیں بخش دیا جائے گا۔'' ہلڈا بے حد مایوس تھی۔ ''ہمارے لیے کوئی راہ نہیں ہے۔''

شیلا باہر نکل آئی تھی۔ وہ آنے والے وقت سے ڈر رہی تھی۔ خود کو حوصلہ دے رہی تھی کہ اس نے ہر صورت میں خود کو ٹونر سے بچانا ہے۔ وہ کنوئیں کے پاس آئی۔ اب وہاں پر ٹونر کے دوسرے ساتھی نہا رہے تھے۔ شیلا نے ان سے کہا۔

''یہ کیا کر رہے ہو تم لوگ! پانی ضائع مت کرو۔''

وہ ہنسنے لگے۔ ''فکر نہ کرو۔ ہم سے اس کا حساب کوئی نہیں لے گا۔'' ایک نے کہا۔

''پانی کی فکر مت کرو۔'' ٹونر نے عقب سے اس کا بازو پکڑ لیا۔ ''اگر تم چاہو تو بعد میں نہا سکتی ہو۔'' اس کا لہجہ معنی خیز تھا۔ شیلا نے ایک جھٹکے سے اس سے بازو چھڑا لیا اور پیچھے ہٹ کر اسکرٹ سے پستول نکال لیا۔

''اب میرے پاس آئے تو اچھا نہیں ہوگا۔'' اس نے دانت پیس کر کہا۔

''اوہ..... ہو..... اب تم بھی ہتھیار چلاؤ گی۔'' ٹونر کا انداز مذاق اڑانے والا تھا۔

''میں چلا سکتی ہوں۔'' شیلا نے فائر کیا جو ٹونر کے پیروں کے پاس لگا تھا۔ وہ اُچھل کر پیچھے ہٹا۔

''بے بی! تم اپنے حق میں برا کر رہی ہو۔'' ٹونر کا لہجہ خوفناک تھا۔

شیلا، ٹونر کے ساتھیوں کی طرف سے لاپروا ہوئی تھی کہ ایک نے اس پر گیلی مٹی کا گولا کھینچ کر مارا جو اس کی پشت پر لگا۔ شیلا لڑکھڑا گئی۔ ٹونر نے موقع سے فائدہ اٹھا کر اس سے پستول چھین لیا اور وہ آسانی سے اس کے ہاتھ میں آ بھی گیا تھا مگر اس سے پہلے ایک فائر ہو چکا تھا۔ ٹونر لڑکھڑا کر پیچھے ہٹا۔ اس نے حیرت سے اپنے پیٹ پر ہاتھ رکھا۔ جب ہٹایا تو اس کا ہاتھ خون سے بھر گیا تھا۔

''میرے خدا!'' اس کے منہ سے نکلا۔

''تم جیسے شخص کو خدا یاد آتا ہے۔'' شیلا نفرت سے بولی۔

''یہ کیا کیا؟'' ٹونر کے ساتھی اس کی طرف لپکے۔

''دور رہو۔'' ٹونر نے دانت پیسے اور پستول شیلا کی طرف سیدھا کیا۔ ''میں اس کتیا کو ابھی سزا دیتا ہوں۔'' شیلا پیچھے ہٹی تھی مگر کسی نے اسے آگے دھکا دیا۔ ٹونر مسکرایا۔ اس کے انداز میں سفاکی تھی۔ اس نے پستول سیدھا کیا۔ شیلا نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ وہ دھماکے کی منتظر تھی۔ اسے اطمینان تھا اس نے ٹونر کو اس کے عزائم میں ناکام بنا دیا ہے۔ اب اسے مرنے کا غم بھی نہیں تھا مگر پستول چلنے کے بجائے اسے جیپوں کی غراہٹ سنائی دی اور اس نے زمان کی دھاڑ سنی تھی۔

''یہ کیا ہو رہا ہے۔ ٹونر! پستول نیچے کرو۔''

''اس کتیا نے مجھے گولی ماری ہے۔'' ٹونر غرایا۔ ''میں اسے.....'' اس کا جملہ ادھورا رہ گیا تھا کیونکہ زمان نے اپنا پستول نکال کر اس کا سر اڑا دیا تھا۔ شیلا کے لیے کتیا کا لفظ سن کر اس کا دماغ اُڑ گیا تھا۔ اس نے پستول واپس رکھا اور ٹونر کے ساتھیوں کو حکم دیا۔

''اسے دفنا دو اور ہاں تم لوگوں سے بعد میں پوچھ گچھ ہوگی۔ اپنے ہتھیار کالنگا کے حوالے کر دو۔''

شیلا کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ جب ٹونر کی لاش دھماکے سے گری تو اسے ہوش آیا اور وہ دوڑ کر زمان سے لپٹ گئی تھی۔

''زمان! تم آ گئے ورنہ یہ مجھے مار دیتا۔ یہ میری عزت کے درپے تھا۔ میں نے اس پر پستول نکالا۔ ان میں سے کسی نے مجھے کچھ مارا۔ ٹونر نے پستول چھیننے کی کوشش کی اور مجھ سے گولی چل گئی۔'' شیلا نے جلدی جلدی اسے بتایا۔

''تم فکر نہ کرو۔ کوئی تمہیں کچھ نہیں کہے گا۔''

''لیکن کیپٹن! تمہیں اس قتل کا جواب دینا پڑے گا۔'' ٹونر کے ایک ساتھی نے گستاخانہ لہجے میں کہا۔ ٹونر کی لاش دفنانے کے لیے لے جائی جا رہی تھی۔

''سر کہو۔'' زمان نے سرد لہجے میں کہا۔ ''اور جہاں تک جواب دہی کا تعلق ہے تو جرمنوں سے بچ گئے تو..... وہ چوکی کی طرف آ رہے ہیں۔''

''جرمن!'' ان کے چہرے سفید پڑ گئے اور کندھے جھک گئے۔ زمان فوری طور پر مشین گنیں نصب کروانے لگا۔ کالنگا ٹونر کی لاش دفن کروا رہا تھا۔ اس نے ٹونر کے تینوں ساتھیوں سے ہتھیار لے کر انہیں کنوئیں میں اتار دیا تھا کہ وہ پانی جمع کریں۔ پانی کے اسراف پر اس نے تینوں سے سختی سے پوچھا تھا اور انہیں وارننگ دی تھی کہ اب ایک قطرہ بھی

ضائع کیا تو ان کا پانی بند کر دیا جائے گا۔ کالنگا نے انہیں سزا سنائی کہ جب تک وہ ضائع ہونے والے پانی کے کین دوبارہ نہیں بھریں گے انہیں پانی نہیں ملے گا۔ کالنگا کے ساتھ آنے والے سپاہیوں نے پھرتی سے مشین گنیں اور مارٹر نصب کیے تھے۔ زمان نے مارٹر گنوں کے نزدیک اس طرح فٹ کرائے تھے کہ ان سے دائیں اور سامنے کی طرف آسانی سے حملہ کیا جا سکے۔ اس کا اندازہ تھا کہ میجر پارکر باقی افراد کو لے کر کم سے کم ڈیڑھ گھنٹے بعد پہنچے گا۔ اس نے مشین گنوں اور مارٹر پر آدمی لگا دیے تھے۔ اس کے بعد اس نے ٹرک اور گاڑیاں درمیانی اور جنوبی عمارت کے درمیان والے کھلے میدان میں پارک کرائیں۔ یہ جگہ چوکی کے باہر سے براہِ راست حملے سے محفوظ تھی۔ عقبی حصے میں یہ گاڑیاں بہ آسانی جرمنوں کا نشانہ بن جاتیں۔ شیلا اس کے ساتھ لگی تھی۔ آخر زمان کو اسے کہنا پڑا کہ وہ اندر جائے کیونکہ عین ممکن تھا جرمن آتے ہی حملہ کر دیتے۔

''میں تمہارے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ تم میری نظروں سے دور ہوئے تو پھر گم ہو جاؤ گے۔''

''زخمیوں کو تمہاری ضرورت ہے۔'' اس نے نرمی سے یاد دلایا۔ ''ہلڈا بے چاری اکیلی ہے۔''

شیلا بادلِ ناخواستہ اندر چلی گئی۔ زمان لیفٹیننٹ کالنگا کے ہمراہ آبزرویشن پوسٹ میں آ گیا۔ مشرقی اُفق سے چاند نمودار ہو رہا تھا۔ ابھی سورج کی روشنی مغربی اُفق پر واضح تھی لیکن پورے چاند نے مشرقی اُفق کو بھی روشن کر دیا تھا لہٰذا کسی طرف بھی ایک میل تک سب کچھ واضح نظر آ رہا تھا۔ کالنگا اور زمان دوربینوں سے اردگرد پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ سات بجے کے قریب کالنگا نے شمال کی جانب سے گرد و غبار اُڑتے دیکھا۔

''کوئی قافلہ اس طرف آ رہا ہے سر!'' اس نے زمان کو مطلع کیا۔ زمان نے دوربین اس طرف گھما دی۔ فضا میں اس طرح گرد اڑ رہی تھی جیسے کوئی قافلہ ریت پر سفر کر رہا ہو۔ ان کے دل دھڑک اٹھے تھے۔

''اگر یہ جرمن ہوئے سر؟'' کالنگا کا لہجہ سوالیہ تھا۔

''تب بھی ہمیں ان کو چوکی پر قبضے سے حتی الامکان روکنا ہوگا۔''

''یس سر!'' کالنگا نے دوبارہ شمالی اُفق کا جائزہ لینا شروع کیا۔ ''سر! مجھے چند بڑے ہیولے نظر آ رہے ہیں۔ ممکن ہے یہ ٹرک ہوں یا ٹینک۔ اگر یہ ٹینک ہیں تو لازماً جرمن ہیں۔ ان کی تعداد چار ہے۔''

''یہ ہمارا دستہ ہے۔'' زمان نے یقین سے کہا۔ ''دو ٹرک اور دو ٹینک۔''

زمان کا اندازہ درست نکلا تھا۔ پندرہ منٹ بعد میجر پارکر چوکی کے احاطے میں ٹرک سے اتر رہا تھا۔ سپاہی فوری طور پر مورچوں میں چلے گئے۔ ان کی پوزیشنیں پہلے سے طے تھیں۔ دونوں ٹینک چوکی کے مین گیٹ کے دائیں بائیں کھڑے کر دیے گئے تھے اور ٹرک دوسری گاڑیوں والی جگہ پہنچا دیے گئے تھے۔

☆☆☆

''تم نے اسے شوٹ کیوں کیا؟'' میجر پارکر چلایا۔ ''تم جانتے ہو جرمنوں سے مقابلے کے لیے ہمیں ایک ایک فرد کی ضرورت ہوگی۔''

''سر! وہ شیلا کو شوٹ کرنے والا تھا اس وجہ سے مجھے اس پر گولی چلانی پڑی۔''

''یہ سارا قصور شیلا کا ہے۔ اسے مزاحمت نہیں کرنی چاہیے تھی۔'' میجر پارکر بولا۔ ''نہ وہ مزاحمت کرتی نہ یہ حادثہ پیش آتا۔''

''سر۔۔۔ ایک نرس کا جنسی استحصال آپ کی نظر میں اتنا سنگین جرم نہ ہو تب بھی اس نے دو سنگین جرم کیے تھے۔ اپنے ساتھیوں سے اسلحہ لے لینے اور انسانوں کے لیے قیمتی پانی ضائع کرنا۔ ان کی اس حرکت کی وجہ سے ایک سو افراد کی جان خطرے میں پڑ گئی تھی اور اس پر وہ سزائے موت کے حقدار ہیں۔''

''کیپٹن! اگر ہم اس جنگ میں بچ گئے تو تمہیں احتساب کا سامنا کرنا پڑے گا۔'' میجر پارکر کا لہجہ سرد تھا۔

''میجر سر! میں ہر احتساب کے لیے تیار ہوں۔ میرا ضمیر مطمئن ہے۔ میں نے درست فیصلہ کیا تھا۔''

چوکی کی چار دیواری میں بنے مورچوں میں دو دو سپاہی مشین گنوں اور رائفلوں کے ساتھ لگا دیے گئے تھے۔ میجر کے ساتھ آنے والے مارٹرز بھی مناسب جگہوں پر نصب کر دیے گئے تھے۔ میجر نے سختی سے بلیک آؤٹ کا حکم دے رکھا تھا۔ صرف اندرونی کمروں میں مشعلیں روشن تھیں جن کی روشنی باہر نہ آ سکے۔ میجر سے بات کر کے کیپٹن زمان پھر آبزرویشن پوسٹ پر آ گیا تھا۔ سو سے زائد افراد کے آنے سے پانی کا نیا ذخیرہ دیکھتے ہی دیکھتے صاف ہو گیا تھا۔ سپاہی اپنے کوٹے سے زیادہ پانی پی رہے تھے اور فی الوقت انہیں روکا بھی نہیں جا سکتا تھا جرمنوں کے خطرے کے سامنے سپاہیوں میں بے دلی بے حد خطرناک ہو سکتی تھی۔ زمان نے اوپر آنے سے پہلے

ایک ایک مورچے میں جا کر جوانوں کا حوصلہ بڑھایا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ سفید فام سپاہیوں کے حوصلے پست تھے۔ وہ متوقع جرمن حملے سے خوفزدہ نظر آ رہے تھے جبکہ افریقی سپاہیوں کے حوصلے بلند تھے اور وہ جرمنوں سے مقابلے کے لیے پُرعزم تھے حالانکہ یہ ان کی جنگ نہیں تھی۔ خطے پر انگریز قابض ہوں یا جرمن انہیں اس سے خاص فرق نہیں پڑتا تھا لیکن وہ انگریزوں سے کیے عہدِ وفاداری کو آخری دم تک نبھانے کے لیے مستعد تھے۔

''سر! مجھے میجر اور سفید فام سپاہیوں کی جانب سے خطرہ ہے۔'' لیفٹیننٹ کالنگا نے اس سے کہا۔ وہ دوربینوں سے چاروں طرف نظر رکھے ہوئے تھے۔ ''وہ ابھی سے حوصلہ ہار رہے ہیں۔ جرمن سامنے آئے تو یہ ہتھیار بھی ڈال سکتے ہیں۔''

''یہ فیصلہ وہ اکیلے نہیں کر سکتے۔'' زمان نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ''میں نے سفید فام سپاہیوں کو بانٹ دیا ہے۔ وہ ایک جگہ نہیں ہیں۔''

''اگر میجر نے فیصلہ کر لیا تو؟'' کالنگا نے پوچھا۔

''تو ہم اسے ٹیک اوور کر لیں گے۔'' زمان نے پھر اسی انداز میں کہا۔

رات کا کھانا جو دلیے اور تلے ہوئے آلوؤں پر مشتمل تھا، اوپر ہی کھایا تھا۔ کھانے کے بعد شیلا ان کے لیے کافی لائی تھی۔

''زخمیوں کی کیا کنڈیشن ہے؟''

''وہ خوفزدہ ہیں مگر جو صحیح سلامت ہیں وہ ان سے زیادہ خوفزدہ ہیں۔ مجھے ڈر ہے جرمنوں کو سامنے دیکھ کر یہ ہتھیار ڈالنے پر آمادہ نہ ہو جائیں۔ زمان! مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ جرمن بھی درندے ہوتے ہیں۔''

''تم فکر نہ کرو۔ جب تک میں زندہ ہوں ہم جرمنوں کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالیں گے۔''

شیلا، کالنگا کی وجہ سے جھجکی پھر زمان کے سینے سے لگ گئی۔ ''زمان! تم سے ملنے کے بعد میں اس کے لیے تیار نہیں ہوں کوئی اور مرد مجھے چھوئے۔ اس پر میں موت کو ترجیح دوں گی۔''

زمان جھینپ رہا تھا۔ کالنگا نے رُخ دوسری طرف کر لیا تو اس نے اطمینان کا سانس لیا۔

''شیلا! میں نے کہا نا جب تک میں زندہ ہوں تمہیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔''

''سچ زمان!'' شیلا نے سرگوشی کی۔ وہ مزید بے تکلفی پر آمادہ تھی مگر زمان نے اسے نرمی سے الگ کر دیا۔

''شیلا! اب تم نیچے جاؤ اور اگر لڑائی چھڑ جائے تو باہر مت آنا۔''

شیلا نیچے گئی تو زمان نے کھسیا کر کالنگا کی طرف دیکھا جو مسکرا رہا تھا ''سر! عورت گوری ہو یا کالی، عورت ہی ہوتی ہے۔''

''کیا تمہاری زندگی میں کوئی عورت آئی ہے؟''

کالنگا ہنسا ''عورت سے کون بچ سکتا ہے۔ ایک پیچھے میری جان کو رو رہی ہوگی۔ میں کمانے کے لیے پانچ سال پہلے گھر سے نکلا تھا، اب تک واپس نہیں جا سکا۔''

''دیکھو کب جانا نصیب ہوتا ہے..... یا نہیں ہوتا'' زمان نے کافی کی چسکی لی ''میرا خیال ہے جرمن آ بھی گئے تو تاریکی میں حملہ نہیں کریں گے۔''

''جرمن دن میں حملہ کرنا پسند کرتے ہیں'' کالنگا نے اس کی تائید کی ''اس طرح انہیں اپنا ہدف واضح نظر آتا ہے۔ وہ اسے سو فیصد یقین سے تباہ کر سکتے ہیں۔''

''کیا تم جرمنوں کا سامنا کر چکے ہو؟'' زمان نے دلچسپی سے پوچھا۔

''شمالی مغربی افریقہ میں..... جرمنوں نے ہمارے مستقر پر حملہ کیا تھا۔ ہمارے ساتھ فرانسیسی رضاکار بھی تھے۔ مکار انگریزوں نے انہیں آگے رکھا اور اسلحہ بھی معمولی سا دیا تھا۔ انہوں نے بہت بہادری سے مقابلہ کیا تھا مگر جرمنوں نے انہیں کاٹ کر رکھ دیا۔ اس کے بعد برٹش فورس نے اپنے سیاہ فام دستوں کو آگے کیا۔ میں ایک پلاٹون کی کمان کر رہا تھا۔ جب ہم نے شدید لڑائی کے بعد جرمن دستوں کو پسپا کیا تو میرے دستے کے صرف چار افراد زندہ بچے تھے۔ میں بھی زخمی تھا۔ چار مہینے ایک فیلڈ اسپتال میں پڑا رہا۔ زخم بھر گئے تو اپنی کمپنی کے ساتھ مصر بھیج دیا گیا۔''

''ہم سب برٹش مفادات کی بساط پر چلنے والے مہرے ہیں۔ ایک پٹ جاتا ہے تو اس کی جگہ دوسرے مہرے آ جاتے ہیں۔ ہم بساط کے مہروں سے بھی زیادہ بے بس ہیں۔''

جرمنوں کی آمد کے آثار رات دو بجے نمودار ہوئے تھے۔ اس وقت زمان سونے کے لیے جا چکا تھا۔ جرمنوں کی آمد محسوس کرتے ہی ریڈ الرٹ کر دیا گیا تھا۔ جو سو رہے تھے، ہڑبڑا کر بھاگے۔ سب اپنے اپنے مورچوں میں پہنچ گئے تھے۔ زمان نے آبزرویشن پوسٹ کا رخ کیا تھا۔ وہاں میجر پارکر اور کیپٹن جونز بھی موجود تھے۔ جرمنوں کے ٹینک اور ٹرکس نمودار ہو رہے تھے، وہ کسی قدر شمال مغرب سے آئے تھے۔

جہاں ریت نے ڈھلان کی صورت اختیار کی تھی' وہاں جرمن مشینی دستے رکنے لگے۔ ذرا سی دیر میں ڈھلان کا اوپری سرا ان سے بھر گیا۔

''یہ ہمارا جائزہ لے رہے ہیں'' زمان نے کہا۔

''کیا یہ ہماری یہاں موجودگی بھانپ گئے ہیں؟'' میجر پارکر کے لہجے میں مایوسی تھی۔

''اس کے لیے صرف ٹرکوں اور ٹینکوں سے بننے والے ریت کے نشانات کافی ہیں'' زمان نے ملائمت سے کہا ''اب یہ لوگ اندازہ کرنے کی کوشش کریں گے کہ ہماری طاقت کیا ہے۔ ہماری کامیابی اسی میں ہے کہ ہم جرمنوں کو مخمصے میں رکھیں۔ انہیں اپنی درست تعداد اور اسلحے کا اندازہ نہ ہونے دیں۔''

''ہماری اصل طاقت پانی ہے'' کالنگا نے کہا ''جرمن پیاسے ہیں اور پانی کے ذریعے ہم ان سے سودے بازی کرسکتے ہیں۔''

''تم سے کسی نے پوچھا نہیں ہے لیفٹیننٹ!'' کیپٹن جونز سرد لہجے میں بولا ''پلیز! کوائٹ ناؤ۔''

کالنگا نے معنی خیز نظروں سے زمان کی طرف دیکھا۔ اس نے پارکر سے کہا ''میجر' اس وقت ہم دشمن کے سامنے ہیں اور اس سے لڑنے کے لیے معقول تجویز پیش کرنے والے کا رینک دیکھنے والے میرے نزدیک احمق ہوتے ہیں؟''

''تم مجھے احمق کہہ رہے ہو؟'' کیپٹن جونز غرایا۔

''پلیز آفیسرز! اپنے وقار کا خیال رکھیں'' میجر پارکر نے ناگواری سے کہا۔

جرمن دستے بتدریج چوکی کے گرد پھیل رہے تھے۔ انہوں نے اپنے مشینی دستے کو پیچھے ہٹا کر نظروں سے اوجھل کردیا تھا۔ وہ انہیں محفوظ مقام پر رکھنا چاہتے تھے۔ انہیں سب سے زیادہ خطرہ ٹینکوں اور مارٹرز سے تھا۔ جرمن ان چیزوں میں مہارت کی وجہ سے پورے یورپ پر قابض ہوگئے تھے۔ زمان نے میجر سے کہا ''سر! سپاہیوں کی نصف تعداد کو آرام کرنے دیا جائے تاکہ جرمن جب صبح حملہ کریں تو وہ تازہ دم ہوں۔''

''اگر جرمنوں نے ابھی حملہ کردیا تو؟'' کیپٹن جونز نے اعتراض کیا۔

''عام طور سے جرمن رات کو حملہ نہیں کرتے۔ خاص طور سے جب وہ دشمن کی پوری طاقت سے ناواقف ہوں۔ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہم جرمنوں کے بارے میں درست طور پر جانتے ہیں اور وہ ہمارے بارے میں نہیں جانتے۔''

''زمان' درست کہہ رہے ہو۔ سپاہیوں کو باری باری آرام کرکے تازہ دم ہوجانا چاہیے۔ تاکہ کل وہ جنگ میں بھرپور حصہ لے سکیں۔''

طے ہوا کہ سپاہی باری باری دو گھنٹے کے لیے آرام کریں گے۔ کنوئیں سے نکالے جانے والے پانی کے ذخیرے کو مورچوں میں تقسیم کردیا گیا تھا تاکہ سپاہیوں کو پانی کا مسئلہ نہ ہو۔ انہیں مونگ پھلی' بنولے کے بیج اور خشک دودھ کا راشن بھی دے دیا گیا تھا۔ چھ سپاہی مورچوں کے درمیان سرنگیں کھود رہے تھے۔ تاکہ اوپر آنے کا خطرہ مول لیے بغیر ایک مورچے سے دوسرے مورچے تک جایا جاسکے۔ دیواری مورچوں میں تعینات سپاہیوں کو پوری طرح چوکس رہنے کو کہا گیا۔ نفری کی کمی کی وجہ معمولی زخمی سپاہی بھی ڈیوٹی پر تھے۔ کل ایک سو دس افراد تھے۔ ان کے علاوہ انیس زخمی تھے۔ دو نرسیں الگ سے تھیں۔ جرمنوں کی آمد کا سن کر ہی سب الرٹ ہوگئے تھے۔ زمان درمیانی عمارت کے لاک اپ میں قید اطالوی سپاہیوں کے پاس پہنچا۔

''جرمن آگئے ہیں'' اس نے ان سے کہا ''تمہیں پتا ہے اگر ہمیں شکست ہوگئی اور انہوں نے یہ جان لیا کہ تم نے ہمیں ان کے بارے میں بتایا ہے تو وہ تمہارے ساتھ کیا سلوک کریں گے؟''

ترجمان کے توسط سے یہ سن کر البرونو اور اس کے ساتھی لرز گئے۔ ''وہ ہمیں شوٹ کردیں گے' اطالویوں کے لیے ان کا رویہ درست نہیں ہے۔''

''اس لیے اب تم مکمل طور پر ہمارا ساتھ دو۔ یہ بتاؤ کہ ان لوگوں میں جرمن کتنے ہیں اور اطالوی کتنے؟ ان کے پاس پانی کی کیا صورتِ حال ہے؟''

''تقریباً ساڑھے چار سو جرمن اور ڈیڑھ سو اطالوی ہیں'' البرونو نے بتایا ''پانی اتنا تھا کہ اب تک لازماً ختم ہوگیا ہوگا۔ صرف افسران کے لیے کچھ پانی محفوظ تھا۔ اگر جرمن آچکے ہیں تو یقین کرو وہ پانی کی وجہ سے جلد از جلد حملہ کرنے کی کوشش کریں گے۔''

زمان تشویش میں پڑ گیا۔ اگر البرونو کا تجزیہ درست تھا تو جرمن صبح سے پہلے بھی حملہ کرسکتے تھے۔ وہ فوری طور پر آبزرویشن پوسٹ پر پہنچا۔ وہاں کالنگا نے اس کی فکر کو بڑھا دیا ''کیپٹن! جرمن حرکت کررہے ہیں۔ کئی بار ان کے دستے ڈھلان کے اس طرف آچکے ہیں لیکن فوراً واپس چلے جاتے ہیں۔''

''شاید وہ ہمارا رَدِعمل جاننا چاہ رہے ہیں۔ تمام پوزیشنوں پر حکم پہنچادو جب تک ہماری طرف سے ریڈ فلیئر

فائر نہ کیا جائے' حملہ نہ کریں۔''

کالنگا نے اپنا قاصد روانہ کردیا۔ زمان دوربین سے معائنہ کرنے لگا۔ جرمن جس طرح حرکت کررہے تھے' اس سے ان کے عزائم جارحانہ لگ رہے تھے۔ وہ ریت کے ٹیلوں کے پیچھے اپنی پوزیشنیں مضبوط کررہے تھے البتہ ان کی گاڑیاں اور ٹینک نظروں سے اوجھل تھے۔ انہیں شاید ریت کے بڑے ٹیلوں کے پیچھے چھپا دیا گیا تھا۔ اچانک زمان نے ایک ٹیلے کے عقب سے دو افراد کو نمودار ہوتے دیکھا۔ ان میں سے ایک نے بڑا سا سفید جھنڈا اٹھا رکھا تھا۔ ان کا رخ چوکی کے دروازے کی طرف تھا۔ وہ صلح کے لیے آرہے تھے مگر زمان کی چھٹی حس نے اسے خبردار کیا۔ اس طرح وہ چوکی میں ان کی جنگی طاقت کا جائزہ لینے آرہے تھے۔ وہ نیچے کی طرف لپکا اور میجر پارکر کو بتا کر بولا ''میجر! انہیں چوکی سے دور روکنا ہوگا۔ یہ اندر نہ آنے پائیں۔''

''اس صورت میں بات کرنے کے لیے ہمارے کسی آدمی کو باہر جانا ہوگا۔''

''ضرور جائیے..... لیکن یہ اندر نہ آئیں۔ مین گیٹ سے ذرا فاصلے پر رہیں۔ اس دوران میں گیٹ کے سامنے ہمارے آدمی اس طرح نقل و حرکت کریں جس سے آنے والے جرمنوں کو یہ تاثر ملے کہ ہماری نفری کافی زیادہ ہے اور جنگ کے لیے بھرپور تیار ہے۔''

''صلح کی پیش کش'' میجر پارکر نے زیرِلب کہا ''کیپٹن کیا ہم ان سے صلح نہیں کرسکتے' میرا مطلب ہے.....''

''میجر! آپ جانتے ہیں' جرمنوں کی پہلی شرط یہی ہوگی کہ ہم ہتھیار ڈال دیں۔ اس کے بعد وہ ہم سے ہر سلوک کرنے کے لیے آزاد ہوں گے'' زمان کے لہجے میں تلخی تھی۔

''دوسری جانب ہماری طرف سے کیا مطالبہ کیا جاسکتا ہے؟'' پارکر نے سوال کیا۔

''سر' ہم ایک کام کرسکتے ہیں۔ ہم جرمنوں کو پیش کش کرسکتے ہیں کہ وہ ہم سے پانی لے کر یہاں سے چلے جائیں۔'' کیپٹن جونز نے تجویز پیش کی۔

''کیا چھ سو آدمیوں کے لیے پانی کی اس مقدار کا کیپٹن صاحب کو اندازہ ہے' جس پر وہ یہاں سے جانے کے لیے آمادہ ہوسکیں'' زمان نے طنز کیا ''ایک سپاہی کے لیے دو لیٹرز بھی فرض کرلیا جائے تب بھی چار دن کا پانی مہیا کرنے میں ہمیں پورا ایک ہفتہ لگے گا بشرطیکہ اس دوران میں ہم اس پانی سے ایک قطرہ نہ استعمال کریں۔''

کیپٹن جونز کھسیا گیا ''میں نے..... تجویز دی تھی۔''

''میجر! اگر جرمن چوکی پر حملہ کرکے اس پر قابض ہوبھی گئے تو آپ اندازہ کرسکتے ہیں' سب سے پہلے ہمارا پانی بند ہوگا۔ جرمنوں کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ یہ پانی ان کے لیے.. بھی ناکافی ہوگا۔''

بات میجر پارکر کی سمجھ میں آگئی۔ اس نے فوری طور پر بات کرنے کی ذمے داری زمان کے سر ڈال دی ''ان سے بات کرو اور اپنی طرف سے جو مناسب' سمجھو کہو۔''

''میجر! یہ درست نہیں ہے'' کیپٹن جونز نے احتجاج کیا ''کیپٹن زمان جرمنوں کو گمراہ کرے گا۔ وہ اور وہ چوکی پر حملہ کردیں گے۔''

''شٹ اپ کیپٹن! کیا تم زمان کی جگہ جرمنوں سے بات کرسکتے ہو؟''

''نو سر!'' اس نے جلدی سے کہا ''مجھے جرمن زبان نہیں آتی ہے۔''

''جرمن زبان نہیں' بات کرنا آتا ہو'' زمان نے کہا اور میجر پارکر کے خیمے سے باہر آگیا۔ اس نے اپنا خیمہ شمالی اور درمیانی عمارت کے درمیان ریت کے دو ٹیلوں کے درمیان لگوایا تھا۔ ان ٹیلوں پر مزید ریت ڈال کر انہیں بلند کیا جارہا تھا۔ زمان نے ایک افریقی سارجنٹ کو طلب کرکے اسے سمجھایا کہ اس نے کس طرح اپنے جوانوں کی مدد سے مین گیٹ کے سامنے ایسا تاثر دینا ہے کہ جیسے چوکی میں بڑے پیمانے پر جنگی کارروائیاں جاری ہیں۔ ان میں ٹینکوں اور ٹرکوں کی نقل و حرکت بھی تھی۔ اگرچہ دن کی روشنی میں جرمنوں پر خاصی حد تک بھید کھل جاتا۔ زمان کا مقصد یہی تھا کہ جرمن حملے میں زیادہ سے زیادہ تاخیر ہو۔ جتنی دیر ہوگی' ان کی سپاہ پیاس سے اتنی ہی بے حال ہوتی جاتی۔ پیاسے سپاہی زیادہ دیر لڑنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔

اس نے جرمن زبان جاننے والے ایک گورے سپاہی کو ساتھ لیا۔ جرمن پرچم بردار مین گیٹ سے تقریباً سو گز کے فاصلے پر رکے تھے۔ زمان نے نزدیکی مورچے میں تعینات سپاہیوں کو حکم دیا ''اگر جرمن دھوکا کریں اور ہمیں ماردیں تو ان کو بچ کر نکلنے مت دینا۔''

''یس سر!'' مورچے کے مشین گنر نے جواب دیا۔

زمان خان ترجمان کے ساتھ مین گیٹ سے تقریباً پچاس گز آگے گیا اور پھر رک گیا۔ یہ مناسب فاصلہ تھا' یہاں مین گیٹ کے اندر ہونے والی سرگرمیاں نظر آرہی تھیں لیکن واضح نہیں تھیں۔ جرمن آگے نہیں بڑھے تو ترجمان نے زمان کے اشارے پر کہا ''تم لوگوں نے اگر بات کرنی ہے تو یہاں

آؤ۔"

"تم لوگ یہاں کیوں نہیں آتے؟" پرچم بردار کے ساتھ والا جرمن جواباً چلایا "ہم بات کرنے آئے ہیں۔"

"تمہاری مرضی" زمان نے کہا اور واپس جانے کے لیے مڑا تھا کہ جرمن بلند آواز سے بولا۔

"ٹھیک ہے' ہم آرہے ہیں۔"

چند لمحے بعد وہ ان کے سامنے تھا۔ زمان نے اس کے بیجز سے اندازہ لگایا کہ وہ کرنل تھا اور کمپنی میں ایک ہی کرنل ہوسکتا تھا یعنی وہ کمپنی کمانڈر کرنل بوئر تھا۔ ایک لمحے کو زمان کے دل میں آیا کہ اسے یہیں ڈھیر کردے مگر یہ کھلا اعلانِ جنگ اور جنگی اصولوں کے خلاف ہوتا۔ صلح کے ایلچیوں پر ہاتھ نہیں اٹھایا جاسکتا۔ زمان نے سرد لہجے میں پوچھا "ویل' کرنل تم کیا چاہتے ہو؟"

"ہم صلح صفائی سے اس چوکی پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔"

"صلح صفائی سے؟" زمان طنزیہ انداز میں مسکرایا "کرنل ..... سر! کیا برطانیہ عظمیٰ نے یہ چوکی کثیر خرچے سے اس لیے بنائی تھی کہ اسے صلح صفائی سے جرمنوں کے حوالے کردے۔"

"دوسری صورت میں جنگ ہوگی" کرنل بوئر کے لہجے میں دھمکی تھی "کیا تم جنگ کے لیے تیار ہو۔"

"کرنل' اگر تم جنگ چاہتے ہو تو ہم اس کے لیے بھی تیار ہیں لیکن ہم جانتے ہیں' تمہاری پیاسی سپاہ زیادہ دیر تک ہمارا مقابلہ نہیں کرسکتی ہے۔"

کرنل بوئر چونکا "تم یہ بات کیسے کہہ سکتے ہو؟"

"کرنل سر! ہماری قوت صرف اس چوکی تک محدود نہیں ہے۔ صحرا میں ہمارے گشتی دستے بھی ہیں۔ کل ایک دستے نے تین اطالوی سپاہیوں کو گرفتار کیا تھا۔"

"وہ تمہارے پاس ہیں" کرنل بوئر غرایا "غدار.....!"

"بہرحال کرنل! اگر تم صلح کرنا چاہتے ہو تو صلح تمہاری نہیں ہماری شرائط پر ہوگی۔"

"تمہاری کیا شرائط ہیں؟" کرنل بوئر چونکا' اس کی نظریں چوکی کے اندر جاری نقل و حرکت پر مرکوز تھیں۔

"کرنل بوئر! اپنا تمام بھاری اسلحہ ہمارے حوالے کردو۔ اس کے بدلے ہم تمہیں اتنا پانی دے دیں گے کہ تم صحرا عبور کرکے اپنے دستوں سے جاملو۔"

"میں حملہ کرکے تمہاری چوکی پر قبضہ کیوں نہ کرلوں؟..... اس طرح مجھے پانی بھی مل جائے گا اور یہ چوکی بھی۔"

"ضرور..... اگر تم پانی کے لیے اپنے سپاہیوں کا خون بہانا چاہتے ہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن کرنل! میں بتادوں پانی تمہیں پھر بھی نہیں ملے گا۔"

"کیا اس وقت ہمیں تھوڑا پانی مل سکتا ہے؟" کرنل نے پرامید لہجے میں پوچھا۔

"مل سکتا ہے لیکن مفت میں نہیں..... اس کے بدلے تمہیں اپنا کوئی نہ کوئی ہتھیار ہمارے حوالے کرنا پڑے گا۔"

"جرمن اپنا ہتھیار کسی کے حوالے نہیں کرتے" کرنل بوئر تن کر بولا۔

"تب اتحادی بھی اپنا پانی کسی کو نہیں دیتے" زمان نے رکھائی سے جواب دیا۔

کرنل بوئر نے غور سے اسے دیکھا "میرا خیال ہے تم گورے نہیں ہو' کسی ایشیائی نسل سے تعلق ہے تمہارا..... پھر تم ان لوگوں کے لیے کیوں مررہے ہو' جو تمہیں غلام بنائے ہوئے ہیں۔ جرمنی نے آج تک کسی ایشیائی یا افریقی ملک کو غلام نہیں بنایا۔"

"پلیز کرنل! سیاست نہیں..... ہم سپاہی ہیں' ہمیں اپنے شعبے کے بارے میں بات کرنی چاہیے۔"

"میں تمہیں آدھے گھنٹے کے بعد جواب دوں گا" کرنل بوئر واپس چلا گیا۔

زمان اندر آیا اور میجر پارکر کو اپنی گفتگو سے آگاہ کیا' وہ خوش نظر آنے لگا "ویل ڈن کیپٹن!"

"جب صبح وہ ہماری پوزیشن دیکھے گا تو اس پر سب کھل جائے گا" کیپٹن جونز جل کر بولا۔

"میرا مقصد بھی یہی ہے۔ تب ہی میں نے اس کے سامنے ایسی تجویز رکھی تھی جس پر وہ غور کرنے پر مجبور ہوا۔ اگر اس کا فوری حملے کا ارادہ تھا تب بھی وہ کچھ نہ کچھ دیر لگائے گا۔"

کرنل بوئر آدھے کے بجائے ایک گھنٹے بعد آیا تھا' وہ یقیناً اپنے اسٹاف افسران سے مشورہ کررہا تھا۔ زمان جان بوجھ کر کسی قدر تاخیر سے باہر گیا۔ کرنل اس تاخیر پر پیچ و تاب کھا رہا تھا "کیپٹن' کیا فیصلہ کیا ہے تم لوگوں نے؟"

"کرنل! چوکی آپ کے حوالے نہیں کی جاسکتی۔ ہم اس کی ضرورت محسوس نہیں کرتے" زمان نے خشک لہجے میں جواب دیا "البتہ بعض شرائط پر آپ کو پانی مل سکتا ہے۔"

"کن شرائط پر؟"

"دس لیٹر پانی ایک بھاری مشین گن کے بدلے۔ ایک مارٹر کے بدلے آپ سولیٹر پانی لے سکتے ہیں اور ایک ٹینک کے بدلے پانچ سولیٹرز۔"

"اور میں اپنی ساری فوج تمہارے سامنے ڈال دوں تو

تم سارا پانی مجھے دے دو گے؟" کرنل کے لہجے میں طنز تھا۔

"ہم اتحادی قیدیوں کے ساتھ اچھا سلوک کرتے ہیں' آپ اطمینان رکھیں کرنل! اگر آپ ہمارے قیدی بنے تو آپ کو ضرورت کا پورا پانی ملے گا۔"

کرنل بوئر کچھ دیر سوچتا رہا "مجھے فوری طور پر سولیٹرز پانی کی ضرورت ہے۔"

"وہ آپ کو ایک مارٹر اور اس کے دس گولوں کے بدلے مل جائے گا۔"

"گولوں کی بات نہیں ہوئی تھی۔"

"تو اب ہوگئی۔ ہر مشین گن کے ساتھ اس کے ایک ہزار راؤنڈز اور ٹینک کے ساتھ اس کا مکمل گولا بارود۔"

"ٹھیک ہے..... پانی اور مارٹر کا تبادلہ کس طرح ہوگا؟"

"آپ مارٹر اور اس کے گولے لے آئیں..... ہم پانی لاتے ہیں لیکن آپ کے ساتھ پانچ سے زیادہ آدمی نہ ہوں۔ ہماری طرف سے بھی اتنے ہی آدمی آئیں گے۔ تبادلہ اسی جگہ ہوگا۔"

کرنل واپس چلا گیا اور زمان نے اندر آکر میجر کو فیصلے سے آگاہ کیا۔ کیپٹن جونز نے اعتراض کیا "ہم انہیں پانی نہیں دیں گے۔ اس طرح تو ہم اپنے پیروں پر خود کلہاڑی ماریں گے۔"

"میجر سولیٹرز پانی کے بدلے ایک مارٹر اور دس گولے برے نہیں ہیں۔ ہمارے پاس ایک ہتھیار آئے گا اور ان کے پاس کم ہوجائے گا' اس سے یہ تاثر بھی ہوگا کہ ہمارے پاس پانی کی کمی نہیں ہے۔"

"کیا ہمارے پاس اتنا پانی ہے؟"

"اتنا نہیں ہے تب بھی ہوجائے گا۔" زمان نے یقین سے کہا "اگر ٹونز اور اس کے ساتھی پانی ضائع نہ کرتے تو ہمارے پاس دو سولیٹرز سے بھی زیادہ پانی ہوتا۔"

ٹونز کے ذکر پر میجر اور کیپٹن دونوں کا منہ بن گیا مگر میجر پارکر نے اس کے فیصلے کو مان لیا تھا۔ صبح پانچ بجے کے قریب جرمنوں اور اتحادیوں میں جنگ بندی پر عجیب و غریب طریقے سے عمل درآمد ہورہا تھا۔ زمان نے بیس بیس لیٹرز والے پانچ کین کرنل بوئر کے حوالے کیے اور اس نے جواب میں ایک مارٹر اور اس کے دس گولے ان کے حوالے کیے تھے۔ جب کرنل کے آدمی کین اٹھانے کے لیے آگے بڑھے تو زمان نے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا "کرنل! کیا ضمانت ہے کہ مارٹر اور اس کے گولے درست حالت میں ہیں؟"

"تم چیک کرلو" کرنل بوئر کی آواز بدل گئی تھی۔

"مجھے ایک گولا فائر کرکے دکھاؤ" زمان نے بھانپ لیا کہ جرمنوں نے کوئی مکاری کی تھی۔ جرمنوں نے اس کی فرمائش پر مارٹر سیٹ کیا اور اس کا رخ دیران جیسے کی طرف کرکے اس میں گولا ڈالنے لگے۔ زمان نے انہیں روک دیا "یہ نہیں..... یہ والا گولا ڈالو۔"

یہ سن کر جرمنوں کے چہرے چاندنی میں بھی فق نظر آنے لگے۔ کرنل بوئر جلدی سے بولا "کیپٹن! یہ گولے درست نہیں ہیں۔"

"تب یہ گولے لے جاؤ اور درست گولے لے کر آؤ۔"

"ہمیں مجبور نہ کرو کہ ہم حملہ کردیں" کرنل نے دانت پیسے شاید اپنی چال ناکام ہونے پر۔

"کرنل! ہم آپ کو اصلی اور صاف پانی دے رہے ہیں جواب میں ہمیں بھی اچھی چیز چاہیے۔"

کرنل کے ایک ساتھی نے جرمن زبان میں کچھ کہا اور وہ مارٹر اور اس کے گولے اٹھا کر واپس جانے لگے۔ زمان بھی اپنے ساتھیوں سمیت پانی کے کین لے کر چوکی میں آگیا۔ جرمن جاننے والے گورے نے بتایا' کرنل کے ساتھی نے اسے ہتھیار دینے سے منع کردیا تھا۔

"شاید اب جنگ کا سامنا کرنا پڑے" زمان نے خود سے کہا' جب اس نے میجر پارکر کو صورتِ حال سے آگاہ کیا تو اس سے زیادہ کیپٹن جونز بلبلا گیا۔

"دیکھا' میں نے کہا تھا..... یہ شخص جنگ کرائے گا۔"

"میں جنگ اب تک روکے ہوئے تھا۔ اگر وہ رات میں حملہ کرتے تو ہمارے لیے مشکل ہوجاتی۔ اب دن کی روشنی میں ہم بہ خوبی دشمن کا مقابلہ کرسکیں گے۔"

"وہ کس طرح؟" میجر پارکر نے دریافت کیا۔

"سر! میرا اندازہ ہے..... جرمن حملے کی ابتدا مارٹر اور ٹینک کی گولہ باری سے کریں گے۔ ہمیں یہ گولا باری برداشت کرنا ہوگی پھر جب جرمن دستے حرکت میں آئیں گے اور ہمارے پاس آئیں گے تو ہم جوابی حملہ کریں گے۔"

"جرمن اپنے ٹینکوں اور مارٹرز سے ہمیں بھون ڈالیں گے۔"

"بلاشبہ ہمیں نقصان ہوگا لیکن دشمن کو شکست دینے کے لیے یہ نقصان برداشت کرنا پڑے گا۔"

میجر پارکر بزدل سہی لیکن اس میں جنگی معاملات کی سوجھ بوجھ تھی۔ وہ ایسے ہی میجر کے عہدے تک نہیں پہنچ گیا تھا۔ اس نے زمان کا پلان سمجھ لیا تھا۔ "زمان درست کہہ رہا ہے۔ ہم دشمن پر اس وقت جوابی حملہ کریں گے جب اسے زیادہ سے

زیادہ نقصان پہنچا سکیں۔ سپاہیوں سے کہو کہ وہ مورچے مضبوط کریں۔ جرمنوں کے حملہ کرنے سے پہلے ہمیں یہ کام کر لینا چاہیے۔"

"آپ فکر نہ کریں جناب! لیفٹیننٹ کالنگا پہلے ہی یہ کام کروا رہا ہے۔ بوریوں میں ریت بھر کر نئے مورچے بنائے جا رہے ہیں اور پہلے سے موجود مورچوں کو مزید محفوظ کیا جا رہا ہے۔ کاش ہمارے پاس ایک پلٹن اور ہوتی تو عمارتوں کی چھتوں پر بھی ریت کے ڈھیر لگا دیتے۔"

لیفٹیننٹ کالنگا کے افریقی دستے پورے جوش و خروش سے مورچے مضبوط بنانے میں لگے ہوئے تھے۔ مین گیٹ کے خلا کو ریت بھری بوریاں رکھ کر بند کیا جا رہا تھا تاکہ جرمن چوکی تک آ بھی جائیں تو آسانی سے اندر داخل نہ ہو سکیں۔ سفید فام سپاہی مورچوں میں تھے' کل ایک سو دس افراد میں سے بیس سفید فام تھے' باقی افریقی یا کمل شیر اور زمان ہندوستانی تھے۔ زمان جانتا تھا کہ اسے جنگ ان افراد کی مدد سے لڑنا پڑے گی۔ سفید فاموں کی بے دلی ابھی سے نمایاں تھی۔ وہ مورچے بنانے کے کام میں قطعی حصہ نہیں لے رہے تھے اس لیے زمان خان نے انہیں پہرے پر لگا دیا تھا۔ جب صبح کا سورج طلوع ہوا تو زمان نے آبزرویشن پوسٹ سے دیکھا۔ جرمن تین اطراف سے ان کا محاصرہ کر چکے تھے اور ان کے چار عدد ٹینک حملہ آور پوزیشن میں کھڑے تھے۔ لیو پرڈ (چیتا) کہلانے والے یہ ٹینک حرکت پذیری اور فائر پاور میں بے مثال تھے مگر خوش قسمتی سے ان پر ساٹھ ملی میٹر والی دہانے کی توپ نصب تھی ورنہ یورپ میں جو ٹینک استعمال ہو رہے تھے ان پر نوے ملی میٹر دہانے کی توپ تھی جو زیادہ بڑے اور تباہ کن گولے پھینک سکتی تھی۔ چھوٹی نال والے ٹینک طاقت ور گولا نہیں پھینک سکتے تھے۔ بہر حال وہ اب بھی جس فاصلے پر تھے' نہایت آسانی سے پوری چوکی کو نشانہ بنا سکتے تھے۔ آبزرویشن پوسٹ سب سے زیادہ خطرے میں تھی کیونکہ وہ سب سے بلندی پر تھی۔ زمان نے ایک ٹینک سے شعلہ نکلتے دیکھا۔ اس کا رخ آبزرویشن پوسٹ کی طرف تھا۔ زمان چلایا "جھک جاؤ" جیسے ہی وہ اور کالنگا نیچے گرے' گولا شوں کی آواز کے ساتھ پوسٹ کے پاس سے ہوتا جنوبی حصے میں چار دیواری کے اندر جا گرا۔ زوردار دھماکا ہوا۔ زمان اور کالنگا اٹھ کر نیچے کی طرف بھاگے۔ دوسرا گولا پوسٹ پر آ کر لگا تھا اور اس کا ملبا نیچے سیڑھیوں تک آیا تھا۔ وہ بال بال بچے تھے' اس کے ساتھ ہی دشمن نے بھرپور حملہ کر دیا تھا۔ جو سپاہی کھلے میں تھے' وہ اندر بھاگے۔ ان کے لیے یہی حکم تھا البتہ جو مورچوں میں دبکے تھے' وہ وہیں رہے۔ سب سے زیادہ خطرہ دیواروں میں بنے مورچوں کو تھا۔ وہ براہِ راست نشانے پر تھے اگرچہ جہاں مورچے تھے' وہاں دیوار ایک میٹر سے زیادہ چوڑی تھی اور ریت کی بوریاں رکھ کر اسے مزید مضبوط بنا لیا گیا تھا۔ جرمنوں نے روشنی ہوتے ہی بیک وقت ٹینکوں اور مارٹروں سے حملہ کیا۔ ان کے ٹینک پیش قدمی کرتے ہوئے چوکی کی طرف آنے لگے مگر زیادہ خطرہ مارٹر کے گولوں سے تھا کیونکہ وہ نسبتاً اوپر سے آ رہے تھے۔ کئی گولے اب تک عمارتوں پر گر چکے تھے۔ شمالی عمارت زیادہ متاثر ہوئی تھی لیکن اسے رات کو ہی خالی کر دیا گیا تھا۔ اس وقت سارے لوگ درمیانی عمارت کی نچلی منزل میں تھے جو پتھروں سے بنی ہونے کی وجہ سے خاصی محفوظ تھی۔ زخمی اور نرسیں بھی وہیں تھیں۔ سب افراد مسلح تھے حتیٰ کہ زخمیوں کو بھی ہتھیار دے دیے گئے تھے۔

جرمن ٹینک اور مارٹر وقفے وقفے سے گولا باری کر رہے تھے۔ ٹینک چوکی سے کوئی تین سو گز کے فاصلے پر آ کر رک گئے وہ چوکی کی دیوار کو نشانہ بنانے کی کوشش کر رہے تھے لیکن ان کے گولے اس موٹی دیوار پر زیادہ مؤثر نہیں تھے۔ میجر پارکر نے ان پر مارٹرز سے حملہ کرنے کا حکم دیا۔ ان کے پاس چار عدد ساڑھے چار انچ کے مارٹر تھے۔ جن کی حد ہزار گز تک تھی مگر ان کے گولوں کی تعداد سو سے زیادہ نہیں تھی۔ تین سفید فام سپاہیوں نے شمالی سمت ایک مورچے کے پیچھے مارٹر سیٹ کیا اور ٹینک سے فاصلے اور سمت کا اندازہ کرنے کے لیے ایک گولا فائر کیا۔ گولا ٹینک سے چند گز آگے گرا تھا اور اس جوابی حملے نے ٹینک کو پسپا ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ ٹینک ریورس میں چلتا ڈھلان کے دوسری طرف چلا گیا۔ مارٹرز کے چند گولوں نے ٹینکوں کو پسپا کر دیا تھا مگر مارٹرز کا فائر مستقل آ رہا تھا۔ زمان نے حساب لگایا۔ ہر تیسرے منٹ میں ایک گولا گر رہا تھا اس کا مطلب تھا' جرمنوں کے پاس بھی زیادہ گولا بارود نہیں تھا۔ ورنہ وہ تیز فائر کر کے دشمن کو بدحواس کرنے کی حکمت پر کاربند ہا کرتے تھے۔

اب تک گرنے والے گولوں سے ایک نقصان ہوا تھا۔ وسطی خندق میں مارٹر لگنے سے دو سپاہی ہلاک ہو گئے تھے۔ یہ دونوں سفید فام تھے۔ اس کے بعد سفید فام سپاہی کھلے میں آنے سے گریز کرنے لگے مگر ابھی تک کسی نے اپنا فرض ادا کرنے سے انکار نہیں کیا تھا۔ میجر پارکر رات کو ہی اپنا کمانڈ سینٹر وسطی عمارت میں لے گیا تھا۔ اس کے اوپری حصے میں تواتر سے گولے گرنے کی وجہ سے اوپری منزل ملبے کا ڈھیر بن

گئی تھی لیکن کوئی جانی یا کسی اور طرح کا نقصان نہیں ہوا تھا کیونکہ یہ حصہ مکمل طور پر خالی تھا۔ ایک سو تیس میں سے ساٹھ افراد عمارت میں تھے اور ستر افراد مورچوں یا ٹینک میں تھے۔ کیپٹن جونز' زمان کو دیکھتے ہی پھٹ پڑا۔

"بس کچھ دیر بعد ہم اس عمارت کے ملبے تلے دبے ہوں گے۔"

"مسٹر جونز! تمہیں غالباً فوج میں آنے کے بجائے کسی ایسے ملک کا رخ کرنا چاہیے تھا جہاں جانے کے بارے میں جرمن نہ سوچیں۔ ممکن ہے یہ عمارت ہماری توقع کے عین مطابق ملبے کا ڈھیر بن جائے لیکن جنگ میں یہ سب ہوتا ہے۔"

میجر پارکر نے ناگواری سے زمان کی طرف دیکھا "کیپٹن! مختصر بات کیا کرو۔"

"میں مسٹر جونز کو تسلی دے رہا تھا' تسلی ذرا تفصیلی الفاظ میں ہی دی جاتی ہے" زمان کا لہجہ طنزیہ تھا "میں یہ بتانے آیا ہوں کہ ہمارے دو سپاہی سارجنٹ ولفرڈ اور سارجنٹ مچل مارے جا چکے ہیں۔ ان کی پوسٹ پر مارٹر گرا تھا۔ دو افراد کی وہاں پر ضرورت ہے۔"

یہ سن کر اندر موجود افراد کے چہرے سفید پڑ گئے۔ زمان نے دو سفید فام سپاہیوں کی طرف اشارہ کیا "تم دونوں جاؤ۔"

"ہم نہیں جائیں گے" ایک چلایا "وہاں خطرہ ہے۔"

"بکومت" زمان دہاڑا "جانتے ہو حکم عدولی کی سزا..... میں ابھی تمہیں شوٹ کر دوں گا" اس نے پستول کے دستے پر ہاتھ رکھا تو ان دونوں نے بادلِ ناخواستہ باہر کا رخ کیا۔

کیپٹن جونز نے نفرت سے زمان خان کی طرف دیکھا "تم لوگوں کو مردار ہے۔"

"مسٹر جونز! براہ کرم تم جرمنوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے تو اپنا منہ بند رکھو۔ ہمیں ان سے نمٹنے دو۔" زمان نے چڑ کر کہا اور میجر پارکر کی طرف دیکھا "میجر..... میرا خیال ہے جرمن بارہ بجے کے آس پاس حملہ کریں گے کیونکہ ابھی سورج ان کے سامنے ہے' بارہ بجے وہ ان کے اوپر ہوگا۔"

"میجر.....! اگر ہم ابھی جرمنوں سے بات کریں....." جونز نے کہنا چاہا لیکن زمان نے اس کا گریبان پکڑ کر کھینچ لیا۔

"اب اگر تم نے کوئی اختلافی بات کی تو اچھا نہیں ہوگا۔ ہم برطانیہ غلطی کے لیے جان کی بازی لگا رہے ہیں اور تم..... جو خود کو برطانیہ کا شہری کہتے ہو' اس کے دشمنوں سے صلح کی بات کر رہے ہو۔"

"کیونکہ ہم خودکشی نہیں کرنا چاہتے" جونز نے اپنا کالر جھٹکے سے چھڑایا "اب تم نے مجھے ہاتھ لگایا تو....." اس نے اپنے پستول پر ہاتھ رکھا۔ میجر پارکر جلدی سے ان کے درمیان آ گیا۔

"جنٹل مین..... مت بھولیں آپ آرمی افسران ہیں۔ گلی کے بدمعاش نہیں۔ زمان! تم غیر ضروری باتوں سے گریز کرو اور جونز! تم بے دلی پھیلانے کی کوشش مت کرو۔"

"میجر' اس وقت جوانوں کا حوصلہ بلند ہے' اس قسم کی باتوں سے ان کے مورال پر برا اثر پڑے گا۔"

زمان کی توقع کے عین مطابق گیارہ بجے جرمنوں نے بمباری روک دی تھی' اس دوران میں انہوں نے ٹینک اور مارٹر کے ستر سے زیادہ گولے فائر کیے تھے جن سے دو سپاہی ہلاک اور چند ایک معمولی زخمی ہوئے تھے۔ البتہ تینوں عمارات ملبے کا ڈھیر ضرور بن گئی تھیں۔ دو ٹرک بھی اس بمباری کا نشانہ بنے تھے۔ چوکی کی چار دیواری میں جابجا سوراخ ہو گئے تھے۔ مگر کہیں سے بھی دیوار اس طرح نہیں ٹوٹی تھی کہ جرمن بہ آسانی اندر گھس آتے' بمباری رکتے ہی ان سوراخوں کو ریت سے بھری بوریاں رکھ کر بند کیا جانے لگا تھا۔ بوریوں میں ریت پہلے ہی بھر لی گئی تھی۔ زمان جانتا تھا کہ زمینی حملہ بھرپور ہوگا اس لیے وہ دیواری مورچوں کو مضبوط کرنے کی طرف خصوصی توجہ دے رہا تھا۔ ایک طرح سے کمانڈ اس نے سنبھال لی تھی۔ میجر پارکر اس کے کسی اقدام پر اعتراض نہیں کر رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ سفید فام نفری بھی بے چون و چرا اس کے احکامات پر عمل کر رہی تھی۔ سیاہ فام دل و جان سے اس کے ساتھ تھے۔ کالنگا کی وجہ سے بھی اور اس کے اچھے کمانڈر ہونے کی وجہ سے بھی۔ جرمنوں کے حملے کے خلاف جوابی پلان اس نے کالنگا اور چھ دوسرے لیفٹیننٹس کی مدد سے سپاہیوں کو اچھی طرح سمجھا دیا تھا۔ اس نے واضح کیا کہ اپنا ایمونیشن بہت احتیاط سے استعمال کرنا ہے۔ اس نے کنوئیں میں پانی بھرنے والے سپاہیوں کو بھی اوپر بلوا لیا تھا۔ اس معرکے کے لیے اسے ایک ایک سپاہی کی اشد ضرورت تھی۔

جرمنوں کے حملے کو روکنے میں سب سے اہم کردار بھاری مشین گنوں کا تھا جنہیں چاروں طرف اس طرح لگایا تھا کہ پیش قدمی کرنے والے دشمن کو بہ آسانی نشانہ بنا سکے۔ سورج سر پر آتے ہی جرمنوں نے پیش قدمی شروع کر دی تھی۔ ان کی طرف سے ایک بار پھر گولا باری شروع ہو گئی تھی۔ اس بار ان کا نشانہ چوکی کی شمالی دیوار تھی۔ اس دیوار میں سوراخ کر کے جرمن اندر گھسنا چاہتے تھے۔ ٹینک اور مارٹر کے گولے دیوار کے آس پاس گرنے لگے تھے۔ زمان نے فوری

طور پر دو بھاری مشین گنیں شمال کی طرف بنائے گئے مورچوں میں منتقل کرنے کا حکم دیا۔ وہ شمالی عمارت کے ملبے کے اوپر سے میدانِ جنگ کا جائزہ لے رہا تھا۔

جرمنوں نے بھاری مشین گنیں بکتر بند گاڑیوں پر لگا رکھی تھیں جو چوکی کی طرف تواتر سے فائر کر رہی تھیں۔ پیش قدمی کرنے والے جرمن دو اور تین کی تعداد میں ریت کے ابھرے ٹیلوں کے عقب میں چھپے آگے بڑھ رہے تھے۔ چوکی کی دیوار سے ریت کی ڈھلان تک کوئی پانچ سو گز میں یہ کوہان نما ٹیلے سیکڑوں کی تعداد میں تھے اور پیش قدمی کرنے والوں کو اچھی رکاوٹ فراہم کر رہے تھے۔ چوکی کی طرف سے جوابی حملہ نہ ہونے سے جرمنوں کے حوصلے بڑھ گئے تھے۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ ان کی متواتر تین گھنٹے کی گولا باری نے چوکی میں محصور فوج کے کس بل نکال دیے ہیں اور وہ بہ آسانی چوکی پر قابض ہو سکتے تھے۔ شمال اور مغرب سے پیش قدمی کرنے والے حملہ آور جرمنوں کی تعداد کسی طرح بھی تین سو سے کم نہیں تھی۔ یعنی وہ ان سے کئی گنا زیادہ تھے۔ میجر پارکر چوکی کی جنوبی سمت اور کیپٹن جونز مشرقی سمت میں تعینات تھے مگر اس طرف سے جرمن حملے کے آثار نظر نہیں آتے تھے۔ دراصل اس طرف وسیع میدان تھے' جن میں رکاوٹیں نہ ہونے کے برابر تھیں۔ جرمن اس طرف سے حملہ کرتے تو انہیں بھاری جانی نقصان اٹھانا پڑتا۔

جرمن بھاری مشین گنیں مورچوں کو نشانہ بنانے کی کوشش کر رہی تھیں مگر ریت کی بوریوں کی وجہ سے وہ کسی قدر محفوظ تھے۔ پیش قدمی کر کے سپاہی اب چوکی سے تین سو گز کے فاصلے پر تھے۔ زمان کے پاس خاص پستول تھا جس میں مختلف رنگوں کی روشنی کے گرینیڈ لگا کر فائر کیے جا سکتے تھے' یہ گرینیڈ بلندی پر جا کر پھٹ جاتے اور ان سے تیز روشنی نکلتی تھی جو دس سیکنڈ تک میلوں سے نظر آتی تھی۔ زمان نے محسوس کیا کہ جوابی حملہ نہ ہونے کی وجہ سے جرمن اب کسی قدر غیر محتاط انداز میں اور تیزی سے آگے آنے کی کوشش کر رہے تھے۔ چوکی سے ان کا فاصلہ ڈھائی سو گز رہ گیا تھا۔ زمان ملبے کے درمیان میں دبکا دوربین سے جائزہ لے رہا تھا۔ معاً اس نے ایک مارٹر گولا دیوار پر گرتے دیکھا اور کئی گز تک چوکی کی دیوار غائب ہو گئی۔ اب آر پار جانے کے لیے بڑا سا سوراخ تھا اور اس سوراخ کے عین سامنے بھاری مشین گن کا مورچا تھا۔ دیوار میں اور بھی کئی جگہوں پر شگاف پڑ گئے تھے۔

اچانک جرمن بکتر بند گاڑیاں حرکت میں آئیں اور مختلف سمتوں سے ڈھلان سے اتر کر چوکی کی طرف بڑھنے لگیں۔ ان سے نمٹنے کے لیے زمان نے ایک بندوبست اور کر رکھا تھا۔ اس کا ایک نشانچی درمیانی عمارت کے ملبے میں اپنی رائفل سمیت چھپا ہوا تھا۔ اس کا کام بکتر بند کے مشین گنر کو نشانہ بنانا تھا۔ مگر اسے بھی وقت سے پہلے حملہ کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ جرمن رفتہ رفتہ دو سو گز والی حد کے نزدیک آ رہے تھے۔ دو سو گز کے اندر وہ عام رائفلوں اور سب مشین گنوں کی فائر کی زد میں آ جاتے۔ زمان دوربین لگائے زیرِ لب کہہ رہا تھا۔

''آؤ..... دو سو اور آگے آؤ..... دھنستے جاؤ۔''

مورچوں میں تعینات سپاہی اور ان کے لیفٹیننٹس بے تابی سے زمان کی طرف سے جوابی حملے کے منتظر تھے۔ جرمن اب دو سو گز کے اندر تھے اور ان کا انداز ایک بار پھر محتاط ہو گیا تھا۔ اب تک ہونے والے حملے میں مغربی طرف دیواری مورچے میں موجود ایک سارجنٹ سر پر گولی لگنے سے ہلاک ہوا تھا جبکہ اس کا ساتھی زخمی تھا۔ اس مورچے میں نئے سپاہیوں کو لگا دیا گیا تھا۔ لیفٹیننٹ کالنگا رینگتا ہوا اس کے پاس آیا۔ ''سر! حملے کے لیے بے چین ہیں۔''

''انہیں ذرا اوپر آگے آ لینے دو'' زمان نے کہا ''ہمیں پیش قدمی کرنے والوں سے نہیں' بکتر بند کی مشین گنوں سے زیادہ خطرہ ہے۔''

چھ عدد بکتر بند گاڑیاں چوکی کے کوئی چار سو گز کے فاصلے پر پیش قدمی کرنے والے سپاہیوں کو کور فائر فراہم کر رہی تھیں' اس سے آگے آنے کی صورت میں وہ چوکی کے اندر فائر نہیں کر سکتی تھیں۔

''مارٹرز کی کیا پوزیشن ہے؟'' زمان نے پوچھا۔

''چار مارٹرز اس طرف لگا دیے گئے ہیں۔ ٹینک اس صورت میں حرکت میں آئیں گے جب جرمن ٹینک سامنے آئیں گے'' کالنگا نے پلان دہرایا تو زمان نے مطمئن ہو کر سر ہلا دیا۔ اس کے اندازے کے مطابق سو سے زائد جرمن سپاہی دو سو گز کے اندر آ چکے تھے۔ یہ موقع مناسب تھا۔ اس نے پستول اوپر کیا اور گرینیڈ فائر کر دیا۔ دھماکوں کی آواز کے ساتھ دو سو گز کی بلندی تک پہنچا اور سرخ روشنی میں پھٹ گیا' اس کے ساتھ ہی چوکی میں نصب بھاری مشین گنیں گرجنے لگی تھیں۔ مشین گنروں کو حکم تھا کہ وہ نزدیکی جرمنوں کو نظر انداز کر کے دور واقع جرمنوں کو نشانہ بنانے کی کوشش کریں۔ مورچوں میں موجود سپاہ نے نزدیک آنے والے جرمنوں پر فائرز شروع کیے۔ پہلے ہی حملے میں زمان نے درجن بھر جرمنوں کو گرتے دیکھا تھا۔ حملہ شروع ہوتے ہی کالنگا مغربی

دیوار کی طرف چلا گیا تھا۔ یہ حصہ اس کے چارج میں تھا۔ زمان کے نشانچی نے ایک بکتر بند کے مشین گنر کو نشانہ بنایا۔ وہ گولی کھا کر اندر گرا تو بکتر بند کا عملہ گاڑی کو تیزی سے واپس لے گیا تھا۔

جو جرمن بے فکری سے زیادہ ہی نزدیک آ گئے تھے' اب انہیں جان کے لالے پڑ گئے تھے۔ ذرا فاصلے پر موجود جرمنوں کی پیش قدمی مشین گنوں نے روک دی تھی۔ کالنگا کی طرف سے فائر کیا جانے والا مارٹر گولا ایک بکتر بند پر گرا۔ گنر اور گن دونوں کے پرخچے اڑ گئے تھے۔ بکتر بند سے گاڑھا سیاہ دھواں اٹھنے لگا۔ اس میں سے کھانستے اور لڑکھڑاتے جرمن نکلے تو مشین گن کی باڑھ نے پلک جھپکتے میں ان کا صفایا کر دیا مگر اس نقصان کے بعد جرمنوں کے حملے میں شدت آ گئی تھی۔ تازہ دم سپاہیوں کا ایک ریلاریت کی ڈھلان کے عقب سے نکل کر چوکی کی طرف بڑھنے لگا۔ ایک جرمن ٹینک سے نکلنے والے گولے نے مغربی دیوار کے مورچے کا شیرازہ بکھیر دیا تھا۔ اس میں موجود دونوں سپاہی مارے گئے تھے۔ کالنگا نے احتیاطاً سامنے اپنے دستے رکھے تھے اور وہ پوری بے گری سے جرمن دستوں کا مقابلہ کر رہے تھے۔ ان کی طرف سے بے پناہ مزاحمت کے بعد چوکی کے نزدیک آنے والے جرمن سپاہی پسپا ہو کر کوہان نما ٹیلوں کے عقب میں پناہ لینے لگے۔ ابتدائی دس منٹ کی جنگ میں کم سے کم تین درجن جرمن مارے جا چکے تھے اور اتنے ہی زخمی تھے۔ زخمیوں کو ان کے ساتھی اٹھا کر عقبی طرف لے جانے کی کوشش کر رہے تھے اور بھاری مشین گنوں کا نشانہ بن رہے تھے۔ شمالی دیوار کے ایک مورچے سے زخمی سپاہی کے چلانے کی آواز آ رہی تھی۔

زمان کے آس پاس سے گولیاں گزر رہی تھیں۔ ٹینک کا ایک گولا اس سے محض دس گز دور گرا تھا اس کا ٹکڑا لگنے سے اس کے شانے پر ہلکا سا زخم بھی آیا تھا لیکن وہ اس جگہ سے ہٹ نہیں سکتا تھا۔ اپنے قاصد سے اس نے کالنگا کو حکم دیا کہ ریت کی ڈھلان کے سرے کے پار تقریباً چھ سو گز کے فاصلے پر مارٹرز فائر کرے۔ اس نے دیکھا تھا کہ بکتر بند گاڑی اس طرف گئی تھی جس کا گنر مارا گیا تھا۔ اس طرح زخمی ہونے والے جرمنوں کو بھی اس سمت لے جایا جا رہا تھا ممکنہ طور پر جرمنوں کا کیمپ اسی طرف تھا۔ کالنگا نے چند مارٹرز اس طرف فائر کیے' جواب میں اس طرف سے گاڑھا دھواں اٹھتا نظر آیا' مارٹرز کسی نشانے پر لگے تھے۔

تازہ دم جرمن دستے پہلے پیش قدمی کرنے والوں کی جگہ لے رہے تھے۔ اس وقت تقریباً چار سو جرمن میدانِ جنگ میں تھے۔ زمان کا اندازہ تھا کہ کرنل بوئر نے اپنے ریزرو دستے بھی میدان میں جھونک دیے تھے۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ بہرصورت آج کے دن ہی چوکی پر قبضہ کرنا چاہتا تھا۔ پیاس سے پاگل جرمن دیوانہ وار آگے بڑھ رہے تھے۔ گولیاں کھا کر گر رہے تھے مگر ان کے جوش و ولولے میں کمی نہیں آ رہی تھی۔ ان کی نسبت اطالوی پست ہمت تھے' وہ آگے بڑھنے سے ہچکچا رہے تھے۔ جب بھی سامنے سے فائر آتا' وہ پناہ کی تلاش میں بھاگتے تھے۔ ان کے مقابلے میں جرمن سینہ سپر ہو کر بڑھتے تھے۔ ان کی بھرپور کوشش تھی کہ کسی طرح دیوار کے ٹوٹے حصے تک پہنچ جائیں۔ زمان محسوس کر رہا تھا کہ جرمنوں کو کم سے کم دیوار تک پہنچنے سے روکنا مشکل ہے۔ سو دو سو افراد کی قربانی دے کر وہ یہ کام کر سکتے تھے۔ غالباً جرمنوں کے ذہن میں بھی یہی تھا۔ قدم قدم پر ان کی لاشیں گر رہی تھیں مگر وہ پیش قدمی جاری رکھے ہوئے تھے۔

بالآخر چند جرمن دیوار کے ٹوٹے حصے تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ اب وہ ان کی طرف سے کی جانے والی فائرنگ سے محفوظ تھے۔ انہوں نے سب سے پہلے دیوار کے نزدیکی مورچے کو دستی بم سے اڑا دیا۔ اس میں موجود دونوں سپاہیوں کے پرخچے اڑ گئے تھے۔ ٹوٹی دیوار کے سامنے والے مورچے میں کالنگا کے دستے کے دو سیاہ فام بھاری مشین گن کو بڑی مہارت سے استعمال کر رہے تھے۔ انہوں نے جرمنوں کو بھاری نقصان پہنچایا تھا۔ اچانک زمان نے گنر کو الٹ کر گرتے دیکھا' اس کے ماتھے سے خون فوارے کی طرح بلند ہو رہا تھا۔ کسی جرمن نشانچی نے اپنا کام دکھایا تھا۔ اس وقت ایک ایک فرد جرمنوں سے مزاحمت کر رہا تھا۔ دو سپاہی تباہ ہونے والے مورچے کے آگے ریت کی بوریاں رکھ رہے تھے تاکہ جرمن اس راستے سے اندر نہ آ سکیں۔ ایک سپاہی کو دیوار کی آڑ سے نشانہ بنایا گیا۔ وہ چھلانگ ہو کر زمین پر گر پڑا تھا۔ دوسرا فوراً سرنگ میں اتر گیا تھا۔

بھاری مشین گن کا دوسرا سپاہی بے چارہ پریشان تھا کہ مشین گن کس طرح چلائے۔ ایک آدمی اسے چلاتا تھا اور دوسرا اس کی گولیوں کا پٹا سنبھالتا تھا۔ زمان نے سرنگ میں گھسنے والے سپاہی کو چلا کر مشین گن کی طرف جانے کا حکم دیا اور اپنے قاصد سے نشانچی کو پیغام بھیجا کہ وہ جرمن نشانچی کو مار گرائے ورنہ وہ انہیں زیادہ نقصان پہنچا سکتا تھا۔ جرمن ٹینک اب کسی قدر خاموش تھے۔ البتہ ان کی مشین گنیں مصروف تھیں۔ مارٹرز کا فائر مسلسل سے آ رہا تھا۔ جرمنوں کے پاس زمان کے اندازے سے کہیں زیادہ گولے تھے۔ ان گولوں

نے چار مورچوں کو خاصا نقصان پہنچایا تھا۔ چار سپاہی مارے گئے تھے۔ باقی زخمی ہوئے تھے۔ جرمنوں کا دباؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ دوسرا سپاہی سرنگوں سے ہوتا مشین گن تک آ گیا تھا مگر جرمنوں نے دیوار کے ٹوٹے حصے کے سامنے سے اپنی توپیں ہٹالی تھیں۔ مشین گن اس مقام پر انہیں بھاری نقصان پہنچا سکتی تھی۔

مشین گن کا مورچا ٹوٹی دیوار سے کوئی بیس گز کے فاصلے پر تھا۔ وہاں سے جرمنوں نے اس پر دستی بم برسانے شروع کر دیے۔ ایک دستی بم مورچے کے بالکل پاس گرا تھا اور مورچے میں موجود سپاہی بال بال بچے۔ اگر یہ دستی بم ایک گز بھی آگے گرتا تو ان لوگوں کے پرخچے اڑ جاتے۔ زمان نے میگافون پر انہیں بھاری مشین گن سمیت پیچھے آنے کا حکم دیا۔ جیسے جیسے جرمن چوکی کی دیوار کے نزدیک آ رہے تھے' زمان کے سپاہی دیوار کے مورچوں سے پسپا ہو رہے تھے۔ انہیں متبادل پلان پہلے ہی دے دیا گیا تھا۔ وہ اب دیوار سے دور کے مورچوں میں منتقل ہو رہے تھے۔ دیوار کے نزدیک آ جانے والے جرمن بھاری مشین گنوں کی مار سے بھی محفوظ ہو گئے تھے اس لیے زمان کے سپاہی اب ان پر دستی بم پھینک رہے تھے۔ شمالی دیوار پر جرمنوں کا زیادہ زور تھا۔ البتہ مغربی دیوار پر اب تک کالنگا کے دستے ڈٹے ہوئے تھے۔

بھاری مشین گن کو پیچھے لا کر دیوار سے کوئی ساٹھ گز دور کے کنٹینر کے پاس تیار مورچے میں نصب کر دیا گیا تھا' باقی تین مشین گنیں اسی پوزیشن میں تھیں۔ مورچوں سے آنے والے سپاہی اب پچھلے مورچوں اور سرنگوں سے مزاحمت کر رہے تھے۔ زمان کا اندازہ تھا کہ ان کے درجن سے زیادہ سپاہی مارے جا چکے تھے یا شدید زخمی تھے۔ اس کے مقابلے میں جرمن سو سے زیادہ جانوں کی قربانی دے چکے تھے۔ بھاری مشین گنوں سے بچ کر اس کے دو سو کے قریب سپاہی چوکی کی دیوار کی آڑ میں آ چکے تھے۔ زمان نے جنوبی اور مشرقی دیواروں پر تعینات سپاہ کو بھی اس طرف آنے اور مزاحمت کرنے کا حکم دیا تھا۔

اب جرمن اس کوشش میں تھے کہ کسی طرح چوکی کے اندر گھس کر پوزیشن سنبھال لیں۔ زمان نے شمالی دیوار پر کم توجہ دی تھی۔ اس نے زیادہ سپاہی مغربی دیوار کی سمت لگا رکھے تھے کیوں کہ جرمن وہاں تک آ جاتے تو ان کے ٹرک اور ٹینک جرمنوں کے نشانے پر آ جاتے۔ زمان سب سے آخر میں خود پیچھے ہٹا تھا۔ اب جرمنوں کے سامنے شمالی دیوار کا پورا حصہ خالی تھا۔ انہوں نے سب سے پہلے دیواری مورچوں پر قبضہ کیا اور وہاں سے چوکی کی عمارتوں کی طرف فائرنگ کرنے لگے۔ زمان کے ساتھ اس طرف مشکل سے بیس آدمی تھے۔ اس نے بھاری مشین گن والا مورچا خود سنبھال لیا تھا۔ اس اثنا میں جرمن دیوار سے اندر آ کر ریت کے کوہان نما ٹیلوں کے پیچھے مورچے بنانے لگے۔ اس بار بارہ جرمن اس کارروائی میں مارے بھی گئے لیکن پچاس ساٹھ افراد اندر گھس آئے تھے۔ زمان کے ان بیس میں سے سات آٹھ سفید فام تھے اور ان کی حالت خراب تھی۔ اچانک اوپر کی طرف سے میجر پارکر کے دستے نے اندر آنے والے جرمنوں پر حملہ کر دیا۔

گھمسان کی جنگ شروع ہو گئی تھی۔ اتنے فاصلے سے بھاری مشین گن بیکار تھی اس لیے اب لڑنے والے رائفلیں اور مشین گنیں اور دستی بم استعمال کر رہے تھے۔ ایک برسٹ گن کے جواب میں تین جرمن گنیں چل رہی تھیں۔ ایک دستی بم کے جواب میں ان کی جانب سے تین دستی بم آ رہے تھے۔ زمان نے ایک بے حد نزدیک آ جانے والے جرمن سپاہی کو پستول سے شوٹ کیا تھا۔ لگتا تھا کچھ دیر بعد دست بہ دست جنگ کی نوبت آ جائے گی۔ اندر گھس آنے والے جرمنوں کی تعداد سو سے بھی زیادہ ہو چکی تھی اور زمان کے چھ سات سپاہی مارے جا چکے تھے' اس نے سوچا ''اب ٹینکوں کے استعمال کا وقت آ گیا ہے۔''

اس نے میگافون پر کہا ''الفا..... ادھر ی..... موو''

یہ مخصوص کوڈ تھا' اس کا مطلب تھا کہ الفا ٹینک مغربی سمت سے چوکی میں گھس آنے والوں پر حملہ کرے۔ کالنگا عمل کے لیے بالکل تیار تھا۔ مغربی سمت سے شرمن ٹینک بلائے ناگہانی کی طرح نمودار ہوا اور اس پر لگی طاقت ور مشین گن جرمنوں پر آگ و آہن برسانے لگی تھی۔ زمان نے دوبارہ میگافون پر کہا ''برادو..... ادٹو..... موو'' یہ اشارہ تھا کہ دوسرا ٹینک وسطی عمارت کے سامنے کی طرف سے جرمنوں پر حملہ کرے۔ یہی اس سارے پلان کی تھیم تھی۔ کثیر جرمن سپاہ کو ایک ایسی جگہ گھیرنا جہاں سے انہیں اپنے ٹینکوں اور بھاری مشین گنوں کی قطعی مدد نہ مل سکے' وہ مریں یا پسپا ہوں۔ دوسرا ٹینک قدرے جنوب مشرقی سمت سے آیا تھا اور اب جرمن تین طرف سے زد میں آ گئے تھے۔ ٹینکوں کی بھاری مشین گنوں کی زد میں آ کر جرمن گندم کی فصل کی طرح کٹ رہے تھے۔ ٹینکوں کی شمولیت نے پانسا پلٹ دیا تھا۔ جرمن جوان پر حاوی آتے جا رہے تھے' چند منٹ کے اندر نصف سے زیادہ دستہ گنوانے کے بعد بدحواسی کے عالم میں پسپا ہونے لگے۔ مغربی اور مشرقی مورچوں سے سپاہی بھی ان پر گولیاں برسانے لگے

تھے۔ اندر گھس آنے والے تقریباً سوا سو جرمنوں میں سے بہ مشکل پچیس تیس کو باہر نکلنے کا موقع ملا تھا۔ زمان نے چلا کر ان کا تعاقب کرنے کا حکم دیا۔

سپاہی جوش و خروش سے جرمنوں کے تعاقب میں بھاگے تھے۔ دیوار تک ان کو رگیدتے گئے اور پھر مورچوں میں گھس کر بھاگتے ہوئے جرمنوں پر فائرنگ شروع کر دی۔ بلند مقامات سے بھاری مشین گنیں دور نکل جانے والے دشمنوں کی خبر لے رہی تھیں۔ چوکی کے احاطے اور اس کے باہر جہاں تک نظر جاتی تھی' جا بہ جا جرمنوں کی لاشیں بکھری تھیں۔ شرمن ٹینک جرمنوں کے تعاقب میں چوکی کے ٹوٹے احاطے سے باہر نکلے تھے۔ جرمن ٹینکوں نے گولے برسائے مگر وہ نشانے پر نہ لگے۔ شرمن ٹینکوں کی جوابی گولا باری سے دو جرمن ٹینکوں میں آگ لگ گئی تھی اور وہ اسی جلتی حالت میں پسپا ہو گئے تھے۔ یہ ایک شاندار فتح تھی جو انہوں نے طاقت ور دشمن کے خلاف حاصل کی تھی۔ مارے جوش کے نعرے لگاتے سپاہی زمان کے گرد جمع ہونے لگے۔ میجر پارکر یہ منظر دیکھ کر جل گیا۔

''کیپٹن! زیادہ خوش ہونے کی ضرورت نہیں'' اس نے زہریلے لہجے میں کہا ''یہ ٹھیک ہے کہ ہم نے ڈھائی سو جرمن ٹھکانے لگا دیے ہیں مگر ہمارے بھی چالیس سپاہی مارے جا چکے ہیں۔ دس شدید زخمی ہیں۔ محض ساٹھ افراد کے ساتھ ہم جرمنوں کا اگلا حملہ نہیں روک سکتے۔''

''میجر! اتنا مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے'' زمان نے اسے تسلی دی ''جرمن اب زیادہ دیر پیاس برداشت نہیں کریں گے۔ میرا خیال ہے وہ صبح تک ہتھیار ڈال دیں گے۔''

''یہ خوش فہمی ہے تمہاری..... تم جرمنوں کو مجھ سے زیادہ نہیں جانتے..... یہ ضدی قوم مر جائے گی لیکن ہمارے آگے ہتھیار نہیں ڈالے گی۔'' میجر پارکر نے اسی لہجے میں کہا۔

''تب ہم کیا کریں..... محض آنے والے وقت کے خوف سے ان کے آگے ہتھیار ڈال دیں'' زمان تلخی سے بولا۔

''ہمارے پاس اس کے سوا اور کیا چارہ ہے۔ سپاہیوں کی حالت دیکھو..... یہ تھکے ہوئے ہیں۔ کئی زخمی ہیں' اس حالت میں یہ کس طرح لڑیں گے۔''

''یہ لڑیں گے سر! اگر انہوں نے زندہ رہنا ہے تو لڑیں گے ورنہ جرمن ہم میں سے کسی کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔'' زمان نے کہا اور ایک جھٹکے سے پلٹ کر اندر چلا گیا۔ تہ خانہ بم باری سے محفوظ تھا۔

شیلا ایک شدید زخمی جوان کا خون روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔ زخمیوں میں خاصا اضافہ ہو گیا تھا۔ کسی نے ایک کافی کا مگ اسے تھما دیا۔ اسے نہ بھوک کا احساس تھا اور نہ پیاس۔ پچھلے چند گھنٹے میں اس نے جو خونریزی دیکھی تھی' اس نے زمان کے احساسات کو منجمد کر دیا تھا۔ اندر زخمیوں کی چیخ و پکار جاری تھی۔ کوئی خدا کو یاد کر رہا تھا اور کوئی اپنے پیاروں کو..... کوئی اس جگہ مرنا نہیں چاہتا تھا جو اس کے وطن سے ہزاروں میل دور تھی۔ اس فضا سے زمان کو الجھن ہوئی تو وہ دوبارہ باہر آ گیا۔ کالنگا مرنے والے سپاہیوں کی تدفین کروا رہا تھا۔ دو سپاہی پانی کے لیے کنوئیں میں اتر گئے تھے۔ پانی کم ہو گیا تھا۔ نیچے چالیس میٹر والا ایک بڑا کین پہلے ہی سیٹ کیا تھا جسے فوری طور پر اوپر پہنچا دیا گیا تھا۔ اس کے پانی سے تھکے ہوئے اور پیاسے سپاہی تازہ دم ہو گئے۔ انہیں کھانے کے لیے بسکٹ اور پاؤڈر دودھ کا آمیزہ ملا۔ پھر کافی دی گئی تو وہ اپنے ساتھیوں کی موت اور جرمنوں کی بکھری لاشیں بھول کر ہنسنے اور قہقہے لگانے لگے۔

میجر پارکر ایک طرف بیٹھا سگار پی رہا تھا۔ کیپٹن جونز بازو میں گولی لگنے کے بعد نیچے لیٹا تھا۔ ساٹھ افراد میں سے اڑتالیس سیاہ فام تھے اور بارہ سفید فام۔ گل شیر کو زندہ سلامت پا کر زمان نے اطمینان کا سانس لیا تھا ورنہ حملے کے دوران میں وہ اس کے بارے میں فکر مند رہا تھا۔ گل شیر کھانا کھا رہا تھا۔ اس نے گزشتہ رات خود اپنے لیے روٹی بنائی تھی اور اسے ہی کھا رہا تھا۔ بہ قول اس کے اسے فرنگیوں کے بنائے کھانوں پر اعتبار نہیں تھا۔ وہ اپنا کھانا خود بناتا تھا۔ ''گل شیر! تم ٹھیک ہو نا؟''

''جی صاحب!'' اس نے جواب دیا ''لیکن ایک مسئلہ ہو گیا ہے۔ میری نسوار کی ڈبیا غائب ہو گئی ہے۔''

زمان مسکرایا ''فکر نہ کرو۔ اگر زندہ بچ گئے اور اس صحرا سے نکل گئے تو تمہیں ڈھیر ساری نسوار لے دوں گا۔''

''بچنا مشکل نظر آتا ہے صاحب! جرمن دوبارہ آئے گا۔ پانی کے لیے آدمی جان بھی دے سکتا ہے۔ مجھ کو یقین ہے اگر جرمنوں کے پاس پانی ہوتا تو وہ کبھی ایسا حملہ نہیں کرتا'' گل شیر نے چوکی کے اندر اور باہر بکھری لاشوں کی طرف اشارہ کیا ''اس بار وہ پہلے سے زیادہ زوردار حملہ کرے گا۔''

''میرا بھی یہی خیال ہے'' زمان نے کہا اور کالنگا کو بلا کر تمام دیواری مورچوں کو ریت کی بوریوں سے بھرنے کا حکم دیا ''یہ کام سورج غروب ہونے سے پہلے ہو جانا چاہیے۔''

''یس کیپٹن سر!'' کالنگا نے کہا ''ایک بات ہے..... میجر کے ارادے کچھ اور ہیں۔ میرے ایک سپاہی نے اطلاع دی ہے کہ وہ سفید فام سپاہیوں کو ہتھیار ڈالنے کی

ترغیب دے رہا تھا۔''

''خبیث.....'' زمان غرایا ''اب اس پر نظر رکھنا ہو گی۔ کالنگا' یقین کرو..... اگر جرمن چوکی پر قابض ہو گئے تو وہ پانی کی مقدار دیکھ کر ہمیں پیاسا مار دیں گے۔ ہمیں ایک قطرہ بھی نہیں دیں گے۔ اس صحرا میں گرمی ایسی ہے کہ پانی نہ ملے تو آدمی صرف چوبیس گھنٹے میں مر جاتا ہے۔''

کالنگا نے سر ہلایا ''عزیزیہ میں آدمی صرف چار گھنٹے میں بھی مر جاتا ہے۔ یہ لیبیا میں ایک جگہ ہے' جہاں دنیا میں سب سے زیادہ گرمی پڑتی ہے۔ سر! جرمنوں کی لاشوں کا کیا کرنا ہے؟''

''انہیں جمع کر کے چوکی کی دیوار کے باہر پھینک دو لیکن ان کا اسلحہ ضرور جمع کروا لینا۔''

نفری کم ہونے کی وجہ سے زمان خود بھی بوریوں میں ریت بھرنے لگا۔ جن سے دیواری مورچے بند کیے جا رہے تھے۔ عمارتوں کے ملبے کے گرد مورچوں کو مضبوط بنایا جا رہا تھا۔ جرمن حملوں میں دو بھاری مشین گنیں اور دو مارٹر بیرل تباہ ہو گئے تھے۔ دوسرے حملے میں اطالوی سپاہیوں سے ملنے والی جیپ اور مزید ایک ٹرک نشانہ بنے تھے۔ اس حملے میں وہ اپنا ستر فیصد ایمونیشن پھونک چکے تھے۔ اگر جرمن ویسا ہی بھرپور حملہ کرتے تو وہ زیادہ دیر مزاحمت نہیں کر سکتے تھے۔ جرمنوں نے حملے کے دوران میں جس طرح بے دریغ گولا بارود اور ایمونیشن کا استعمال کیا تھا' اس سے لگتا تھا' ان کے پاس ایمونیشن کی کمی نہیں ہے۔ کالنگا نے حکمت عملی سے کام لیا۔ اس نے جرمنوں کی لاشیں ریت کی بوریوں کی جگہ استعمال کیں اور ان سے مورچے بند کر دیے۔ اس نے آ کر زمان کو اسلحے کی رپورٹ دی ''سر! ہائیس خودکار رائفلیں' پچاس ہلکی مشین گنیں اور چار بھاری مشین گنیں ہاتھ لگی ہیں۔ ایمونیشن زیادہ نہیں ہے۔ ہاں' ایک سو تیس دستی بم بھی ہیں۔''

''یہ ہوئی نا کام کی چیز'' زمان خوش ہو گیا۔ ''ہمارے پاس دستی بموں کی کمی تھی جو جرمنوں نے پوری کر دی۔''

''سر! یہ تباہ کن بم ہیں'' کالنگا بولا ''ایسے ایک دستی بم نے میرے سامنے ہماری ایک مشین گن کو پرزے پرزے کر دیا تھا۔''

''اب جنگ میں یہ کام آئیں گے۔ مجھے لگ رہا ہے' اس بار آمنے سامنے جنگ کی نوبت آئے گی۔''

''اگر میجر نے ہتھیار ڈالنے کا فیصلہ نہ کر لیا'' کالنگا کا لہجہ معنی خیز تھا۔

''لیفٹیننٹ! ہم اسے ایسا کرنے نہیں دیں گے' تم ایک آدمی مستقل اس پر لگا دو۔''

''اگر میجر نے کوئی ایسا فیصلہ کیا تو.....''

''شوٹ دم'' زمان کا لہجہ سرد تھا۔ ''ہم ہتھیار ڈالنے پر مرنے کو ترجیح دیں گے۔ دوسری صورت میں زیادہ دردناک موت ہمارا مقدر ہو گی۔''

کالنگا سر ہلاتا چلا گیا۔ زمان نے ملبے پر بلند ترین جگہ سے دوربین کی مدد سے جرمنوں کا جائزہ لیا۔ سورج غروب ہونے والا تھا اور اس کی مدھم پڑتی روشنی میں جرمن ست نظر آ رہے تھے' کبھی کبھی کوئی ذرا جھانک کر چوکی کا جائزہ لیتا تھا۔ زمان نے چوکی کے چاروں طرف بکھری لاشوں کا جائزہ لیا۔ ان کی کل تعداد ایک سو چالیس کے لگ بھگ تھی۔ ستر سے زیادہ لاشیں چوکی کے اندر تھیں اور چند لاشیں جرمن اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ زمان نے حساب لگایا' جرمنوں کے سوا دو سو سے ڈھائی سو افراد ہلاک ہوئے تھے' جبکہ سو کے قریب زخمی ہو کر جنگ میں حصہ لینے کے قابل نہیں رہے تھے۔ گویا جرمنوں کے پاس کم سے کم دو سو افراد حملے کے لیے موجود تھے یعنی اب بھی ان سے تین گنا زیادہ نفری تھی۔ دو ٹینک ناکارہ ہونے کے بعد جرمنوں کے پاس بھی دو ٹینک تھے البتہ ان کے پاس چار عدد بکتر بند گاڑیاں تھیں جن پر مشین گنیں نصب تھیں۔ دیگر ہتھیاروں میں بھی جرمنوں کو برتری حاصل تھی۔

زمان جانتا تھا کہ حالات اچھے نہیں تھے۔ شاید وہ اگلا جرمن حملہ نہ روک پائیں مگر ہتھیار ڈالنے کا اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔ اگر میجر پارکر ہتھیار ڈالنے کا فیصلہ کرتا اور وہ اس کے خلاف بغاوت کرتا تو کالنگا کی وجہ سے سیاہ فام اس کا ساتھ دیتے لیکن سفید فام میجر کا ساتھ دیتے۔ اسے جرمنوں سے پہلے ان سے نمٹنا پڑتا اور یہ صورت حال خطرناک ہو سکتی تھی۔ زمان نے فیصلہ کیا کہ وہ ایسا وقت آنے سے پہلے میجر پارکر سے بات کر لے تو زیادہ بہتر ہو گا۔ وہ نیچے اترا..... میجر پارکر ایک مورچے کے پاس کھڑا سگار سے شغل کر رہا تھا۔ زمان نے بلا تمہید اس سے پوچھا ''سر! آنے والے وقت کے بارے میں آپ نے کیا سوچا ہے؟''

میجر پارکر نے پُرسوچ انداز میں اس کی طرف دیکھا ''تمہارا کیا خیال ہے؟ ہم ساٹھ آدمیوں کے ساتھ ڈھائی سو..... زیادہ بہتر طور پر مسلح فوج سے مقابلہ کر سکتے ہیں؟''

''ہم ایک سو دس افراد کے ساتھ چھ سو بہتر طور پر مسلح فوج کا مقابلہ کر چکے ہیں'' زمان نے سرد لہجے میں کہا۔ ''میں اب بھی چوکی کا بہتر طور پر دفاع کر سکتا ہوں۔''

میجر پارکر نے زمان کے الفاظ میں پوشیدہ پیغام بھانپ لیا تھا ''کیپٹن! مت بھولو..... اس فوج کا کمانڈر میں ہوں اور میں جو حکم دوں' تم سب کو اس پر عمل کرنا ہوگا۔''

''سر! اگر آپ کوئی ایسا حکم دیں جس سے ہم سب کی جان خطرے میں پڑ جائے تو ہمیں حق ہے کہ آپ کا حکم ماننے سے انکار کر دیں'' زمان خان نے مناسب الفاظ میں کہا۔

''نصف نفری تمہاری ضد کی وجہ سے ہلاک ہو چکی ہے۔ اب میں باقی افراد کو اس طرح بلاوجہ نہیں مرنے دوں گا۔''

''سر! ایک بات پر غور کریں..... اگر جرمنوں نے ہتھیار ڈالنے کے بعد ہمیں معاف بھی کر دیا تب بھی ساڑھے تین سو جرمنوں کے مقابلے میں ہمیں پانی سے کیا ملے گا؟ یہ آپ خود سوچ سکتے ہیں۔ پانی نہ ملنے کی صورت میں ہمارے زخمی چوبیس گھنٹے میں ہلاک ہو جائیں گے۔ جو لوگ صحت مند ہیں وہ بھی زیادہ سے زیادہ دو دن میں ہلاک ہو جائیں گے۔ چوبیس گھنٹے میں سات سو لیٹر زپانی جرمنوں کو بھی کم پڑے گا۔ وہ ہمیں اس میں سے ایک قطرہ نہیں دیں گے۔''

''اور تمہارا کیا خیال ہے' اس بار جنگ کے بعد جب وہ چوکی میں داخل ہوں گے تو کیا ہمیں زندہ چھوڑیں گے؟''

''اول تو یہ مفروضہ ہے' ہم عملی طور پر ایک بار انہیں پسپا کر چکے ہیں۔ اب بھی ان کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ ان میں اور ہم میں بنیادی فرق پانی کا ہے۔ ان کے پیاسے سپاہی زیادہ سے زیادہ کل صبح تک جواب دے جائیں گے۔ اس کے بعد نوے فیصد امکان ہے جرمن ہتھیار ڈال دیں گے۔''

''اور انہوں نے حملہ کر دیا تو.....؟''

''تب بھی سر..... ہم آخر تک مقابلہ کریں گے۔ جرمنوں کی تعداد اتنی کم ضرور کر دیں گے کہ جب وہ چوکی پر قابض ہوں گے تب بھی ان کی تعداد اتنی ہوگی کہ پانی ان کے لیے ضرورت سے زیادہ ہوگا تب وہ ہمیں بھی پانی دیں گے'' زمان نے اپنا تجزیہ پیش کیا۔

''وہ ہمیں مار دیں گے'' میجر پارکر غرایا ''کسی کو نہیں چھوڑیں گے۔''

''اس صورت میں بھی مناسب یہی ہے کہ آخر دم تک ان کا مقابلہ کریں۔''

''چوکی پر قبضہ دینے کے عوض ہم ان سے اپنی شرائط منوا سکتے ہیں۔''

''سر..... ایک بار جب ہم ہتھیار ڈالنے کے بعد ان کے رحم و کرم پر ہوں گے' تب ہم ان سے ان شرائط پر عمل کروا سکیں گے؟'' زمان کا لہجہ کاٹ دار تھا۔

''وہ معاہدے کے پابند ہوں گے'' میجر پارکر کا لہجہ کمزور تھا۔

''سر..... سپاہیوں کی اکثریت ہتھیار ڈالنے کے خلاف ہے۔''

''یہ سیاہ فام.....'' میجر کے لہجے میں حقارت تھی۔

''سر! یہ انسان ہیں اور انہیں اپنی زندگی بچانے کا پورا حق ہے'' زمان بولا ''آپ انہیں نظر انداز کر کے کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے۔''

میجر پارکر اسے غور سے دیکھ کر بولا ''اگر میں کوئی فیصلہ کروں تو.....؟''

''سر! ہم اسے ماننے سے انکار کر دیں گے۔ اگر یہ اجتماعی فیصلے کے خلاف ہوا'' زمان نے دوٹوک جواب دیا۔ ''اور ہم آخری دم تک جرمنوں سے لڑنے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔ ہم ہتھیار نہیں ڈالیں گے۔''

''تم لوگ بغاوت کر دو گے؟''

''سر! برٹش رول میں بھی جانتا ہوں۔ اگر فوج کا کمانڈر دشمن سے ساز باز کرے تو جونیئر اس سے بغاوت کر سکتے ہیں۔'' زمان نے کہا تو میجر پارکر خاموش ہو گیا۔

سورج غروب ہوتے ہوتے کالنگا کے سپاہی اپنا کام کر کے مورچوں میں آرام کرنے لگے۔ زمان ان لوگوں کی سخت جانی پر حیران تھا۔ وہ گزشتہ تیرہ گھنٹوں سے متواتر حالتِ جنگ میں تھے اور اس کے باوجود تازہ دم نظر آ رہے تھے۔ زمان بہت زیادہ تھکن محسوس کر رہا تھا لیکن میجر پارکر کے عزائم جان کر اس کے لیے آرام کرنا ممکن نہیں رہا تھا۔ وہ مغربی سمت میں واقع مورچے کے اوپری حصے میں آ بیٹھا تھا۔ وہاں موجود سارجنٹ نے اس سے دبے الفاظ میں کہا تھا ''کیپٹن! نیچے آ جائیں..... یہ جگہ خطرناک ہے۔''

''شکریہ! تم آرام کرو'' زمان نے نرمی سے کہا اس نے دوربین سے جرمنوں کا جائزہ لینے کی کوشش کی مگر ان کی طرف ..... مکمل خاموشی تھی۔ کوئی روشنی بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔ وہ ریت کی ڈھلان کے عقب میں چھپے تھے۔ زمان جانتا تھا' وہ اگلا حملہ کرنے کا منصوبہ بنا رہے تھے۔ چاند طلوع ہو چکا تھا مگر مشرقی افق سے زیادہ بلند نہیں ہوا تھا۔ زمان کا اندازہ تھا کہ جرمن نصف رات کے بعد دوبارہ حملہ کریں گے۔ اس وقت تک اس کے سپاہی آرام کر کے تازہ دم ہو جائیں گے۔ صبح سے پہلے چوکی پر قبضہ ان کے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ تھا۔ اگر وہ کسی طرح صبح تک جرمنوں کو چوکی سے دور رکھنے میں کامیاب ہو جاتے تو پھر امید کی جا سکتی تھی۔

''زمان!'' اچانک اسے شیلا کی آواز آئی' وہ نیچے سے آئی تھی ''میں اوپر آ رہی ہوں۔''

''نہیں رکو..... میں نیچے آ رہا ہوں'' زمان نیچے کود گیا۔ وہ اور شیلا کنوئیں کے پاس ریت کے ایک ٹیلے پر آ بیٹھے۔ شیلا اس کے لیے پانی میں دودھ اور چینی ملا کر لائی تھی۔ ''شیلا' تمہیں آرام کرنا چاہیے تھا۔''

''یہ آرام کا وقت نہیں ہے'' شیلا نے چاند کی طرف دیکھا ''زمان! مجھے ڈر لگ رہا ہے۔''

''کس سے..... جرمنوں سے؟''

اس نے سر ہلایا ''وہ ہر صورت یہاں حملہ کریں گے۔ ہم انہیں کس طرح روکیں گے؟''

''تم اس کی فکر نہ کرو' جب تک میں زندہ ہوں' انہیں اندر نہیں آنے دوں گا' میرے بعد.....''

شیلا نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا ''پلیز..... ایسی باتیں مت کرو' میرے لیے تمہاری زندگی اہم ترین ہے۔ اگر تمہیں کچھ ہوا تو میں بھی زندہ نہیں رہوں گی'' شیلا نے سر اس کے شانے پر رکھ دیا۔

''شیلا! جذباتی باتیں مت کرو'' زمان نے اس کے بال سہلاتے ہوئے کہا ''مجھے اپنا فرض ادا کرنا ہے' تمہارا فرض زخمیوں کی دیکھ بھال ہے۔ تم نے اسے ادا کرنا ہے۔ چاہے میں رہوں یا نہ رہوں؟''

شیلا کچھ دیر خاموش رہی ''زمان اگر ہم بچ گئے تو کیا تم مجھے اپنے گھر لے جاؤ گے؟''

''ہاں' میں تمہیں اپنے گھر لے جاؤں گا۔''

''لیکن تم کہہ رہے تھے' تم لوگوں کے ہاں..... خاندان سے باہر شادی.....'' شیلا جھجک کر خاموش ہو گئی۔

''تم اس کی فکر مت کرو'' زمان نے آہستہ سے کہا۔

چاند رفتہ رفتہ ان کے سامنے بلند ہوتا گیا۔ شیلا اس سے کچھ اور بھی کہنا چاہتی تھی لیکن اس کے پاس الفاظ نہیں تھے۔ زمان کا ہاتھ تھامے اس کے ذہن میں رہ رہ کر ایک ہی خیال آ رہا تھا کہ یہ وقت شاید دوبارہ نہ آئے۔

''زمان' تم آرام کر لو'' اس نے کہا ''تم دو دن سے نہیں سوئے۔''

''آج رات میں نہیں سو سکتا'' زمان نے کہا ''یہ رات سونے والی نہیں ہے۔''

شیلا کھڑی ہو گئی۔ ''ہاں' یہ رات سونے والی نہیں ہے۔ مجھے زخمیوں کی فکر ہے۔ نئے زخمیوں میں سے دو مر چکے ہیں اور پانچ کی حالت نازک ہے۔''

''رچ کیسا ہے؟''

''اس کی قوتِ ارادی اسے زندہ رکھے ہوئے ہے مگر اب وہ زیادہ دیر نہیں گزار سکتا۔ ممکن ہے صبح تک.....''

شیلا کے اندر جانے کے بعد زمان افسردہ ہو گیا۔ ان لوگوں کا سوچ کر جو ابھی اس جنگ کی بھینٹ چڑھیں گے' جنگ ناگزیر تھی۔ وہ ٹیلے پر لیٹ کر آرام کرتا رہا اور کسی ایسی پلاننگ کے بارے میں سوچتا رہا جس سے جرمنوں کو صبح تک چوکی پر قبضے سے روک سکے۔ اس نے مشین گنوں کے لیے درمیانی عمارت کے ملبے کے اوپر ریت کی بوریوں کی مدد سے تین مورچے بنوائے تھے۔ یہاں وہ بھاری مشین گنیں لگا کر جرمنوں کی پیش قدمی روک سکتا تھا۔ ٹینکوں کے بارے میں اس نے فیصلہ کیا تھا کہ انہیں کوئی دیوار کے سامنے لگائے گا۔

مسلسل جاگنے سے اس کے سر میں درد ہو رہا تھا لیکن اسے معلوم تھا' اسے ایک بھی درد کش دوا نہیں مل سکے گی۔ چوکی پر اس نام کی کوئی شے باقی نہیں رہی تھی۔ بارہ بجے وہ اٹھا' اس نے تمام مورچوں کا ایک چکر لگایا۔ ہر مورچے میں دو میں سے ایک سپاہی جاگ رہا تھا۔ مطمئن ہو کر وہ میجر پارکر کے پاس آیا۔ وہ تہ خانے میں اپنے حصے میں بستر پر چت لیٹا تھا۔ کالنگا نے سفید فاموں کو مختلف مورچوں میں تقسیم کر دیا تھا اور میجر کے پاس کوئی نہیں تھا۔ میجر بے بس اور مجبور تھا۔ زمان کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں نفرت چمکنے لگی ''زمان خان! تمہیں اپنے اقدامات کے لیے جواب دینا پڑے گا۔''

''تقریباً نوے افراد کی زندگیاں بچانا میرے لیے زیادہ اہم ہے۔''

''جرمنوں سے مقابلے کی صورت میں ان میں سے کوئی ایک بھی زندہ نہیں بچے گا۔''

''میجر' میں آپ سے بحث نہیں کرنا چاہتا'' اس نے سرد لہجے میں کہا ''زخمیوں اور لڑنے والے سپاہیوں کا فیصلہ ہے کہ ہتھیار نہیں ڈالنے ہیں۔ اس صورت میں جرمنوں کی جانب سے خدشہ ہے کہ وہ سب کو قتل کر دیں گے یا پیاسا مرنے کے لیے چھوڑ دیں گے۔''

''پھر میرے پاس کس لیے آئے ہو' جاؤ جو کرنا ہے کرو۔''

''میجر سر! اس لڑائی میں ہمیں ایک ایک فرد کی ضرورت ہے۔ وہ افراد جو معمولی زخمی ہیں' وہ اس جنگ میں حصہ لیں گے۔ آپ کو بھی لڑنا ہوگا۔''

''میں اس لڑائی کے لیے تیار نہیں ہوں'' میجر پارکر غرایا۔

''سر! برٹش رول کے تحت میدانِ جنگ میں دشمن سے

لڑنے سے انکار کرنے والے کو کیا سزا دی جاتی ہے۔ آپ اچھی طرح جانتے ہیں؟''

میجر پار کر نے خوں خوار نظروں سے اسے دیکھا۔ ''لیکن تم مجھے سزا نہیں دے سکتے۔ جونیئر سینئر کو سزا دینے کا حق نہیں رکھتے ہیں۔''

''سر' آپ بھول رہے ہیں۔ میں رینک میں کم ہوں لیکن اس وقت چوکی کا کمانڈر میں ہوں اور آپ سمیت ہر شخص کو سزا دینے کا اختیار رکھتا ہوں۔'' زمان سخت لہجے میں بولا ''کیا آپ اب بھی انکار کرتے ہیں؟''

میجر پار کر چند لمحے دانت پیستا رہا پھر ایک جھٹکے سے بولا ''آل رائٹ! مجھے کہاں ڈیوٹی دینی ہے؟''

''سر! آپ الفا ٹینک کی کمان کریں۔ اسے چوکی کی گرتی دیوار کے سامنے تعینات کیا جائے گا۔''

''مجھے قبول ہے'' میجر نے اٹھ کر جوتے پہنے اور باہر نکل گیا۔ اس ٹینک کا ڈرائیور اور مشین گنر کالنگا کے خاص آدمی تھے۔ میجر کمانڈ کرنے کے ساتھ توپ بھی استعمال کرتا۔ تازہ زخمیوں میں سے چار دم توڑ چکے تھے اور انہیں ایک خندق میں دفنایا جا چکا تھا۔ اب کل پچیس زخمی تھے۔ جن میں سے پانچ اس قابل تھے کہ مورچے میں بیٹھ کر فائرنگ کر سکتے تھے۔ انہیں مورچوں میں پہنچا دیا گیا تھا۔ ایک سپاہی نے آ کر اطالوی سپاہیوں کا پیغام دیا جو لاک اپ میں تھے۔ وہ زمان سے بات کرنا چاہ رہے تھے۔ زمان ان کے لاک اپ کے سامنے پہنچا۔ اس نے ترجمان کو بلوا لیا تھا۔ البرٹو اسے دیکھ کر بولا ''ہم تمہارے ساتھ مل کر جرمنوں سے لڑنا چاہتے ہیں۔''

''ہمیں تمہاری مدد کی ضرورت نہیں ہے۔''

''ہم پر اعتبار کرو۔ ہم جرمنوں کے ہاتھ آنے کے مقابلے میں مرنے کو ترجیح دیں گے۔''

''ہو سکتا ہے لیکن فی الحال تمہاری مدد کی ضرورت نہیں ہے' جب ہوگی تو بلا لیں گے۔''

زمان نے لاک اپ کی چابیاں شیلا کے حوالے کر دی تھیں اور ہدایت دی ''اگر ہمیں شکست ہونے لگے تو ان کو آزاد کر دینا..... تاکہ یہ اپنی جان بچا سکیں۔''

زمان نے زخمیوں اور نرسوں کے لیے رائفلیں بھی دی تھیں تاکہ جرمن انہیں قتل کرنے کے ارادے سے اندر آئیں تو وہ مزاحمت کر سکیں۔ ان سارے کاموں سے فارغ ہو کر وہ رات ایک بجے باہر آیا تھا۔ کالنگا مشین گن مورچوں کے درمیان سے جرمنوں کا جائزہ لے رہا تھا۔ پندرھویں کے چاند کی روشنی کسی قدر کم ہوتی تھی لیکن صحرا میں دور کا منظر واضح نظر آ رہا تھا ''سر..... میرا خیال ہے..... جرمن اگلے حملے کی تیاری کر رہے ہیں'' اس نے زمان کو دیکھ کر کہا ''ان کی نقل و حرکت میں تیزی آ گئی ہے۔ وہ بار بار چوکی کا جائزہ لینے کے لیے آگے آ رہے ہیں۔''

''اگر وہ ایسا نہ کریں تو مجھے تعجب ہوگا۔ جیسے اس چوکی پر قابض رہنا ہماری بقا کے لیے لازمی ہے' اسی طرح وہ بھی چوکی پر قبضہ کیے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے۔''

''سر' میں نے پانی کا تمام ذخیرہ سپاہیوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ ان سے کہا ہے کہ اسے زیادہ استعمال کریں اور اگر جرمن قابض ہونے لگیں تو پانی ضائع کر دیں۔ میں نے کنوئیں کے گرد اور اس کے اندر بم لگوا دیے ہیں۔ اگر ہمیں شکست ہوگی تو یہ بم بلاسٹ کر کے کنواں تباہ کر دیں گے۔ جرمن اس سے پانی حاصل نہیں کر سکیں گے۔''

''فی الحال وہاں سے سارے بم ہٹا دو'' زمان نے حکم دیا۔ ''اگر ضرورت پڑی تو دو تین دستی بم اسے تباہ کرنے کے لیے کافی ہوں گے۔''

''یس سر!'' کالنگا فوری طور پر حکم کی تعمیل کے لیے روانہ ہو گیا۔

زمان دوربین سے جرمنوں کی نقل و حرکت کا جائزہ لے رہا تھا۔ اچانک دو جرمن ٹینک اور ان کے عقب میں چار بکتر بند شانہ بہ شانہ نمودار ہوئے۔ ان کے عقب میں پیدل سپاہی تھے۔ زمان کے ذہن میں مختصر اور تیز حملے کا خیال آیا۔ یہ حکمت عملی دشمن کے کسی ایک مقام پر قبضے کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔ اس کی مثال تیر کی سی ہوتی ہے جو پسلیاں چیر کر دل میں پیوست ہو جائے۔ اس نے فوری طور ٹینکوں کو حرکت میں آنے کا حکم دیا۔ میگا فون پر اس کی آواز گونجتے ہی سب الرٹ ہو گئے تھے۔ الفا اور برادو ٹینک سامنے آ گئے تھے۔ جرمنوں نے ٹینکوں کی توپ سے حملہ کیا۔ اولین گولے چوکی کی دیوار سے ٹکرائے اور دیوار میں سوراخ ہو گئے۔ زمان نے مارٹرز اس طرف کر کے حملہ کرنے کا حکم دیا۔ مارٹرز کا نشانہ ٹینکوں اور بکتر بند کی آڑ میں آنے والی سپاہ تھی۔ دونوں مارٹرز یکے بعد دیگرے گولے برسانے لگے۔

زمان نے دوربین سے جائزہ لیا۔ ٹینکوں اور بکتر بند کے عقب میں کم سے کم بھی ڈیڑھ سو جرمن سپاہی تھے تو باقی سو کے قریب جرمن کہاں تھے؟ یک دم زمان کو احساس ہوا کہ یہ کوئی چال تھی۔ جرمن اس طرف سے حملے کا تاثر دے کر کسی اور طرف سے چوکی پر حملہ کرنا چاہتے تھے۔ یہیں ممکن تھا' ٹینکوں اور بکتر بند کے پیچھے اتنے جرمن نہ ہوں جتنے ظاہر کیے جا رہے

تھے۔ جب مارٹر گولے ٹینکوں کے اوپر سے گزر کر عقب میں گرے تو فضا میں زیادہ تر ریت اچھلی تھی۔ زمان نے تیزی سے چاروں طرف دیکھا۔ اچانک اس نے مغربی افق کے انتہائی کونے سے دو بڑے سائز کے ٹرک نمودار ہو کر چوکی کی طرف بڑھتے دیکھے۔ اس نے چلا کر مشین گنروں کو ان پر حملہ کرنے کا حکم دیا ''انہیں چوکی کے پاس آنے سے روکو۔''

عجلت میں دو بھاری مشین گنوں کا رخ ان ٹرکوں کی طرف پھیر دیا گیا۔ زمان بے تابی سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ عین ممکن تھا کہ یہ ٹرک بھی دھوکا ہوتے۔ اصل حملہ کسی اور طرف سے ہوتا۔ مشین گنروں نے کمال مہارت سے ٹرکوں کو چوکی کی دیوار سے سو گز پہلے ہی ناکارہ کر دیا تھا۔ اب ان سے کود کود کر جرمن سپاہی چوکی کی دیوار کی طرف بھاگ رہے تھے۔ دوسری طرف ٹینکوں اور بکتر بند سے گولا باری اور بھاری مشین گنوں سے حملے جاری تھے۔ ٹینکوں نے متواتر گولے برسا کر دیوار کا بڑا حصہ گرا دیا تھا پھر ایک شرمن ٹینک کا گولا کارگر رہا اور جرمن ٹینک شعلوں کی زد میں آ گیا۔ اس کا عملہ نکل کر بھاگا۔ دوسرے جرمن ٹینک کی پیش قدمی از خود رک گئی تھی۔ پھر مارٹرز نے دو بکتر بند کو نشانہ بنایا اور انہیں ناکارہ کر دیا۔ ایک تو الٹ گئی تھی۔ زمان نے میگا فون پر الفا کو باہر نکل کر حملہ کرنے والے پیدل جرمنوں کو روکنے کا حکم دیا۔ جرمن تیزی سے حملہ آور ہوئے تھے اور صرف دو مشین گنوں سے انہیں روکنا مسئلہ تھا۔ چند سپاہی دیواری مورچوں تک گئے تھے مگر وہ بھی بے بس تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے پچاس ساٹھ جرمن دیوار تک پہنچ گئے۔ اب دونوں جانب سے ایک دوسرے پر دستی بم برسائے جا رہے تھے۔ جرمن ٹینک پسپا ہو گئے تھے اور بکتر بند بھی پیچھے ہٹ رہی تھیں مگر ان کی جانب سے فائر اور گولا باری کا سلسلہ جاری تھا۔ ایک گولا آ کر بھاری مشین گن کے مورچے پر لگا اور مشین گن خاموش ہو گئی۔

زمان رینگتا ہوا مورچے تک پہنچا۔ گولے کے دھماکے سے ریت کی بوریاں اندر موجود سپاہیوں پر گر گئی تھیں۔ زمان بوریاں کھینچ کر نکالنے لگا۔ ایک اور سپاہی بھی اس کی مدد کے لیے پہنچ گیا تھا۔ متواتر فائر میں یہ کام بے حد خطرناک تھا مگر انہوں نے کسی نہ کسی طرح ساری بوریاں ہٹا دیں۔ یہ دیکھ کر زمان کو دھچکا لگا کہ دونوں سپاہی مدد سے بے نیاز ہو چکے تھے۔ اس نے ان کی لاشیں باہر نکال کر خود مشین گن سنبھالی اور بکتر بند کے مشین گنروں کو نشانہ بنانے کی کوشش کرنے لگا۔ مدد کے لیے آنے والا سپاہی اب گولیوں کی بیلٹ سنبھال رہا تھا۔

الفا ٹینک گھوم کر چوکی کے مغربی حصے میں پہنچا جہاں سے جرمن سپاہی مورچے بنا کر اندر حملے کر رہے تھے۔ ٹینک پر لگی مشین گن نے ایک ہی حملے میں درجن سے بھی زیادہ جرمن سپاہی صاف کر دیے تھے۔ پھر توپ کے حملے نے ان کے پاؤں اکھاڑ دیے۔ بچنے والے جرمن الٹے قدموں واپس بھاگے۔ ریت کی ڈھلان کے دوسری طرف جاتے جاتے ان میں سے کئی اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔ صحرا کی ریت ان تازہ شکاروں کے لہو سے سیراب ہو رہی تھی۔ زمان اور برادو ٹینک کے جوابی حملے جرمن مشینی دستوں کو پسپا کر رہے تھے۔ دو مشین گنر گنوانے کے بعد ان کے حوصلے پست ہو گئے تھے اور جرمن ایک بار پھر ریت کے پیچھے روپوش ہو گئے تھے۔ تازہ حملوں میں ان کے کم سے کم ستر آدمی مارے گئے تھے۔

جرمنوں کی پسپائی ان کی دوسری فتح تھی۔ اس حملے میں جرمن مزید ایک ٹینک اور دو بکتر بند سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔ زمان مشین گن کے مورچے سے نکل کر نیچے آیا تو جمع ہونے والے سیاہ فام سپاہیوں کے چہرے اترے ہوئے تھے۔ زمان کا دل دھک سے رہ گیا ''کیا ہوا..... کالنگا کہاں ہے؟'' اس نے پوچھا۔

چار سپاہی کالنگا کو لے کر آ رہے تھے۔ انہوں نے اس کی لاش ریت پر رکھی تو زمان لڑکھڑا گیا۔ اس افریقی نوجوان سے اسے ان چند دنوں میں گہری انسیت ہو گئی تھی۔ دو گولیاں اس کے چوڑے سینے کے آر پار ہو گئی تھیں۔ بعض افریقی بلند آواز سے رونے لگے۔ زمان نے اس کے چہرے سے ریت صاف کی اور جھک کر اس کے ماتھے کو چوما۔ اسے لگا جیسے اس کے جسم کا ایک بازو الگ ہو گیا ہے۔ الفا ٹینک جرمنوں کو پسپا کر کے فاتحانہ انداز میں اندر آیا تھا۔ میجر پار کر اس سے نکل کر تیز قدموں سے ان کی طرف آیا۔ اس کے چہرے سے خوشی ظاہر تھی پھر وہ کالنگا کی لاش دیکھ کر ٹھٹکا اور چند لمحے ساکت رہنے کے بعد تھکے قدموں سے اندر چلا گیا۔

اس حملے میں انہیں سب سے شدید نقصان کالنگا کی صورت میں اٹھانا پڑا تھا۔ اس کے علاوہ بھی پندرہ افراد ہلاک اور آٹھ زخمی ہوئے تھے۔ اب لڑنے والے صرف چالیس افراد رہ گئے تھے۔ مارٹرز کے تمام گولے خرچ ہو چکے تھے۔ صرف دو بھاری مشین گنیں اور ان کے محدود تعداد میں راؤنڈز رہ گئے تھے۔ ٹینکوں میں گولے چند رہ گئے تھے۔ چھوٹے ہتھیاروں کا ایمونیشن بھی اتنا تھا کہ دس پندرہ منٹ میں ختم ہو جاتا۔ صورت حال بے حد مایوس کن تھی۔ وہ کسی صورت تیسرے جرمن حملے کا سامنا کرنے کی سکت نہیں رکھتے تھے۔ رات تین بجے جرمن پسپا ہوئے تھے۔ پانچ بجے تک وہ مرنے

والوں کو دفناتے رہے۔ مورچوں کو از سرِ نو مضبوط کیا۔ نفری اتنی نہیں تھی کہ حملوں میں ٹوٹ جانے والی دیواروں کی مرمت بھی کی جاتی' اب ٹینکوں کو درمیانی مورچوں کی حفاظت کے لیے سامنے رکھ دیا گیا تھا۔ مارٹرز کے حملوں میں کئی ٹرک اور واحد رہ جانے والی جیپ بھی تباہ ہوگئی تھی۔ اب ان کے پاس ایک بڑا اور ایک چھوٹا ٹرک باقی رہ گیا تھا۔

میجر پارکر اندر ایک پیٹی پر بیٹھا کافی پی رہا تھا۔ زمان نے اسے رپورٹ دی۔ وہ چپ چاپ سنتا رہا۔ کچھ دیر بعد اس نے طنزیہ لہجے میں پوچھا ''کیپٹن! اب تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟''

''سر! میرا اندازہ ہے ہم جرمنوں کا تیسرا حملہ نہیں روک سکتے'' اس نے آہستہ سے کہا۔

''مجھے معلوم ہے لیکن میں یا تم اس معاملے میں کیا کر سکتے ہیں؟''

زمان محسوس کر رہا تھا کہ اس بار کیا جانے والا حملہ شدید اور قاتلانہ ہوگا۔ وہ چوکی پر قبضہ کرنے نہیں انہیں قتل کرنے آئیں گے۔ وہ راہ میں آنے والے ہر فرد کو یقینی طور پر ہلاک کریں گے تاکہ جلد از جلد پانی تک پہنچ سکیں۔ چھ بجے روشنی نمودار ہو رہی تھی۔ رات خاصی سردی تھی۔ جب تک جنگ جاری رہی ان لوگوں کو سردی کا احساس نہیں ہوا لیکن جب جنگ رک گئی تو انہوں نے گرم کپڑے پہنے تھے۔ کھانے اور پینے کا موقع ملا تھا۔ وہ جرمنوں کو دوسری بار شکست دے کر خوش تھے۔ ان کا محدود ذہن آنے والے خطرات کو محسوس نہیں کر پا رہا تھا۔

زمان اندر آیا۔ شیلا زخمیوں والے حصے میں ایک طرف دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ زمان اس کے پاس ہی بیٹھ گیا۔ شیلا نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ اس کی نظروں میں سوال تھا کہ اب کیا ہوگا؟ زمان نے اس کے اسکرٹ سے جھانکتے پستول کے دستے کی طرف دیکھا ''شاید اس کے استعمال کا وقت آ گیا ہے۔ شیلا کیا تمہیں ڈر لگ رہا ہے؟''

اس نے اثبات میں سر ہلایا ''ہاں..... لیکن ہمارے حوالے سے'' وہ بولی ''زمان! کیا باہر سے مدد نہیں آ سکتی ہے۔ یا ہم اس چوکی سے نہیں جا سکتے؟''

''باہر سے مدد آ سکتی ہے لیکن امید کم ہے اور ہم چوکی سے کیسے جائیں' ہمارے پاس گاڑیوں کا ایندھن تک نہیں ہے۔ پیدل سفر کرنا ممکن نہیں ہے۔ چاروں طرف سیکڑوں میل تک کوئی آبادی نہیں ہے۔'' زمان نے مایوسی سے جواب دیا تھا ''شیلا! اب کوئی معجزہ ہی ہمیں بچا سکتا ہے۔ خدا سے دعا کرو..... معجزے وہی دکھاتا ہے۔''

''زمان! میں بھی لڑوں گی تم لوگوں کے ساتھ۔''

''کیپٹن میں بھی لڑوں گا'' قریب لیٹے رچ نے آہستہ سے کہا۔

''ہم بھی کیپٹن..... ہم بھی..... میں بھی.....'' کمرے سے آوازیں ابھرنے لگیں۔ ''ہم آخری دم تک لڑیں گے۔''

کئی زخمی مارے جوش کے اٹھ بیٹھے تھے اور مطالبہ کرنے لگے کہ انہیں مورچوں تک پہنچا دیا جائے۔ ''کیپٹن! جب تک میرے ہاتھ میں رائفل اور جسم میں جان ہوگی' میں کسی جرمن کو نزدیک نہیں آنے دوں گا۔'' ایک سپاہی نے عزم سے کہا۔

''میرے دوستو!..... ساتھیو! ہم جرمنوں سے لڑ سکتے ہیں اور انہیں شکست بھی دے سکتے ہیں لیکن تقدیر سے نہیں لڑ سکتے۔ ہمارے پاس اسلحہ نہ ہونے کے برابر رہ گیا ہے لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں' جرمن ہمیں ختم کیے بغیر آپ تک نہیں پہنچ سکتے۔''

ایک سپاہی نے آ کر زمان کو سیلوٹ کیا ''میجر پارکر کا پیغام ہے۔''

''میں ابھی آتا ہوں'' زمان نے اسے جانے کا اشارہ کیا اور شیلا سے کہا ''شاید میجر نے ہتھیار ڈالنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ مجھے افسوس ہے شیلا.....! میں اسے نہیں روک سکتا ہوں۔''

''کیوں زمان! تم نے پہلے بھی اسے دوبار روکا ہے'' شیلا بے تابی سے بولی۔

''پہلے مجھے یقین تھا' میں دشمنوں کو روک سکتا ہوں۔ محدود وسائل کے باوجود اس کا مقابلہ کر سکتا ہوں مگر اب میں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اسے روکنا ممکن نہیں ہے'' زمان نے گہری سانس لی۔

وہ باہر والے کمرے تک آیا جہاں میجر پارکر پوری تیاری کی حالت میں کھڑا تھا۔ اس نے کمر سے اپنا سروس پسٹل بھی لگا رکھا تھا۔ زمان نے اسے سیلوٹ کیا اور خاموش کھڑا ہو گیا۔ میجر نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا ''زمان! تم جانتے ہو میں کیا کرنے والا ہوں؟''

''یس سر!'' اس نے آہستہ سے کہا۔

''کیا تم مجھے روکو گے نہیں؟''

''نو سر..... کیونکہ اب میں خود کو دشمن کے روکنے کا اہل نہیں پاتا۔''

''آؤ میرے ساتھ'' میجر پارکر باہر کی طرف بڑھا۔ مشرق سے سورج کا گولا نمودار ہو رہا تھا اور اس کی اولین کرنیں عمارتوں کے ملبے کو روشن کر رہی تھیں۔ میجر پارکر اور

اسے دیکھ کر سپاہی ان کے گرد جمع ہو گئے تھے۔ ان سب کے چہروں پر سوال تھا۔ جنگ کے بارے میں کیا فیصلہ کیا گیا ہے۔ میجر پارکر چند لمحے انہیں دیکھتا رہا پھر اس نے کہا ''میرے ساتھیو! تم لوگوں نے ایک ناقابلِ فراموش جنگ لڑی ہے..... مگر ابھی ایک معرکہ باقی ہے۔ ہمیں دشمن سے لڑنا ہے یا اس کے آگے ہتھیار ڈالنے ہیں۔ دونوں فیصلے ہمارے لیے بہت مشکل ہیں۔ میں خود میں اتنی اہلیت نہیں پاتا کہ اپنی مرضی سے کوئی فیصلہ کر سکوں۔ آپ مجھے بتائیں..... ہم دشمن سے لڑیں یا اس کے آگے ہتھیار ڈال دیں؟''

''ہم جنگ کریں گے'' ایک سیاہ فام سپاہی ہاتھ اٹھا کر بولا ''جنگ..... جنگ..... جنگ.....'' یکے بعد دیگرے سب کے ہاتھ بلند ہوتے چلے گئے۔ میجر پارکر نے سوالیہ نظروں سے زمان کی طرف دیکھا تو اس نے ہاتھ اٹھا دیا تھا۔ میجر پارکر ایک ایک کو دیکھتا رہا۔

''ویل جنٹل مینز! ہم جنگ کریں گے لیکن..... چھپ کر نہیں، کھل کر ہم دشمن کو چوکی کی دیوار پر روکیں گے۔ آپ سب دیواروں کے ساتھ مورچے بنالیں۔''

تمام سپاہی بھاگے۔ میجر پارکر نے زمان کی طرف دیکھا ''ہم ٹینکوں سے حملہ کریں گے۔''

''جناب! ہمارے پاس ایمونیشن بہت کم ہے'' زمان نے کہا لیکن میجر جوش میں آ گیا تھا۔ وہ احتیاط کی حدوں سے گزر کر جرمنوں سے مقابلہ کرنا چاہتا تھا۔ زمان پریشان ہو گیا۔ اگرچہ وہ ہتھیار ڈالنے کے حق میں نہیں تھا لیکن اس طرح کھلی جنگ بھی ان کے لیے خودکشی کے مترادف تھی۔ وہ میجر سے اختلاف بھی نہیں کر سکتا تھا۔ کمانڈ ایک طرح سے اس نے سنبھال لی تھی اور سپاہی اس کے حکم کی تعمیل کر رہے تھے۔ زمان نے اس سے کہا کہ کنوئیں کی حفاظت کے لیے اسے مشین گنوں سے مورچا بنانے کی اجازت دے۔ میجر مان گیا۔ مرکزی عمارت کے ملبے پر دو بھاری مشین گنیں موجود تھیں۔ اگرچہ ان کے راؤنڈز کم تھے لیکن اب بھی دفاع کے لیے ٹینکوں کے بعد یہی موثر ترین ہتھیار تھا۔ تین سپاہیوں کے ہمراہ زمان نے ان مورچوں میں پوزیشن سنبھال لی۔ میجر پارکر ٹینکوں کی کمان کر رہا تھا اور دونوں ٹینک مغربی دیوار کے ساتھ تھے۔ سپاہی چار دیواری کے ساتھ جگہ جگہ پوزیشن سنبھال چکے تھے۔ دشمن مورچے بالکل خالی تھے مگر زمان محسوس کر رہا تھا کہ جرمن حملے کی صورت میں سپاہیوں کو اس میں پناہ لینا ہی پڑتی۔

ان کے پاس مشین گنوں کے صرف تین باکس تھے۔ ہر بکس کے پٹے میں پانچ سو گولیاں تھیں۔ اگر مشین گن کا ٹریگر مستقل دبا کر رکھا جاتا تو ایک بکس دو منٹ میں خالی ہو جاتا۔ اس لحاظ سے ان کے پاس صرف تین منٹ کی جنگ کا ایمونیشن تھا۔ نیچے ٹینکوں کی مشین گنوں پر نئے بکس لوڈ کیے جا رہے تھے۔ زمان جانتا تھا یہ چار بھاری مشین گنیں اور توپیں ہی ان کی امید ہیں۔ جیسے ہی سورج ذرا بلند ہوا' جرمن شمالی ڈھلان سے نمودار ہوئے۔ ان کا واحد ٹینک اور بکتر بند کی مشین گنیں سپورٹ فائر کر رہی تھیں۔ معرکہ ایک بار پھر گرم ہو چکا تھا۔ جرمن سپاہی انفرادی طور پر کوہان نما ٹیلوں کی آڑ لیتے آگے آ رہے تھے۔ وہ آگے کم آ رہے تھے اور دائیں بائیں زیادہ ہو رہے تھے۔ زمان ذرا تاخیر سے سمجھا کہ اس طرح وہ ان کا اسلحہ ضائع کروا رہے تھے۔ دونوں ٹینکوں کی مشین گنیں مستقل فائر کر رہی تھیں۔ جرمنوں کی حکمتِ عملی بھانپتے ہی زمان نے فائرنگ روک دی تھی۔ اس نے میجر کو بھی پیغام بھجوایا کہ ایمونیشن ضائع نہ کرے۔ جرمن چالاکی سے کام لے رہے ہیں۔ اب اس نے مشین گن کو اسپاٹ ٹارگٹ کے لیے استعمال کرنا شروع کیا۔ جیسے ہی کوئی جرمن حرکت کرتا وہ اور اس کا ساتھی گنر ان کی طرف مختصر برسٹ مارتا تھا۔ اس حکمتِ عملی کے خاطر خواہ نتائج نکلے۔ چند منٹ کے اندر درجن بھر جرمن سپاہی ڈھیر ہو چکے تھے اور ان کی پیش قدمی رک گئی تھی۔

جھنجلا کر جرمنوں نے مارٹرز فائر کرنا شروع کر دیے۔ گولے آ کر چوکی کے مختلف حصوں میں گرنے لگے تھے۔ ایک گولہ سیدھا برادر شرمن ٹینک کے کھلے ڈھکن کے اندر گرا اور ٹینک کے پرخچے اڑ گئے۔ دھماکا اتنا شدید تھا کہ سوگز دور بیٹھے زمان کے کان بج گئے۔ ٹینک کا اپنا گولا بارود بھی پھٹا تھا۔ گرد و غبار اڑ کر اوپر تک گیا تھا۔ الفا ٹینک اس سے دس گز کے فاصلے پر تھا۔ اس کا کنر تباہ شدہ ٹینک کا ٹکڑا لگنے سے مارا گیا تھا مگر ٹینک بچ گیا تھا۔ یہ شدید دھچکا تھا۔ خود جرمنوں کو بھی اس کامیابی کی توقع نہیں تھی۔ جیسے ہی ایک ٹینک تباہ ہوا۔ جرمن سپاہی شور مچاتے اور فائرنگ کرتے چوکی کی طرف دوڑنے لگے۔ زمان اور اس کے ساتھیوں نے مشین گنوں کا رخ ان کی طرف کر دیا تھا۔ ساتھ ہی چوکی کے دوسرے حصوں سے سپاہی سمٹ کر شمالی دیوار کی طرف آنے لگے۔

دو بھاری مشین گنیں اگرچہ پھیل کر آنے والے حملہ آوروں کو روکنے کے لیے ناکافی تھیں لیکن ان سے جرمنوں کی پیش قدمی کی رفتار کسی قدر سست ہو گئی۔ اس دوران میں سپاہیوں کو آنے اور شمالی دیوار کے ساتھ پوزیشن سنبھالنے کا موقع مل گیا تھا۔ میجر پارکر نے اپنے ٹینک کے مارے جانے

والے مشین گنر کی جگہ خود سنبھال لی تھی اور ٹینک کی توپ بھی آنے والے جرمنوں پر گولے فائر کر رہی تھی۔ اس نے ایک بکتر بند کے پرخچے اڑا دیے تھے۔ آنے والے سپاہی اپنی رائفلوں اور ہلکی مشین گنوں سے جرمنوں کو روک رہے تھے۔ گھمسان کی جنگ جاری تھی۔

اچانک کوئی اور مورچے میں داخل ہوا۔ زمان نے چونک کر دیکھا۔ یہ شیلا تھی جس کے ہاتھ میں دور مار رائفل تھی۔ ''شیلا! تم کیوں آئی ہو؟'' اس نے کسی قدر برہمی سے کہا۔

''کیپٹن! میں انعام یافتہ نشانے باز ہوں'' اس نے جواب دیا اور اس کے پاس اوندھی لیٹ کر رائفل شانے سے لگائی ''میں ابھی اس کا ثبوت بھی دے سکتی ہوں'' شیلا نے ایک جرمن کا نشانہ لیا جو چوکی کی دیوار کے بہت نزدیک آ گیا تھا۔ شیلا کے فائر کرتے ہی وہ اچھلا اور ریت پر گر کر ساکت ہو گیا۔

''شاندار!'' زمان کے منہ سے نکلا۔ شیلا نے ڈھائی سو گز دوری پر متحرک جرمن کا سر اڑا دیا تھا۔ ''میرے مورچے میں خوش آمدید!''

جرمن چوکی تک پہنچنے کی دیوانہ وار کوششیں کر رہے تھے۔ گولیاں کھا کر گر رہے تھے اور دوبارہ اٹھ کر چوکی کی طرف بڑھتے تھے اور جب تک دم میں دم ہوتا تھا' ان کی جدوجہد جاری رہتی تھی۔ دوسری طرف ان کے سپاہی بھی سر دھڑ کی بازی لگائے ہوئے تھے۔ چھپنے اور بچنے سے زیادہ وہ جرمنوں کے شکار میں لگے ہوئے تھے۔ ان میں سے کئی مر چکے تھے اور کئی شدید زخمی تھے لیکن ان کے جذبۂ مزاحمت میں کمی نہیں آ رہی تھی۔ میجر پارکر اس پوری جنگ میں پہلی بار دلیری سے دشمن کا سامنا کر رہا تھا۔ اس کی فرنٹ لائن پر موجودگی نے سپاہیوں کے حوصلے بڑھا دیے تھے۔ وہ ٹینک کی مشین گن سے جرمنوں پر فائر کر رہا تھا اور اس نے کئی جرمنوں کو مار گرایا تھا۔

جرمن جس جوش و خروش سے آئے تھے' اب اس کی لہر مدھم پڑتی جا رہی تھی۔ جیسے ساحل پر آنے والی موج بے دم ہو جاتی ہے۔ اپنے بے شمار ساتھیوں کی لاشیں آنے والوں کے حوصلے پست کر رہی تھیں۔ اس تازہ معرکے میں بھی کئی درجن جرمن اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔ ابھی تک ان کا کوئی آدمی چوکی سے سوگز سے زیادہ نزدیک نہیں آ سکا تھا۔ ان کی گولا باری بھی بے سود رہی تھی۔ اس طرف سے کی جانے والی مزاحمت ناقابلِ بیان تھی۔ ایک موقع پر پیش قدمی کرنے والے چار پانچ جرمن زمان کے مورچے کی مشین گنوں کی زد میں آ کر گرے تو جرمنوں کا حوصلہ جواب دے گیا اور وہ پلٹ کر واپس بھاگے تھے۔ زمان نے ان بھاگتے جرمنوں پر فائر نہیں کیا ورنہ وہ ان میں سے کئی کو بہ آسانی مار سکتا تھا۔ نہ جانے کیوں اس کی انگلی ٹریگر سے ہٹ گئی۔ شاید قتل و خون سے اس کا دل بھر گیا تھا۔ میجر پارکر نے بھی فائرنگ روک دی تھی۔ شیلا نیچے اتر گئی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ کئی نئے زخمی اس کا انتظار کر رہے ہوں گے۔

انہوں نے چوکی کو ایک بار پھر بچا لیا تھا لیکن ساتھ ہی انہیں اپنے ایک درجن سے زیادہ ساتھیوں سے مزید محروم ہونا پڑا تھا۔ چار شدید زخمی تھے۔ جرمن اپنے پیچھے مزید لاشیں چھوڑ گئے تھے۔ زمان اتر کر نیچے آیا تو میجر پارکر ٹینک کے اوپر بیٹھا ستا رہا تھا۔ اس کے ماتھے پر زخم آیا تھا۔ زمان نے اپنی پانی کی چھاگل اس کی طرف بڑھا دی ''مبارک ہو میجر.....!''

اس نے سر ہلایا ''ہم نے دشمن کو ایک بار پھر پسپا کر دیا ہے۔ شاید آخری بار!''

زمان نے محسوس کیا' میجر درست کہہ رہا تھا۔ یہ شاید آخری بار تھا۔ ان کے پاس ایمونیشن نہیں تھا۔ مشین گنوں کی مشکل سے چند درجن گولیاں تھیں۔ ٹینک گولا بارود سے قطعی محروم تھے۔ ''لڑنے کے لیے ہمارے پاس اب سوائے ہاتھ پیر کے اور کچھ نہیں ہے'' میجر نے افسردگی سے کہا۔

سپاہی اندر جمع تھے۔ اس فتح نے انہیں خوش نہیں کیا تھا۔ مرنے والوں کی لاشیں انہیں بتا رہی تھیں کہ جلد یا بدیر ان کا انجام بھی یہی ہونا ہے۔ انہوں نے لاشیں دفنانا شروع کر دی تھیں۔ چوکی اچھے خاصے قبرستان میں بدل گئی تھی۔ زمان ٹینک پر چڑھ کر میجر کے ساتھ بیٹھ گیا ''سر! اگر اب ہم ہتھیار ڈالیں تو جرمنوں کا کیا ردِعمل ہوگا؟''

''کیا کہہ سکتے ہیں'' میجر نے صحرا کی طرف دیکھا۔ ''ممکن ہے وہ ہمیں صرف جنگی قیدی بنائیں یا یہ بھی ممکن ہے کہ قتل کر دیں۔''

''ہمارے لیے کوئی فیصلہ کرنا اب بھی آسان نہیں ہے'' زمان ہنسا تھا ''ممکن ہے قدرت فیصلہ کرے۔''

''یہ سب تقدیر کے فیصلے ہیں'' میجر نے چوکی سے باہر بکھری جرمنوں کی لاشوں کی طرف اشارہ کیا۔

جرمن واپس ریت کی ڈھلان کے عقب میں جا پہنچے تھے۔ انہوں نے پھر مارٹرز فائر کرنا شروع کر دیے تھے۔ سپاہی مورچوں میں چلے گئے تھے۔ مگر میجر اور زمان ٹینک پر بیٹھے رہے۔ گولے ان کے اوپر سے گزر کر چوکی کے مختلف حصوں پر گر رہے تھے مگر گولا باری کی رفتار بے حد سست تھی۔ چھ سات منٹ بعد ایک گولا آتا تھا۔ میجر نے تبصرہ کیا۔

"لگتا ہے ..... جرمنوں کے پاس بھی گولا بارود ختم القریب ہے" پھر اس نے کچن میں جھانکا "بڈی' تمہارے پاس کافی ہے تو ہمیں دے دو۔"

اندر سے قہرماں اور کاغذی کپ انہیں تھما دیے گئے "جرمن ڈھلان سے جھانک رہے ہیں" زمان نے اس طرف دیکھا "پیاس آخری حدوں پر ہوگی۔"

میجر ہنسا "ابھی میرے ذہن میں احمقانہ خیال آیا تھا کہ جرمنوں کو دعوت دوں' وہ کنوئیں سے جتنا پانی چاہے حاصل کرلیں۔ شاید میرا دماغ چل گیا ہے۔"

اس لمحے زمان کو صحرا کی جانب سے شور سنائی دیا۔ اس نے دیکھا اور اچھل پڑا تھا۔ تقریباً سو جرمنوں کا گروہ ان کی چوکی کی طرف دوڑ رہا تھا۔ وہ حملہ کررہے تھے؟ زمان کے ذہن میں پہلا خیال یہی آیا لیکن وہ حملہ کرنے کے انداز میں نہیں بلکہ میراتھن میں حصہ لینے والے کسی بے ترتیب ہجوم کے انداز میں دوڑ رہے تھے۔

"جرمن بھی پاگل ہوگئے ہیں" میجر پارکر نے زیرِلب کہا۔

جرمن سپاہیوں نے اپنی رائفلیں سر سے بلند کررکھی تھیں۔ زمان نے ٹینک اور بکتر بند کے عملے کو بھی کود کر بھاگتے ہوئے ہجوم میں شامل ہوتے دیکھا "میجر! یہ ہتھیار ڈالنے آرہے ہیں" اس نے کہا اور پھر چلایا "کوئی فائر نہ کرے' یہ ہتھیار ڈالنے آرہے ہیں۔"

جرمن اتنی تیزی سے بھاگ رہے تھے کہ بار بار ریت پر گرتے۔ اٹھتے اور پھر بھاگنا شروع کردیتے تھے۔ ان کا انداز جلد ریس جیتنے کی خواہش رکھنے والے ایتھلیٹ کا سا تھا۔ پانچ سو گز کا فاصلہ انہوں نے چند منٹ میں طے کیا اور ہجوم کے انداز میں چوکی کی ٹوٹی دیوار سے اندر آنے لگے۔ اپنی رائفلیں ٹینک کے سامنے پھینک کر وہ اس طرح بھاگتے کنوئیں کی طرف چلے گئے تب زمان نے پہلی بار کنوئیں سے فوارے کی طرح اچھلتے پانی کو دیکھا تھا اور تب ہی اس کی سمجھ میں آیا کہ کس چیز نے جرمن سپاہیوں کو ہتھیار ڈالنے پر آمادہ کیا تھا۔ جو کام تین دفعہ کی جنگ نہیں کرسکی تھی' وہ پانی کی ایک جھلک نے کردکھایا تھا۔

بھاگتے دوڑتے جرمن کنوئیں کے گرد جمع ہوکر اس اچھلتے پانی کو ہاتھوں میں لے کر پینے کی کوشش کررہے تھے۔ ایک دوسرے پر گرے جارہے تھے۔ مارے خوشی کے بچوں کی طرح چلا رہے تھے۔ میجر پارکر اور زمان نے ان کے پیچھے کرنل بوئر اور اس کے افسران کو آتے دیکھا۔ انہوں نے بھی اپنے ہتھیار سروں سے اوپر اٹھا رکھے تھے۔ کرنل بوئر نے سب سے پہلے اپنا پستول میجر پارکر کے سامنے رکھا۔

"میجر! میں کبھی ہار نہ مانتا" اس نے کہا "مگر پیاس نے میرے آدمیوں کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کردیا ہے۔"

"کرنل! تم بھی جاکر پانی پی سکتے ہو۔"

"یہ ایک معجزہ ہے" زمان سحرزدہ نظروں سے کنوئیں سے اچھلتے پانی کو دیکھ رہا تھا۔

"بے شک یہ معجزہ ہے" میجر پارکر نے اس کی تائید کی۔ ان کے سپاہی جرمنوں کے گرد گھیرا ڈال رہے تھے۔

نصف گھنٹے بعد صورتِ حال مکمل طور پر ان کے قابو میں تھی۔ تمام جرمن سیر ہوکر آسودگی کے ساتھ تپتی ریت پر بیٹھے تھے۔ ان کا تمام اسلحہ قبضے میں لیا جاچکا تھا۔ جرمن کیمپ سے آئے ان کے ہاتھ خاصا اسلحہ لگا تھا۔ ان کے پاس چار بڑے اور تین چھوٹے ٹرک تھے۔ ایندھن بھی کافی تعداد میں تھا۔ سب سے بڑھ کر ایک طاقت ور ریڈیو سیٹ ملا تھا جس پر ہیڈ کوارٹر رپورٹ کرکے مدد مانگی گئی تھی۔ جرمنوں کے ساتھ دو ڈاکٹرز بھی تھے جو اب جرمن زخمیوں کے ساتھ اتحادی زخمیوں کا علاج بھی کررہے تھے۔ ان کے پاس ادویات اور آلات بھی تھے۔ ایک سو عدد صحیح سلامت جرمن اور پچاس کے قریب زخمی ان کے ہاتھ لگے تھے۔

کنوئیں سے پانی ابلنا بند ہوگیا تھا لیکن یہ اب بھی خاصا اوپر تھا۔ جرمنوں کے پاس ڈیزل سے چلنے والا سکشن پمپ تھا۔ اس کی مدد سے وہ جتنا پانی چاہے کنوئیں سے نکال سکتے تھے۔ کنوئیں سے اچانک اتنا پانی کیوں کر ابلنے لگا تھا' اس راز سے پردہ ایک سپاہی نے اٹھایا۔ اس نے کنوئیں کے کھلے منہ میں مارٹر گولا گرتے دیکھا تھا۔ اس گولے نے پتہ کو اڑا دیا تھا اور اس کے نیچے نہ جانے کب سے دبا پانی اچانک ابل پڑا تھا۔ شام کو نہادھو کر زمان میجر اور کرنل بوئر کے درمیان ہونے والی میٹنگ میں شریک ہوا تھا۔ جس میں جرمنوں سے چوکی کی تعمیرِنو کے کام لینے کا معاملہ زیرِغور آیا تھا۔ پانی کی کمی نہیں تھی لہٰذا اگلے دن سے کام شروع کرنے کا فیصلہ ہوا۔

زمان اندر آیا تو شیلا چمکتی آنکھوں سے اس کے پاس آئی تھی۔ "رچ کا آپریشن ہوگیا ہے' اس کی حالت بہتر ہورہی ہے۔"

"مبارک ہو!" زمان نے کہا "میں نے ہیڈ کوارٹر دوبارہ واپسی کی درخواست بھیجی ہے۔ اگر وہ منظور ہوگئی تو کیا تم میرے ساتھ چلوگی؟"

شیلا نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔

تعاقب

مرزا ظفر بیگ

سراغ رسانی کے پیشے سے وابستہ لوگوں کو ہر نئے کیس کی صورت میں ایک امتحان کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ بعض دفعہ جلد اور کبھی دیر سے انہیں کامیابی ملتی ہے۔ ایک ایسے ہی سراغرساں کا قصہ اس کی کلائنٹ اپنے پُراسرار تعاقب سے بے حد پریشان تھی۔

لمحہ بہ لمحہ سنسنی خیز موڑ اختیار کرتی ایک پُرتجسس و تیز رفتار تحریر

میں اپنے دفتر میں بیٹھا تھا کہ وہ آفت کی پرکالہ کسی آندھی کی طرح اندر داخل ہوئی۔ میں نے بہت عرصے بعد سحر انگیز آنکھوں اور پُرکشش ناگوں والی کوئی حسینہ دیکھی تھی۔ وہ کسی بھی مرد کے دل کی دھڑکنیں تیز کرنے کے لیے کافی تھی۔ میں نے جلدی سے خود سنبھالا اور باوقار انداز میں اپنی کرسی پر تن کر بیٹھ گیا۔ میں نے جلدی سے اس فیشن میگزین کو اپنی میز کی دراز میں ڈال دیا جسے میں اس قتالہ کے آنے سے پہلے دیکھ رہا تھا۔ اس میگزین میں حسیناؤں کی بہت سی تصاویر چھپی ہوئی تھیں لیکن جب کوئی حسینہ بذاتِ خود سامنے آجائے تو تصویریں دیکھنے کی کیا ضرورت؟

"جی مس ..... میں تمہاری کیا خدمت کرسکتا ہوں؟" میں نے اپنی آواز میں شہد گھولتے ہوئے اس حسین مہمان سے سوال کیا۔

"تمہارا نام نوآ ملانو ہے نا؟" اس نے مجھ سے الٹا سوال کردیا۔ وہ کچھ گھبرائی ہوئی لگ رہی تھی۔

"میرے آفس کے دروازے پر اسی نام کی تختی لگی ہوئی ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ میں کوشش کررہا تھا کہ اس کے سامنے خود کو ایک نفیس اور شائستہ نوجوان کے روپ میں پیش کروں۔ اس دوران میں اس کا بغور جائزہ بھی لے رہا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ وہ کوئی ایکٹریس ہے یا ماڈل ہے یا پھر کوئی کال گرل..... اس کے انداز و اطوار بتا رہے تھے کہ وہ اپنے حسن بلاخیز سے واقف ہے لیکن اس سے کچھ زیادہ فائدہ نہیں اٹھا پائی۔ وہ حلیے سے خوش حال دکھائی نہیں دیتی تھی۔ اس وقت وہ مجھے پریشان لگ رہی تھی۔

"مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔" اس نے کہا۔ "میں پہلے کی طرح پُرسکون انداز سے سونا چاہتی ہوں۔"

"لیکن مس، میں اس معاملے میں تمہاری کوئی مدد نہیں کرسکتا۔" میں نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔ "میں ایک سیکیورٹی اسپیشلسٹ ہوں، کوئی ڈاکٹر نہیں جو تمہاری بے خوابی کا علاج کرسکوں۔"

"میں جانتی ہوں، مجھے سیکیورٹی کی ہی ضرورت ہے، میں عدم تحفظ کا شکار ہوں جس کی وجہ سے میری نیندیں اڑ چکی ہیں۔" اس نے اپنے خوبصورت ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا۔

"تو ٹھیک ہے، آرام سے بیٹھ جاؤ اور پوری بات بتاؤ کہ

تمہارا مسئلہ کیا ہے۔" میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"شکریہ..... معاف کرنا، میں نے اپنا تعارف تو کرایا ہی نہیں۔" اس نے اپنی مترنم آواز میں کہا۔ "دراصل میں اس صورتِ حال سے اتنی پریشان ہوں کہ بس..... کچھ سمجھ میں نہیں آرہا....."

"بے خوف ہو کر بات کرو، جب تک تم مجھے اصل بات نہیں بتاؤ گی میں تمہاری مدد کیسے کروں گا۔" میں نے کہا۔

اس نے ایک سرد آہ بھری پھر کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن ایک دم چپ ہو گئی۔ میں دیکھ رہا تھا کہ اس کا انداز کچھ ڈرامائی سا تھا۔

"میرا نام امانڈا اسمتھ ہے۔" آخر اس نے اپنا تعارف کرایا۔ "مجھے شک ہے کہ کوئی شخص میرا تعاقب کر رہا ہے۔ شاید وہ میری جان لینا چاہتا ہے۔ نہ مجھ سے کچھ کھایا جا رہا ہے نہ پیا جا رہا ہے اور نہ میں سکون سے سو پا رہی ہوں۔ مجھے ہر وقت اس شخص کا خوف لگا رہتا ہے جو نہ جانے کیوں میرے پیچھے پڑ گیا ہے۔"

"اچھا تو یہ بات ہے..... تم چاہتی ہو کہ میں تمہیں اس سے تحفظ فراہم کروں اور اسے تمہارا تعاقب کرنے سے روک دوں، یہی بات ہے نا؟" میں نے نرم لہجے میں کہا۔

"بالکل..... میں یہی چاہتی ہوں۔" امانڈا نے جلدی سے کہا۔

"تمہیں کس پر شک ہے؟ یہ تمہارا کوئی سابقہ بوائے فرینڈ تو نہیں ہے؟" میں نے اس سے پوچھا۔ "یا کوئی ایسا شخص ہے جو تمہارے ساتھ پارٹنر شپ میں کام کرتا تھا لیکن تم نے اسے نکال دیا اور وہ تم سے انتقام لینے پر اتر آیا ہو؟"

"معذرت خواہ ہوں، میرا ذہن ذرا بھی کام نہیں کر رہا ہے۔" اس نے بیزاری سے کہا۔

"تمہیں یہ اندازہ کب ہوا کہ کوئی تمہارا تعاقب کر رہا ہے؟" میں نے کچھ سوچتے ہوئے سوال کیا۔

"چند ہفتے پہلے ہی مجھے یہ احساس ہوا تھا۔" امانڈا نے جواب دیا۔ "مجھے ایسا لگا جیسے کوئی مجھے دیکھ رہا ہے، نادیدہ نگاہیں میری نگرانی کر رہی ہیں۔ پھر میں نے اپنے گھر کے باہر ایک کار کے انجن کی آواز سننی شروع کی۔ وہ آواز بار بار مجھے سنائی دیتی تھی۔ میں نے جب بھی اپنے گھر کی کھڑکی سے باہر دیکھا تو مجھے سیاہ رنگ کی ایک نسان کار دکھائی دی، وہ میرے گھر کے باہر کچھ دیر رہتی اور پھر چلی جاتی۔ گزشتہ ہفتے ایسا تین بار ہوا تھا جس کے بعد سے میں بے حد خوفزدہ ہو گئی ہوں۔"

"تم نے اس کار کی نمبر پلیٹ تو دیکھی ہو گی؟ یا اس کا ماڈل دیکھا ہو یا اس کار کو چلانے والے کی جھلک دیکھی ہو؟" میں نے اگلا سوال کیا۔

"نہیں، میں معذرت خواہ ہوں، میں اس سلسلے میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتی۔" امانڈا نے اپنا سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

"کوئی بات نہیں۔" میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "اچھا یہ بتاؤ کہ تم نے پولیس سے رابطہ کیا تھا؟"

"کیا تھا، لیکن میں یہ ثابت نہیں کر سکی کہ کوئی میرا تعاقب کر رہا ہے یا میری جان کو کسی نادیدہ دشمن سے خطرہ ہے، کیوں کہ ابھی تک نہ تو کسی نے مجھے کوئی نقصان پہنچایا نہ میرے گھر میں گھسنے کی کوشش کی اور نہ ایسی کوئی حرکت کی جس سے میں....."

"میں سمجھ گیا۔" میں نے امانڈا کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "میں اس معاملے کا اچھی طرح جائزہ لے لوں پھر بتاؤں گا کہ میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں لیکن اس کے لیے تمہیں میری فیس کا ایک حصہ پیشگی ادا کرنا ہو گا۔"

یہ سنتے ہی امانڈا نے میری طرف ایسے دیکھا جیسے شرارت کرنے کے بعد دیکھتے ہیں پھر اس کی آنکھوں میں شرمندگی کا تاثر ابھر آیا۔ اس نے بوجھل سے لہجے میں کہا۔ "میں فی الوقت تمہیں کچھ بھی ایڈوانس نہیں دے سکتی۔ دو پروڈکشن ہاؤسز میں میرا آڈیشن چل رہا ہے۔ دراصل میں ایک اداکارہ ہوں..... لیکن ابھی میں جدوجہد کے دور سے گزر رہی ہوں۔"

امانڈا کی بات سنتے ہی میرا سینہ فخر سے پھول گیا۔ میرا اندازہ بالکل درست نکلا تھا وہ ایک اداکارہ تھی۔

"ٹھیک ہے، ہم اس مسئلے پر بعد میں بات کریں گے۔" میں نے کہا۔ "جب تم بڑی فلم اسٹار بن جاؤ تو مجھے پام اسپرنگ میں کوئی ولا خرید کر دے دینا لیکن فی الحال تمہیں میرے صرف اخراجات ادا کرنے ہوں گے۔" میں نے امانڈا سے یہ بات کہہ تو دی لیکن میں یہ سوچ رہا تھا کہ میرے اصول اب کہاں گئے؟ میری اپنے ڈیڈی سے اسی بات پر تو لڑائی رہتی تھی کہ میں لوگوں کے کام آنا چاہتا تھا، انہیں تکلیف اور نقصان نہیں پہنچانا چاہتا جب کہ اس وقت میں ایک تجارتی ذہن سے سوچ رہا تھا۔

☆☆☆

میں نے اپنی مزدا پارکنگ لاٹ میں پہلے سے کھڑی ہوئی فورڈ اور سرخ جیپ کے درمیان لے جا کر کھڑی کر دی لیکن میں نے اس بات کا خیال رکھا تھا کہ اگر مجھے اپنی کار عجلت میں وہاں سے نکالنی پڑے تو کوئی مشکل پیش نہ آئے۔ میری نظریں "میٹیئر ریسٹورنٹ" پر جمی ہوئی تھیں جہاں چند روز پہلے ہی امانڈا نے کام کرنا شروع کیا تھا۔

میں حلفیہ کہہ سکتا ہوں کہ اس شہر کی آدھی ویٹریسز

اداکارائیں ہیں جو کسی عمدہ موقع کی منتظر ہیں تاکہ وہ راتوں رات شہرت کی بلندیوں پر پہنچ جائیں۔ اس مقام تک پہنچنے سے پہلے وہ اپنی اداکارانہ صلاحیتوں کا مظاہرہ اسی طرح کے ہوٹلز اور ریسٹورنٹس میں کرتی ہیں اور گاہکوں پر یہ ظاہر کرتی ہیں کہ وہ ان کے لیے بہترین، صحت بخش اور غذائیت سے بھرپور کھانے پیش کر رہی ہیں۔

میں نے اپنی گھڑی کی طرف دیکھا، دس بجنے میں دس منٹ تھے، گویا امانڈا کے ریسٹورنٹ سے باہر آنے میں ابھی دس منٹ باقی تھے۔ ٹھیک دس بجے اس کی ڈیوٹی ختم ہو جاتی تھی۔

اچانک میری نظر سامنے گلی کے کونے سے نمودار ہونے والی سیاہ نسان پر پڑی اور میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا، مجھے یاد آ گیا کہ امانڈا نے سیاہ نسان کا ذکر کیا تھا جو اس کے گھر کے سامنے نظر آتی تھی۔ وہ گاڑی آہستہ آہستہ میری کار کے قریب پہنچی اور وہیں رک گئی۔ میں نے اس کے ڈرائیور کا چہرہ دیکھنے کی کوشش کی مگر اس نے اپنے ہیٹ کو اپنے چہرے پر اس طرح جھکا لیا تھا کہ اس کا چہرہ دکھائی نہیں دے رہا تھا پھر بھی میں اپنی سیٹ میں نیچے کی طرف سرک گیا تاکہ وہ مجھے نہ دیکھ سکے۔

سیاہ نسان کا ڈرائیور اپنی کار سے اترا اور ٹہلتا ہوا سامنے سڑک کے پار واقع ہارڈ ویئر اسٹور کی طرف چلا گیا۔ میری نظریں اسی پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ شخص وہاں کھڑے ہو کر شوکیس میں رکھے ہوئے اوزار دیکھنے لگا۔ میں جانتا تھا کہ یہ سب ڈراما ہے کیونکہ رات کے اس حصے میں اس شخص کو کسی اوزار کی ضرورت نہیں ہو سکتی۔ وہ بہ ظاہر شوکیس کی طرف متوجہ تھا لیکن دراصل اس کی ساری توجہ میٹیئر کے ریسٹورنٹ کی طرف تھی جہاں سے کسی بھی لمحے امانڈا ظاہر ہو سکتی تھی۔

پھر مجھے امانڈا نظر آئی۔ وہ ریسٹورنٹ سے باہر نکل رہی تھی۔ چلتے چلتے اس نے اپنا ایپرن اپنے بیگ میں رکھا اور اپنے بندھے ہوئے بال کھول لیے وہ خاصی جلدی میں نظر آ رہی تھی۔ اس نے سرسری نظروں سے میری طرف دیکھا، غالباً وہ یہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہی تھی کہ میں وعدے کے مطابق اسے تحفظ فراہم کرنے کے لیے وہاں موجود ہوں یا نہیں۔ میری کار دیکھ کر اسے یقیناً تسلی ہوئی ہو گی۔ دوسری طرف اس کے تعاقب میں آنے والا شخص اسے سرسری انداز سے دیکھ رہا تھا۔ امانڈا اپنی فاکس ویگن میں بیٹھی اور اسے اسٹارٹ کر کے آہستہ آہستہ پارکنگ لاٹ سے باہر نکل گئی۔

ہارڈ ویئر کی دکان پر کھڑا ہوا شخص تیزی سے واپس مڑا اور اپنی سیاہ نسان میں آ بیٹھا، اس نے بہ عجلت اپنی کار اسٹارٹ کی اور امانڈا کے تعاقب میں روانہ ہو گیا۔ میں اس کھیل کو دیکھ رہا تھا اور سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

تھوڑے انتظار کے بعد میں نے بھی اپنی کار اسٹارٹ کی اور ان دونوں کے پیچھے روانہ ہو گیا۔ چند منٹ کے سفر کے بعد ہی امانڈا کی کار ایک پارکنگ گیراج میں داخل ہو گئی۔ وہ آگے تھی، اس کے پیچھے سیاہ کار والا تھا اور سب سے آخر میں، میں تھا۔ سیاہ کار والے نے ایک بار بھی پیچھے مڑ کر دیکھنے کی کوشش نہیں کی تھی، ورنہ اپنے تعاقب کا اندازہ لگانے کے لیے اسے محتاط ہونا چاہیے تھا مگر ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کی ساری توجہ اپنے شکار یعنی امانڈا پر ہے۔ یہی وہ وقت تھا جب میں نے ایکشن میں آنے کا فیصلہ کیا اور اس فیصلے پر عمل درآمد بھی کر ڈالا۔ میں نے بڑی تیزی سے اپنا اسٹیئرنگ وہیل گھمایا اور اپنی کار کو سیاہ کار کے سامنے اس انداز سے لے آیا کہ اس کا راستہ بند ہو گیا۔ میں نے پوری طاقت سے بریک لگائے تھے جس کی وجہ سے سیاہ کار والے کو بھی ہنگامی بریک لگانے پڑے۔ اگر وہ ایسا نہ کرتا تو اس کی کار میری کار سے ٹکرا جاتی۔ سیاہ کار والے نے غصے سے میری طرف دیکھا پھر اپنی کار کے اسٹیئرنگ وہیل پر گھونسے برسانے لگا۔ ساتھ ہی وہ چیخ چیخ کر کچھ کہہ بھی رہا تھا جو اس وقت میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ میں اپنے عقب نما آئینے میں دیکھ رہا تھا کہ امانڈا تیزی سے گیراج کے بیرونی دروازے کی طرف جا رہی تھی۔ میں بھی یہی چاہتا تھا کہ وہ بہ حفاظت وہاں سے نکل جائے تاکہ میں اس کا تعاقب کرنے والے سے باز پرس کر سکوں۔

ادھر وہ اپنی کار سے اترا اور ادھر میں اپنی کار سے اتر آیا۔ وہ میری طرف اس انداز سے بڑھ رہا تھا جیسے میری بوٹیاں کر دے گا یا میرے چیتھڑے اڑا دے گا۔ وہ مسلسل کچھ بڑبڑا رہا تھا جب کہ میرا دایاں ہاتھ بیلٹ پر تھا جہاں میرا پستول موجود تھا۔ اس کی موجودگی میں مجھے کسی چیز کی فکر نہیں تھی۔

"بے وقوف انسان، کیا تم پاگل ہو گئے ہو؟" سیاہ کار والے نے چیخ کر کہا۔ "تم نے ابھی ابھی اپنی اور میری موت کا پورا پورا سامان کر دیا تھا اگر مرنے کا شوق ہے تو کہیں اور جا کر مرو۔"

"میں پاگل ضرور ہوں لیکن تم جیسا نہیں۔" میں نے غراتے ہوئے کہا۔ "میں لڑکیوں کا تعاقب کر کے انہیں ہراساں نہیں کرتا۔" یہ کہتے کہتے میں نے لپک کر اس کا گلا پکڑ لیا اور پوری قوت سے دبانا شروع کر دیا۔ سیاہ کار والا حیران و پریشان تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ وہ اپنا گلا میری مضبوط گرفت سے چھڑانے کے لیے زبردست جدوجہد کر رہا تھا۔ میں نے اس کا گلا پکڑ کر اسے گھسیٹا اور اس کی کار کے پیچھے لے آیا جہاں میں نے پوری

قوت سے اس کی گردن نیچے کی تو اس کا سر کار کی ڈکی پر ٹک گیا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے اپنا پستول نکال کر اس کی پسلیوں سے لگاتے ہوئے کہا۔ ''اس لڑکی کا پیچھا کرنا چھوڑ دو۔ آج کے بعد اگر تم نے اس کا تعاقب کیا یا اسے ہراساں کرنے کی کوشش کی تو میں تمہارا برا حشر کروں گا۔''

اس نے ایک بار پھر خود کو چھڑانے کی کوشش کی مگر میں نے یہ کوشش ناکام بنادی۔ اس کے بجائے میں نے اپنا پستول اس کے عین دل کے مقام پر رکھ دیا۔

یہ دیکھ کر اس کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں اور چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اس نے موت کے فرشتے کو دیکھ لیا ہے۔ میں نے سوچا کہ آج کے لیے اتنا ہی بہت ہے۔ اس لیے میں نے اسے اپنی گرفت سے آزاد کر دیا اور خود پیچھے ہٹ گیا۔ اس نے میری طرف بے چارگی سے دیکھا، میرے ہاتھ میں ابھی تک پستول دبا ہوا تھا جس کی نال کا رخ اسی کی طرف تھا۔ اس کی موجودگی میں وہ مجھ پر حملے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے مجھے گھور کر دیکھا ضرور..... لیکن گھورنے کے علاوہ اور کچھ نہیں کر سکا۔ وہ خود کو بہادر ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا تھا مگر اس میں بھی ناکام رہا۔

''تم نے میرے ساتھ یہ سب کیوں کیا جب کہ میں تمہیں جانتا تک نہیں؟'' اس نے اپنا گلا سہلاتے ہوئے کہا۔

''تم مس انابڈا اسمعہ کو مسلسل ہراساں کر رہے ہو جب کہ یہ بات نہ اسے پسند ہے اور نہ مجھے۔'' میں نے رعب دار لہجے میں کہا۔ ''اگر تم نے آئندہ اسے ہراساں کرنے کی کوشش کی تو بہت نقصان اٹھاؤ گے۔ سمجھ گئے یا اور سمجھاؤں؟''

''سمجھ گیا..... سمجھ گیا۔'' اس نے ایسے کہا جیسے میں کوئی ننھا سا بچہ ہوں اور اس سے کسی بات کی ضد کر رہا ہوں۔

''ہمارے درمیان کوئی جھگڑا نہیں ہے۔'' میں نے اس سے کہا۔ ''اور نہ میں کسی دشمنی کی بنیاد رکھ رہا ہوں۔ تمہارے لیے بہتر ہوگا کہ اپنی کار میں بیٹھو اور یہاں سے چلے جاؤ..... اور آئندہ مس انابڈا کو ہراساں کرنے کی حماقت مت کرنا ورنہ..... باقی تم خود سمجھ دار ہو۔ میں نہیں چاہتا کہ میرا اور تمہارا دوبارہ آمنا سامنا ہو۔''

میں نے سوچا کہ کم از کم یہ تو معلوم کروں کہ وہ کون ہے اور یہ بھی چیک کر دوں کہ اس کے پاس کوئی ہتھیار ہے یا نہیں لیکن اس کی نوبت نہیں آئی کیونکہ اسی دوران ایک نیلی کار وہاں داخل ہوئی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ کسی کو یہ پتا چلے کہ ہمارے درمیان کوئی جھگڑا وغیرہ ہو رہا ہے، مجھے یہ اندیشہ تھا کہ کہیں وہاں پولیس نہ آ جائے، اگر ایسا ہوتا تو میرے لیے مشکل کھڑی ہو سکتی تھی۔ لہٰذا میں نے وہاں سے کھسک جانے میں ہی عافیت جانی۔

''ٹھیک ہے مسٹر.....'' سیاہ کار والے نے تھکے تھکے انداز سے کہا اور اپنی کار کی طرف بڑھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد اس کی کار وہاں سے واپس جا رہی تھی۔ میں نے اپنا پستول واپس ہیلٹر میں اڑس لیا۔ میں مطمئن تھا کہ اس کھلم کھلا ٹکراؤ کے بعد وہ اب کبھی انابڈا کو تنگ نہیں کرے گا لیکن میں سیاہ کار والے کی طرف سے بالکل ہی بے فکر نہیں ہونا چاہتا تھا وہ کسی بھی وقت موقع ملتے ہی کچھ بھی کر سکتا تھا لہٰذا میں نے فیصلہ کیا کہ تھوڑے تھوڑے دن بعد انابڈا کو چیک کرتا رہوں گا اور اس کی خیریت معلوم کرتا رہوں گا تاکہ اگر کسی وقت اسے میری مدد کی ضرورت ہو تو میں فوراً پہنچ جاؤں۔ ویسے انابڈا کے پاس میرا فون نمبر بھی تھا اگر وہ ضرورت محسوس کرتی تو مجھ سے خود ہی رابطہ کر سکتی تھی۔ یہ سوچ کر میں اپنی کار کی طرف بڑھ گیا۔ نیلی کار والے نے میری طرف دیکھ کر خوش اخلاقی سے ہاتھ ہلایا اور میں وہاں سے روانہ ہو گیا۔

☆☆☆

دو ہفتے خیریت سے گزر گئے۔ اس دوران نہ میں نے انابڈا سے رابطہ کیا اور نہ اس کی جانب رابطہ کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ سب ٹھیک ٹھاک تھا اور صورتِ حال اطمینان بخش تھی۔ میرے پاس کام بھی آ رہا تھا اور اس کا معاوضہ بھی مل رہا تھا لیکن مجموعی طور پر بے کیفی چھائی ہوئی تھی کیوں کہ اس دوران زیادہ تر کام تاجروں، صنعت کاروں اور دوسرے خشک مزاج لوگوں کے ملے تھے۔ منصبِ نازک سے چوں کہ میرا سابقہ نہیں پڑ رہا تھا اس لیے زندگی بے کیف معلوم ہو رہی تھی۔ میں باقاعدہ جاگنگ کرنے پارک میں بھی جاتا تھا اور شوٹنگ کی پریکٹس بھی کرتا تھا۔ میرے پیشے کے اعتبار سے خود کو فٹ رکھنے کے لیے یہ سب بے حد ضروری تھا مگر پھر بھی بیزاری نے مجھے گھیر رکھا تھا۔

اس روز میں کاؤچ پر بیٹھا زندگی کی بے ثباتی پر غور کر رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ انسان اتنا خود غرض اور لالچی کیوں ہے..... کہ فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ میں نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا اور ماؤتھ پیس میں ہیلو کہا۔

''تو آج ملا نو؟'' دوسری طرف سے انابڈا کی سُریلی آواز سن کر میرے دل میں گھنٹیاں سی بجنے لگیں۔

''ہاں، میں بول رہا ہوں۔'' میں نے جلدی سے جواب دیا۔ اس دوران میں نے محسوس کر لیا تھا کہ وہ کچھ گھبرائی ہوئی ہے۔ ''خیریت تو ہے نا؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

''وہ..... مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے، فوراً جلدی سے میرے پاس آ جاؤ..... کوئی شخص میرے گھر میں گھسنے کی کوشش کر رہا ہے۔'' انابڈا نے بوکھلائے ہوئے لہجے میں کہہ رہی تھی۔ ''یہ وہی آدمی ہے..... میری جان کا دشمن!''

میرا خیال غلط ثابت ہوا تھا، میں سمجھ رہا تھا کہ میری دھمکی کے بعد سیاہ کار والا انابڈا کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھے گا لیکن اس نے تو انتہا کر دی تھی، وہ اس کے گھر میں کھلم کھلا داخل ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔

''انابڈا گھبرانا نہیں..... میں آ رہا ہوں تم ایسا کرو کہ جس کمرے میں ہو، اسے لاک کر لو۔'' میں نے اسے نصیحت کرتے ہوئے کہا۔ ''دروازے کے سامنے احتیاطاً کوئی میز یا صوفہ وغیرہ کھینچ کر رکھ دو اور فوراً 911 پر رابطہ کرو، میں بس پہنچ رہا ہوں۔''

☆☆☆

میرا گھر لنکن پارک میں واقع تھا جہاں سے انابڈا کے گھر تک کا فاصلہ زیادہ نہیں تھا مگر اس وقت یہ فاصلہ بہت زیادہ لگ رہا تھا کیوں کہ ایک تو میری کار پرانی تھی، دوسرے راستے میں ٹریفک بہت زیادہ تھا لیکن میں اس میں بھی تیز رفتاری کا مظاہرہ کر رہا تھا جس کی وجہ سے مجھے راستے میں کئی گاڑی والوں نے چیخ چیخ کر برا بھلا کہا اور لعنت ملامت بھی کی۔ ان کا خیال تھا کہ اس انداز سے گاڑی ڈرائیو کر کے میں خود بھی مروں گا اور انہیں بھی مرواؤں گا مگر مجھے کسی کی پروا نہیں تھی۔ میں آندھی طوفان کی طرح انابڈا کے گھر کی طرف اڑا چلا جا رہا تھا۔ مجھے جلد از جلد وہاں پہنچنا تھا جہاں وہ ظالم شخص انابڈا کی جان لینے کی کوشش کر رہا تھا۔

میں اس پرانی اور کھٹارا کار کو استعمال کرنے پر اس لیے مجبور تھا کیونکہ میری اپنے ڈیڈی اور فیملی سے لڑائی ہو گئی تھی۔ میں ان لوگوں کا کوئی احسان نہیں لینا چاہتا تھا ورنہ میرے ڈیڈی کا ''بزنس'' بہت اچھا تھا، وہ مجھے نئی کار بھی دلوا سکتے تھے لیکن اس دور کے دوسرے نوجوانوں کی طرح میرے ذہن میں بھی یہ خبط سا گیا تھا کہ میں اپنے پیروں پر کھڑا ہوں گا اور اپنی زندگی خود بناؤں گا اسی لیے میں اپنے گھر کا عیش و عشرت چھوڑ کر اس فلیٹ میں تنہا زندگی گزارنے اور اس کھٹارا گاڑی کو استعمال کرنے پر مجبور تھا۔ حالانکہ اس وقت رات کا ایک بجا تھا اس کے باوجود سڑک پر اس قدر ٹریفک تھا کہ ایسا لگ رہا تھا جیسے دن نکلا ہوا ہو۔ ویسے بھی عام طور سے یہ کہا جاتا ہے کہ نیویارک وہ شہر ہے جہاں کبھی رات نہیں ہوتی۔ اس شہر کے لوگ ہر وقت جاگتے رہتے ہیں۔

آخر کار میں انابڈا کے گھر پہنچ گیا۔ وہ خاصا بڑا اور کشادہ مکان تھا۔ اسے دیکھ کر مجھے یہ اندازہ لگانے میں دیر نہیں لگی کہ انابڈا اتنی غریب نہیں ہے جتنا اس نے خود کو میرے سامنے ظاہر کیا تھا۔ ممکن ہے یہ گھر اسے کسی عزیز کی جانب سے ترکے میں ملا ہو یا اس نے ورثے میں ملنے والی دولت سے یہ گھر خریدا ہو۔ بہرحال جو بھی تھا، وہ گھر بہت خوبصورت تھا۔ اس کے سامنے وہی سیاہ نسان کار کھڑی تھی جسے میں نے اس روز انابڈا کے دشمن کو چلاتے دیکھا تھا، آس پاس پولیس تھی اور نہ کوئی پولیس کار۔ یا تو انابڈا نے پولیس کو اطلاع ہی نہیں دی تھی یا اس کا پولیس سے رابطہ نہیں ہو سکا تھا۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ انابڈا نے مجھے فون کرنے کے بعد اس شخص کی انابڈا کی ٹیلی فون لائن کاٹ دی ہو۔ میں نے اپنی جیب سے پستول نکالا اور بھاگتا ہوا آگے بڑھا۔ میں نے دیکھ لیا تھا کہ اس گھر پر کوئی سکیورٹی الارم نہیں لگا ہوا تھا۔ یہ بھی اچھا ہی تھا، اگر ایسا ہوتا تو انابڈا کا دشمن میری آمد سے باخبر ہو جاتا۔

گھر کا دروازہ بند تھا اس کا مطلب یہ تھا کہ سیاہ کار والا کھڑکی سے یا کسی اور ذریعے سے اندر داخل ہوا تھا۔ میں نے کسی کھلی ہوئی کھڑکی کی تلاش میں نظریں دوڑائیں تو اوپر والی منزل پر مجھے ایک کھڑکی نظر آ گئی۔ اس کے بالکل سامنے صنوبر کا ایک درخت تھا۔ کھڑکی کے سامنے وہ درخت دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی۔ میں نے سوچا کہ اس معاملے سے نمٹنے کے بعد میں انابڈا سے بات کروں گا کہ وہ کھڑکی کے سامنے سے یہ درخت کٹوا دے ورنہ کسی بھی دشمن کے لیے اس درخت کے ذریعے اس کھڑکی تک پہنچنا کوئی مشکل کام نہیں ہوگا۔

میں لپک کر اس درخت پر چڑھ گیا اور چند ثانیوں میں ہی اوپر کھڑکی تک جا پہنچا۔ اس طرح کے کاموں میں مجھے بڑی مہارت تھی۔ میرا اندازہ تھا کہ سیاہ کار والا بھی اس طرح اوپر گیا ہوگا۔ وہ کھڑکی انابڈا کے بیڈ روم کی تھی۔ وہ بیڈ روم بڑی نفاست سے سجایا گیا تھا لیکن میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ میں اس کی خوبصورتی کو دیکھتا، پھر وہ دشمنِ جاں بھی وہاں موجود تھا۔ اس کی پیٹھ کھڑکی کی طرف تھی۔ اس کے سامنے سہمی اور خوف زدہ انابڈا کھڑی تھی۔ اس کے جسم پر باریک کپڑے کا ایک گاؤن تھا جس میں سے اس کا مرمریں بدن جھلک رہا تھا۔ سیاہ کار والا بڑے خطرناک انداز میں انابڈا کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اور انابڈا سہمے ہوئے انداز سے پیچھے دروازے کی طرف ہٹ رہی تھی۔ میں کھڑکی پر چڑھ گیا۔ انابڈا نے مجھے دیکھ لیا تھا مگر اس نے کسی حیرت کا اظہار نہیں کیا۔ وہ دشمن کو باخبر نہیں کرنا چاہتی تھی۔

"بے حیا، فاحشہ!" سیاہ کار والے نے نفرت سے کہا۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھا جس کا رخ امانڈا کی طرف ہی تھا۔ میری آہٹ سن کر وہ میری طرف گھوما لیکن یہ اس کی بدبختی ہی تھی کہ میرے ہاتھ میں پستول تھا اور اگر میں پہل نہ کرتا تو وہ مجھے شوٹ کر دیتا لہٰذا میں نے فائر کرنے میں کوئی تاخیر نہیں کی۔ جھٹکا اتنا زوردار تھا کہ وہ پوری طرح گھوما اور لہراتا ہوا امانڈا کے بیڈ پر گر گیا۔ اس کے سینے سے خون کا چشمہ ابل رہا تھا۔

امانڈا فرش پر بیٹھ کر ہسٹریائی انداز سے چیخ چیخ کر رونے لگی۔ میں اپنا پستول ہاتھ میں لیے کھڑا تھا اور یہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ یہ سب اچانک کیسے ہو گیا پھر مجھے خیال آیا کہ شاید سیاہ کار والا زندہ ہو چنانچہ میں نے آگے بڑھ کر اس کی نبض چیک کی مگر وہ مر چکا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر میرے ہاتھ میں اس وقت پستول نہ ہوتا تو سیاہ کار والا میرے ہاتھ سے نہ مارا جاتا لیکن اس صورت میں وہ مجھے قتل کر دیتا۔

میں نے اس کی جیبوں کی تلاشی لی۔ میں جاننا چاہتا تھا کہ میرے ہاتھوں مارا جانے والا شخص کون ہے پھر مجھے اس کا شناختی کارڈ مل گیا۔ اس کا نام روز فلر تھا اور وہ ایک پرائیویٹ سراغرساں تھا۔ یہ بات میرے لیے پریشان کن تھی کہ ایک پرائیویٹ سراغ رساں میرے ہاتھوں مارا گیا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ امانڈا کا تعاقب بغیر کسی وجہ کے نہیں کر رہا تھا، اس کے پیچھے اصل کہانی کچھ اور ہی تھی۔ میں نے کچھ سوچا پھر اپنا سیل فون نکالا اور پولیس کا نمبر ملانے لگا۔ میرا فرض تھا کہ اس واقعے کی اطلاع پولیس کو فوراً دوں۔

☆☆☆

یہ میری بدقسمتی ہی تھی کہ اس روز سارجنٹ ولیمز نائٹ ڈیوٹی پر تھا۔ وہ میرا ازلی دشمن تھا اور مجھے نقصان پہنچانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ میرے ڈیڈی نے اس کے پارٹنر کی شکایت کی تھی اور اسے ملازمت سے نکلوا دیا تھا حالانکہ اس کے پارٹنر نے اپنی غلطی سے وہ ملازمت کھوئی تھی، بہرحال اس دن سے سارجنٹ ولیمز میرا دشمن بن گیا تھا۔

پھر پولیس، سارجنٹ ولیمز کی قیادت میں امانڈا کے گھر پہنچ گئی۔ ٹیکنیکل اسٹاف روز فلر کی لاش کے اطراف پاؤڈر چھڑک کر اس کی مختلف زاویوں سے تصویریں اتار رہا تھا۔ سارجنٹ ولیمز خاموشی سے کھڑا یہ سب دیکھ رہا تھا۔ چند لمحوں بعد وہ مجھے ہال میں لے گیا اور درشت لہجے میں بولا۔ "آج تمہیں کوئی نہیں بچا سکے گا۔ میرا دل چاہ رہا ہے کہ تمہیں کال کوٹھری میں بند کر کے چابی کہیں پھینک دوں۔"

"سارجنٹ، میں نے یہ قدم اپنے دفاع میں اٹھایا ہے اس شخص کے پاس پستول تھا، اگر میں اسے شوٹ نہ کرتا تو وہ مجھے قتل کر دیتا۔" میں نے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔ "دوسری بات یہ ہے کہ یہ شخص امانڈا کا تعاقب کرتا رہا تھا اور اسے ہراساں کر رہا تھا۔ وہ اس کے گھر میں زبردستی داخل ہوا تھا، نہ جانے اس کے کیا ارادے تھے وہ امانڈا کو قتل کرنا چاہتا تھا یا اس کے ساتھ زیادتی کرنے والا تھا، میں نے تو امانڈا کو تحفظ فراہم کر کے تمہاری ..... یعنی پولیس کی مدد کی ہے۔ تمہیں تو میرا شکر گزار ہونا چاہیے۔"

"لیکن میں دیکھ رہا تھا کہ میری باتوں کا سارجنٹ ولیمز پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں میں میرے لیے نفرت کی چنگاریاں تھیں۔

"تمہاری بکواس ختم ہو گئی؟" سارجنٹ نے نخوت سے کہا۔ "اب تم سیدھی طرح میرے ساتھ پولیس اسٹیشن چلو۔ جو کہنا ہے وہیں چل کر کہنا۔" یہ کہہ کر اس نے مجھے گھما کر دیوار کے ساتھ لگایا اور میرے دونوں ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال دیں۔

☆☆☆

میں نے سارجنٹ ولیمز کو اپنی پوری کہانی سو دفعہ سنا دی مگر ہر بار وہ مجھ سے یہی کہتا تھا کہ میں اسے سچ بتاؤں۔ جب میری برداشت سے باہر ہو گیا تو میں نے اس سے کہا۔ "سنو سارجنٹ، میں نے تمہیں سب کچھ سچ سچ بتا دیا ہے۔ اب تمہاری مرضی ہے کہ اس کا یقین کر دو یا نہ کرو لیکن خدا کے لیے مجھے اس کوٹھری سے نکالو، میں اس تنگ جگہ میں مر جاؤں گا۔"

"جو حکم عالی جاہ!" اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "میں ابھی تمہارے لیے اس جگہ کو آراستہ کراتا ہوں، نیا رنگ و روغن کراتا ہوں۔ نیا ٹی وی اور فریج منگواتا ہوں، ظاہر ہے تم جیسے قاتل مجرم کے آرام کا خیال رکھنا میرا فرض جو ہے۔"

"سارجنٹ ....." میں نے کچھ کہنا چاہا تو اس نے مجھے زور سے ڈانٹ دیا۔

ابھی میں کچھ کہنے والا تھا کہ ایک تنومند مگر بدشکل پولیس والا اندر داخل ہوا۔ اس کا شیو بڑھا ہوا تھا لیکن جو بات اس نے سارجنٹ ولیمز سے کہی وہ سن کر وہ مجھے فرشتہ لگنے لگا۔ اس نے کہا تھا۔ "چیف کہہ رہے ہیں کہ ہمارے پاس اس شخص کی بے گناہی کا ثبوت آ گیا ہے۔ اس نے کچھ نہیں کیا، اسے فوری رہا کر دیا جائے۔" میں نے سارجنٹ ولیمز کی طرف مسکرا کر دیکھا جو مجھے ایسے گھور رہا تھا جیسے کچا کھا جائے گا۔

میں سوچنے لگا کہ یہ جادو کیسے ہو گیا؟ پھر مجھے خیال آیا کہ ضرور کسی وکیل نے چکر چلایا ہو گا۔ اس نے سارجنٹ کے پاس کو دھمکی دی ہو گی کہ اگر اس نے مجھے رہا نہ کیا تو وہ اسے عدالت میں لے جائے گا۔

میں نے نہایت سکون سے سارجنٹ سے کہا۔ "اچھا بھئی سارجنٹ! ہم تو چلے۔ ویسے تمہارے لیے یہ شرم کا مقام ہے کہ مجرم تمہاری گرفت میں آنے کے بعد اس طرح سے نکل جائے۔"

"ملانو، میں کہتا ہوں کہ میری نظروں سے دور ہو جاؤ ورنہ ....." یہ کہتے ہوئے سارجنٹ ولیمز نے نفرت سے زمین پر تھوکا اور میں جلدی سے باہر نکل گیا۔ تنومند پولیس والا مجھے پولیس چیف کے کمرے میں لے گیا جہاں میرا سامان میرے حوالے کر دیا گیا اور مجھے جانے کی اجازت مل گئی۔ میں نے اس شخص کی طرف دیکھا جس نے مجھے اس لاک اپ سے نجات دلائی تھی۔ وہ ایک شریف نوجوان لگ رہا تھا جس کے جسم پر بیش قیمت سوٹ تھا۔

"مسٹر ملانو، میرا نام میکس ویل ہے۔" نوجوان نے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا تو میں نے اس سے ہاتھ ملایا۔

"میں ایک وکیل ہوں اور تمہارے ڈیڈی نے تمہیں یہاں سے رہا کرانے کے لیے میری خدمات حاصل کی تھیں۔" نوجوان وکیل کی یہ بات سن کر میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ میرے ڈیڈی بار بار میری مدد کر کے مجھے یہ جتانے کی کوشش کرتے تھے کہ میں ہمیشہ ان کی مدد کا محتاج رہوں گا۔ اور اپنے آپ کوئی کام نہیں کر سکتا۔ میرا جی چاہا کہ واپس لاک اپ میں جا کر بند ہو جاؤں لیکن پھر میں خود کو کوستا ہوا باہر نکلا۔ نوجوان وکیل میرے ساتھ تھا۔

"مسٹر میکس ویل، ڈیڈی کا میری طرف سے شکریہ ادا کر دینا۔" میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ "اور یہ بھی کہہ دینا کہ ان کی ان مہربانیوں سے میرے اور ان کے درمیان فاصلے کم نہیں ہوں گے۔"

"ٹھیک ہے، کہہ دوں گا اور کوئی حکم؟" میکس ویل نے کہا۔

"اور اب مجھے میرے گھر تک چھوڑ دو۔" میں نے سپاٹ لہجے میں کہا تو میکس ویل مجھے اپنی کار کی طرف لے گیا۔

☆☆☆

اس وقت میں اپنی کار میں بیٹھا تھا میری کار روز فلر کے گھر کے سامنے کھڑی تھی جو ساحل پر تھا میں اندھیرا ہونے کا منتظر تھا۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ وہاں کوئی نہیں ہے جو مجھے دیکھ سکے تو میں اپنی کار سے اترا، اس وقت تک اندھیرا ابھی ہو چکا تھا۔ سمندر کی جانب سے آنے والی ہوا کے جھونکے اس وقت بہت خوشگوار لگ رہے تھے۔ میں محتاط قدموں سے روز فلر کے گھر کی طرف بڑھا۔ تھوڑی دیر تک میں اس کے دروازے کو چیک کرتا رہا کہ وہاں خفیہ الارم تو نہیں لگا ہوا ہے۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ لائن صاف ہے تو میں نے اپنی جیب سے ایک مڑا تڑا سا تار نکالا اور تالے کے سوراخ میں داخل کر دیا۔ ایک منٹ میں تالا کھل گیا اور میں آہستگی سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔

بیرونی دروازہ ڈرائنگ روم میں کھل رہا تھا۔ یہ کمرا خاصا بڑا تھا مجھے اس گھر کو دیکھ کر ایسا لگا جیسے روز فلر نے اسے سجانے یا سنوارنے پر کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ اس گھر میں موجود دھول مٹی یہ بتا رہی تھی کہ روز فلر اس گھر میں بہت کم وقت گزارتا تھا۔ ڈرائنگ روم میں ایک سستا سا ٹی وی، ایک سستا سا وی سی آر اور ایک چھوٹی سی میز رکھی تھی۔ میز پر شراب کی ایک بوتل رکھی تھی جو آدھی استعمال ہو چکی تھی۔ برابر میں کاؤچ رکھی تھی جس پر ڈھیروں ویڈیو کیسٹس بے ترتیبی سے پڑی ہوئی تھیں۔ مجھے ایسا لگا کہ یہ سب فحش فلموں کی کیسٹس ہیں۔ میں نے کچھ سوچا اور وہاں سے ایک ویڈیو کیسٹ اٹھا کر وی سی آر پر لگائی اور ٹی وی آن کر دیا۔

ٹی وی کی اسکرین ہو گئی لیکن اس پر کسی تصویر کے بجائے صرف کھرکھر کی آوازیں آتی رہیں۔ اس کے بعد اسکرین پر ایک کمرے کا منظر ابھر آیا۔ وہاں ایک خاصا بھاری بھرکم شخص تھا جس کے جسم پر اس قدر بال تھے کہ اگر اسے ریچھ کہا جاتا تو بے جا نہ ہوتا۔ وہ کپڑوں سے بے نیاز تھا، اس کے ساتھ بستر پر جو عورت تھی اسے دیکھ کر نہ میں چونکا اور نہ حیران ہوا، بلکہ ایک مسکراہٹ میرے ہونٹوں پر پھیل گئی۔ میرا اندازہ بالکل صحیح نکلا۔ وہ عورت اس بالوں والے مرد کے ساتھ گناہ کا کھیل کھیل رہی تھی۔ میں نے اس سے پہلے بھی فحش فلمیں دیکھی تھیں مگر یہ فلم دیکھ کر مجھے پسینہ آ گیا۔ وہ عورت امانڈا تھی۔

یکایک میں نے اپنے پیچھے آہٹ سنی جیسے کوئی دبے قدموں اندر آیا ہو۔ میں نے پیچھے گھومتے ہوئے اپنا پستول نکال لیا۔ وہ امانڈا تھی۔ وہ ڈیوفلم کے مقابلے میں کچھ بڑی عمر کی لگ رہی تھی لیکن اس کی ٹانگیں ابھی تک ویسی ہی تھیں جیسی فلم میں نظر آ رہی تھیں۔ نیلے اسکرٹ اور سفید بلاؤز میں وہ خاصی پرکشش لگ رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک ننھا منا سا پستول تھا جو اس نے میری طرف تان رکھا تھا۔

''تو تمہیں سب کچھ معلوم ہو گیا؟'' اماندا نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''بلکہ ضرورت سے زیادہ جلدی معلوم ہو گیا۔''

''ہاں لگتا تو ایسا ہی ہے۔'' میں نے اپنا پستول ابھی تک اس کی طرف تان رکھا تھا اور اس نے اپنے پستول سے مجھے نشانہ بنا رکھا تھا۔

''اماندا میں سب سمجھ چکا ہوں۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ''یہ فحش کیسٹ مجھے بہت کچھ بتا چکی ہے۔ میرے خیال میں روز فلر تمہارے اس راز سے واقف ہو چکا تھا اور وہ تمہیں بلیک میل کر رہا تھا۔ ہے نا؟ اور اب تم وہ ثبوت واپس لے جانے کے لیے ہی یہاں آئی ہو، میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟ مگر یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ میں تم سے پہلے یہاں پہنچ گیا۔''

اماندا نے کوئی جواب نہیں دیا البتہ پستول پر اپنی گرفت مضبوط کر دی۔

''تم اداکاری کو سنجیدگی کے ساتھ بہ طور پروفیشن اپنانا چاہتی تھیں مگر یہ فحش فلمیں جو تم نے کئی سال پہلے بنوائی تھیں، تمہارے راستے کی رکاوٹ بن سکتی تھیں۔ روز فلر کو ان فلموں کے بارے میں معلوم ہو چکا تھا، اس نے تمہیں بلیک میل کرنا شروع کیا تو تم نے اسے کسی تنہا جگہ ملنے کے لیے بلایا تاکہ اس سے بات چیت کر کے اس کا مطالبہ پورا کر دو اور وہ رقم لے کر خاموش ہو جائے۔ ادھر تم نے اسے بلایا اور دوسری طرف مجھ سے رابطہ کر کے یہ کہانی سنائی کہ کوئی تمہارا تعاقب کر رہا ہے۔ تمہارا منصوبہ یہ تھا کہ میں اپنی آنکھوں سے اسے تمہارا تعاقب کرتے دیکھ لوں گا تو تمہاری کہانی پر یقین کر لوں گا۔ بعد میں تم نے جو سوچا تھا ویسا ہی ہوا، میں نے روز فلر کو قتل کر دیا اور پولیس نے مجھے گرفتار کر لیا۔ اس طرح تمہارا کام ہو گیا، تمہیں ایک بلیک میلر سے نجات مل گئی اور تمہارے لیے اداکاری کے میدان میں کیریئر بنانے کی راہ ہموار ہو گئی۔''

''شٹ اپ۔'' اماندا نے غصے سے کہا۔ ''اچھا ہوا کہ وہ مر گیا، بلیک میلرز کو ویسے بھی زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ اچھا اب میری بات سنو، تم اپنا پستول پھینک دو میں اپنا پھینک دیتی ہوں۔ ہم دونوں مل کر اس مسئلے کا کوئی حل نکال لیں گے، میرا یقین کرو تمہیں کوئی نقصان نہیں ہو گا بلکہ تم فائدے میں ہی رہو گے۔'' یہ کہہ کر وہ بڑے قاتلانہ انداز سے مسکرائی۔ ''مجھے دو بہت بڑے اسٹوڈیوز کی طرف سے دو بہت بڑی آفرز مل چکی ہیں۔ میرا مستقبل بہت روشن ہے۔''

''میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔'' میں نے جان بوجھ کر انجان بنتے ہوئے کہا۔

''میں تمہارے دل کی بات جانتی ہوں۔'' اماندا نے کہا۔ ''تم جس طرح میری طرف دیکھتے ہو اس سے مجھے اندازہ ہو چکا ہے کہ تم مجھ سے کیا چاہتے ہو۔ میں تمہاری خواہش کی راہ میں حائل نہیں ہوں گی۔ میں تمہاری ہوں گی اور میرا سب کچھ بھی تمہارا ہی ہو گا۔ اگر میں ایک کامیاب اسٹار بن گئی تو دنیا ہماری مٹھی میں ہو گی۔ ہم خوب گھومیں گے، پھریں گے۔ عیش و عشرت ٹھاٹ باٹ، جہاز، کشتیاں، ہوٹل، دلاز، پارٹیاں سب کچھ ہمارے پاس ہو گا۔ اس وقت تمہیں اندازہ ہو گا کہ تم نے میرا ساتھ دے کر کتنی عقل مندی کا مظاہرہ کیا تھا۔''

''اوہ میرے خدا، تمہیں تو پورا یقین ہے کہ میں تمہارا ساتھ دوں گا۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

''ظاہر ہے میں نے تمہارے دل کی بات جو پڑھ لی ہے۔'' اس نے پورے اعتماد سے کہا۔

''اماندا تم نے بہت بڑی غلطی کی تھی جو مجھ سے مدد مانگی تھی اور میرے ذریعے اپنے بلیک میلر کا خاتمہ کرایا۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ''میں غلط کام نہیں کرتا۔ تم مجھے کتنے ہی لالچ کیوں نہ دے لو، میں یہ تمام پول کھلنے کے بعد اب تمہارا ساتھ نہیں دوں گا۔''

''بے وقوفی کی باتیں مت کرو۔'' اماندا نے کہا۔ ''دنیا میں ہر انسان کی ایک قیمت ہوتی ہے۔ بولو کیا چاہیے تمہیں؟ دولت، طاقت یا عورت؟''

''بکواس مت کرو۔'' میں نے غصے سے کہا تو اسے بھی غصہ آ گیا اور اسی غصے میں اس کی انگلیوں کا دباؤ اس کے پستول کے ٹریگر پر بڑھ گیا۔ غصے میں اس نے یہ بھی نہیں دیکھا کہ اس کے پستول کا رخ میرے بجائے اس کی طرف ہو گیا تھا کیونکہ وہ باتیں کرتے ہوئے مسلسل اپنے پستول والے ہاتھ کو ادھر ادھر ہلا رہی تھی۔ ایک دھماکا ہوا اور اماندا لہرا کر فرش پر گر گئی۔ اس کا لباس خون آلود ہو گیا اور وہ اسی وقت مر گئی۔ کمرے میں اس کی سسکیوں کی آواز سنائی دی تو میں نے چونک کر اس کی لاش کی طرف دیکھا۔ تب پتا چلا کہ وہ آواز ٹی وی سے آ رہی تھی جس پر اس کی فحش فلم ابھی تک چل رہی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ اماندا آج مری ہے یا اس دن مری تھی جس دن اس نے یہ فحش فلم بنوائی تھی؟

میں نے اپنا سیل فون نکالا اور سارجنٹ ولیمز کا نمبر ڈائل کرنے لگا۔ مجھے معلوم تھا کہ اس مرتبہ وہ مجھ پر شک نہیں کرے گا، بلکہ اس ڈرامے کے کامیاب ڈراپ سین پر مجھے شاباشی دے گا۔

✱✱

قاتل گیت

سیرینا راض

محبت کرنے سے پہلے انسان یہ نہیں سوچتا کہ اس کا انجام کیا ہو گا وہ ہمیشہ کے لیے ایک ہو جائیں گے — یا پھر ان کے درمیان دائمی جدائی کے فاصلے حائل ہو جائیں گے۔ دو محبت کرنے والوں کا قصہ پُر افسوں جو محبت کی کشتی میں سوار تو ہو گئے تھے لیکن منزل کا پتا معلوم نہیں تھا۔

موسیقی کا شوق رکھنے والے شائقین کے لیے ایک قاتل دھن کا انتخاب

نومبر، دسمبر میں جب بارش ہوتی ہے تو لاہور شہر خراب بن جاتا ہے۔ ایک تو سردی اوپر سے بارش..... گھر، سڑکیں، بازار..... ہر جگہ پانی، لاہور کے رہنے والوں کو سردی کی یہ بارش زیادہ نہیں بھاتی۔ وہ اس کے جلد خاتمے کی دعا کرتے ہیں مگر اس بار تو بارش رکنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔

اس بارش میں الیاس پیامی سگڑا سمٹا، رین کوٹ پہنے مال پر چلا جا رہا تھا۔ اس کا ارادہ الحمرا آرٹس کونسل جانے کا تھا۔ نہ جانے کیوں آج اس کا دل چاہ گیا تھا کہ کسی رکشا یا تانگے کے بجائے اس بارش میں سڑکوں پر پیدل سفر کیا جائے اور اب وہ بارش کے پانی میں اپنے اسی ارادے کی تکمیل کر رہا تھا۔

حالانکہ صبح کے دس بج رہے تھے مگر فضا میں کچھ اندھیرا تھا، گہرے سیاہ بادلوں نے آسمان کو ڈھک رکھا تھا۔ الیاس پیامی الحمرا آرٹس کونسل میں داخل ہوا تو گیٹ پر موجود چوکیدار نے اسے روک لیا۔

''اس وقت آپ اندر نہیں جا سکتے۔ ہال بند ہے۔ شام کو پانچ بجے کھلے گا۔'' پٹھان چوکیدار نے الیاس پیامی کو گھورتے ہوئے کہا ''ویسے تم کو اس وقت اندر کیا کام ہے؟ کس سے ملنا ہے؟''

''میں جانتا ہوں کہ ہال بند ہے مگر میں رات کے میوزیکل شو کے سلسلے میں آیا ہوں۔'' الیاس پیامی نے کہا اور اندر کی طرف چل دیا، چوکیدار اس کو روک نہ سکا بلکہ صرف دیکھتا رہ گیا۔

الحمرا کے مین ہال میں داخل ہوتے ہی گویا ماضی کی فلم اس کی آنکھوں کے سامنے چل پڑی۔ ذہن کے دریچے وا ہوتے ہی ہنستی مسکراتی عالیہ اس کے سامنے آن کھڑی ہوئی۔ کبھی وہ دونوں ایک جان دو قالب تھے۔ ایک دوسرے کو بہت چاہتے تھے۔ انہوں نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ وہ اس طرح جدا ہوں گے۔ الیاس پیامی نے اپنا بھیگا ہوا رین کوٹ اتارا، اس پر سے پانی جھاڑا اور کوٹ کو ایک طرف لوہے کی گرل کے پاس رکھے ہوئے اسٹول پر رکھ دیا۔ حالانکہ الیاس کو عالیہ سے جدا ہوئے تین سال کا عرصہ گزر چکا تھا مگر آج بھی اس کی یادوں کے صنم خانے میں اس کی تصویر دھندلی نہیں ہوئی تھی۔ وہ چاہتے ہوئے بھی اس کو بھول نہیں سکا تھا۔

الیاس نے عالیہ کی تلاش میں ادھر ادھر نظریں دوڑائیں مگر وہ اسے وہاں نظر نہ آئی ''ہوسکتا ہے اس نے اب یہاں پروگرام کرنے چھوڑ دیے ہوں۔ وہ اب یہاں نہ ہو، ہوسکتا ہے وہ اس ادارے سے اب کوئی واسطہ نہ رکھنا چاہتی ہو'' اس نے سوچا۔

لمبی راہداری کو طے کرتا ہوا الیاس پیامی آگے بڑھا۔ وہ ہال میں پہنچا جہاں میز کرسیاں رکھی تھیں یہ الحمرا کا ریسٹورنٹ تھا جس کے فرش پر سرخ قالین بچھا ہوا تھا۔ اس ہال کو بڑی خوبصورتی سے سجایا گیا تھا۔ اس کا ماحول خاصا سحر انگیز تھا۔ وہ اس ہال کی خوبصورتی سے متاثر ہوا۔

الیاس پیامی الحمرا اس لیے آیا تھا کہ آج کل یہاں ملک کا ابھرتا ہوا نوجوان موسیقار جاوید خیال اپنے فن کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ ویسے تو وہ ہر ساز کو بجانے میں ماہر تھا اور نوجوان نسل کا نمائندہ گلوکار اور موسیقار تھا۔ مگر پیانو پر اس کو سب سے زیادہ دسترس حاصل تھی۔ لوگ اس کے میوزیکل شو میں بڑے شوق اور دلچسپی سے آتے تھے۔ جاوید خیال گزشتہ ایک ماہ سے الحمرا میں ہر روز اپنا میوزیکل شو کر رہا تھا جس کا عنوان تھا۔

''ایک شام..... جاوید خیال کے نام۔''

اس شو کو عوام الناس میں اور بالخصوص موسیقی کے دیوانوں میں بڑی مقبولیت حاصل ہو رہی تھی۔ جاوید خیال اور اس کے ساتھیوں نے موسیقی کی دنیا میں دھوم مچا دی تھی، یہ ملک کا سب سے مقبول میوزک بینڈ بن کر ابھرا تھا۔

ہال کے ایک کونے میں موسیقی کے جدید آلات رکھے ہوئے تھے۔ وہ ان پر نظر ڈالتا ہوا آگے بڑھا تو اسے دوسری طرف ایک آدمی نظر آیا۔ اس کے یونیفارم کی جیب پر الحمرا کا مونوگرام کڑھا ہوا تھا۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ وہ اس جگہ کا ملازم ہے۔

اس کمرے میں اونچے اونچے بانس کے اسٹول رکھے ہوئے تھے اور سامنے چھوٹی پٹڑی نما کاؤنٹر بنا ہوا تھا۔ اس جگہ کی سیٹنگ واقعی متاثر کن تھی۔ بانس کے شیڈز میں ہی رنگین بلب لگے ہوئے تھے۔ مہاگنی کے کاؤنٹر کے دوسری طرف ایک سنہرا چمکتا ہوا پیانو رکھا تھا جس پر غالباً ابھی ابھی پالش کی گئی تھی۔

اس آدمی نے جو کاؤنٹر کے پاس کھڑا تھا، مڑ کر سوالیہ نظروں سے الیاس پیامی کی طرف دیکھا۔ ''میں غلط وقت آگیا ہوں۔'' الیاس نے کہا۔ ''آپ کو کس سے ملنا ہے؟'' اس آدمی نے پوچھا۔ ''دراصل میں جاوید خیال کے بینڈ میں شامل ہونے آیا ہوں اور آئندہ شوز میں بینڈ کے ساتھ پرفارم کروں گا۔''

''اچھا اچھا!'' اس آدمی کا لہجہ ایک دم بدل گیا۔ ''جاوید خیال صاحب تو ساڑھے دس بجے ریہرسل شروع کرتے ہیں۔ آپ ذرا جلدی آگئے، بہرحال بیٹھیے، میں آپ کے لیے چائے منگواتا ہوں۔''

''شکریہ'' الیاس نے کہا اور ایک کرسی پر بیٹھ گیا تھوڑی دیر بعد اس کے سامنے چائے آگئی۔ اس بھیگے بھیگے موسم سردی میں چائے کی اس گرما گرم پیالی نے بڑا مزہ دیا۔ چائے پیتے ہوئے الیاس نے سامنے لگے قدِ آدم آئینے میں اپنے سراپا کا جائزہ لیا۔ اس کو اس وقت اپنا بڑھا ہوا شیو اچھا نہیں لگا۔

''جاوید خیال صاحب کی وجہ سے ہمارے ہال کی رونق بڑھ گئی ہے۔ بے شمار لوگ ان کی موسیقی سننے آتے ہیں۔ کبھی بڑے موڈ میں اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ہیں، میرے خیال میں اس وقت سننے دوڑنے لگتی ہے جب وہ پیانو پر جگنی کی دھن چھیڑتے ہیں۔ پیانو پر جگنی کی دھن پیش کرنا ایک تجربہ ہے۔'' کاؤنٹر والا آدمی بولے جا رہا تھا اور الیاس مسلسل عالیہ کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

چائے کی پیالی ختم کرنے کے بعد الیاس پیامی اپنے آئندہ اقدام کے بارے میں غور کرنے لگا۔

اچانک اس کے کانوں میں پیانو کی دھن سنائی دی۔ پھر جگنی ہوا کے دوش پر اس کے کانوں تک پہنچنے لگی، کوئی پیانو پر جگنی کی وہی دھن بجا رہا تھا جس نے جاوید خیال

گروپ کو راتوں رات مقبولیت عطا کی تھی۔ شروع میں جاوید خیال کو کوئی جانتا بھی نہیں تھا، وہ چند لڑکوں کی ٹیم کے ساتھ ملک کے چھوٹے بڑے شہروں میں جاتا تھا اور چھوٹے موٹے کنسرٹ کرتا تھا مگر اس کو زیادہ پذیرائی نہیں ملی تھی۔ پھر اس نے جگنی کو پیانو پر چھیڑنے کی سنگت میں بڑے خوبصورت انداز سے ترتیب دیا اور لوگ اس کے دیوانے ہوگئے۔

بعض لوگ یہ بھی کہتے تھے کہ کسی پرانے اور ماہر موسیقار نے جاوید خیال کی مدد کی تھی اور اس کو پیانو پر جگنی کی دھن ترتیب دینا سکھایا تھا لیکن یہ کسی کو معلوم نہ تھا کہ وہ موسیقار کون ہے جس کی وجہ سے آج جاوید خیال کی دھوم مچی ہوئی تھی۔

الیاس پیامی پیانو پر جگنی کی دھن سنتا رہا۔ اس کی انگلیاں بے قراری کے عالم میں میز پر طبلے بجاتی رہیں۔ وہ واقعی بڑی پیاری دھن تھی اور پیانو بجانے والا بھی ماہر معلوم ہوتا تھا۔

''ارے الیاس! تم.....؟'' عالیہ کی آواز سنتے ہی الیاس پیامی تیزی سے مڑا۔ جس کے لیے اس کی آنکھیں ترس رہی تھیں، وہ سامنے ہی کھڑی تھی۔ ویسی ہی متناسب، سرو قد، جاذب نظر، اس کی آنکھیں اب بھی پرانی محبت کا گداز لیے ہوئے تھیں۔ لیکن الیاس کو وہ کچھ دھلی، کچھ مغموم سی لگی۔

''کیا حسین اتفاق ہے کہ تم ایک دم میرے سامنے آگئے۔ مجھے ابھی تک یقین نہیں آرہا۔'' عالیہ نے مترنم لہجے میں الیاس سے کہا۔

''مجھے کونسا یقین آرہا ہے۔'' الیاس نے کہا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کبھی اس حسینہ کی آنکھیں ہمیشہ مسکراتی نظر آتی تھیں اور ان سے بھرپور زندگی کا اظہار ہوتا تھا۔ مگر آج ان میں نہ جانے کہاں سے اتنا دکھ آگیا تھا۔

''سناؤ کیسے ہو تم الیاس؟'' عالیہ نے اس کے پاس ہی بیٹھتے ہوئے کہا ''اتنے عرصے کہاں رہے؟ اب کیا کر رہے ہو؟''

''دراصل کافی عرصے سے کراچی میں ہوں۔'' الیاس پیامی نے کہا ''کچھ دن پہلے دبئی گیا ہوا تھا۔ ایک آدھ چکر امریکا اور برطانیہ کا بھی لگا چکا ہوں۔ حال ہی میں لاہور آیا تھا، جاوید خیال کی کافی شہرت سن چکا تھا۔ سوچا کیوں نہ اس سے ملوں، شاید.....''

''اس دوران موسیقی سے دور رہے..... ہے نا؟'' عالیہ نے اسی افسردگی آمیز مسکراہٹ سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

قارئین متوجہ ہوں

قرآن حکیم کی مقدس آیات و احادیث نبوی آپ کی ذہنی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہٰذا جن صفحات پر آیات اور احادیث درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

''ہاں..... خیر..... تم اپنی سناؤ'' الیاس نے بھی مسکراتے ہوئے کہا۔

''شادی کے بعد خاصی حسین ہوگئی ہو۔'' پھر وہ خود ہی ہنسا اور بولا ''میں بھی کتنا بے وقوف ہوں..... کہہ رہا ہوں کہ تم حسین ہوگئی ہو..... حالانکہ حسین تم تو ہمیشہ سے ہو، لیکن یہ سچ ہے کہ تمہارا حسن واقعی اب پہلے سے زیادہ جادو جگا رہا ہے۔ تمہارے شوہر سلیم بزمی کیسے ہیں؟''

سلیم بزمی کے ذکر پر الیاس نے محسوس کیا کہ عالیہ کی آنکھوں میں دکھ کے سائے لہرانے لگے۔ اس کو افسوس ہوا کہ یہ سوال عالیہ سے کیوں پوچھا۔ کہیں سے الیاس کو معلوم ہوا تھا کہ عالیہ کو شادی کے بعد یہ پتا چلا تھا کہ سلیم بزمی بلانوش ہے۔ شراب کا وہ بے حد رسیا ہے۔ عالیہ، سلیم کی اس عادت سے بے حد پریشان تھی مگر نبھا رہی تھی، شوہر کو بھی برداشت کر رہی تھی اور اس کی اس عادت بد کو بھی۔ شراب پینے کے بعد سلیم بزمی ناقابل برداشت ہوجاتا تھا۔

''اس وقت سلیم بزمی لاہور میں نہیں ہیں۔'' عالیہ نے آہستگی سے کہا۔ ''وہ باہر گئے ہوئے ہیں۔ آؤ ریہرسل پر چلیں۔ جاوید خیال آج کل ایک نئے پروگرام کی ریہرسل کر رہا ہے اور وہ تاخیر برداشت نہیں کرتا، مجھے اس کے ساتھ.....'' اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

دونوں آگے بڑھے تو عالیہ نے الیاس سے پوچھا۔ ''کیا تم کبھی جاوید خیال سے ملے ہو؟''

''نہیں.....'' الیاس نے انکار میں سر ہلایا۔

''تو اس وقت اس سے مل لو۔'' عالیہ نے کہا ''وہ شو میں جو کچھ نظر آتا ہے، ریہرسل کے وقت اس سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔''

دونوں ریہرسل ہال میں داخل ہوئے۔ اسٹیج پر ایک لمبا تڑنگا نوجوان کھڑا تھا۔ اس نے آدھی آستین والی ٹی شرٹ اور جینز پہن رکھی تھی۔ اس کی تیز نظریں عالیہ اور الیاس پر جمی ہوئی تھیں۔ الیاس جاوید کی تصویریں اخبارات اور رسائل میں دیکھ چکا تھا۔ اس کے علاوہ اس نے جاوید کو ٹی وی پر بھی دیکھا تھا۔ وہ واقعی تصویروں سے بالکل مختلف لگ رہا تھا۔

''عالیہ!'' جاوید کی تیز آواز آئی۔ ''میں تمہارا منتظر ہوں، آجاؤ تاکہ ریہرسل شروع کی جاسکے۔''

''دیکھ لیا تم نے؟'' عالیہ نے ہر گوشی کی اور تیزی سے اسٹیج کی طرف بڑھ گئی۔ الیاس احمقوں کی طرح اسے دیکھتا رہا۔ پھر وہ اسی نیم تاریک ہال میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

''ریہرسل کے بعد..... یہیں رہنا۔'' جاتے جاتے عالیہ، الیاس سے کہہ گئی تھی لہٰذا اب اس کو اخلاقاً اس لڑکی کا انتظار کرنا تھا۔ وہ ہال میں بیٹھ تو گیا مگر دل ہی دل میں اسے جاوید خیال سے نفرت سی محسوس ہونے لگی۔ اس کی وجہ کیا ہوسکتی تھی؟ یہ بات خود الیاس بھی نہیں جانتا تھا۔

ریہرسل شروع ہوئی۔ بینڈ نے ایک فوک سونگ کی طرز کی آمیزش کے ساتھ ایک نئے گانے کی کی دھن چھیڑی۔ جاوید خیال غالباً کسی نئے آئٹم کی تیاری کررہا تھا۔ ایک بار ..... دو بار..... تین بار ریہرسل ہوئی۔ ہر بار غلطی ہوجاتی تھی اور دھن آگے ہی نہیں بڑھ پارہی تھی۔

آخر جاوید خیال اٹھ کر اپنے سازندوں پر ناراض ہونے لگا۔ اس کا انداز ایسا تھا جیسے وہ کوئی بہت بڑا موسیقار یا موسیقی کا نامور استاد ہو۔ الیاس پیامی دور سے ہی محسوس کررہا تھا کہ سازندوں بالخصوص وائلن والے اور پیانو والے کے چہروں پر ناگواری تھی۔ ان لوگوں نے غالباً بڑی مشکل سے جاوید خیال کی بک بک برداشت کی۔ شاید کچھ مجبوریاں ان کے آڑے آرہی تھیں۔ پھر الیاس کو یاد آگیا۔ وائلن والا نوجوان حمید تھا۔ الیاس اس کو پہلے بھی ایک کنسرٹ میں اپنے فن کا مظاہرہ کرتے دیکھ چکا۔ وہ واقعی بہت عمدہ وائلن بجاتا تھا۔

ریہرسل چلتی رہی، ہال سازوں سے گونجتا رہا اس کے ساتھ ہی درمیان میں جاوید خیال کی ہدایت دیتی آوازیں بھی آتی رہیں۔ اس کے بعد جاوید خیال پیانو پر بیٹھ گیا۔ اس نے دھن چھیڑی تو الیاس کو محسوس ہوا کہ واقعی وہ جادو جگا رہا ہے۔

اسٹیج کے اوپر لگے ہوئے بڑے بڑے رنگین بلب روشن ہوگئے۔ شاید یہ گرینڈ ریہرسل چل رہی تھی۔ ان بلبس کے قریب ہی الیکٹریشن بھی بلندی پر موجود تھے۔ وہ اوپر سے عین جاوید خیال کے اوپر سرخ، سبز، نیلی اور پیلی روشنیاں پھینک رہے تھے۔ روشنی کا ہر رنگ ہر ہالہ جاوید کو اپنے حصار میں لیے ہوئے تھا۔ جاوید خیال اپنے فن میں ندرت پیدا کرنے کے لیے روشنیوں کا استعمال کراتا تھا مگر اس وقت اس کی روشنیوں کی میٹنگ پسند نہیں آئی تو وہ اُٹھ کھڑا ہوا اور دونوں الیکٹریشنز پر ناراض ہونے لگا۔ وہ دونوں حیران ہوکر اسے دیکھنے لگے۔ اسی وقت دوسرے شخص نے پیانو چھیڑا تو جاوید خیال چیخ اٹھا۔

''بے وقوف انسان! تم نے موسیقی کی تربیت کس گدھے سے لی ہے؟ تم جیسے دو تین لوگ اس لائن میں اور آگئے تو یہ فن تباہ و برباد ہوجائے گا۔''

''جاوید صاحب!'' پیانو بجانے والا آرٹسٹ بھی مشتعل ہوگیا۔ ''آپ میری توہین کررہے ہیں۔''

''بکواس بند کرو.....'' جاوید چیخا۔

الیاس پیامی حیران ہورہا تھا اور جاوید خیال کے ساتھ کام کرنے والوں کی ہمت کو داد دے رہا تھا جو اس بدمزاج شخص کو برداشت کررہے تھے۔ حالانکہ اس کے ساتھ کام کرنے والا ہر آدمی اپنے کام میں ماہر تھا اور ان میں سے کسی کو بھی جاوید کو ہدایت کی ضرورت نہیں تھی مگر بے پناہ شہرت اور مقبولیت نے اس کا دماغ خراب کردیا اور وہ کسی کو خاطر میں نہیں لارہا تھا۔ شاید اس کو حکم چلانے کی عادت پڑ گئی تھی، دوسروں کو اپنے سامنے بے بسی سے سر جھکائے دیکھ کر اس کا سینہ پھول جاتا تھا۔ پھر عالیہ نے اپنی آواز کا جادو جگانا شروع کیا تو الیاس پیامی اس میں کھو گیا۔

''مجھ سے پہلی سی محبت میرے محبوب نہ مانگ۔'' گیت پرانا تھا مگر موسیقی نئی تھی اور پھر عالیہ کی سحر انگیز آواز نے اس کو بالکل نیا بنادیا تھا۔ عالیہ کے منہ سے یہ گیت وہ پہلے بھی سن چکا تھا، اس کی آواز آج بھی پہلے جیسی ہی تھی۔ عالیہ نے ایک بار الیاس کی فرمائش پر یہی گیت صرف اس کے لیے گایا تھا۔

یہ تین سال پہلے کی بات تھی۔ اس وقت ان دونوں میں محبت کا رشتہ استوار ہوچکا تھا۔ وہ بات یاد آتے ہی الیاس کے دل پر گھونسا سا لگا۔ آخر کار وہ ریہرسل ختم ہوگئی، جاوید خیال کا منہ بنا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر برہمی نمایاں تھی۔

''اگر تم لوگوں نے اسی طرح فن کا مظاہرہ کیا تو ہمارے نئے کنسرٹ کا اللہ ہی حافظ ہے۔'' جاوید خیال نے اپنے ساتھیوں کو مخاطب کیا۔ ''بہر حال تم سب کو شام سات بجے تک یہاں پہنچ جانا ہے تاکہ ہم ایک بار پھر ریہرسل کرلیں۔ ٹھیک سات بجے.....! ایک منٹ ادھر نہ ادھر۔''

الیاس نے محسوس کیا کہ جاوید کی آواز میں بڑی رعونت تھی۔ وہ بالکل فلمی بادشاہوں کی طرح اپنے آدمیوں کو حکم دے رہا تھا اور وہ سب سر جھکائے کھڑے تھے الیاس کو تاریکی میں تھا۔ جاوید کا بینڈ دو دو تین آدمیوں کے گروپس کی شکل میں رخصت ہونے لگا۔ ان میں سے ایک شخص کی بڑبڑانے کی آواز الیاس کے کانوں تک پہنچی۔

''بڑا آیا حکم چلانے والا..... ہم سے وقت کی پابندی کرائے گا..... پہلے خود تو کرلے۔ موسیقی کی الف بے سے واقف نہیں ہے اور بنا پھرتا ہے.....''

عالیہ، جاوید خیال کے ساتھ الیاس کے پاس آئی اور الیاس کا جاوید سے تعارف کرایا۔ الیاس یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ تھوڑی دیر پہلے بدتمیز اور بدمزاج نظر آنے والے اس شخص نے کتنی تیزی سے ملنساری، خوش اخلاقی اور انکساری کا لبادہ اوڑھ لیا تھا۔ اس کے باوجود الیاس نے اس کی آنکھوں میں اپنے لیے رقابت کی چمک بھی محسوس کرلی تھی۔

''پیامی صاحب مجھے افسوس ہے کہ آپ یہاں ایک طرف بیٹھے رہے اور میں نے آپ کو نہیں دیکھا جاوید کہہ رہا تھا۔ ''مگر کیا کیا جائے؟ ہم آرٹسٹوں کو فن کے لیے اپنا خون پسینہ ایک کرنا پڑتا ہے۔ سب کچھ بھلانا پڑتا ہے تب کہیں جاکر فن جنم لیتا ہے۔ کام کرتے وقت ہمیں اپنے اردگرد کا ہوش نہیں ہوتا۔ بہر حال..... میں آپ کو آج کے کنسرٹ میں آنے کی دعوت دیتا ہوں، میرا دعویٰ ہے کہ آج کے شو میں پورا مجمع وہ سر اور وہ آواز سنے گا جو اس نے پہلے کبھی نہیں سنی ہوگی۔''

اسی لمحے گیلری کا ایک ملازم عالیہ کے پاس آیا اور اس سے نیچی آواز میں کچھ کہنے لگا۔ الیاس کے کان میں صرف ایک لفظ ''ٹیلی فون'' پڑا تھا۔ اس کے ساتھ ہی وہ تیزی سے چلی گئی۔ الیاس بھی آہستہ آہستہ دوبارہ اس کاؤنٹر کی طرف آگیا جہاں اس نے چائے پی تھی۔ تھوڑی دیر بعد عالیہ آتی نظر آئی۔

''الیاس! مجھے جلدی میں جانا پڑ رہا ہے۔'' وہ بولی ''مگر تم شام کو کنسرٹ میں ضرور آنا۔''

''مگر.....'' الیاس نے کچھ کہنا چاہا تو عالیہ اسے خدا حافظ کہتی ہوئی آگے چلی گئی۔

الیاس میز پر بیٹھ گیا اور تین سال پہلے کی کہانی پر غور کرنے لگا۔ سلیم بزمی کا اس دور میں بڑا چرچا تھا۔ پھر وہ یکایک عالیہ کی طرف مائل ہوگیا اور عالیہ بھی سلیم بزمی کی طرف کھنچتی چلی گئی۔ عالیہ کی بے وفائی نے الیاس کو گہرا صدمہ پہنچایا، پھر وہ خود ہی سلیم بزمی کے لیے میدان چھوڑتے ہوئے پیچھے ہٹ گیا۔

اچانک الیاس کو پیانو پر جگنی کی دلنواز دھن سنائی دی۔ بہت خوبصورت دھن تھی مگر اس میں کوئی کمی ضرور تھی۔ الیاس کو حیرت تھی کہ اس کے سامنے جاوید اور اس کی ٹیم کے ارکان چلے گئے تھے تو اب یہ کون تھا جو پیانو بجا رہا تھا؟ اس نے غور کیا تو اسے وہ آواز پہلی منزل سے آتی محسوس ہوئی۔

''اوپر کون پیانو بجا رہا ہے؟'' الیاس نے کاؤنٹر پر کھڑے ہوئے اسی آدمی سے پوچھا جس نے اسے چائے پلائی تھی۔ ''جاوید خیال ہے۔'' اس نے جواب دیا ''پہلی منزل پر اس کو کمرا ملا ہوا ہے جہاں وہ اکثر ریاض کرتا رہتا ہے۔ وہیں سے ایک راستہ سیڑھیوں کے ذریعے اسٹیج کے پیچھے اتر رہا ہے۔ اکثر وہ وہی راستہ استعمال کرتا ہے۔''

اچانک موسیقی نے دم توڑ دیا۔ جگنی کی دلفریب لے کیا ٹوٹی، الیاس اور کاؤنٹر میں دونوں کو ہی جھٹکا لگا۔ اس طرح اچانک پیانو کے رکنے سے دونوں حیران ہوکر اوپر کی طرف دیکھنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد اس نے سیڑھیوں سے کسی کے اترنے کی آواز سنی، وہ جو بھی تھا۔ اس کو نظر نہ آسکا۔ ''ہوسکتا ہے وہ عالیہ ہو جو کوئی کام یاد آنے پر اوپر گئی ہو۔'' الیاس نے سوچا۔

پھر اس نے کاؤنٹر میں سے فون کا پوچھ کر اپنے دفتر کا نمبر ملایا۔ اس کام میں بمشکل ایک منٹ لگا ہوگا۔ اس نے اپنے دفتر میں اطلاع دی تھی کہ وہ اپنی طبیعت کی خرابی کی وجہ سے آج نہیں آسکے گا۔ پھر اسے عالیہ آتی نظر آگئی۔ وہ سیڑھیوں سے اتر کر اسی کی طرف آرہی تھی۔ اس کا چہرہ سفید پڑ چکا تھا اور آنکھوں میں خوف کے سائے لہرا رہے تھے۔

''کیا بات ہے عالیہ؟ کیا ہوا؟'' الیاس نے پوچھا۔

''وہ..... وہ..... اوپر..... کسی نے..... جاوید کو..... گولی ماردی ہے۔'' عالیہ نے بڑی مشکل سے جملہ مکمل کیا۔

الیاس پیامی بھاگتا ہوا اوپر پہنچا۔ ایک کمرے پر ''دفتر'' کی تختی لگی ہوئی تھی اور دوسرا کمرا غالباً جاوید کا تھا۔ الیاس تیزی سے اندر گھسا۔

کمرے کے ایک کونے میں ساز رکھے تھے اور فرش پر بچھے قالین پر جاوید خیال کی بے حس و حرکت لاش پڑی تھی گولی اس کی ٹھوڑی کے نیچے گلے میں پیوست ہوگئی تھی۔ الیاس نے جاوید کو ایک نظر دیکھتے ہی اندازہ لگا لیا کہ وہ مر چکا تھا۔ عالیہ بھی اوپر آچکی تھی مگر وہ لاش کی طرف دیکھنے سے کترا رہی تھی۔

''میں اوپر آئی تو دروازہ کھلا ہوا تھا اور یہ یہاں اسی طرح پڑا تھا۔'' عالیہ نے الیاس کو بتایا۔

''تمہارا کہنا ہے کہ جب تم یہاں آئیں تو دروازہ کھلا ہوا تھا؟'' الیاس نے عالیہ سے پوچھا تو اس نے اقرار میں اپنا سر ہلایا۔

الیاس نے اپنے ذہن پر زور دیا تو اسے یاد آیا کہ جب

اس نے پیانو کے ایک دم رکنے کی آواز سنی تو اس سے چند لمحوں پہلے اس کے کانوں میں دروازہ زور سے بند ہونے کی آواز آئی تھی..... ''مگر نہیں..... وہ دروازہ بند ہونے کی آواز نہیں تھی بلکہ گولی چلنے کی آواز تھی۔'' الیاس نے سوچا۔ پھر اپنے اس شک کو دور کرنے کے لیے اس نے کئی بار دروازہ زور سے کھولا اور بند کیا مگر کوئی خاص آواز نہ ہوئی۔ تب اسے سو فیصد یقین ہو گیا کہ وہ گولی چلنے کی ہی آواز تھی۔

''تم نے اوپر کسی کو دیکھا؟'' الیاس نے عالیہ سے پوچھا تو اس نے انکار میں سر ہلا دیا۔

''تم تو چلی گئی تھیں! واپس کیوں آئیں؟'' الیاس نے عالیہ سے سوال کیا۔

''میں اپنے نئے آئیٹم کی لائنیں یہیں بھول گئی تھی، وہی لینے آئی تھی.....'' کہتے کہتے عالیہ کی نظر جاوید خیال کی لاش کی طرف اٹھی تو اس کو جھرجھری آ گئی۔ الیاس پیامی کا دل کہہ رہا تھا کہ عالیہ اس سے کچھ نہ کچھ ضرور چھپا رہی ہے۔

''عالیہ! میرا خیال ہے کہ میں نے جس پیانو کی آواز سنی وہ جاوید خیال نہیں بلکہ کوئی اور بجا رہا تھا۔'' الیاس نے کہا تو عالیہ پریشان ہو کر اسے دیکھنے لگی۔

''کیا یہ خودکشی نہیں ہے؟'' عالیہ نے پوچھا۔

''نہیں، جاوید کو قتل کیا گیا ہے۔'' الیاس نے کہا۔ ''اور قاتل آلۂ قتل یعنی ریوالور اپنے ساتھ لے گیا ہے۔''

اس کے بعد اسی کمرے کے فون کے ذریعے الیاس نے پولیس کو اس قتل کی اطلاع دی اور نیچے آ کر کاؤنٹر میں کو بھی ساری بات بتا دی۔

پولیس آ گئی۔ اس نے تفتیش بھی شروع کر دی۔ پولیس نے اپنی تفتیش کا دائرہ صرف تین افراد کے گرد رکھا تھا۔ وائلن بجانے والا حمید، پیانو بجانے والا آرٹسٹ نواز اور سنگر عالیہ! لاش اسپتال بھجوائی جا چکی تھی۔ پولیس فوٹو گرافر اور فنگر پرنٹس والے بھی اپنا کام کر کے جا چکے تھے۔

وائلن نواز حمید اب بھی جاوید خیال پر برہم تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ جاوید خود کو بہت بڑا فنکار سمجھنے لگا تھا حالانکہ اس کو مقبول بنانے میں اس کے بینڈ کے لوگوں کا زیادہ حصہ تھا۔

''اختلاف اپنی جگہ انسپکٹر صاحب!'' وہ کہہ رہا تھا ''مگر آرٹسٹ لوگ ایسے نہیں ہوتے کہ دوسروں کی جان لے لیں۔''

انسپکٹر شیراز نے کہا ''مجھے معلوم ہوا ہے کہ جاوید مرنے سے پہلے پیانو بجا رہا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اوپر کوئی گیا تھا اور..... وہ جاوید کا شناسا تھا جاوید کو اس پر شک بھی نہیں ہوا ہوگا کہ وہ اس کو اس طرح ہلاک کر سکتا ہے۔''

''یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ قاتل خود پیانو بجا رہا ہو۔'' الیاس نے کہا ''اور جاوید خیال کے آتے ہی اس نے پیانو بجانا چھوڑ کر اسے قتل کر دیا ہو!''

''نہیں جناب! کاؤنٹر مین نے کہا ''پیانو صرف جاوید صاحب بجا رہے تھے، وہ اکثر جنتی کی اس دھن کی پریکٹس کرتے تھے، حالانکہ ان کا یہ آئیٹم اب پرانا ہو چکا ہے اور انہیں اس کی پریکٹس کی ضرورت نہیں تھی۔''

''لیکن اس دھن میں اب بھی کوئی کمی ضرور تھی۔'' الیاس نے یہ سوچا ضرور..... مگر زبان سے کچھ نہ کہا۔

''نواز! سنا ہے جاوید صاحب تم پر بھی ناراض ہوئے تھے.....''

انسپکٹر شیراز نے کہا تو نواز نے درمیان میں دخل اندازی کرتے ہوئے کہا ''میرا اس قتل سے کوئی تعلق نہیں ہے۔'' اس کے انداز میں احتجاج تھا۔

''اس لڑکی کو لے کر آؤ۔'' انسپکٹر شیراز نے سپاہی سے کہا۔ الیاس کو معلوم تھا کہ انسپکٹر نے عالیہ سے پہلے بھی پوچھ تاچھ کی تھی اور اس سے نیچے رکنے کو کہا تھا۔ وہ عالیہ کی طرف سے بھی مشکوک ہو رہا تھا اور اس کو قاتلہ سمجھ رہا تھا گو یہ سوچتے ہوئے اس کا دل بیٹھنے لگا تھا۔ عالیہ آئی تو اس کا مرجھایا ہوا اور اداس چہرہ دیکھ کر الیاس کو شدید رنج ہوا۔ وہ قاتلہ نہیں ہو سکتی تھی۔

''مسز سلیم بزمی.....!'' انسپکٹر شیراز نے کہا ''کیا کریں ہمارا کام ہی ایسا ہے کہ لوگ ہم سے ناراض رہتے ہیں، ہمارے سوال کسی کو پسند نہیں آتے۔ بہرحال میں نے سنا ہے کہ تمہارے اور جاوید مرحوم کے درمیان کوئی چکر تھا۔''

''میرے اور جاوید کے درمیان جو بھی تعلق تھا، وہ صرف اس بینڈ کے حوالے سے تھا۔'' عالیہ نے بڑے تحمل کے ساتھ جواب دیا۔

''چلو مان لیا، تم اس کی طرف مائل نہیں تھیں مگر وہ تو تھا۔ اخباروں میں بھی کبھار خبریں بھی چھپتی رہی ہیں۔ سنا ہے ایک سال سے وہ تم پر دباؤ ڈال رہا تھا کہ سلیم بزمی سے طلاق لے کر اس سے شادی کر لو۔ کیا یہ بات غلط ہے؟'' انسپکٹر شیراز نے نرمی سے سوال کیا۔

''ہاں، یہ بات بالکل غلط ہے، بے بنیاد ہے۔'' عالیہ نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا ''ٹھیک ہے میرے تعلقات میرے شوہر سے اچھے نہیں ہیں اور میں نے اس سے علیحدہ ہونے کا بھی سوچا تھا مگر اس معاملے میں جاوید خیال کا کوئی کردار نہیں ہے۔''

''ہو سکتا ہے آج پھر جاوید نے تم سے شادی کی بات کی ہو، اور تم نے مشتعل ہو کر اسے گولی مار دی ہو!'' انسپکٹر نے کہا ''دراصل ہم ہر پہلو پر سوچنے کے لیے مجبور ہیں۔''

''میں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔'' عالیہ زور سے چیخی۔ ''میں نے جاوید کو شوٹ نہیں کیا۔''

بعد میں انسپکٹر شیراز نے اس معاملے پر الیاس سے بات کی تو اس نے وہ سب کچھ بتا دیا جو اسے معلوم تھا۔ یہ بھی کہ فائر کی آواز کو وہ دروازہ زور سے بند ہونے کی آواز سمجھا تھا۔

''جاوید خیال کی قاتلہ یہ لڑکی بھی ہو سکتی ہے اور حمید یا نواز میں سے کوئی بھی..... قتل ان تینوں میں سے کسی ایک نے کیا ہے۔'' انسپکٹر شیراز نے کہا ''کیونکہ اس کمرے کا ایک راستہ اسٹیج کے پیچھے ہے تنگ سیڑھیاں ہیں جو اسٹیج کے پیچھے ہیں۔ ان سے اوپر نیچے آیا جایا جا سکتا ہے۔ قاتل اسی راستے آیا تھا اور اسی سے واپس چلا گیا۔''

انسپکٹر شیراز نے باری باری تینوں سے پیانو بجانے کو کہا۔ عالیہ، حمید اور نواز تینوں نے ہی بے حد عمدہ کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔ ان سب نے غور سے اس میوزک کو سنا مگر الیاس پیامی کا خیال تھا کہ جو میوزک اس نے سنا تھا، وہ ان میں سے کوئی نہیں بجا سکا کیونکہ اس میوزک میں مہارت کے ساتھ کوئی کمی ضرور تھی۔

''ٹھیک ہے! تم تینوں جاؤ۔'' انسپکٹر شیراز نے رات کے سات بجے انہیں جانے کی اجازت دے دی ''مگر لاہور سے باہر نہ جانا، کسی وقت بھی تمہاری ضرورت پڑ سکتی ہے۔''

''میں تمہیں گھر چھوڑ دوں؟'' سیڑھیاں اترتے ہوئے الیاس نے عالیہ سے کہا تو عالیہ نے منع کر دیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ الیاس کا جی چاہا کہ کسی طرح اس کے سارے دکھ لمحوں میں دور کر دے۔ اس نے اصرار کر کے عالیہ کو اپنے ساتھ چلنے پر آمادہ کر ہی لیا۔

باہر اندھیرا پھیل چکا تھا۔ ابھی تک بارش بھی ہو رہی تھی۔ سردی بڑھ چکی تھی۔ ٹیکسی کے ذریعے وہ دونوں ریواز گارڈن پہنچے۔ اس علاقے کی طرف ٹیکسی کے مڑتے ہی یادوں نے الیاس پر یلغار کر دی۔ کبھی وہ عالیہ سے ملنے کے لیے اسی ریواز گارڈن میں اس کے گھر آتا تھا اس وقت اسے یہ علاقہ لاہور کا سب سے حسین علاقہ لگتا تھا۔

ریواز گارڈن کی ایک پانچ منزلہ عمارت کے فرسٹ فلور میں عالیہ رہتی تھی۔ اس نے اب بھی وہیں ٹیکسی رکوائی تھی۔ مگر یہاں وہ سلیم بزمی سے شادی سے پہلے رہتی تھی، اب کیوں؟ الیاس نے سوچا اور پھر سر جھٹک دیا۔

پوری عمارت وہی تھی۔ وہی زینہ، وہی سیڑھیاں، وہی دیواریں.....! وہ بلا جھجک عالیہ کے فلیٹ کے دروازے پر پہنچا اور گھنٹی بجائی۔ خالہ صغریٰ نے دروازہ کھولا تو حسب سابق الیاس نے انہیں سلام کیا۔ انہوں نے بھی پہلے کی طرح اسے دعائیں دیں۔

''الیاس!'' فلیٹ کے ڈرائنگ روم میں بیٹھتے ہوئے عالیہ نے کہا ''میں اور سلیم بزمی شادمان کالونی میں رہتے تھے مگر ہمارے درمیان اختلافات اس قدر بڑھے کہ میں واپس اپنے اس فلیٹ میں خالہ صغریٰ کے پاس چلی آئی۔ اس دنیا میں خالہ صغریٰ کے سوا میرا اور کون ہے؟ اسی لیے میں ان کے پاس آ گئی ہمارے درمیان اب تصفیہ ممکن نہیں ہے۔ وہ شراب نہیں چھوڑ سکتا اور میں شراب برداشت نہیں کر سکتی۔ سنا ہے اب تو اس نے ہیروئن بھی پینی شروع کر دی ہے وہ خود کو تو ہلاک کر ہی رہا ہے مگر میرے لیے اس کے ساتھ زندگی گزارنا موت سے بھی زیادہ اذیت ناک ہے۔''

''تم نے اس سے طلاق کا مطالبہ کیا؟'' الیاس نے پوچھا۔

''کیا تھا مگر اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔''

''تو خلع کا مقدمہ دائر کر دو۔''

''کر تو دیتی مگر ابھی اسے میری ضرورت ہے۔''

''کیا مطلب؟ یہ کیسی محبت ہے کہ اس سے جان بھی چھڑانا چاہتی ہو اور اس بات کی پروا بھی کرتی ہو کہ اسے تمہاری ضرورت ہے۔'' الیاس نے ناگواری سے کہا۔

خالہ صغریٰ نے چائے لا کر سامنے رکھی تو وہ دونوں خاموش ہو کر پینے لگے۔

''اب کیا ارادہ ہے؟'' الیاس نے پوچھا۔

''سلیم بزمی سے علیحدگی اختیار کر چکی ہوں، بس عملاً اس کا اعلان ہونا ہے۔'' عالیہ نے جواب دیا۔

الیاس نے محسوس کیا کہ عالیہ، جاوید خیال کے قتل کے حوالے سے بات کرنے سے کترا رہی تھی اس لیے اس نے بھی اس موضوع پر بات کرنا مناسب نہ سمجھا۔

''اچھا، میں چلتا ہوں۔'' الیاس نے عالیہ سے کہا ''اگر میری ضرورت ہو تو مجھ سے رابطہ کرنے میں نہ ہچکچانا۔ تم کو کھو کر میں نے زندگی کا بہت بڑا سبق حاصل کیا ہے۔ شاید تمہارے کام آ کر میرے دکھ کا مداوا ہو سکے۔'' وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور باہر نکل گیا۔

ریواز گارڈن کے کونے پر الیاس کی نظر ایک شخص پر پڑی۔ نہ جانے کیوں اسے محسوس ہوا جیسے وہ شخص پولیس کا مخبر تھا یا پھر سادہ لباس میں پولیس والا تھا۔ اور عالیہ پر نظر رکھے

ہوئے تھا۔ الیاس نے اس سادہ لباس والے کی طرف دیکھا، دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں تو اس شخص نے پیٹھ موڑ لی اور تیزی سے آگے روانہ ہوگیا۔ اس نے ایک بار بھی پلٹ کر الیاس کی طرف نہیں دیکھا تھا۔

ہلکی ہلکی بارش ابھی تک ہو رہی تھی۔ الیاس ایک دکان سے سگریٹ لینے رکا تو آگے والا شخص ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر روانہ ہوگیا الیاس نے ایک رکشہ آتا دیکھا تو اسے روکا اور اس میں بیٹھ کر رکشا والے کو ٹیکسی کے پیچھے چلنے کو کہا۔

''صاب! کیا پھڈا ہے؟ ہم کو مت پھنسوا دینا۔'' رکشا والے نے کہا۔

''ارے ڈرو نہیں، میں پولیس کا آدمی ہوں اور اس ٹیکسی میں مجرم بھاگ رہا ہے۔ تم تو پولیس کی مدد کر رہے ہو۔'' الیاس نے سنجیدگی سے کہا تو رکشا والا خاموش ہوگیا۔

ٹیکسی آگے نکل چکی تھی، اس کی رفتار بھی تیز تھی رکشا آہستہ جا رہا تھا۔ دونوں کے درمیان خاصا فاصلہ تھا۔ پھر درمیان میں دوسری گاڑیاں بھی آگئی تھیں مگر الیاس کی عقابی نظروں نے ٹیکسی کو سول لائنز کے تھانے کے آگے رکتا دیکھا تو اس کے شک کی تصدیق ہوگئی۔ واقعی پولیس عالیہ پر نظر رکھ رہی تھی اور اسے عالیہ پر شک تھا کہ وہی جاوید خیال کی قاتلہ ہے۔

الیاس اس نے رکشا والے کو واپس چلنے کو کہا، وہ عالیہ کو باخبر کرنا چاہتا تھا تاکہ وہ ہوشیار رہے مگر جب وہ عالیہ کے علاقے ریواز گارڈن پہنچا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ عالیہ اس رات میں اور بارش میں کہیں جا رہی تھی۔

سارا دن اس کا الحمرا آرٹ گیلری میں پہلے ریہرسل اور پھر پولیس کی بک بک جھک جھک میں گزرا تھا، الیاس کو یقین تھا کہ وہ ان حالات میں گھر سے باہر نکلنا بھی پسند نہیں کرے گی مگر وہ کہیں جا رہی تھی اور بہت جلدی میں تھی۔

عالیہ نے ایک ٹیکسی روکی، اس میں بیٹھی اور ٹیکسی آگے بڑھ گئی۔ اس بار الیاس نے بھی ٹیکسی روکی، اسے ڈرائیور کو خاصا قائل کرنا پڑا تب کہیں جا کر وہ آگے جانے والی ٹیکسی کا تعاقب کرنے پر تیار ہوا۔ الیاس کو یقین تھا کہ اس قتل کے حوالے سے عالیہ کو کچھ نہ کچھ ضرور معلوم ہے مگر وہ اس سے بھی چھپا رہی ہے اور پولیس سے بھی، آخر وہ کیا بات تھی؟ الیاس یہی جاننا چاہتا تھا۔

ایک تو اندھیرا، اوپر سے بارش، پھر سردی بھی غضب کی! موسم ایک دم بے رحم ہوگیا تھا۔ دونوں ٹیکسیاں ایک دوسرے کے پیچھے گیلی سڑک پر زرد روشنی بکھیرتی مدھم رفتار سے آگے بڑھ رہی تھیں۔

آخر آگے والی ٹیکسی چوبرجی سے دائیں طرف گھوم کر ایک تین منزلہ عمارت کے سامنے رک گئی۔ اس میں سے عالیہ اتری اور اس عمارت میں داخل ہوگئی جبکہ الیاس نے اپنی ٹیکسی پہلے ہی رکوالی۔ وہ اتر کر عمارت کے عقب میں پہنچا۔ ایک راستہ ادھر بھی تھا۔ گویا یہ راستہ آر پار تھا۔ دونوں طرف سے عمارت میں آ بھی سکتے تھے اور جا بھی سکتے تھے۔

عالیہ کی ٹیکسی وہیں کھڑی تھی۔ الیاس بھی اپنی ٹیکسی کو رکوا کر آیا تھا۔ لگ بھگ دس منٹ بعد الیاس نے عالیہ کو آتے دیکھا۔ وہ رو رہی تھی۔ الیاس کو اس کی سسکیاں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ عالیہ اپنی ٹیکسی میں سوار ہوئی اور ٹیکسی روانہ ہوگئی۔

اب الیاس آگے بڑھا۔ اس نے اس عمارت کا جائزہ لیا۔ پرانی سی عمارت تھی۔ وہ دروازے سے اندر داخل ہوا اور نیچے لگے ہوئے لیٹر بکس دیکھنے لگا۔ ہر ایک پر فلیٹ نمبر اور اس میں رہنے والے کا نام لکھا ہوا تھا۔

اچانک ہی اس کی نظر ایک نام پر پڑی اور وہ سب سمجھ گیا۔ اس نے ایک فلیٹ کی بیل بجائی اور وہاں سے اس عمارت کی مالکن کے بارے میں پوچھا اس کو بتایا گیا کہ وہ گراؤنڈ فلور پر رہتی ہے۔ الیاس پیامی نے گراؤنڈ فلور کے فلیٹ کی گھنٹی بجائی۔ گھسٹتے ہوئے قدموں کی آواز آئی اور دروازہ کھل گیا۔ سفید بالوں والی ایک بڑی بی الیاس کو گھور رہی تھیں۔

''مجھے..... سلیم بزمی سے ملنا ہے۔'' الیاس نے کہا تو بڑی بی کے چہرے پر ناگواری آگئی۔

''کیوں؟ تم کون ہو؟'' انہوں نے پوچھا۔

''میں پولیس کے محکمے سے آیا ہوں۔'' الیاس پیامی نے اعتماد سے کہا ''میرا نام انسپکٹر دلاور ہے۔''

''انسپکٹر صاحب! بڑی بی نے کہا ''وہ صبح سے مسلسل پی رہا ہے۔ اپنے آپے میں نہیں رہا ہے وہ! میرا خیال ہے اس وقت اس سے نہ ملو۔ اسے اس کے حال پر چھوڑ دو اگر اس وقت اس کی بیوی بھی آئے گی تو میں اسے بھی اوپر جانے کی اجازت نہیں دوں گی۔''

''وہ ابھی یہاں سے ہو کر گئی ہے۔'' الیاس نے کہا۔

''ہاں، میں نے صبح فون کر کے اسے بلایا تھا مگر وہ بہت دیر سے آئی۔ بہرحال وہ صبح چلا گیا تھا، جانے سے پہلے بھی اس نے خوب شراب پی تھی۔ تھوڑی دیر پہلے ہی تو لوٹا ہے۔ اب اس سے نہ ملو، میرے خیال میں یہ اس کے حق میں بہتر ہوگا۔

اس کی بیوی بھی اب صبح ہی آئے گی۔''

''وہ آسانی سے واپس چلی گئی؟'' الیاس نے پوچھا۔

''نہیں..... بہت سمجھانا پڑا اسے..... مسلسل روئے جا رہی تھی وہ اس کے لیے'' بڑی بی نے کہا'' حالانکہ ان دونوں میں علیحدگی ہو چکی ہے، بس قانونی خانہ پُری ہونی ہے، اس کے باوجود جب سلیم آپے سے باہر ہوتا ہے تو مجھے عالیہ کو ہی بلانا پڑتا ہے وہ وہ بے چاری بھی فوراً آجاتی ہے۔''

''خالہ! میں.....'' ابھی الیاس نے صرف اتنا کہا تھا کہ ایک آواز سن کر اس کے رونگٹے کھڑے ہوگئے کوئی شخص اوپر کسی فلیٹ میں پیانو پر جگنی کی مسحور کن دھن بجا رہا تھا مگر اس وقت ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے پیانو بجانے والا پریشان ہے، اسی لیے اس کی دھن بار بار ٹوٹ رہی تھی مگر مجموعی طور پر وہ لاجواب دھن تھی۔

پھر الیاس کا خون گویا اس کی رگوں میں سنسنانے لگا، یہ وہی دھن تھی جو آج صبح اس نے الحمرا میں جاوید خیال کے کمرے سے آتی سنی تھی۔ پھر یکایک وہ دھن رک گئی تھی، اس کے بعد فائر ہوا تھا۔ اس دھن میں اور صبح والی دھن میں رتی برابر بھی فرق نہیں تھا۔ صبح والی دھن میں بھی ایک نامعلوم سی کمی تھی اور اس دھن میں بھی۔

''دیکھو انسپکٹر بیٹا! وہ اسی طرح ہر وقت یہ دھن بجاتا رہتا ہے اور شراب کے نشے میں دھت رہتا ہے۔'' بڑی بی نے الیاس سے کہا۔

مگر الیاس نے بڑی بی کی بات نہ سنی۔ وہ سیڑھیاں چڑھتا اوپر چلا گیا۔ اس کا دماغ صبح والی اور اب والی دھنوں کا موازنہ کر رہا تھا۔ دونوں ایک ہی تھیں! آخر وہ اس فلیٹ کے دروازے پر پہنچ کر رک گیا جہاں سے پیانو کی آواز آرہی تھی۔ اس نے دروازے کو دھکیلا۔ وہ کھلا ہوا تھا۔ الیاس خاموشی سے اندر داخل ہوگیا۔

کمرے میں ایک بھاری بھرکم آدمی پیانو بجا رہا تھا۔ دروازے کی طرف اس کی پیٹھ تھی، کمرے کا حال بہت خراب تھا۔ ہر طرف موسیقی کے آلات بکھرے ہوئے تھے۔ فرش پر پڑا ہوا کارپٹ بھی گندا ہو چکا تھا..... بلکہ اب تو اس کے چیتھڑے اڑ رہے تھے۔ پردوں میں سے بساند آرہی تھی۔

''سلیم بزمی صاحب!'' الیاس نے یہ کہا ہی تھا کہ میوزک نے دم توڑ دیا اور اس آدمی نے گھوم کر الیاس کی طرف دیکھا اس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی الیاس کے دل پر گھونسا سا لگا۔ وہ اپنی عمر سے دس سال بڑا نظر آرہا تھا۔ اس کے سارے بال سفید ہو چکے تھے۔ سر اور داڑھی کے بال بے ترتیبی سے بڑھے ہوئے تھے۔ نہ جانے کتنے عرصے سے وہ نہایا نہیں تھا۔ اس کی آنکھوں میں وحشت تھی۔ چند لمحے وہ آنکھیں جھپکا جھپکا کر الیاس کی طرف دیکھتا رہا جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔

''میرا نام الیاس پیامی ہے..... یاد آیا کچھ؟'' الیاس نے اس سے کہا۔

''کیا بات ہے؟'' سلیم بزمی نے نشے سے لڑکھڑاتی آواز میں اس سے پوچھا۔

الیاس..... بہ غور سلیم کے ہاتھوں کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ ابھی تک پیانو کے کی بورڈ پر تھے۔ ''کیا بات ہے؟ کیوں آئے ہو؟'' سلیم بزمی نے ایک بار پھر اپنا سوال دُہرایا اور ہانپنے لگا۔ شراب نے اس کی حالت غیر کر رکھی تھی۔

''سلیم بزمی! تم کسی زمانے میں اس ملک کے ٹاپ کے موسیقار تھے۔ مگر بعد میں تم شراب کے چکر میں پڑ گئے اور اس خانہ خراب نے تمہیں کہیں کا نہ چھوڑا۔ لوگوں نے تمہیں چھوڑ دیا، تمہارے پرستاروں نے تم سے منہ موڑ لیا۔ اسٹیج، ٹی وی اور فلم والے تمہیں بھول گئے اور مختلف آرگنائزیشنز نے بھی تمہارے شوز کرانے بند کر دیے۔''

سلیم بزمی اپنی سرخ سرخ آنکھوں سے الیاس کو گھور رہا تھا مگر وہ بولے جا رہا تھا۔ ''تم سے بڑا موسیقار تو اس ملک میں تھا ہی نہیں سلیم.....! تمہارے کنسرٹس کے لوگ دیوانے تھے۔ اداروں نے تمہارے کنسرٹ کے ذریعے بڑا پیسا کمایا، تم نوٹ بنانے والی مشین سمجھے جاتے تھے مگر تم نے اپنے پیروں پر خود کلہاڑی ماری ہے۔''

سلیم بزمی کی آنکھوں میں پہلی بار سنجیدگی نظر آئی اس نے الیاس کو گھورنا بھی بند کر دیا۔

''تم نے ہی جاوید خیال کو پیانو پر جگنی کی وہ مسحور کن دھن تیار کر کے دی تھی ورنہ وہ اتنا بڑا فن کار نہ تھا۔ میں نے آج اس کو پیانو پر یہ دھن بجاتے سنا تھا۔ وہ ٹھیک ٹھاک تھی۔ آج صبح تم ہی الحمرا گئے تھے اور تم ہی اوپر جاوید خیال کے کمرے میں پیانو پر جگنی کی دھن بجا رہے تھے جو اچانک دم توڑ گئی اور اس کے بعد فائر کی آواز سنائی دی۔ تم نے ہی جاوید خیال کو قتل کیا ہے سلیم بزمی! تم اس کے قاتل ہو۔''

''ہاں..... میں نے ہی اسے قتل کیا ہے۔'' سلیم بزمی نے غراتے ہوئے کہا ''اور اب تم یہ بات کسی اور کو بتانے کے قابل نہیں رہو گے۔'' یہی کہتے ہوئے اس نے اپنی جیب سے ریوالور نکالنے کی کوشش کی، الیاس نے ریوالور کی جھلک دیکھ لی تھی۔ اسی لمحے سلیم نے الیاس کا گریبان بھی پکڑ لیا۔

دونوں فرش پر گتھم گتھا ہو گئے۔ حالانکہ سلیم نشے میں تھا، اس کے باوجود اس میں بڑا دم خم تھا۔ اس کی مزاحمت پر الیاس کو حیرت ہوئی اسی دوران سلیم نے ریوالور نکال لیا مگر اس کو فائر کرنے کا موقع نہیں مل رہا تھا۔ کبھی ایک اوپر ہوتا، کبھی دوسرا، اسی طرح لڑتے ہوئے وہ دونوں فرش پر لڑھکتے چلے گئے۔

اچانک ہی فائر کی آواز سنائی دی۔ سلیم بزمی نے ریوالور کا ٹریگر دبا دیا تھا مگر یہ اس کی بدنصیبی تھی کہ اس کا نشانہ ... وہ خود ہی بنا تھا۔ نشے کے باعث اس کو اپنے ہاتھ پر قابو نہیں رہا تھا، اس نے اس وقت ٹریگر دبا دیا تھا جب ریوالور کی نال اس کے اپنے سینے کی طرف تھی۔

چند لمحوں تک سلیم بزمی نہ سمجھنے والے انداز سے الیاس کو دیکھتا رہا اور پھر فرش پر لڑھک گیا۔ اس کے سینے سے خون کا فوارہ ابل رہا تھا۔

الیاس، سلیم کو چھوڑ کر نیچے بھاگا، اس نے بڑی بی کو صورتِ حال بتائی اور پھر ان کے گھر سے ہی عالیہ کو فون کر دیا اور انسپکٹر شیراز کو بھی اطلاع دے دی۔ اسی نے ایمبولینس بھی منگوائی تھی مگر ایمبولینس کے آنے سے پہلے ہی سلیم بزمی نے دم توڑ دیا۔ تاہم مرتے مرتے اس نے بیان دے دیا اور یہ تسلیم کیا کہ جاوید خیال کو اسی نے قتل کیا تھا۔ اس کے بیان کی گواہی عالیہ نے بھی دے دی تھی۔

نصف شب کے قریب الیاس، عالیہ کو ساتھ لے کر ریواز گارڈن پہنچا جہاں اس نے اپنے فلیٹ میں روتے ہوئے بتایا۔

''مجھے شادی کے بعد ہی سلیم بزمی سے نفرت ہو گئی تھی۔ میں اس کے بارے میں دھوکا کھا گئی تھی۔ وہ ویسا نہیں تھا جیسا بن کر مجھ سے ملتا تھا۔ اسی لیے میں نے اس سے الگ ہونے کا فیصلہ کیا تھا تاہم جب بھی اسے میری ضرورت ہوتی، میں فوراً پہنچتی اور اس کی مدد کرتی، مجھے امید تھی کہ شاید کسی دن وہ ٹھیک ہو جائے..... مگر ایسا نہ ہو سکا۔''

''عالیہ! سلیم کو جاوید سے نفرت کیوں تھی؟'' الیاس نے پوچھا۔

''جاوید نے سلیم سے معاہدہ کیا تھا کہ وہ اس کے لیے اچھی دھنیں تیار کر کے دے، وہ اس کام کا معقول معاوضہ دے گا۔ ابتدا میں جاوید نے ادائیگی کی مگر بعد میں وہ اپنے وعدے سے منحرف ہو گیا اور سلیم کی تیار کردہ دھنوں میں نقص نکالنے لگا مگر بعد میں وہی دھنیں اپنے کنسرٹس میں استعمال کرنے لگا۔ جو سراسر غلط تھا، حالانکہ اگر جاوید، سلیم کے ساتھ ایمان داری سے کام کرتا اور اس کو اپنے ساتھ شامل رکھتا دونوں ہی بہت آگے جا سکتے تھے مگر جاوید کی بدنیتی نے گڑبڑ کر دیا۔ اس نے آخر میں سلیم سے صاف کہہ دیا کہ اب اس کی ضرورت نہیں ہے۔

صبح جو فون کال آئی تھی وہ سلیم بزمی کی مکان مالکہ تھی۔ انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ سلیم آپے سے باہر ہے، خوب شراب پی رہا ہے اور جاوید کو جان سے مارنے کا اعلان کر رہا ہے..... انہوں نے یہ بھی بتایا کہ وہ گھر سے جا چکا ہے۔ میں پریشان ہو کر الحمرا واپس آئی تاکہ جاوید کو بتا دوں کہ وہ سلیم سے ہوشیار رہے..... بلکہ اس سے دور رہے۔''

''ہاں عالیہ! جب میں نے گیلری میں پیانو پر بجتی دھن سنی تو مجھے یقین ہو گیا کہ اس کو بجانے والا جاوید نہیں بلکہ کوئی اور ہے۔ اس کو کوئی ماہر بجا رہا ہے مگر نہ جانے کیوں مجھے اس دھن میں کمی سی محسوس ہوئی..... اس کی اندازہ مجھے اس وقت ہوا جب میں رات کو سلیم بزمی کے فلیٹ میں داخل ہوا اور اسے پیانو بجاتے دیکھا.....''

''ہاں..... ایک سال پہلے ایک حادثے میں سلیم کے بائیں ہاتھ کی پہلی انگلی ٹوٹ گئی تھی اور اس کو کاٹنا پڑ گیا تھا۔'' عالیہ نے بتایا۔

''اب میں سمجھا، ظاہر ہے اس انگلی کے نہ ہونے سے سلیم وہ کی نہیں دبا پا رہا تھا جس سے جگنی کی اس دھن کی بنیاد ہوئی تھی اور یہی وہ ادھورا پن تھا جو میرے ذہن میں مسلسل چبھ رہا تھا، اچھا..... تم نے جاوید کے کمرے میں کیا دیکھا اور وہ کونسی بات تھی جو تم نے انسپکٹر شیراز سے چھپائی تھی۔'' الیاس پیامی نے پوچھا۔

''میں اوپر پہنچی تو میں نے جاوید خیال کی لاش دیکھی۔ مجھے یقین تھا کہ اس کو سلیم نے ہی ہلاک کیا ہے اور وہ زینے سے اتر کر فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا ہے مگر میں تک میں سلیم سے مل نہ لیتی۔ اس سے بات نہ کر لیتی، یہ نہیں کہہ سکتی تھی کہ وہی جاوید کا قاتل ہے البتہ مجھے شک ضرور بلکہ کسی حد تک یقین تھا۔''

''اچھا ہوا اس کی مکان مالکن نے تمہیں اس سے ملنے دیا۔'' الیاس نے کہا ''عالیہ! اس وقت اس کی حالت خراب تھی۔ اگر تم اس کے سامنے چلی جاتیں تو وہ تم کو بھی خدانخواستہ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ تم محفوظ ہو۔'' الیاس کی بات سن کر عالیہ شاید غیر ارادی طور پر مسکرا دی۔

★

جوابی احسان

شگفتہ پروین

بے صبرا انسان خواہشات کی بے شمار زنجیروں میں جکڑا ہوتا ہے۔ جبکہ صبر انسان میں غنا اور بے فکری پیدا کر دیتا ہے۔ دو دوستوں کے گرد گھومتی ایک جرم زدہ تحریر۔

ایک انو کے قتل کی روداد جس کی منصوبہ بندی میں کوئی ستم نہیں تھا

''کیا وہ مر گئی؟'' جیک نے ایک نیم تاریک بوتھ میں داخل ہوتے ہوئے کہا اور ویٹرلیس کو اشارہ کیا۔ ''میں تو بہت خوف زدہ ہو گیا ہوں فریڈ!''

فریڈ نے دونوں ہاتھوں میں اپنا چہرہ چھپاتے ہوئے کہا۔ ''معلوم نہیں یہ کیسے ہو گیا..... میں اور مولی ایک دوسرے سے بحث کر رہے تھے۔ اور اس کے بعد بس مجھے اتنا یاد ہے کہ وہ فرش پر پڑی ہوئی تھی، بالکل بے حس و حرکت!'' اس نے سر اٹھا کر جیک کی طرف دیکھا۔ ''میں نے تو اسے ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا۔ وہ خود کافی ٹیبل سے ٹکرائی تھی۔''

جیک نے ایک ڈرنک کا آرڈر دیا اور ویٹرلیس کے جانے کے بعد بولا۔ ''تم نے کسی اور کو تو یہ بات نہیں بتائی؟''

فریڈ نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میں نے ٹیبل کو سیدھا کر دیا اور مولی کو اٹھا کر لیونگ روم میں لے آیا تھا شاید وہ ہوش میں آ جائے۔ مگر اسے ہوش نہیں آیا۔'' اس نے سختی سے اپنی آنکھیں بھینچ لیں۔ گویا اس منظر کا تصور بھی اس کے لیے بہت تکلیف دہ تھا۔

جیک نے ویٹرلیس سے ڈرنک لی اور اس کا ایک سپ لیتے ہوئے بولا۔ ''تم اس قدر پریشان مت ہو، کچھ نہ کچھ

کرتے ہیں۔"

"کیا مطلب؟" فریڈ نے الجھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

فریڈ نے آگے کی جانب جھکتے ہوئے کہا۔ "میرا مطلب ہے کہ تم کیوں اپنی ساری زندگی جیل کی سلاخوں کے پیچھے گزارو.....؟ یہ ایک حادثہ بھی تو ہوسکتا ہے۔"

"یہ واقعی ایک حادثہ تھا! میں قسم کھاتا ہوں۔"

"یہ بات تم جانتے ہو یا میں....." جیک نے کہا۔ "لیکن پولیس یہ بات نہیں مانے گی لہٰذا کوئی خطرہ مول لینے سے بہتر ہے کہ کوئی ثبوت ہی باقی نہ رہنے دیا جائے!"

"تم لاش کو غائب کر دینا چاہتے ہو؟ لیکن کہاں..... کیسے؟" فریڈ نے آنکھیں پھیلاتے ہوئے کہا۔

"کسی نہ کسی طرح یہ کام ہو ہی جائے گا۔" جیک نے کہا۔ "بس تم پر قتل کا الزام نہیں آنا چاہیے۔"

فریڈ نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے جیک کی طرف دیکھا۔ "میں تمہارے اس احسان کا بدلہ کس طرح چکاؤں گا؟"

"آسان سی بات ہے۔" جیک نے جواب دیا۔ "میں تمہارے کام آرہا ہوں۔ تم میرے کام آنا۔"

"ضرور..... بتاؤ کیا کام ہے؟" فریڈ نے خلوص سے پوچھا۔

"میری بیوی کو قتل کر دو۔"

"تم..... تم مذاق کر رہے ہو؟" فریڈ نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔

"میں مذاق نہیں کر رہا۔" جیک نے اطمینان سے کہا۔

"لیکن کیوں؟ تمہاری بیوی تو خود تم سے طلاق لینا چاہتی ہے۔ جلد ہی وہ تمہاری زندگی سے نکل جائے گی....."

"ہاں..... اور میری ہر اس چیز میں آدھے حصے کی حق دار بن جائے گی جو میں نے شادی شدہ زندگی کے بیس سالوں کے دوران شدید محنت سے بنائی ہے۔" جیک نے نفرت سے کہا۔

"مگر میں ایسا نہیں کرسکتا۔" فریڈ نے دونوں ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا "میں کوئی قاتل نہیں ہوں۔"

"تم قاتل بن چکے ہو فریڈ!" جیک نے اطمینان سے اسے یاد دلایا۔ "اور اگر میں نہ ہوتا تو تمہاری ساری زندگی جیل کی سلاخوں کے پیچھے گزرتی۔"

☆☆☆

"کیا وہ مر گئی؟"

جیک کے استفسار پر فریڈ نے بوتھ میں آنے کے بعد دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپاتے ہوئے کہا۔ "ہاں، وہ مر گئی۔"

یہ سنتے ہی جیک نے ایک طویل سانس لی۔ "تم نے یہ کیسے کیا؟"

فریڈ نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ ملتے ہوئے کہا۔ "مجھ میں ایسا کرنے کی بالکل ہمت نہیں تھی۔ مگر گھر جانے کے بعد جب میں نے سوچا تو مجھے احساس ہوا کہ تم نے میرے لیے بہت بڑا کام کیا ہے لہٰذا مجھے اس کا بدلہ اتارنا ہوگا۔" اس نے اپنے چہرے سے ہاتھ ہٹاتے ہوئے جیک کی طرف دیکھا۔ "پولیس یہی سوچے گی کہ تمہاری بیوی مارچ ڈکیتی کے دوران گولی لگنے سے ہلاک ہوئی ہے۔"

جیک نے بوتھ کی دیوار سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔ "تم نے بالکل ٹھیک کیا فریڈ! اب ہم دونوں ان ناخوش گوار واقعات کو بالکل بھول جائیں گے۔"

☆☆☆

"کیا وہ مر گئی؟" فریڈ کی بیوی مولی نے پوچھا۔

مونیل کے کمرے میں داخل ہونے کے بعد جیک نے مولی کو اپنے بازوؤں میں اٹھا کر ہوا میں گھماتے ہوئے اس کی بات کا جواب دیا۔ "ہاں، وہ مر گئی۔"

مولی نے خود کو جیک کی گرفت سے چھڑایا اور رقص کے سے انداز میں گھومتے ہوئے بولی۔ "مجھے تو یقین نہیں آرہا کہ یہ سب کچھ اتنی آسانی سے ہوگیا۔ جیسا تم نے کہا تھا بالکل ویسا ہی ہوا..... جب میں نے فریڈ کو بتایا کہ میں کسی دوسرے آدمی کے لیے اسے چھوڑ رہی ہوں تو وہ بالکل پاگل سا ہوگیا۔ ایک لمحے کے لیے مجھے یوں محسوس ہوا کہ وہ مجھے مار ہی ڈالے گا مگر جوں ہی وہ میری طرف بڑھا میں فوراً کافی ٹیبل سے ٹکرا کر گرتی ہوئی فرش پر گر گئی اور بالکل بے حس و حرکت پڑی رہی....."

جیک نے اسے اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا۔ "تم نے بہت زبردست کام کیا۔ تمہاری اداکاری بہت کامیاب رہی۔ اسے یقین ہوگیا تھا کہ تم مر چکی ہو۔"

"میں بہت خوش ہوں کہ سب کچھ بالکل ٹھیک ہوگیا۔" اس نے کہا۔ "ورنہ میں بہت گھبرا رہی تھی، تمہارے آنے سے پہلے میں نے ایک ڈرنک لی تب میرے اعصاب پُرسکون ہوئے۔"

جیک ہنسا۔ "چلو، یہ تو ہوگیا۔ اب میں اپنے گھر جاؤں گا تو مجھے وہاں اپنی پیاری بیوی کی لاش پڑی ہوئی ملے گی۔ پھر کچھ روز اس کا غم منانے کے بعد ہم دونوں اس کے لائف انشورنس کی رقم پر عیش کریں گے۔"

"اور فریڈ کا کیا ہوگا؟" مولی نے تشویش زدہ انداز میں کہا۔ "اگر اس نے زبان کھول دی تو؟"

"وہ کبھی اپنی زبان نہیں کھولے گا۔ کیونکہ اگر اس نے ایسا کیا تو پہلے خود پھنسے گا۔"

☆☆☆

"تم زندہ ہو!" جیک اپنے لیونگ روم میں حیران و پریشان کھڑا اپنی زندہ و سلامت بیوی کو گھور رہا تھا۔ "اگر فریڈ یہاں موجود ہوتا تو میں ابھی اپنے ہاتھوں سے اس کا گلا گھونٹ دیتا۔" وہ چلایا۔

مارچ نے اپنے لیے ڈرنک بناتے ہوئے کہا۔ "تم نے دیر کر دی۔ فریڈ مر چکا ہے۔"

جیک نے بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا۔ "تم نے اسے مار دیا؟ کیوں؟"

"ظاہر ہے، تمہیں اور مولی کو پھنسانے کے لیے..... میں تم دونوں کے بارے میں بہت پہلے سے جانتی ہوں۔" اس نے اپنے گلاس سے ایک سپ لیتے ہوئے کہا۔ "اب تمہارے پاس ایک ہی راستہ ہے کہ اپنا سب کچھ مجھے دے دو اگر تم نے ایسا نہ کیا تو میں تمہیں فریڈ کے قتل کے الزام میں گرفتار کرا دوں گی۔"

"پولیس والے احمق نہیں ہیں..... وہ فوراً اس بات کا پتا لگالیں گے کہ یہ کام دراصل کس کا ہے۔" جیک نے کہا۔

"ہوسکتا ہے۔" مارچ نے بے پروائی سے کہا۔ "مگر کیا تم یہ خطرہ مول لے سکو گے؟ شبہ تو فوراً تم پر کیا جائے گا کیونکہ بہرحال، اس کی بیوی کے ساتھ تمہارے تعلقات ہیں۔"

☆☆☆

"کیا وہ زندہ ہے؟" مولی نے پوچھا۔

جیک نے اثبات میں گردن ہلائی۔

"مگر فریڈ نے تو اسے مار دیا تھا۔" مولی نے بیڈ پر گرتے ہوئے کہا۔

"اس نے بتایا تو یہی تھا مگر اب وہ خود مر چکا ہے۔" جیک نے کہا۔

"فریڈ مر گیا؟ اسے کس نے مارا؟" مولی نے حیرت سے کہا۔ جیک نے اپنی آنکھیں سکیڑتے ہوئے اسے دیکھا۔ "میرا خیال ہے کہ یہ کام تمہارا ہے مولی!" اس کے ہاتھ میں گن تھی۔

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟" مولی نے پیچھے سرکتے ہوئے کہا۔ "ہم ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔" اس نے خوفزدہ نظروں سے گن کو دیکھا۔

"مگر مجھے اپنی آزادی زیادہ پیاری ہے۔ میرے پاس بس یہی ایک راستہ ہے۔ پولیس سوچے گی کہ تم نے فریڈ کو قتل کیا اور اس کے بعد خودکشی کرلی۔" جیک نے مولی کا نشانہ لیتے ہوئے کہا۔ عین اسی لمحے دروازے پر زوردار دستک سنائی دی۔

"دروازہ کھولو، پولیس!" جیک اس وقت تک فائر کر چکا تھا۔

☆☆☆

"تم زندہ ہو؟"

جیک نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے فریڈ کو دیکھا جو جیک کی بیوی مارچ کے ساتھ جیل کی کوٹھری کے باہر کھڑا تھا۔

"ہاں، میں زندہ ہوں۔" فریڈ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"جب میں اپنی دانست میں یہ سمجھ کر گھر پہنچا کہ تم نے مولی کی لاش کو ٹھکانے لگا دیا ہوگا، اس وقت یہ بات مجھ پر واضح ہوگئی تھی کہ تم نے مجھے بے وقوف بنایا ہے..... جس میز سے ٹکرا کر مولی نیچے گری تھی اس میز پر میں نے ایک وائن گلاس رکھا دیکھا جس پر مولی کی لپ اسٹک کا نشان تھا۔ جب کہ تمہارے پاس آنے سے پہلے میں نے وہ میز سیدھی کر کے رکھی تھی اور اس پر کوئی گلاس نہیں تھا۔ تب میں یہ حقیقت جان گیا کہ مولی دراصل مری نہیں ہے۔"

"اس کے بعد ہم نے تمہارا منصوبہ تم پر ہی استعمال کر ڈالا۔" مارچ نے بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "بیس سالوں میں، میں تمہیں اتنا تو جان ہی گئی ہوں کہ اپنی گردن بچانے کے لیے تم مولی کو بھی مار ڈالو گے۔ لہٰذا جیسے ہی تم گھر سے نکلے، ہم نے تمہارا پیچھا کیا اور پھر پولیس کو فون کر دیا۔"

مارچ نے اپنا بازو فریڈ کے گرد حمائل کرتے ہوئے کہا۔ "مولی کی لائف انشورنس کی رقم حاصل کرنے کے بعد فریڈ اور میں ٹھاٹ سے رہیں گے!"

جیک کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ "تو کیا تم دونوں کا بھی ایک دوسرے کے ساتھ معاشقہ چل رہا تھا؟"

فریڈ نے مارچ کے رخسار پر پیار کرتے ہوئے کہا۔ "تم بالکل ٹھیک سمجھے جیک.....! اور اگر دیکھا جائے تو یہ سب تمہاری وجہ سے ممکن ہوا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم تمہارے اس احسان کا بدلہ کس طرح اتاریں!"

یقینی و بے یقینی کا طلسم کدہ، ستارہ شناس راؤ پرویز کی مہم جوئی

پانچویں قسط

مستقبل شناس

ایچ اقبال

وہ علم الاعداد کا ماہر تھا۔ کسی کے نام کے عدد کے حاکم سیارے کی "شرارتوں" سے واقف ہونے میں اسے ذرا دیر نہیں لگتی تھی۔ اس کے ساتھ ہی دست شناسی کے معاملے میں بھی اسے کارخانۂ قدرت سے خاص صلاحیت ودیعت کی گئی تھی۔ انسانی ہاتھ کی لکیریں اس سے باتیں کرتی تھیں۔ وہ کسی کا ہاتھ دیکھ کر اس کے سارے راز ہائے درونِ پردہ سے واقف ہوجاتا تھا۔ لوگوں کے ماضی و مستقبل اس کے سامنے دست بستہ کھڑے ہوجاتے تھے۔ اس کی کوشش ہمیشہ یہ رہی کہ اپنا اور ان لوگوں کا ہاتھ نہ دیکھے جو اس سے قربت رکھتے ہیں۔ وہ اپنے اور اپنے پیاروں کے مستقبل سے بے خبر رہنا چاہتا تھا۔ کیونکہ مستقبل کے بارے میں جان لینے کا عذاب سہنا کبھی کبھی ناقابلِ برداشت بھی ہوجاتا ہے۔ اس کی یہ فکر کچھ دوسری پریشانیوں کا سبب بنتی رہی جس کی بنیادی وجہ ایک خوش اندام و خوش چہرہ نازنین تھی۔ اس کے گرد اسرار کے پردے تنے ہوئے تھے۔ کچھ لوگ اسے قتل کرنے کے لئے دنیا کا ایک ایک گوشہ چھان رہے تھے۔

اسرار و حقیقت کے تانے بانے میں الجھی الف لیلوی داستان

گزشتہ قسط کے آخری لمحات

میں جس بات سے ڈر رہا تھا' وہی بات سامنے آگئی تھی۔ سامعہ نے ایک ایسا سوال کر دیا تھا جس کا جواب دینے میں مجھے خاصا وقت لگتا۔ اس کے انداز سے یہ بات مجھے اچھی طرح محسوس ہوگئی تھی کہ وہ مطالعہ کر کے اس علم کی وہ چھوٹی چھوٹی باتیں نہیں سمجھ سکی ہوگی جو بہ ظاہر چھوٹی چھوٹی سہی مگر ان کی اہمیت مسلم ہے۔ ان سے بے خبر انسان کو اس قسم کے کسی بھی سوال کا جواب دینا خاصا وقت طلب کام ہے۔

مگر اچانک پیش آنے والے واقعے نے مجھے جواب دینے سے بچالیا لیکن وہ بچاؤ میرے لیے کچھ خوشگوار نہیں تھا۔

''ڈیڈی!'' سامعہ چونکی۔

اور پھر میں نے بھی بازرگان کو دیکھ لیا تھا جو میز کے بہت قریب کھڑا مجھے بڑی تیکھی نظروں سے دیکھ رہا تھا..... میرے سارے جسم میں جیسے کسی نامعلوم خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔

راؤ پرویز کی اس دلچسپ داستان کے مزید واقعات ملاحظہ فرمائیں

عندلیب نے مجھے بتایا تھا کہ بازرگان اور اس کے ساتھی اس طرح غائب ہوگئے ہیں جیسے انہوں نے روپوشی اختیار کرلی ہو لیکن میں بازرگان کو اپنے سامنے دیکھ رہا تھا۔

سامعہ اپنے باپ کو دیکھ کر چونکی تو تھی لیکن شاید صرف اس لیے کہ وہ غالباً غیر متوقع طور پر اس کے سامنے آیا تھا۔ سامعہ کے تاثرات تبدیل ہونے میں دیر نہیں لگی اور اس نے خوش گوار لہجے میں کہا۔

''آیئے ڈیڈی! میں آپ کو بہت دلچسپ شخصیت سے ملواتی ہوں۔''

''دلچسپ!'' بازرگان نے اپنا نچلا ہونٹ دانتوں میں دبایا اور ایک کرسی سرکا کر مجھے گھورتا ہوا بیٹھ گیا۔

بازرگان کو دیکھ کر میرے حواس پر ایک ضرب سی تو لگی تھی لیکن خود کو سنبھالنے میں مجھے دیر نہیں لگی۔ اس بھرے پرے کلب میں وہ میرے لیے کسی خطرے کا سبب نہیں بن سکتا تھا اور کچھ ڈھارس مجھے شاید یہ بھی تھی کہ عندلیب نے مجھے یہاں بھیجا تھا تو میری طرف سے بے خبر بھی نہیں ہوگی۔

سامعہ نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کچھ کہنا چاہا لیکن بازرگان نے ہاتھ اٹھا کر اسے بولنے سے روک دیا۔ وہ بہ دستور مجھے گھورے جا رہا تھا اور میں نے اپنے چہرے پر ایسے تاثرات پیدا کر لیے تھے جیسے آج میں نے اسے پہلی بار دیکھا ہو۔

''تم کیوں میری بیٹی کے پیچھے پڑ گئے ہو!'' وہ سرد لہجے میں بولا۔ ''مردوں کو صرف مردوں سے ٹکر لینا چاہیے۔''

''میں سمجھا نہیں۔'' میں نے حیرت کا اظہار کیا۔ ''آپ آخر کہنا کیا چاہتے ہیں؟''

''میری بیٹی کے سامنے بھولا بننے کی کوشش نہ کرو!'' بازرگان نے تلخی سے کہا۔

سامعہ جو الجھی ہوئی نظروں سے کبھی میری طرف اور کبھی اپنے باپ کی طرف دیکھ رہی تھی' یکا یک بول پڑی۔ ''لیکن ڈیڈی، پیٹو.....''

''چپ رہو تم!'' بازرگان نے اسے تیز نگاہوں سے دیکھا۔ ''تم نہیں جانتیں کہ یہ میرے خطرناک دشمنوں میں سے ایک ہے۔ اسی نے تمہیں.....''

بازرگان سامعہ کو غالباً اس کے اغوا کے بارے میں بتانے جا رہا تھا اس لیے میں جلدی سے بول پڑا۔ ''شاید آپ کو کسی قسم کی غلط فہمی ہوئی ہے جناب!..... بعض ملتے جلتے چہرے انسان کو دھوکا دے دیتے ہیں۔ میں نے تو آپ کو پہلے کبھی دیکھا بھی نہیں اور آپ دشمنی کی بات کر رہے ہیں!''

''زیادہ باتیں نہ بناؤ!'' بازرگان کا لہجہ زہریلا تھا۔ ''مجھے یقین ہے، تم لوگ مجھے بے وقوف نہیں سمجھتے ہوگے۔ باتیں تم نے غالباً سامعہ کو بے وقوف بنانے کے لیے کی ہیں۔''

''معاف کیجیے گا!'' میں نے ایسا ظاہر کیا جیسے اس کی باتیں میرا موڈ خراب کر رہی ہوں۔ ''میں تو پہلے سے آپ کی بیٹی کو بھی نہیں جانتا۔ یہ ابھی خود میری میز پر آئی ہیں۔''

''یہ ٹھیک کہہ رہے ہیں ڈیڈی!'' سامعہ جلدی سے بولی۔

''سامعہ!'' بازرگان ڈانٹنے کے انداز میں بولا۔ ''اگر خاموش نہیں بیٹھ سکتیں تو یہاں سے چلی جاؤ۔''

سامعہ اب تک غالباً برداشت کرتی رہی تھی کہ اسے کسی کے سامنے اس طرح ڈانٹا ڈپٹا جائے۔ اب یکا یک اس کے چہرے کے تاثرات بدل گئے۔ وہ ایکدم کھڑی ہوگئی۔

''ٹھیک ہے ڈیڈی! مجھے بھی یہ اچھا نہیں لگا ہے کہ آپ مجھے دوسروں کے سامنے اس طرح ڈانٹتے ڈپٹتے رہیں جیسے میں کوئی چھوٹی سی بچی ہوں۔ میں اب گھر ہی جا رہی ہوں۔ کلب میں رکوں گی ہی نہیں۔''

وہ جھٹکے سے مڑی اور تیزی سے بیرونی دروازے کی

طرف بڑھتی چلی گئی۔ میں نے محسوس کیا جیسے وہ کچھ روہانسی بھی ہوگئی تھی۔ جوان اولاد کے لیے دوسروں کے سامنے والدین کی ڈانٹ ڈپٹ برداشت کرنا مشکل ہی ہوتا ہے۔

بازرگان مجھے اس طرح گھورتا رہا جیسے بیٹی کے اس طرح چلے جانے کی اس نے ذرا بھی پروا نہ کی ہو۔

اب میں مسکرایا۔ ''ہاں مسٹر بازرگان! اب ہم اطمینان سے باتیں کر سکتے ہیں۔''

بازرگان کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ ابھری لیکن اس میں تلخی تھی۔ ''تو آگئے تم راستے پر!''

''یہی ضروری تھا۔'' میں نے اطمینان سے کہا۔ ''بچوں کے سامنے وہ باتیں کرنا مناسب نہیں ہوتا جو آپ مجھ سے کرنا چاہتے ہیں!''

''میں اپنا سوال دہراؤں گا کہ اب تم میری بیٹی کو کیوں الجھانا چاہتے ہو۔ پہلے تم لوگوں نے اسے زبردستی اغوا کیا تھا لیکن اب غالباً اس سے تعلقات بڑھا کر اسے کہیں لے جانا چاہتے ہو۔ میرا خیال تھا، اب تم لوگوں کو یقین آچکا ہوگا کہ اس کے ہمارے پاس نہیں ہے۔''

''ہمیں واقعی اس کا یقین ہوچکا ہے۔'' میں نے اطمینان سے کہا۔ ''لیکن آپ کو ضرور غلط فہمی ہوئی ہے کہ میں سامعہ سے تعلقات بڑھانا چاہتا ہوں۔ آپ کی بیٹی میری اس بات کی تصدیق بھی کر چکی ہے کہ وہ خود میری میز پر آئی تھی۔''

''اسے اس طرح اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے تم نے کیا چال چلی تھی؟''

میں نے ایک طویل سانس لے کر مایوسانہ انداز میں سر ہلایا۔ ''شاید میں کسی طرح بھی آپ کی غلط فہمی دور نہیں کر سکتا۔''

اسی وقت میری جیب میں پڑا ہوا موبائل فون گنگنایا۔ بازرگان کچھ بولتے بولتے رک گیا۔ میں نے جلدی سے جیب میں ہاتھ ڈال کر موبائل فون نکالا۔ میرا خیال تھا کہ عندلیب مجھے اس صورتِ حال کے مطابق کوئی ہدایت دینا چاہتی ہوگی لیکن مجھے ایک اجنبی نمبر دکھائی دیا۔ بہرحال مجھے کال تو ریسیو کرنا ہی تھی۔

''ہیلو!'' میں نے موبائل کان سے لگایا۔

''میں سامعہ بول رہی ہوں۔'' دوسری طرف سے جلدی جلدی کہا جانے لگا۔ ''کلب سے نکلتے ہی فون کر رہی ہوں آپ کو۔ پلیز آپ اس معاملے میں اپنا مزاج ٹھنڈا ہی رکھیے گا۔ ڈیڈی کو یقیناً کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ ان کا مزاج کچھ ایسا ہی ہے۔ کسی وقت آپ کو بتاؤں گی وہ اتنے چڑچڑے کیوں ہوگئے ہیں۔ آپ ان پر ہرگز ظاہر نہ کیجیے گا کہ فون آپ کو میں نے کیا ہے۔''

''ٹھیک ہے، میں خیال رکھوں گا کہ.....'' میں نے اچانک خاموش ہوتے وقت بازرگان پر اچٹتی سی نظر ڈالی۔ وہ بڑے غور سے میرے چہرے کا جائزہ لے رہا تھا۔

''میں کسی وقت پھر آپ سے بات کروں گی۔'' دوسری طرف سے سامعہ نے کہا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔ مجھے حیرت تھی کہ اسے میرا موبائل نمبر کیسے معلوم ہوگیا۔

''کس کا فون تھا؟'' بازرگان مجھے ٹٹولتی ہوئی سی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

''آپ کو اس سے کوئی غرض نہیں ہونی چاہیے مسٹر بازرگان!'' میں نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

بازرگان نے اس طرح ہاتھ بڑھایا جیسے موبائل فون میرے ہاتھ سے جھپٹ کر کال کرنے والے کا نمبر دیکھنا چاہتا ہو۔

میں نے تیزی سے موبائل فون اپنی جیب میں ڈال لیا اور کھردرے لہجے میں بولا۔ ''میں تو اب تک تہذیب کے دائرے میں رہا ہوں بازرگان، مگر تم اب حد سے تجاوز کر رہے ہو!''

''تم مجھے دیکھ کر کسی سے کچھ کہتے کہتے رک گئے تھے۔'' بازرگان کی تیز نگاہیں میرے چہرے پر جمی رہیں۔ ''کس بات کا خیال رکھنے کے لیے کہا تھا تم نے؟''

''میں تمہیں پھر بتاتا ہوں کہ دوسروں کے داخلی معاملات میں دلچسپی لینا انسان کو تہذیب کے دائرے سے خارج کر دیتا ہے۔''

''تہذیب کی جو بھی جانتے ہو تم!'' وہ تلخی سے بولا۔ ''ایک لڑکی کو اغوا کرنے والا مجھے تہذیب سکھا رہا ہے!''

''وہ دوسری بات تھی۔ ویسے..... کیا یہ بتاؤ گے کہ اس کا کوئی مرد ہے؟''

''تم اس معاملے کو سمجھ ہی نہیں سکتے!''

''تم مجھے اور کیا سمجھانے آئے ہو؟''

''صرف یہ کہ میری بیٹی سے دور رہو؟''

''تمہاری یادداشت شاید ٹھیک نہیں۔ تمہاری بیٹی تمہیں بتا چکی ہے کہ وہ خود میری میز پر آئی تھی۔''

''آئندہ وہ ایسا نہیں کرے گی اور اگر کرے بھی تو تم منہ موڑ لینا۔''

''تہذیب سے گری ہوئی حرکت مجھ سے ممکن نہیں۔''

''تو پھر تمہیں اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔'' بازرگان

کے لہجے میں کسی جانور کی سی کھر کھراہٹ آگئی۔ ”احمر تم لوگوں کے ہاتھ سے نکل چکی ہے اس لیے میں نے تم لوگوں کو نظر انداز کر دیا۔ لیکن اگر تم میری بیٹی سے دور نہیں رہو گے تو پھر میں تمہارے خلاف کوئی بھی قدم اٹھا سکتا ہوں۔“

میں نے بے پروائی کا مظاہرہ کرنے کے لیے اپنے شانے اچکائے اور دوسری طرف دیکھنے لگا۔ اس سے باتیں کرتے ہوئے مجھے یہ ڈر نہیں لگا تھا کہ وہ کسی قدیم مذہب کا پیروکار اور ساحر ہے۔ احمر نے مجھے بتا دیا تھا کہ اس کے بابا کی وجہ سے وہ لوگ اس معاملے میں اپنی کسی پُراسرار طاقت سے کام نہیں لے سکتے تھے۔

بازرگان میز پر آگے کی طرف جھک کر میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے غرایا۔ ”اگر تم پھر سامعہ کے ساتھ نظر آئے تو پچھتانے کا موقع بھی نہیں ملے گا۔“

”غالباً یہ تمہاری وارننگ ہے!“ میں نے اس کی طرف مضحکہ اڑانے والے انداز میں دیکھا۔

وہ جواب میں کچھ کہے بغیر اٹھا اور تیزی سے ایک طرف بڑھتا چلا گیا۔ اب مجھے کیا کرنا چاہیے؟ میں نے سوچا۔

اسی وقت میری جیب میں پڑا ہوا موبائل فون پھر گنگنایا۔

موبائل جیب سے نکالتے ہوئے میں سوچ رہا تھا کہ سامعہ نے پھر مجھ سے رابطہ کیا ہے، لیکن میرا خیال غلط ثابت ہوا اس مرتبہ دوسری طرف عندلیب تھی۔

”بازرگان سے کیا باتیں ہوئیں؟“ اس نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

”اوہ.....! تو تم مجھ پر نظر رکھے ہوئے ہو؟“

”یہ کیسے ممکن تھا کہ میں تمہیں یہاں سامعہ سے ملنے بھیجوں اور خود بے خبر ہو جاؤں، مجھے یہ علم تو تھا کہ وہ بھی اس کلب کا ممبر ہے مگر..... وہ کافی دن سے غائب تھا اس لیے میں سمجھ رہی تھی کہ وہ آج یہاں بھی نہیں آئے گا۔ خیر چھوڑو! میں پوچھ رہی تھی کہ اس سے کیا باتیں ہوئیں؟“

میں نے اسے بازرگان سے اپنی گفتگو کے بارے میں تفصیل سے بتا دیا پھر بولا ”اب بتاؤ۔ میں نے اس سے جس طرح بات کی اس میں مجھ سے کوئی غلطی تو نہیں ہوئی؟“

”نہیں.....“ عندلیب نے جواب دیا ”بس یہ ہوا کہ بازرگان سے تمہاری یہ اچانک ملاقات ایک اعتبار سے اچھی بھی ثابت ہوئی اور ایک اعتبار سے بری بھی!“

”یعنی؟ کیا مطلب؟“

”وہ کافی دن سے غائب تھا۔ اب نظروں میں آگیا۔ میں اس کی نگرانی شروع کروا چکی ہوں۔“ عندلیب نے جواب دیا ”اور خرابی یہ ہوئی کہ سامعہ سے تمہاری پہلی ہی ملاقات اس کے علم میں آگئی۔ اب وہ اسے تم سے دور رکھنے کی کوشش کرے گا!“

”شاید وہ اپنے اس مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے۔ میرا خیال ہے کہ اس کی بیٹی زیادہ قابو میں نہیں ہے اس کے!“

”یہ سمجھنے کی وجہ؟“

میں نے بتایا کہ بازرگان کی ڈانٹ ڈپٹ پر وہ یہاں سے اٹھی تھی تو کچھ روہانسی تھی اور کلب سے نکلتے ہی اس نے مجھے فون کیا تھا۔

”کیوں؟“ عندلیب نے چونک کر پوچھا ”کیا کہا تھا اس نے؟“

میں نے عندلیب کو یہ بھی بتا دیا۔

”اوہ!“ وہ بولی ”اس کا مطلب ہے کہ تم اسے متاثر کرنے میں کامیاب ہو چکے تھے؟“

”ایسی کوئی بات تو نہیں ہوئی تھی کہ وہ متاثر ہو جاتی!“ میں نے کہا۔

”تفصیل سے بتاؤ“ عندلیب کے انداز میں بے چینی تھی۔ ”مختصر سے وقت میں اس سے تمہاری کیا باتیں ہو سکی تھیں؟“

میں نے عندلیب کو ان باتوں سے بھی آگاہ کر دیا۔

”یہ تو واقعی کوئی خاص بات نہیں ہوئی۔“ عندلیب نے کہا۔

”میرا خیال ہے کہ وہ کچھ ضدی لڑکی ہے۔“ میں نے خیال ظاہر کیا۔ ”بازرگان نے اسے میرے سامنے ڈانٹا تھا اس لیے اس پر ضد سوار ہو گئی ہے۔ وہ دوبارہ مجھ سے ضرور ملے گی۔“

”اگر اسے اپنے باپ کی اس بات پر یقین نہیں آیا کہ اسے اغوا کرنے والوں میں ایک تم بھی تھے! بازرگان اسے یہ بات ضرور بتائے گا۔“

”بازرگان کی بات ہلکی کرنے کی ایک صورت یہ ہو سکتی ہے کہ میں بھی سامعہ سے فون پر بات کر لوں.....“

”کیا کہو گے اس سے؟“ عندلیب نے پوچھا۔

میں نے مختصر طور پر بتایا کہ مجھے کیا خیال آیا تھا۔

عندلیب بولی ”کوشش کر دیکھو۔ شاید کامیاب ہو جاؤ!“

”ایک بات میری سمجھ میں نہیں آسکی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”سامعہ کو میرا موبائل نمبر کیسے معلوم ہو گیا؟“

”وہ ثریا ہی کے ذریعے اس تک پہنچا تھا۔“ عندلیب

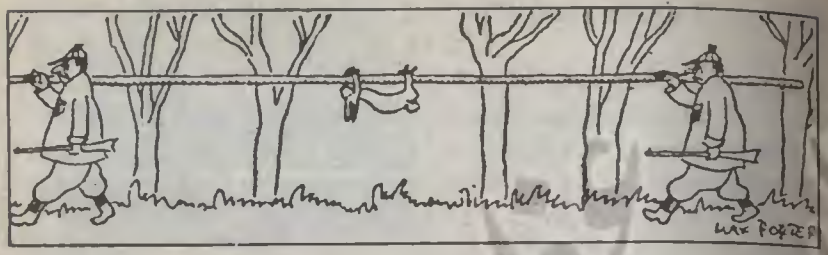

نے بتایا ”سامعہ کو یہ باور کرانے کی کوشش کی گئی تھی کہ تم اجنبیوں سے اس وقت تک نہیں ملتے جب تک کوئی تمہیں فون کر کے ملاقات کا وقت نہ لے لے!“

”اوہو!“ میں ہنسا ”دنیا کی کوئی نام ور نصیحت بتا دیا گیا تھا مجھے!“

”ہاں“ عندلیب نے کہا ”کوشش یہ کی گئی تھی کہ وہ پہلے ہی سے کچھ مرعوب ہو جائے تم سے!“

”لیکن اس نے مجھے فون کر کے وقت نہیں لیا تھا۔“

”اسے یہ زعم ہوگا کہ وہ وقت لیے بغیر بھی تم سے مل سکتی ہے۔“

”اس سے میرے اس اندازے کی تصدیق ہوتی ہے کہ وہ کچھ ضدی قسم کی لڑکی ہے۔“

”اسے فون کرنے میں دیر نہیں لگاؤ۔ تم نے یہی سوچا ہے نا کہ بازرگان سے پہلے ہی اس سے بات کر لو۔“

”ہاں۔“

”اس سے بات کر لو تو مجھے بتانا۔“

دوسری طرف سے رابطہ منقطع کر دیا گیا۔

مجھے عندلیب سے ایک بات پوچھنی تھی۔ میں نے فوراً اس کا موبائل نمبر ملایا۔

”اتنی جلدی کیا ہو گیا؟“ عندلیب نے پوچھا۔

”ایک بات پوچھنی تھی تم سے لیکن تم نے لائن کاٹ دی۔ یہ بتاؤ کہ میں کیا اب بھی کلب میں رکوں؟“

”قطعی ضروری نہیں ہے۔“ عندلیب نے جواب دیا۔ ”ہاں اگر تم روسی طائفے کی شعبدہ بازیاں دیکھنا چاہو تو رک سکتے ہو۔“

”مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں۔“

”تو پھر اٹھ جاؤ وہاں سے۔“

میں رابطہ منقطع کر کے وہاں سے اٹھا تو ایک بار پھر وہ صاحب آنکلے جن کی باتیں مجھے اسٹاک ایکسچینج کی سیر کراتی رہی تھیں۔ ان سے پیچھا چھڑا کر میں بیرونی دروازے کی طرف بڑھا۔ میں نے ان لوگوں سے نظر بچانے کی کوشش کی تھی جن سے ثریا میرا تعارف کرا چکی تھی۔

میں نے سوچا کہ اپنی کار میں بیٹھنے کے بعد ہی سامعہ سے بات کروں گا اور عندلیب کو نتیجے سے آگاہ کرنے کے بعد فون پر ہی احمر سے رابطہ کروں گا۔ دیکھنا یہ تھا کہ وہ اب بھی مجھے بلاتی ہے یا اپنے بابا کی بیماری کے بہانے سے مجھے پھر ٹالنے کی کوشش کرتی ہے۔

اپنی کار کی طرف بڑھتے ہوئے میں نے اپنے موبائل سے سامعہ کا نمبر دیکھا اور پھر وہ نمبر ملاتے ہوئے میں نے اپنی کار کا دروازہ کھولا۔ جب میں اپنی سیٹ پر بیٹھ چکا تھا تو مجھے دوسری طرف سے پہلی گھنٹی کی آواز سنائی دی۔

دوسری گھنٹی کے بعد کال ریسیو کی گئی اور میں نے سامعہ کی آواز سنی۔ ”مجھے بے حد خوشی ہوئی ہے کہ آپ نے خود مجھے فون کیا۔“

اس بات سے میں نے اندازہ لگایا کہ ابھی تک بازرگان اس سے نہیں ملا تھا اور ان دونوں میں فون پر بھی بات نہیں ہوئی تھی۔

میں نے کہا ”بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جن سے ایک مختصر ملاقات کے بعد میں ان سے دوبارہ ملنا چاہتا ہوں یا ان سے دوبارہ بات کرنے کی خواہش ہوتی ہے۔“

کسی عورت کو خوش کرنے کے لیے یہ ایک طے شدہ کلیہ ہے کہ اس کی تعریف اس انداز میں کر دی جائے جس میں تعریف کا پہلو نمایاں نہ ہو۔

”شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے اس قابل سمجھا۔“ سامعہ نے کہا، پھر بولی۔ ”آپ کے فون کرنے سے میں سمجھ رہی ہوں کہ ڈیڈی سے آپ کی کوئی شدید جھڑپ نہیں ہوئی۔“

”درست اندازہ لگایا آپ نے!“ میں نے کہا۔ ”کیونکہ آپ کا فون آگیا تھا اس لیے میں نے خود کو قابو میں

رکھا، تاہم میں ان کی یہ غلط فہمی رفع نہیں کر سکا کہ میں ان کے دشمنوں میں سے نہیں ہوں اور انہیں دراصل مجھ پر کسی اور کا دھوکا ہوا ہے۔"

"حالات نے انہیں بہت چڑچڑا کر دیا ہے، یہ تو میں نے بتایا ہی تھا آپ کو۔ بس خواہ مخواہ کچھ لوگ دشمن ہو گئے ہیں ڈیڈی کے!"

"کچھ دن پہلے۔" میں نے رک کر کہا۔ "کیا آپ کو اغوا کر لیا گیا تھا؟"

سامعہ چونکی۔ "یہ کیسے معلوم ہوا آپ کو؟"

"آپ کے ڈیڈی ہی بتا رہے تھے۔" میں نے جواب دیا۔ "ان کا خیال ہے کہ میں آپ کو اغوا کرنے والوں میں سے ایک ہوں۔"

"ارے نہیں۔" وہ ہنس پڑی۔ "ڈیڈی کو یقیناً غلط فہمی ہوئی ہے۔ آپ جیسا آدمی اس قسم کی حرکتیں کیسے کر سکتا ہے!"

اس کے جواب سے مجھے سکون ملا۔ اب بازرگان اسے جو کچھ بتاتا، اس میں اثر انگیزی نہیں رہتی۔

سامعہ نے مزید کہا۔ "میں آپ کی شکر گزار ہوں کہ آپ نے میری بات کی لاج رکھی اور ڈیڈی کی غلط فہمی نظر انداز کر دی۔"

"میں نے اس لیے فون نہیں کیا تھا کہ آپ میرا شکریہ ادا کریں۔"

اور میں نے واقعی اسے اس لیے فون نہیں کیا تھا۔ میرا مقصد تو یہ تھا کہ میرے بارے میں وہ بازرگان کی باتوں کو اہمیت نہ دے، انہیں اپنے باپ کی غلط فہمی سمجھے اور مجھ سے اس کی آئندہ ملاقات کے لیے بھی میدان ہموار ہو سکے۔

سامعہ دھیرے سے ہنسی۔ "مجھے بھی اندازہ ہے کہ آپ نے میرا شکریہ وصول کرنے کے لیے فون نہیں کیا ہوگا۔"

"میں نے بس اس لیے آپ کی بات کی لاج رکھی کہ علم نجوم کے بارے میں آپ کے سوال نے مجھے متاثر کیا ہے۔ آج کل تو لوگ اور خصوصاً لڑکیاں صرف یہ جاننے کے لیے پاگل سی رہتی ہیں کہ ان کے ستارے کیا کہتے ہیں اور ان کے لیے یہ ہفتہ کیسا رہے گا۔ آپ مجھے پہلی لڑکی ملی ہیں جس نے اس بارے میں سوچا ہے کہ زمین سے اربوں میل دور ہونے کے باوجود ستارے انسان کی زندگی پر کیونکر اثر انداز ہو سکتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ علم نجوم، بلکہ ہر علم اور ہر بات پر انسان کو آنکھیں بند کر کے یقین نہیں کرنا چاہیے۔ آخر دماغ کس لیے ہوتا ہے؟ اسی لیے نا کہ انسان غور کرے، ہر بات پر اندھا دھند ایمان نہ لے آئے!"

"آپ کو میرا یہ سوال کرنا اچھا لگا؟" سامعہ غالباً خوش ہو گئی تھی۔

"یقیناً آپ نے بہت کانٹے کی بات سوچی۔" میں اسے زیادہ سے زیادہ خوش کرنا چاہتا تھا۔

"تو کیا آپ ابھی میرے سوال کا جواب دیں گے؟"

"ابھی!" میں دھیرے سے ہنسا۔ "کیا آپ کا خیال ہے کہ آپ نے کوئی معمولی سوال کیا ہے؟"

"کیا مطلب؟"

"اس کا جواب اتنا سیدھا سادہ نہیں ہے کہ چند جملوں میں دیا جا سکے۔ مجھے بہت کچھ کہنا پڑے گا، تب ہی بات آپ کی سمجھ میں آ سکے گی۔"

میں چاہتا تھا کہ وہ خود ہی ملاقات کے بارے میں بات کرے اور میں اپنے اس مقصد میں کامیاب رہا۔ وہ بولی۔ "میں اپنے سوال کا جواب ضرور چاہوں گی اور مجھے اس سلسلے میں آپ سے ملنا ہی پڑے گا۔ کیا آپ مجھے اپنا اتنا قیمتی وقت دے سکیں گے؟"

"جو تشنہ علم ہوں، ان کی پیاس بجھانا میرے لیے باعث تسکین ہوتا ہے۔"

"بہت اچھی سوچ ہے آپ کی۔ میں جلد ہی بتاؤں گی کہ میں آپ سے کہاں اور کب مل سکتی ہوں۔ اب تو رات ہو گئی ہے، میں کل کسی وقت فون کروں گی۔"

"ہچکچایئے گا نہیں مجھے فون کرتے ہوئے۔ میں آپ کے لیے ضرور وقت نکالوں گا۔ آپ ایک غیر معمولی لڑکی ہیں۔ میں تو آپ کا ہاتھ بھی دیکھنا چاہوں گا۔"

"میں ضرور دکھاؤں گی۔"

میں سامعہ کو بے حد خوش کرنے میں کامیاب رہا تھا۔ فون بند کرتے وقت میرے ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔ میں نے فوراً عندلیب سے رابطہ قائم کیا اور اسے تفصیل سے بتایا کہ سامعہ سے میری کیا گفتگو ہوئی تھی۔

"ویری گڈ!" عندلیب نے سب کچھ سن کر کہا۔ "اگر تم اسے اپنا گرویدہ بنانے میں کامیاب رہے تو میرے منصوبے کے ایک بہت اہم حصے کی تکمیل ہو جائے گی۔"

میں نے ایک طویل سانس لی۔ "تمہارا منصوبہ میرے لیے زیادہ سے زیادہ پُراسرار ہوتا جا رہا ہے۔"

عندلیب ہنسی۔ "بہت جلد اسرار کے سب پردے ہٹ جائیں گے۔ اب تم گھر جا کے آرام کرو۔"

"بس جا رہا ہوں۔"

رابطہ منقطع کرنے کے بعد میں احمر کا نمبر ملانے لگا۔

دو گھنٹیوں کے بعد دوسری طرف سے کال ریسیو کر لی گئی۔

"شاید کچھ جلدی فارغ ہو گئے آپ!" احمر کی آواز سنائی دی۔

"تو اچھا ہوا نا؟ مجھے خوشی ہوگی اگر تم مجھے یہ اطلاع نہ دو کہ تمہارے بابا اپنی طبیعت کی خرابی کے باعث گھر پر ہی ہیں۔"

میرے اس انداز گفتگو پر احمر ہنسی۔ "نہیں۔" اس نے کہا۔ "میں آپ کو یہ اطلاع نہیں دوں گی۔ بابا تھوڑی دیر پہلے ہی گئے ہیں۔ بہ مشکل ایک گھنٹا پہلے۔ ویسے یہ حقیقت ہے کہ دن میں ان کی طبیعت ایک بار پھر خراب ہوئی تھی اور ڈاکٹر کو بلانا پڑا تھا۔"

"تفصیلی گفتگو وہاں آنے پر!" میں بولا۔ "آج میں نے دوا بھی کوٹ کی جیب میں رکھ لی ہے۔ آج تم دوا کے بہانے مجھے جلدی رخصت ہونے پر مجبور نہیں کر سکو گی!"

"جلدی تو آپ کو جانا پڑے گا۔" احمر نے کہا۔ "ڈاکٹر کا خیال تھا کہ اب انہیں کل صبح تک آرام کرنا چاہیے لیکن مجھ سے انہوں نے کہا کہ ان کا جانا بے حد ضروری ہے۔ وہ بس یہ خیال رکھیں گے کہ انہیں زیادہ دیر نہ ہو۔ انہیں بہت زیادہ تاخیر ہوئی تو بھی وہ تین گھنٹے میں لوٹ آئیں گے۔"

"اوہ!" میرے منہ سے نکلا۔ "گویا اب زیادہ سے زیادہ دو گھنٹے رہ گئے ہیں ان کی واپسی میں!"

"یہ نہ کہیے۔ یہ تو زیادہ سے زیادہ وقت ہوا۔" احمر بولی۔ "آپ تو یہ سمجھیں کہ اب ان کی واپسی میں ڈیڑھ گھنٹا رہ گیا ہے۔ اسی وقت میں آپ کو یہاں پہنچنا بھی ہے۔"

"تمہارے ساتھ اتنا کم وقت گزرے گا تو بہت تشنگی رہ جائے گی۔"

"میں کب چاہتی ہوں پرویز کہ ہم ایک دوسرے کے ساتھ زیادہ وقت نہ گزاریں لیکن صورت حال کی نزاکت تو سمجھنا ہی پڑے گی۔"

"اچھا بس!" میں نے کہا۔ "ان باتوں میں وقت ضائع کرنے کے بجائے میں تمہاری طرف آنے کے لیے تیزی سے روانہ ہوتا ہوں۔"

میں نے رابطہ منقطع کر کے موبائل اپنی جیب میں ڈالا اور انجن اسٹارٹ کیا۔ لیکن اس سے پہلے کہ میری کار حرکت میں آتی، میں نے ایک ہلکی سی چیخ سنی۔

کلب کے احاطے میں جس جگہ کاریں پارک کی گئی تھیں، وہاں زیادہ روشنی نہیں تھی لیکن اتنا اندھیرا بھی نہیں تھا

بیرون ملک مقیم قارئین

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ ماہنامہ سسپنس ڈائجسٹ ماہنامہ پاکیزہ

ماہنامہ سرگزشت اور ماہنامہ دلکش

کے

سالانہ خریدار

بن کر بذریعہ رجسٹرڈ ائر میل

اپنا پسندیدہ ڈائجسٹ گھر بیٹھے حاصل کریں

ڈاک خرچ میں 100% اضافے کی وجہ سے غیر ممالک کے لئے زر سالانہ کی شرح مندرجہ ذیل ہوگی

ایشیا، یورپ اور افریقا کے لئے	فی ڈائجسٹ
سالانہ ڈاک خرچ تقریباً	3080/- روپے
12 شماروں کی قیمت	420/- روپے
زر سالانہ	3500/- روپے

امریکا، آسٹریلیا، کینیڈا اور نیوزی لینڈ کے لئے	فی ڈائجسٹ
سالانہ ڈاک خرچ تقریباً	4080/- روپے
12 شماروں کی قیمت	420/- روپے
زر سالانہ	4500/- روپے

اپنے ڈرافٹ اور منی آرڈر ادارے کے نام، ذیل میں درج پتے پر ارسال کریں۔ یہ کراچی میں قابل ادائیگی ہونا ضروری ہیں۔ بیرون شہر/ملک ادائیگی کے لئے بینک کمیشن کے دس ڈالر کے مساوی رقم کا اضافہ کر لیں۔

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

63-C PHASE II EXTENSION,
D.H.A., MAIN KORANGI ROAD,
KARACHI 75500
PHONES: (92) (21) 5802552,
5804200 FAX: 5802551,
E-MAIL: jdpgroup@hotmail.com

کہ کچھ دکھائی نہ دیتا۔ ایک کار اسی وقت وہاں آکر رکی تھی جس میں سے ایک جوان اکھڑ جوڑا اترا تھا اس لیے میری نظر سب سے پہلے انہی دونوں کی طرف گئی تھی لیکن چیخ کی آواز نے تو ان دونوں کو بھی چونکا دیا تھا۔

پہلے سے پارک کی گئی کاروں میں سے ایک کار حرکت میں آئی۔ وہ ٹوسیٹر اسپورٹس تھی۔ چیخ میں نے پھر سنی۔ اس کے ساتھ ایسا بھی لگا جیسے چیخنے والی کا منہ دبا دیا گیا ہو۔ میں نے ہی نہیں بلکہ وہاں اسی وقت آنے والے جوڑے نے بھی وہ آواز سنی ہوگی لیکن میری توجہ ان دونوں کی طرف نہیں، اسپورٹس کی طرف تھی جس کا رخ احاطے کے پھاٹک کی طرف تھا۔

دبی دبی سی چیخ پھر سنائی دی۔ ایسا لگا تھا جیسے منہ دبا ہوا ہونے کے باوجود چیخنے کی کوشش کی گئی ہو، چیختے ہوئے کچھ کہنے کی کوشش کی گئی ہو۔

''پر..... وِد.....''

کچھ ایسی آواز تھی۔ مجھے ایسا لگا جیسے مجھے ہی پکارا گیا ہو۔ غالباً ''پرویز'' کہنے کی کوشش کی گئی تھی لیکن چیخنے والی کا منہ زیادہ طاقت سے دبا دیا گیا تھا۔

میں فوراً ہی اپنی کار حرکت میں لے آیا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھی ہوئی ہستی کی میں بہت ہلکی سی جھلک دیکھ سکا تھا، وہ بھی کوئی لڑکی ہی تھی۔ اس کے بال شانوں تک تھے جن کی رنگت کالی بہرحال نہیں تھی۔

اسپورٹس کو میں نے پھاٹک سے نکل کر بائیں جانب مڑتے دیکھا۔ جلد ہی میری کار بھی پھاٹک سے نکلی اور میں نے اسے بائیں جانب موڑا۔ اسپورٹس مجھے اچھے خاصے فاصلے پر نظر آئی۔ اس کی رفتار بہت تیزی سے بڑھائی گئی تھی، ویسے بھی اسپورٹس کاریں خاصی تیز رفتار ہوتی ہیں۔

ابھی دس ہی بجے تھے لیکن اس سڑک پر ٹریفک برائے نام ہی تھا۔ اسپورٹس نہایت برق رفتاری سے دوڑائی جا سکتی تھی۔

رفتار میں نے بھی بڑھائی لیکن مجھے محسوس ہوا کہ اسپورٹس تک پہنچنا شاید ممکن نہیں ہوگا۔ ہاں اگر اسے کسی سگنل پر رکنا پڑ جاتا تو دوسری بات تھی اور سڑک پر آگے جا کے ایک سگنل تھا بھی جہاں یہ سڑک ایک نہایت بارونق سڑک کراس کرتی تھی۔

میرے دماغ میں خیالات کی یورش بھی کار کی رفتار سے کم شدید نہیں تھی۔ خیالات کے بگولے سے میرے دماغ میں زنانے کی سی آواز پیدا کر رہے تھے یا شاید وہ آواز میرے دماغ میں کار کی تیز رفتاری کے باعث تھی۔

میرے لیے اندازہ لگانا بھی مشکل تھا کہ اسپورٹس میں جو لڑکی اغوا کی جا رہی تھی، وہ کون تھی۔ میری دانست میں اس نے مجھے ہی پکارنا چاہا تھا لیکن مجھے وہ آواز بالکل اجنبی لگی تھی۔ لڑکی کو اغوا کرنے والی بھی کوئی لڑکی ہی تھی جس کی بہت ہلکی سی جھلک دیکھ سکا تھا لیکن یہ بات یقینی نظر آ رہی تھی کہ اس کے ساتھ کوئی اور بھی ہوگا جس نے مغوی لڑکی کا منہ رکھا ہوگا۔ ان دونوں کو ڈرائیونگ سیٹ کے برابر کی سیٹ ہونا چاہیے تھا۔

وہ ٹوسیٹر تھی لیکن مجھے وہ لڑکی یا اس کا منہ دبانے والے کی ہلکی سی جھلک بھی نظر نہیں آئی تھی۔ اس سے میں بس یہ اندازہ لگا سکتا تھا کہ وہ دونوں اس سیٹ کے پائیدان کے قریب میں ہوں گے۔

درمیانی فاصلہ زیادہ ہونے کے باوجود میں نے اسپورٹس کے بریک لگنے کی چیخوں جیسی آواز سنی۔ اسپورٹس کو خاصی تیز رفتاری کے ساتھ دائیں جانب موڑا گیا تھا اور اس طرح وہ اس سگنل سے بچ گئی تھی جہاں میں اسے کراس کر رہا تھا کہ شاید اسے رکنا پڑے۔

مجھے اس طرف مڑنے کے لیے اپنی رفتار خاصی کم کرنی پڑی تھی اس لیے اسپورٹس سے میرا فاصلہ بھی خاصا بڑھ گیا تھا لیکن وہ میری نظروں سے اوجھل نہیں ہوئی تھی۔

اس سڑک کی کشادگی کم تھی اور یہاں سناٹا بھی نسبتاً زیادہ تھا۔ میں نے خطرناک حد تک رفتار بڑھا دی۔ اس وقت میں یہ بھی بھول گیا تھا کہ احمر میرا انتظار کر رہی ہوگی۔ شاید انسانیت کا جذبہ محبت کے جذبے سے زیادہ شدید ہوتا ہے۔ اس وقت میرے دل میں محبت کا جذبہ انسانیت کے جذبے میں دب گیا تھا۔

کسی مظلوم لڑکی کو بچانے کی کوشش کو انسانیت ہی کہا جا سکتا ہے پھر اس لڑکی نے شاید مجھے پکارا بھی تھا..

اچانک مجھے ثریا کا خیال آیا لیکن چیخ کی آواز ثریا کی آواز سے مختلف تھی، تاہم میں نے سوچا کہ عام بول چال کی آواز اور چیخنے کی آواز میں بہت فرق آ جاتا ہے۔ ممکن ہے ثریا ہی ہو لیکن یہ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے کون اغوا کر سکتا ہے اور کیوں کر سکتا ہے؟

مجھے اس وقت عندلیب سے رابطہ کر کے اسے صورت حال سے آگاہ کرنا چاہیے تھا یا پولیس کی مدد حاصل کرنے کے لیے اس کے ایمرجنسی نمبر پر رابطہ کرنا چاہیے تھا لیکن کار کی رفتار اتنی تھی کہ اسٹیرنگ پر دونوں ہاتھوں کی گرفت رکھنا ضروری تھا۔ موبائل استعمال کرنے کے لیے اسٹیرنگ سے ہاتھ ہٹانا خطرناک حرکت ہوتی۔ کسی وقت کوئی ہلکا... سا جھٹکا کھا کر بھی کار میرے قابو سے باہر ہو سکتی تھی۔

اسپورٹس نے پھر ایک موڑ کاٹا اور میں جھنجلاہٹ یا کھسیاہٹ میں دانت پیس کر رہ گیا۔

اسپورٹس ڈرائیو کرنے والی کوشش کر رہی تھی کہ وہ کسی ایسی سڑک پر نہ جائے جہاں ٹریفک کا ہجوم ہو۔ اس کی کوشش یہ ہونی بھی چاہیے تھی لیکن جو اس کا تعاقب کر رہا ہو، وہ ایسی صورت میں جھنجلایا کھسیایا ہی سکتا ہے۔

میری جیب میں پڑا ہوا موبائل گنگنایا۔ میں اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ وہ کال کس کی ہو سکتی تھی۔ احمر کا امکان اس لیے نہیں تھا کہ اس سے بات کیے ہوئے مجھے ابھی بہ مشکل دس منٹ گزرے تھے۔

عندلیب؟ راجو؟ یا کوئی اور؟ میں اندازہ لگا سکا نہ کال ریسیو کر سکا۔ دونوں ہاتھ اسٹیرنگ پر جمائے رکھنا میرے لیے بے حد ضروری تھا۔

موبائل کی گنگناہٹ بند ہوگئی۔ کال کرنے والے نے سمجھ لیا ہوگا کہ میں اس وقت کال ریسیو نہیں کرنا چاہتا یا کوئی اور سبب ہے۔

اسپورٹس سے میرا درمیانی فاصلہ اب بھی اچھا خاصا تھا لیکن وہ میری نظر میں تھی۔ اب مجھے اس پر کچھ تعجب بھی ہوا۔ اسپورٹس کی رفتار اتنی ہوتی ہے کہ اب تک اسے مجھ سے بہت دور نکل جانا چاہیے تھا۔ میری کار اس تک پہنچ ہی نہیں سکتی تھی۔ میں اس سلسلے میں بس ایک ہی اندازہ لگا سکا۔ اسپورٹس چلانے والی اتنی ماہر نہیں تھی کہ اسپورٹس کو اس رفتار سے دوڑا سکتی جس رفتار سے وہ دوڑ سکتی تھی۔

دفعتاً میں چونکا۔ فاصلہ زیادہ ہونے کے باوجود، جب اسپورٹس کی رفتار کم ہوئی اور وہ ایک طرف مڑی تو مجھے اندازہ ہوگیا کہ وہ اس علاقے کے پولیس اسٹیشن کے احاطے میں مڑی تھی۔

احاطے کے باہر ہی دو چار پولیس والے بھی ٹہلتے نظر آئے تھے۔

میرا دماغ چکرا گیا۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ کوئی کسی کو اپنی گاڑی میں اغوا کرے اور پھر وہ گاڑی پولیس اسٹیشن میں داخل ہو۔

ایکسلریٹر پر میرے پیر کا دباؤ غیر ارادی طور پر کم ہوتا چلا گیا۔ پولیس اسٹیشن قریب آتا جا رہا تھا۔

جیب میں پڑا ہوا موبائل پھر گنگنایا۔ اب کار کی رفتار اتنی تھی کہ میں ایک ہاتھ سے بھی اسٹیرنگ سنبھال سکتا تھا۔ میں نے جیب سے موبائل نکالا اور دیکھ لیا کہ کال کرنے والی عندلیب تھی۔

''ہاں۔'' میں نے موبائل کان سے لگایا۔

''پولیس اسٹیشن میں داخل ہونے کی حماقت نہ کر بیٹھنا۔'' عندلیب کی آواز آئی۔

میں چونک پڑا۔

''سیدھے نکلتے چلے جاؤ اور کسی موڑ پر گاڑی روکو۔''

ذہن میں آنے والے ایک خیال کے ساتھ ہی میری نظر کار کے عقب نما آئینے پر گئی اور میرا خیال درست ثابت ہوا۔ عندلیب کی کار میرے پیچھے آ رہی تھی۔ پہلے میں نے اس طرف دھیان ہی نہیں دیا تھا حالانکہ عندلیب مجھ سے کہہ چکی تھی کہ اب میں اردگرد کے ماحول سے باخبر رہنے کی عادت ڈالوں۔

''تم کب سے میرے پیچھے ہو؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''یہ باتیں بعد میں۔ اب میں فون بند کر رہی ہوں۔ تم سیدھے نکل جاؤ۔'' عندلیب نے رابطہ منقطع کر دیا۔

پولیس اسٹیشن کے قریب آتے آتے میرے کار کی رفتار خاصی کم ہو چکی تھی جس میں میں نے فوراً اضافہ کرنا شروع کیا اور میری کار تھانے کے سامنے سے گزر گئی۔

اس معاملے سے میرا دماغ بری طرح چکرا گیا تھا۔

میں نے عقب نما آئینے پر نظر رکھی تھی۔ عندلیب کی کار مجھے تھانے میں داخل ہوتی نظر آئی۔

ایک موڑ قریب آ گیا تھا۔ کار میں نے اس طرف موڑی اور روک دی عندلیب نے مجھ سے یہی کہا تھا۔

میرا موبائل پھر گنگنایا۔ وہ میری گود میں ہی پڑا تھا۔ میں نے فوراً کال ریسیو کی۔

''بہت تیزی سے نکل جاؤ اس علاقے سے!'' عندلیب کے انداز میں عجلت تھی۔ ''ایک پولیس موبائل تمہاری تلاش میں روانہ ہو رہی ہے یہاں سے۔ تمہیں اس کے ہاتھ نہیں لگنا چاہیے۔''

میں نے بے خیالی میں انجن ابھی بند کیا بھی نہیں تھا۔ عندلیب کی پریشانی نے مجھے کار فوراً حرکت میں لانے پر مجبور کر دیا۔ ساتھ ہی میں نے پوچھا۔ ''آخر بات کیا ہے؟''

''وہ ابھی مجھے معلوم نہیں ہو سکی۔ تم بس نکل جاؤ۔''

''میں روانہ ہو چکا ہوں۔'' میں نے کہا لیکن دوسری طرف سے رابطہ پہلے ہی منقطع کیا جا چکا تھا۔

میں نے بہت تیزی سے رفتار بڑھائی اور جلد ہی ایک موڑ کاٹا۔ اب میں ایک ایسی سڑک پر تھا جو پولیس اسٹیشن کی سڑک کے متوازی تھی۔ پولیس موبائل میری تلاش میں جس طرف جاتی، میری کار اب اس کی مخالف سمت میں دوڑ رہی تھی۔ اس کے بعد بھی میں نے کار دو تین جگہ موڑی۔ اب مجھے اندیشہ نہیں رہا کہ پولیس موبائل مجھے تلاش کر سکے گی۔

میرا دماغ اب پہلے سے زیادہ چکرا گیا تھا۔ اغوا کنندگان ایک معنوی لڑکی کے ساتھ پولیس اسٹیشن میں گئے تھے لیکن پولیس نے الٹا میری تلاش شروع کر دی تھی۔

میرا موبائل پھر گنگنایا اور میں نے کال ریسیو کرنے میں دیر نہیں لگائی۔ اس بار بھی دوسری طرف عندلیب ہی تھی۔

''ایک بات کا خیال نہیں رہا مجھے۔'' عندلیب نے کہا۔ ''وائرلیس پر تمہاری کار کا نمبر دوسری پولیس موبائلوں کو بتایا جا سکتا ہے۔ وہ لوگ گھیر لیں گے تمہیں۔ اپنی کار تم کسی گلی میں چھوڑ دو اور خود ٹیکسی کر کے.....''

''اس طرح بھی میری کار پولیس کے ہاتھ تو لگ جائے گی۔''

''پوری بات تو سنو!'' عندلیب کے لہجے میں تھوڑی سی جھنجلاہٹ تھی۔ ''ٹیکسی کر کے تم سیدھے کلب کے علاقے کے پولیس اسٹیشن میں جاؤ اور وہاں یہ رپورٹ درج کراؤ کہ ابھی جب تم کلب سے نکلے تو تمہاری کار غائب تھی۔''

بات ابھی جاری تھی لیکن میں نے کار کا رخ ایسی سمت میں کر دیا کہ جلد ہی ایک تنگ سی گلی تک پہنچ سکوں۔ یہ سارا علاقہ میرا دیکھا بھالا تھا۔

گویا چوری کی رپورٹ درج کرواؤں؟'' میں نے عندلیب سے پوچھا۔

''تھانے میں اور کیا رپورٹ درج کرائی جاتی ہے؟'' عندلیب اس بار کچھ زیادہ جھنجلا گئی۔

''سوری۔'' میں نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''شاید اس وقت میرے دماغ نے کام کرنا چھوڑ دیا ہے۔''

''میں جلد ہی تم سے پھر رابطہ کروں گی۔'' عندلیب نے کہا اور اپنا موبائل بند کر دیا۔

میں نے موبائل اپنے برابر کی سیٹ پر ڈالا اور رفتار کچھ بڑھائی۔ میں جلد ہی اس گلی تک پہنچ گیا جہاں میں نے کار کھڑی کرنے کے بارے میں سوچا تھا۔

گلی نیم تاریک بھی تھی۔ میں نے گاڑی لاک کی اور تیزی سے چلتا ہوا اس گلی سے نکلا۔ ایک پُررونق سڑک تک پہنچنے میں مجھے چار پانچ منٹ لگے۔ وہاں سے میں نے ایک ٹیکسی کی اور اس سڑک تک گیا جس طرف کلب کی پشت تھی۔ وہاں سے میں پیدل چل پڑا اور ایک گلی سے گزر کر کلب کی سڑک پر پہنچ گیا۔ جب میں کلب کے سامنے پہنچا تو وہاں مجھے ذرا بھی رونق نظر نہیں آئی۔ کلب کے احاطے میں کاریں تو پارک تھیں مگر کوئی شخص دکھائی نہیں دیا۔ غالباً ردی طائفے کا شو ہو رہا ہوگا اور کلب کے تمام مہمان اس سے لطف اندوز ہو رہے ہوں گے۔

سڑک پر تھوڑا بہت ٹریفک اب بھی تھا۔ ایک طرف چند ٹیکسیاں کھڑی تھیں۔ انہی میں سے ایک ٹیکسی کر کے میں پولیس اسٹیشن پہنچا۔ ٹیکسی تبدیل کر کے میں نے اپنی دانست میں کچھ عقل مندی کا ثبوت دیا تھا۔ اب اگر اتفاقاً بھی یہ ٹیکسی ڈرائیور پولیس کے ہاتھ لگ جاتا تو وہ پولیس کو یہی بتاتا کہ میں کلب کے سامنے سے اس کی ٹیکسی میں سوار ہوا تھا۔

ٹیکسی سے اترتے وقت مجھے ایک خیال اور آیا۔ اگر میں ٹیکسی روک لیتا تو وہ اس تھانے کے پولیس والوں کی نظر میں اچھی طرح آ جاتی جس سے مستقبل میں مجھے شاید کوئی رعایت مل جاتی۔

''مجھے یہاں سے کہیں اور بھی جانا ہے۔'' میں نے ٹیکسی ڈرائیور سے کہا۔ ''تم کچھ دیر رک جاؤ۔''

''زیادہ دیر تو نہیں لگے گی صاحب؟''

''دیر سویر کی پروا نہ کرو۔ تم جو کہو گے دے دوں گا۔''

اس طرح ٹیکسی ڈرائیور وہاں رکنے پر آمادہ ہو گیا۔

میں نے پولیس اسٹیشن میں اپنی کار غائب ہونے کی رپورٹ درج کرائی۔ اپنا بیان میں نے وہی لکھوایا جو عندلیب نے بتایا تھا۔ اس کام میں مجھے زیادہ دیر نہیں لگنی چاہیے تھی لیکن پولیس کے ''روایتی طریقۂ کار'' کی وجہ سے خاصا وقت لگ گیا۔

جب میں پولیس اسٹیشن سے نکل کر ٹیکسی کی طرف بڑھا تو موبائل پر احمر کا فون آ گیا۔

''کہاں رہ گئے آپ؟'' اس نے پوچھا۔

''غیر متوقع طور پر کچھ پریشانی ہو گئی تھی۔''

''کیا ہوا؟'' احمر نے جلدی سے پوچھا۔

''آ کر بتاؤں گا۔'' میں ٹیکسی سے کچھ فاصلے پر رک گیا۔ ''اب بیس منٹ لگیں گے مجھے تم تک پہنچنے میں۔''

''جب آپ نے مجھے فون کیا تھا، اسی کو پچاس منٹ سے زیادہ گزر چکے ہیں۔ میں نے آپ کو بتایا تھا کہ بابا جلدی بھی آ سکتے ہیں۔''

''چلو ٹھیک ہے۔'' میں نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''آج کچھ کم وقت کی ملاقات سہی!''

میں احمر سے وہ بات پوچھنے کے لیے بے چین تھا جو رات سے ہی میرے دماغ میں چکرا رہی تھی۔ اس کے ساتھ وہ حالات بھی مجھے پریشان کیے ہوئے تھے جن سے میں گزرا تھا۔

''بس اب جلدی آ جائیے!'' احمر نے کہا اور رابطہ منقطع کر دیا۔

میں جب ٹیکسی میں بیٹھا تو اپنے ساتھ کیے جانے والے ڈرامے کے حوالے سے میرے ذہن میں ایک اور سوال ابھرا۔ احمر نے مجھے اتنی تاخیر سے فون کیوں کیا؟ اصولاً تو اسے کم از کم بیس منٹ پہلے ہی فون کر لینا چاہیے تھا۔ تو کیا وہ اس بات سے واقف تھی کہ میں اس وقت ایک پریشانی میں گھرا ہوا ہوں؟

احمر کو وہ صورتِ حال صرف عندلیب ہی سے معلوم ہو سکتی تھی۔ آج میں احمر سے حقیقت معلوم کر کے رہوں گا، میں نے سوچا۔

ٹیکسی سڑک پر رواں دواں تھی۔ ڈرائیور کو میں نے بتا دیا تھا کہ اب مجھے کہاں جانا ہے۔

دو منٹ بعد ہی عندلیب کی کال آ گئی۔

''رپورٹ کر دی؟'' اس نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

''ہاں۔ اور اس میں خاصی دیر لگی۔''

''اسی لیے میں نے تمہیں فون بھی دیر سے کیا ہے۔ میں جانتی ہوں کہ تھانوں میں اس قسم کے معاملات جلدی نہیں نمٹتے۔ خیر! ابھی تم اپنے گھر نہیں جانا۔ پہلے مجھ سے مل لو۔ کیا تم یہ جاننے کے لیے بے چین نہیں ہو کہ جو کچھ ہوا، وہ سب کیا تھا۔''

''یقیناً میں جاننا چاہتا ہوں لیکن.....''

''مجھ سے طارق روڈ والے شیزان میں ملو۔'' عندلیب نے کہا اور رابطہ منقطع کر دیا۔

ساری صورتِ حال مجھے الجھن میں تو ڈالے ہوئے تھی ہی، عندلیب کی اس بات نے الجھن میں اور اضافہ کر دیا کہ میں ابھی اپنے گھر نہ جاؤں۔ میں یہ اندازہ لگانے سے بھی قاصر تھا کہ گھر میں میرے لیے کیا خطرہ ہوگا۔

ویسے ابھی تو میں اپنے گھر جا بھی نہیں رہا تھا۔ ٹیکسی احمر کے فلیٹ کی طرف فراٹے بھر رہی تھی، لیکن عندلیب نے مجھے شیزان میں بلایا تھا۔ اپنی دماغی الجھنوں کے باعث میرے لیے وہ ملاقات ضروری بھی تھی۔ مجھے اسی سے معلوم ہو سکتا تھا کہ جو کچھ ہوا، وہ کیا تھا اور اب اپنے گھر پر میرے لیے کیا خطرہ تھا۔

میرے کہنے پر ٹیکسی ڈرائیور نے ٹیکسی کا رخ بدلا۔ میں موبائل پر احمر سے رابطہ کرنے لگا۔ اسے بتانا چاہتا تھا کہ اس تک پہنچنے میں ایک گھنٹا بھی لگ سکتا ہے۔

''پھر تو بہت دیر ہو جائے گی پرویز!'' احمر نے میری بات سن کر کہا۔

''آدھا گھنٹا تو پھر بھی ہوگا نا ہمارے پاس!..... ویسے میں یہ بھی سوچ رہا ہوں کہ آج تمہارے بابا کے آنے کے بعد بھی رکوں۔ انہیں ہم دونوں کے بارے میں علم تو ہے نا!''

''نہیں پرویز!'' احمر نے جلدی سے کہا۔ ''پلیز!..... بہتر ہوگا کہ آپ آج میرے پاس آنے کا پروگرام ختم ہی کر دیں۔ میں آپ کو کل کسی وقت فون کروں گی۔ پھر آ جائیے گا آپ!''

''اچھا میں تیس چالیس منٹ بعد فون کروں گا تمہیں! پھر کوئی فیصلہ کر لیا جائے گا۔''

مجھے اندیشہ تھا کہ احمر پھر کوئی عذر تراشے گی اس لیے میں نے اس کا جواب سنے بغیر ہی رابطہ منقطع کر دیا۔ ممکن تو خیر یہ بھی تھا کہ وہ فوراً خود ہی مجھے فون کر بیٹھتی لیکن یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ تیس چالیس منٹ بعد اسی وقت کچھ کہتی جب میں اسے فون کرتا۔

دو تین منٹ گزر گئے لیکن احمر کا فون نہیں آیا۔

میرا دماغ پھر ان واقعات میں الجھنے لگا جن سے میں دوچار ہو چکا تھا۔ میں نے تو کسی لڑکی مدد کرنا چاہی تھی لیکن اب مجھے خود ہی پولیس سے اپنا بچاؤ کرنے کی تدبیروں میں الجھنا پڑا تھا۔ گویا ساری کہانی بدل گئی تھی اور اب مجھے عندلیب ہی سے معلوم ہو سکتا تھا کہ یہ سب کچھ کیسے ہو گیا تھا۔

ٹیکسی شیزان کے سامنے جا رکی۔ میں نے اتر کر کرایہ ادا کیا اور ریستوران میں داخل ہوا۔

عندلیب ابھی وہاں نہیں پہنچی تھی۔ میں نے ایک میز کا انتخاب کیا اور فوراً ہی سر پر مسلط ہو جانے والے ویٹر سے انتظار کرنے کے لیے کہا۔ ویٹر مؤدبانہ انداز میں سر ہلا کر واپس جانے لگا اسی وقت میں نے عندلیب کو ریستوران میں داخل ہوتے دیکھا۔ میں نے ایک ایسی میز کا انتخاب کیا تھا کہ اس نے فوراً ہی مجھے دیکھ لیا اور تیزی سے میری طرف آ گئی۔

''میرا خیال تھا کہ میں تم سے پہلے پہنچ جاؤں گی۔'' وہ بیٹھتے ہوئے بولی۔

''میں بس ابھی پہنچا ہوں۔ ایک منٹ بھی نہیں گزرا۔''

''کیسا تجربہ رہا یہ؟'' وہ خفیف سا مسکرائی۔

''دماغ خراب ہو گیا ہے میرا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ

سب کچھ ہوا کیسے؟''

''میری کار جب پولیس اسٹیشن کے احاطے میں جا کر رکی تھی تو کچھ پولیس والے ایک موبائل کی طرف لپک رہے تھے اور ایک لڑکی ان کے ساتھ دوڑتی ہوئی کہہ رہی تھی کہ وہ بھی چلے گی ان کے ساتھ، اس کا موقف یہ تھا کہ اپنا پیچھا کرنے والے کو وہ فوراً پہچان سکتی ہے۔ پولیس اسٹیشن میں پہلے سے موجود ایک شخص نے اسے رکنے کا اشارہ کیا تو وہ رک گئی لیکن ایک بات میں نے فوراً سمجھ لی۔ میرا اندازہ یہ تھا کہ اس نے تم پر اپنے تعاقب کا یا ایسا ہی کوئی سنگین الزام لگایا ہوگا۔ بس اسی لیے میں نے فون پر تم سے کہا کہ فوراً اس علاقے سے دور ہو جاؤ۔ میں چاہتی تھی کہ جب تک معاملہ پوری طرح میری سمجھ میں نہ آجائے، تم پولیس سے دور رہی رہو۔''

''عجیب کہانی سنا رہی ہو تم!'' میں اسے تعجب اور فکر مندی سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''میں تو اس کار کے پیچھے اس لیے لگا تھا کہ اس میں سے کسی لڑکی کے چیخنے کی آواز سنائی دی تھی۔ مجھے شبہ ہے کہ اس نے میرا ہی نام لے کر مدد کے لیے چیخنا چاہا تھا اور میں سمجھا تھا کہ اس کار میں کسی لڑکی کو اغوا کیا جا رہا ہے۔''

''یہ سب کچھ معلوم ہے مجھے!'' عندلیب نے کہا۔ ''اسی لیے تو میں نے بھی اپنی کار تمہاری گاڑی کے پیچھے ڈال دی تھی۔ بعد میں مجھے شبہ ہوا تھا کہ وہ اسپورٹس تیزی سے نکل کیوں نہیں گئی!..... تمہاری نظر میں کیوں رہی۔ یہی بات میں تم سے کہنا چاہتی تھی اور میں نے تم سے موبائل پر رابطہ کرنا چاہا تھا لیکن تم نے میری کال ریسیو ہی نہیں کی۔''

''دراصل.....''

''میں سمجھ گئی تھی۔'' عندلیب نے میری بات کاٹی۔ ''تیز رفتاری کی وجہ سے تم اپنی توجہ صرف ڈرائیونگ پر مرکوز رکھنا چاہتے تھے۔''

''ہوں۔'' میں نے سر ہلایا۔

''پھر جب اسپورٹس پولیس اسٹیشن میں داخل ہوئی تو مجھے کسی گڑبڑ کا احساس ہوا۔ میں نے فوراً تمہیں پھر فون کیا۔ اس وقت تم بھی اپنی کار کی رفتار کم کر چکے تھے اس لیے تم نے کال ریسیو کر لی۔''

''شاید یہ اچھا ہی ہوا کہ تم نے مجھے فون کر دیا ورنہ میں تو اپنی کار پولیس اسٹیشن ہی لے جاتا۔''

''اور فوراً مصیبت میں پھنس جاتے۔''

''آخر یہ سب کچھ تھا کیا؟'' میں نے بے تابی سے پوچھا۔

''تمہیں ایک لوفر ثابت کرنے کے لیے کاشف کرمانی کا ایک منصوبہ۔''

''کیا!'' میں چونکا۔ ''کاشف کرمانی؟''

''ہاں۔'' عندلیب نے کہا۔ ''یہ اس کی کھسیاہٹ سمجھی جا سکتی ہے۔ نجیب کے قتل کے معاملے میں تو اسے تمہارے خلاف کچھ کرنے کا کوئی موقع مل نہیں سکا تھا۔ الٹا تم نے ہی اسے دو عورتوں کے حوالے سے پریشانی میں ڈال دیا تھا۔''

کاشف کرمانی سے اپنی ملاقات کی ساری تفصیل میں عندلیب کو بتا چکا تھا..... بس یہ بات نہیں بتائی تھی کہ وہ سب کچھ میں نے کیسے جانا تھا۔

ویٹر کے آنے سے ہماری گفتگو کا سلسلہ ذرا دیر کے لیے رک گیا۔ جب وہ آرڈر لے کر چلا گیا تو عندلیب نے بتایا۔

''اس کار میں کسی کو اغوا نہیں کیا گیا تھا۔ صرف زرینہ ہی تھی اسپورٹس میں!''

''زرینہ؟'' میں چونکا۔

''ہاں۔'' عندلیب نے سر ہلایا۔ ''کاشف کرمانی کو دبانے کے لیے تم نے جن دو خواتین سے اس کے تعلق کی بات اس سے کہی تھی، ان میں سے ایک کا نام زرینہ ہی بتایا تھا نا تم نے مجھے!''

مجھے یاد آگیا کہ ایک موقع پر میں عندلیب کو یہ سب کچھ بھی بتا چکا تھا۔

''وہ ایک ماڈل گرل ہے۔''

''میں نے تمہیں یہ بھی بتا دیا تھا۔ خیر! تم اپنی بات جاری رکھو۔''

''پولیس اسٹیشن میں اس نے بتایا تھا کہ کلب کے احاطے میں ایک شخص نے اس سے بدتمیزی کی تھی اور جب وہ اپنی کار میں وہاں سے چل پڑی تو وہ اس کے تعاقب میں لگ گیا۔''

''یہ تم نے کیسے سمجھ لیا کہ زرینہ نے یہ حرکت کاشف کرمانی کے ایما پر کی ہوگی۔''

''وہ پہلے ہی سے اس پولیس اسٹیشن میں موجود تھا۔''

''اس کا مطلب تو یہی ہوا کہ منصوبے کے مطابق زرینہ کو اسی پولیس اسٹیشن کا رخ کرنا تھا۔''

''بالکل سیدھی سی بات ہے۔'' عندلیب نے تائید کی۔ ''پھر جب زرینہ نے موبائل میں پولیس والوں کے ساتھ جانا چاہا تھا تو کاشف کرمانی نے ہی اسے رکنے کا اشارہ کیا تھا۔ یہ اندازہ میں نہیں لگا سکی کہ زرینہ نے پولیس والوں

کے ساتھ کیوں جانا چاہا تھا اور کاشف کرمانی نے اسے کیوں روکا تھا!''

بات اب خاصی حد تک میری سمجھ میں آنے لگی تھی۔ جب میں نے کاشف کرمانی کو ایک شادی شدہ عورت شکیلہ اور ایک ماڈل گرل زرینہ سے اس کے تعلقات کے بارے میں بتایا تھا تو اسے زرینہ پر شبہ ہوا تھا۔ زرینہ کے تعلقات کیونکہ اور لوگوں سے بھی تھے اس لیے کاشف کرمانی نے سمجھا تھا کہ زرینہ ہی نے مجھے اس سے اپنے تعلقات کے بارے میں بتایا ہوگا۔ اسے زرینہ پر غصہ بھی آیا تھا اور اس نے سوچا تھا کہ وہ زرینہ کو اس کی سزا ضرور دے گا۔

بعد میں جب زرینہ نے اسے یقین دلایا ہوگا کہ اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں تو کاشف کرمانی نے فیصلہ کیا ہوگا کہ وہ بعد میں کسی موقع پر زرینہ کو آزمائے گا۔

میں کچھ دن تک غائب رہنے کے بعد دو دن پہلے ہی منظر عام پر آیا تھا۔ ممکن ہے اس دوران میں کاشف کرمانی نے میری نگرانی کی ہو۔ اس کی خواہش یہی ہوگی کہ وہ مجھے کسی چکر میں پھنسانے کے لیے زرینہ کو استعمال کرے۔ آج اسے ایک تدبیر سوجھ گئی۔ جب میں کلب میں تھا تو اس نے زرینہ کو وہاں بلایا اور اس سے یہ ڈراما اسٹیج کرنے کے لیے کہا.....

ظاہر ہے کہ زرینہ اس کے لیے فوراً تیار ہو گئی ہوگی۔ مجھ سے اس کا کوئی تعلق تھا ہی نہیں اور پھر کاشف کرمانی کو تو وہ خوش رکھنا ہی چاہتی ہوگی۔

''اب میں سب کچھ سمجھ چکا ہوں۔'' میں نے اس وقت کہا جب ویٹر ہماری آرڈر کی ہوئی چیزیں میز پر رکھ کر جا چکا تھا۔

''لیکن صرف سمجھ لینے سے کچھ نہیں ہوگا۔'' عندلیب بولی۔ ''پولیس سے بچاؤ کے لیے میں تم سے ایک قدم تو اغوا ہی چکی ہوں۔''

''کار کی چوری کی رپورٹ؟''

''ہاں۔ لیکن صرف اتنا ہی کافی نہیں ہے۔ تمہیں یہ بھی ثابت کرنا ہوگا کہ رپورٹ کرانے سے دس پندرہ منٹ پہلے تم کلب ہی میں تھے۔ اس کی گواہی ثریا دے دے گی۔ محکمۂ پولیس سے تعلق ہے اس کا۔ اس کی گواہی نظر انداز نہیں کی جا سکتی۔''

''میری کار کا کیا ہوگا؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ پولیس کو مل ہی جائے گی۔ کار وہ ضبط تو نہیں کریں گے، تمہیں دے ہی دیں گے۔''

''ہوں۔'' میں نے سر ہلایا، پھر دانت پر دانت جما کر بولا۔ ''اس زرینہ اور کاشف کے بچے سے میں اب اچھی طرح نمٹوں گا۔''

''بے ہودہ لوگوں سے بے ہودگی سے پیش آنا کوئی اچھی بات نہیں۔''

میں نے عندلیب کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کچھ رک کر کہا۔ ''زرینہ کو عدالت میں تو گھسیٹا جا سکتا ہے!..... اس پر ہتکِ عزت کا دعویٰ.....''

''اس میں ایک تو وقت کی بربادی بھی ہے، اور پھر ہتکِ عزت کے دعوے سے ایک ماڈل گرل کی صحت پر کیا فرق پڑے گا؟ کچھ بھی نہیں..... اور پھر میں نہیں چاہتی کہ تم زیادہ دن کے لیے یہاں کسی معاملے میں پھنس جاؤ۔''

''کافرستان لے جانا چاہتی ہو مجھے؟'' میں نے اسے بہ غور دیکھا۔

''ہوں۔'' وہ زیرِ لب مسکرائی۔

''احمر کے بغیر؟''

''میں خاصی پُرامید ہوں۔ مل جائے گی وہ!''

''صرف پُرامید ہو یا.....''

''میرا خیال ہے کہ اب تمہیں گھر جا کے پولیس کا سامنا کرنا چاہیے۔'' عندلیب نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''اتنی جلدی پہنچ جائیں گے وہ میرے گھر؟''

''کاشف کرمانی کی وجہ سے میرا یہی خیال ہے۔'' عندلیب نے جواب دیا۔ ''وہ پولیس اسٹیشن کے انچارج کو بتا سکتا ہے کہ زرینہ کا بتایا ہوا کار نمبر اس کے لیے اجنبی نہیں ہے اور وہ اس کار کے مالک کو جانتا ہے۔ وہ ان لوگوں کو تمہارا پتا بتا سکتا ہے۔'' عندلیب نے اپنے گلاس سے جوس کا آخری گھونٹ لیا۔ ''میں اب چلتی ہوں۔ تم بل ادا کر دینا۔ یہاں سے سیدھے اپنے گھر ہی پہنچو ورنہ اس معاملے میں پے چیدگی آسکتی ہے۔ پولیس تم سے پوچھ سکتی ہے کہ اپنی کار کی چوری کی رپورٹ درج کرانے کے بعد تم سیدھے اپنے گھر پہنچنے کے بجائے کہیں اور کیوں چلے گئے یا کہاں گئے۔''

باتیں تو عندلیب کی غلط نہیں تھیں لیکن میں نے محسوس کیا کہ اس نے احمر کے بارے میں گفتگو سے گریز کرنا چاہا تھا۔

یہ معاملہ میرے دماغ کو خاصا چکرائے دے رہا تھا کہ میرے ساتھ کیا ڈراما کیا جا رہا ہے اور کیوں کیا جا رہا ہے۔

میری دوا کا وقت ہو چکا تھا۔ وہ میں نے جیب سے نکال کر کھائی۔

عندلیب جا چکی تھی۔ میں نے بل ادا کیا اور گھڑی پر نظر ڈالی۔ عندلیب کے ساتھ میرا کچھ زیادہ وقت نہیں گزرا تھا۔

احمر تک پہنچنے میں زیادہ تاخیر نہیں ہوتی لیکن جیسا کہ عندلیب نے کہا تھا، اس وقت مجھے اپنے گھر پہنچنا چاہیے تھا..... تاہم میں نے احمر کو فون کرنے میں کوئی حرج نہیں سمجھا۔

''جی پرویز!'' دوسری طرف سے احمر کی آواز سنائی دی۔

میں کچھ اور بھی کہتا لیکن احمر نے جلدی سے بول کر میری بات پوری نہیں ہونے دی۔ ''نہیں پرویز! اب نہ آیئے گا۔ بابا آگئے ہیں۔ مجھے ذرا بھی توقع نہیں تھی کہ وہ اتنی جلدی آجائیں گے۔''

اس ''بابا'' کو دیکھنا ضرور چاہیے، میں نے سوچا۔

''خیر۔'' میں نے کہا۔ ''میں نے تو یہ کہنے کے لیے ہی فون کیا تھا کہ اب آج تو نہیں آسکوں گا۔ مجھے اب گھر جانا ہے۔''

''بالکل صحیح۔ آپ کو فوراً گھر پہنچنا چاہیے۔''

''کیوں؟'' میں تھوڑا سا چونکا۔ ''تم ایسا کیوں سمجھ رہی ہو کہ مجھے فوراً گھر پہنچنا چاہیے۔''

''آپ خاصے تھک گئے ہوں گے نا!'' احمر نے جلدی سے کہا۔ ''ابھی آپ پوری طرح تندرست نہیں ہوئے ہیں۔ آپ کو آرام کی ضرورت ہے۔''

احمر بات بنا گئی تھی۔ میرے خیال کے مطابق اسے عندلیب سے صورتِ حال کا علم ہو چکا تھا۔

''اچھا!'' میں نے طویل سانس لی۔ ''میں اب جا کے آرام کرتا ہوں۔ کل مجھے تمہارے فون کا انتظار رہے گا۔''

''بابا کی طبیعت اب ٹھیک ہی معلوم ہو رہی ہے۔ امید ہے کہ وہ ٹھیک ہی رہیں گے اور ان کے معمولات پھر وہی ہو جائیں گے۔ کل رات ہماری ملاقات ضرور ہوگی۔ اپنا خیال رکھیے گا۔ دوا کھالی آپ نے؟''

''ابھی کھائی ہے۔ اچھا میں فون بند کر رہا ہوں۔''

''خدا حافظ۔''

میں نے بھی جواب میں یہی کہا۔

ریستوران سے نکل کر میں نے ایک ٹیکسی کی اور اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ راستے میں وہ باتیں میرے ذہن میں چکرائی رہیں جو فون پر احمر سے ہوئی تھیں۔ میرے گھر پہنچنے کے سلسلے میں وہ بڑی خوب صورتی سے بات بنا گئی تھی۔

یکایک میں چونکا۔ احمر سے باتیں کرتے ہوئے میں نے اس کا ایک فقرہ نوٹ نہیں کیا تھا۔ اس نے یہ بھی تو کہا تھا کہ میں خاصا تھک گیا ہوں گا لہٰذا مجھے آرام کرنا چاہیے۔ زرینہ کی وجہ سے بھاگ دوڑ میں مجھے تھوڑی سی تھکن تو ہوئی تھی لہٰذا میں احمر سے پوچھ سکتا تھا کہ اسے میری تھکن کا علم کیسے ہو گیا؟

عندلیب یقیناً اس کے رابطے میں تھی۔

اوہ، احمر! میں نے جھنجلاہٹ سی محسوس کی..... مجھے بے وقوف بنانے والے اس ڈرامے میں آخر اس نے عندلیب کا ساتھ کیوں دیا؟

اس سوال کا میرے دل نے یہ جواب دیا کہ جو ڈراما کیا جا رہا تھا، اس میں میری ہی کوئی بھلائی مضمر ہوگی۔ مجھ سے محبت کرنے والی احمر مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتی اور ایسا ہی میں عندلیب کے بارے میں یا راجو کے بارے میں بھی سوچ سکتا تھا۔ وہ دونوں میرے بہت اچھے دوست تھے۔

مگر کیوں؟ یہ سب کیوں؟ میری اس میں کیا بھلائی تھی کہ ایک ڈراما کر کے مجھے بے وقوف بنایا جا رہا تھا؟

یہ سوالات میرے دماغ پر شدید باؤ ڈال رہے تھے۔

جب میں گھر پہنچا تو عیدو بابا سے مجھے معلوم ہوا کہ پولیس ابھی تک میرے گھر نہیں پہنچی تھی۔

''پولیس کے بارے میں آپ نے کیوں پوچھا بیٹے سرکار؟'' عیدو بابا حیرت سے بولے۔

''میری کار چوری ہو گئی ہے ایک جگہ سے۔'' عیدو بابا کو ساری باتیں بتانا ضروری نہیں تھا۔ ''رپورٹ کرا دی ہے میں نے اس کی۔ مجھے خیال آیا تھا کہ شاید کار انہیں مل گئی ہو اور وہ مجھے بتانے آئے ہوں۔''

حالانکہ اس قسم کے معاملات میں ایسا ہوتا نہیں ہے۔ کار مل جاتی تو پولیس اسٹیشن سے مجھے فون کر دیا جاتا، لیکن عیدو بابا اتنا زیادہ نہیں سوچ سکتے تھے۔

میں نے اپنے کمرے میں آکر کپڑے تبدیل کیے اور بستر پر لیٹ کر گھڑی پر نظر ڈالی۔

پولیس کے اب تک نہ آنے کا میں نے ایک ہی مطلب سمجھا۔ کاشف کرمانی نے انہیں میرے بارے میں نہیں بتایا تھا۔ وہ اس معاملے میں اتنی تیزی دکھا کر خود کو نمایاں نہیں کرنا چاہتا ہوگا اور یہ بات تو اس نے سمجھ ہی لی ہوگی کہ کار نمبر کی مدد سے پولیس میرا پتا تو لگا ہی لے گی!

ایک گھنٹے بعد، یعنی سونے سے پہلے مجھے ایک اور دوا کھانی تھی جس کے لیے مجھے جاگنے کی کوشش نہیں کرنی تھی۔ نیند ابھی میری آنکھوں سے دور ہی تھی۔

میں بستر پر پڑا زرینہ اور کاشف کرمانی کے بارے میں سوچتا رہا۔ عندلیب کی باتوں کا انداز تو یہ تھا کہ میں ان دونوں کو اپنے ذہن سے جھٹک دوں لیکن مجھے اپنے بھڑکے ہوئے

جذبات پر اختیار نہیں تھا۔ کوئی نہ کوئی سزا تو ان دونوں کو ملنی ہی چاہیے۔ میں سوچ رہا تھا۔

سوچتے سوچتے ایک خیال میرے ذہن میں آ ہی گیا اور میرے ہونٹوں پر ایک تلخ سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

یہ ٹھیک رہے گا، میں نے سوچا، ایک ماڈل گرل کے ساتھ اس قسم کی زیادتی کوئی غیر شریفانہ بات بھی نہیں ہوگی۔

میرا ہاتھ فون کی طرف گیا۔ میں راجو سے کچھ بات کرنا چاہتا تھا۔ اپنے منصوبے کے سلسلے میں مجھے اس سے کچھ مدد لینا پڑتی لیکن ریسیور اٹھا کے میں نے پھر رکھ دیا۔ مجھے خیال آیا تھا کہ راجو ابھی سویا تو نہیں ہوگا لیکن پینے پلانے کے مشغلے میں ضرور لگا ہوا ہوگا۔ اس وقت اسے ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں ہوتا۔ جو کام مجھے اس سے لینا تھا، وہ کل بھی لیا جا سکتا تھا۔ اس کے لیے زیادہ عجلت کی ضرورت نہیں تھی۔

مجھے راجو کے پینے پلانے کا خیال آیا تو کچھ اداس ہو گیا۔ یہ بات مجھ سے پوشیدہ نہیں تھی کہ وہ کیوں پیتا تھا۔ ''یادِ ماضی'' کو عذاب کہا گیا ہے تو کچھ غلط نہیں کہا گیا۔ راجو کے ساتھ بھی ایسا ہی تھا۔ کچھ یادوں کی اذیت ہی اسے شراب کی طرف لائی تھی لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ کسی غم کا علاج ہرگز نہیں ہے۔ اگرچہ میں شراب نوشی کا عادی نہیں ہوں لیکن مطالعے اور مشاہدے سے میں نے یہی جانا ہے کہ شراب نوشی کے وقت وہ یادیں کچھ زیادہ ہی اذیت ناک ہو جاتی ہیں جنہیں انسان بھلانا چاہتا ہے۔ وہ یادیں اسی وقت ذہن سے محو ہوتی ہیں جب بہت زیادہ پی کر انسان بالکل مدہوش ہو جائے لیکن راجو کو میں نے کبھی مدہوشی کی حالت میں دیکھا ہی نہیں تھا۔

اس کے بارے میں سوچتے سوچتے خاصا وقت گزر گیا۔ پھر میں نے اپنی دوا کھائی۔ اس وقت مجھے زنگولا کا خیال آیا۔ میں نے فوراً موبائل فون پر عندلیب سے رابطہ کیا۔

عندلیب نے اپنے موبائل پر میرا نمبر دیکھ لیا ہوگا۔ اس نے کال ریسیو کرتے ہی کہا۔ ''مجھے معلوم ہے کہ پولیس ابھی تک تمہارے گھر نہیں پہنچی۔''

''میں نے یہ بتانے کے لیے فون نہیں کیا ہے۔ میں زنگولا کے بارے میں پوچھنا چاہتا ہوں۔ غالباً چوبیس گھنٹے گزر چکے ہیں۔''

''ہاں۔'' عندلیب نے جواب دیا۔ ''میں اس وقت زنگولا خطرے کی حالت سے باہر آ گیا ہے لیکن ابھی اسے کچھ دن ہاسپٹل میں تو رہنا ہی پڑے گا۔''

''ندرتی وغیرہ کو علم تو ہو گیا ہوگا کہ زنگولا اب کہاں ہے!''

''یقینی بات ہے۔ وہ بے خبر کیسے رہ سکتے ہیں!''

''تو وہ ہاسپٹل میں بھی زنگولا کو ختم کرنے کے لیے کوئی قدم اٹھا سکتے ہیں۔'' میں نے خدشہ ظاہر کیا۔

''یہ میں بھی سوچ چکی ہوں۔ اس کی حفاظت کا معقول بندوبست کیا ہے میں نے!''

''آخر وہ کافرستان کی مہم کا ساتھی ہے تمہارا!''

''کیا طنز کر رہے ہو؟'' عندلیب ہنسی۔

''میں نے تو سیدھی سی بات کی تھی۔ تم جو چاہو سمجھ لو۔''

''بہتر ہوگا کہ اب تم آرام کرو۔''

دوسری طرف سے رابطہ منقطع کیا گیا تو میں نے بھی اپنا موبائل بند کر کے آنکھیں بند کر لیں اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔

صبح نہ جانے کیوں میری آنکھ کچھ جلدی ہی کھل گئی۔ معمول کے مطابق میں نے اٹھ کر غسل کیا اور پھر ناشتا کرنے بیٹھا۔ ناشتا کرتے ہوئے مجھے یاد آیا کہ رات کو سوتے وقت، جب مجھ پر کسی حد تک غنودگی طاری ہو چکی تھی تو میں نے سوچا تھا کہ گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ میں خطرناک حالات سے قریب اور قریب تر ہوتا جا رہا ہوں لہٰذا مجھے کوئی معقول قسم کا ہتھیار خرید لینا چاہیے۔ میری چھٹی حس بھی کہہ رہی تھی کہ مستقبل قریب میں کچھ زیادہ خطرناک صورتِ حال بھی پیدا ہو سکتی ہے۔ ان خیالات میں اسمتھ اینڈ ویسن جیسا ننھا سا ہتھیار شاید میرے کام نہ آتا۔

ایک بار پہلے بھی میں یہ سوچ چکا تھا لیکن بات صرف سوچ تک ہی رہ گئی تھی۔ ناشتا کرتے وقت میں نے فیصلہ کیا کہ آج میں عندلیب کے ساتھ جا کر کوئی ریوالور خرید لوں گا۔ آتشیں ہتھیاروں کے بارے میں مجھے کچھ معلومات حاصل نہیں تھیں اس لیے اس معاملے میں عندلیب ہی میری مدد کر سکتی تھی۔

ناشتا کرنے کے بعد میں نے اخبار پر اچٹتی سی نظریں دوڑائیں اور پھر اخبار ایک طرف ڈال کر بستر پر لیٹ گیا۔

ان دنوں میرے پاس سوچنے کے لیے کچھ زیادہ موضوعات نہیں تھے۔ لے دے کر ایک ذات احمر کی تھی یا ایک یہ سوال کہ میرے ساتھ کیا ڈراما کیا جا رہا تھا اور کیوں کیا جا رہا تھا۔ گزشتہ رات سے کاشف کرمانی اور زرینہ بھی میرے دماغ میں جگہ بنا چکے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ سامعہ اور اس کے باپ بازرگان کا خیال بھی اپنے ذہن سے جھٹک

نہیں سکا تھا۔

اس وقت میری دماغی لہریں سامعہ کا طواف کرنے لگیں۔ اسے فون کر کے میں نے جیسے بات کی تھی اور جس قسم کا ردعمل اس نے ظاہر کیا تھا، اس کی وجہ سے مجھے امید تو یہی تھی کہ بازرگان کی اس بات پر وہ شاید یقین نہ کرے کہ اسے اغوا کرنے والوں میں ایک شخص میں بھی تھا۔

اس وقت میں بستر پر لیٹے لیٹے سامعہ کے انفرادی عدد کی خصوصیات پر غور کرنے لگا۔ جن لوگوں کے نام کا عدد پانچ ہو، ان ان کا تعلق سیارہ عطارد (MERCURY) سے ہوتا ہے۔ یہ لوگ عموماً خاصے تیز طرار ہوتے ہیں، سو سامعہ بھی تھی۔ جب میں اور راجو اسے اغوا کرنے گئے تھے تو وہ ہمیں دیکھ کر کوئی سہمی ہوئی لڑکی نظر نہیں آئی تھی اس نے ہم دونوں سے بچ نکلنے کی بھی کوشش کی تھی۔

تجسس کا مادہ اور کچھ سیکھنے کا شوق بھی عطارد سے تعلق رکھنے والوں کا خاصہ ہے۔ سامعہ میں یہ خصوصیت بھی تھی۔ پانچ کے عدد سے تعلق رکھنے والے لوگ جلد باز بھی ہوتے ہیں چنانچہ سامعہ نے ثریا سے حاصل کردہ موبائل نمبر پر مجھ سے رابطہ کر کے ملاقات کا وقت لینے میں وقت کا زیاں سمجھا تھا اور سیدھی میری میز پر پہنچ گئی تھی۔

میرے لیے سب سے اہم بات یہ تھی کہ اس عدد سے تعلق رکھنے والے افراد دل کے برے نہیں ہوتے۔

ان دنوں میں جن لوگوں سے میرا واسطہ پڑا تھا، ان میں سامعہ دوسری تھی جس کا انفرادی عدد ''پانچ'' تھا۔ اس سے پہلے میں تھوڑی ہی دیر کے لیے شیراز ہمدانی سے اس وقت مل چکا تھا جب میں اور راجو، ندرتی کے گھر گئے تھے۔

''ہمدانی'' کیونکہ شہر ''ہمدان'' کی نسبت سے ہے اس لیے میں اسے شیراز کے نام کا لازمی حصہ نہیں سمجھتا اور شیراز کا عدد پانچ ہے۔ میں نے شیراز کو بھی دل کا برا نہیں پایا تھا۔ اپنے ساتھی داریوش کے ساتھ وہ بھی احمر کو ''پرنسز'' کہتا تھا اور ان لوگوں کی خواہش تھی کہ احمر کسی بھی طرح لیکن بہ خیر و عافیت ان تک پہنچ جائے۔

ان خیالات سے میں اس وقت نکلا جب عبید بابا نے مجھے پولیس کے آنے کی اطلاع دی۔ وہ اس خیال سے بہت خوش نظر آ رہے تھے کہ پولیس کو میری وہ کار مل گئی ہوگی جس کی چوری کی رپورٹ میں درج کرا چکا تھا۔

میں نے شب خوابی کے لباس پر گاؤن پہنا اور سوچ میں ڈوبا ہوا ڈرائنگ روم کی طرف بڑھا۔ عندلیب نے مجھ سے جو کچھ کہا تھا، مجھے اسی کے مطابق پولیس سے بات کرنی تھی۔

ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے وقت میں اپنے ہونٹوں پر مسکراہٹ لے آیا تھا۔ ''غالباً میری کار مل گئی ہے۔'' میں نے پولیس افسر کی طرف بڑھتے ہوئے کہا جس کے ساتھ ایک ہیڈ کانسٹیبل بھی تھا۔

پولیس افسر نے تیکھی نظروں سے میری طرف دیکھا اور بولا۔ ''کار تو آپ کی مل چکی ہے لیکن میں یہاں اس لیے آیا ہوں کہ آپ کے خلاف کل رات ایک رپورٹ درج کرائی گئی ہے۔''

''اچھا!'' میں نے حیرت ظاہر کی۔ ''میرے خلاف کیا رپورٹ درج کرائی گئی ہے؟ کون ہے رپورٹ درج کرانے والا؟''

''کل رات آپ کسی کلب میں گئے تھے؟''

''یقیناً گیا تھا، اور میری کار اسی کلب کے احاطے سے غائب ہوئی تھی۔ یہ بات میں اپنی رپورٹ میں درج کرا چکا ہوں۔''

''کلب کے احاطے میں آپ نے ایک خاتون سے چھیڑ چھاڑ کی تھی اور وہ چھیڑ چھاڑ تہذیب سے گری ہوئی بھی تھی۔''

''کیا بے ہودہ الزام لگا رہے ہیں آپ مجھ پر!'' میں نے بگڑ کر کہا۔

''یہ الزام آپ پر میں نہیں لگا رہا ہوں۔ یہ تو آپ کے خلاف رپورٹ میں لکھوایا گیا ہے۔ پھر جب وہ خاتون اپنا پیچھا چھڑانے کے لیے اپنی کار میں وہاں سے روانہ ہوئیں تو آپ نے اپنی کار میں ان کا پیچھا کیا۔ خاتون کو جب ایک پولیس اسٹیشن نظر آیا تو انہوں نے اپنی کار وہاں روکی۔ آپ نے انہیں ایک پولیس اسٹیشن پر رکتے دیکھا تو آپ نے اسی میں اپنی عافیت سمجھی کہ وہاں سے فرار ہو جائیں۔''

میں نے یہ سب کچھ بڑے تحمل سے لیکن اس طرح سنا جیسے مجھے غصہ آ رہا ہو۔ پولیس افسر کے خاموش ہوتے ہی میں تلخ لہجے میں بولا۔ ''یہ سارے الزامات مجھ پر اسی خاتون نے لگائے ہیں؟''

''جی ہاں۔''

''وہ خاتون ہیں کون؟''

''زرینہ نام ہے ان کا۔ وہ ایک مشہور ماڈل گرل ہیں۔''

''خوب!'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''کیا آپ اس کا ذکر اتنے احترام سے اس لیے کر رہے ہیں کہ وہ ایک مشہور ماڈل گرل ہے؟''

''ہمیں اس سے کوئی غرض نہیں کہ ان کا پروفیشن کیا ہے۔'' پولیس افسر نے بگڑے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''ہمیں صرف یہ سکھایا گیا ہے کہ ہمیں عورت کا احترام کرنا چاہیے۔''

''بہت اچھی تربیت ہوتی ہے آپ لوگوں کی۔'' میرا طنزیہ انداز برقرار رہا۔ ''اسی لیے آپ میرے بیان کے بجائے ایک ماڈل گرل پر یقین کر رہے ہیں۔''

''کیا بیان ہے آپ کا؟..... ابھی تو کوئی بیان نہیں دیا آپ نے!''

''آپ کو اس کا علم ہے کہ میری کار مل گئی ہے تو آپ کو یہ بھی معلوم ہوگا کہ میں نے اس کی چوری کی رپورٹ درج کرائی تھی۔ کیا وہ رپورٹ میرا بیان نہیں ہے؟''

''اگر اسے آپ کا بیان مان لیا جائے تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ آپ نے جس وقت وہ رپورٹ درج کرائی ہے، یہ اس سے کافی پہلے کی بات ہے جب آپ نے مس زرینہ کے بیان کے مطابق ان سے تہذیب سے گری ہوئی چھیڑ چھاڑ کی تھی۔ اس سلسلے میں آپ کو پولیس اسٹیشن چلنا ہوگا۔ مس زرینہ کو بھی وہیں بلایا جائے گا تاکہ وہ آپ کی شناخت کر سکیں۔ اس کے بعد ہی آپ کو معلوم ہو سکے گا کہ پولیس آپ کے خلاف کیا قدم اٹھا سکتی ہے۔''

''مجھے پولیس اسٹیشن جانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔'' میں نے تیز لہجے میں کہا۔ ''مجھ پر جو الزام لگایا گیا ہے، وہ سراسر بے بنیاد ہے۔''

''اس کا ثبوت دینا ہوگا آپ کو۔'' پولیس افسر نے کہا۔ ''آپ نے کار چوری ہونے کی جو رپورٹ درج کرائی ہے۔ اس سے آپ کے اس بیان کی تائید نہیں ہوتی کہ آپ پر لگایا گیا الزام بے بنیاد ہے۔''

''میں ایک معزز گواہ پیش کر سکتا ہوں۔ آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ جس وقت مجھ پر چھیڑ چھاڑ اور تعاقب کا الزام لگایا گیا ہے، اس وقت میں کلب ہی میں تھا۔ گواہی کے بعد آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ میں نے کلب سے رخصت ہونے کے دس پندرہ منٹ بعد ہی رپورٹ درج کروا دی تھی۔''

''آپ اس گواہ کو بھی پولیس اسٹیشن بلا لیں۔''

''میں کسی کو اس زحمت میں کیوں ڈالوں؟ آپ خود جا کر ان سے پوچھیں۔ میں آپ کو ان کا نام اور ان کا موبائل نمبر دے سکتا ہوں۔ ان کا تعلق آپ ہی کے محکمے سے ہے۔ شاید آپ نے ثریا صاحبہ کا نام بھی سنا ہوگا!''

میں نے پولیس افسر کے ساتھ ہی کانسٹیبل کو بھی چونکتے دیکھا اور اس سے یہی سمجھ سکا کہ محکمۂ پولیس میں ثریا خاصی مشہور ہوگی۔

''کیا آپ ثریا بیگ کی بات کر رہے ہیں؟'' پولیس افسر نے جلدی سے پوچھا۔ ''بریگیڈیئر جلال بیگ کی صاحب زادی؟''

''جی ہاں۔'' میں نے کچھ سکون سے کہا کیونکہ ثریا کا نام سنتے ہی پولیس افسر کے چہرے کے تنے ہوئے عضلات ڈھیلے پڑ گئے تھے۔

''اگر مس ثریا یہ بیان دیتی ہیں تو.....'' پولیس افسر بڑبڑایا اور کچھ سوچتے ہوئے خاموش ہو گیا۔

''تو زرینہ کے لیے خاصی مشکلات پیدا ہو سکتی ہیں۔'' میں نے اپنی دانست میں اس کی ادھوری بات پوری کی۔

پولیس افسر نے جلدی سے اپنا موبائل سنبھالا اور غالباً وہی نمبر ملانے لگا جو میں نے اسے بتایا تھا۔

چند لمحے بعد میں نے اس کے چہرے پر الجھن کا تاثر دیکھا۔ جلد ہی اس کی وجہ بھی میری سمجھ میں آ گئی۔ وہ ثریا سے رابطہ کرنے کی کوشش میں دو تین بار ناکام ہوا تھا۔

''انہوں نے اپنا موبائل بند کر رکھا ہے۔'' پولیس افسر نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

اس بات سے میں کچھ پریشان ہوا۔ میرے خیال کے مطابق عندلیب نے ثریا کو یہ بیان دینے پر آمادہ کرنے کے بعد ہی مجھ سے اس کا نام لینے کے لیے کہا تھا۔

''ان کے گھر فون کر لیجیے!'' میں نے خود کو پُرسکون رکھنے کی کوشش کی۔ ''معلوم ہو جائے گا کہ وہ کہاں ہیں، اور شاید وہ گھر پر ہی ہوں کسی وجہ سے موبائل بند کر دیا ہوگا انہوں نے۔ ٹیلی فون ڈائرکٹری سے بریگیڈیئر جلال بیگ کے گھر کے بھی نمبرز معلوم ہو جانے چاہئیں۔''

''مجھے معلوم ہے۔'' پولیس افسر نے کہا اور موبائل پر پھر کوئی نمبر ملانے لگا۔

میں بہ دستور کچھ پریشان رہا۔ میرے خیال کے مطابق اس وقت ثریا کو اپنا موبائل بند نہیں کرنا چاہیے تھا۔

پولیس افسر نے جو فون ملایا تھا، اس پر اس نے جو مختصر گفتگو کی، وہ میری دانست میں ثریا نہیں ہو سکتی تھی۔ جو باتیں ہوئی تھیں ان سے میری پریشانی میں اضافہ ہو گیا۔

''سن لیا آپ نے!'' پولیس افسر نے مجھے تیز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''وہ چار پانچ دن کی چھٹی پر ہیں اور آرام کرنے کے لیے کاغان چلی گئی ہیں۔ ان کے گھر سے مجھے یہ بات ان کے والد نے بتائی ہے۔''

''ناممکن۔'' میں نے لہجے میں مضبوطی پیدا کرنے کی

کوشش کی۔ ''کل کلب میں ایک خاص تقریب تھی۔ وہاں موجود دوسرے مہمان بھی اس کی تصدیق کریں گے کہ ثریا کل اس تقریب میں شریک تھی۔''

''آپ انہیں کب سے جانتے ہیں؟''

''کالج کے زمانے سے۔'' میں نے عندلیب کی ہدایت کے مطابق جواب دیا۔ ''وہ مجھ سے جونیئر تھی لیکن ہماری اچھی خاصی دوستی ہوگئی تھی۔''

''خیر!'' پولیس افسر نے اپنے دائیں ہاتھ میں دبا ہوا رول بائیں ہتھیلی پر مارتے ہوئے کہا۔ ''یہ تو ایک لمبا مرحلہ ہے کہ ہم کلب کے لوگوں سے ملیں اور کلب میں مس ثریا کی موجودگی کی تصدیق کریں۔ فی الحال تو میرا خیال یہ ہے کہ آپ نے مس ثریا کا نام لے کر مجھے مرعوب کرنے کی کوشش کی تھی۔ شاید آپ کا خیال ہوگا کہ میں ان سے تصدیق ضروری نہیں سمجھوں گا اور آپ کے بیان پر یقین کرلوں گا۔''

''میرا یہ خیال ہرگز نہیں تھا۔'' میں نے لہجے میں سختی پیدا کی۔

''بہرحال۔'' پولیس افسر نے کہا۔ ''اب آپ کو میرے ساتھ پولیس اسٹیشن چلنا پڑے گا۔''

میں نے پولیس افسر سے الجھنے کے بجائے یہ زیادہ مناسب سمجھا کہ عندلیب کو اس صورت حال سے آگاہ کروں۔

''ٹھیک ہے۔'' میں نے خود کو پُرسکون ظاہر کرنے کی کوشش کی۔ ''چلتا ہوں میں آپ کے ساتھ، لیکن مجھے کپڑے تبدیل کرنے ہوں گے۔''

''کپڑے آپ ضرور تبدیل کریں لیکن جلدی۔'' پولیس افسر نے خشک لہجے میں کہا۔

میں اٹھا اور تیزی سے چلتا ہوا ڈرائنگ روم سے نکل کر اپنے کمرے میں پہنچا۔ موبائل پر میں نے فوراً عندلیب سے رابطہ قائم کیا اور شکر ہے کہ اس وقت اس کا موبائل بند نہیں تھا۔

''میں سمجھ رہی ہوں کہ تم نے مجھے کس پریشانی میں فون کیا ہوگا۔'' عندلیب نے کہا۔ ''جو گڑبڑ ہوگئی ہے، اس کے بارے میں تمہیں بعد میں بتاؤں گی۔ فی الحال تم ان لوگوں کے ساتھ پولیس اسٹیشن پہنچو۔ میں دیکھتی ہوں کہ اس عراقی..... میرا مطلب ہے اس ماڈل گرل.....''

میں نے تیزی سے کہا۔ ''تم نے اچانک اپنی بات بدل دی۔ عراقی کیوں کہا تھا تم نے؟''

عندلیب نے طویل سانس لی۔ ''یہ سب کچھ میں تمہیں بعد میں بتاتی۔ بے خیالی میں نکل گیا یہ لفظ میرے منہ سے۔''

''تو اب تفصیل بتادو۔''

''وہ ایک عراقی کرد ہے۔ چند سال قبل صدام حسین کی عسکری زیادتیوں سے گھبرا کے اس کے مختصر خاندان نے ایران کی طرف ہجرت کی تھی۔ یہ معلومات میں نے کسی طرح رات ہی کو حاصل کرلی تھیں۔ ایران میں پناہ نہ ملی تو زرینہ یہاں آگئی اور کچھ ہی عرصے بعد اس نے ماڈل گرل کا پیشہ اختیار کرلیا۔ بس اب اور زیادہ کچھ نہ پوچھو۔ پولیس اسٹیشن پہنچو۔ میں دیکھوں گی کہ تمہیں اس عراقی ماڈل گرل کے اس الزام سے کس طرح بچایا جاسکتا ہے۔''

میں نے پھر کچھ کہنا چاہا لیکن عندلیب سلسلہ منقطع کرچکی تھی۔ میں نے اس سے دوبارہ بات کرنے کے لیے رابطے کی کوشش نہیں کی اور جلدی جلدی کپڑے تبدیل کرنے لگا۔

عندلیب سے زیادہ بات نہ ہونے کے باوجود میرے جسم میں عجیب سی سنسناہٹ پھیل گئی تھی۔ ایران کا حوالہ ایک بار پھر میرے سامنے آیا تھا۔ گو کہ عندلیب کے بیان کے مطابق زرینہ عراقی کرد تھی لیکن یہاں تو وہ ایران ہی سے آئی تھی۔

مجھے خیال آیا کہ یہ حالات کہیں مجھے کشاں کشاں ایران نہ پہنچادیں؟

کپڑے تبدیل کرکے میں اپنے کمرے سے نکلا ہی تھا کہ موبائل فون پر راجو کی کال آگئی۔

''اس وقت کیسے فون کیا تو نے؟'' میں نے چونک کر پوچھا۔

''کیوں؟'' راجو نے کھردرے لہجے میں کہا۔ ''مجھے فون کرنے کے لیے کیا اب مجھے اس کے لیے تجھ سے نا اجازت لینی پڑے گا؟''

''عندلیب نے تو فون نہیں کیا تجھے؟'' میرے قدم ڈرائنگ روم کی طرف بڑھ رہے تھے۔

''نہیں۔'' اس مرتبہ راجو کا انداز چونکا ہوا تھا۔ ''کوئی خاص بات؟''

''ایک ماڈل گرل زرینہ نے مجھ پر الزام لگایا ہے کہ میں نے کل رات اس سے کچھ بدتمیزی کی تھی اور پھر اس نے تعاقب بھی کیا تھا۔ وہ میرے نام سے ناواقف تھی لیکن اس نے میری کار کا نمبر پولیس کو بتادیا تھا۔ اب پولیس میرے پاس پہنچ گئی ہے اور مجھے شناخت کے لیے پولیس اسٹیشن لے جارہی ہے۔ زرینہ وہاں آئے گی مجھے شناخت کرنے۔''

''کس پولیس اسٹیشن میں؟'' راجو نے جلدی سے پوچھا۔

میں نے اسے پولیس اسٹیشن کا نام بتا دیا جہاں میں نے زرینہ کو جاتے دیکھا تھا۔

''چل ٹھیک ہے۔'' راجو نے کہا۔ ''میں آتا ہوں وہاں!''

''اس کی ضرورت نہیں ہے۔'' میں نے جلدی سے کہا۔

دراصل مجھے خیال آیا تھا کہ پولیس کا ایک بڑا حلقہ راجو کو پسند نہیں کرتا اس لیے اگر پولیس اسٹیشن میں بھی راجو کو پہچان لیا جاتا تو میری پوزیشن کم زور پڑ سکتی تھی لیکن راجو کے انداز سے ظاہر ہو گیا کہ وہ میری بات نہیں مانے گا۔ اس نے رابطہ منقطع کر دیا۔

میں سوچ میں غلطاں و پیچاں ڈرائنگ روم میں داخل ہوا۔ مجھے دیکھتے ہی پولیس افسر اور س کے ساتھ ہیڈ کانسٹیبل بھی کھڑا ہو گیا۔

پولیس اسٹیشن جانے کے لیے میں اپنی کار کو ترجیح دیتا لیکن کار تھی نہیں۔ مجبوراً مجھے پولیس کار میں بیٹھنا پڑا۔ عید و بابا کو میں نے یہ کہہ کر مطمئن کر دیا تھا کہ میں اپنی کار لینے پولیس اسٹیشن جا رہا ہوں۔

راستے میں پولیس افسر نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی اور میں نے بھی اسے مخاطب کرنا ضروری نہیں سمجھا۔ یہ خیال تو میرے لیے ہیجان انگیز تھا ہی کہ عراقی کرد زرینہ ایران سے یہاں آئی تھی لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ سوال بھی مجھے الجھا رہا تھا کہ ثریا نے عندلیب کو دھوکا کیوں دیا؟

عندلیب نے کہا تھا کہ تفصیلات وہ مجھے بعد میں بتائے گی اور ویسے بھی وہ زیادہ باتیں کرنے کا موقع تھا بھی نہیں۔

پولیس کار جب پولیس اسٹیشن کے احاطے میں داخل ہوئی تو میں سوچ رہا تھا کہ راجو نے اگر فون اپنے گھر سے کیا تھا تو وہ ابھی یہاں نہیں پہنچا ہوگا۔ اسے مجھ سے زیادہ فاصلہ طے کرنا پڑتا لیکن مجھے توقع یہی تھی کہ وہ طوفانی رفتار سے موٹر سائیکل چلا کر یہاں پہنچے گا۔ اسے شاید دو چار منٹ اور لگتے۔ میں اب بھی پریشان تھا کہ اس کے آنے سے میری پوزیشن پر کیا اثر پڑے گا اور یہ بات بھی میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ اس نے یہاں پہنچنا کیوں ضروری سمجھا تھا۔ یہ انداز تو اسے خود بھی ہونا چاہیے تھا کہ اس کی وجہ سے میری پوزیشن پر کیا اثر پڑ سکتا ہے!

مجھے پولیس افسر نے اپنے کمرے میں لے جا کر بٹھایا۔

میں نے سب خیالات اپنے ذہن سے جھٹک کر پولیس افسر کی طرف دیکھتے ہوئے طنزیہ انداز میں کہا۔ ''کب تک آئیں گی آپ کی مس زرینہ؟''

''انہیں تو ہم سے پہلے پہنچ جانا چاہیے تھا۔'' پولیس افسر کے انداز سے فکر مندی کا اظہار ہوا۔ ''میں نے آپ کے سے ہی انہیں فون کر دیا تھا۔ خیر، دو چار منٹ میں آ جانا چاہیے انہیں!'' پھر یکا یک پولیس افسر کا لہجہ طنزیہ ہو گیا۔ ''کیا جلدی ہے آپ کو؟''

''جلدی نہ بھی ہو تو میں بلاوجہ اپنا وقت ضائع نہیں کر سکتا۔'' میں نے بھی تیکھا لہجہ اختیار کیا اور پھر پوچھا ''میری کار کہاں ہے؟''

''وہ تو اسی پولیس اسٹیشن میں ہے جہاں آپ نے کے بارے میں رپورٹ درج کرائی تھی۔ وہیں سے ملے آپ کو!..... لیکن اگر مس زرینہ نے آپ کو شناخت کر صورتِ حال بدل بھی سکتی ہے۔ پھر شاید آپ کو اپنی کار ملنے میں کچھ دیر لگے۔''

میں منہ بنا کر دوسری طرف دیکھنے لگا۔ میں ظاہر چاہتا تھا کہ میں بالکل پریشان نہیں ہوں لیکن حقیقت یہ تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب عندلیب میرے کے لیے کیا کر سکے گی۔

پولیس افسر اپنی کرسی سے اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ وہ بار بار پر بھی نظر ڈال رہا تھا۔

یکا یک چٹخ اٹھا کر راجو کمرے میں داخل ہوا۔

''تم!'' پولیس افسر چونکا۔ ''تم یہاں کیسے؟''

''کیوں؟'' راجو نے اسے خشمگیں نظروں سے

''میں یہاں کیوں نہیں آ سکتا؟..... میں نے پولیس کے دروازے پر ایسا کوئی نوٹس بورڈ نہیں دیکھا جس ہو کہ یہاں میرے داخلے پر پابندی لگائی جا چکی ہے۔''

پولیس افسر بگڑ کر پھر کچھ کہتا لیکن میں جلدی سے پڑا۔ ''انہیں میں نے بلایا ہے فون کر کے۔ دوست میرے!''

''اوہ!'' پولیس افسر کے ہونٹ سکڑ گئے۔ اس خاص انداز میں میری طرف اور پھر راجو کی طرف دیکھا۔

راجو میری کرسی کے قریب آ گیا۔

''بہت خوب!'' پولیس افسر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نظر آئی۔ وہ میری طرف دیکھتا ہوا بولا۔ کے دوست ہیں آپ کے تو مجھے ابھی سے یقین کر لینا کہ آپ پر جو الزام لگایا گیا ہے، وہ صرف الزام نہیں ہی ثابت ہوگا۔''

راجو نے پولیس افسر کی طرف دیکھا۔ مجھے لگا سخت بات کہے گا۔ میں نے جلدی سے اس کا ہاتھ پکڑ

دیا۔

''بیٹھ جا!'' میں نے قریب کی دوسری کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

''نہیں۔'' راجو نے سرد لہجے میں کہا۔ ''پولیس اسٹیشنوں کی کرسیاں مجھے سخت ناپسند ہیں۔''

پولیس افسر نے اس کی طرف بڑی کڑی نظروں سے دیکھا لیکن اسی وقت اس کی توجہ ایک آواز کی طرف مبذول ہو گئی۔ وہ آواز ایسی تھی جیسے پولیس اسٹیشن کے احاطے میں کوئی کار آ کر رکی ہے۔

''غالباً مس زرینہ آ گئی ہیں۔'' پولیس افسر نے کہتے ہوئے غور سے میری طرف دیکھا۔ میرا خیال ہے کہ وہ میرے چہرے پر کسی خاص قسم کے تاثرات دیکھنے کی توقع کر رہا تھا لیکن اسے مایوسی ہی ہوئی ہوگی۔ اس وقت میرے دماغ میں صرف یہ سوال گردش کر رہا تھا کہ عراق کے کرد قبیلے کی لڑکی یہاں آ کر ماڈل گرل کیسے بن گئی۔ ماڈل گرل بننے کے لیے ماڈرن بلکہ شاید الٹرا ماڈرن بننا ضروری ہوتا ہے جبکہ میری معلومات کے مطابق کرد قبائل کے لوگ بہت پس ماندہ تھے۔

کمرے کی طرف آتی ہوئی سینڈلوں کی آواز سے صاف ظاہر ہو گیا کہ اس طرف تیزی سے آنے والا کوئی مرد نہیں ہو سکتا۔

جلد ہی وہ کمرے میں داخل ہوئی اور میں نے اسے پہچان بھی لیا۔ میں اسے ٹی وی کمرشلز میں دیکھ چکا تھا۔ وہ ایک ایسا لباس پہنے ہوئے تھی جسے کوئی نام نہیں دیا جا سکتا کیونکہ وہ کسی بہترین بوتیک کی اپنی اختراع تھا۔ وہ خاصے گہرے میک اپ میں نہ ہوتی تو بھی اس کے نقش و نگار سے اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ وہ کافی خوب صورت لڑکی ہے۔ اس کی عمر کے بارے میں چوبیس پچیس سال کا اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔

''یس آفیسر!'' وہ اندر قدم رکھتے ہی بولی کیونکہ اس کی سب سے پہلے پولیس افسر ہی پر پڑی تھی۔ اردو بولتے ہوئے اس کا لہجہ بہت شفاف تھا۔ کوئی گمان بھی نہیں کر سکتا تھا کہ وہ کوئی کرد لڑکی ہوگی۔

''ادھر دیکھیے مس زرینہ!'' راجو نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بلند آواز میں کہا۔ ''یہ میرا دوست جس کے بارے میں آپ کا بیان ہے کہ اس نے آپ سے بدتمیزی کی تھی۔''

وہ راجو کی آواز سن کر چونکی اور مجھے ایسا لگا جیسے وہ راجو کو دیکھ کر کچھ گڑبڑا گئی ہو لیکن یہ بس شبہ ہی تھا میرا۔ ممکن ہے ایسا نہ ہو۔ شاید اس کے چہرے کے تاثرات مجھے دیکھ کر بدلے ہوں یا کوئی اور بات ہو

''مس زرینہ!'' پولیس افسر بولا۔ ''آپ نے جس کار کا نمبر بتایا تھا، اس کے مالک یہی ہیں اور آپ نے جو حلیہ اور وضع قطع نوٹ کروائی تھی، وہ بھی انہی کے مطابق ہے۔ ان کا نام راؤ پرویز ہے۔''

''نہیں۔'' زرینہ جلدی سے بولی۔ ''یہ وہ صاحب نہیں ہیں جنہوں نے مجھ سے بدتمیزی کی تھی اور میرا تعاقب کیا تھا۔''

میں پلکیں جھپکائے بغیر زرینہ کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ میرے سان گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ فوری طور پر ایسا جواب دے گی کہ میں پولیس کی زد میں آنے سے صاف بچ جاؤں گا۔

خود پولیس افسر کے چہرے پر بھی اس کے جواب سے ایسے مایوسانہ تاثرات ابھرے تھے کہ معلوم ہوتا تھا جیسے اس کے چہرے پر پھٹکار برس پڑی ہو۔

زرینہ نے ایک نظر راجو کو اور پھر مجھ پر ایک اچٹتی سی نظر ڈال کر پولیس افسر کی طرف دیکھتے ہوئے اپنی بات میں اضافہ کیا۔ ''میں نے تو ان صاحب کو شاید پہلے کبھی دیکھا بھی نہیں۔''

یہ موقع تھا جب میں پولیس افسر پر واقعی طنز کر سکتا تھا۔

''غالباً یہ کہا جا سکتا ہے کہ پولیس افسر کی حیثیت سے آپ انسان کو سمجھنے کی بڑی پرکھ رکھتے ہیں؟'' میں نے کہا۔

پولیس افسر کے چہرے پر جھنجلاہٹ اور غصے کے تاثرات نظر آئے۔

''آپ جا سکتے ہیں۔'' اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے جھنجلاتے سے کہا۔

''جا تو سکتا ہوں میں لیکن میرے وقت کی بربادی کا ذمے دار کون ہے؟''

''آپ کی کار چوری کر کے کسی نے مس زرینہ کا تعاقب کیا تھا لہٰذا آپ پر شبہ کیا جانا ایک فطری بات ہے۔'' پولیس افسر مجھے گھورتا ہوا بولا۔ ''اگر آپ چاہیں تو حکام بالا سے میری شکایت کر دیں، مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔''

''میرا دوست لوگوں کو معاف کر دینے کا عادی ہے۔'' راجو نے پولیس افسر کی طرف دیکھتے ہوئے اس انداز میں کہا جیسے اس کا مضحکہ اڑانا چاہتا ہو۔

پولیس افسر راجو سے غالباً کوئی سخت بات کہنا چاہتا تھا مگر

کسی خیال سے رک گیا اور اس نے اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔

''کیا کسی نے آپ کی کار چوری کرلی تھی؟'' زرمینہ نے میری طرف دیکھتے ہوئے بڑی معصومیت سے پوچھا۔

میں اسے جواب دیے بغیر کھڑا ہوگیا اور راجو سے بولا۔

''موٹر سائیکل تو ہوگی نا تیرے پاس؟''

''ہاں، کیوں!''

''ایک اور پولیس اسٹیشن چلنا ہے۔ میری کار وہیں ہے، اس کی چوری کی رپورٹ میں نے وہیں درج کروائی تھی۔ وہ مجھے ملے گی بھی وہیں سے۔''

راجو نے سر کی جنبش سے مجھے چلنے کا اشارہ کیا اور دروازے کی طرف قدم بڑھا دیے۔

''آپ کی وجہ سے خواہ مخواہ وقت برباد ہوا ہے پولیس کا!'' پولیس افسر نے اپنی جھنجلاہٹ زرمینہ پر اتارنا چاہی۔

''کیا مطلب!'' زرمینہ کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں۔

''اس میں میری کوئی غلطی تو نہیں ہے!..... میں نے کسی کے خلاف رپورٹ درج کرائی تھی تو کیا یہ ضروری ہے کہ آپ کسی کو بھی پکڑ لائیں اور میں کہہ دوں کہ آپ نے صحیح آدمی پکڑا ہے۔''

ان دونوں میں تلخی کس حد تک بڑھی یا بڑھی بھی یا نہیں، مجھے اس کا علم نہیں ہوسکا۔ راجو میرے کندھے پر ہاتھ رکھے مجھے تقریباً دھکیلتا ہوا اس کمرے سے باہر لے آیا تھا۔

احاطے میں کھڑی ہوئی اپنی موٹر سائیکل کا انجن اسٹارٹ کرتے ہوئے راجو نے پولیس اسٹیشن کے دروازے پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالی۔ میں اس کے پیچھے بیٹھ چکا تھا۔ قریب ہی میں نے وہ اسپورٹس کار بھی کھڑی دیکھی جو زرمینہ ہی کی ہوسکتی تھی اور جس کا میں نے گزشتہ روز تعاقب اس خیال سے کیا تھا کہ اس میں کوئی لڑکی اغوا کی جارہی تھی۔

مجھے یاد آیا کہ اس وقت کلب کے احاطے میں آکر رکنے والی کار سے جو ایک جوڑا اترا تھا، اس نے بھی لڑکی کے چیخنے کی آواز سنی تھی۔ ان دونوں نے چونک کر اسپورٹس کی طرف دیکھا بھی تھا لیکن اب تک ایسی کوئی بات سامنے نہیں آئی تھی جس سے اندازہ ہوتا کہ انہوں نے پولیس اسٹیشن میں اس واقعے کی رپورٹ درج کرائی ہو۔ غالباً انہوں نے رپورٹ کرائی ہی نہیں تھی جس کا صرف یہی ایک سبب ہوسکتا تھا کہ لوگ اب اس قسم کے معاملات میں الجھنے سے ڈرنے لگے تھے۔ ایک تو پولیس کی تحقیقات کے غلط انداز سے ان کا وقت بہت برباد ہوتا تھا اور بعض اوقات لینے کے دینے بھی پڑ جاتے تھے۔ بعد میں معلوم ہوتا ہے کہ جس کے خلاف رپورٹ درج کروائی گئی تھی، وہ کوئی بے حد بارسوخ آدمی اور آج کا دور انہی لوگوں کا ہے جن کی پہنچ ''اوپر'' تک ہے۔

راجو مجھے لیے ہوئے اس پولیس اسٹیشن پہنچا جہاں مجھے اپنی کار لینی تھی۔ متعلقہ پولیس افسر نے مجھے مشکوک نظروں سے دیکھا، غالباً اس کے علم میں تھا کہ میں کسی الزام تراشی کے باعث قانون کی زد میں آگیا تھا لیکن میں اسے یہ بھی معلوم ہوگیا ہوگا کہ میں قانون کی زد سے نکل چکا تھا۔ اسی لیے مجھے اپنی کار لینے میں کوئی دشواری پیش نہ آئی۔ بس رسمی کارروائی ہوئی جس میں ذرا سا وقت لگا۔

''کہیں بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔'' راجو نے مجھ سے کہا۔

قریب ہی ایک صاف ستھرا ریستوران تھا۔ ہم وہیں جا بیٹھے۔ میں خود بھی راجو سے دو ایک باتیں کرنے کے لیے بے چین تھا۔

''یہ زرمینہ.....'' میں نے کچھ رک کر راجو کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کیا تجھے جانتی ہے؟''

''یہ خیال تجھے کیوں آیا؟'' راجو دھیرے سے ہنسا۔

''مجھے ایسا لگا تھا کہ وہ تجھے دیکھ کر بوکھلا گئی تھی، اور اس وقت تو میں حیران ہی رہ گیا جب اس نے مجھے شناخت کیا۔''

''جب میں نے تجھے فون کیا تھا تو تو نے ایسی کوئی بات کہی تھی جس سے میں اندازہ لگا چکا تھا کہ اس معاملے کے بارے میں تو اپنی ایس ڈی ایم صاحبہ کو سب کچھ بتا چکا ہے۔''

''تو اس سے کیا؟''

''اسی نے کچھ ایسا بندوبست کیا ہوگا کہ زرمینہ اپنا رویہ بدلنے پر مجبور ہوجائے۔''

اس امکان پر میں بھی غور کرچکا تھا لیکن زرمینہ کی بوکھلاہٹ نے مجھے اس شبہے میں مبتلا کیا تھا کہ وہ راجو کو جانتی تھی، بلکہ شاید اس سے ڈرتی بھی تھی۔ اسی لیے جب راجو نے مجھے اپنا دوست بتایا تو اس نے مجھے شناخت نہ کرنے کی اپنی عافیت سمجھی لیکن راجو اس سے انکار کررہا تھا اور عندلیب نے اس کے بعد سے اب تک مجھ سے رابطہ نہیں کیا تھا۔ مجھ سے رابطہ نہ کرنا میری دانست میں غیر فطری بات تھی۔

''زرمینہ کے بارے میں عندلیب نے مجھے ایک عجیب بات بتائی تھی۔'' میں نے راجو سے کہا۔ ''کیا اس پر یقین کیا جاسکتا ہے کہ یہ الٹرا ماڈرن ماڈل گرل ایک عراقی کردہ ہے؟''

''اچھا!'' راجو نے تعجب سے کہا۔ ''عراقی کردہ؟''

''ہاں۔''

پھر میں نے اسے وہ سب کچھ بتا دیا جو مجھے زرمینہ کے بارے میں عندلیب سے معلوم ہوا تھا۔ راجو نے سب کچھ سننے کے بعد سر ہلایا اور کچھ سوچنے لگا۔

میں نے گزشتہ رات زرمینہ کو سزا دینے کے لیے ایک منصوبہ سوچا تھا لیکن اب ان بدلے ہوئے حالات میں اس منصوبے پر عمل درآمد ایک فضول سی بات ہوتی۔

میں نے اور راجو نے چائے اور کافی ختم کی ہی تھی کہ میرے موبائل فون پر سامعہ کی کال آگئی۔

''کیسے ہیں آپ پرویز صاحب!'' اس نے خوش گوار لہجے میں ایک رسمی جملے سے گفتگو کی ابتدا کی۔

''میں ٹھیک ہوں، آپ سنائیں!''

''کل ڈیڈی مجھ پر بہت بگڑے تھے۔ انہوں نے مجھے تاکید کی ہے کہ میں اجنبیوں سے دور رہوں۔ آپ کا یہ خیال درست ہے کہ آپ کے بارے میں ان کی غلط فہمی دور نہیں ہوئی۔ وہ یہی سمجھ رہے ہیں کہ میرے اغوا میں آپ کا ہاتھ تھا۔ وہ کہہ رہے تھے کہ اگر ان کے پاس ثبوت ہوتا تو وہ آپ کو گرفتار کرانے میں دیر نہیں لگاتے!''

''اچھا!'' میں اس طرح ہنسا جیسے ان باتوں کی میری لیے کوئی اہمیت نہ ہو۔

راجو مجھے غور سے دیکھ رہا تھا اور غالباً اندازہ لگانے کی کوشش کررہا تھا کہ مجھ سے بات کرنے والی ہستی کس کی ہوسکتی تھی۔

''میں نے انہیں ایک بار تو سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ انہیں ضرور کچھ غلط فہمی ہوئی ہے۔ آپ تو دراصل ایک بہت اچھے پامسٹ اور علم نجوم کے ماہر ہیں لیکن جب وہ اس کے بعد بھی مجھ پر بگڑ گئے تو میں نے خاموشی اختیار کرلی۔ اگر میں ان سے بحث کرتی تو ان کا غصہ بہت بڑھ جاتا۔''

''اچھا کیا آپ نے! غصہ ور آدمیوں سے بحث نہیں کرنی چاہیے۔''

میں نے محسوس کیا کہ اب راجو کی پیشانی پر ایک شکن پڑ گئی تھی۔ کوئی اندازہ لگانے سے قاصر رہنے کے باعث اس کا ذہن الجھ گیا ہوگا۔

''آج کل تو میں کوشش کرتی ہوں کہ بہت ہی کم بات ہو ڈیڈی سے۔ چڑچڑے ہوگئے ہیں کچھ دن سے۔ اچھا خیر، یہ بتایئے۔ اب آپ سے ملاقات کیسے ہو؟''

''کب ملنا چاہتی ہیں آپ؟''

سامعہ سے میرا یہ سوال ایسا تھا کہ راجو نے ایک لمبی سانس لے کر کرسی کی پشت سے ٹیک لگالی۔

''میں تو جلد از جلد ملنا چاہتی ہوں لیکن ڈیڈی کا موڈ خراب ہے اور وہ گھر پر ہی ہیں۔ کیوں نہ ہم شام کو ملیں؟''

''شام کو آپ کے ڈیڈی نہیں ہوں گے گھر پر؟''

''شام کو وہ کہیں جائیں گے۔ فون پر کسی سے کہہ رہے تھے تو میں نے سنا تھا۔''

''شام کو کس وقت؟'' میں نے پوچھا۔

''سات آٹھ بجے کے درمیان!''

''ساڑھے سات بجے کا وقت رکھ لیں۔ آٹھ بجے کہیں اور جانا ہے مجھے!''

''صرف آدھے گھنٹے کی ملاقات؟'' سامعہ کے لہجے میں مایوسی تھی۔

''آپ کو اندازہ نہیں ہے میری مصروفیات کا۔ زیادہ وقت کے لیے ہم پھر کبھی مل لیں گے۔ آپ مجھ سے آج ہی ملنے کی خواہش مند ہیں ورنہ میں کہتا کہ ملاقات چند دن بعد رکھی جائے۔''

''نہیں نہیں۔'' وہ جلدی سے بولی۔ ''چند دن بعد نہیں۔ میں ٹھیک ساڑھے سات بجے سفاری پارک پہنچ جاؤں گی۔''

''سفاری پارک؟''

''جی ہاں۔ دراصل میں چاہتی ہوں کہ شہر کی کسی عام جگہ پر ملاقات نہ ہو۔ اگر ڈیڈی کے کسی شناسا نے بھی دیکھ لیا تو ڈیڈی کو پتا چل جائے گا اور میری شامت آجائے گی۔''

''اچھا!'' میں نے اس طرح کہا جیسے سوچ میں پڑ گیا ہوں۔

''پلیز!'' وہ جلدی سے بولی۔ ''انکار نہ کیجیے گا۔''

''چلیں ٹھیک ہے۔ میں آجاؤں گا۔ ٹھیک ساڑھے سات بجے۔ وقت کا خیال رکھیے گا۔''

سامعہ خوش ہوگئی اور یہ بھی طے پاگیا کہ سفاری پارک میں ہماری ملاقات کس جگہ ہوگی!

موبائل بند کرتے ہوئے میں نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ راجو کی طرف دیکھا جو مجھے گھور رہا تھا۔

''ختم ہوگئی احمر کی محبت!'' وہ بولا۔ ''فلرٹ شروع کردیا کسی لڑکی سے!''

''یہ بازرگان کی بیٹی ہے۔''

''اوہ!''

''تجھے نہیں معلوم اس کے بارے میں!''

''مجھے؟ کیا مطلب؟''

''عندلیب نے اس بارے میں کچھ نہیں بتایا؟''

''تیری ایس ڈی ایم سے میری اتنی دوستی تو نہیں ہے!''

''کیوں بے دقوف بنا رہا ہے مجھے!'' میں نے منہ بنایا۔

''کیا مطلب؟''

''میں سمجھ چکا ہوں راجو کہ میرے ساتھ کوئی ڈراما کیا جا رہا ہے اور اس معاملے میں تو بھی مل گیا ہے عندلیب سے!''

''پتا نہیں کیا بک رہا ہے!'' راجو نے منہ بنایا۔

''چل چھوڑ! مجھے پروا بھی نہیں ہے اس کی!''

لیکن یہ میں نے غلط کہا تھا۔ پروا تو مجھے تھی اس کی! سوچ سوچ کر تھک چکا تھا اس کے بارے میں!

''یہ زرینہ.....'' میں نے کہنا چاہا لیکن اسی وقت میرا موبائل فون گنگنایا اور میں نے عندلیب کی کال ریسیو کی۔

''اب خیال آیا ہے تمہیں میرا جب میں حوالات میں بند کیا جا چکا ہوں۔'' میں نے کہا۔

دوسری طرف عندلیب ہنسنے لگی۔ پھر بولی۔ ''میں بے خبر نہیں ہوں کسی بات سے۔ کہو تو یہ بھی بتا دوں کہ تم اس وقت راجو کے ساتھ کس جگہ ہو!''

''یہ تم نے کیا چکر چلایا کہ زرینہ نے مجھے پہچاننے ہی سے انکار کر دیا!''

''اس کی یہ حرکت تو میرے لیے بھی حیران کن ہے۔''

''کیا مطلب!'' میں حیرت سے بولا۔ ''میں تو سمجھ رہا تھا کہ تم نے ہی اس پر کوئی دباؤ ڈلوایا ہے۔''

''مجھے اس سلسلے میں کچھ سوچنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ راجو نے مجھ سے فون پر کہا تھا کہ میں اس طرف سے بے فکر ہو جاؤں، وہ سنبھال لے گا سارا معاملہ!''

''اوہ!'' میری حیرت میں اضافہ ہوا اور میں نے ایک جھلکے سے نظریں اٹھا کر راجو کی طرف دیکھا جو میری اور عندلیب کی گفتگو سے بے نیاز اپنے دائیں ہاتھ کے ناخن دیکھ رہا تھا۔

''اسی لیے میں نے کچھ نہیں کیا!'' عندلیب نے بات جاری رکھی۔ ''لیکن یہ میری سمجھ میں بھی نہیں آیا کہ اس نے زرینہ کا بیان کیسے بدلوا دیا!''

''ابھی پوچھتا ہوں میں اس سے!'' میں راجو کو گھورتا رہا۔ ''تم مجھے ثریا کے بارے میں بتاؤ۔ وہ اچانک کہاں غائب ہو گئی؟''

''دراصل غلطی مجھ سے ہوئی تھی۔'' عندلیب نے جواب دیا۔ ''میں نے ثریا سے بات کیے بغیر تم سے کہہ دیا تھا کہ وہ تمہارے حق میں بیان دے دے گی۔ بعد میں مجھے پتا چلا کہ وہ دفتر سے واقعی چھٹی پر ہے۔ بہانہ اس نے یہی بنایا ہے کہ وہ چند دن آرام کرنے کے لیے کاغان جا رہی ہے، اپنا موبائل اس نے بند کر رکھا ہے اور اس کے گھر پر کوئی فون کرتا ہے تو اسے بتا دیا جاتا ہے کہ وہ کاغان گئی ہوئی ہے۔ اب اگر وہ تمہارے حق میں بیان دیتی تو دفتر میں اس کا ریکارڈ خراب ہوتا۔''

''تو یہ راجو اگر کام نہ آتا تو مروا دیا تھا تم نے!''

''نہیں، میں کچھ اور کرتی۔ راجو سے پوچھ کر مجھے بھی بتانا کہ اس نے زرینہ کا بیان کیسے بدلوا دیا۔ میں بہت حیران ہوں۔''

''ابھی بات کروں گا میں اس سے!..... ابھی تم کہاں ہو؟''

''کیوں؟''

''آج تم مجھے کوئی معقول سا ریوالور دلوا دو۔ کچھ معلوم نہیں، کب کیا حالات ہو جائیں۔ یہ میرا سمتھ اینڈ ویسن تو کھلونا ہے ان حالات میں!''

''آج میں کچھ مصروف ہوں۔ کل پر رکھو یہ پروگرام!''

''اچھا ہاں! ابھی سامعہ کا فون آیا تھا۔''

''کیا بات ہوئی؟'' عندلیب نے جلدی سے پوچھا۔

میں نے وہ ساری باتیں دہرائیں جو فون پر ہو چکی تھیں۔

''میرا خیال ہے۔'' میں نے کہا۔ ''یہ بات تمہارے لیے اہم ہو سکتی ہے کہ بازرگان آج دن بھر اپنے گھر پر رہے گا۔''

''میرے لیے یہ زیادہ اہم ہے کہ شام کو تمہاری سامعہ سے ملاقات ہو گی۔'' عندلیب نے کہا۔ ''اگر تم اسے کافرستان کی سیاحت پر آمادہ کر سکو تو یہ بہت بڑا کام ہو گا۔ اور شاید یہ کچھ زیادہ مشکل بھی نہیں ہے۔ مہم جویانہ فطرت تو ہے اس کی۔''

''یہ کام تو میں کسی حد تک کر بھی چکا ہوں۔ بتایا تو تھا میں نے تمہیں!''

''کیا کرنا ہو گا اسے!''

''اگر وہ آمادہ ہو جاتی ہے تو کیا یہ ممکن ہے کہ وہ اپنے باپ سے چھپ کر اتنی دور کا سفر کر سکے؟''

''نتیجہ جو کچھ بھی نکلے، میں اس کا انتظار کروں گی۔''

''اچھا اب میں فون بند کر رہا ہوں۔ راجو سے نمٹنا ہے ابھی مجھے!''

''او کے!'' عندلیب نے کہا اور رابطہ منقطع کر دیا۔

میں اپنا موبائل جیب میں رکھ کر راجو کو گھورنے لگا۔

''اب کیا کہے گا تو؟ عندلیب سے معلوم ہو گیا مجھے۔ تو نے اس سے کہا تھا کہ میرا معاملہ سنبھال لے گا، یعنی زرینہ کے سلسلے میں!''

''تو پھر؟''

''تو نے کہا تھا کہ یہ کام عندلیب نے کیا ہو گا لیکن زرینہ مجھے دیکھ کر بوکھلائی تھی۔ اب میں سمجھ گیا ہوں ساری بات! تو نے اس کے سامنے مجھے اپنا دوست کہا تھا۔ تیرا کوئی دباؤ ضرور ہے اس پر لہٰذا اس نے گھبرا کر مجھے بے قصور قرار دے دیا۔''

''شرلک ہومز کی طرح قلابے نہ ملایا کر!'' راجو نے منہ بنایا۔ ''چل اب چلیں یہاں سے!''

''تو.....'' میں اسے گھورتا رہا۔ ''نہیں بتائے گا تو؟''

''کیا بتاؤں؟''

''زرینہ کو کب سے جانتا ہے۔''

''بہت عرصے سے۔'' راجو سنجیدہ نظر آنے لگا۔

''اور اس پر تو نے حیرت ظاہر کی تھی جب میں نے بتایا تھا کہ وہ ایک عراقی کرد ہے۔''

''ہوں۔''

مجھے اس وقت حیرت ہوئی۔ ایسا لگا جیسے راجو اچانک کچھ افسردہ ہو گیا ہو۔

''چل اب چلتے ہیں۔'' راجو اچانک کھڑا ہو گیا۔

اس کی اچانک افسردگی سے میں اتنا پریشان ہوا کہ پھر اس سے زرینہ کے بارے میں کچھ معلوم کرنے کے لیے اس پر دباؤ نہیں ڈال سکا۔

ریستوران سے نکل کر راجو نے بڑے سپاٹ، رسمی سے انداز میں ''اچھا پھر ملیں گے'' کہا اور اپنی موٹر سائیکل کی طرف بڑھ گیا۔

میں ایک طرف کھڑا اسے جاتے دیکھتا رہا۔ جب اس کی موٹر سائیکل میری نظروں سے اوجھل ہو گئی تو میں ایک ٹھنڈی سانس لے کر اپنی کار کی طرف بڑھا۔ میرے دماغ میں چکرائے ہوئے سبھی خیالات و سوالات وقتی طور پر تو اس معمے میں دب گئے کہ راجو اور زرینہ کے تعلق میں کوئی ایسا پہلو بھی تھا جو راجو کو افسردہ کر سکتا تھا۔

حیرت مجھے اس پر بھی تھی کہ راجو کو میں نے کبھی افسردہ نہیں دیکھا تھا۔ ہاں البتہ کبھی کبھی اس کا چہرہ سپاٹ ضرور ہو جاتا تھا، ہر قسم کے جذبات سے عاری!

گاڑی چلاتے ہوئے مجھ پر زرینہ کی شخصیت منڈلاتی رہی۔ اتنی ماڈرن ماڈل گرل کا عراقی کرد ہونا اور پھر ایران کے راستے پاکستان آنا تو میرے لیے پُراسرار تھا ہی، اب راجو کی افسردگی کے باعث اس سریت کی دبازت کچھ اور بڑھ گئی۔

میں نے فیصلہ کیا کہ زرینہ کے ماضی کے بارے میں ضرور چھان بین کروں گا لیکن میں جن حالات سے دوچار تھا، ان میں اس کام کے لیے وقت نکالنا مجھے خاصا دشوار معلوم ہو رہا تھا۔

جب میں گھر پہنچا تو عید و بابا نے اس پر خوشی کا اظہار کیا کہ مجھے اپنی کار واپس مل گئی ہے۔

کچھ تھکن کا احساس ہونے کے باعث میں کپڑے تبدیل کر کے بستر پر لیٹ گیا۔

احمر سے آخری گفتگو گزشتہ رات ہوئی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ وہ آج کسی وقت مجھے فون کرے گی لیکن ابھی تک اس کا فون نہیں آیا تھا۔

میں اس سوال کو اپنے ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کرتا رہا کہ میرے ساتھ جو ڈراما کیا جا رہا ہے، اس میں احمر کیا کردار ادا کر رہی ہے اور کیوں ادا کر رہی ہے۔

دوپہر کے کھانے سے پہلے میں نے دوا کھائی اور کھانا کھانے کے بعد موبائل فون پر ایک اخبار کے دفتر سے رابطہ کیا۔ میرا اسکول کے زمانے کا ایک دوست جالب اسی اخبار میں رپورٹر کی حیثیت سے ملازم ہوا تھا اور اب اخبار کا چیف رپورٹر تھا۔ حالات نے اسے جرنلزم تو کیا، میٹرک کے بعد پڑھنے ہی نہیں دیا تھا لیکن اپنی ذہانت اور صلاحیتوں سے اس نے بہت جلد اپنا ایک مقام بنا لیا تھا۔ مجھے توقع تھی کہ اس سے زرینہ کے بارے میں کچھ نہ کچھ ضرور معلوم ہو جاتا۔ زرینہ بہرحال ایک ماڈل گرل تھی۔

مجھ سے زرینہ کا نام سنتے ہی جالب میرا مذاق اڑانے لگا۔ اسے فوری طور پر یہ خیال آیا تھا کہ اس خوب صورت ماڈل گرل کی زلف گرہ گیر مجھے اپنا اسیر بنا چکی ہے لیکن میں اسے یہ باور کرانے میں کامیاب رہا کہ ایسی کوئی بات ہرگز نہیں دراصل وہ ایک بہت سنجیدہ معاملہ تھا جس کے باعث مجھے زرینہ کے بارے میں معلومات درکار تھیں۔

میری باتوں سے جالب سنجیدہ ہوا اور اس نے مجھے زرینہ کے بارے میں خاصی معلومات حاصل ہو گئیں۔ اس نے تصدیق کی کہ زرینہ پیدائشی کرد اور عراق کی رہنے والی تھی جس نے اپنے مختصر خاندان کے ساتھ عراق سے ایران کی طرف ہجرت کی تھی۔ اس سفر میں اس کے جو عزیز اس کے ساتھ تھے، وہ ایران نہ پہنچ سکے، راستے ہی میں صدام حسین

کے فوجیوں کے ہاتھوں مارے گئے۔ صرف زرینہ ہی زندہ سلامت ایران پہنچ سکی تھی۔ پھر جب اسے ایران میں پناہ مل سکی تو اس نے پاکستان کا رخ کیا۔ یہاں کافی پہلے سے آباد ایک ایرانی خاندان نے اس کی مدد کی اور اسے یہاں کے شہری حقوق دلوا دیے۔

جالب مجھے اس ایرانی خاندان کے بارے میں کچھ نہ بتا سکا تاہم اس نے مجھ سے وعدہ کیا کہ وہ اس بارے میں چھان بین کر کے جلد ہی مجھے آگاہ کرے گا۔

جالب کے بیان کے مطابق بہت اچھے لوگوں کے خاندان میں اگر کوئی برا بھی ہو تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ جس نیک دل خاندان نے ایک ستم رسیدہ اور حالات گزیدہ عراقی کردلڑکی کی مدد کی تھی، اسی خاندان کے ایک معمر شخص رامین فیضی نے زرینہ کو اپنی داشتہ بنالیا۔ اس کی اسی حرکت کے باعث اس کے خاندان کے لوگوں نے اس سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ناتا توڑ لیا تھا۔

رامین فیضی کی داشتہ بننے کے کچھ ہی عرصے بعد زرینہ نے ماڈل گرل بننے کی کوششیں شروع کیں۔ اسی لائن کے ایک نوجوان ہاشم نے اس کی مدد بھی کی لیکن رامین فیضی نے اس کی نیت پر شبہ کیا اور نشے کے عالم میں اسے گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ اب رامین فیضی عمر قید کی زندگی گزار رہا تھا۔

ہاشم کے قتل کا مقدمہ چلا تھا تو اخبارات نے زرینہ کو خاصا ایکسپوز کیا تھا۔ یہی چیز زرینہ کے کام آگئی۔ اس کی خوب صورتی نے بہت سے لوگوں کو متاثر کیا اور اسے ماڈل گرل کی حیثیت سے کام کرنے کے کئی مواقع ایک ہی وقت میں مل گئے۔ ہاشم کے قتل میں اس کا دامن بالکل صاف تھا لہٰذا مقدمہ ختم ہوتے ہی اس نے کام شروع کر دیا۔ اپنی صلاحیتوں کی وجہ سے وہ بہت جلد مقبول بھی ہوگئی۔ جب وہ رامین فیضی کی داشتہ تھی، انہی دنوں میں اس نے اردو سیکھنے کے لیے ایک نہایت قابل ٹیچر کی خدمات حاصل کی تھیں لیکن یہ خود اس کی ذہانت تھی کہ وہ کسی اہلِ زبان کی طرح اردو بولنے پر قادر ہوگئی۔

''ماڈل گرل بننے کے بعد سے اب تک وہ کیا کرتی رہی ہے؟'' میں نے جالب سے پوچھا۔

''بس ماڈل گرل ہی کی حیثیت سے کام کرتی رہی ہے۔''

''میرا مطلب ہے..... رامین فیضی کے بعد بھی کسی سے اس کے تعلقات رہے ہیں یا نہیں؟''

''عجیب سوال کیا ہے تم نے!..... ارے اس لائن میں آنے کے بعد کیا لڑکیاں پارسائی کی زندگی گزارتی ہیں؟''

''میں یہی تو معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ اس عرصے میں اس کے تعلقات کس کس سے رہے ہیں؟''

''یہ تو لمبی ڈیوٹی لگا رہے ہو تم میری!'' جالب نے کہا۔ ''اتنی چھان پھٹک میں تو خاصا وقت لگ جائے گا۔''

''یار کچھ تو کرنا ہوگا۔'' میں نے اصرار کیا۔

''میری مصروفیات کا علم ہے تمہیں؟..... اچھا خیر چھوڑو۔ میں اپنے اخبار کے کسی اور رپورٹر کو لگا دیتا ہوں اس کام پر!''

''کچھ بھی کرو۔ میں یہ سب ضرور معلوم کرنا چاہتا ہوں۔''

''آخر معاملہ کیا ہے یار؟''

''کسی وقت ملوں گا تو اطمینان سے بتاؤں گا۔'' میں نے اسے ٹالا۔ یہ اسے بتایا ہی نہیں جا سکتا تھا کہ یہ معلومات حاصل کرنے کی ضرورت مجھے کیوں محسوس ہوئی تھی۔

جالب سے پکا وعدہ لے کر میں نے رابطہ منقطع کیا اور بستر پر لیٹا اپنے دماغ میں وہ ساری باتیں دہراتا رہا جو مجھے جالب سے معلوم ہوئی تھیں۔ ہر چند وہ زرینہ کے بارے میں اچھی خاصی معلومات تھیں لیکن یہ سمجھ میں نہیں آسکا تھا کہ اس ساری کہانی میں راجو کا کردار کہاں پوشیدہ تھا۔

میری دانست میں یہ بات یقینی تھی کہ راجو اور زرینہ ایک دوسرے سے واقف تھے اور زرینہ پر راجو کا کوئی دباؤ بھی تھا۔ اسی دباؤ کی وجہ سے وہ گھبرا گئی تھی اور اس نے راجو کے دوست کے خلاف بیان دینے کی جرأت نہیں کی تھی۔

مجھے اس کا بھی اندازہ تھا کہ کاشف کرمانی بری طرح تلملا گیا ہوگا۔ میری دانست میں ایک امکان یہ بھی تھا کہ وہ انتقاماً زرینہ کے خلاف کوئی قدم اٹھا بیٹھتا۔

اگرچہ گزشتہ رات میں خود بھی زرینہ کے خلاف کچھ کر گزرنے کا کوپروگرام بنا چکا تھا لیکن اب صورت حال کل رات سے مختلف تھی۔ ایک تو یہ کہ زرینہ ذاتی طور پر مجھے کوئی زک نہیں پہنچانا چاہتی تھی اور کاشف کرمانی کی محض آلۂ کار بنی تھی اور دوسرے یہ کہ اب اس نے اپنا بیان بدل ہی دیا تھا۔ اب تو شاید کسی حد تک یہ میری ذمے داری تھی کہ اسے کاشف کرمانی کی کسی انتقامی کارروائی سے محفوظ رکھنے کی کوشش کروں۔

میں نے ایک بار پھر جالب سے فون پر رابطہ کرنا چاہا۔ میں اس سے زرینہ کا پتا معلوم کرنا چاہتا تھا لیکن اس سے بات نہیں ہوسکی، وہ کسی میٹنگ میں تھا۔ میں جالب کا حوالہ

دے کر کسی اور رپورٹر سے بھی بات کر سکتا تھا لیکن زرینہ کے نام کی وجہ سے میں نے یہ مناسب نہیں سمجھا۔

میں بستر پر پڑا سوچتا رہا۔ وہ معاملات کچھ کم نہیں تھے جن پر میں سوچتا رہتا تھا۔ احمر پہلی بار مجھے عندلیب کے گھر میں نظر آئی تھی اور شاید میں پہلی ہی نظر میں اپنا دل ہار بیٹھا تھا۔ اس کا صحیح اندازہ مجھے اس وقت ہوا جب وہ میرے گھر میں آکر رہنے لگی تھی۔ میں اور راجو اسے کچھ خطرات سے نکال کر لائے تھے۔ خطرہ اسے ندرتی اور دیبارو کی وجہ سے تھا۔ ہم اسے جس بنگلے سے لائے تھے وہاں ہم نے زنگولا کو بھی دیکھا تھا۔ بعد ازاں اسے بھی قتل کرنے کی کوشش کی گئی تھی لیکن میں اور راجو اسے بھی اس کے گھر سے صحیح سلامت نکال لائے تھے، کافرستان کے رہنے والے زنگولا کی کہانی میرے لیے حیرت انگیز تھی۔ اس کے خیال کے مطابق احمر اس کے دیس کی شہزادی ثورتی تھی جس نے صدیوں پہلے اس وقت کے فرماں روا یعنی اپنے باپ کے خلاف بغاوت کی تھی اور اس کی حکومت ختم کر کے اپنے دیس کے باسیوں کو اس کے جبر و استبداد سے بچایا تھا۔ اب شہزادی ثورتی نے، زنگولا کے خیال کے مطابق دوسرا جنم لیا تھا۔ وہ اسی کو واپس لے جانے کے لیے آیا تھا۔ خواب میں اسے شہزادی ثورتی ہی نے بشارت دی تھی اور اس سے کہا تھا کہ وہ آکر اسے لے جائے تاکہ وہ اپنے دیس کو ''بیرونی جبر و استبداد'' سے بچا سکے۔ بیرونی استبداد سے زنگولا کی مراد ریاستِ چترال کے لوگوں سے تھی۔

دیبارو اور ندرتی کا تعلق ایران سے تھا اور یہ بات بھی سامنے آگئی تھی کہ احمر کا تعلق بھی ایران ہی سے تھا۔ وہ اپنی بہن فرخندہ اور ماں کے ساتھ ایران سے آئی تھی۔ ندرتی اور دیبارو اس کی ہلاکت چاہتے تھے اور اس معاملے میں ان کا ''ایکشن اسکواڈ'' بہت زیادہ فعال تھا جس کا سربراہ کمانڈر بازرگان تھا، لیکن دوسری طرف کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو احمر کو ہر قسم کے خطرے سے دور رکھنا چاہتے تھے۔ ان لوگوں میں سے وہ یعنی شیراز اور داریوش میری نظر میں آچکے تھے۔ احمر کا ذکر کرتے ہوئے وہ اسے بڑے احترام سے ''پرنسز احمر'' کہا کرتے تھے۔

یہ بات میرے لیے اور زیادہ چکرا دینے والی تھی۔ احمر کی شخصیت کا اسرار بڑھ گیا تھا۔ ایک طرف وہ کافرستان کی شہزادی ثورتی تھی تو دوسری طرف کہیں کی پرنسز!

اسی دوران میں کچھ ایرانی لوگوں کی ایک کونسل بھی سامنے آگئی تھی جس کی سربراہ مسز خان تھی۔ وہ احمر کو ندرتی اور دیبارو سے نہیں بلکہ شیراز اور داریوش سے بھی بچانا چاہتی تھی۔ عندلیب نے اس معاملے میں اس کونسل کا ساتھ دیا تھا لیکن وہ بھی میرے سامنے اسرار کے وہ پردے نہیں اٹھا سکی تھی جو احمر کی شخصیت پر پڑے ہوئے تھے۔ عندلیب نے اس سلسلے میں رازداری کا حلف لے رکھا تھا جو میرے لیے خاصی سنسنی خیز بات تھی۔

شیراز اور داریوش کسی طرح احمر سے رابطے میں بھی رہ چکے تھے۔ وہ احمر کو کسی بات کے لیے آمادہ کرنا چاہتے تھے لیکن احمر اس کے لیے تیار نہیں تھی۔ مسز خان اور اس کی کونسل بھی چاہتی تھی کہ احمر ان کی بات نہ مانے۔

میرے گرد چکرا دینے والے ان واقعات کا سلسلہ جاری تھا جب اچانک میرے گھر سے احمر اور فرخندہ کو اغوا کر لیا گیا۔ کچھ شواہد نے یہ اشارہ دیا کہ اس حرکت میں کمانڈر بازرگان اور اس کے ایکشن اسکواڈ کا ہاتھ تھا۔ احمر سے اپنی محبت کے باعث مجھ پر ایسی دہشت سوار ہوئی کہ میں کمانڈر بازرگان کے گھر پر چڑھ دوڑا۔ وہاں سے میں نے اور راجو نے بازرگان کی بیٹی سامعہ کو بے ہوش کر کے اغوا کر لیا۔ میرا خیال تھا کہ بیٹی کی خاطر بازرگان، احمر اور فرخندہ کو چھوڑنے کے لیے تیار ہو جائے گا لیکن مجھے اپنے اس مقصد میں کامیابی نہیں ہوسکی۔ ہمیں عندلیب کی مدد حاصل ہوگئی تھی لیکن بازرگان اپنی بیٹی سامعہ کو بچا لینے میں کامیاب ہوگیا تھا۔

میں اس معرکے میں بے ہوش ہوگیا اور جب مجھے پوری طرح ہوش آیا تو مجھے ایک ہفتے سے زیادہ ہو چکا تھا۔ ان دنوں میں جو واقعات گزرے تھے، وہ مجھے ایک پُراسرار اور خوف ناک خواب کی طرح یاد رہے تھے۔

یہ بات میری دانست میں بالکل واضح ہوگئی تھی کہ بازرگان وغیرہ کا تعلق ایران کے ایک قدیم مذہب سے تھا۔ وہ ایسی پُراسرار قوتوں کے مالک تھے جنہیں ''سحر'' کے سوا کوئی نام نہیں دیا جا سکتا تھا۔

ان لوگوں نے مجھے اندھیرے کا اور احمر کو روشنی کا قیدی بنا دیا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے ساتھ تھے لیکن روشنی اور اندھیرے کی ایک ''حد'' تھی جسے پار کر کے ہم ایک دوسرے کو چھو بھی نہیں سکتے تھے۔

پھر جب وہ لوگ احمر کو زبردستی کسی معبد کی قربان گاہ پر لے گئے تو وہ مدد کے لیے مجھے پکار رہی تھی۔ میں اس کے لیے موت سے بھی آنکھیں چار کر سکتا تھا لیکن اس کی مدد نہیں کر سکا۔ اندھیرے نے مجھے بری طرح جکڑ رکھا تھا۔ پھر جب جلاد نے احمر کی گردن اڑانا چاہی تو میرے حواس میرا

ساتھ چھوڑ گئے۔

راجو اور عندلیب نے مجھے بتایا تھا کہ پولیس نے مجھے ایک سڑک پر پڑا ہوا پایا تھا۔

یہ بات میری سمجھ میں نہیں آسکی تھی کہ ان لوگوں نے احمر کو ہلاک کر دیا تو مجھے کیوں چھوڑ دیا؟

احمر کے لیے میں بہت اداس تھا۔ اپنی زندگی مجھے بے معنی لگنے لگی تھی۔ راجو اور عندلیب اگر مجھے روکنے میں کامیاب نہ رہتے تو میں خودکشی کر لیتا۔ میری یہ ذہنی کیفیت اس وقت اچانک ختم ہوئی جب احمر نے فون پر مجھ سے رابطہ کیا۔ پھر اس سے میری ملاقاتیں بھی ہوئیں۔ مجھے اس کے ''نیک بابا'' کے بارے میں بھی معلوم ہوا جس نے اپنی ساحرانہ قوت سے نہ صرف احمر کو بلکہ مجھے بھی بازرگان وغیرہ سے بچالیا تھا۔

احمر کے بیان کے مطابق اس کے بابا کا تعلق بھی اسی مذہب سے تھا جس کے پیروکار بازرگان وغیرہ تھے لیکن بابا کو ان سے زیادہ ساحرانہ قوت حاصل تھی۔ وہ جس فلیٹ میں رہتے تھے، اسی میں انہوں نے احمر کو بھی رکھا تھا۔ احمر کے بیان کے مطابق وہ کوئی ایسی صورت کرنا چاہتے تھے کہ بازرگان وغیرہ کا خطرہ احمر کے سر سے ہمیشہ کے لیے ٹل جائے۔ اسی لیے وہ فی الحال احمر کو ہر ایک سے پوشیدہ رکھنا چاہتے تھے لیکن میرے لیے احمر کی بے چینی محسوس کر کے انہوں نے اسے مجھ سے ملنے کی اجازت دے دی تھی۔

احمر کو زندہ سلامت پا کر مجھے ایک نئی زندگی تو مل گئی تھی لیکن احمر کے ساتھ بہت زیادہ وقت گزرنے سے پہلے ہی میں الجھنوں کا شکار ہو گیا تھا۔ کچھ ایسی باتیں ہو چکی تھیں جنہوں نے مجھے اس شک میں ڈال دیا تھا کہ احمر کے حالات سے عندلیب بے خبر نہیں ہے۔ ان دونوں میں کم از کم ٹیلی فونک رابطہ ضرور رہتا ہے۔ یہ تو ابھی گزشتہ رات ہی کی بات تھی جب احمر نے مجھ سے موبائل فون پر کہا تھا کہ میں بہت تھک گیا ہوں گا اس لیے مجھے گھر جا کے آرام کرنا چاہیے۔

یہ میرے لیے چونکا دینے والی بات تھی کہ اسے میری تھکن کا علم ہو گیا تھا۔ مجھے زرینہ کے سلسلے میں جو بھاگ دوڑ کرنا پڑی تھی، اس کا علم عندلیب ہی کو تھا اور وہی احمر کو اس بارے میں بتا رہی تھی۔

لیکن مجھ سے یہ سب کچھ کیوں چھپایا جا رہا تھا؟ یہ میرے لیے ایک لاینحل سوال تھا۔ میری دانست میں عندلیب اچھی طرح جانتی تھی کہ احمر پر کیا گزری تھی اور اب وہ کہاں تھی۔ اس کے اطمینان کا ایک ثبوت یہ تھا کہ وہ کافرستان کے سفر پر روانہ ہونا چاہتی تھی اور یہ سفر صرف احمر یعنی زنگولا کی شہزادی ثورتی ہی کی وجہ سے کیا جا سکتا تھا۔ اس سفر میں یقیناً زنگولا بھی ساتھ ہوتا۔ اسے گولی لگی تھی اور اس کی زندگی کے لالے پڑ گئے تھے تو عندلیب اس کے لیے خاصی پریشان ہوئی تھی۔

دعوتِ فکر دینے والا ایک معما میرے لیے یہ بھی تھا کہ عندلیب نے کافرستان جانے کا پروگرام کیوں بنالیا تھا؟ کیا وہ وہاں احمر کو شہزادی ثورتی کے روپ میں پیش کرنا چاہتی تھی؟

اگر میں ذہنی طور پر ان سوالوں کے اثباتی رخ کی طرف جاتا تو یہ سوال پیدا ہوتا کہ عندلیب یہ سب کچھ کیوں کرنا چاہتی تھی؟

اور اب اس معمے میں ایک نیا چلبلا سا اشارہ یہ ملا تھا کہ عندلیب غالباً سامعہ کو بھی اس سفر کی طرف راغب کرنا چاہتی تھی۔ کمانڈر بازرگان کی بیٹی کے بارے میں عندلیب کا اس طرح سوچنا بھی میرے لیے چکرا دینے والی بات تھی۔

مجھے یہ اندازہ بالکل نہیں تھا کہ مسز خان بھی ان سب حالات سے باخبر ہو گی یا نہیں، البتہ خاصا قوی شبہ مجھے یہ ضرور تھا کہ مجھے حالات سے بے خبر رکھ کر جو ڈراما کیا جا رہا تھا، راجو کو اس کا علم تھا۔

گویا ہر بات میرے لیے پریشان کن ہی بنی ہوئی تھی۔ میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میرا دوست راجو، میرا ساتھ دینے کے بجائے میرے ساتھ کھیلے جانے والے ڈرامے میں عندلیب کا ساتھ دے گا جس سے اس کی کبھی نہیں بنی تھی۔ میری بے حد کوششوں سے وہ ایک دوسرے کے کچھ قریب تو ہوئے تھے لیکن ایک غیر مرئی حد فاصل ان کے درمیان اب بھی محسوس کی جا سکتی تھی۔

پھر اب اچانک یہ زرینہ کا قصہ آ کھڑا ہوا تھا!

یہ سوچا تو جا سکتا تھا کہ زندگی ہمیشہ ایک ہی رخ پر نہیں بہتی، اس کی شاخیں ادھر ادھر پھوٹتی رہتی ہیں لیکن مجھے بس یہ بات کھٹک رہی تھی کہ زرینہ عراقی کرد تھی اور ایران کے راستے پاکستان آئی تھی۔

اگر کافرستان کو نظر انداز کر دیا جائے تو اب تک کے سارے معاملات میں ایران ضرور سامنے آ رہا تھا۔ بدروحی دیبارو اور بازرگان ایرانی تھے اور احمر کو ہلاک کرنا جیسے ان کا مشن تھا، زندگی کا ایک مقصد تھا۔

دوسری طرف احمر کو ''پرنسز'' کہنے والے شیراز اور دلاور لوش کا تعلق بھی ایران سے تھا۔ عندلیب انہیں احمر کا نام نہاد

بہی خواہ کہتی تھی۔

خود احمر بھی ایرانی تھی اور اس کے تحفظ کی ذمے داری لینے والی کونسل بھی ایرانیوں پر مشتمل تھی۔

عندلیب نے جو اس کونسل کے لیے کسی قسم کا حلف اٹھایا تھا تو اس کی وجہ بھی یہ تھی کہ اس کا خاندان بھی 1961ء میں ایران کی خفیہ پولیس ''ساداک'' سے خوف زدہ ہو کر خفیہ طور پر پاکستان آ گیا تھا۔

ایران! ایران! ایران!

ہر بات کے ڈانڈے ایران سے مل رہے تھے۔

میں ان سب باتوں پر سوچ سوچ کر بے حد تھک چکا تھا اور اب مجھے یقین بھی ہو گیا تھا کہ ان معاملات سے متعلقہ افراد میں سے کوئی جب تک اپنی زبان نہیں کھولے گا، یہ ساری کہانی میرے لیے پُراسرار ہی رہے گی۔

مجھے ذہنی انتشار سے بچانے کے لیے زبان کشائی عندلیب بھی کر سکتی تھی، احمر بھی کر سکتی تھی اور مسز خان بھی لیکن وہ کب ایسا کریں گی۔ مجھے اس کا بالکل اندازہ نہیں تھا۔

رہ گیا راجو تو اس کے بارے میں مجھے یقین تھا کہ وہ بھی ان معاملات کے پس منظر سے واقف نہیں ہوگا..... اسے بھی اتنا ہی بے خبر ہونا چاہیے تھا جتنا میں تھا.....

یہ تمام خیالات بھی میرے ذہن میں گردش کرتے رہے لیکن وقت پر دوا کھانا میں نہیں بھولا۔ اب میری بھی شدید خواہش تھی کہ میں جلد از جلد پوری طرح صحت مند ہو جاؤں۔ میرا خیال ہے، احمر سے ملنے کے بعد میں جسمانی طور پر خود بھی بہتری کی طرف مائل ہو چکا تھا۔ وہ میری زندگی میں بہت دل کشی لے آئی تھی لیکن کسی بھی مناسب وقت پر مجھے اس سے یہ گلہ تو بہر حال کرنا تھا کہ میرے ساتھ کیے جانے والے ڈرامے میں وہ کیوں شریک ہوئی۔

پانچ بجے کے قریب جب میں کافی پی رہا تھا تو موبائل فون پر احمر کی کال آئی۔

''اب ملی ہے فرصت؟'' میں نے شکوہ کرنے کے انداز میں سوال کیا۔

''میں چاہتی تھی، فون پر آپ سے یہ نہ کہنا پڑے کہ بابا کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اور خدا جانے وہ کہیں جا ئیں یا نہ جائیں!''

میں نے احمر کے لہجے کی شگفتگی محسوس کی اور مسکرایا۔

''اچھا تو کیا بابا آج دن میں ہی.....''

''یہ مطلب نہیں تھا میرا۔'' احمر نے جلدی سے کہا۔ ''ابھی تو وہ گھر پر ہی ہیں، طبیعت بھی ٹھیک ہے ان کی۔ خوب اندازہ ہو گیا ہے انہیں کہ میں آپ سے ملنے کے لیے کتنی بے چین رہتی ہوں ورنہ وہ مجھے ابھی سے کیوں بتاتے وہ شام کو سات بجے کہیں جائیں گے۔''

''اوہ!'' میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

ساڑھے سات بجے تو مجھے سفاری پارک میں سامعہ سے ملنا تھا۔

''یہ اوہ کیوں؟'' احمر کے لہجے میں شوخی آ گئی۔

ادھر میں یہ سوچنے لگا تھا کہ سات بجے کا وقت بتانے کی وجہ یہ تو نہیں کہ میں اس وقت احمر کے پاس جا ہی نہیں سکتا تھا!

''واپسی کب ہو گی بابا کی؟'' میں نے پوچھا۔

''دیر سے ہی آئیں گے۔ کیوں؟''

''دراصل عندلیب نے مجھے ایک کام سونپا ہے۔ ساڑھے سات بجے مجھے کہیں جانا ہو گا۔''

''کیا بہت دیر لگ جائے گی؟'' احمر کے انداز سے ایسا لگتا تھا جیسے وہ کچھ مایوس ہوئی ہو۔

''نہیں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''میرا خیال ہے کہ میں زیادہ سے زیادہ نو بجے تک تو پہنچ ہی جاؤں گا تمہارے پاس۔''

میں نے سامعہ کو صرف آدھے گھنٹے کا وقت دینے کا وعدہ کیا تھا۔

''پھر تو ٹھیک ہے۔'' اس مرتبہ احمر جیسے خوش ہو گئی۔ ''بابا تو بارہ ایک بجے سے پہلے واپس نہیں آئیں گے۔''

''گڈ!'' میں مسکرایا۔ ''گویا ہمارے پاس مناسب وقت ہو گا۔ ٹھیک ہے آج میں تم سے دو ایک باتیں بھی پوچھوں گا۔''

''پوچھیں گے؟ کیا مطلب؟''

''دو ایک باتیں مجھے بہت کھٹک رہی ہیں۔'' میں نے زور دے کر کہا۔ میں احمر کے جواب اور اس کے لہجے سے اس پر اپنی بات کا ردِعمل دیکھنا چاہتا تھا۔ احمر کی ذہانت مجھ سے پوشیدہ نہیں تھی۔ مجھے یقین تھا کہ بعد میں اسے بھی اپنی غلطیوں کا احساس ہو گیا ہو گا۔ وہ بے ساختگی میں مجھ سے دو ایک ایسی باتیں کہہ چکی تھی جو مجھے شک و شبہے میں ڈال سکتی تھیں اور میں شک و شبہے میں پڑ بھی چکا تھا۔

''آپ تو مجھے الجھن میں ڈال رہے ہیں۔'' احمر بولی۔ ''کیا باتیں کھٹک رہی ہیں آپ کو۔''

''یہ تو ملاقات پر ہی بتاؤں گا۔''

''تو اسی وقت چھیڑتے یہ بات!..... میں اب کئی گھنٹے الجھن میں پڑی رہوں گی۔''

میں دھیرے سے ہنسا۔ ''اتنا وقت یہ سوچنے میں گزار دو کہ مجھے کیا باتیں کھٹک رہی ہیں۔ اگر تم اندازہ لگانے میں

کامیاب رہیں، تو جو تم کہو گی، میں وہ ہارنے کے لیے تیار ہوں۔ ویسے میرے پاس ہارنے کے لیے بچا کچھ نہیں ہے۔ میں تو خود اپنے آپ کو ہی تمہاری محبت کی چوکھٹ پر ہار چکا ہوں۔"

"فون پر یہ باتیں اچھی نہیں لگتیں۔" احمر نے کہا۔

"جب چہرے کے تاثرات اور آنکھیں یہ سب کچھ کہتی ہیں تو ساری فضا دھنک رنگ ہو جاتی ہے۔"

"واہ!" میں نے داد دی۔ "یہ اندازہ تو مجھے ہے کہ تم نثر میں بھی بہت اچھی شاعری کر سکتی ہو۔"

"محبت کی چوکھٹ پر خود کو ہارنا کیا نثر میں شاعری نہیں ہے؟"

"بس تو ٹھیک ہے۔" میں نے خوش دلی سے کہا۔ "خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو۔"

"لیکن میں جنگل میں اکیلی نہیں ہوں۔"

"پھر بڑی برجستگی دکھائی تم نے، لیکن تیس تم نہیں، میں ہوں۔"

"میں اپنی بات دہراؤں گی کہ فون پر اس قسم کی باتوں کا مزہ آدھا بھی نہیں رہتا۔"

"تو پھر ٹھیک ہے۔ نو بجے تک آ رہا ہوں میں۔ پھر ہوں گی یہ ساری باتیں، شاید ساڑھے آٹھ بجے ہی پہنچ جاؤں۔"

"میں وقت سے کہتی رہوں گی کہ وہ جلدی گزرے!"

"تم تو فقرے بول رہی ہو اور مجھے روک رہی ہو۔"

"شکایت کر رہے ہیں؟"

"نہیں۔" میں مسکرایا۔ "اسے زبان پر آنے کی جرأت کہاں؟"

"اچھا بس۔ اب فون بند کر رہی ہوں۔ خدا حافظ۔"

دوسری طرف سے رابطہ منقطع کر دیا گیا۔

حقیقت یہی ہے کہ احمر کے سامنے بیٹھ کر اس قسم کی باتیں کرنے میں زیادہ سرشاری محسوس ہوتی تھی لیکن اس وقت یہ بات میرے دماغ میں نہیں منڈلائی۔ میرا فکری ارتکاز اس وقت اس سوال پر تھا کہ احمر نے گفتگو کی راہیں کیوں بدل دی تھیں؟ یہ جاننے پر اصرار کیوں نہیں کیا تھا کہ میرے ذہن میں کیا باتیں کھٹک رہی تھیں؟

شاید ہر بات کا جواز سوچ لیا گیا ہے۔

میرے دماغ میں اس کے سوا کوئی خیال نہ آ سکا۔

ساڑھے چھ بج چکے تھے جب میں نے سفاری پارک جانے کی تیاری شروع کی۔ اسی وقت اخبار کے دفتر سے جالب کا فون آ گیا۔

"یار کیا بتاؤں۔" وہ بولا۔ "مجھے معلوم تو ہو گیا تھا کہ تم نے مجھے دوبارہ فون کیا تھا لیکن میں اس وقت ایک میٹنگ میں تھا۔ اس کے بعد ہی تمہارے فون کا پتا چلا مگر اسی وقت ایک اور میٹنگ کی کال آ گئی۔ بس ہفتے میں آج ہی کا دن ایسا ہے جب پے در پے میٹنگز ہی ہوتی رہتی ہیں۔ کبھی چیف ایڈیٹر کے ساتھ تو کبھی....."

جالب بولتا چلا جا رہا تھا جبکہ مجھے اس کی ان مصروفیات سے آگاہی حاصل کرنے میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ مجھ سے ضبط نہ ہو سکا تو بول پڑا۔ "یار تمہاری مصروفیات کی کہانیاں میں پھر کبھی سن لوں گا۔ اس وقت میں کہیں جانے کی تیاری کر رہا ہوں۔ تمہیں دوبارہ فون میں نے یہ جاننے کے لیے کیا تھا کہ کیا مجھے زرینہ کے گھر کا پتا یا ٹیلی فون نمبر مل سکتا ہے۔"

"عجیب بات کہی تم نے!" جالب کچھ حیرت سے بولا۔

"کیوں؟"

"تمہیں زرینہ سے اتنی دلچسپی ہے کہ اس کے بارے میں بہت سی معلومات حاصل کر ڈالیں..... لیکن تمہیں اس کے گھر کا پتا معلوم ہے، نہ....."

"اس کی وجہ ہے۔" میں نے جالب کی بات کاٹی۔ "زرینہ کی ذات سے میری دلچسپی کا سبب وہ نہیں جو تم نے فون پر فوری طور پر سمجھ لیا تھا۔ اسی لیے مجھے نہ تو اس کا پتا معلوم ہے، نہ میں اس کا فون نمبر جانتا ہوں۔"

"تمہاری باتوں نے تو چکرا دیا ہے مجھے۔"

"میں کسی دن تم سے مل کر تمہاری چکراہٹ دور کر دوں گا لیکن فی الحال مجھے بس اپنی بات کا جواب چاہیے۔"

"یار اس کا پتا اور فون نمبر تو مجھے بھی نہیں معلوم مگر....."

جالب جیسے کچھ سوچنے لگا۔

"مگر کیا؟" میں جلدی سے بولا۔

"ہو سکتا ہے کسی رپورٹر کو معلوم ہو۔ تم ہولڈ کرو، میں معلوم کرتا ہوں۔"

"اتنا وقت نہیں ہے میرے پاس۔ بہت جلدی میں ہوں۔ معلوم کر کے تم مجھے فون کر دینا۔ ابھی دس منٹ تو ہوں میں گھر پر..... اگر زیادہ دیر لگے تو بھی تم مجھ سے بات کر سکتے ہو۔ میرا موبائل نمبر تو ہے نا تمہارے پاس!"

"اچھا ٹھیک ہے۔" جالب نے کہا۔ "میں معلوم کر کے بتاتا ہوں۔"

میں نے ریسیور رکھا اور سفاری پارک جانے کی تیاری میں پھر سے مصروف ہو گیا۔

جب میں اپنے کمرے سے نکلنے والا تھا، اسی وقت

جالب کی کال آ گئی۔

"یار صرف پتا معلوم ہو سکا ہے اس کا۔" وہ بولا۔ "اس ادائن میں بے تحاشا کامیابی کے بعد اس نے اپنا ٹیلی فون نمبر بدلوا دیا تھا اور موبائل فون بھی غالباً دوسرا خرید لیا تھا۔ یہ نمبر وہ بہت خاص خاص لوگوں کو بتاتی ہے۔ اخباری لائن کے تو دو تین ہی آدمی ایسے ہوں گے جنہیں ان نمبروں کا علم ہو اور ایسا کوئی آدمی میرے اخبار میں نہیں ہے۔"

"اچھا پتا ہی بتاؤ۔" اب میں بڑی عجلت میں تھا۔

جالب نے پتا بتایا جو میں نے نوٹ کر لیا۔ جالب نے وعدہ کیا کہ وہ زرینہ کا فون یا موبائل نمبر معلوم کرنے کی کوشش ضرور کرے گا۔

میں چاہتا تو تھا کہ زرینہ کے گھر جا کر اس سے ملوں اور کاشف کرمانی کے معاملے میں اسے اپنے تعاون کا یقین دلاؤں لیکن مجھے اس کا پتا اس وقت معلوم ہوا تھا جب مجھے اس کے گھر جانے کی مہلت نہیں تھی۔ اگر مجھے اس کے رابطے کا نمبر معلوم ہو جاتا تو میں ایک آدھ منٹ کے لیے اس سے بات ہی کر لیتا۔

جب میری کار سفاری پارک کی طرف جا رہی تھی تو میں نے موبائل فون پر راجو سے رابطہ کیا۔

"کیا ہے یار!"

راجو کا لہجہ کچھ اکھڑا اکھڑا سا تھا جس پر میں نے دھیان نہیں دیا اور کہا۔ "تم سے زرینہ کے بارے میں زیادہ باتیں نہیں ہو سکی تھیں لیکن میں نے بعد میں اس کے بارے میں کافی سوچا ہے۔ مجھے شبہ ہے بلکہ یقین سمجھو۔ وہ کسی وقت بھی کاشف کرمانی کی کسی انتقامی کارروائی کا نشانہ بن سکتی ہے۔ کاشف کرمانی جیسا شخص یہ بات نظر انداز نہیں کر سکتا کہ اس سے کسی نے دغا بازی کی ہے۔"

"تو میں کیا کروں؟" راجو نے خشک لہجے میں کہا۔

"میں تو کوشش کرتا کہ زرینہ کو ہوشیار کر دوں لیکن مجھے اس کا پتا بہت دیر سے ملا۔ ابھی میں سامعہ سے ملنے جا رہا ہوں۔"

"تو مجھے کیوں بور کر رہا ہے یار!"

"دیکھ راجو! میں اس پر ہرگز یقین نہیں کروں گا کہ تو زرینہ سے واقف نہیں ہے۔"

دوسری طرف سے رابطہ منقطع کر دیا گیا اور میں نے سر جھٹکتے ہوئے مایوسانہ انداز میں سانس لی۔ راجو اب بھی زرینہ کے بارے میں کوئی بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس سے تجسس میں اور اضافہ ہوا۔ راجو کی اتنی زیادہ بیگانگی سے دراصل "بیگانگی" کی نفی ہو جاتی ہے۔ راجو اور زرینہ ایک دوسرے کے لیے اتنے بیگانہ ہرگز نہیں ہو سکتے تھے۔ کوئی ایسی خاص بات ضرور تھی جو راجو مجھ سے چھپانا چاہتا تھا اور یہ میرے لیے خاصے تعجب کا مقام تھا۔ راجو میرا بہت ہی گہرا دوست تھا۔ اس نے اپنے بارے میں مجھ سے کوئی بات کبھی نہیں چھپائی تھی، کم از کم میں تو یہی سمجھتا تھا لیکن زرینہ کے معاملے کے بعد میری سوچ میں تبدیلی آنا ایک فطری امر تھا۔ یقیناً کوئی ایک ایسی بات ضرور تھی جو راجو نے مجھ سے چھپائی تھی اور اس بات کا تعلق ظاہر ہے کہ زرینہ سے تھا۔

میں ان دونوں کے بارے میں سوچتا ہوا سفاری پارک پہنچ گیا۔ میں نے اتنی جلدی کی تھی کہ طے شدہ وقت میں ابھی پانچ منٹ باقی تھے لیکن سامعہ مجھے اپنی منتظر ملی۔ اس سے میں اندازہ لگا سکتا تھا کہ وہ مجھ سے ملنے کے لیے کتنی بے چین تھی۔

میں ان دنوں غیر معمولی حالات کا شکار تھا اس لیے میرے ذہن میں یہ خیال آ ہی گیا کہ سامعہ کی بے چینی یہ معنی تو نہیں رکھتی کہ اس کے دل میں کوئی کھوٹ تھا؟ وہ مجھے کوئی نقصان تو نہیں پہنچانا چاہتی تھی؟

میرے دماغ میں آنے والے ان سوالات کا ایک پس منظر تو بہر حال تھا۔ وہ اپنے باپ سے سن چکی تھی کہ اسے اغوا کرنے میں میرا ہاتھ بھی تھا لیکن اس کے لیے اپنے باپ سے زیادہ میری باتیں یا میری بات قابلِ یقین تھی۔

وہ مجھ سے بڑے پُرجوش انداز میں ملی۔ "میں بہت خوش ہوں کہ آپ نے ایک منٹ کی بھی تاخیر نہیں کی۔"

"وقت ہمیشہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔" میں شاید کچھ فلسفیانہ ہو گیا۔

"آیئے، اس طرف چہل قدمی کرتے ہیں۔" سامعہ نے ایک طرف اشارہ کیا۔

میں نے ٹہلنے کے انداز میں اس طرف قدم بڑھا دیے جس طرف اس نے اشارہ کیا تھا۔ "اگر آج آپ سے ملاقات نہ ہوتی تو پھر کئی دن تک نہ ہوتی۔ میں کافرستان جانے کی تیاریوں میں مصروف ہو گیا ہوں۔"

سامعہ چونکی۔ "تو کیا جلد ہی جا رہے ہیں۔"

"ارادہ تو یہی ہے۔ اب دیکھیں کتنا وقت لگتا ہے تیاری میں!"

"ایسی کیا تیاریاں کر رہے ہیں آپ جن میں زیادہ وقت بھی لگ سکتا ہے!"

"دراصل میں اکیلا نہیں ہوں، کچھ اور لوگ بھی میرے ساتھ جانا چاہتے ہیں۔ روانگی کے سلسلے میں ان کے اپنے

اپنے مسائل ہیں۔"

"آپ کسی وجہ سے انہیں اپنے ساتھ لے جانا چاہتے ہیں یا یہ خود اپنی کی خواہش ہے؟"

"وہ خود ہی میرے ساتھ چلنے کے لیے آمادہ ہوئے ہیں۔ ان میں سے بعض تو بس کافرستان دیکھنے کے خواہش مند ہیں لیکن ایک آدھ ایسا بھی ہے جو میرے استادگرامی سے ملنا چاہتا ہے۔"

"آپ جیسی ہستی کے استادگرامی سے ملنے کی خواہش تو مجھے بھی ہے۔"

"آپ نے ابھی مجھ میں ایسی کیا خاص بات دیکھی ہے!" میں ہنسا۔

"آپ کی باتوں سے کچھ اندازہ تو ہوگیا ہے آپ کے بارے میں!"

"میں آپ کا ہاتھ دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"اور میں نے علمِ نجوم کے حوالے سے ایک سوال کیا تھا آپ سے!"

"مجھے یاد ہے۔" میں مسکرایا۔ "لیکن کیا یہ آپ کا ہاتھ دیکھنے کی شرط ہے کہ میں پہلے آپ کے سوال کا جواب دوں؟"

"ارے نہیں۔" وہ جلدی سے بولی۔ "میری کوئی شرط وشرط نہیں ہے۔ آپ میرا ہاتھ ضرور دیکھیں۔"

"وہاں چل کر بیٹھتے ہیں۔" میں نے گھاس کے ایک قطعے کی طرف اشارہ کیا۔

وہ میرے ساتھ اسی طرف بڑھنے لگی۔ ثریا اور عندلیب کے حوالے سے مجھے معلوم ہوا تھا کہ مجھ سے مرعوب ہوئے بغیر وہ مجھے اپنا ہاتھ نہیں دکھائے گی مگر وہ یقیناً مجھ سے متاثر ہوچکی تھی۔ علوم مخفی کے حوالے سے تو میں نے اس سے ایسی کوئی بات کی ہی نہیں تھی کہ اسے خود سے مرعوب سمجھ لیتا، ابھی تو اس کے ایک سوال کا جواب ہی مجھ پر گویا قرض تھا۔

گھاس کے قطعے کی طرف بڑھتے ہوئے میں یکایک چونکا۔ چونکنے کی وجہ ایک اجنبی شخص تھا جس نے بہ عجلت خود کو ایک درخت کی آڑ میں کیا تھا۔ اگر وہ اطمینان سے درخت کی آڑ میں چلا گیا ہوتا تو کوئی ایسی وجہ نہیں تھی کہ میں چونکتا۔ اس کی عجلت کے باعث مجھے شبہ ہوا تھا کہ اس نے شاید ہم سے چھپنے کی کوشش کی تھی۔

میں نے اسے بس دو ایک پل کے لیے دیکھا تھا اور وہ مجھے اجنبی نہیں لگا تھا لیکن میرے دماغ کے کسی گوشے میں ایک معمولی سی خلش ہوئی کہ میں اس شخص کو پہلے بھی کہیں دیکھ چکا ہوں۔

"اچانک کہاں کھو گئے آپ!"

سامعہ کی ہنستی ہوئی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ اس اجنبی کے حوالے سے میں واقعی ذہنی طور پر کھو گیا تھا۔ مجھے یہ تک احساس نہیں ہوا تھا کہ میں اور سامعہ گھاس کے قطعے پر بیٹھ چکے ہیں۔

"کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے میرے ساتھ!" میں سامعہ کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرایا۔ "اچانک کوئی خیال آتا ہے اور میں اس کے بارے میں سوچتے ہوئے بھول ہی جاتا ہوں کہ میرے ساتھ کوئی اور بھی ہے..... خیر چھوڑیے! ..... کل آپ نے کیا سوال کیا تھا مجھ سے؟"

"پہلے آپ میرا ہاتھ تو دیکھیے!"

"نہیں، پہلے میں اس کا جواب دوں گا۔"

"آپ نے تو کہا تھا کہ اس میں خاصا وقت لگے گا۔"

"ابھی ابھی ایک شارٹ کٹ آیا ہے میرے ذہن میں۔" میں مسکرایا۔

"یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔" وہ خوش ہوگئی۔

"اچھی بات تو ہے لیکن تھوڑا سا پریشان آپ بھی ہوجائیں گی۔"

"کیا مطلب؟"

"آپ نے یہی کہا تھا نا کہ خلا میں کروڑوں میل کے فاصلے کی کوئی اہمیت ہی نہیں ہے لیکن نئے دریافت شدہ سیارے نیپچون، پلاٹو اور یورینس ہماری زندگی پر کیونکر اثر انداز ہوسکتے ہیں جبکہ وہ زمین سے اربوں میل دور ہیں۔ یہی سوال تھا نا آپ کا؟"

"جی ہاں۔"

میں اس دوران میں اس درخت کی طرف سے غافل نہیں تھا جس کی آڑ میں ایک اجنبی کو چھپتے دیکھ چکا تھا۔ وہ دستور اس درخت کی آڑ میں تھا اور کم از کم ایک مرتبہ جھانک کر ہماری طرف دیکھ چکا تھا۔

کسی نامعلوم خطرے کا احساس ہوجانے کے باوجود میں نے اپنے چہرے پر اس کا تاثر نہیں آنے دیا اور سامعہ سے بولا۔ "ایک بات تو آپ بہرحال مانتی ہوں گی۔ اربوں میل کا فاصلہ ہونے کے باوجود ہماری کہکشاں کے ان تمام سیاروں کی کشش انہیں گویا ایک دوسرے کا اسیر بنائے ہوئے ہے۔ یہ سب ایک لگے بندھے راستے پر گردش کررہے ہیں۔ ایک اعتبار سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ پروانوں کی طرح ایک دوسرے کے گرد منڈلا رہے ہیں۔ آپ کی یہ بات درست

ہے کہ زمین میں ان سیاروں کا فاصلہ اربوں میل ہے لیکن عطارد اور زہرہ تو ان تینوں سیاروں سے زمین کی بہ نسبت کچھ اور زیادہ دور ہیں، تو جب یہ دونوں سیارے بھی آپ کے ان تین سیاروں کے اسیر ہیں تو ظاہر ہے کہ زمین کیوں نہیں ہوگی۔"

سامعہ بڑی توجہ سے میری باتیں سن رہی تھی۔

"اب آپ میری ایک بات پر غور کیجیے!" میں نے کہا۔ "پلاٹو، نیپچون اور یورینس کو چھوڑ کر باقی سیاروں سے ہماری زمین کا زیادہ سے زیادہ فاصلہ اسی کروڑ میل اور کم سے کم فاصلہ ساڑھے چھ کروڑ میل کے لگ بھگ ہے۔ بقول آپ کہ، خلا میں کروڑوں میل کے فاصلے کی کوئی اہمیت نہیں اور آپ کی یہ بات ٹھیک بھی ہے لیکن ہم زمین پر بسنے والوں کے لیے تو یہ کوئی کم فاصلہ نہیں ہے۔ ہماری زمین کا قطر تو دس ہزار میل بھی نہیں۔ تو جب آپ سمجھتی ہیں کہ کروڑوں میل دور کے یہ سیارے ہماری زندگی پر اثر انداز ہوسکتے ہیں تو پلاٹو، یورینس اور نیپچون کی اثر پذیری کو آپ خارج از امکان کیوں سمجھ رہی ہیں جبکہ..... ابھی میں کہہ چکا ہوں کہ عطارد اور زہرہ تو زمین کی بہ نسبت ان سے کچھ اور زیادہ دور ہیں مگر ان کی کشش کے اسیر ہیں۔ جواب دیں گی آپ مجھے اس بات کا!"

سامعہ بہت الجھی ہوئی نظر آنے لگی تھی۔ وہ پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ "میں نے تو ایک ایسا سوال کیا تھا کہ جواب دینا آپ کے لیے مشکل ہوجائے لیکن آپ نے تو مجھے ہی پریشان کردیا!"

"پریشان نہ ہوں آپ۔ غور کیجیے اس پر۔ میں آپ کی ذہانت کا معترف ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ معاملہ آپ کی سمجھ میں آجائے گا اور اس کی ضرورت نہیں رہ جائے گی کہ میں آپ کے سوال کے جواب میں طویل اور مدلل تقریر کروں۔"

"میرا خیال ہے کہ بہت سوچنا پڑے گا مجھے اس پر!" سامعہ بدستور الجھی ہوئی نظر آرہی تھی۔ "فوری طور پر تو میں کچھ بھی نہیں کہہ سکتی۔"

"آپ کل تک سوچیں، پرسوں تک سوچیں!" میں نے اطمینان سے کہا کیونکہ وہ مجھے ایک طویل مباحثے میں الجھانے کے بجائے خود ہی پریشانی میں پڑ گئی تھی اور میری ذہانت کی وجہ سے میرے سوال کا جواب دینا اپنی انا کا مسئلہ بنے ہی تھی۔ میں جو اس کی ذہانت کا معترف بن بیٹھا تھا تو اب وہ بھی اپنی ذہانت ثابت کرنے کی انتہائی کوشش پر مجبور تھی۔

وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ "جب آپ مجھے اتنا وقت دے رہے ہیں تو میں اس پر اطمینان سے غور کروں گی۔ ابھی تو آپ میرا ہاتھ دیکھیے۔"

"اندھیرا بہت تیزی سے بڑھا ہے۔" میں نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔ "آپ کا ہاتھ دیکھنے کے لیے ہمیں کسی زیادہ روشن جگہ پر جانا ہوگا۔"

"تو چلیے!" وہ فوراً کھڑی ہوگئی۔ "ادھر وہ ایک چھوٹا سا کیفے ہے وہیں چل کر بیٹھتے ہیں۔"

اس کے ساتھ میں بھی کھڑا ہوگیا۔ حقیقتاً اس کا ہاتھ دیکھنے کے لیے وہاں روشنی کم تھی لیکن میں یہ بھی دیکھنا چاہتا تھا کہ درخت کی آڑ میں جانے والا اجنبی ہمارے پیچھے لگا رہے گا یا نہیں؟

کیفے میں اتنی روشنی تھی کہ میں سامعہ کا ہاتھ دیکھ سکتا تھا۔ اس نے کچھ چیزوں کا آرڈر دینے کے بعد ہاتھ میری طرف بڑھا دیا تھا۔

میں اس دوران میں کسی قدر ہیجان میں مبتلا ہوچکا تھا۔ میں نے اس اجنبی کی نقل و حرکت دیکھ لی تھی۔ وہ یقیناً ہم پر مستقل نظر رکھنا چاہتا تھا۔ اس نے بس کیفے میں داخل ہونے سے گریز کیا تھا۔

میرے ہیجان کی وجہ یہ تھی کہ میں نے شاید اسے پہچان لیا تھا۔ اب مجھے یاد نہیں کہ وہ کیا خیال تھا جس نے مجھے وہ رات یاد دلا دی تھی جب میں نے اور راجو نے سامعہ کو اس کے گھر سے اغوا کیا تھا۔ بازرگان کے آجانے کی وجہ سے ہم سامعہ کو لے کر پچھلے دروازے سے بھاگے تھے جہاں ایک شخص نے ہماری کار پر فائرنگ کی تھی، اندھیرے میں مجھے اس شخص کا چہرہ صاف طور پر دکھائی نہیں دیا تھا لیکن وہاں اتنی مدھم روشنی ضرور تھی کہ مجھے اس کا چہرہ کچھ یاد دلایا ہوا سا ضرور نظر آگیا تھا۔ اس کے دھندلے سے وہ نقش و نگار میری یادداشت سے محو نہیں ہوئے تھے اس لیے اجنبی کو واضح طور پر دیکھ کر میں نے اسے پہچان لیا تھا۔ وہ یقیناً وہی تھا، بازرگان کے ایکشن اسکواڈ کا کوئی آدمی!

کیا اسے بازرگان ہی نے ہمارے پیچھے لگایا ہوگا، میں سوچ رہا تھا۔

"آپ پھر کہیں کھو گئے!"

سامعہ کی آواز نے مجھے چونکایا۔

"ہاں۔" میں مسکرایا۔ "میں نے بتایا تھا نا! اکثر ہوتا ہے میرے ساتھ ایسا!"

''اب میرا ہاتھ دیکھیے نا!'' سامعہ کے لہجے میں اشتیاق تھا۔

''ہاں ہاں، ضرور۔'' میں نے کہا اور جیب سے رومال نکال کر اپنے بھیگے ہوئے ہاتھ صاف کرنے لگا۔ میرے ہاتھ اچانک بھیگنے کی وجہ غالباً یہ تھی کہ میری چھٹی حس نے مجھے کسی نامعلوم خطرے کا احساس دلایا تھا۔

پارک میں سامعہ مجھے پہلے ہی سے اپنی منتظر ملی تھی اور میں نے اس وقت بھی سوچا تھا کہ سامعہ کی اس بے چینی کی وجہ اس کے دل کا کوئی کھوٹ تو نہیں؟ وہ مجھے کوئی نقصان تو نہیں پہنچانا چاہتی؟

اور اب بازرگان کا آدمی نظر میں آیا تھا تو میری نظر میں سامعہ کا مشکوک ہوجانا ایک فطری بات تھی۔ یہ خارج از امکان نہیں تھا کہ اس نے مجھ پر نہیں بلکہ اپنے باپ ہی کی باتوں پر یقین کیا ہو اور اب بازرگان میرے خلاف کسی اقدام کے لیے اسی کو اپنا آئیہ کار بنا رہا ہو۔ سامعہ بہ خوشی اس شخص کے خلاف آئیہ کاربن سکتی تھی جو اس کے باپ کا دشمن ہو اور جس نے اسے اغوا بھی کیا ہو۔

میں نے اس سوچ بچار کے باوجود اپنے چہرے پر وہ تاثرات نہیں آنے دیے جس سے سامعہ کو گمان ہوجاتا کہ مجھے اس پر شک ہوگیا ہے۔

میں نے رومال جیب میں رکھ کر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا۔ ''میں تو خیر آپ کا ہاتھ دیکھنا ہی چاہتا تھا لیکن کیا آپ یہ چاہیں گی کہ میں آپ کو آپ کے بارے میں کچھ بتاؤں؟''

''یقیناً۔'' سامعہ نے فوراً کہا۔ ''لیکن پہلے آپ میرے ماضی سے پردہ اٹھائیے، مستقبل کی بات بعد میں!''

''گویا میرا امتحان مقصود ہے؟''

''ہرگز نہیں۔'' وہ جلدی سے بولی۔ ''ایسا نہ سمجھیے، پلیز!''

میں نے مسکراتے ہوئے اس کے ہاتھ کی لکیروں پر نظر ڈالی اور پھر مجھے وہی تجربہ ہوا جو اس سے پہلے نجیب، زنگولا اور کاشف کرمانی کا۔ ہاتھ دیکھ کر ہوا تھا میری نگاہیں اس کے ہاتھ کی لکیروں سے الجھیں اور میرے دماغ میں وہ خیالات رینگنے لگے جن کے بارے میں لکیریں مجھے بتا رہی تھیں۔

اس کے ساتھ ہی میں نے سامعہ کی طرف دیکھے بغیر بولنا شروع کردیا۔ ''آپ کے بچپن میں ہی آپ کی والدہ کا انتقال ہوگیا تھا۔ اس کے بعد آپ کے والد ہی نے آپ کی پرورش کی لیکن اپنی غیر معمولی مصروفیات کے باعث آپ پر مناسب توجہ نہیں دے سکے۔ اسی لیے آپ بچپن میں شدید محرومی کا شکار ہیں لیکن نوجوان ہوتے ہوتے آپ نے اپنی دلچسپی کے مشاغل تلاش کرلیے۔ تعلیم کے حصول کے ساتھ ساتھ آپ کو دنیا گھومنے کا شوق بھی رہا۔ چھٹیوں کے زمانے میں آپ نے کئی ملکوں کے مختلف شہروں کی سیر کی ہے۔ میکسیکو جیسے شہروں میں آپ کو بل فائٹنگ دیکھنے کا بہت اشتیاق رہتا تھا اور آپ اپنا یہ شوق پورا بھی کرتی تھیں۔ اس خطرناک کھیل سے بھی آپ کی اس فطرت کا اندازہ ہوتا ہے کہ آپ ایڈونچرسٹ ہیں۔ آپ کے گھومنے پھرنے پر مسٹر بازرگان نے کبھی کوئی پابندی نہیں لگائی۔ دو مرتبہ آپ انہیں بتائے بغیر بھی بیرون ملک گئی ہیں اور جانے کے بعد ہی انہیں آپ نے کسی طرح اطلاع دی ہے۔''

''حیرت انگیز۔'' سامعہ کی پُرجوش آواز نے مجھے چونکا دیا۔ ''یہ باتیں آپ کو ڈیڈی کے سوا کسی سے معلوم نہیں ہوسکتیں اور ڈیڈی سے آپ کی واقفیت ہی نہیں ہے۔''

سامعہ کے بولنے کی وجہ سے میں چونکا تو اس کے ہاتھ کی لکیروں سے میرے دماغ کا رابطہ منقطع ہوگیا اور میں نے مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

''اور کچھ بتائیے!'' اس کے چہرے پر جوشیلے تاثرات تھے۔ میں نے اسے دو ایک باتیں اتنی وضاحت سے بتائی تھیں جو کوئی پامسٹ نہیں بتا سکتا، جیسے بل فائٹنگ کے بارے میں یا یہ کہ وہ دو مرتبہ اپنے باپ کو بتائے بغیر ملک سے باہر چلی گئی تھی۔

''اور کیا جاننا چاہتی ہیں آپ؟'' میں نے پوچھا اور چور نظروں سے اردگرد کا جائزہ بھی لیا۔ میں جاننا چاہتا تھا کہ بازرگان کا آدمی ہمارے قریب کہیں ہے یا نہیں؟

''کچھ بھی بتائیے!'' سامعہ کے لہجے میں اشتیاق تھا۔

میں نے پھر اس کے ہاتھ پر نظر ڈالی اور اس کی لکیریں مجھے بتانے لگیں کہ وہ ذہین بھی تھی۔ شوخ چنچل بھی تھی لیکن کبھی وقت اپنے دماغ کو آزاد بھی چھوڑ دیتی تھی۔ ایسے موقعوں پر کبھی کبھی اس سے بے وقوفانہ حرکتیں بھی سرزد ہوتی تھیں۔

سامعہ کے نام کا عدد ''پانچ'' بھی یہ ظاہر کرتا تھا کہ وہ معروف زندگی گزارنا پسند کرتی ہے۔ اسی لیے جب اس نے نوجوانی کی چوکھٹ پر قدم رکھا تو اپنے لیے خاصی مصروفیات تلاش کرلی تھیں۔ وہ باقاعدہ منصوبہ بندی کرنا پسند نہیں کرتی تھی۔ جس وقت جو دل میں آتا تھا، کرگزرتی تھی۔ کسی بھی معاملے میں، کسی وقت بھی اس کا مزاج تبدیل ہوجاتا تھا لیکن وہ دل کی بری نہیں تھی۔

یہ سب کچھ سامعہ کو بتاتا بھی رہا اور پھر اچانک مجھے خیال آیا کہ مجھے اپنے بارے میں بھی تو سامعہ کے خیالات جاننا چاہئیں۔ میں یہ آسانی سے معلوم کرسکتا تھا کہ وہ میرے خلاف کچھ کرگزرنے کے سلسلے میں اپنے باپ کی آئیہ کار بنی تھی یا نہیں۔

میں نے خاموش ہوکر اپنی توجہ اس کے دماغ کی لکیر پر مرکوز کی اور میں ایک بار پھر اسی تجربے سے دوچار ہوا جس سے میں کاشف کرمانی کا ہاتھ دیکھتے ہوئے دوچار ہوا تھا۔

میری بصارت کی غیر مرئی لہریں سامعہ کے ہاتھ کی دماغی لکیر سے براہِ راست اس کے دماغ تک پہنچیں اور پھر وہ خیالات جیسے میرے دماغ کی کسی سطح پر منعکس ہونے لگے جو سامعہ سوچ رہی تھی۔

''اتنا حیرت انگیز پامسٹ دنیا میں شاید ہی کوئی ہو۔ بہ حیثیت انسان بھی یہ برے نہیں معلوم ہوتے۔ نہ جانے کیسے غلط فہمی ہوگئی ہے ڈیڈی کو کہ وہ انہیں اپنا دشمن سمجھنے لگے ہیں اور یہ سوچنا تو بڑا مضحکہ خیز ہوگا کہ یہ مجھے یا کسی بھی لڑکی کو اغوا کرنے کے بارے میں سوچ بھی سکتے ہیں۔''

سامعہ کے خیالات جان کر مجھے کچھ سکون ملا لیکن بازرگان کے آدمی کی طرف سے میں چوکنا ہی رہنا چاہتا تھا۔

''اچانک خاموش کیوں ہوگئے آپ!'' سامعہ بولی۔ ''کوئی خاص بات دیکھنے لگے کیا؟''

''ہاں۔'' میں نے کہا۔ ''آپ مستقل مزاج نہیں ہیں۔ کسی بھی معاملے پر مشکلات سامنے آجائیں تو آپ دل برداشتہ ہوکر خود کو اس معاملے سے بے تعلق کرلیتی ہیں۔''

''ہاں یہ تو ہے۔'' وہ مسکرائی۔ پھر اس نے مجھ سے اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے کہا۔ ''خیر چھوڑیں۔ یہ بتائیں کہ ان علوم کے علاوہ آپ کی دلچسپیاں کیا ہیں۔ اسپورٹس وغیرہ سے بھی کچھ لگاؤ ہے آپ کو!''

میں مسکرا پڑا۔ سامعہ کے نام کا عدد یہاں اپنا کام دکھا گیا تھا۔ یکسانی سے اکتاہٹ اس کے مزاج کا خاصہ تھی۔ کوئی اور لڑکی ہوتی تو مجھ سے اپنے مستقبل کے بارے میں بھی پوچھنا چاہتی لیکن اس نے اچانک گفتگو کا موضوع ہی بدل دیا تھا۔ علوم مخفی سے اسپورٹس کی طرف چھلانگ لگادی تھی۔

''باقی باتیں اگلی ملاقات پر!'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''آپ کے ساتھ آدھے گھنٹے سے کچھ زیادہ وقت گزر گیا ہے۔ اب مجھے جانا ہوگا۔''

سامعہ کے آرڈر پر جو کچھ آیا تھا، وہ ہم اس دوران میں کھا پی بھی چکے تھے۔ بل کی ادائیگی سامعہ نے بہ اصرار خود کی۔

''یہ ملاقات تو بڑی تشنہ رہی۔'' سامعہ نے اس وقت کہا جب ہم اس طرف بڑھ رہے تھے جہاں ہم نے اپنی کاریں کھڑی کی تھیں۔

''آئندہ ملاقات تفصیلی ہوجائے گی۔'' میں نے خوش مزاجی سے کہا۔

''کہیں آپ اچانک کافرستان نہ چلے جائیے گا!..... دراصل میں سوچ رہی ہوں کہ جب کچھ لوگ آپ کے ساتھ جا ہی رہے ہیں تو آپ اس میں ایک آدھ کا اضافہ بھی کرسکتے ہیں۔''

''کیا آپ بھی چلنا چاہتی ہیں؟''

''یہی خیال آیا تھا ابھی میرے ذہن میں، کل تک میں فیصلہ بھی کرلوں گی اور فون پر آپ کو بتادوں گی، اگر آپ یا آپ کے ساتھ جانے والا گروپ میری شمولیت پر اعتراض نہ کرے۔''

''اگر مجھے ہی کوئی اعتراض نہ ہو تو دوسرے کیسے کرسکتے ہیں!''

''شکریہ پرویز صاحب!'' سامعہ جیسے کھل اٹھی۔

میری کار بالکل قریب آگئی تھی۔ سامعہ وہیں رک گئی۔

''آپ کی گاڑی کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ اس طرف کھڑی ہے۔'' سامعہ نے کچھ دور کھڑی ہوئی کاروں میں سے ایک طرف اشارہ کیا۔

''چلیں میں آپ کو وہاں تک چھوڑ آؤں!'' میں نے قدم بڑھایا۔

''ارے نہیں پرویز صاحب!'' سامعہ جلدی سے بولی۔ ''آپ جائیے، میں چلی جاؤں گی۔''

''آئیے بھی۔'' میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے ایک قدم اور بڑھایا۔

سامعہ نے قدرے تذبذب کے بعد قدم بڑھایا۔

''آپ خواہ مخواہ تکلف کررہے ہیں!''

''یہ تکلف کی بات نہیں۔'' میں نے خوش دلی سے کہا۔ ''یہ تہذیب کا تقاضا ہے کہ مرد ہر معزز لڑکی یا عورت کو اتنی تعظیم تو دے!''

''اوہ!'' سامعہ کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ ''غالباً مجھے شکر گزار ہونا چاہیے کہ آپ جیسی ہستی مجھے اتنی عزت دے رہی ہے۔''

''جب میں تہذیب کا تقاضا پورا کررہا ہوں تو اس میں شکریے کی ضرورت ہی نہیں رہ جاتی۔''

''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ جیسے اچھے انسان کے بارے میں ڈیڈی کو اتنی سنگین غلط فہمی کیسے ہوگئی!''

''ہوجاتا ہے ایسا!'' میں اس طرح ہنس دیا جیسے یہ بات ٹال ہی دینا چاہتا ہوں۔

سامعہ کو اس کی کار تک چھوڑنے کا فیصلہ میں نے ایک اور وجہ سے بھی کیا تھا۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ بازرگان کا آدمی صرف سامعہ پر نظر رکھنا چاہتا ہے یا اس کے مقاصد کچھ اور بھی تھے۔ یہ میں نے دیکھ لیا تھا کہ پارک سے وہ بھی نکل آیا تھا اور اب ایک جگہ اس طرح کھڑا تھا جیسے خود کو کچھ کاروں کی آڑ میں رکھنا چاہتا ہو۔ میں نے یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ وہ موبائل پر کسی سے باتیں کررہا تھا۔ غالباً وہ بازرگان ہی کو رپورٹ دے رہا ہوگا کہ اب میں اور سامعہ سفاری پارک سے روانہ ہونے والے تھے۔

اگر اس کی ڈیوٹی صرف اتنی تھی کہ وہ سامعہ پر نظر رکھے تو سامعہ کی کار کے جاتے ہی اسے بھی وہاں سے چلا جانا چاہیے تھا۔

سامعہ نے اپنی کار کے قریب پہنچنے تک مجھ سے کافرستان کے بارے میں کچھ استفسار بھی کرڈالا تھا اور میں نے اسے ایسے جوابات دیے تھے جن سے اس کے شوق کو ہوا مل سکتی تھی۔

جب سامعہ نے اپنی کار اسٹارٹ کردی تو میں نے جھک کر ایک الوداعی جملے کے بعد یہ بھی کہا کہ وہ اس سوال پر غور کرنا ہرگز نہ بھولے جو میں نے سیاروں کے بارے میں اس سے کیا تھا۔

سامعہ نے ہنس کر اپنی کار آگے بڑھادی اور میں مسکراتا ہوا اپنی کار کی طرف پلٹا۔ میں نے اس طرف بھی ایک اچٹتی سی نظر ڈالی جہاں بازرگان کے آدمی کو کھڑا دیکھا تھا۔ وہ بہ دستور وہیں دکھائی دیا۔ اب وہ موبائل پر کسی سے بات کرنے کے بجائے اس طرح ادھر ادھر دیکھ رہا تھا جیسے کسی کی تلاش ہو، یا وہ کسی کا منتظر ہو۔ اس کے انداز سے صاف ظاہر تھا کہ وہ سامعہ کے پیچھے نہیں جائے گا۔

اب میری فکرمندی میں کچھ اضافہ ہوا۔ وہ آدمی یقیناً وہاں میری وجہ سے رکا ہوا تھا۔ یہ اندازہ میں نہیں لگا سکا کہ اسے بازرگان سے کیا ہدایت ملی ہوگی لیکن یہ بات میری دانست میں طے تھی کہ کچھ گڑبڑ ضرور ہوگی۔ مجھے خیال آیا کہ آج ہی میں نے عندلیب سے کہا تھا کہ وہ مجھے کوئی اچھا سا ریوالور دلا دے۔ بازرگان یا اس کے ایکشن اسکواڈ کے لوگوں کے آگے میرا ننھا سا اسمتھ اینڈ ویسن کسی کھلونے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا تھا۔

کار کے قریب پہنچ کر میں دروازہ کھولتے کھولتے رک گیا۔ مجھے خیال آیا تھا کہ موبائل فون پر عندلیب کو اس صورت حال سے آگاہ کردوں لیکن پھر میں نے سوچا کہ کار میں بیٹھنے کے بعد، بلکہ کار حرکت میں لانے کے بعد ہی عندلیب سے رابطہ کروں۔ مناسب یہی تھا کہ بازرگان کا آدمی مجھے موبائل پر باتیں کرتے ہوئے نہ دیکھ سکے۔

میں کار کا دروازہ کھول کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ انجن اسٹارٹ کرنے کے لیے چابی لگاتے وقت میں کن انکھیوں سے بازرگان کے آدمی کی طرف دیکھتا رہا جس نے ابھی تک اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی تھی۔

شاید یہ میرا تعاقب کرے گا، میں نے سوچتے ہوئے کار اسٹارٹ کرنا چاہی مگر انجن ایک عجیب سی آواز نکال کر خاموش ہوگیا۔

یہ کیا گڑبڑ ہوئی ہے، مجھے خیال آیا۔ میں نے اپنی کار کے انجن کی ایسی آواز پہلے کبھی نہیں سنی تھی۔

کار اسٹارٹ کرنے کی دوسری کوشش میں بھی مجھے کامیابی نہیں ہوسکی۔ انجن ایک نامانوس سی آواز کے بعد بند ہوگیا تھا۔

پھر جب میری کئی کوششیں ناکام ہوگئیں تو مجھے تشویش ہوئی۔ میرے دماغ میں یہ خیال آنا غیر فطری نہیں کہا جاسکتا کہ انجن میں گڑبڑ ہوئی نہیں تھی بلکہ کی گئی تھی۔

کیا اس طرح مجھے یہاں روکنے کی کوشش کی گئی ہے؟ میں نے سوچتے ہوئے آہستگی سے کار کا دروازہ کھولا۔

ایسے موقعوں پر کار کا بونٹ کھول کر دیکھا ہی جاتا ہے لیکن میرا اندازہ تھا کہ جو گڑبڑ کی گئی تھی، وہ میری سمجھ میں نہیں آسکے گی۔ مجھے انجن کے بارے میں بس اتنی ہی معلومات تھیں جو عام طور پر کار چلانے والوں کو ہوتی ہیں۔ اس قسم کے معاملوں میں زیادہ سمجھ بوجھ اتنے کم لوگوں میں ہوتی ہے کہ انہیں شمار ہی نہیں کیا جانا چاہیے۔

بہرحال میں نے بونٹ کھول کر دیکھا اور ادھر ادھر ہاتھ مار کر بند کردیا۔ اپنے اندازے کے مطابق مجھے اس گڑبڑ کا پتا چل ہی نہیں سکتا تھا جو انجن اسٹارٹ نہ ہونے کا سبب تھی۔

رومال سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے میں کار کے دروازے کے پاس جا کھڑا ہوا۔ میں نے کن انکھیوں سے دیکھ لیا تھا کہ بازرگان کے آدمی نے ابھی تک اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی تھی۔

اس کا مقصد کیا ہے، میں سوچ رہا تھا۔ وہ جگہ اتنی ویران

نہیں تھی کہ مجھ پر حملہ کیا جاسکتا یا کوئی اور نازیبا حرکت کی جاسکتی۔ تو پھر شاید بازرگان یہ چاہتا ہو کہ میں ٹیکسی کرنے پر مجبور ہوجاؤں اور ٹیکسی ڈرائیور کے روپ میں اس کا کوئی آدمی ہو۔

میں نے عندلیب سے بات کرنے کے لیے جیب سے موبائل نکالا ہی تھا کہ بازرگان کا آدمی مجھے اپنی طرف بڑھتا نظر آیا۔ میں چوکنا ہوگیا۔ موبائل میرے بائیں ہاتھ میں تھا۔ میرا دایاں ہاتھ جیب میں چلا گیا اور اسمتھ اینڈ ویسن کے دستے پر میری گرفت مضبوط ہوگئی۔ میں مضطرب تو ہوا تھا لیکن میں نے اس کا اظہار نہیں ہونے دیا تھا۔ میری نظر موبائل پر تھی اور انداز ایسا تھا جیسے کسی کو فون کرنے سے پہلے کچھ سوچنے لگا ہوں۔

بازرگان کا آدمی میرے بالکل قریب آیا۔ اپنی وضع قطع سے وہ کوئی جرائم پیشہ ہرگز نہیں معلوم ہوتا تھا۔ اس کی عمر چالیس پینتالیس کے درمیان ہوسکتی تھی۔ میں نے اسے پہلی بار اتنے قریب سے دیکھا اور سوچے بغیر نہیں رہ سکا کہ یہ بھی ایرانی ہی معلوم ہوتا ہے۔ ویسے بھی بازرگان جیسے شخص کے ایکشن اسکواڈ میں صرف ایرانی ہی ہوسکتے تھے۔

''شاید آپ کی گاڑی میں کوئی خرابی ہوگئی ہے!'' اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے بڑے شائستہ لہجے میں کہا۔ زبان انگریزی تھی لیکن لب ولہجہ کسی اہلِ زبان کا نہیں تھا۔ انگریزی الفاظ کی وہ مخصوص ادائیگی کسی ایرانی ہی کی ہوسکتی تھی۔

''جی ہاں۔'' میں نے اس کی طرف غور سے دیکھا۔

''کیا میں آپ کی کوئی مدد کرسکتا ہوں؟'' لہجہ اب بھی شائستہ ہی تھا۔

اس سے پہلے کہ میں جواب میں کچھ کہتا، ایک گاڑی میرے قریب آکر ایک جھٹکے سے رکی۔ میں چونک پڑا، اور پھر میں نے دیکھا کہ وہ سامعہ کی گاڑی تھی۔

''خیریت تو ہے پرویز صاحب؟'' سامعہ نے کار کی کھڑکی سے سر باہر نکالتے ہوئے میری طرف دیکھا۔ ''آپ ابھی تک گئے نہیں یہاں سے؟'' اس کے انداز میں کچھ تعجب تھا۔

''آپ واپس کیسے لوٹ آئیں؟'' میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''بس اتفاق سمجھ لیجیے کہ میں کافی آگے تک نکل گئی تھی لیکن مجھے اپنے پیچھے کوئی گاڑی آتی دکھائی نہیں دی۔ رات کے وقت میں اتنے فاصلے سے آپ کی گاڑی پہچان تو نہیں سکتی تھی لیکن مجھے ہیڈ لائٹس بھی نظر نہیں آئیں۔ اس پر مجھے اچنبھا ہوا اور خیال آیا کہ آپ اتنی دیر تک روانہ کیوں نہیں ہوئے۔ بس یہی سوچتے ہوئے میں نے اپنی کار واپس موڑلی تھی کہ آپ اچانک رک کیوں گئے۔ آپ نے تو بتایا تھا کہ آپ کو جلد ہی کہیں پہنچنا ہے۔''

''ہاں۔'' میں نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''پتا نہیں کیا گڑبڑ ہوگئی ہے۔ گاڑی اسٹارٹ ہی نہیں ہورہی!''

یہ میں نے دیکھ لیا تھا کہ سامعہ کی کار آتے ہی بازرگان کے آدمی نے اپنا رخ اس حد تک بدل لیا تھا کہ اس کا چہرہ سامعہ کو واضح طور پر دکھائی نہ دے سکے۔

''اچانک کیا گڑبڑ ہوگئی!'' سامعہ کار سے اترنے کے لیے دروازہ کھولنے لگی۔

''مقدرات اچانک ہی گڑبڑ ہوتے ہیں۔'' میں نے ہنس کر کہا۔

بازرگان کا آدمی اس وقت تیزی سے ایک طرف بڑھتا چلا گیا۔

''پھر اب کیا کرنا ہے!'' سامعہ میرے قریب آکھڑی ہوئی۔

''یہی سوچ رہا تھا۔''

''یہاں کسی میکنک کو تلاش تو کیا جاسکتا ہے لیکن ضروری نہیں کہ وہ قابلِ بھروسا ہو۔ میرا مطلب ہے، وہ کوئی نام نہاد میکنک بھی ہوسکتا ہے جو آپ کی قیمتی کار میں کوئی اور خرابی بھی پیدا کردے۔''

''ہاں اس کا امکان تو ہے۔''

''اور پھر آپ کو جلد ہی کہیں پہنچنا بھی ہے۔'' سامعہ بولی۔ ''کیوں نہ آپ اپنی گاڑی یہیں چھوڑ دیں۔ بعد میں کسی طرح منگوا لیجیے گا۔ آپ میرے ساتھ چلیے۔ آپ کو جہاں جانا ہے، میں پہنچادوں گی..... پلیز! انکار نہ کیجیے گا۔ اس قسم کے معاملات میں تکلف نہیں کیا جاتا۔ کسی جگہ پہنچنے میں آپ کو دیر کیوں ہو جب میں اپنی کار کے ساتھ یہاں موجود ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے طویل سانس لی۔ ''یہی کرنا پڑے گا۔ میں اپنے گیراج والے کو فون کردوں گا۔ وہ اپنے کسی آدمی کو بھیج کر گاڑی منگوا لے گا۔''

''تو پھر آیئے۔ جلدی کیجیے۔ آپ کا کچھ وقت تو پہلے ہی ضائع ہوچکا ہے۔''

میں نے سامعہ کی کار میں بیٹھتے ہوئے سوچا کہ مجھے جانا تو احمر کے پاس ہے لیکن یہ مناسب نہیں ہوگا کہ میں سامعہ کی کار میں اس کے فلیٹ کے قریب تک جاؤں۔ سامعہ کی کار

سے وہاں کسی قریبی سڑک پر اتر جا سکتا تھا اور وہاں سے ٹیکسی کی جا سکتی تھی۔

''یہ بہت اچھا ہوا کہ اس وقت میرے پیچھے کوئی گاڑی نہیں آئی۔'' سامعہ نے کار اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔ ''ہیڈ لائٹس دیکھ کر میں تو یہی سمجھتی کہ آپ ہی کی گاڑی ہوگی۔''

''کبھی ایسے ناخوش گوار واقعے کے بعد کوئی خوش گوار صورت بھی اچانک نکل ہی آتی ہے۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''یہ تو میرے لیے بھی ایک خوش گوار صورت ہے کہ اس طرح مجھے آپ کے ساتھ کچھ اور وقت گزارنے کا موقع ملا۔''

''میں پریشان ہوں کہ مجھے کہیں دیر نہ ہو جائے۔''

''آپ کو جانا کہاں ہے؟''

میں نے اسے احمر کے فلیٹ کے قریب کی ایک سڑک کا نام بتا دیا۔

سامعہ نے یک بہ یک رفتار خاصی تیز کر دی۔ ''میں آپ کو بہ وقت پہنچا دوں گی۔''

''کہیں اور نہ پہنچا دیجیے گا۔'' میں نے ہنس کر اسپیڈو میٹر کی طرف دیکھا جس کی سوئی بڑی تیزی سے ستر کے ہندسے تک پہنچی تھی اور غالباً اس سے کچھ زیادہ آگے جانے کے موڈ میں تھی۔

سامعہ بھی ہنس پڑی اور بولی۔ ''آج آپ ڈرائیونگ میں میری مہارت بھی دیکھ لیں۔''

میں خاموش رہا۔ اپنے ہونٹوں پر مسکراہٹ بھی لے آیا تھا لیکن حقیقت یہ تھی کہ میں اس تیز رفتاری سے ڈر رہا تھا۔ یہ ایک عجیب بات ہے کہ جو لوگ خود ڈرائیونگ جانتے ہیں، وہ دوسروں کی تیز رفتار ڈرائیونگ سے ڈرتے ہیں۔

اس ڈر کے ساتھ مجھے یہ اطمینان بھی تھا کہ میں وقت پر احمر کے پاس پہنچ جاؤں گا اور یہ خوشی بھی تھی کہ میں اس گڑبڑ سے بچ نکلا تھا جو بازرگان میرے ساتھ کرنا چاہتا تھا۔ میری دانست میں یہ بات یقینی تھی کہ کوئی گڑبڑ ضرور ہوتی۔ بازرگان کا آدمی جب میرے قریب آیا تھا تو یقیناً اس کی نیت کچھ ٹھیک نہیں ہوگی۔ وہ مجھ سے بڑی شائستگی سے مخاطب ہوا تھا لیکن اس شائستگی کے پیچھے اس کے کچھ مذموم عزائم ضرور ہوں گے۔

سامعہ نے مجھ سے پھر کافرستان کی باتیں شروع کر دیں اور مجھے بھی جواباً کچھ کہنا پڑا لیکن میری خواہش تھی کہ وہ اپنی ساری توجہ ڈرائیونگ پر مرکوز رکھے۔

یکایک موبائل بجنے کی آواز سنائی دی جو میرے لیے نامانوس تھی۔ وہ میرا موبائل نہیں تھا لہٰذا ظاہر ہے کہ سامعہ ہی کا ہوگا جو اس کی گود میں پڑا تھا۔

''کیا مصیبت ہے۔'' بڑبڑاہٹ کے ساتھ سامعہ نے رفتار کچھ کم کرتے ہوئے موبائل اٹھا کر دیکھا اور چونکی۔ ''اوہ ڈیڈی!''

اس کے ان الفاظ نے مجھے بھی چونکایا۔

''یہ کال تو ریسیو کرنا ہی پڑے گی۔'' سامعہ نے رفتار کچھ اور کم کرتے ہوئے موبائل اپنے کان سے لگایا ''یس ڈیڈی!''

میں بہت غور سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ اس وقت میرے دل سے یہ ڈر بھی نکل گیا تھا کہ کار کی رفتار کم ہو جانے کے بعد بھی اچھی خاصی تھی۔

''نہیں، کوئی خاص پروگرام نہیں تھا ڈیڈی!'' سامعہ اپنے باپ سے کہہ رہی تھی۔ ''یوں ہی ..... بس تفریحاً نکل پڑی تھی ..... میں؟'' یکایک اس کا انداز سوالیہ ہو گیا اور پھر اس کے جواب سے میں نے سمجھ لیا کہ بازرگان نے اس سے پوچھا تھا کہ وہ اس وقت کہاں ہے۔ سامعہ نے اس جگہ کا نام بتایا تھا جہاں سے کار گزر رہی تھی۔ پھر اس نے دوسری طرف سے کچھ سن کر کہا۔ ''جی ہاں ڈیڈی! ..... اسی راستے میں ہے، وہ میڈیکل اسٹور! ..... جی! ..... جی بہتر! ..... میں لیتی آؤں گی ..... ارے نہیں ڈیڈی! ..... جب وہ میرے راستے ہی میں ہے تو میں بھولوں گی کیوں؟''

میں سمجھ گیا، بازرگان نے اس سے کہا تھا کہ وہ راستے میں پڑنے والے میڈیکل اسٹور سے کوئی دوا لیتی آئے۔ یہ سمجھنے کے بعد مجھے پھر خطرے کا احساس ہوا۔ بازرگان یقیناً بے خبر نہیں تھا کہ اس وقت میں سامعہ کے ساتھ تھا۔ اس سے یہ بات بھی پوشیدہ نہیں ہوگی کہ سامعہ کی کار اس وقت کہاں سے گزر رہی تھی۔ گویا یہ طے تھا کہ بازرگان کا آدمی ہمارے تعاقب میں ہوگا۔ اسی نے موبائل پر بازرگان کو اطلاع دی ہوگی۔

''دو منٹ سے زیادہ نہیں لگیں گے مجھے!'' سامعہ نے موبائل اپنی گود میں ڈالتے ہوئے مجھ سے کہا۔ ''راستے میں ایک میڈیکل اسٹور ہے۔ وہاں سے مجھے ڈیڈی کے لیے کچھ لینا ہے۔''

''کیا کچھ بیمار ہیں وہ؟'' میں نے ایسے لہجے میں پوچھا جیسے کوئی رسم ادا کی ہو۔

''ارے نہیں۔'' سامعہ نے کچھ منہ بنایا۔ ''میں تو اسے ان کا وہم ہی سمجھوں گی۔ کچھ عرصے سے وہ محسوس کرنے لگے

ہیں کہ ان کی یادداشت کم زور ہوتی جا رہی ہے۔ کسی ڈاکٹر نے نہیں کسی دوا کا نام بھی بتا دیا۔ کئی مہینے سے وہ ان کے استعمال میں ہے۔ میرا خیال ہے اس دوا کو مارکیٹ میں آئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔ میں نے تو وہ نام پہلی بار سنا ہے۔ نوٹرو پل۔''

یہ نام میں سن چکا تھا اور کیونکہ سامعہ بھی اس سے واقف تھی اس لیے یقیناً وہ بازرگان کے استعمال میں ہوگی۔ ایسی صورت میں یہ سوچا جا سکتا تھا کہ اس وقت بازرگان کا سامعہ کو فون کرنا محض اتفاق بھی ہو سکتا ہے لیکن یہ سوچ لینے کے باوجود میں اندرونی بے چینی کو دبانے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ میری یہ کیفیت سامعہ سے بھی پوشیدہ نہیں رہی لیکن وہ کچھ اور سمجھی۔

''آپ پریشان نہ ہوں۔'' وہ بولی۔ ''میں نے کہا نا کہ مجھے دو منٹ سے زیادہ نہیں لگیں گے۔ میرا دعویٰ ہے کہ میں اب بھی آپ کو وقت پر پہنچا دوں گی۔'' اس نے رفتار کم کرنا شروع کی۔ ''اسٹور قریب آ گیا ہے۔''

''میں نے دیکھا ہے۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا۔ ''میں آپ کو چھوڑنے کے بعد بھی کسی میڈیکل اسٹور سے وہ دوا لے سکتی تھی لیکن اب ڈیڈی کہہ چکے ہیں کہ وہ میں یہیں سے لے لوں۔ ہو سکتا ہے یہ میڈیکل اسٹور والا ڈیڈی کو جانتا ہو۔ اگر میں نے دوا یہاں سے نہ لی تو ڈیڈی کو پتا چل جائے گا۔ بات تو معمولی سی ہے لیکن میں آپ کو بتایا تھا نا کہ ڈیڈی کچھ عرصے سے کچھ چڑچڑے ہو گئے ہیں۔''

''یادداشت کم زور ہونے سے ..... شاید ایسا بھی ہوتا ہو۔'' میں نے مسکرانے کی کوشش کی۔

''ابھی مجھے خیال آیا۔'' سامعہ جلدی سے بولی۔ ''یادداشت کم زور ہونے لگے تو بھی شاید انسان غلط فہمیوں کا شکار ہونے لگتا ہے۔ میرا مطلب ہے، وہ آپ کے معاملے میں .....''

''میں سمجھ رہا ہوں آپ کی بات۔''

سامعہ نے کار روک دی۔ وہاں میڈیکل اسٹور کے قریب کچھ دکانیں کھانے پینے کی اشیا کی بھی تھیں اس لیے یہاں سناٹا نہیں تھا۔ اس رونق کی وجہ سے میں نے کچھ اطمینان محسوس کیا۔

''بس ابھی آئی۔'' سامعہ نے ہینڈ بریک لگاتے ہوئے ہیٹر بھی بجائی اور گود میں پڑا ہوا موبائل اٹھاتی ہوئی کار سے اتر گئی۔ دروازہ بند کر کے وہ تیزی سے میڈیکل اسٹور کی طرف بڑھ گئی تھی۔

میلے کچیلے لباس میں ایک ہیرو نچی آیا اور میری ہی جانب کھڑا ہو کر کپڑے سے ونڈ اسکرین صاف کرنے لگا۔ اس کے لباس سے آتی ہوئی بو مجھے بہت گراں گزر رہی تھی۔ میں نے اس سے پیچھا چھڑانے کے لیے جلدی سے ایک نوٹ نکالا اور اس کی طرف بڑھا دیا۔

''بس جاؤ، صفائی کی ضرورت نہیں ہے۔''

جب کار رکی تھی تو میں نے سوچا تھا کہ پوری طرح چوکنا رہوں گا لیکن اس ہیرو نچی کی وجہ سے چند لمحوں کے لیے میرا دھیان بٹا اور وہی چند لمحے مجھے مہنگے پڑے ورنہ میں کسی اجنبی کو اتنی آسانی سے دروازہ کھول کر کار میں نہ آنے دیتا۔

''اس ریوالور کی ایک گولی ..... تمہیں دوسری دنیا کی سیر کرا سکتی ہے۔'' ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ہوئے اجنبی نے انگریزی میں کہا۔

مجھے فوراً خیال آیا کہ منصوبہ مجھے اغوا کرنے کا تھا لیکن یہ شاید ممکن نہ ہوتا۔ کار کی چابی سامعہ اپنے ساتھ ہی لے گئی تھی لیکن اگر یہ میرے لیے اطمینان کی بات تھی تو وہ اطمینان جلد ہی رخصت ہو گیا۔ اجنبی بڑی پھرتی سے پچھلی سیٹ پر چلا گیا تھا۔

''خبردار جو تم نے اپنی ساتھی کو ذرا بھی کوئی اشارہ دینا چاہا۔'' اجنبی کی آواز دھیمی مگر لہجے میں سفاکی تھی۔ ''میں ڈرائیونگ سیٹ کے پیچھے بیٹھے بیٹھے بھی تمہاری کھوپڑی کا نشانہ لے سکتا ہوں۔''

میں سن ہو کر رہ گیا۔ چند لمحوں کے لیے شاید میرے دماغ نے بھی کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔ صورتِ حال اتنی ہی تیزی سے بدلی تھی کہ میری جگہ کوئی اور عام آدمی ہوتا تو اس کا دماغ بھی کام کرنا چھوڑ دیتا۔ میں نے اس وقت ایک خواب کی طرح محسوس کیا کہ سامعہ واپس کار میں آ بیٹھی تھی۔

''میں نے کہا تھا نا کہ مجھے دو منٹ سے زیادہ نہیں لگیں گے۔'' وہ کار اسٹارٹ کرتے ہوئے بولی۔ ''نوٹرو پل'' کا ڈبا اس نے اوپر ہی ڈال دیا تھا۔

اس کی آواز مجھے چند لمحوں کے خواب سے باہر لے آئی۔

''آپ گم کیوں ہو گئے پرویز صاحب!'' وہ کار حرکت میں لاتے ہوئے بولی۔ ''میں نے آپ سے وعدہ کیا ہے کہ میں آپ کو وقت پر پہنچا دوں گی۔''

وہ میرے گم صم ہو جانے کی اصل وجہ سمجھ ہی نہیں سکتی تھی۔ ریوالور والا پچھلی نشست پر نہیں بلکہ ڈرائیونگ سیٹ کے پیچھے پائیدان پر بیٹھا تھا۔ سامعہ عقب نما آئینے میں اس کا

عکس بھی نہیں دیکھ سکتی تھی۔

میرا دماغ سوچنے سمجھنے کے قابل ہوا تو مجھے خیال آیا کہ میرا اغوا اس صورت میں کس طرح ممکن ہے جبکہ ڈرائیونگ سامعہ کر رہی تھی۔

لیکن میرا یہ خیال بھی فوراً ہی ہوا ہو گیا۔

عقب سے ایک اور ریوالور کی نال سامعہ کے سر سے لگا دی گئی۔

''یہ ریوالور ہے بے بی!''

اسٹیرنگ پر سامعہ کے ہاتھ ڈگمگا گئے۔ اچھا یہ ہوا کہ ابھی رفتار میں اضافہ نہیں ہوا تھا ورنہ کار کہیں ٹکرا بھی سکتی تھی۔ پھر فوراً ہی یہ بھی ہوا کہ بوکھلاہٹ میں سامعہ کا پیر کلچ سے پھسل گیا اور انجن بند ہونے کے ساتھ ہی کار ایک جھٹکے سے رک گئی۔

''ٹھیک ہے۔ کوئی بات نہیں۔ دوبارہ اسٹارٹ کرو۔'' عقب سے کہا گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ بولنے والے نے اپنی آواز بدلنے کی کوشش کی تھی اور ایسا اس نے سامعہ کے آنے کے بعد کیا تھا۔ گویا اسے شاید یہ ڈر تھا کہ سامعہ اس کی آواز پہچان لے گی۔

سامعہ نے بوکھلائے ہوئے انداز میں میری طرف دیکھا لیکن میں بس اس کا منہ ہی تکتا رہ گیا۔ اس صورتِ حال میں کہتا بھی کیا؟

''چلو بے بی!'' عقب سے غراتی ہوئی آواز میں کہا گیا۔ ''دوبارہ اسٹارٹ کرو۔ میرے دونوں ہاتھوں میں ریوالور ہیں۔ میں ایک ہی وقت میں تم دونوں کو ختم کر سکتا ہوں۔''

سامعہ کے ہونٹ بھنچ گئے۔ اس نے اپنی بوکھلاہٹ پر قابو پا لیا تھا۔

''نہیں کروں گی اسٹارٹ۔'' وہ آہستہ سے بولی۔ ''تم ہمیں اغوا کرنا چاہتے ہو اس لیے ہمیں ہلاک نہیں کرو گے۔''

''اگر تم یہ سمجھتی ہو تو میں تمہیں ایک اور بات بتا دوں۔ اب کار جس جگہ کھڑی ہے یہاں سناٹا ہے۔ آس پاس جو دو چار آدمی نظر آ رہے ہیں، وہ میرے ساتھی ہیں۔ میرا اشارہ ملتے ہی وہ یہاں آ جائیں گے اور تم دونوں کو بے بس کر دیا جائے گا۔ اگر تم نے چیخنے چلانے کی کوشش کی تو تمہارے سر پر میرے ریوالور کی ایک ہی ضرب تمہیں بے ہوش کر دے گی۔ تم سے ہماری کوئی دشمنی نہیں ہے لیکن یہ جو تمہارے ساتھ ہے، اسے ہلاک کرنے کا مجھے کوئی افسوس نہیں ہوگا۔''

اس نے جو کچھ کہا تھا، وہ دھمکی بھی ہو سکتی تھی لیکن یہ ضروری بھی نہیں تھا۔

''کار چلاؤ سامعہ!'' میری آواز بھرائی ہوئی تھی۔

''آخر آپ سے کسی کو کیا دشمنی ہو سکتی ہے؟'' سامعہ نے میری طرف دیکھا۔

''سنو بے بی!'' پیچھے سے بڑے کھردرے لہجے میں کہا گیا۔ ''اب اگر تم نے کار اسٹارٹ کرنے میں دیر کی تو میں تمہیں بے ہوش کرنے میں دیر نہیں لگاؤں گا۔''

''چلو سامعہ!'' میں پھر بولا۔ ''یہ بعد میں دیکھا جائے گا کہ یہ لوگ آخر مجھ سے چاہتے کیا ہیں۔''

سامعہ کے چہرے پر اب الجھن کے تاثرات نہ تھے۔ اس نے کار بہرحال اسٹارٹ کی اور اسے حرکت میں لے آئی۔

جب میں نے سامعہ کو اغوا کیا تھا، اس وقت بھی میں طے کر چکا تھا کہ سامعہ خاصی نڈر لڑکی ہے۔

''رفتار ذرا تیزی سے بڑھاؤ بے بی!'' عقب سے کہا گیا۔

سامعہ نے رفتار میں اضافہ شروع کیا۔ اس کے ہونٹ بھنچے ہوئے تھے۔ چہرے سے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ خاص سوچ میں ڈوب گئی ہو۔

میں کن انکھیوں سے اس شخص کو دیکھ سکتا تھا جو ڈرائیور سیٹ کے پیچھے چھپا بیٹھا تھا۔ اس کے ایک ریوالور کی نال میری طرف تھی اور دوسرے ریوالور کی نال سامعہ کے سر سے لگی ہوئی تھی۔

یہ اب میری سمجھ میں آ چکا تھا کہ سفاری پارک سے مجھے اغوا ہی کیا جاتا مگر اچانک سامعہ کے آ جانے کی وجہ سے بازرگان کا آدمی مجھ سے دور ہو گیا ہوگا۔ اس کی رپورٹ نے بازرگان کو دی ہوگی۔ پہلے تو بازرگان یہ نہیں چاہتا ہوگا کہ مجھے سامعہ کے سامنے اغوا کیا جائے لیکن پھر شاید اسے یہ فیصلہ کرنا پڑا کہ وہ سامعہ کی موجودگی کی پروا نہ کرے۔ اس نے منصوبہ بندی اس طرح کی کہ سامعہ کو ایک میڈیکل ٹیسٹ پر رکنا پڑے۔ اپنے آدمیوں کو اس نے پہلے ہی سے ہدایات دیا جو مجھے سامعہ ہی کی کار میں اغوا کر لیں۔ ایک امکان یہ تھا کہ ایک ہیروئنچی کو بھی کچھ دے دلا کر اس کے لیے استعمال کر لیا گیا چند لمحوں کے لیے بڑی میری توجہ اس کی طرف مبذول ہو سکے اور اس مہلت سے فائدہ اٹھا کر وہ آسانی کار میں گھس آئے۔

یہ بات طے تھی کہ اس سارے کھیل میں بازرگان کا ہاتھ تھا اور سامعہ اس شخص سے بھی واقف تھی جو اس

کے سر پر ریوالور کی نال لگائے بیٹھا تھا۔ اسی لیے سامعہ کے کار میں آنے کے بعد اس نے آواز بدل کر بولنے کی کوشش کی تھی۔ وہ نہیں چاہتا ہوگا کہ سامعہ اسے پہچان لے۔

میری سمجھ میں یہ نہیں آ سکا کہ مجھے اغوا کر کے بازرگان کیا مقصد حاصل کرنا چاہتا ہے۔ احمر مجھے بتا چکی تھی کہ وہ لوگ اب اسے اس کے بابا کی حفاظت میں سمجھ رہے تھے اس لیے ان لوگوں کا مقصد یہ تو نہیں ہونا چاہیے تھا کہ وہ مجھ سے احمر کے بارے میں پوچھنا چاہتے۔ ان لوگوں کو تو اب یہ یقین ہونا چاہیے تھا کہ میں بھی اس بات سے بے خبر ہوں گا کہ احمر اب کہاں ہے۔

ان تمام خیالات کے ساتھ مجھے جھنجلاہٹ عندلیب پر بھی ہو رہی تھی۔ اسے سوچنا چاہیے تھا کہ سفاری پارک جا کر بازرگان کی بیٹی سے ملنا بھی تو میرے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ وہ کلب میں مجھے اس قسم کی کچھ وارننگ بھی دے چکا تھا کہ اب میں اس کی بیٹی کے قریب دوبارہ نظر نہ آؤں۔

اوہ، مجھے خیال آیا، کیا بازرگان مجھے اس کی سزا دینا چاہتا ہے کہ میں اس کی بیٹی کے ساتھ تھا؟

میرا ذہن اسی خیال پر اٹکنے لگا۔

''رفتار اور بڑھاؤ بے بی!'' عقب سے حکم دیا گیا۔

''نہیں بڑھاؤں گی۔'' سامعہ کے سخت لہجے نے مجھے چونکایا۔ ''تم مجھے یہ بتاؤ کہ میرے دوست کو کہاں لے جانے کی ہدایت ملی ہے تمہیں ڈیڈی سے!''

میں چونکا تو تھا ہی، اب حیران بھی رہ گیا کہ سامعہ نے حقیقت سمجھ لی تھی۔ اس کی ذہانت کا معترف تو میں بہرحال تھا۔

''کون ڈیڈی؟'' عقب سے سخت لہجے میں کہا گیا۔ ''کس کی بات کر رہی ہو تم؟''

''تم آواز بدل کر بولنے کی کوشش کر رہے ہو لیکن میں نے تمہیں پہچان لیا ہے۔'' سامعہ نے کچھ تلخ لہجے میں کہتے ہوئے عقب نما آئینے کا زاویہ اس طرح بدلا کہ اپنی نشست کے عقب میں دیکھ سکے۔

''کیا تم کچھ پاگل ہو لڑکی؟'' عقب سے کہا گیا۔ ''میں آواز بدل کر کیوں بولوں گا؟''

''اس لیے کہ میں تمہیں کم از کم فوری طور پر تو نہ پہچان سکوں۔'' سامعہ نے جواب دیتے ہوئے غالباً ایکسلریٹر سے پیر ہٹایا اور اتنی زور سے بریک لگائے کہ چرچراہٹ کی آواز کافی دور تک پھیلی ہوگی۔

کار ایک جھٹکے سے رکی اور میں بہ مشکل خود کو آگے کی طرف گرنے سے بچا سکا۔

مجھے اب کچھ کچھ یاد آ رہا ہے کہ بریک لگا کر اس طرح کار روکتے وقت سامعہ کی نظر عقب نما آئینے پر رہی تھی۔ غالباً اس نے سوچا تھا کہ اگر اسے بے ہوش کرنے کے لیے اس کے سر پر ضرب لگانے کی کوشش کی جائے تو وہ خود کو اس ضرب سے بچانے کی کوشش کر سکے۔

کار رکتے ہی وہ آگے کی طرف جھک گئی۔ اس طرح بھی وہ یقیناً خود کو ریوالور کی ضرب سے بچانا چاہتی ہوگی۔ آگے جھکتے ہی اس نے مدد کے لیے بھی چیخنا چلانا شروع کر دیا۔

اچانک کار رکنے کے جھٹکے سے ریوالور والے نے بھی خود کو سنبھال لیا تھا اور جب میں سنبھلا تو میں نے دیکھا کہ ریوالور کی نال بدستور میری طرف اٹھی ہوئی تھی۔

وہ تقریباً ایک ویران سی سڑک تھی لیکن پیچھے سے آنے والی دو کاریں بڑی تیزی سے ہمارے قریب رکیں۔ سامعہ نے غالباً عقب نما آئینے میں وہ کاریں دیکھنے کے بعد ہی یہ حرکت کی تھی۔ اس طرح اسے مدد مل جانے کی توقع ہوگی۔

دونوں کاروں سے کئی آدمی اتر کر ہماری طرف لپکے۔

سامعہ اب بھی آگے کی طرف جھکی ''ہیلپ'' ''ہیلپ'' چیخ رہی تھی اس لیے وہ نہیں دیکھ سکی کہ ان دونوں کاروں سے اترنے والے ہماری کوئی مدد نہیں کر سکتے تھے۔ ان میں ایک بازرگان خود تھا لہٰذا باقی بھی اسی کے آدمی ہو سکتے تھے۔

''چپ ہو جاؤ سامعہ!'' بازرگان نے قریب آ کر ڈانٹنے والے انداز میں کہا۔ سامعہ چپ ہو گئی۔ باپ کی آواز سن کر اسے یقیناً اچھا خاصا ذہنی جھٹکا لگا ہوگا۔

میں جواب تک خاموشی سے سوچ رہا تھا کہ اپنے بچاؤ کے لیے مجھے کسی مناسب موقع کا انتظار کرنا چاہیے، اب یہ یقین کرنے پر مجبور ہو گیا کہ اب کوئی اور موقع آنے کا امکان نہیں رہا۔ سامعہ کی یہ بات بھی میرے ذہن میں تھی کہ اگر کسی کو اغوا کرنے کی منصوبہ بندی کی جائے تو اسے ہلاک نہیں کیا جاتا۔ ریوالور کی نال مجھے صرف دھمکانے کے لیے میری طرف اٹھی ہوئی تھی۔ میں نے بڑی تیزی سے اپنا دایاں ہاتھ گھما کر ریوالور والے کی کلائی پر مارا۔ پھر میں فوراً ہی جیب سے اپنا اسمتھ اینڈ ویسن نکال کر، ان لوگوں کو خود سے دور رکھنے کے لیے دو ایک ہوائی فائر ہی کر ڈالتا لیکن مجھے اس کی مہلت نہیں مل سکی۔

کار کا پچھلا دروازہ کھول کر تین آدمی اندر آ گئے تھے اور انہوں نے مجھے جکڑ لیا تھا۔ پھر انہوں نے مجھے پچھلی سیٹ پر

گھسیٹ بھی لیا۔

دوسری طرف بازرگان نے بھی دروازہ کھول کر سامعہ کو ڈرائیونگ سیٹ سے باہر کھینچ لیا۔

''یہ سب کیا ہو رہا ہے ڈیڈی!'' سامعہ ہذیانی انداز میں چیخی۔ ''آپ اس طرح میرے دوست کو اغوا نہیں کروا سکتے۔ میں.....''

سامعہ کچھ اور بھی کہنا چاہتی تھی لیکن اس کی آواز جیسے گھٹ کر رہ گئی۔ بازرگان نے خدا جانے اس کا منہ دبایا تھا یا گردن ہی دبا دی تھی۔

کچھ ایسی ہی حالت میری بھی ہوئی تھی۔ مجھے پچھلی سیٹ پر گھسیٹنے کے بعد بڑی پھرتی سے میرے منہ پر ایک چوڑا ٹیپ چپکا دیا گیا تھا۔

''ذرا بھی آواز نکالنے کی کوشش نہ کرنا۔'' کسی نے غرا کر کہا تھا۔ ''ورنہ سمجھ لو کہ تمہیں بے ہوش کر دیا جائے گا۔''

میں نے ہاتھ پیر ڈھیلے چھوڑ دیے۔ میرے حق میں یہ زیادہ بہتر تھا کہ وہ لوگ مجھے بے ہوش نہ کریں۔ یہ اندازہ تو میں نہیں لگا سکتا تھا کہ وہ مجھے بے ہوش کرنے کے لیے کیا کرتے لیکن وہ کچھ بھی کر سکتے تھے۔ میں اس وقت بہر حال انہی کے قبضے میں تھا۔

میں نے بے بسی کے عالم میں دیکھا کہ بازرگان سامعہ کو زبردستی دوسری کار کی طرف لے گیا تھا۔ کسی نے اس کار کا دروازہ کھولا اور سامعہ کو اس کار میں ڈال دیا گیا۔ فوراً ہی وہ کار حرکت میں آ گئی۔

جو لوگ مجھے جکڑے ہوئے تھے' انہی میں سے ایک نے اچانک بلند آواز میں کچھ کہا اور مڑ کر کار کے پیچھے دیکھنے لگا۔

اس مرتبہ انگریزی کے بجائے فارسی بولی گئی تھی۔ میری سمجھ میں صرف دو لفظ آ سکے۔ ''کمانڈر'' اور ''کار''

اس سے یہی اندازہ لگا سکا کہ پیچھے کوئی کار آ رہی تھی اور کمانڈر بازرگان کو اس سے آگاہ کیا گیا تھا۔

بازرگان اس آگاہی سے ایک لمحہ پہلے ہی واپسی کے لیے مڑ چکا تھا۔ وہ لپکتا ہوا کار کے قریب آیا اور ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھول کر کار میں آ بیٹھا۔

جس کار میں سامعہ کو دھکیلا گیا تھا، وہ تیزی سے آگے بڑھتی چلی گئی تھی۔ بازرگان نے انجن اسٹارٹ کرنے میں ایک پل کی بھی تاخیر نہیں کی۔

چالی شاید کار ہی میں رہ گئی تھی یا بازرگان وہ سامعہ کے ہاتھ سے چھین لایا ہوگا۔

میں نے محسوس کیا کہ میرے جسم پر ہاتھ پھیرا گیا تھا اور پھر میری جیب سے میرا اسمتھ اینڈ ویسن نکال کر مجھے فری کر دیا گیا۔

بازرگان نے تیزی سے رفتار بڑھاتے ہوئے ایک کانٹا اور فارسی ہی میں کچھ کہا۔ میرے ساتھ بیٹھے آدمیوں میں سے ایک نے پھر مڑ کر دیکھا اور دیکھتا رہا۔ غالباً اسے ہدایت کی گئی تھی کہ وہ پیچھے نظر رکھے اور بازرگان کو بتائے جو کار دیکھی گئی تھی' وہ مڑ کر اس طرف آتی ہے یا نہیں۔

بازرگان نے کار کی رفتار میں بے تحاشا اضافہ کیا لیکن جلد ہی اس نے رفتار کم کر دی جب میرے ساتھ بیٹھے ہوئے پیچھے دیکھنے والے شخص نے زرگان سے کچھ کہا۔

رفتار کم کرتے ہوئے بازرگان کا انداز کچھ ایسا تھا جیسے وہ مطمئن ہو گیا ہو۔ میں ایسی پوزیشن میں تھا کہ صرف اندازے ہی لگا سکتا تھا۔ غالباً بازرگان کو یہ بتا دیا گیا تھا کہ کار دیکھی گئی تھی، وہ ہمارے پیچھے نہیں آئی تھی۔

بازرگان نے عقب نما آئینے کا زاویہ ویسے ہی کر دیا، جو سامعہ نے پچھلی سیٹ پر نظر رکھنے کے لیے تبدیل کیا تھا۔

''تم نے ضرور سمجھ لیا ہوگا کہ صورتِ حال اب تمہارے حق میں نہیں ہے۔'' بازرگان نے عقب نما آئینے میں مجھے دیکھتے ہوئے انگریزی میں کہا۔ ''تمہیں بے ہوش کیے نہیں کیا گیا کہ میں تم سے باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ تمہارے ہونٹوں پر چپکا ہوا ٹیپ ہٹا دیا جائے گا۔ فیصلہ تم کر لینا کہ تم بے ہوش ہونا پسند کرو گے یا ہوش میں رہنا۔''

میرے ساتھ بیٹھے ہوئے آدمیوں کے لیے یہ اشارہ کافی تھا۔ میرے ہونٹوں پر چپکا ہوا ٹیپ اکھاڑ دیا گیا۔ یہ کام اتنی بے دردی سے کیا گیا کہ میرے منہ سے سسکاری نکل گئی۔

بازرگان نے فارسی میں بھی کچھ کہا اور میرے ساتھ بیٹھے ہوئے آدمیوں میں سے ایک اگلی سیٹ پر چلا گیا۔ دونوں میرے دائیں بائیں بیٹھے رہے۔ انہوں نے ایک ایک کلائی بڑی مضبوطی سے پکڑ رکھی تھی حالانکہ مجھے مسلح کیا جا چکا تھا۔

''ٹھیک ہے نا اب!'' بازرگان انگریزی میں بولا۔ ''یقیناً تم ہوش میں رہنا پسند کرو گے۔''

''تمہاری اس حرکت کا کوئی جواز نہیں ہے بازرگان۔'' میں نے کچھ غصے کا اظہار کیا۔ ''آج بھی میں تمہاری بیٹی سے خود نہیں ملا تھا، اسی نے مجھے.....''

''بے کار باتوں میں میرا وقت ضائع نہ کرو۔'' بازرگان میری بات کاٹتا ہوا بولا۔ ''اس وقت مجھے اس سے کوئی غرض نہیں ہے کہ میری بیٹی سے ملنے کی خواہش تمہیں تھی یا اس نے تمہیں بلایا تھا۔''

''پھر کیا مقصد ہے مجھ سے اس طرح پیش آنے کا؟'' میں نے اپنے لہجے سے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی کہ میں اس صورتِ حال سے خوف زدہ تو کیا، پریشان بھی نہیں ہوں۔

''احمر کہاں ہے؟'' بازرگان نے سوال کیا۔

''بے تکا سوال کیا ہے تم نے۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ احمر کی تلاش اب ہمیں بھی ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ مجھے اس کے سوال پر حیرت بھی ہوئی تھی۔ میرے خیال کے مطابق وہ جانتا تھا کہ احمر اب کس کی حفاظت میں تھی۔

''بے تکا سوال نہیں ہے یہ۔'' بازرگان بولا۔ ''کچھ دن تک تم لوگ یقیناً اس کے لیے پریشان رہے ہو لیکن آج کل ایسا نہیں ہے..... تم بھی مطمئن ہو اور تمہاری ایس ڈی ایم دوست مندلیب بھی!..... اسی لیے میں تم سے معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ ان دنوں تم جس فلیٹ میں جا کر وقت گزارتے رہے ہو، وہاں کون کون رہتا ہے؟''

احمر کی طرف سے بازرگان کی بے خبری کا اظہار تو میرے لیے الجھن کا سبب بنا ہوا تھا ہی، اس کے سوال نے مجھے پریشان بھی کر دیا۔ اس سوال کا مطلب یہ تھا کہ ان دنوں میری نگرانی کی جاتی رہی ہے اور میں اس سے بے خبر رہا تھا۔ مندلیب کئی مرتبہ مجھ سے کہہ بھی چکی تھی کہ میں اپنے اردگرد کے ماحول سے باخبر رہنے کی عادت ڈالوں۔

''چپ کیوں ہو گئے؟'' بازرگان بولا۔ ''کیا احمر اسی فلیٹ میں ہے؟''

''تمہارا دماغ کچھ زیادہ ہی اڑان بھرنے لگا ہے!'' میں نے کوشش کر کے اپنا لہجہ طنزیہ بنایا تھا ورنہ حقیقت تو یہ تھی کہ بازرگان کی ان باتوں کے باعث میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی تھی۔ یہ میرے لیے ایک ہولناک انکشاف تھا کہ بازرگان کو احمر کے فلیٹ کا علم ہو گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی میری یہ الجھن بھی برقرار تھی کہ بازرگان اس فلیٹ کے مالک کی شخصیت سے بے خبر کیوں ہے۔

''اندازے لگانے میں مجھ سے بہت کم غلطی ہوتی ہے۔'' بازرگان نے کہا۔ ''یہ تو میں جانتا ہوں کہ اس فلیٹ میں ایک بڈھا رہتا ہے لیکن یہ مجھے نہیں معلوم کہ اس کے علاوہ وہاں کون ہے۔ تم کس سے ملنے جاتے ہو؟ اس بڈھے کی عدم موجودگی میں تم وہاں کس کے ساتھ وقت گزارتے ہو؟''

میرا دم بخود رہ گیا۔ ''بڈھے'' کا لفظ بازرگان کی زبان پر اسی صورت میں آ سکتا تھا جب وہ احمر کے بابا کی شخصیت سے واقف ہو گیا ہو لیکن حیرت کا مقام یہ تھا کہ وہ اس شخص کا ذکر اتنی حقارت سے کر رہا تھا حالانکہ احمر کے بیان کے مطابق احمر کا وہ ''بابا'' انہی لوگوں کے مذہب کے پیروکاروں میں سے تھا، اب سب سے بڑا اسرار یہی تھا مگر بس ان کا ساتھی نہیں تھا۔

''جواب دو۔'' بازرگان نے سخت لہجے میں کہا۔ ''وہاں احمر ہی ہے نا؟''

میں نے اپنے دماغ پر چھا جانے والی بوکھلاہٹ پر قابو پانے کی کوشش کی اور کہا۔ ''اگر وہاں احمر ہوتی اور تمہیں اس کا شبہ بھی ہو جاتا تو کیا وہ وہاں محفوظ رہ سکتی تھی؟''

''وہ فلیٹ کچھ اس قسم کا ہے۔'' بازرگان نے کہا۔ ''وہاں سے ہم نے احمر کو زبردستی نکالنے کی کوشش کی تو خاصا ہنگامہ ہو جائے گا جو میں نہیں چاہتا۔ ہم اسے وہاں سے خاموشی کے ساتھ نکال لانا چاہتے ہیں لیکن اس کوشش میں ہمیں کامیابی نہیں ہو سکی۔ اس سلسلے میں ذرا دیر پہلے بھی ایک کوشش کی جا چکی ہے۔ میں نے اپنے دو آدمی بھیجے تھے۔ اس بڈھے کے جانے کے بعد میرے آدمیوں نے کئی مرتبہ کال بیل کا بٹن دبایا تھا لیکن کسی نے دروازہ نہیں کھولا، جیسے وہاں کوئی موجود ہی نہ ہو۔''

میں اس وقت بڑی غیر یقینی صورتِ حال سے دوچار تھا لیکن یہ جان کر مجھے بے حد خوشی ہوئی کہ میری احتیاط کام آ گئی تھی۔ میں نے پہلی ہی ملاقات میں اس سے کہہ دیا تھا کہ جب میں آ کر کال بیل بجاؤں تو وہ دروازہ کھولنے سے پہلے پوچھا نہ کرے کہ کون ہے۔ اس کے بجائے وہ دبے قدموں دروازے کے قریب آ کر انتظار کیا کرے۔ جب مجھے اندازہ ہو جائے گا کہ وہ دروازے کے قریب آ چکی ہوگی تو میں خود ہی اپنا نام بتا دیا کروں گا۔

احمر کو یہ ہدایت دیتے ہوئے میرے ذہن میں صرف یہ خیال تھا کہ اگر کوئی اجنبی غلطی سے اس فلیٹ کی کال بیل کا بٹن دبا دے تو اسے بھی احمر کی آواز سننے کا موقع نہ مل سکے۔

یہ تو میرے سان گمان میں بھی نہیں تھا کہ میری اس ہدایت کے باعث احمر کسی وقت بازرگان کے شکنجے میں آنے سے بچ جائے گی۔

''تم بار بار خاموش کیوں ہو جاتے ہو!'' بازرگان نے جھنجلا کر کہا۔ ''میں نے تمہارے منہ سے ٹیپ اس لیے ہٹوایا ہے کہ تم میری باتوں کا جواب دے سکو۔''

اسی وقت میری جیب میں پڑا ہوا موبائل فون گنگنایا۔ بازرگان نے چونک کر فارسی میں اپنے آدمیوں سے کچھ کہا۔

میرے دائیں جانب بیٹھے ہوئے آدمی نے فوراً میری جیب میں ہاتھ ڈال کر موبائل نکال لیا۔

میرے خیال کے مطابق وہ احمر کی کال ہوسکتی تھی۔ مجھے اس تک پہنچنے میں دیر ہوگئی تھی اس لیے اس کا مجھے فون کرنا ایک فطری امر تھا۔ میں نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ میں نے جو موبائل فون احمر کو دیا تھا، اس کا نمبر میں نے اس کے نام کے ساتھ اپنے موبائل میں ''فیڈ'' کرنے کی ضرورت ہی نہیں محسوس کی تھی۔ وہ نمبر مجھے ویسے ہی بہت اچھی طرح یاد تھا کیونکہ وہ عرصے تک میرے استعمال میں رہ چکا تھا۔

لیکن وہ کال احمر کی تھی ہی نہیں۔ موبائل فون پر کال کرنے والے کا نمبر دیکھنے کے بعد بازرگان کے آدمی نے بازرگان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''عندلیب۔''

بازرگان نے رک کر غالباً کچھ سوچا، پھر فارسی میں کچھ کہا۔ اس کے آدمی نے میرا موبائل ''پاور آف'' کر کے واپس میری جیب میں ڈال دیا۔

یکا یک مجھے ایک عجیب سا احساس ہوا جسے مایوسی ہی کہا جاسکتا ہے۔ غالباً میرے لاشعور میں کہیں یہ موہوم سی امید تھی کہ عندلیب مجھ پر گزرنے والی صورتِ حال سے بے خبر نہیں ہوگی لیکن اس کی کال کا مطلب میری دانست میں یہ تھا کہ وہ سامعہ سے میری ملاقات کی تفصیل جاننا چاہتی ہوگی۔ اس کال کی وجہ سے وہ موہوم سی امید میرے لاشعور سے شعور تک آئی اور دم توڑ گئی۔

کار اس وقت ایک نہایت بارونق سڑک سے گزر رہی تھی جہاں ہر طرف روشنی ہی روشنی تھی لیکن میں خود کو ایک ایسے اندھیرے میں محسوس کر رہا تھا جہاں میرے کسی بھی خواہ کی نظر نہیں پہنچ سکتی تھی۔

''کیا میں تمہارے منہ پر پھر ٹیپ لگوا دوں؟'' بازرگان کا لہجہ بے حد غصیلا تھا۔

''میں تمہاری احمقانہ بات کا آخر کیا جواب دوں!'' میں نے بہ دستور بے باکانہ انداز اختیار رکھنے کی کوشش کی۔ ''جب کال بیل بجانے کے بعد بھی تمہارے آدمیوں کو وہاں سے کوئی جواب نہیں ملا تو اس کا مطلب اس کے علاوہ کیا ہوسکتا ہے کہ وہ اس فلیٹ میں کوئی نہیں ہوگا۔''

''تم اس خالی فلیٹ میں جا کر جھک مارتے ہو!'' بازرگان جھنجلا سا گیا۔

''میں تمہیں صاف صاف بتا دیتا ہوں۔'' مجھے کوئی اور جھوٹ نہیں سوجھا۔ ''میرا مزاج خاصا عیاشانہ ہے لیکن وہ سب کچھ میں بہت رازداری سے کرتا ہوں۔ میں فون کر کے اس فلیٹ میں کسی پروفیشنل لڑکی کو بلا لیتا ہوں۔''

''بکواس کر رہے ہو تم!'' بازرگان بولا۔ ''تم جتنی دیر بھی اس فلیٹ میں رہے ہو، وہاں کسی لڑکی کو جاتے ہوئے نہیں دیکھا گیا۔''

''اگر تمہارے آدمی وہاں آنے والی لڑکیوں کو نہ دیکھ سکے تو اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔'' میں اپنے جھوٹ پر ڈٹا رہا۔

اس سے پہلے کہ بازرگان پھر جھنجلاتا یا غصے کا اظہار کرتا، موبائل فون کی گنگناہٹ سنائی دی جو میرے لیے مانوس نہیں تھی۔ ویسے بھی میرا فون تو ان لوگوں نے ''پاور آف'' ہی کر دیا تھا۔ وہ آواز بازرگان کے موبائل فون کی تھی۔ اس نے وہ اپنی جیب سے نکالا اور کان سے لگایا۔

گفتگو کیونکہ فارسی میں شروع ہوئی تھی اس لیے قدرتی طور پر میری توجہ اس کی طرف مرکوز نہیں رہ سکی۔ میں یہ سوچنے لگا کہ کار اتنی کم رفتار سے کیوں چلائی جا رہی تھی۔ کیا بازرگان کار ہی میں بیٹھے بیٹھے مجھ سے گفتگو جاری رکھنا چاہتا تھا؟

یہ وہ سوال تھا جو دوسرے بہت سے خیالات کے ہجوم سے میرے دماغ میں اٹھا تھا۔ اس وقت سوچنے کے لیے میرے پاس صرف یہ بات نہیں تھی کہ کار اتنی کم رفتار سے چلانے کا کیا مقصد تھا؟

بازرگان نے جلد ہی موبائل بند کر کے اپنی جیب میں ڈال لیا۔ میں نے عقب نما آئینے میں اس کے چہرے کے عکس کی طرف دیکھا۔ مجھے اس کے ہونٹوں پر آسودگی ایسی مسکراہٹ دکھائی دی جو سفاکانہ بھی تھی۔

روشنیوں سے معمور اس سڑک پر مجھے عقب نما آئینے میں سب کچھ صاف صاف نظر آ رہا تھا۔ میری آنکھیں بازرگان کے چہرے کے عکس کی آنکھوں سے چار ہوئیں اور وہ دھیرے سے اس طرح ہنسا جیسے میرا مذاق اڑا رہا ہو۔ کم از کم مجھے ایسا ہی لگا تھا۔ اس کے سفید سفید دانت مجھے کسی درندے کے دانتوں کی طرح چمکتے محسوس ہوئے تھے۔

''اب اس بڈھے کی ساری ہڈیاں چکنا چور ہو جائیں گی۔'' اس نے مجھ سے ہی کہا تھا۔ ''یا پھر وہ بتا دے گا کہ اس فلیٹ میں اس کے علاوہ کون رہتا ہے۔''

میں چونک پڑا۔ بازرگان کے ان دو جملوں میں مجھے ایک خوفناک کہانی چھپی محسوس ہوئی تھی۔

''ہاں۔'' بازرگان عقب نما آئینے میں میری طرف دیکھتے ہوئے سر ہلانے لگا۔ ''بات غالباً تم نے سمجھ لی ہے۔ میں نے آج دو قدم اٹھائے تھے۔ ایک کے نتیجے میں تم اس وقت میرے قبضے میں ہو اور دوسری طرف میرے آدمیوں نے اس بڈھے کو بھی اغوا کر لیا ہے۔ اب اس پر اس کی آخری سانس تک تشدد کیا جائے گا۔ میں نے اپنے آدمیوں سے کہہ دیا ہے کہ اگر وہ زبان نہ کھولے تو اس کی جان لینے سے بھی گریز نہ کیا جائے۔ مجھے شبہ ہے کہ وہ مسز خان کی اسی کونسل کا آدمی ہوگا جو احمر کو تحفظ دیتی رہی ہے۔''

میں بری طرح چکرا گیا۔ بازرگان کی کئی باتیں میرے لیے لایعنی یا ناقابلِ فہم تھیں اور یا پھر احمر مجھ سے اس معاملے میں بھی جھوٹ بولتی رہی تھی۔ اس کے کہنے کے مطابق تو اس کا بابا، بازرگان اور اس کے گروہ سے بڑا ساحر تھا لیکن اب میرے سامنے یہ بات آ رہی تھی کہ وہ کسی حقیر چوہے کی طرح بازرگان کے آدمیوں کے شکنجے میں جا پھنسا تھا۔

پہلے تو صرف یہی بات میرے لیے الجھن کا سبب بنی رہی تھی کہ میرے ساتھ کوئی ڈراما کیا جا رہا تھا لیکن اب یہ بات سامنے آ رہی تھی کہ احمر نے کسی بابا کے بارے میں بھی مجھے صرف کہانیاں ہی سنائی تھیں۔ وہ بوڑھا کوئی اتنا بڑا ساحر نہیں تھا جو مجھے اور احمر کو بازرگان وغیرہ سے چھڑا سکتا۔

''تم نے۔'' میں شاید پاگلوں کی طرح بڑبڑایا۔ ''تمہارے آدمیوں نے اتنے بڑے ساحر کو بھی پکڑ لیا؟''

''ساحر کو؟'' بازرگان حیرت سے بولا ''کیا وہ بڈھا کوئی ساحر ہے؟''

''کیا تم لوگ نہیں ہو؟'' میں نے چند لمحوں کے لیے شاید اپنے حواس ہی کھو دیے تھے۔

''کیا اچانک تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے؟'' بازرگان حیرت سے بولا ''یا تم پاگل ہو جانے کی اداکاری کر رہے ہو؟''

میں گنگ ہو کر رہ گیا۔ آخر کیا تھا یہ سب کچھ؟ اگر وہ بوڑھا کوئی ساحر نہیں تھا اور یہ لوگ بھی ساحر نہیں تھے تو پھر مجھے اندھیرے کا اور احمر کو روشنی کا قیدی کس نے بنایا تھا؟ وہ کون لوگ تھے جو قربان گاہ پر احمر کی گردن اڑا دینا چاہتے تھے اور ایسا کیا واقعہ ہوا تھا کہ احمر کی زندگی بھی بچ گئی تھی اور میں بھی اندھیرے کی قید سے رہا ہو گیا تھا؟

''اس اداکاری سے کام نہیں چلے گا۔'' بازرگان تلخ لہجے میں بولا۔ ''تمہیں میرا وہ کام تو کرنا ہی ہوگا جس کے لیے میں نے تمہیں اغوا کیا ہے۔ میں کار اتنی آہستگی سے چلا رہا ہوں تو صرف اس لیے کہ منزل پر پہنچنے سے پہلے تم سے میری بات چیت ختم ہو جائے اور تم جان لو کہ میں تم سے کیا کروانا چاہتا ہوں۔''

''کیا کروانا چاہتے ہو؟'' میں کھوئے کھوئے سے انداز میں بولا۔

''مجھے بڑی حد تک یقین تھا کہ تم اس فلیٹ میں احمر کی موجودگی کا اعتراف نہیں کرو گے اس لیے میں نے تمہارے اغوا کا منصوبہ بناتے وقت یہ بھی سوچ لیا تھا کہ تمہارے اعتراف نہ کرنے کی صورت میں مجھے تم سے کیا کروانا ہوگا۔''

''کیا چاہتے ہو تم؟'' ذہنی طور پر میں پراگندہ ہی رہا۔

''تم ہمارے ساتھ اس فلیٹ پر چلو گے۔ ہماری منزل وہی ہے۔'' بازرگان نے کہا۔ ''تم فلیٹ کی کال بیل بجاؤ گے۔ پھر اس کے بعد تمہیں کیا کرنا ہے، یہ تم ہی جانتے ہو۔''

''تمہاری باتیں میری سمجھ میں نہیں آ رہی ہیں۔''

''جب ایک لمبے چاقو کی نوک تمہارے جسم میں اترے گی تو سب کچھ سمجھ میں آ جائے گا۔'' بازرگان نے بڑی سفاکی سے کہا۔ ''اگر وہ بوڑھا مسز خان کی کونسل ہی سے تعلق رکھتا ہے تو ہرگز زبان نہیں کھولے گا اور اسی امکان کو سامنے رکھتے ہوئے میں نے دوسری منصوبہ بندی بھی کی ہے۔ تم اس فلیٹ کا دروازہ کھلواؤ گے۔ مجھے یقین ہے کہ کال بیل کے بعد کسی قسم کا سگنل، کسی قسم کا اشارہ بھی دیا جاتا ہوگا۔ اس کے بعد ہی اندر سے دروازہ کھولا جاتا ہے۔''

میں چپ رہا۔ میں اپنے چکراتے ہوئے دماغ پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا۔ بازرگان اور احمر کی باتوں کا تجزیہ ایک دشوار عمل سہی لیکن میں ذہنی طور پر اسی عمل سے گزر رہا تھا۔

بازرگان کی باتیں مجھے سچی اور احمر کی باتیں جھوٹی لگنے لگی تھیں۔ میرے دماغ میں یہ سوال جیسے چنگھاڑنے لگا تھا کہ میرا اور احمر کا اندھیرے اور روشنی کا قیدی بننا کیا میرا کوئی خواب تھا؟

''تم دیکھ رہے ہو گے کہ اب ہم اپنی منزل کے قریب ہوتے جا رہے ہیں۔'' بازرگان بولا تو میں یکا یک چونک سا گیا۔

کار اب ایک ایسی سڑک پر دوڑ رہی تھی جو ہمیں اس عمارت تک پہنچا دیتی جہاں ایک فلیٹ میں اس وقت احمر کو میرا منتظر ہونا چاہیے تھا۔

میرا دماغ جھنجھنا سا گیا۔ احمر کو موت کا بلاوا دینے کے لیے میں بازرگان کا آلۂ کار نہیں بن سکتا تھا۔ اس نے مجھ سے کتنا بھی جھوٹ بولا ہو، وہ میری محبوب تو تھی۔ میں اس کی خاطر اپنی جان تو دے سکتا تھا لیکن اس کی زندگی کے لیے کوئی خطرہ نہیں بن سکتا تھا۔

''ٹھیک ہے۔'' بازرگان کچھ توقف سے بولا۔ ''تم ہمیں نہ بتاؤ کہ تم کیا سگنل دیتے ہو، لیکن تمہیں اس فلیٹ کے دروازے تک تو لے جایا ہی جائے گا۔ کال بیل کا بٹن دبانے کے لیے تم اپنی انگلی کو زحمت نہ دینا۔ یہ کام میں کر دوں گا لیکن

اس کے بعد وہ سب کچھ تمہیں کرنا ہوگا جس سے فلیٹ کا دروازہ کھل جائے۔"

"وہاں کوئی نہیں ہوگا جو دروازہ کھولے۔" میری آواز بھرا سی گئی۔

"تو پھر تم اندر کیسے جاتے ہو؟"

"لاک کھول کر۔"

"لاک تو چابی سے کھلتا ہے اور تمہیں کبھی چابی لگاتے ہوئے نہیں دیکھا گیا۔"

"میں لاک کھول کر ہی جاتا ہوں۔" میں نے اصرار کیا۔

"چابی کہاں ہے اس کی۔"

"وہ میں ہر وقت تو اپنے پاس نہیں رکھتا!"

"اپنی یہ بکواس جاری رکھ کر تم اپنی جان نہیں بچا سکتے۔"

"تم جانو!" میں نے بے پروائی سے کہا۔

میرے حواس اب خاصی حد تک بحال ہو چکے تھے۔ احمر کی باتیں جھوٹی ہوں یا سچی، میں نے جو کچھ دیکھا تھا وہ خواب ہو یا نہ ہو، احمر میری زندگی تو تھی اور کوئی شخص بھی اپنی زندگی کے لیے خطرہ نہیں بن سکتا۔

"میں صرف ایک بات جانتا ہوں۔" بازرگان نے ہونٹ بھینچ لیے پھر کچھ توقف سے بولا۔ "آج اس فلیٹ کا دروازہ کھلے گا یا تم اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھو گے۔"

میں خاموش رہا۔

"ہم اب پہنچنے والے ہیں۔" بازرگان نے کار کی رفتار کم کرتے ہوئے کہا۔ "جب اس فلیٹ کا دروازہ ہمارے سامنے ہوگا تو ایک چاقو کی نوک تمہارے پہلو سے لگا دی جائے گی۔ کال بیل کا بٹن فوراً دبا دیا جائے گا اور میں اپنی کلائی تمہاری آنکھوں کے سامنے رکھوں گے۔ گھڑی کی جگہ میں اب چھوٹی سی اسٹاپ واچ باندھے ہوئے ہوں۔ کال بیل کا بٹن دباتے ہی وہ اسٹاپ واچ بھی اپنا کام شروع کر دے گی۔ تم اس پر نظر رکھو یا نہ رکھو، اگر تیس سیکنڈ کے اندر اندر دروازہ نہ کھلا تو چاقو کی نوک تمہارے جسم میں بس اس حد تک اتار دی جائے گی جیسے سوئی چبھو دی گئی ہو۔ پھر مزید دس سیکنڈ گزرنے کے بعد بھی دروازہ نہ کھلا تو چاقو کی نوک تمہارے جسم سے خفیف سا ایک سفر اور طے کرے گی۔ مزید دس سیکنڈ کے بعد اور... مزید دس سیکنڈ کے بعد اور!" بازرگان کے لہجے میں بلا کی درندگی آ گئی۔ "فلیٹ کا دروازہ نہیں کھلے گا تو تمہارے جسم میں چاقو بہ تدریج داخل ہوتا رہے گا۔ آج میں دیکھوں گا کہ کوئی انسان کسی کی خاطر کتنی تکلیف برداشت کر سکتا ہے۔"

اس وقت میں نے غیر ارادی طور پر سختی سے دانت پر دانت جما لیے۔ ایک نئے دور کا انسان ہوتے ہوئے بھی میں اس وقت قیس و فرہاد کی دنیا میں چلا گیا تھا۔ وہ دنیا جہاں لاوے کی طرح سنسناتے ہوئے امتحان، عشق کے سامنے آتے ہیں، لیکن عشق سرنگوں نہیں ہوتا۔

میں نہیں جانتا کہ مجھ پر اچانک وہ کیفیت کیوں طاری ہو گئی تھی۔

مجھے ایسا لگا جیسے میں کسی خواب کی دنیا میں سفر کر رہا ہوں۔ کار روک کر مجھے اتارا گیا تھا۔ زینے طے کرتے وقت بازرگان کے دو آدمی میرے دائیں بائیں تھے۔ تیسرا میرے پیچھے اور بازرگان آگے آگے چل رہا تھا۔ مجھے اب یاد آ رہا ہے کہ بازرگان نے کار سے اترتے وقت کہا تھا۔ "ناقابل برداشت تکلیف کے باعث اگر تمہارے منہ سے چیخ نکلی تو یقین کر لو کہ وہ تمہاری زندگی کی آخری چیخ ہوگی۔ اس سے پہلے کہ لوگ تمہاری چیخ سن کر تمہاری طرف لپک سکیں، چاقو پوری طرح تمہارے جسم میں داخل کر دیا جائے گا، تمہارے جسم کو چیر دیا جائے گا۔ یہ میرا قطعی فیصلہ ہے۔ آج اس فلیٹ کا دروازہ کھلے گا یا تم اپنی جان سے جاؤ گے۔"

اور پھر وہ گھڑی میرے سر پر آ پہنچی جب ایک امتحان میرے سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔ فلیٹ کے دروازے کے پاس لگا ہوا کال بیل کا بٹن دبایا جا چکا تھا۔ چاقو کی نوک میرے پہلو سے لگا دی گئی تھی۔ بازرگان نے اپنی کلائی میرے سامنے کر دی تھی۔ اسٹاپ واچ کی مدھم سی "ٹک ٹک" سنتے ہوئے مجھے ایسا لگا جیسے وہ میری موت کے قدموں کی آہٹ ہو۔

میں اس وقت یہ نہیں سوچ رہا تھا کہ مجھے احمر کو اپنی آواز سنانا ہے تاکہ وہ دروازہ کھول دے، میرا دماغ تو اس سوال میں الجھ گیا تھا کہ ایک جبری موت کے سامنے منصور کی سوچ کیا ہوگی۔ عشق تو وہ بھی تھا اور وہ بھی جو میرے رگ و پے میں رواں دواں تھا۔ فرق کی بات صرف مجازی اور حقیقی کی تھی لیکن میری سوچ کا دھارا اس سے ماورا ہو چکا تھا۔

مجھے بس اتنا یاد ہے کہ تیس سیکنڈ گزرنے سے پہلے ہی ٹیپ کا دروازہ کھل گیا تھا اور مجھے احمر کی آواز سنائی دی تھی۔

"آج اتنی دیر لگا دی آپ نے؟"

اس وقت میں جیسے اپنے دماغ میں ہی چیخ پڑا۔ "تم کیا کر بیٹھی ہو احمر؟"

ہاتھ کی لکیروں کے تانے بانوں کو سلجھاتے راشد پرویز کی اس پُر تحیر داستان کے بقیہ واقعات اگلے ماہ پڑھیے

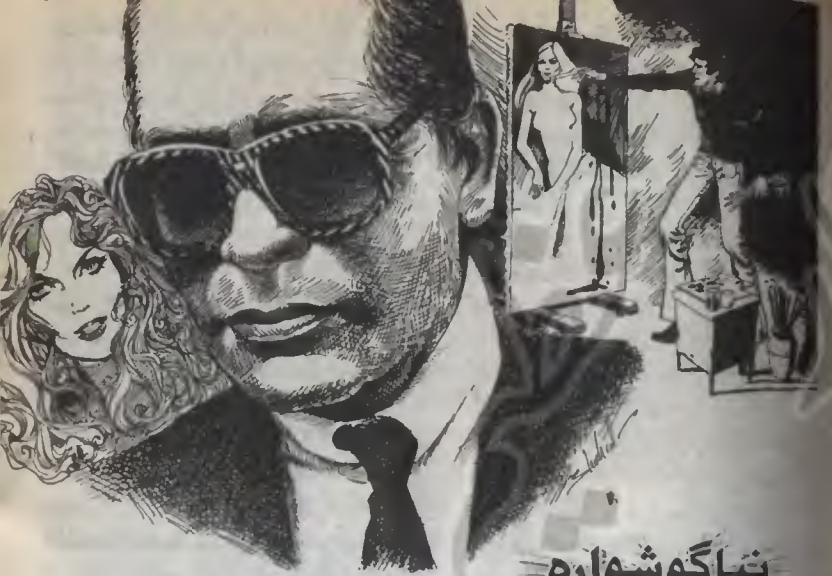

نیا گوشوارہ

شکیل صدیقی

ہر پل رنگ بدلتی زندگی کبھی کبھی کوئی ایسا رنگ اختیار کر لیتی ہے۔ جس کا تاثر تا دیر قائم رہتا ہے۔ ان دونوں کی اندگی نے بھی اچانک ہی رنگ بدلا تھا۔

جعل سازی کے فن سے آشنا افراد کی کرشمہ سازیاں

مسٹر آفندی! بلیک میلروں کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟" ں نے پوچھا۔

میرا بس چلے تو انہیں قتل کر کے ان کی بوٹیاں چیل کوؤں کو کھلا دوں۔" میں نے جواب دیا۔

وہ ٹہلتا ہوا میرے آفس کی کھڑکی تک گیا اور شیشے پر نظریں جما کر سڑک پار عمارتوں کی جھلملاتی روشنیوں کی طرف دیکھنے لگا۔ "اس کا مطلب ہے کہ تم بھی اس کے حق میں ہو کہ ان کا قصہ پاک کر دیا جائے۔"

"ہاں ۔ ۔ ۔

ہیں۔ خاوند بیوی میں علیحدگی کرانا، خفیہ طریقے سے دوسروں کی باتیں ریکارڈ کرنا اور فاتحوں کی سن گن لینا وغیرہ۔ اس لیے میں نے سوچا کسی پرائیویٹ سراغرساں کی خدمات حاصل کی جائیں پس میں نے ٹیلی فون ڈائریکٹری کے پیلے صفحات دیکھ ڈالے۔ اس میں تمہارا نام مل گیا۔"

"لیکن تم نے میرا ہی انتخاب کیوں کیا؟ پرائیوٹ سراغرساں تو اور بھی ہیں؟"

"اس لیے کہ تمہارا آفس رات آٹھ بجے سے صبح چار بجے تک کھلا رہتا ہے۔ یعنی زیرِ زمین دنیا سے تمہارے روابط ہوں گے۔"

"ٹھیک ہے..... اب یہ بتاؤ کہ رقم کی ادائی تم کیسے کرو گے؟" میں نے پوچھا۔

میرا سوال سن کر اس شخص کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ اس نے میری میز پر دونوں ہاتھ رکھے اور آگے کی طرف جھک کر بولا۔ "میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ تم اتنی جلدی رضامند ہو جاؤ گے۔ اس وقت تو میں اتنی رقم نہیں لایا ہوں۔ بہرحال پندرہ ہزار ریال میں تمہیں کل ہی ادا کر دوں گا اور باقی نصف رقم میں تمہیں کام ختم کرنے کے بعد ادا کروں گا۔"

"جناب! آپ کا نام کیا ہے؟"

"میرا خیال ہے اس کی ضرورت نہیں ہے اگر میں نام نہ بتاؤں تو اس سے کیا فرق پڑے گا؟"

"ٹھیک ہے۔" میں نے اپنے بالوں پر ہاتھ پھیر کر کہا۔ "اس شخص کا نام بتائیے جسے قتل کرنا ہے تاکہ میں کسی غلط آدمی کو موت کے منہ میں نہ پہنچا دوں۔"

"اس شخص کا نام جمشید خراسانی ہے اور ۱۱۸ کوچہ تہامسب پر، مشہد میں ہی رہتا ہے۔" اس نے ایک گہرا سانس لے کر کہا۔ "وہ ایک آرٹسٹ ہے۔"

"کیا وہ تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو بلیک میل کر رہا ہے۔" میں نے پوچھا۔

"ہاں۔" اس نے مختصراً کہا۔

"مگر کس معاملے میں؟"

"میرا خیال ہے کہ یہ بتانا بھی ضروری نہیں ہے۔"

میں نے اعتراف کیا کہ یہ ضروری نہیں ہے۔ "لیکن جائے واردات سے عدم موجودگی ثابت کرنا بہرحال تمہارے لیے ضروری ہے۔ دوسری بات یہ کہ میں جمشید کو کب ہلاک کر دوں؟"

وہ چند لمحوں تک سوچتا رہا پھر کہنے لگا۔ "جمعہ کی رات کیسی رہے گی؟ اور میرا خیال ہے کہ یہ کام رات آٹھ بجے سے لے کر گیارہ بجے تک ہو جائے تو مناسب ہے۔"

"اگر مجھے کل پندرہ ہزار ریال مل جائیں تو بس یوں سمجھیں کہ آپ کا کام ہو گیا۔" میں نے کہا۔

اس نے اپنے سر کو اثباتی جنبش دی اور کہنے لگا۔ "ایک سراغرساں کی حیثیت سے تم، لوگوں کا پیچھا کرنے میں بھی ماہر ہو گے؟"

"آپ نے درست اندازہ لگایا۔ دوسرے سراغرسانوں کی طرح لوگوں کا پیچھا کرنا میری لیے کوئی مشکل کام نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

"لیکن میرا پیچھا کرنے کی کوشش نہ کرنا۔" اس نے کہا۔ "اب میں باہر نکل کر تمہاری کھڑکی کے سامنے سے گزروں گا، مجھے دیکھ کر تم ہاتھ ہلانا۔ اگر میں فوراً نظر نہ آؤں تو انتظار کرنا۔ تمہیں کھڑکی میں دیکھ کر ہی مجھے اطمینان ہو گا۔ تم نے میری ہدایت پر عمل نہ کیا تو سمجھنا کہ یہ معاہدہ منسوخ ہو گیا۔ میں کسی اور شخص کی خدمات حاصل کر لوں گا۔"

جب وہ میرے آفس سے نکل گیا تو میں اس کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے کھڑکی میں جا کر کھڑا ہو گیا، چار منزل نیچے نظر ڈالنے پر سڑک سنسان دکھائی دی۔ میرے آفس سے نکل کر اس شخص نے سڑک پار کی اور ٹھہر کر کھڑکی کی طرف دیکھنے لگا۔

میں نے ہاتھ ہلا دیا۔ یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ اس نے بھی مجھے دیکھ لیا ہے، اس نے اپنے سر کو اثباتی جنبش دی پھر وہ آگے بڑھا اور گلی کے کونے پر جا کر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

میں بھاگم بھاگ نیچے گیا اور اس کا پیچھا کرنے لگا۔ حقیقت یہ ہے کہ میں جمشید خراسانی کو قتل کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ جہاں تک پولیس کو اطلاع دینے کا تعلق ہے تو میں اسے بھی غیر ضروری سمجھتا تھا۔ کوئی قدم اٹھانے سے پہلے میں یہ جاننا ضروری خیال کرتا تھا کہ وہ اور اس کے ساتھی کون ہیں!

وہ ایک کار میں بیٹھ گیا۔ اتفاق سے میری کار نزدیک ہی کھڑی تھی۔ اس لیے پیچھا کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ اس وقت سڑکوں پر ٹریفک کم تھا۔ اس لیے آگے والی کار نگاہ میں رکھتے ہوئے میں مشہد کے مضافات میں پہنچ گیا۔ کار ایک شان دار مکان میں داخل ہو گئی۔ گیٹ سے مکان کا فاصلہ کافی تھا، اس لیے میں نے اپنی کار جھاڑیوں میں کھڑی کی اور اِدھر اُدھر دیکھتا ہوا اتر آیا۔ اس مکان کے گیٹ پر کوئی دربان نہیں تھا۔ اس لیے میں قریب چلا گیا۔ دائیں جانب نام کی تختی لگی تھی جس پر "فریدوں عباس" لکھا تھا۔ پورچ میں پہلے سے تین کاریں کھڑی تھیں، اس نے وسیع و عریض

پورچ میں اپنی بھی کار کھڑی کی اور اندر چلا گیا۔

میں نے اس بنگلے کے گرد چکر لگایا۔ وہ قدیم رومی طرز کا بنا تھا۔ محرابیں، گنبد اور چوڑے ستون نمایاں تھے۔ ایک کمرے کی کھڑکی میں روشنی دکھائی دی تو میں اس سے چپک کر کھڑا ہو گیا۔ اس کھڑکی کا پردہ ہٹا ہوا تھا اس لیے مجھے اندرونی منظر دیکھنے میں آسانی ہوئی۔ وہ ایک گول میز تھی جس کے گرد تین افراد بیٹھے تھے۔ وہ تاش کھیل رہے تھے اور ساتھ ہی چائے کا دور بھی چل رہا تھا۔ میز کے وسط میں ایک فروٹ اور چند پیالیاں رکھی تھیں۔

میں نے ان میں سے ایک کو فوراً ہی پہچان لیا وہ شیرازی تھا اور ایک آرٹ گیلری چلا رہا تھا۔ مجھے یاد تھا کہ ایک بار جب میں امریکا سے دو خوبصورت پینٹنگز لایا تھا تو میں نے اسی کے ہاتھ انہیں فروخت کیا تھا۔ میرے کلائنٹ کی آمد پر انہوں نے اس کی طرف دیکھا پھر شیرازی نے پوچھا۔ "فریدوں! تم جمشید کو ختم کر آئے؟"

اس کی تصدیق ہو گئی تھی کہ میرے موکل کا نام فریدوں ہے۔ اس نے فوراً ہی جواب نہیں دیا اور میز کے قریب جا کر اپنی لیے ایک پیالی میں قہوہ انڈیلا اور اس کے چند گھونٹ پینے کے بعد بولا۔ "جمشید ابھی زندہ ہے، میں اسے ختم نہیں کر پایا۔"

"یہاں سے جاتے وقت تو تم نے ہم سب کو کافی اطمینان دلایا تھا اور اب بزدلوں کی سی باتیں کر رہے ہو۔"

"منصوبے اور عمل میں بہت فرق ہوتا ہے۔" فریدوں نے ایک گہرا سانس لے کر کہا۔ "جب میں نے خود کو اس معاملے میں بے بس پایا تو ایک کرائے کے قاتل کی خدمات حاصل کر لیں۔"

"تمہیں یہ کیسے پتا چلا کہ کرائے کا قاتل مشہد میں کہاں رہتا ہے۔" شیرازی نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔

"یہ میں نہیں بتا سکتا۔" فریدوں نے ناک سکیڑ کر کہا۔ "میرے اپنے ذرائع ہیں۔ وہ اس کام کے لیے تیس ہزار ریال طلب کر رہا تھا۔ یہ رقم ہم سب جمع کر کے دے سکتے ہیں۔ وہ جمعے کی رات کو آٹھ اور گیارہ بجے کے درمیان اسے ختم کر دے گا۔ اس لیے جمعے کو ایک بار پھر ہم سب کو یہاں اکٹھا ہو کر تاش کھیلنا ہو گا..... تاکہ ہم جائے واردات سے لاعلم موجودگی ثابت کر سکیں۔" فریدوں نے کہا۔

جب وہ سب وہاں سے چلے گئے تو میں چھپتا چھپاتا وہاں سے چلا آیا۔ اس کے بعد میں نے اپنی کار کا رخ کوچہ تہامسب کی طرف کر دیا۔ وہ بھی ایک شان دار سی عمارت تھی۔ جس کی تعمیر جدید طرز پر ہوئی تھی۔ عمارت کا ایک کمرا روشن تھا۔ اس لیے میں اس طرف چلا گیا۔ وہاں ایک عورت ٹیلی وژن کے سامنے بیٹھی تھی۔ وہ قبول صورت تھی۔ اس کی عمر تقریباً تیس برس تھی۔ ٹیلی وژن پر اس وقت کوئی امریکی کاؤبوائے فلم چل رہی تھی۔ جسے وہ انہماک سے دیکھ رہی تھی۔ آیت اللہ خمینی نے ایران میں امریکا کے خلاف نعرے لگا کر بہت سی چیزیں بدل ڈالی تھیں لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ایران میں امریکی کلچر اب بھی پایا جاتا تھا۔

کار پورچ میں ایک کار کی ہیڈ لائٹس آڑی ترچھی لکیریں بنانے لگیں تو میں دبے قدموں سے عمارت کے پچھلے حصے کی طرف چلا گیا۔ تاہم آڑے میں اسے دیکھ سکتا تھا۔ کار سے اترنے والا ایک تندرست و توانا شخص تھا۔ اس کا چہرہ سرخ و سفید اور جسم بھاری تھا۔ چہرے پر ہلکی سی داڑھی تھی۔ اس نے صدر دروازہ کھولنے کے لیے اپنی چابی استعمال کی تھی۔ اطلاعی گھنٹی بجا کر عورت کو ڈسٹرب نہیں کیا تھا۔ وہ جب اس کمرے میں گیا تو عورت نے سر اٹھا کر اس کی طرف صرف ایک بار دیکھا اور پھر اپنا چہرہ ٹیلی وژن کی طرف گھما لیا۔ مرد جو میرے خیال میں جمشید خراسانی تھا، زینے سے اوپر چلا گیا۔ دو کمروں کی بتیاں روشن ہوئیں، اس کے بعد جمشید نے غالباً کپڑے تبدیل کیے اور بتی بجھا کر سو گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد اس عورت نے بھی ٹیلی وژن آف کر کے اس کمرے کی بتیاں بجھائیں اور اوپر جا کر دوسری خواب گاہ میں سو گئی۔ میں آدھا گھنٹا مزید اپنی جگہ پر دبکا رہا پھر یہ قیاس کر کے اب وہ دونوں سو گئے ہوں گے، اپنی جگہ سے نکلا اور میں نے ایک ایک کر کے ساری کھڑکیاں چیک کیں۔ بالآخر ایک کھلی مل گئی تو اس سے اندر چلا گیا۔ وہاں کی سن گن لینے کے بعد معلوم ہوا کہ وہ کوئی اسٹوڈیو ہے۔ میں نے ایک بڑے ہال میں چند پینٹنگز اور رنگ برش وغیرہ رکھے دیکھے۔ تاریکی تھی اس لیے میں یہ اندازہ نہیں لگا سکا کہ ان پینٹنگز کا معیار کیا ہے۔

وہاں سے باہر آ کر میں اپنے آفس کی طرف چل پڑا۔ اپنے آفس کی چرمی کرسی پر بیٹھنے کے بعد میں نے جمشید خراسانی کا نام تلاش کیا تو اس کے نام کی ایک گیلری بھی مل گئی۔

میں نے اس نتیجے پر پہنچنے میں دیر نہیں لگائی کہ وہ سب آرٹ کی دنیا سے تعلق رکھتے ہیں اگر فریدوں اور شیرازی آرٹسٹ ہیں تو اس مکان میں بیٹھے ہوئے باقی دو افراد بھی آرٹسٹ ہوں گے۔ بہرحال جمشید اگر آرٹ گیلری چلا رہا تھا تو کیا خود بھی آرٹسٹ تھا، یہ میں نہیں جانتا تھا۔

میں گھر جا کر سو گیا۔ جب دوسرے روز میں اپنے

آفس گیا تو میں نے اپنے میل باکس میں ایک موٹا سا لفافہ پایا۔ اسے کھولنے پر مجھے پندرہ ہزار ریال رکھے دکھائی دیے۔ فریدوں نے اپنا وعدہ پورا کیا تھا! میں سوچنے لگا کہ اب کیا کرنا چاہیے؟ کیا پولیس کو فون کر دوں؟ پھر خیال آیا کہ بہتر ہوگا کہ اپنے انداز سے تحقیقات کروں اور جمشید خراسانی سے کچھ سوالات کر دوں تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ فریدوں اور شیرازی اسے کیوں قتل کرانا چاہتے ہیں۔"

اس رات میں اس کے پتے پر گیا اور میں نے اطلاعی گھنٹی بجائی تو اس عورت نے دروازہ کھولا جو پچھلی رات ٹیلی وژن دیکھ رہی تھی۔ "جی فرمایئے؟" اس نے پلکیں جھپکاتے ہوئے کہا۔

"میں آقا جمشید خراسانی سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔"

"وہ اس وقت تشریف نہیں رکھتے، ایک گھنٹا پہلے جا چکے ہیں۔" اس نے جواب دیا۔ وہ اس وقت ڈھیلا ڈھالا سا لباس پہنے تھی۔ وہ پختہ عمر کی عورت تھی لیکن اپنی اصلی رنگت اور بھوری آنکھوں کی وجہ سے دلکش لگ رہی تھی! میرا دل چاہ رہا تھا کہ اسے دیکھتا رہوں۔

"آپ بتا سکتی ہیں کہ وہ کب واپس آئیں گے؟"

"اس بارے میں مجھے کچھ پتا نہیں ہے۔" اس نے معذرت سے کہا۔

"یہ بتا سکتی ہیں کہ وہ کہاں گئے ہیں؟"

"نہ انہوں نے بتایا، نہ میں نے پوچھا۔" اس نے میرے شانے کے پیچھے نظریں دوڑاتے ہوئے استفسار کیا۔ "تمہاری کار کہاں ہے؟ یہاں تک تم کیسے آئے ہو؟"

وہ متمول لوگوں کا علاقہ تھا اور جمشید کا مکان کافی اندر تھا اس لیے عورت کا سوال غیر ضروری نہیں تھا۔

"میں نے اسے سڑک کے نزدیک ہی پارک کیا ہے تاکہ واپس جانے میں کوئی دقت نہ ہو!" میں نے کہا۔

میرے اب وہاں کھڑے رہنے کا کوئی جواز نہیں تھا، اس لیے مجھے چاہیے تھا کہ میں اسے خدا حافظ کہہ دیتا۔ میں نے وہی کیا اور وہاں سے پلٹ آیا۔ تھوڑا آگے جا کر میں نے پلٹ کر دیکھا، وہ عورت اب بھی دروازے پر کھڑی مجھے دیکھ رہی تھی، اس لیے میں چلتا چلا گیا تاکہ اس کی نظروں سے اوجھل ہو جاؤں۔ وہ بال دار لوگوں کا رہائشی علاقہ تھا اس لیے وہاں زیادہ رونق نہیں تھی۔ میں نے سوچا، جمشید کا انتظار کر لینا چاہیے۔ ممکن ہے کہ وہ کہیں نزدیک ہی گیا ہو۔

تھوڑی دیر بعد میں پھر اس مکان کی طرف گیا تو میں نے ایک کھڑکی روشن دیکھی۔ میں قریب گیا تو میں نے اس عورت کو ٹیلی وژن کے سامنے بیٹھے دیکھا۔ اس وقت اس کے ہاتھ میں دودھ کا ایک گلاس اور سینڈوچ تھا۔ کمرے میں اس کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔ ساڑھے نو بجے خبریں ہوئیں پھر اس عورت نے چینل تبدیل کیا اور ایک انگریزی فلم "ڈاکٹر نو" دیکھنے لگی۔ مجھے ٹیلی وژن کا اسکرین تو دکھائی نہیں دے رہا تھا، لیکن چوں کہ میں یہ فلم کئی بار دیکھ چکا تھا اس لیے محض مکالموں سے میں نے اس کا نام جان لیا تھا۔

فلم دیکھنے کے بعد وہ جا کر سو گئی۔ میں نے اپنی ریڈیم ڈائل والی گھڑی دیکھی، اس وقت رات کا ایک بج رہا تھا۔ آسمان پر گہرے بادل چھائے ہوئے تھے۔ اس لیے میں نے وہاں رکنا مناسب نہیں سمجھا اور واپس آ گیا۔

دوسرے روز حسبِ معمول میں شام کے وقت اٹھا، غسل کرنے کے بعد میں نے ناشتا کیا اور پھر اخبار دیکھنے لگا۔ مقامی خبروں کے صفحے پر ایک ایسی خبر تھی کہ میں ٹھٹک گیا لکھا تھا:۔

جمشید خراسانی جو ایک آرٹ گیلری چلا رہے تھے۔ پچھلی رات کار کے ایک حادثے میں ہلاک ہو گئے۔ وہ درمیانے درجے کے ایک ہوٹل میں بیٹھے تھے۔ جب باہر آ کر سڑک پار کرنے لگے تو اچانک دائیں جانب سے آنے والی کار انہیں کچلتی ہوئی نکل گئی۔ ایک عینی شاہد کا بیان ہے کہ کار کے پہیے ان پر سے اس طرح سے گزرے کہ انہوں نے جائے حادثہ پر ہی دم توڑ دیا۔ عینی شاہد کا بیان ہے کہ اس کار کا نمبر نوٹ نہیں کر پایا لیکن اس نے اتنا ضرور دیکھ لیا کہ وہ ہلکے نیلے رنگ کی لکسن کانٹی نینٹل کار تھی۔

میں سوچنے لگا کہ جمشید کو ہلاک کرنے میں فریدوں یا شیرازی کا ہاتھ ہے یا پھر یہ محض ایک حادثہ ہی ہے؟

اخبار ایک طرف ڈال کر میں اپنے آفس پہنچ گیا۔ جب میں نے میل باکس کھولا تو اس میں ایک اور لفافہ ملا، جب میں نے اسے کھولا تو اس میں سے پندرہ ہزار ریال نکلے!

معاملہ اب اتنی آسانی سے ختم نہیں ہو سکتا تھا میں چاہتا تھا تو اس رقم کو جیب میں رکھ لیتا اور اس بات کو بھول جاتا کہ میں نے تحقیق کرنے کا تہیہ کر لیا۔ میں فریدوں کی رہائش گاہ پر گیا اور میں نے اطلاعی گھنٹی بجائی۔ دروازہ خود فریدوں نے کھولا اور مجھے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ "تمہیں یہاں آنے کی کیا ضرورت تھی؟" اس نے کہا۔ "باقی رقم تو میں نے آج سہ پہر کو تمہارے میل باکس میں ڈال دی تھی۔"

"ہاں، میں جانتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "لیکن میں تم سے چند سوالات کرنا چاہتا ہوں۔"

اندر سے بہت سے لوگوں کی باتیں کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اس سے میں نے اندازہ لگایا کہ اس وقت کچھ اور لوگ بھی آئے ہوئے ہیں۔ فریدوں نے اندازہ لگا لیا کہ میں آسانی سے اس کا پیچھا نہیں چھوڑوں گا۔ اس لیے وہ مجھے ایک پائپ کے کمرے میں لے گیا۔ "معاہدے کے مطابق جمشید کو جمعے کے روز ٹھکانے لگانا تھا لیکن تم نے یہ کام بدھ کی رات ہی کر ڈالا۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ بدھ کی رات ہم سب آقائے پویا کی صاحبزادی کی شادی میں مدعو تھے، ورنہ جائے حادثہ میں اپنی عدم موجودگی ہی ثابت نہ کر پاتے!" اس نے تشویش سے کہا۔

"آقائے پویا؟، میں نے سوچا۔ "اوہ! ہاں" جب میں ٹیلی فون ڈائریکٹری میں آرٹسٹوں کے نام پتے دیکھ رہا تھا تو اس میں ان کا نام دکھائی دیا تھا۔ وہ بھی ایک آرٹ گیلری چلا رہے تھے۔

"کیا پولیس نے اس معاملے میں تم سے پوچھ گچھ کی؟"

"نہیں، ابھی تک اس کی نوبت نہیں آئی۔ بہرحال میں نے خود کو تیار کر رکھا تھا۔" اس نے جواب دیا۔ "میں تو سوچ رہا تھا کہ تم جمشید کو ریوالور یا خنجر سے ہلاک کرو گے لیکن کار کے حادثے والا آئیڈیا بھی خوب تھا۔ اچھا..... ہاں یہ تو میں پوچھنا ہی بھول گیا کہ تمہیں یہ کیسے پتا چلا کہ میں یہاں رہتا ہوں۔"

"فریدوں! مجھے تمہارے پورے گروپ کے بارے میں پتا ہے۔ تم، شیرازی، آقائے پویا اور..... وہ جس کے چہرے پر داڑھی ہے۔ اس کا نام میری زبان کی نوک پر ہے۔"

"واراب!" فریدوں نے میری مشکل آسان کی۔

"اوہ ہاں....." میں نے اس کا نام بھی ٹیلی فون ڈائریکٹری میں دیکھا تھا۔ میں نے سوچا۔

"فریدوں! میں نے جمشید خراسانی کو ہلاک نہیں کیا" بالآخر میں نے کہا۔

"اگر تم نے نہیں کیا ہے تو پھر کس نے کیا ہے؟" اس نے حیرت سے کہا۔

"میں اس بارے میں کوئی اندازہ نہیں لگا سکا ہوں البتہ میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ وہ تمہیں کیوں بلیک میل کر رہا تھا۔"

"اس بات سے تمہارا کوئی تعلق نہیں ہے۔" اس نے رکھائی سے جواب دیا۔

"میں پولیس کے پاس جا کر سب کچھ بتا دوں گا۔" میں نے دھمکی دی۔

اس دھمکی کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس نے کہا۔ "تم میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ میں نہایت آسانی سے ساری باتوں سے لاعلمی ظاہر کر دوں گا۔"

کیا واقعی؟" میں نے حیرت ظاہر کی۔ "اور تم اس کی کیا وضاحت دو گے کہ تمہاری انگلیوں کے نشانات ان نوٹوں پر ہیں جو ایک گڈی کی صورت میں میرے پاس ہیں۔ یہ محض ایک ہوائی تیر تھا جو نشانے پر لگ گیا۔ ورنہ مجھے کیا معلوم کہ اس کی انگلیوں کے نشانات نوٹوں پر ہیں یا نہیں؟ میں نے انہیں لیبارٹری چیک تھوڑی کیا تھا؟

"ہوں' جناب سراغ رساں! کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ آپ ساری باتوں کو بھول جائیں اور تیس ہزار ریال اپنی جیب میں رکھ لیں؟" اس نے تیکھے لہجے میں کہا اور اپنی ٹھوڑی کھجائی۔

"اگر مجھے سارے معاملات کا علم ہو جائے گا تو مجھے اطمینان ہو جائے گا۔ پھر میں پولیس کے پاس نہیں جاؤں گا۔" میں نے وضاحت کی۔

"ٹھیک ہے۔" وہ بولا۔ "آج سے دو برس پہلے جب جمشید یہاں بندر عباس سے آیا تھا تو اس نے خود کو اس طرح سے متعارف کرایا تھا کہ اس کے پاس آرٹ کا ایک بڑا ذخیرہ ہے۔ نامور اور جدید آرٹسٹوں کی اچھی پینٹنگز ہیں۔ اس زمانے میں وہ آرٹ کی ساری نمائشوں میں شریک ہوا کرتا تھا۔ کبھی کبھار ایک آدھ پینٹنگ بھی خرید لیتا تھا۔ چونکہ اس کی شخصیت مرعوب کن تھی اس لیے وہ لوگوں کی آنکھوں میں سما گیا۔ اس کی طرف خوامخواہ توجہ دی جانے لگی۔ اس زمانے میں وہ فرانس کا ایک آدھ چکر بھی لگا لیا کرتا تھا۔ وہاں سے واپسی پر وہ پینٹنگز بھی لے کر آتا تھا جن کے متعلق اس کا دعویٰ ہوتا تھا کہ وہ پینٹنگز اس نے آرٹ گیلریوں کے بجائے ذاتی طور پر خریدی ہیں یا آرٹسٹوں کے تہ خانوں سے نکلوائی ہیں جہاں وہ انہیں رکھ کر بھول گئے تھے۔ کئی بار وہ پینٹنگز اس نے ہم لوگوں کو بھی دکھائیں اور اس کی قیمت نہایت مناسب بتائی۔ ہم لوگوں نے اس سے پینٹنگز خریدنا شروع کر دیں۔ وہ اچھی قیمت پر بک گئیں۔ میں نے پچھلے دو برسوں میں اس سے چودہ پینٹنگز خریدیں، تقریباً اتنی ہی میرے دوستوں نے بھی خریدی ہوں گی۔"

''اور تم لوگ انہیں اپنی آرٹ گیلریوں میں فروخت کرتے رہے؟''

''ہاں، اور ان سے ہمیں اچھا خاصا منافع ہوا۔'' اس نے بتایا۔

''مگر پھر کوئی گڑبڑ ہوگئی؟''

''ایک ہفتے پہلے جمشید نے یہ انکشاف کیا کہ وہ ساری پینٹنگز جو ہم نے اس سے خریدی تھیں جعلی ہیں۔ اس کے بارے میں اسے یقین تھا۔ اس لیے کہ پینٹنگز اس نے خود پینٹ کی تھیں۔ مجھے اعتراف ہے کہ وہ ایک اچھا آرٹسٹ تھا۔ چاہے جعلی سہی..... اس کی دی ہوئی پینٹنگز ہم آرٹ کے قدر دانوں کے ہاتھوں فروخت کر چکے تھے۔ جمشید نے دھمکی دی کہ اگر ہم نے اسے ایک لاکھ ریال ادا نہ کیے تو وہ آرٹ کے ان سارے قدر دانوں کو بتا دے گا کہ ہم نے جو پینٹنگز انہیں فروخت کی ہیں وہ جعلی ہیں۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے، آرٹ کے قدر دانوں کا ہم پر سے اعتماد اٹھ جاتا۔ ہماری آرٹ گیلریوں کی طرف کون آتا؟ ہم سب تباہ و برباد ہو جاتے۔''

''تو تم لوگوں نے پولیس رپورٹ کیوں نہیں کی؟'' میں نے پوچھا۔

اس نے میری طرف عجیب سی نظروں سے دیکھا۔ جیسے کہہ رہا ہو کہ مجھے ایسا احمقانہ سوال نہیں کرنا چاہیے تھا۔

''پولیس میں جانے سے تو معاملہ مزید خراب ہوتا چلا جاتا۔ اس بات کی خوب تشہیر ہوتی جسے ہم چھپانا چاہتے تھے۔ مقدمے کی ساری کارروائی اخبارات میں شائع ہوتی اور جسے نہیں بھی معلوم ہوتا اسے بھی معلوم ہو جاتا۔'' اس نے وضاحت کی۔

''اور تم لوگوں نے یہ فیصلہ کیا کہ جمشید کو بلیک میلنگ کی رقم یعنی ایک لاکھ ریال ادا نہیں کرو گے؟''

''ہاں..... اس بات کا قوی امکان تھا کہ جمشید کچھ دنوں بعد پھر آئے اور مزید رقم کا مطالبہ کرے گا۔ اس کی ہوس روز بہ روز بڑھتی۔ اس کے ساتھ اس کا بھی اندیشہ تھا کہ وہ کسی موقعے پر اس جعل سازی کا بھانڈا نہ پھوڑ دے۔ چنانچہ اسے راہ سے ہٹانے کا فیصلہ کیا گیا۔''

''کیا تم لوگ یہ ثابت کر سکو گے کہ جب جمشید ہلاک ہوا تھا تو تم لوگ جائے حادثہ سے بہت دور تھے؟''

''ہاں، یہ تو میں پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ پچھلی رات ہم آقائے پویا کی صاحبزادی کی شادی میں شریک تھے۔'' وہ بولا۔ ''جس کی تقریب رات آٹھ بجے سے صبح تین بجے تک جاری رہی۔ اس اثنا میں ہم میں سے کوئی اس تقریب سے کر جمشید کو قتل نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے کہ شادی کی یہ تقریب ایک بحری جہاز پر ہو رہی تھی۔''

''کیا جمشید شادی شدہ تھا۔''

''اس بارے میں اس نے ہمیں کچھ نہیں بتایا۔''

''تو پھر وہ عورت کون ہے جو اس کے مکان میں اس کے ساتھ رہتی ہے؟''

''وہ اس کی سیکریٹری فرح ہوشنگ ہوگی۔'' اس نے جواب دیا۔

☆☆☆

فریدوں کے پاس سے میں ۱۱۸ کو چلتا ہوا، مشہد گیا۔ اطلاعی گھنٹی بجانے پر فرح نے دروازہ کھولا۔ ''مجھے حسن آفندی کہتے ہیں اور میں ایک پرائیویٹ سراغ رساں ہوں۔'' میں نے کہا اور اپنا تعارفی کارڈ اس کی طرف بڑھا دیا۔

''تم کس چیز کے بارے میں تحقیقات کرنے آئے ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''کیا جمشید نے بھاری رقم کی بیمہ پالیسی لے رکھی تھی؟ اور اگر ایسا ہے تو اس کا فائدہ کس کو پہنچ رہا ہے؟ اس کا وارث کون ہے؟'' میں نے مسکرا کر کہا۔

اس نے مجھے اندر آنے کو کہا۔ اندر لے جا کر اس نے مجھے ڈرائنگ روم کے ایک صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ''جمشید نے اپنی زندگی کا بیمہ نہیں کرایا تھا۔ اب رہا یہ سوال کہ اس کا وارث کون ہے..... یہ بھی مجھے نہیں پتا..... اس لیے کہ یہاں اس کا کوئی دوست یا رشتے دار ہی نہیں تھا۔'' وہ بولی۔

''ممکن ہے کہ تم اس کی وارث ہو؟''

''میں؟ ہاہ!'' وہ بے ساختہ ہنسی۔

''مادام! میں یہ اس لیے کہہ رہا ہوں کہ مجھے یقین ہے کہ جمشید کار کے حادثے میں ہلاک نہیں ہوا ہے بلکہ اسے قتل کیا گیا ہے۔''

وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر ٹہلنے لگی۔

''آپ اس کی سیکریٹری ہیں نا؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں، کہہ سکتے ہو۔''

''ایسی صورت میں تو جمشید کی مصروفیات کا آپ کو علم رہتا ہوگا؟''

''کیسی مصروفیات؟'' اس نے کہا۔

''مادام! وہ کسی کو بلیک میل کر رہا تھا۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

''بلیک میل!'' اس نے چونک کر کہا۔ ''وہ کس کو اور کیوں بلیک میل کر رہا تھا؟''

''وہ اس شہر کے سارے آرٹ ڈیلروں کو جعلی پینٹنگز فروخت کر رہا تھا، مادام!'' میں نے کہا۔

''کیا واقعی؟'' اس نے حیرت ظاہر کی۔

''اتنا کچھ کرنے کے بعد بھی وہ مطمئن تھا۔ جعلی پینٹنگز فروخت کرنے کے بعد وہ پھر آرٹ گیلری والوں کے پاس پہنچ گیا اور اس نے ان سے مطالبہ کیا کہ اگر انہوں نے اسے ایک لاکھ ریال ادا نہ کیے تو وہ آرٹ کے قدر دانوں کے پاس جا کر یہ بتا دے گا کہ وہ اب تک ان سے جعلی پینٹنگز خریدتے رہے ہیں۔''

''اوہ! یہ تو بہت کمینے پن کی بات ہے۔'' اس نے سرسری لہجے میں کہا۔

''اسے لالچ و طمع نے مار ڈالا۔'' میں نے کہا۔

''وہ پینٹنگز جعلی تھیں اور جمشید انہیں پینٹ کرتا تھا؟'' اس نے گہرا سانس لے کر کہا اور چھت کی طرف دیکھنے لگی۔

''ہاں..... جب وہ آرٹ گیلری والوں کو بلیک میل کرنے کی نیت سے گیا تھا تو اس نے یہی کچھ کہا تھا۔ مجھے حیرت ہے کہ اس کے ساتھ رہتے ہوئے تم نے کوئی گڑبڑ محسوس نہیں کی؟'' میں نے ادب بالائے طاق رکھ کر آپ کے بجائے اسے تم سے مخاطب کیا۔

''یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ ان آرٹ ڈیلروں میں سے کسی نے اسے اپنی کار سے کچل ڈالا ہو۔'' فرح نے کہا۔

''جس وقت جمشید ہلاک ہوا ہے وہ سب ایک ایسی تقریب میں شریک تھے جہاں سے واپس آ کر کوئی واردات نہیں کر سکتے تھے۔''

''تو کیا تمہارا خیال ہے کہ اسے میں نے ہلاک کیا ہے؟'' وہ بولی۔

''تم نے اسے تھوڑی دیر پہلے کمینہ کہا تھا، اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ تم اس سے بے زار تھیں۔ ممکن ہے اسے ہلاک کرنے کی تمہارے پاس کوئی اچھی وجہ ہو۔''

''تم نے یہ اندازہ کیسے لگایا؟''

''میں اسے کیا بتاتا کہ جب جمشید کو ہلاک کیا گیا تھا تو اس وقت وہ ٹیلی وژن پر جیمز بانڈ کی فلم ''ڈاکٹر نو'' دیکھ رہی تھی۔'' ان معاملات میں میری چھٹی حس بہت تیز ہے۔'' میں نے کہا۔

''اگر اسے آرٹ ڈیلروں میں سے کسی نے ہلاک نہیں کیا ہے اور یہ میرا کام بھی نہیں ہے تو پھر اسے ایک سادہ سا حادثہ کہنا چاہیے۔'' وہ بولی۔

''اس وقت تو ایسا ہی معلوم ہو رہا ہے۔''

''تو تم ایک پرائیویٹ سراغ رساں ہو؟ اس پیشے سے تمہیں کتنی آمدنی ہو جاتی ہے؟''

''بس گزارہ ہو جاتا ہے۔'' میں نے کہا۔

''تمہیں لباس پہننے کا ڈھنگ آتا ہے۔ تم گفتگو بھی اچھی کر لیتے ہو۔ اس لیے میں کچھ کچھ تمہیں پسند کرنے لگی ہوں۔'' اس نے سپاٹ سے لہجے میں کہا۔ ''معلوم نہیں کہ لفظ ''پسند'' کا اس کے نزدیک کیا مفہوم تھا۔ اس لیے میں محتاط رہا۔

''آفندی! اگر میں یہ کہوں کہ میں تمہیں جمشید کی جگہ دینا چاہتی ہوں تو تمہارا کیا جواب ہوگا؟''

''مادام! مجھے معلوم نہیں ہے جمشید سے تمہارے تعلقات کس نوعیت کے تھے، پھر بھی میں یہ کہوں گا کہ میں دو تین ماہ ٹھہر کر ہی۔''

''جمشید صرف رابطے کا آدمی تھا۔ کاروبار کرتے وقت کوئی آدمی بیچ میں بھی ڈالنا پڑتا ہے۔ وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں تھا۔ تمہیں یہ سن کر حیرت ہوگی کہ ان پینٹنگز کو میں نے پینٹ کیا تھا اور اس نے متاثر کن گفتگو کر کے انہیں فروخت کر دیا تھا۔''

''تم؟ تم نے وہ جعلی پینٹنگز تیار کی تھیں؟'' میرا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔

''ہاں۔'' اس نے اپنے سر کو تفہیمی جنبش دی۔ ''تکنیکی طور پر انہیں جعلی تو نہیں کہنا چاہیے اس لیے کہ میں نے کسی کی نقل نہیں بنائی تھی۔ اپنے طور پر پینٹنگز بنائی تھیں اور ان پر مشہور آرٹسٹوں کا نام ڈال دیا تھا۔ یہ میری محنت ہے کہ میں نے انہی کے اسٹائل میں کام کیا تھا۔ اگر تم کہو تو میں تمہیں لیونارڈو..... کی مشہور پینٹنگ ''مونا لیزا'' بھی بنا کر دکھا دوں؟''

''تمہارا مطلب ہے کہ تم ایک عورت ہوتے ہوئے.....''

''کیوں..... کیا یہ خلافِ قانون بات ہے؟'' اس نے میری بات کاٹ کر کہا۔ ''عورتیں کیا آرٹسٹ نہیں ہو سکتیں؟ میں نے پینٹنگز تیار کی تھیں اور جمشید نے انہیں فروخت کیا تھا۔ جہاں تک بلیک میلنگ کا تعلق ہے تو یہ اس کا فعل ہے۔ میں نے اسے بلیک میلنگ کی ترغیب نہیں دی تھی۔

اس لیے وہ میری طرف سے جہنم میں جا سکتا ہے۔'' اس نے بے اعتنائی سے کہا اور ایک بار پھر چھت کی طرف دیکھنے لگی۔ اس کے بعد سرک کر میرے کچھ اور قریب آتے ہوئے بولی۔ ''ہم دونوں مل کر بہت کچھ کر لیں گے۔ یہ چھوٹی سی جگہ ہے، کیوں نہ ہم تہران چلیں؟ کیا خیال ہے؟''

''پیاری فرح! میں دو اور دو چار والا آدمی ہوں، کہیں ایسا نہ ہو کہ.....''

''اندیشوں اور وسوسوں کو اپنے دل میں جگہ نہ دو۔ جعلی پینٹنگ خریدنے والے پولیس کے پاس نہیں جاتے، اس لیے کہ پولیس یہ پوچھتی ہے کہ جب انہیں پتا تھا کہ پینٹنگ جعلی ہے تو انہوں نے اسے کیوں خریدا؟ اس کے علاوہ میں یہ بھی بتاتی چلوں کہ اس ملک میں جعلی پینٹنگز فروخت کرنے والوں کے خلاف کوئی قانون نہیں ہے۔''

''میں یہ نہیں کہہ رہا ہوں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ.....''

''اگر مگر کے چکر میں مت پڑو آفندی! اس کاروبار میں بہت پیسا ہے۔ ابھی دو ہفتے پہلے میں نے داراب کے ہاتھوں دو پینٹنگز فروخت کی تھیں، جانتے ہو اس نے ان کا کیا کیا...؟''

''یہ داراب کون ہے؟'' میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

''وہی جس کی آرٹ گیلری یادگار چوک پر ہے۔'' اس نے کہا۔

میں نے ایک لمحے کے لیے آنکھیں بند کر لیں اور سوچنے لگا کہ میں فریدوں، شیرازی اور آقائے پویا کے بارے میں ہی کیوں سوچتا رہا؟ جمشید نے اس کے علاوہ بھی دوسری گیلریوں کو پینٹنگز فروخت کی ہوں گی۔ مجھے ان کے بارے میں بھی تو سوچنا چاہیے تھا۔

''تم نے اب تک کتنے ڈیلروں کے ہاتھوں اپنی پینٹنگز فروخت کی ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''پانچ ڈیلروں کو فروخت کی ہیں جن میں فریدوں، شیرازی، آقائے پویا، داریوش اور داراب شامل ہیں۔''

''کیا تمہیں معلوم ہے کہ داراب کے پاس نیلے رنگ کی ایک لنکن کانٹی نینٹل ہے؟'' میں نے مسکرا کے کہا۔

''ہاں' ایک بار وہ مجھے اور جمشید کو اسی کار میں بٹھا کر ایک نمائش میں لے گیا تھا۔'' دفعتاً اس کی آنکھیں فرطِ حیرت سے پھیل گئیں۔ ''اوہ ہاں! یاد آیا..... اخبارات میں لکھا ہے کہ جمشید کو نیلے رنگ کی ایک لنکن کانٹی نینٹل نے کچل کر ہلاک کیا تھا۔''

''بالکل درست۔'' میں نے کہا۔ ''یہ قتل داراب نے کیا ہے۔'' میں اپنی جگہ سے اٹھ کر ٹیلی فون کی طرف بڑھا اور اس کا ریسیور اٹھایا۔

''اے ٹھہرو' تم کیا کرنے جا رہے ہو؟'' فرح نے اضطراب سے کہا۔

''پولیس کو اطلاع دینے جا رہا ہوں کہ نیلے رنگ کی ایک لنکن داراب کے گیراج میں کھڑی ہے۔ اگر اس کا رنگ اور جمشید کے کپڑوں پر لگا ہوا رنگ چیک کر لیا جائے تو دونوں رنگ آپس میں مل جائیں گے۔''

''دونوں رنگ آپس میں مل جائیں گے، اس کے بعد؟ کیا پولیس یہ ثابت کر سکے گی کہ داراب نے جمشید کو ہلاک کیا ہے؟ داراب ایک ذی حیثیت شخص ہے، متمول ہے، سوسائٹی میں اس کو عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اس کا وکیل عدالت میں یہ کہہ کر اسے بری کرا لے گا کہ اس سڑک پر تاریکی تھی جمشید اچانک اس کی کار کے سامنے آ گیا۔ اس لیے داراب گھبراہٹ میں کچھ نہ کر سکا، نکر ہو گئی۔ جانتے ہو عدالت اسے کیا سزا دے گی؟ ایک آدھ ماہ کی قید اور چار ہفتوں کے لیے اس کا ڈرائیونگ لائسنس منسوخ کر دیا جائے گا۔''

میں نے سوچا وہ صحیح کہہ رہی ہے۔ میرے اتنے اودھم مچانے سے کیا ہوگا؟ داراب کو قتل کی سزا نہیں ہو پائے گی اور سارا کھیل میرے ہاتھ سے نکل جائے گا۔ مجھے کیا ملے گا؟ میں نے ایک گہرا سانس لیا اور ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔

فرح ہوشنگ میرا ہاتھ تھام کر مجھے صوفے تک لے گئی اور میرے پہلو میں بیٹھتے ہوئے بولی۔ ''یہاں سکون سے بیٹھو اور میری بات سنو۔ جب میں چند مشہور آرٹسٹوں کی پینٹنگز اور تیار کر لوں گی تو انہیں مارکیٹ میں پھیلانے کے بعد ہم اتنا مال کما لیں گے کہ کہیں اور جا کر ٹھاٹ سے رہ سکیں، مجھے دوشنبہ بہت پسند ہیں۔ تہران اور زاہدان..... اگر تمہارے دماغ میں کوئی اور جگہ ہو تو.....''

میں نے محسوس کیا کہ ہمارے درمیان اب بھی فاصلہ قائم ہے لہٰذا پہلے تو میں نے اس فاصلے کو دور کیا اور اس کے بعد آہستہ سے اس کے کان میں کہا۔ ''اب تمہاری پسند میری پسند ہے اور میرے دماغ میں تمہارے سوا کچھ نہیں ہے۔ ایک بات بتاؤں؟ تم میری زندگی کے گوشوارے میں شامل ہو گئی ہو!''

٭٭٭

یہ کوئی بارہ دن پہلے کی بات تھی۔ وہ پال مین کی قیادت میں... کینیڈا کے اس انتہائی شمالی سرے پر سمندر کے اوپر جمی برف کے رن وے پر اترے۔ طیارے سے سات افراد جن میں پانچ مرد اور دو عورتیں تھیں۔ چالیس عدد کتے' چار عدد برف پر پھسلنے والی گاڑیاں اور تقریباً دو ٹن سامان اتارا گیا تھا۔ پائلٹ میگن جو مقامی ریڈ انڈین نسل سے تعلق رکھتا تھا اس نے رخصت ہونے سے پہلے پال مین سے کہا ''جناب میں ہفتے روزانہ شام کو دو گھنٹے اس جگہ آپ کا انتظار کروں گا۔ پورے چھ بجے کے درمیان۔''

''اب تم جا سکتے ہو۔'' پال مین نے سر ہلا کر کہا اور میگن طیارہ لے کر اڑ گیا۔ طیارہ جانے کے بعد پال مین اپنے ساتھیوں کی طرف متوجہ ہوا ''دوستو میں ایک بار پھر دہرا دوں۔ ہماری اس مہم کا مقصد مشرق سے مغرب کی طرف کینیڈا کے اس بے آب و گیاہ خطے میں سفر کرنا ہے جہاں اس سے پہلے کم ہی لوگ آئے ہوں گے۔ ہمارا مقصد اس علاقے کے قدرتی وسائل کا جائزہ لینا ہے۔ ممکن ہے اس سفر میں ہمیں کوئی ایسی چیز مل جائے جو ہماری تقدیر بدل دے۔''

پال مین کے مرد ساتھیوں میں چالیس سالہ کوفر شیف تھا۔ وہ جیالوجسٹ اور پال مین کا عزیز ترین دوست بھی تھا۔ چھتیس سالہ میگین مختلف قسم کے آلات استعمال کرنے کا ماہر

انجامِ لالچ

لبنیٰ زبیر

زندگی گزارنے کے لیے دولت ہر شخص کی ضرورت ہے..... کوئی کوئی کم پر اکتفا کر لیتا ہے..... اور کسی شخص کی ضرورت بڑھ کر ہوس کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ انجانے راستوں پر سفر اختیار کرنے والے ایڈونچر پسند لوگوں کا ماجرا جو اپنی اپنی قسمت بدلنے کے لیے نکل کھڑے ہوئے تھے۔

مہم جوئی کا شوق رکھنے والے افراد کے لیے ایک دلچسپ پُرخطر سفر کی روداد

تھا۔ چوبیس سالہ جیسن کتوں کی دیکھ بھال پر مامور تھا۔ اس کے علاوہ کھانا بنانا بھی اس کی ذمے داری تھی۔ ٹیم کا سب سے معمر فرد چوالیس سالہ گیرٹ ماہر نیوی گیٹر تھا۔ وہ محض ستارے دیکھ کر بھی راستہ تلاش کر سکتا تھا۔ ویسے اس کے پاس اس مقصد کے لیے کئی جدید آلات تھے۔ وہ ان کا ریڈیو بھی آپریٹ کرتا۔ عورتوں میں ڈاکٹر مچلی جیکب تھی۔ یہودی نژاد مچلی ڈاکٹر کے طور پر ان کے ساتھ تھی۔ وہ خاص طور سے برفانی خطوں کی بیماریوں اور زخموں سے نمٹنے کی ماہر تھی۔ اس کے ساتھ لونی تھی جو برفانی گاڑیاں چلانے کی ماہر تھی۔

وہ اپنے ساتھ تقریباً دو ٹن سامان لائے تھے جس کا بیشتر حصہ خوراک اور ایندھن پر مشتمل تھا۔ اس سارے سامان کو مساوی طور پر چاروں برفانی گاڑیوں پر یکساں طور پر لاد دیا گیا۔ ہر گاڑی کو دس عدد کتے کھینچ رہے تھے۔ دس کتے اضافی تھے۔ جب کسی ایک گاڑی کے کتے تھکنے لگتے تو ان کی جگہ دس کتوں کو گاڑی میں جوت دیا تھا۔ یہ خاصی برفانی علاقے میں پائے جانے والے صحت مند کتے تھے جو شدید سردی میں بھی چاق و چوبند رہتے تھے اور گھنٹوں برف پر گاڑیاں کھینچنے کے باوجود نہیں تھکتے تھے۔ لونی اور جیسن کتے گاڑیوں میں جوت رہے تھے۔ انہیں یہ کام کرنا اچھا لگتا تھا۔

انتہائی شمال کے نزدیک ہونے کی وجہ سے مارچ سے ستمبر تک اس علاقے میں دن رہتا تھا اور مطلع صاف ہو تو سورج چوبیس گھنٹے چمکتا تھا مگر آسمان پر اکثر بادل چھائے رہتے تھے۔ اسی وجہ سے ہمہ وقت دھندلی سی روشنی ہوتی تھی جو بعض اوقات تاریکی میں بدل جاتی تھی جب برفانی طوفان آتا تھا' اس وقت بھی صبح کے سات بجے تھے اور ہلکی سی روشنی میں اردگرد کا منظر واضح تھا۔ آسمان پر گہرے سرمئی رنگ کے بادل دیکھ کر لگ رہا تھا کہ کسی وقت بھی برف باری ہو سکتی ہے۔ گیرٹ نے کہا ''ساتھیوں اس سے پہلے کہ برفباری شروع ہو ہمیں سمندر کے اوپر سے نکل جانا چاہیے۔ بعض اوقات گرنے والی برف کے بوجھ سے سمندر کی منجمد سطح ٹوٹ جاتی ہے۔''

یہ سنتے ہی وہ سب عجلت میں چلنے کے لیے تیار ہو گئے۔ جمی ہوئی برف تلے سمندر کے پانی کا درجۂ حرارت کئی درجے منفی تھا اور اس میں گرنے والے کا بچنا معجزات میں ہوتا۔ کتوں کو اشارہ ملنے کی دیر تھی کہ انہوں نے جوش و خروش سے دوڑنا شروع کر دیا۔ سب سے آگے والی سلیج کو جیسن سنبھال رہا تھا اور اس کے عقب میں لونی تھی۔ باقی دو سلیجوں پر باقی افراد تھے۔

لونی نے حال ہی میں گریجویشن کیا تھا۔ وہ برفانی کھیلوں میں حصہ لیتی رہی تھی اور اپنے کالج کی طرف سے اس نے کئی اعزازات حاصل کیے تھے۔ سلیج گاڑی (اس کے نیچے پہیوں کے بجائے پھسلنے والے تختے ہوتے ہیں) چلانے اور کتوں کو قابو کرنے میں اسے خاصی مہارت تھی۔ اسی وجہ سے پال مین نے اسے اپنی مہم میں شامل کیا تھا۔ پال مین کینیڈا کو جانا پہچانا جیالوجسٹ اور مہم جو تھا۔ اس سے پہلے وہ کئی سفر کر چکا تھا اور اس نے بے شمار معدنی ذخیرے دریافت کیے تھے۔ خاص طور سے اس نے شمالی کینیڈا میں ہیرے کی کان دریافت کی تھی لیکن اس کی بدقسمتی کہ فوجی علاقہ ہونے کی وجہ سے حکومت نے وہاں کان کنی کی اجازت دینے سے انکار کر دیا تھا۔ اسی وجہ سے پال مین اس دریافت سے کوئی فائدہ نہیں حاصل کر سکا تھا۔

اس بار اس کا ارادہ تھا کہ وہ مشرق سے مغرب کی طرف کینیڈا کے قطب سے ملنے والی ساحلی پٹی کے ساتھ سفر کرے گا۔ یہاں پر بے شمار علاقے ایسے تھے جہاں آج تک کسی انسان کا گزر نہیں تھا اور نہ ہی وہاں کا زمینی سروے کیا گیا تھا۔ اسے امید تھی کہ اس بار وہ کوئی نہ کوئی ایسی چیز دریافت کرے گا جو اس کے دن پھیر دے گی۔ گزشتہ پانچ سال سے وہ خاصی مشکلات میں رہا تھا۔ اس کی بیوی نے اس سے طلاق لے لی تھی۔ عدالت نے بچے بھی اس کی بیوی کی تحویل میں دے دیے تھے اور اب وہ ان سے مہینے میں ایک بار مل سکتا تھا۔ اس کی بیوی نے حرکت یہ کی کہ بچے لے کر کیوبک سوپے چلی گئی۔ وہ فرانسیسی نژاد تھی اس لیے وہاں بسنے میں اسے کوئی خاص دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ ٹورنٹو سے سیکڑوں میل دور جا کر ہر مہینے بچوں سے ملنا آسان نہیں تھا۔ خاص طور سے اس صورت میں جبکہ اس کی مالی حالت بھی خراب تھی۔

پال مین ایک ایسے سرمایہ دار کی تلاش میں تھا جو اسے سرمایہ دے سکے تاکہ وہ کینیڈا کے شمال میں اپنے سفر کا برسوں پرانا خواب پورا کر سکے۔ مسئلہ یہ تھا کہ لوگ اب ایسی مہمات میں پیسہ لگانے سے ہچکچانے لگے تھے کیونکہ نوے فیصد امکان یہی تھا کہ پیسہ ڈوب جائے گا۔ بلکہ اسے سرمایہ کاری سے زیادہ سٹے بازی کہنا مناسب تھا۔ داؤ لگنے کی صورت میں پیسہ لگانے والے کے وارے نیارے ہو جاتے۔ بالآخر اسے ایک شخص مل گیا۔ یہ فرنچ نژاد کینیڈین اور پال کا ہم نام پال لونی تھا۔ اس نے گزشتہ برسوں میں سونے کی کانوں میں سرمایہ کاری کر کے خاصی رقم کمائی تھی اور اب وہ پال مین کو اس مہم کے لیے ایک لاکھ ڈالرز دینے کے لیے تیار تھا لیکن یہ رقم ناکافی تھی۔ پال مین کو کم سے کم ڈیڑھ لاکھ ڈالرز کی ضرورت تھی مگر پال لونی نے ایک لاکھ ڈالرز سے اوپر مزید ایک ڈالر دینے سے بھی صاف انکار کر دیا تھا۔ مجبوراً پال مین نے بینک سے رجوع کیا۔ اس کی سابقہ ساکھ اور پال لونی کی طرف سے سرمایہ کاری کو مدِنظر رکھ کر اسے پچاس ہزار ڈالرز کا قرض دے دیا اور وہ اس قابل ہوا کہ اپنی مہم کا آغاز کر سکے۔ اس نے آدمی سارے چن کر لیے تھے اور وہ سب رضاکار کے طور پر اس مہم میں شامل تھے لیکن اسے کوئی فائدہ ہوتا تو یہ سب بھی اس میں حصے دار ہوتے۔

لونی اور جیسن کے لیے یہ اعزاز ہی کافی تھا کہ وہ پال مین جیسے مہم جو کے ساتھ ایک دشوار گزار مہم پر جا رہے تھے۔ البتہ باقی افراد کو قائل کرنا آسان ثابت نہیں ہوا تھا۔ خاص طور سے ڈاکٹر مچلی نے صاف کہہ دیا تھا کہ وہ پیشگی معاوضے کے بغیر اس مہم کے لیے اپنی خدمات دینے سے قاصر ہے۔ مجبوراً پال مین نے اسے پانچ ہزار ڈالرز ادا کیے تھے لیکن یہ بات کسی اور کے علم میں نہیں تھی۔ گیرٹ اور میکین نے مہم کی کامیابی کی صورت میں حاصل ہونے والی دولت میں پانچ پانچ فیصد کا مطالبہ کیا تھا اور پال مین کو یہ مطالبہ قبول کرنا پڑا تھا۔ کوفر جیسن اور لونی نے اس سے کوئی مطالبہ نہیں کیا تھا اور آبادی سے اس مہم پر جانے کے لیے تیار ہو گئے تھے۔ ان کی روانگی سے پہلے ہی ایک لاکھ ڈالرز ٹھکانے لگ چکے تھے۔

☆☆☆

جیسن نے مہکتی کافی کا مگ لونی کی طرف بڑھایا۔ دونوں خیمے میں کھانا بنانے میں مصروف تھے۔ کیروسین آئل سے جلنے والے چولھے نے بند خیمے کے اندر اتنی گرمی پیدا کر دی تھی کہ وہ عام لباس میں آ گئے تھے۔ ان کے پاس سردی سے بچاؤ کے لیے خاص قسم کے خیمے اور رات سونے کے لیے گرم سلیپنگ بیگز تھے۔ ان میں لیٹ کر انہیں کمبلوں کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ کل چھ خیمے تھے۔ ایک سامان کے لیے اور باقی پانچ ان کے لیے۔ مچلی اور لونی ایک ہی خیمے میں سو رہی تھیں۔ جیسن اور گیرٹ ایک خیمے میں' جبکہ کوفر شیف اور میکین دوسرے خیمے میں ہوتے تھے۔ پال مین اپنے سامان سمیت تیسرے خیمے میں ہوتا تھا جبکہ ایک اضافی خیمہ کچن کے لیے مخصوص تھا۔

برفانی طوفان کی آمد سے پہلے وہ تقریباً چار گھنٹے تک سفر کرتے رہتے تھے۔ طوفان کے آتے ہی انہوں نے خیمے لگائے۔ گاڑیاں اس طرح کھڑی کیں کہ ان کے درمیانی خلا میں سلیج بھر کر ان پر اوپر سے ترپال ڈال دی تھی۔ اس طرح کتے بھی محفوظ تھے اور یہ امکان بھی نہیں تھا کہ تند ہوائیں سلیج گاڑیوں کو لے جائیں گی۔ برف میں سلاخیں گھسا کر خیمے ان سے باندھ دیے گئے تھے۔ یہ کام کر کے وہ اس وقت تک کے لیے خیموں میں گھس گئے جب تک برفانی طوفان تھم نہ جائے۔ اس سے پہلے آگے سفر محال تھا۔ پال مین اس صورتِ حال سے خوش نہیں تھا۔ ظاہر ہے جتنا وقت ضائع ہوتا اس کی مہم اتنی ہی طول پکڑتی جاتی اور اخراجات اس کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔ خیمے انہوں نے اس طرح لگائے تھے کہ وہ باہر نکلے بغیر ایک دوسرے کے خیموں میں جا سکتے تھے۔

لونی اور جیسن نے کھانا بنانے کی ذمے داری قبول کی تھی بلکہ ذمے داری تو جیسن کی تھی لیکن لونی کو اس سیاہ چمکتی آنکھوں والے نوجوان کے ساتھ رہنا اچھا لگتا تھا۔ اس لیے اس نے از خود کھانا بنانے میں جیسن کا ہاتھ بٹانے کی پیشکش کر دی تھی اور اس وقت دونوں سوپ بنانے کے ساتھ بیٹھے ایک دوسرے کو اپنے بارے میں بتا رہے تھے۔ کافی کی مہک شاید دوسرے خیموں تک جا پہنچی تھی۔ پال مین دروازے سے رینگ کر اندر آیا اور لونی کے برابر میں بیٹھ گیا۔ بیالیس سالہ پال مین اپنی عمر سے زیادہ کا نظر آتا تھا۔ اس نے جیسن سے

بذریعہ ڈاک
خواتین و حضرات گھر بیٹھے داخلہ لیں

انگلش لینگویج کورس	ہیئر بریکنگ	ہوم اکنامکس	بیوٹی پارلر کورس
ریفریجریشن ایئر کنڈیشننگ	الیکٹرونکس	بوتیک فیشن	آٹو موٹر سائیکل
ریڈیو ٹی وی وی سی آر ریپیئرنگ	ایکریڈیشن	ڈرافٹس مین	ڈریسنگ ڈیکوریشن
اسکول ٹیچنگ میتھڈ	صحافت	فوٹو گرافی	انٹیریئر ڈیکوریشن
ہیومینٹیز	شمسی توانائی	مہر سازی	سلنگ بیوٹی
اردو ٹائپ رائٹنگ	موٹر سائیکل مرمت	لائبریرین	کمپیوٹر
کوکنگ بیکنگ	لیڈیز ٹیلرنگ	ایگریکلچر پیسٹیسائیڈز (ہیومینٹیز)	میڈیکل ایڈ
آئل پینٹنگ	ڈینٹل ٹیکنیشن	پبلسٹی ڈیری فارمنگ	نیوز رپورٹر
فلاور میکنگ	پبلک ریلیشنز آفیسر		

یہ تمام کورسز اردو میں ہیں۔ سینکڑوں تصاویر اور ملٹی پیج کتابچہ مفت حاصل کریں۔ ہر شعبہ کی کتابیں بذریعہ ڈاک ہر جگہ کورس کر کے گھر پر کماتے ہیں۔ کورس کے دوران اور سند لینے کے بعد بھی مکمل راہنمائی ایک دفعہ ہی ایک کورس میں داخلہ چاہتا ہے۔ جوابی لفافے کے ساتھ خط لکھیں۔

اسلام آباد اکیڈمی
پوسٹ بکس نمبر 1237
جی پی او، اسلام آباد

کانی کا کہا۔

''سر ایک بات پوچھوں؟'' لونی نے کہا ''آپ کس امید پر یہ مہم کر رہے ہیں؟''

پال مین نے اسے تعریفی نظروں سے دیکھا ''تم ذہین لڑکی ہو اور پہلی فرد ہو جس نے مجھ سے یہ سوال کیا ہے۔ شاید میں خود بھی نہیں جانتا کہ کس امید پر یہ مہم سر کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ شاید اسے مہم جوئی کا جنون کہہ لو۔ میں اپنی مہم کا مقصد طے کیے بغیر اس سفر پر نکل کھڑا ہوا ہوں۔''

''سر اگر اس سفر میں کوئی ایسی چیز ہمارے ہاتھ آ گئی تو.....'' لونی بولتے بولتے رک گئی۔ اس نے کان لگا کر سنا ''کوئی باہر کتوں کے پاس ہے۔''

''میں نے تو نہیں سنا۔'' پال مین بولا۔

''میرے کان بہت تیز ہیں سر۔'' لونی بولی اور اپنی جیکٹ پہنتے ہوئے باہر نکل گئی۔

''کیا حماقت ہے۔'' پال مین زیر لب بولا اور لونی کے پیچھے نکل گیا۔ تر پال تلے سے کتوں کے غرانے اور آپس میں جھپٹنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ لونی تر پال ہٹا رہی تھی۔ اچانک اس کے ہاتھ میں ایک پیکٹ آ گیا۔ یہ کتوں کے راتب کا پیکٹ تھا جو پھٹا ہوا تھا۔ معاً کتوں کے غرانے کی آواز کرب ناک کراہوں میں بدل گئی۔ پال مین بھی بوکھلا گیا اس نے سلیج سے تیز روشنی والی ٹارچ نکالی اور تر پال کے نیچے روشنی کی۔ سامنے خوفناک منظر تھا کم سے کم درجن بھر کتے ایڑیاں رگڑ رہے تھے۔ ان کے کھلے منہ سے جھاگ اور خون نکل رہا تھا۔ اندر بھی راتب کے کئی پھٹے ہوئے پیکٹ پڑے تھے جن پر دوسرے کتے پلے پڑ رہے تھے۔ پال مین کو صورتِ حال سمجھنے میں ایک لمحہ لگا۔ وہ تر پال اٹھاتے ہوئے چلایا ''کتوں کو کسی نے زہر دے دیا ہے۔ میرے خدا.....''

لونی نے ان کتوں سے پیکٹ چھیننے کی کوشش کی جنہوں نے ابھی تک راتب نہیں کھایا تھا۔ وہ ان سے پیکٹ چھین چھین کر باہر پھینکنے لگی۔ کتے دیوانے ہوئے جا رہے تھے۔ لونی کی خوش قسمتی کہ وہ اس پر نہیں پل پڑے تھے۔ جن کتوں نے زہریلا راتب کھا لیا تھا۔ وہ اب ایڑیاں رگڑ رہے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ان کے سترہ بہترین کتے مر چکے تھے اور مزید تین جاں کنی کی کیفیت میں تھے۔ انہوں نے شاید راتب پر منہ ہی مارا تھا۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ زہر بے حد سریع الاثر تھا۔ راتب کے چھ پیکٹ تھے جو کسی نے کھول کر اور ان پر پاؤڈر کی صورت میں زہر ڈال کر کتوں کے سامنے پھینک دیئے تھے۔ ذرا سی دیر میں سب وہاں جمع تھے۔ لونی نے کسی کو نہیں دیکھا تھا اور نہ ہی پال مین کو وہاں کوئی نظر آیا تھا۔

''کیا ہوا ہے.....'' کوفر شیف آیا پھر مرے ہوئے کتوں پر نظر پڑتے ہی رک گیا ''انہیں کیا ہوا ہے؟''

''یہ مر گئے ہیں۔'' پال مین سرد لہجے میں بولا ''کسی نے انہیں راتب میں ملا کر زہر دے دیا ہے۔''

''مگر کس نے؟'' جیسن بولا ''سب اندر تھے۔''

''سب نہیں۔'' لونی نے اردگرد دیکھا ''کم سے کم ایک فرد باہر تھا۔ وہ جس نے کتوں کو زہر دیا۔''

''میں اور لونی گزشتہ ایک گھنٹے سے ساتھ ہیں۔'' جیسن نے فوری طور پر اپنی صفائی پیش کی ''ہم میں سے کوئی ایک لمحے کے لیے بھی باہر نہیں گیا تھا۔''

''میں اور گیرٹ بھی اتنی ہی دیر سے تاش کھیل رہے تھے۔'' کوفر شیف نے جلدی سے کہا۔

''میں آرام کر رہا تھا۔'' میکین نے کہا ''میں بھی خیمے سے باہر نہیں گیا۔''

''اور میں بھی۔'' مچلی بولی ''اپنا سامان درست کر رہی تھی۔''

''پھر کتوں کے راتب میں زہر ملا کر کس نے ڈالا۔'' پال مین بے حد غصے میں تھا۔ اس کی مہم آغاز ہی سے ناکامی کے خطرے سے دوچار ہو گئی تھی۔ سب ایک دوسرے کو شک کی نظر سے دیکھ رہے تھے۔ وہ اندر آ گئے۔ پال مین اور جیسن نے ہلاک ہونے والے کتوں کی لاشیں ذرا فاصلے پر ایک گڑھے میں پھینک دیں۔ لونی نے کھانا مکمل کیا اور سب کو دیا۔ پال مین کا خیمہ سب سے بڑا تھا۔ کھانے کے بعد سب وہیں جمع ہو گئے۔ پال مین ایک ایک کو دیکھ رہا تھا۔

''سوال یہ ہے کہ ہم کس پر شک کریں۔'' اس نے کہا۔

''سب سے زیادہ شک کی زد میں میں اور میکین آتے ہیں۔'' مچلی نے سنجیدگی سے کہا ''کیونکہ ہم ثبوت پیش کرنے سے قاصر ہیں۔ ہم باہر نہیں گئے تھے۔''

''میرا نام مت لو۔'' میکین غرایا ''سوال یہ ہے کہ کسی کو ایسا کرنے کی کیا ضرورت ہے۔''

''مقصد واضح ہے۔'' لونی بولی ''وہ جو کوئی بھی ہے اس مہم کی ناکامی چاہتا ہے۔''

''ممکن ہے ہمارے علاوہ بھی کوئی اس جگہ ہو۔'' جیسن نے خیال پیش کیا۔

''اس ویرانے میں کوئی انسان نہیں ہے۔ یہاں سے نزدیک ترین انسانی آبادی بھی چار سو کلومیٹرز کے فاصلے پر ہے۔'' پال مین نے آگاہ کیا ''نہیں یہ ہم میں سے کوئی ہے۔''

''کسی اور کو ہماری مہم کی کامیابی یا ناکامی سے کیا سروکار ہو سکتا ہے۔''

''ممکن ہے کوئی نہیں چاہتا ہو کہ ہم اس علاقے میں جائیں اور وہاں کوئی کامیابی حاصل کریں۔'' لونی نے سوچ کر کہا ''یہی بات کسی کو ہم سے کیا سروکار ہے۔''

بے حد سی مغز ماری کے باوجود وہ کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکے تھے۔ اس لیے پال مین نے سب کو سونے کے لیے بھیج دیا۔ صبح نئے سفر کا پھر سے آغاز کرنا تھا۔

☆☆☆

میں کتوں کی موت ان کے لیے دھچکا تھی لیکن پال مین نے سفر جاری رکھا۔ اب ہر سلیج کو سات کتے کھینچ رہے تھے۔ سفر جاری تھا لیکن مہم کا ماحول بدل گیا تھا۔ پہلے والی بے تکلفی ختم ہو گئی تھی۔ یہ احساس ہر شے پر بھاری تھا کہ ان کے درمیان ایک خطرناک شخص موجود ہے جو اپنے مقصد کے لیے کسی انتہا تک جا سکتا ہے۔ دو دن تک وہ سمندری خلیجوں پر سفر کرتے رہے۔ یہ خلیجیں دراصل کسی کریک کا حصہ تھیں جن پر برف کی موٹی تہ مستقل جمی رہتی تھی۔ ان کریکس سے پرے کھلے سمندر میں ہزاروں کی تعداد میں چھوٹے بڑے جزائر تھے لیکن برف کی وجہ سے یہ جاننا مشکل تھا کہ جزیرہ کہاں ختم ہوا اور سمندر کہاں سے شروع ہوا۔ سفر کے تیسرے دن آرام کے وقت پال مین نے اپنے کمرے میں سب کو بلا کر ان کے سامنے نقشہ بچھا لیا تھا۔ اس نے جزائر کی طرف اشارہ کیا۔

''ان میں سے اکثر جزیرے انسانی وجود سے خالی ہیں۔'' وہ بولا ''اور اکثر ایسے ہیں جن پر آج تک کسی انسان نے قدم نہیں پہنچے۔''

''لیکن ہماری منزل جزائر نہیں ہیں۔'' گیرٹ نے اعتراض کیا ''ہمیں خشکی پر سفر کرنا ہے۔''

''لیکن کیا حرج ہے اگر ہم ان میں سے کچھ جزائر بھی دیکھ لیں۔'' پال مین نے اصرار کیا ''اکثر جزائر آتش فشانی سے وجود میں آتے ہیں۔ ان میں اکثر قیمتی معدنیات مل جاتی ہیں۔''

پال مین کی اس بات نے گیرٹ کو رائے تبدیل کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ فیصلہ ہوا کہ اگلے دن وہ خشکی سے کوئی بارہ میل دور چند جزائر کے مجموعے تک جائیں گے اور وہاں پر تحقیق کریں گے۔ ان کے سفر کرنے کا طریقہ یہ تھا کہ آٹھ گھنٹے آرام کرتے تھے اور بارہ گھنٹے سفر پھر آٹھ گھنٹے کا آرام ہوتا تھا۔ اس طرح وہ وقت کی بچت کر رہے تھے۔ اگلے روز ناشتے اور کھانے سے فارغ ہو کر انہوں نے سامان باندھا اور سمندر کی منجمد سطح پر سفر کرنے لگے۔ اس وقت وہ پُرتجسس بھی تھے اور خوف زدہ بھی۔ نہ جانے کہاں پر برف کی سطح تڑخ جائے اور وہ پانی میں جا گریں جس کا درجۂ حرارت جان لیوا حد تک کم تھا۔ گرمی میں اکثر برف کی تہ پگھل جاتی ہے اور اس پر دراڑیں بھی نمودار ہو جاتی ہیں۔

وہ کسی حادثے کے بغیر جزائر تک جا پہنچے۔ یہ پندرہ سے زائد چھوٹے بڑے جزائر کا مجموعہ تھا جن میں سب سے بڑا جزیرہ کوئی سات مربع میل پر پھیلا تھا اور سب سے چھوٹا ایک مربع میل سے بھی کم تھا۔ تمام جزائر آتش فشاں سے نکلنے والے لاوے سے وجود میں آئے تھے۔ سب سے بڑے جزیرے کے اوپر تقریباً چار ہزار فٹ کی بلندی پر آتش فشاں کے دہانے سے دھواں اور راکھ کے بادل نکل رہے تھے۔ یعنی وہ زندہ آتش فشاں تھا۔ احتیاطاً انہوں نے آتش فشاں سے دور ساحل کے ساتھ کیمپ لگایا۔ لونی اور جیسن حسبِ معمول کھانا بنانے کی تیاری میں لگ گئے۔ پال مین اور کوفر شیف جزیرے کے سروے کے لیے چلے گئے۔ ڈاکٹر مچلی حسبِ معمول طب سے متعلق ایک موٹی سی کتاب میں گم ہو گئی تھی۔ میکین اور گیرٹ شطرنج کی بازی جما کر بیٹھ گئے تھے۔ لونی اور جیسن بہت تیزی سے ایک دوسرے کے نزدیک آئے تھے۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ اس سفر سے انہیں مالی طور پر فائدہ نہ ہوا تب وہ ملازمت کر کے پیسے جمع کریں گے۔ آگے تعلیم حاصل کریں گے اور دو سال بعد شادی کر لیں گے۔ انہوں نے یہ فیصلہ بھی کیا تھا کہ ٹورنٹو میں رہائش اختیار کریں گے۔ لونی کسی مہم جوئی کے ادارے سے منسلک ہونا چاہتی تھی اور ساتھ ہی اس شعبے میں صحافت کرنے کا ارادہ رکھتی تھی۔ جب کہ جیسن کتوں کی تربیت کا اسکول بنانا چاہتا تھا۔ دونوں کاموں کے لیے رقم کی ضرورت تھی۔ جونی الوقت ان کے پاس نہیں تھی اس لیے شادی کا فیصلہ دو سال تک کے لیے ملتوی کر دیا گیا تھا۔ گزشتہ آرام کے وقفے میں لونی اور جیسن یہ اطمینان کرنے کے بعد کہ سب سو رہے ہیں کچن والے خیمے میں آ گئے تھے۔ جب جذبات کا دور گزر گیا تو جیسن نے سرگوشی کی ''اب دو سال کی مدت بہت زیادہ لگ رہی ہے۔''

''زیادہ فری ہونے کی کوشش مت کرو۔'' لونی شرما گئی تھی ''ہم نے جو فیصلہ کیا ہے اس پر قائم رہیں گے۔''

''ہاں بشرطیکہ تم اسی طرح مجھے نوازتی رہو۔'' جیسن کے لہجے میں شرارت تھی۔

''بس اب چلو اس سے پہلے کہ کسی کی آنکھ کھل جائے۔''

''پہلے وعدہ کرو اگلی بار بھی ملنے آؤ گی۔''

''آؤں گی۔'' لونی ہنسی تھی۔

پال مین اور کوفر شیف واپس آئے تو خوش لگ رہے تھے۔ انہوں نے آتش فشاں کے دامن سے کچھ پتھر لیے تھے مگر تھکے ہونے کی وجہ سے انہوں نے کھانا کھا کر سونے کو ترجیح دی۔ باقی سب بھی سو گئے تھے سوائے لونی اور جیسن کے۔ ان کے دل انتظار میں دھڑک رہے تھے۔ جیسے ہی خیموں میں سکوت ہوا وہ دونوں کچن والے خیمے میں آ گئے۔ گزشتہ تین دن سے کوئی حادثہ نہیں ہوا تھا اس لیے اب ان لوگوں کے رویوں میں مصنوعی تکلف ختم ہوتا جا رہا تھا۔ لونی اور جیسن کو وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا تھا۔ اچانک لونی کی نظر گھڑی پر پڑی اور وہ اچھل پڑی تھی۔

''میرے خدا..... وہ لوگ اٹھنے والے ہوں گے۔'' وہ پھرتی سے اٹھی ''اپنے خیمے میں جاؤ۔''

بادل ناخواستہ جیسن نے اپنے خیمے کا رخ کیا۔ لونی نے اپنے خیمے میں آ کر مچلی کو دیکھا۔ وہ اپنے سلیپنگ بیگ میں بے خبر سو رہی تھی۔ ڈاکٹر مچلی بے حد سرد مزاج عورت تھی۔ کسی سے اس کی بے تکلفی نہیں تھی۔ وہ لیے دیئے رہتی تھی۔ جب خیمے لگتے تو وہ اپنے خیمے میں گھس جاتی۔ کھانا بھی عام طور سے وہیں کھایا کرتی تھی۔ اپنے سامان کی دیکھ بھال کرتی، مطالعہ کرتی اور پھر سو جاتی۔ اس کی نیند خاصی گہری ہوتی تھی۔ رات شاذ ہی کسی وقت اٹھتی تھی اور اس وقت بھی بالکل ساکت پڑی تھی۔ لونی نے مناسب سمجھا کہ کچھ دیر کے لیے سو جائے مگر ابھی اس کی آنکھ لگی تھی کہ پال مین نے خیمے میں جھانکا ''تم ابھی تک سو رہی ہو۔ اٹھ جاؤ۔''

بادل ناخواستہ اس نے سر باہر نکالا ''کیا آج ہمیں کہیں جانا ہے؟''

''نہیں بلکہ اس جگہ رکنا ہے۔ تم مچلی کو بھی اٹھاؤ۔'' پال مین کہہ کر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد لونی نے باہر نکل کر گرم کپڑے پہنے ان کے بغیر باہر جانے کا سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ اس نے مچلی کا سلیپنگ بیگ ہلایا۔

''اٹھ جاؤ صبح ہو گئی ہے۔'' اس کے ہلانے اور آواز دینے کے باوجود مچلی سوتی رہی اس نے دوبارہ آواز دی اور تیسری بار اس کے بیگ کی زپ کھول دی۔ اس کے منہ سے چیخ نکلی تھی۔ مچلی سو نہیں رہی تھی اس کی آنکھیں کھلی تھیں اور وہ مر چکی تھی کسی نے اس کی گردن اس طرح کاٹ دی تھی کہ اس کا سر جسم سے تقریباً الگ ہو گیا تھا۔

لونی کی ہذیانی چیخوں نے سب کو وہاں جمع کر لیا تھا۔ پال مین اور کوفر شیف جزیرے کے اندرونی حصے میں جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ وہ بھی دوڑے چلے آئے۔ مچلی کی لاش دیکھ کر سب ہی سکتے میں آ گئے تھے۔ خاصی دیر بعد پال مین نے اضطراب سے کہا ''یہ کس نے کیا ہے؟''

''لونی سے پوچھو۔'' گیرٹ بولا ''اس کے ساتھ ہوتی ہے ممکن ہے اس نے.....''

''بکواس مت کرو۔'' جیسن جھپٹ کر آگے آیا ''کیا یہ مچلی کو اتنی بے دردی سے قتل کر سکتی ہے۔''

گیرٹ نے شانے اچکائے ''آج کی عورت کے بارے میں کیا کہا جا سکتا ہے کہ کب کیا کر گزرے۔''

لونی رو رہی تھی۔ اس نے جیسن کے شانے میں سر چھپا لیا تھا۔ سب اسے مشکوک نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ میکین نے پوچھا۔

''جب لونی اس کے ساتھ تھی تو یہ کیسے ممکن ہے کوئی مچلی کی گردن کاٹ جائے اور اسے پتا ہی نہیں چلے۔''

''یہ ممکن ہے۔'' جیسن نے کہا ''کیونکہ پچھلے تین گھنٹے سے لونی میرے ساتھ کچن والے خیمے میں تھی۔ ہم وہاں سے ایک لمحے کے لیے بھی نہیں ہٹے تھے۔''

پال مین مچلی کی لاش کا معائنہ کر رہا تھا۔ اس نے لونی سے پوچھا ''تم کتنی دیر پہلے خیمے میں واپس آئیں؟''

''ایک گھنٹا ہو گیا ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

''اس صورت میں لونی قاتل نہیں ہو سکتی..... میں اپنے تجربے کی بنا پر کہہ سکتا ہوں۔ مچلی کو مرے کم سے کم دو گھنٹے گزر چکے ہیں۔''

گیرٹ بدستور لونی کو شک کی نظر سے دیکھ رہا تھا ''ممکن ہے یہ دونوں ملے ہوئے ہوں۔''

''میں تمہارا منہ توڑ دوں گا۔'' جیسن جھپٹا لیکن میکین نے روک لیا۔

''اس طرح شبہ ہم چار افراد پر رہ جاتا ہے۔'' کوفر شیف بولا ''میں بتا دوں کم سے کم میں نے مچلی کو قتل نہیں کیا۔''

''اس بحث کا فائدہ بھی نہیں ہے۔'' میکین نے کہا ''قاتل نے اپنا کوئی نشان نہیں چھوڑا ہے۔''

''سوال یہ ہے کہ مچلی کے قتل کا مقصد؟'' گیرٹ نے پوچھا۔

''مزید سوال یہ ہے کہ کتوں کو زہر کس نے دیا۔'' میکین کا لہجہ طنزیہ تھا ''اس قسم کے احمقانہ سوال بے سود ہیں۔ ہمیں علم نہیں ہے کہ قاتل کون ہے اور اس کا مقصد کیا ہے؟''

''اس سے پہلے ہم میں سے کوئی اور قاتل کا شکار بنے

ہمیں جانا ہوگا۔'' جیسن نے کہا۔ سب نے اس کی تائید کی تھی۔

''پائلٹ تین دن بعد آئے گا۔'' پال مین نے کہا ''اور واپسی کا سفر کم سے کم چار دن کا ہے۔''

''تب پائلٹ کو ریڈیو پر ایک دن بعد آنے کے لیے کہا جائے۔'' لونی نے تجویز پیش کی۔

گیرٹ اپنے خیمے کی طرف گیا تاکہ ریڈیو پر پیغام بھیج سکے۔ اچانک اس کی دہاڑ سنائی دی ''میرے خدا..... یہ کس حرامی نے کیا ہے!''

وہ سب گیرٹ کے خیمے کی طرف بھاگے جہاں وہ اپنے ریڈیو کو رو رہا تھا۔ کسی نے اسے توڑ دیا تھا اور اب وہ کسی کام کا نہیں رہا تھا۔ ''ہم بیرونی دنیا میں کسی سے رابطہ نہیں کر سکتے۔'' اس نے رو دینے والے لہجے میں کہا۔

''یہ کیا ہو رہا ہے۔'' میکین چلایا۔

''ہوش میں رہو۔'' پال مین غرایا اور گیرٹ سے پوچھا ''ریڈیو کس نے خراب کیا جبکہ یہ تمہاری تحویل میں تھا۔''

''رات میں نے اسے چیک کیا تھا۔ تب یہ بالکل ٹھیک تھا۔ کسی نے اسے باہر لے جا کر کوئی دھاتی سلاخ اس کے سرکٹ میں گھسا دی۔ یہ دیکھو اس پر برف کے ذرات بھی نظر آ رہے ہیں۔''

''کوئی ہمیں اس ویرانے میں مار دینا چاہتا ہے۔'' لونی بولی ''میں یہاں سے واپس جاؤں گی۔''

''اور میں بھی.....'' جیسن بولا ''اب ہم ایک دن کے لیے بھی یہاں نہیں رکیں گے۔''

پال مین نے گہری سانس لی ''او کے..... تم لوگ جا کر کتے گاڑیوں میں لگاؤ، ہم واپس جائیں گے۔''

تیسرا انکشاف لونی اور جیسن پر اس وقت ہوا جب انہوں نے ترپال کے نیچے دیکھا۔ کتے رات کسی وقت مر گئے تھے۔ قاتل نے اس بار تیزی اور خاموشی سے کام کیا تھا۔ سریع الاثر زہر نے کتوں کا کام فوری طور پر تمام کر دیا تھا پھر جیسن سے ذرا فاصلے پر ہونے کی وجہ سے وہ ان کی آخری آوازیں نہیں سن سکے تھے۔ لونی اور جیسن بھاگے اور ہانپتے ہوئے یہ خبر دوسروں کو سنائی۔ کتوں کے مرنے کا سن کر سب کے چہرے فق ہو گئے تھے اس کا مطلب تھا کہ وہ اس سرد جہنم میں قیدی بن گئے تھے۔ کتوں کے بغیر پیدل اکیلے سفر کر سکتے تھے لیکن سامان لے کر نہیں اور سامان کے بغیر وہ اس ویرانے میں بھوک سے سردی سے مر جاتے۔

لونی نے اپنی حالت پر قابو پا لیا تھا۔ اس نے پال مین سے پوچھا ''اگر قاتل ہم میں ہے تو وہ ایسی احمقانہ حرکت کیوں کرنے لگا۔ اس طرح تو وہ بھی ہمارے ساتھ مارا جائے گا۔''

جیسن کتوں کا معائنہ کر کے واپس آیا ''میرا خیال ہے قاتل نے اپنے بچاؤ کا بندوبست کر لیا ہے۔ پانچ کتے غائب ہیں اور وہ ان کی مدد سے اس جگہ سے نکل سکتا ہے۔''

وہ سب ایک بار پھر ایک دوسرے کو شک کی نظر سے دیکھنے لگے تھے۔ کتے لے جانے کے نشانات سخت برف پر ملنا محال تھے۔ اس لیے کسی نے کوشش بھی نہیں کی۔ مچلی کی لاش کو برف میں تقریباً دو فٹ گہرا گڑھا کھود کر دبا دیا گیا تھا۔ اس کے اوپر بطور نشانی ایک سرخ رنگ کا جھنڈا لگا دیا گیا تھا۔ اس کے بعد کتوں کی لاشیں ذرا دور برفانی گڑھے میں پھینکیں گئیں۔ منفی دس درجے کی سردی میں اس بات کا کوئی امکان نہیں تھا کہ یہ لاشیں سڑ..کر بدبو دینے لگتیں۔ اس کے بعد وہ مرحومہ مچلی کے خیمے میں جمع ہو کر واپسی کی تجاویز پر غور کرنے لگے۔ میکین اور گیرٹ کا خیال تھا کہ انہیں خود برفانی گاڑیاں کھینچ کر واپس چلنا چاہیے۔ اس طرح بے شک ان کی رفتار سست رہے گی لیکن وہ واپس اس مقام تک پہنچ جائیں گے جہاں ہوائی جہاز انہیں لینے آتا لیکن کوفر شیف اور پال مین اس کے مخالف تھے۔ پال مین نے کہا۔

''اول تو اتنا وزنی سامان کھینچنا ہم چھ افراد کے بس کی بات نہیں ہے اور بالفرض محال ہم نے کسی نہ کسی طرح یہ کام کر بھی لیا تو سارے دن میں تین چار میل سے زیادہ کا فاصلہ طے نہیں کر سکیں گے۔ جبکہ ہم اس مقام سے سو میل سے زیادہ فاصلے پر ہیں۔ وہاں جاتے جاتے بیس پچیس دن لگ جائیں گے اور کیا پتا اس دوران میں مزید کتنے حادثے ہو جائیں۔''

''تب تم کوئی تجویز پیش کرو۔'' میکین بیزاری سے بولا۔

''میری تجویز ہے کہ میں اور گیرٹ کچھ سامان لے کر ہیکنر پر جاتے ہیں۔ اس طرح ہماری رفتار تیز ہوگی۔ ہم ہوائی جہاز آنے سے پہلے وہاں پہنچ جائیں گے اور پھر ہوائی جہاز ادھر لے آئیں گے اس جزیرے میں کئی جگہیں ایسی ہیں جہاں طیارہ لینڈ کر سکتا ہے۔''

میکین اس تجویز سے متفق نہیں تھا کہ کیونکہ صرف گیرٹ ہی واحد فرد تھا جو راستہ دکھا سکتا تھا۔ وہ پال مین کے ساتھ جاتا اور انہیں کوئی حادثہ پیش آ جاتا تو بقیہ چار افراد بے یار و مددگار رہ جاتے ''دوسرے ہم نہیں جانتے کہ قاتل کون ہے اس طرح وہ ہمیں الگ الگ آسانی سے شکار کر لے گا۔''

''وہ تو سب کی موجودگی میں بھی کام دکھا رہا ہے۔'' پال مین نے تلخی سے کہا۔

''میرا خیال ہے میں اور لونی کھانے کا انتظام کریں اتنی دیر میں آپ لوگ طے کریں کہ ہمیں کیا کرنا ہے۔'' جیسن اٹھتے ہوئے بولا ''لیکن یہ بات طے ہے اب ہم یہاں نہیں رکیں گے۔''

لونی اور جیسن کھانا بنانے کے دوران اپنی حفاظت کے بارے میں بھی سوچتے رہے تھے۔ ان کے پاس اسلحے کے نام پر صرف دو شاٹ گنیں تھیں۔ جو پال مین اور کوفر شیف کے پاس تھیں یہ بھی اس لیے کہ کہیں برفانی ریچھ سے سامنا نہ ہو جائے۔ ورنہ اس خطے میں انہیں سوائے قدرتی آفات کے اور کوئی خوف نہیں تھا۔ جیسن نے لونی کو ایک تیز دھار چاقو دیا ''اسے اپنے پاس رکھنا۔ ممکن ہے قاتل کے خلاف کام دے سکے۔''

''سنو جیسن ہم بھی جا سکتے ہیں۔'' لونی نے تجویز دی ''میں اور تم دونوں اسکیٹنگ کے ماہر ہیں۔''

جیسن نے نفی میں سر ہلایا ''ہاں لیکن ہمیں راستے تلاش کرنا نہیں آتے ہیں۔ ممکن ہے میں اکیلا ہوتا تو اس کی کوشش کرتا لیکن تمہارے ساتھ میں اس کا خطرہ مول نہیں لے سکتا۔''

لونی اس کے سینے سے لگ گئی ''میں خود کو بہت بہادر لڑکی سمجھتی تھی مگر مجھے اب ڈر لگ رہا ہے۔''

''فکر مت کرو میں تمہاری حفاظت کروں گا۔'' جیسن نے ایک عزم سے کہا تھا ''مرتے دم تک!''

جب وہ کھانا بنا کر لائے تو وہاں فیصلہ ہو چکا تھا۔ پال مین اور گیرٹ اسکیز لے کر جاتے اور امید تھی کہ تیسرے دن آنے والے طیارے کو لے آتے۔ کھانا کھاتے ہی انہوں نے سامان پیک کیا جس میں ان کے سلیپنگ بیگ اور کھانے کا سامان شامل تھا۔ بیگ اپنی پشتوں پر لاد کر وہ اسکیز پہن کر فوری طور پر روانہ ہو گئے تھے۔ اب ان کے کیمپ میں کل چار افراد تھے۔ لونی خوف زدہ تھی اسے لگ رہا تھا کہ قاتل میکین یا کوفر شیف میں سے کوئی تھا۔

اس نے اکیلے خیمے میں سونے سے صاف انکار کر دیا ''میں جیسن کے خیمے میں سوؤں گی۔ مجھے بالکل پروا نہیں ہے کہ تم کیا سوچتے ہو۔'' اس نے اعلان کیا۔

میکین معنی خیز انداز میں مسکرانے لگا۔ البتہ کوفر شیف نے شرافت سے کہا ''مس ہم ان حالات میں کوئی بے ہودہ بات سوچ بھی نہیں سکتے ہیں۔''

ایک شاٹ گن پال مین لے گیا تھا اور دوسری کوفر شیف کے پاس تھی۔ لونی کو ذرا اطمینان ہوا تھا۔ اگر میکین ہی قاتل تھا تو کوفر شیف اس سے نمٹ سکتا تھا۔ وہ اور جیسن بھی چاقوؤں سے مسلح تھے۔ پال مین اور گیرٹ کے جانے کے بعد وہ لوگ آرام کرنے لگے۔ گھڑی کے مطابق رات تو ہے برف باری شروع ہوئی اور دو گھنٹے بعد یخ بستہ ہوائیں چلنے لگی تھیں۔ درجۂ حرارت منفی تیس درجے سینٹی گریڈ تک گر گیا تھا۔ مجبوراً انہوں نے خیمے گرم کرنے کے لیے چھوٹے ہیٹر جلائے۔ یہ کفایتی برنر ایک لیٹر ایندھن چار گھنٹے میں استعمال کرتے تھے۔ ان کے پاس شدید سردی کے اثرات سے بچانے والی دوائیں بھی تھیں لیکن فی الوقت ان کی ضرورت نہیں تھی۔ کھا پی کر وہ اپنے سلیپنگ بیگز میں گھس گئے تھے۔ حفظ ماتقدم کے طور پر جیسن نے اپنے خیمے کو اندر سے اس طرح بند کر لیا تھا کہ کوئی زپ کھول کر اندر نہیں آ سکتا تھا۔

برف باری کے بعد یخ بستہ ہواؤں کا سلسلہ ساری رات جاری رہا تھا۔ وہ سوتے رہے۔ درمیان میں دو تین بار لونی کی آنکھ کھلی تو اس نے جیسن کو پاس ہی محوِ خواب دیکھا۔ اسے تحفظ کا احساس ہوتا اور وہ پھر سے سو جاتی۔

بارہ گھنٹے بعد جب ان کے پیٹوں میں چوہے دوڑنے لگے تو وہ بادل ناخواستہ گرم سلیپنگ بیگز سے نکلے۔ جیسن نے خیمہ کھولا اور وہ رینگ کر کچن والے خیمے تک گئے۔ جو اس وقت سرد ہو رہا تھا۔ چولھا جلایا تو کچھ گرمی ہوئی۔ جیسن نے فرائنگ پان میں مکھن ڈال کر اس میں انڈے توڑے اور لونی سے کہا ''ان دونوں کو جگاؤ میں اتنی دیر میں ناشتا بناتا ہوں۔''

لونی نے اگلے خیمے میں جھانک کر کہا ''اٹھ جاؤ سب..... ناشتا تیار ہے۔''

اسی لمحے اس نے دیکھا۔ ایک سلیپنگ بیگ خالی تھا۔ دوسرے سے کوفر شیف نے سر نکالا ''ہیلو بے بی..... کیا حال ہیں؟''

''میکین کہاں ہے؟'' لونی نے سوال کیا۔

''میکین۔'' کوفر شیف نے اس کے سلیپنگ بیگ کی طرف دیکھا ''مجھے نہیں پتا..... وہ کہاں ہے؟''

کوفر شیف نے اٹھ کر خیمے کا پردہ دیکھا۔ وہ ذرا سا کھلا تھا ''شاید کسی ضرورت کی وجہ سے باہر گیا ہے۔''

لونی نے واپس آ کر جیسن کو بتایا ''میکین اپنے خیمے میں نہیں ہے۔ کوفر شیف کہہ رہا ہے وہ کسی ضرورت سے باہر گیا ہے۔''

جیسن فکر مند ہو گیا ''باہر اس وقت جس شدت کی سردی ہے اور ہوا چل رہی ہے کوئی باہر جانے کی حماقت نہیں کر سکتا ہے۔ بہر حال اسے دیکھتے ہیں تم ناشتا کرو۔''

ناشتے میں ڈبل روٹی تلے ہوئے اور ابلے ہوئے

انڈے، شہد اور کافی تھی۔ وہ ناشتا کر رہے تھے کہ کوفر شیف بھی آ گیا۔ وہ فکر مند لگ رہا تھا ''میکین کو اتنی دیر میں آ جانا چاہیے تھا۔'' اس نے کہا۔

لونی نے محسوس کیا کہ جیسن کو کوفر شیف شک کی نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ اس نے کہا ''پہلے ناشتا کر لیں پھر میکین کو دیکھتے ہیں۔''

کوفر شیف بھی ناشتے میں شامل ہو گیا۔ اس سے فارغ ہو کر انہوں نے بھاری گرم کوٹ اور دستانے پہنے، پیروں میں کتے کی کھال کے بنے گرم جوتے پہنے جو پاؤں کو برفانی یخ سے بچاتے تھے۔ ورنہ عام چمڑے کے جوتے اس سردی سے بچاؤ نہیں کر سکتے تھے۔ تیار ہو کر وہ باہر نکلے کوفر شیف نے شاٹ گن لے لی تھی۔ وہ میکین کو آوازیں دینے لگے۔ ہوا کی چیخ و پکار میں ان کی آواز زیادہ دور نہیں جا رہی تھی۔ کوفر شیف نے ان سے کہا ''میرا خیال ہے ہمیں الگ الگ سمتوں میں جا کر اسے تلاش کرنا چاہیے۔''

''میں اکیلے نہیں جاؤں گی اور نہ تمہیں جانے دوں گی۔'' لونی نے جیسن سے کہا۔

''ایسا کرو تم اس طرف جاؤ۔'' جیسن نے کوفر شیف کو شمال کی طرف اشارہ کر کے کہا ''میں اور لونی جنوب کی طرف جاتے ہیں۔ دس منٹ بعد تم واپس آ جانا پھر ہم مشرق اور مغرب کی طرف جائیں گے۔''

کوفر شیف نے سر ہلایا ''اتنی دور مت جانا کہ راستہ بھول جاؤ۔''

کوفر شیف کے جاتے ہی وہ دوسری سمت چلنے لگے ''مجھے شک ہے یہی قاتل ہے اس نے میکین کو مار دیا ہے۔'' لونی نے جلدی سے کہا۔ جیسن اس سے متفق تھا۔

''مجھے بھی یہی شک ہے لیکن میں شک ظاہر کرتے ہوئے ڈر رہا ہوں۔ اس کے پاس شاٹ گن ہے۔ اگر وہ سچ مچ قاتل ہے تو وہ ہمیں بھی مار سکتا ہے۔''

''میکین کہاں ہو سکتا ہے۔'' لونی نے چاروں طرف دیکھا۔ تازہ برف باری نے گزشتہ روز کے سارے نشان مٹا دیے تھے۔ وہ گڑھا بھی غائب تھا جس میں کتوں کی لاشیں ڈالی تھیں۔ برف نے سب غائب کر دیا تھا۔ ڈاکٹر مچلی کے قبر پر لگا جھنڈا ابھی ہوائیں اڑا لے گئی تھیں لیکن اس کا ڈنڈا باقی تھا۔ وہ جزیرے کی طرف سمندر پر آ گئے تھے۔ وہ میکین کو آواز دے رہے تھے لیکن ایسا لگ رہا تھا کہ وہ کہیں پاس ہو تو اب بھی تو جواب دینے کے قابل نہیں رہا تھا۔ معالونی کے پاؤں تلے سے برف تڑخی لیکن اس سے پہلے وہ یخ ترین پانی میں جا گرتی۔ جیسن نے اسے بازو سے پکڑ کر پیچھے کھینچ لیا۔ اس نے چیخ ماری۔ گزشتہ برف باری کی پتلی سی تہ جم گئی تھی۔ لونی اس پر چڑھ گئی تھی۔

''واپس چلو اس وقت سمندر پر جانا خطرناک ہو گا۔''

وہ واپس آنے لگے۔ ایک جگہ لونی کے پاؤں کسی شے سے ٹکرائے وہ گرتے گرتے بچی۔ جیسن نے دیکھا۔ لونی کے پیر کی ٹھوکر سے برف ہٹ گئی تھی اور اس کے نیچے سے براؤن رنگ کا کپڑا جھلک رہا تھا۔ اس نے جلدی سے برف ہٹائی۔ نیچے سے میکین کا چہرہ جھانکنے لگا جو نیلگوں ہو رہا تھا۔ اس بار لونی نے زیادہ زور سے چیخ ماری تھی۔

میکین بلاشبہ مر چکا تھا اور اس کی لاش کئی گھنٹوں برف میں پڑی رہی تھی۔ لونی سسکیاں لینے لگی تھی۔ جیسن نے لاش پر سے پوری طرح برف ہٹائی اور جلد اس کے مرنے کی وجہ سامنے آ گئی۔ میکین کے سینے میں چار انچ کا سوراخ تھا جو یقیناً شاٹ گن کی گولی سے بنا تھا۔ گولی اس وقت چلائی گئی جب ہوا پوری رفتار سے چل رہی تھی۔ اس کے شور میں شاٹ گن کا دھماکا دب گیا تھا۔ اس لیے محض سو فٹ کا فاصلہ ہونے کے باوجود وہ لوگ بے خبر سوتے رہے تھے۔ لونی نے جیسن کو جھنجوڑ دیا ''قاتل کوفر شیف ہے وہ ہمیں بھی مار دے گا۔''

''ہمیں اس سے شاٹ گن حاصل کرنی ہے۔'' جیسن بولا ''آؤ چلیں۔''

''نہیں۔'' لونی سہم گئی..... ''وہ ہمیں دیکھتے ہی گولی مار دے گا۔''

جیسن سوچ کر بولا ''ہم اس پر ظاہر نہیں ہونے دیں گے کہ ہم نے میکین کی لاش دیکھ لی ہے اور اس کی موت کی وجہ سے واقف ہو گئے ہیں۔''

''تم اس سے گن چھین کر اسے گولی مار دو گے۔''

''میں قاتل نہیں ہوں۔'' جیسن خفگی سے بولا ''لیکن اسے باندھ کر رکھیں گے جب تک طیارہ نہیں آتا۔''

جیسن نے جلدی جلدی میکین پر دوبارہ برف ڈال کر اسے چھپا دیا۔ وہ خیموں کی طرف آئے۔ کوفر شیف ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔ جیسن نے لوہے کی ایک ڈیڑھ فٹ لمبی راڈ اپنے کوٹ میں چھپائی تھی۔ وہ کوفر شیف کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ تقریباً پندرہ منٹ بعد آیا تھا۔ اس نے تھکے ہوئے انداز میں شاٹ گن ایک طرف رکھ دی ''میکین کہیں نہیں ہے مجھے ڈر ہے وہ سمندر کی طرف چلا گیا جہاں دراڑیں بن رہی ہیں۔ وہ سمندر میں بھی گر سکتا ہے۔ تم لوگ سناؤ۔''

''ہمیں بھی وہ کہیں نظر نہیں آیا۔ البتہ لونی ایک دراڑ

میں گرتے گرتے بچی تھی۔" جیسن نے شاٹ گن کی طرف کھسکتے ہوئے کہا۔ کوفر شیف اس کا نوٹس لیے بغیر فرش پر دراز ہو گیا تھا۔ موقع غنیمت جان کر جیسن نے جھپٹ کر شاٹ گن اٹھائی اور پیچھے سرک گیا۔ کوفر شیف نے چونک کر اسے دیکھا اس کی آنکھوں میں چمک نمودار ہوئی تھی۔

"میرا اندازہ درست تھا۔ میکلین کو تم دونوں نے غائب کیا ہے۔" کوفر شیف بولا۔

جیسن اور لونی اس الزام سے زیادہ اس کی ڈھٹائی پر دنگ رہ گئے تھے" بکو مت..... ! میکلین کو تم نے مارا ہے۔ ہم ابھی اس کی لاش دیکھ کر آ رہے ہیں۔" جیسن نے شاٹ گن اس کی طرف تان لی۔

"خوب تم دونوں مجھے اس بہانے مارنا چاہتے ہو۔" کوفر شیف کے لہجے میں تلخی تھی۔

"ہم نے میکلین کو نہیں مارا۔" لونی چلائی "اس کے قاتل تم ہو۔ اسے شاٹ گن سے شوٹ کیا گیا ہے۔ اس کے قاتل تم ہو شاٹ گن تمہارے پاس تھی۔"

کوفر شیف نے بے یقینی سے انہیں دیکھا "میں اسے نہیں مار سکتا' یہ غلط ہے۔"

جیسن نے شاٹ گن اس کی طرف سیدھی کی "سچ بتاؤ۔ ورنہ گولی مار دوں گا۔"

کوفر شیف نے سر ہلایا "مجھے تم دونوں پر شبہ تھا اس لیے میں نے آزمانے کے لیے شاٹ گن خالی کر کے رکھ دی اور توقع کے عین مطابق تم نے جھپٹ کر اٹھالی۔ قاتل تم ہو لیکن تم مجھے قتل نہیں کر سکو گے۔ یقین نہیں آ رہا تو چلا کر دیکھو۔"

جیسن نے شک سے اسے دیکھا اور خیمے کا پردہ سرکاتے ہوئے نال باہر نکال کر ٹریگر دبا دیا۔ کوئی دھماکا نہیں ہوا۔

کوفر شیف نے مسکرا کر اپنے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا "گولیاں میرے پاس ہیں۔"

"اس طرح تم یقین نہیں دلا سکتے کہ میکلین کو تم نے نہیں مارا ہے۔" جیسن بولا۔

"اگر میں جیسن کا قاتل ہوتا تو تمہیں یوں آزمانے کی کوشش نہ کرتا۔ سیدھا سیدھا گولی مار دیتا۔" کوفر شیف نے دلیل دی۔ وہ سوچنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ لونی نے سر ہلایا۔

"یہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔"

"لیکن شاٹ گن تمہیں واپس نہیں ملے گی۔"

"میں اس کا مشورہ نہیں دوں گا۔" کوفر شیف سنجیدگی سے بولا "یہ بات طے ہے کہ قاتل ہم میں سے کوئی نہیں ہے۔ اس کا مطلب ہے کیمپ کے باہر ایک مسلح قاتل موجود ہے اور ہمارا غیر مسلح ہونا مناسب نہیں ہوگا۔"

"اس کے باوجود میں شاٹ گن تمہارے حوالے نہیں کروں گا۔"

"بے شک اسے اپنے پاس رکھو لیکن گن کو لوڈ رکھو۔ مجھے ایک نظر میکلین کی لاش دکھا دو تو میں بخوشی گولیاں تمہارے حوالے کر دوں گا۔"

"چلو..... لیکن کوئی حرکت نہ کرنا ورنہ میں خالی ہاتھ بھی تم سے نمٹ سکتا ہوں۔" جیسن نے اسے دھمکی دی۔ وہ اور لونی کوفر شیف کو میکلین کی برفانی قبر تک لائے۔ برف ہٹی تو میکلین کی لاش سامنے آ گئی۔ کوفر شیف نے جلدی سے سینے پر کراس بنایا اور بھرائی آواز میں بولا "تم سچ کہہ رہے ہو۔ ہمارے پیچھے کوئی اور ہی ہے۔" اس نے شاٹ گن کی گولیاں جیسن کے حوالے کیں اور اس نے شارٹ گن لوڈ کر لی۔ وہ واپس خیموں تک آئے۔ جیسن اور لونی بھی تشویش زدہ ہو گئے تھے۔ لونی نے کہا۔

"اس ویرانے میں ہمارا دشمن کون ہو سکتا ہے؟"

"ظاہر ہے کوئی ایسا شخص یا پارٹی جو نہیں چاہتی کہ ہم اس علاقے میں سفر کریں۔" جیسن بولا۔

"لیکن کیوں نہیں چاہتی۔ اسے کیا تکلیف ہے؟" لونی جھنجلا گئی تھی۔

"ممکن ہے یہاں اس کا ایسا کوئی مفاد ہو۔ جسے وہ ہر قیمت پر دوسروں سے چھپانا چاہتی ہو۔"

کوفر شیف نے تجویز دی "ہم میں سے ایک کو پہرا دینا چاہیے اور اکیلے کوئی باہر نہ جائے۔ دشمن صرف غافل دیکھ کر وار کر رہا ہے۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے۔" جیسن بولا "وہ شاید اکیلا ہے۔"

لونی خوف زدہ نظر آنے لگی "میں کہتی ہوں۔ سب پر لعنت بھیجو یہاں سے نکلو۔ نہ جانے پال مین کب مدد لے کر آئے۔"

"میرا مشورہ ہے ہمیں یہاں انتظار کرنا چاہیے۔ کھلے میں خطرہ ہے۔" کوفر شیف بولا۔

جیسن نے نفی میں سر ہلایا "یہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ لونی حوصلے سے کام لو۔"

جیسن اور کوفر شیف نے گاڑیاں کیمپ کے گرد کھڑی کر دیں اور ان کی ترپال خیموں کے اوپر ڈال دی تھی۔ اس طرح باہر موجود دشمن ان کی اندر کی پوزیشن سے بے خبر رہتا۔ جیسن اور کوفر شیف نے باری باری پہرا دینے کا فیصلہ کیا۔

دو گھنٹے بعد جیسن چہرا دبے کر سونے چلا گیا۔ لونی نے فیصلہ کیا کہ وہ کوفر شیف کی باری میں جاگتی رہے گی۔ نہ جانے کیوں وہ اس پر مکمل اعتماد کرنے کے لیے تیار نہیں تھی۔ چوبیس گھنٹے سفر کرنے کے بعد ہواؤں کی شدت میں خاصی کمی آ گئی تھی اور سردی کی شدت بھی کم ہو گئی تھی۔ کوفر شیف اپنی ڈیوٹی پوری کر کے سونے چلا گیا تھا۔ جیسن کھانا کھا رہا تھا اور لونی ان پتھروں سے کھیل رہی تھی جو کوفر شیف اور پال مین جزیرے سے لائے تھے۔ لونی کو ان میں سنہری سی چمک نظر آ رہی تھی۔ اسے خیال آیا کہ شاید ان پتھروں میں سونا ہے۔ اس نے ایک گیس برنر جلا کر ایک پتھر اس پر رکھ دیا۔ اس کا درجہ حرارت پندرہ سو درجے سینٹی گریڈ تھا جو سونے کو پگھلانے کے لیے کافی تھا مگر پتھر میں موجود دھات جوں کی توں رہی۔ اسے مایوسی ہوئی یہ سونا نہیں تھا۔ اس نے جیسن کو بتایا۔

"اس چکر میں مت پڑو۔ ہم یہاں سے اپنی جان بچا کر لے جائیں یہی کافی ہے۔"

"سوچو اگر ہمیں سونے یا کسی اور قیمتی دھات کا کوئی نمونہ ہاتھ آ جائے تو ہم راتوں رات دولت مند ہو جائیں گے۔"

"اس خواب نے تو ہمیں اس چکر میں پھنسایا ہے۔" جیسن کے لہجے میں تلخی تھی "انسان کو ہمیشہ لالچ ہی مرواتا ہے۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔" لونی شرمندہ ہو گئی۔

"اب تم سو جاؤ چوبیس گھنٹے سے جاگ رہی ہو۔"

لونی سچ مچ تھکن اور نیند محسوس کر رہی تھی۔ اس نے کھانا کھایا تھا اس لیے سونے کے لیے اپنے سلیپنگ بیگ میں چلی گئی "مجھے اٹھا دینا جب تم سونے کے لیے جانا۔"

"تم فکر نہ کرو۔" جیسن نے سر ہلا کر کہا تھا۔

لونی سونے کے لیے لیٹ گئی تھی لیکن کوئی بات مسلسل اس کے ذہن میں چبھ رہی تھی۔ وہ اس کے بارے میں سوچتی رہی اور پھر سو گئی۔ اچانک اس کی آنکھ کھلی اور وہ اچھل گئی تھی۔ سوتے میں بھی اس کا ذہن کام کرتا رہا تھا اور اب اسے وہ بات یاد آ گئی تھی جو اب تک اس کے لاشعور میں تھی۔ اس نے غور سے دیکھا جیسن سونے کے لیے چلا گیا تھا۔ لونی نے چپکے سے بیگ سے نکل کر انگڑائی لی اور کوفر شیف سے کہا "میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے میں سوچ رہی ہوں کہ ڈاکٹر مچلی کے سامان سے کوئی دوا لے لوں۔"

"ضرور۔" کوفر شیف نے سر ہلایا "اگر تمہیں دواؤں کا علم ہے۔"

"تم اس کی فکر مت کرو۔ میں نے طبی امداد اور دواؤں کے بارے میں ایک کورس کر رکھا ہے۔" لونی بولی اور اٹھ کر اس خیمے میں آئی جہاں ڈاکٹر مچلی کا سامان تھا۔ وہ دواؤں کے ڈبے کھول کھول کر دیکھنے لگی۔ آخر اسے اپنی مطلوبہ چیز ایک ڈبے سے مل گئی۔ اس نے سفید رنگ کے اس سفوف کی شیشی لیب میں رکھی اور کچن میں آ گئی۔ اس نے چمک دار دھات والے پتھر کے ٹکڑے نکالے۔ گیس برنر جلایا۔ ایک ٹکڑا برنر پر رکھا اور اوپر سے ذرا سا سفوف پتھر پر چھڑک دیا تھا۔ ساتھ ہی اس نے منہ پر کپڑا رکھ لیا۔ پتھر سے ہلکا سا دھواں اٹھا اور فوراً ہی اس سے چمک دار دھات کے پگھلے قطرے بہہ نکلے۔ جنہیں لونی نے ایک چمچ میں جمع کر لیا۔ اس نے اندازہ لگایا کہ پتھر سے ایک گرام دھات نکلی تھی۔ اس کا اندازہ درست تھا۔

"تمہارا شک درست تھا۔" اچانک عقب سے سرگوشی سنائی دی اور ساتھ ہی شاٹ گن کی نال اس کی پشت سے لگ گئی "آواز مت نکالنا ورنہ تمہیں گولی مار دوں گا اور پھر مجبوراً مجھے جیسن کو بھی گولی مارنی پڑے گی کیا تم ایسا چاہتی ہو؟"

"نہیں۔" لونی لرز گئی تھی۔

"شاباش تب میرے ساتھ چلو۔" کوفر شیف نے کہا۔

لونی باہر آئی۔ کوفر شیف نے اس پر شاٹ گن تان رکھی تھی۔ خیموں سے ذرا دور آ کر کوفر شیف نے اس سے کہا۔

"مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تم اتنی ذہین نکلو گی۔ تمہیں کیسے پتا چلا کہ ان پتھروں میں پلاٹینیم ہے۔"

"اس کے نہ پگھلنے کی وجہ سے گیس برنر کے درجہ حرارت پر سوائے فولاد کے ہر دھات گیس پگھل جاتی ہے۔ پلاٹینیم بھی آسانی سے پگھل جاتی ہے۔ بشرطیکہ اس کے ساتھ سنکھیا ہو۔ تم اس قیمتی دھات کے لیے لوگوں کو قتل کر رہے تھے؟" لونی نے اچانک پوچھا۔

"دوسروں کا تو نہیں معلوم..... ہاں تمہیں میں ہی قتل کروں گا۔" کوفر شیف نے گن لہرائی "آگے چلو' سمندر کی جانب۔"

لونی اس کا منصوبہ بھانپ گئی تھی "تم چاہتے ہو میری موت حادثہ نظر آئے۔"

کوفر شیف نے سر ہلایا "تم ضرورت کی وجہ سے باہر گئیں اور کسی دراز میں گر گئیں تو اس میں میرا تو کوئی قصور نہیں ہوگا۔"

"تم جیسن کو بھی مار دو گے۔"

''نہیں' میں بلاوجہ قتل و غارت گری کا قائل نہیں ہوں۔'' اس نے انکار کیا۔

''تب مچھلی اور میکین کو کس نے مارا۔''

''میں جھوٹ کیوں بولوں گا۔'' کوفر شیف نے جواب دیا ''انہیں شاید.....''

کوفر شیف کا جملہ ادھورہ رہ گیا۔ فضا شاٹ گن کے ہولناک دھماکے سے گونجی اور کوفر شیف منہ کے بل گر کر ساکت ہوگیا۔ اس کی کمر میں بڑا سا سوراخ نظر آ رہا تھا۔ جس سے تازہ خون ابل رہا تھا۔ لونی چیخنے لگی تھی۔

''چپ رہو۔'' قریب سے پال مین کی آواز آئی ''تمہیں نقصان تو نہیں ہوا۔''

''تم کہاں ہو۔'' لونی نے اردگرد دیکھا۔ ایک برفانی تودے کے عقب سے پال مین لنگڑاتا ہوا برآمد ہوا۔ اس کی حالت خستہ لگ رہی تھی ''شکر ہے میں بروقت آ گیا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ کوفر شیف گیرٹ کا ساتھی نکلے گا۔''

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ گیرٹ اور کوفر شیف ہی اس سارے فساد کی جڑ تھے۔ انہوں نے ہی مچھلی اور میکین کو موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ اندر چلو اچھی لڑکی مجھے شدت سے کافی اور کھانے کی طلب ہو رہی ہے میں نے گزشتہ بارہ گھنٹے سے کچھ نہیں کھایا ہے۔'' پال مین نے کہا اور آگے بڑھ کر کوفر شیف والی شاٹ گن بھی اٹھالی۔ اسی لمحے جیسن نمودار ہوا اور کوفر شیف کی لاش دیکھ کر رک گیا ''اسے کس نے مارا ہے؟''

''میں نے.....'' پال مین بولا ''اگر میں اسے نہ مارتا تو یہ لونی کو قتل کرنے والا تھا لونی سے پوچھ لو۔''

جیسن نے لونی کی طرف دیکھا تو اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ جیسن الجھن سے بولا ''یہ سب کیا ہے۔ کوفر شیف لونی کو کیوں مارنا چاہتا تھا اور تم کیسے واپس آ گئے گیرٹ کہاں ہے؟''

''ان سارے سوالوں کا جواب میں کھانے کے بعد دوں گا۔ اندر چلو۔''

کچن والے خیمے میں آ کر لونی نے پال مین کے لیے انڈے ابالے اور اس دوران میں پال مین نے اپنی کہانی سنائی۔ وہ اور گیرٹ نکلے تھے لیکن ایک دن کے سفر کے بعد گیرٹ نے اسے مارنے کی کوشش کی ''اس نے مجھے پہاڑی سے نیچے دھکا دینا چاہا لیکن میں ہوشیار تھا۔ وہ خود نیچے جا گرا۔''

''تمہیں کیسے پتا چلا کہ وہی قاتل ہے؟'' لونی نے سوال کیا۔

''اس نے خود اعتراف کیا تھا۔ وہ اوپر سے گر کر زخمی ہوا تھا۔ آگے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس لیے میں نے اسے واپس لانے کی کوشش کی لیکن وہ راستے میں مر گیا۔''

لونی نے غور سے اسے دیکھا ''کیا تمہیں معلوم ہے گیرٹ اور کوفر شیف ہم لوگوں کو مارنے پر کیوں تل گئے تھے؟''

پال مین نے نفی میں سر ہلایا ''مجھے نہیں معلوم..... میں اب تک حیران ہوں۔''

''کیا تم نے میری اور کوفر شیف کی گفتگو نہیں سنی تھی؟''

''نہیں' میں نے اسے تمہاری طرف شاٹ گن اٹھاتے دیکھا تھا۔ اس لیے اسے شوٹ کر دیا۔''

''گویا تمہیں نہیں معلوم کہ تم جزیرے سے جو پتھر لائے تھے اس میں وافر تعداد میں پلاٹینیم کی قیمتی دھات موجود ہے۔'' لونی نے سرسراتے لہجے میں پوچھا۔

پال مین اچھل پڑا ''یہ بات مجھے معلوم ہی نہیں تھی۔''

''تم جھوٹے ہو۔'' لونی نے اچانک کہا ''مسلسل جھوٹ بول کر تم اپنے جرائم پر پردہ نہیں ڈال سکتے۔''

''تمہارا دماغ خراب ہے۔'' پال مین غرایا تھا۔

''یہ بتاؤ کہ تمہیں کس نے بتایا کہ میکین مر چکا ہے۔''

''میں نے تمہاری اور کوفر شیف کی گفتگو میں سنا تھا۔'' پال مین بوکھلا کر بولا۔

''ابھی چند لمحے پہلے تم کہہ رہے تھے کہ تم نے میری اور کوفر شیف کی گفتگو نہیں سنی ہے۔''

پال مین نے خون خوار نظروں سے لونی کی طرف دیکھا اور ان دونوں پر شاٹ گن تان لی ''میں نے تو سوچا تھا کہ تمہیں زندہ واپس لے جاؤں گا لیکن لڑکی تمہاری ضرورت سے زیادہ چالاکی نے تمہیں مروا دیا ہے۔''

جیسن نے جواب تک خاموش تماشائی بنا دیکھ رہا تھا بول اٹھا ''خدا کے لیے مجھے بھی بتاؤ یہ کیا معاملہ ہے۔''

''معاملہ تو مجھے بھی نہیں معلوم..... لیکن مچھلی' میکین' گیرٹ اور اب کوفر شیف کے قتل کا ذمے دار پال مین ہے اس نے لالچ میں آ کر اپنے پارٹنر کو بھی مار دیا ہے۔''

''لیکن کوئی مجھ پر یہ الزام ثابت نہیں کر سکے گا۔ تم دونوں کے مارے جانے کا بھی۔'' پال مین نے سرد لہجے میں کہا۔

''تت..... تم ہمیں بھی مار دو گے؟'' جیسن نے بوکھلا کر پوچھا۔

''ہاں اور اس کے بعد یہ کان صرف میری ملکیت ہوگی۔ میں خود اس سے قیمتی دھات نکالوں گا۔ اور کروڑ پتی بن جاؤں گا۔''

''یہ تمہاری بھول ہے ہمارے خون کا حساب تم سے ضرور لیا جائے گا۔'' لونی نفرت سے بولی۔

''بکو مت..... اور باہر چلو۔'' پال مین نے گرج کر کہا ''یاد رکھنا میں گولی مارنے سے ذرا نہیں ہچکچاؤں گا۔''

پال مین کے لہجے میں دھمکی محسوس کر کے وہ بادل نخواستہ خیمے سے باہر آئے ''تمہارا کیا ارادہ ہے پال مین؟'' جیسن نے پوچھا ''کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم ہمیں قتل نہ کرو۔''

اس نے انکار کیا ''میں اپنے خلاف گواہ چھوڑنے کی حماقت نہیں کر سکتا۔ ویسے فکر نہ کرو تم دونوں کو مرتے وقت زیادہ تکلیف نہیں ہوگی۔ سرد پانی ایک منٹ سے بھی پہلے تمہاری جان لے لے گا۔''

لونی اور جیسن لرز گئے ''پلیز نہیں.....'' جیسن کراہا۔

''شور مت کرو۔ چلو..... ذرا آگے دراڑ ہے۔ شاباش چلتے جاؤ۔'' پال مین نے پچکار کر کہا ''رکنا مت ورنہ گولی مار دوں گا۔''

''میرا خیال ہے تم ہمیں گولی مار دو۔'' جیسن نے رک کر کہا ''میں یہ اذیت ناک موت قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔''

''میرے لیے گولی مار کر لاش دراڑ میں پھینکنا بھی مشکل نہیں ہے۔'' پال مین نے شاٹ گن سیدھی کی۔ لونی بے اختیار جیسن کے سامنے آ گئی تھی۔

''پہلے مجھے گولی مارو۔''

پال مین ہنسا ''اچھا جولیٹ.....''

جیسن لونی کو اپنے سامنے سے ہٹانے کی کوشش کر رہا تھا کہ شاٹ گن گرجی۔ لونی چیخ مار کر جیسن سے لپٹ گئی اور وہ بوکھلا کر اس کا جسم ٹٹولنے لگا تھا مگر وہ صحیح سلامت تھی گولی اسے نہیں لگی تھی۔ جیسن نے پال مین کی طرف دیکھا وہ ساکت کھڑا نہیں گھور رہا تھا پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ منہ کے بل گر کر ساکت ہوگیا۔ اس کی پشت میں ویسا ہی سوراخ تھا جیسا کہ لونی نے کچھ دیر پہلے کوفر شیف کی پشت میں دیکھا تھا۔ پال مین مر چکا تھا کیونکہ اس کی پشت کے خلا سے ساکت اور بے حرکت دل صاف نظر آ رہا تھا۔ لونی نے دیکھا ذرا فاصلے پر برفانی تودے سے ٹکا کوفر شیف کھڑا تھا۔ وہ زندہ تھا نہ جانے کیسے۔ وہ آیا اس نے خیموں سے دوسری شاٹ گن نکالی اور پال مین کو شوٹ کر دیا۔ وہ بھی لڑکھڑا کر گر پڑا۔ لونی اور جیسن اس کی طرف دوڑے۔ جیسن نے اس کا زخم دیکھا جو بے حد سنگین تھا۔ نہ جانے کتنی قوت ارادی استعمال کر کے وہ یہاں آیا تھا اور اس وقت آخری دموں پر تھا۔

''سوری لونی' لٹل گرل.....'' اس نے سرگوشی میں کہا ''میں نے تمہیں مارنا چاہا لیکن خدا کو تمہیں زندہ رکھنا تھا۔ وقت میرا اور پال کا آیا ہے۔''

''پلیز۔'' لونی رونے لگی۔

''جیسن غور سے سنو۔ میری جیب میں اس جگہ کا مکمل نقشہ ہے۔'' کوفر شیف نے کہا ''اس میں پلاٹینیم کی اس کان کا نقشہ اور حوالہ ہے۔ تم لوگ اس کے چکر میں مت پڑنا۔ اسے کسی کے ہاتھ فروخت کر دینا' کیونکہ یہ لالچ ہی ہے جو آدمی کو مرواتا ہے۔''

''اسے اندر لے چلو۔'' لونی نے جیسن سے کہا۔

''نہیں' مجھے مرنے دو۔ ہاں ہماری لاشیں چھپا دینا۔ اس کہانی کو بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے کسی حادثے کی کہانی سنا دینا۔ پہلے کان کے حقوق حاصل کرنا پھر اسے فروخت کرنا۔'' کوفر شیف نے کہتے کہتے آنکھیں بند کر لیں۔ وہ مر چکا تھا۔ لونی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اگلی صبح تک جیسن اور اس نے وہاں پائے جانے والے تمام نشانات مٹا دیے۔ لاشیں ایک گڑھے میں ڈال دیں۔ اضافی سامان گاڑیوں میں ڈال کر انہیں ایک محفوظ جگہ رکھ دیا تاکہ بعد میں کوئی مہم جو اس طرف آئے تو اس سامان کو استعمال کر سکے بعد میں وہ کتے لا کر اس سامان کو لے جا کر فروخت بھی کر سکتے تھے۔ اس سے خاصی رقم مل جاتی لیکن لونی نے صاف کہہ دیا کہ وہ نہ تو خود اس طرف آئے گی اور نہ جیسن کو آنے دے گی۔

''ہمارے پاس یہ نقشہ ہے۔ مجھے یقین ہے کان کے حقوق فروخت کرنے سے خاصی رقم مل جائے گی اور نہ بھی ملے تب بھی ہم محنت کر کے اپنی زندگی سنوار سکتے ہیں۔''

''گویا ہم یہ سب یہاں چھوڑ جائیں گے۔'' جیسن نے گاڑیوں اور اس میں حد سے قیمتی سامان کو دیکھا۔

''ہم لے کر کیوں نہیں جا رہے۔'' لونی نے اس کی آنکھوں میں دیکھا ''ہم یہاں سے محبت لے کر جا رہے ہیں۔''

جیسن مسکرا دیا اور دونوں ہیکنر پر پھسلتے اپنے خوب صورت مستقبل کی طرف روانہ ہوگئے۔ جہاں لالچ کے بجائے محبت ان کی منتظر تھی۔

ہر لمحہ سنسنی اور ہر سطر تحیر کے ساتھ بے پناہ سسپنس کا حامل ایک یادگار سلسلہ

دسویں قسط

دیوی

ظاہر جاوید مغل

وہ نزاکت و لطافت کا پیکر تھی۔ خوب صورت اور چھوئی موئی سی دلکش دوشیزہ، اپنی دنیا میں مگن پھر اچانک حالات کا جبر اسے ایک ایسے زنداں میں لے گیا جہاں کی نادیدہ دیواریں آسمان تک بلند تھیں۔ اس قفس میں نہ صرف اس کا نازک سراپا وحشتوں تلے کچلا گیا بلکہ اس کی روح تک کو جھلسنے کرنے کے اسباب مہیا کئے گئے۔ شاید اسے قید کرنے والے اس طرح سے اس کا امتحان لے رہے تھے اور وہ ہر امتحان اور ہر آزمائش پر پوری اترتی رہی لیکن یہ سرخ روئی اس کے حق میں ستم پر ستم لانے کا سبب بنتی رہی۔ اس کے باوجود اس کا صبر، ایثار اور استقامت ناقابل شکست ٹھہرا۔ اس نے ہر ظلم مسکرا کر سہا اور ہر نئے ستم پر سر تسلیم خم کئے رکھا۔ ایک مجبور مگر پرعزم اور حوصلہ مند دوشیزہ کی انوکھی داستان جس میں زمانے کی نیرنگیوں کے ساتھ قسمت کی کار فرمائیاں بھی اپنے اوج پر نظر آتی ہیں۔

ظلم و ستم اور جبر کی بھٹی میں کندن ہو جانے والی ایک معصوم دوشیزہ کا ماجرائے روح شکن

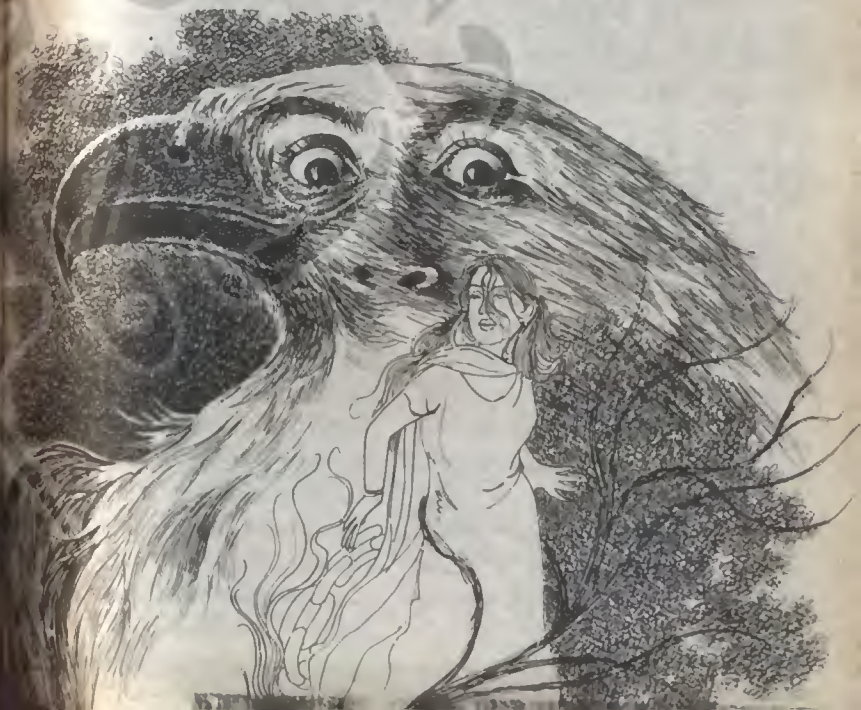

اس نے ساتھ والے کمرے میں پہنچ کر دیکھا، صفیہ کی حالت دلدوز انداز میں چلا رہی تھی اور صفیہ کو کندھوں سے پکڑ کر جھنجوڑ رہی تھی۔ صفیہ کی حالت ٹھیک نظر نہیں آ رہی تھی۔ وہ بالکل زرد ہو رہی تھی اور کھینچ کے سانس لے رہی تھی۔ اسی اثنا میں قدرت اللہ کی مریدنی فضیلت، دو نوکرانیوں کے ساتھ تیزی سے اندر داخل ہوئی۔ اس نے صفیہ کی والدہ کو کھینچ کر کمرے سے نکال لیا اور اسے نوکرانیوں کے سپرد کرنے کے بعد خود صفیہ کی حالت سنبھالنے میں لگ گئی۔ اس نے ایک خاص پیالے میں سے پانی لے کر صفیہ کے چہرے پر چھینٹے دیئے پھر ایک کالے کپڑے سے اس کی ہتھیلیوں کی مالش کرنے لگی۔ کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر لیا گیا تھا۔

ایک نوکرانی نے صفیہ کی والدہ کو تسلی دیتے ہوئے کہا ''حوصلہ کرماسی کچھ نہیں ہوگا۔ پہلے بھی تو دو تین بار دورہ پڑا ہے صفو کو..... اللہ سے خیر مانگ..... وہ ابھی ٹھیک ہو جائے

گی۔"

"ہائے میرے دھی کو کچھ ہوگیا تو میں کیا کروں گی۔ یا اللہ میری صفیہ کو کچھ نہ ہو۔ اس کے بدلے تو میری جان لے لے" ادھیڑ عمر عورت نے روتے اور ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

پھر ا . نے کہیں سے ایک جائے نماز ڈھونڈی اور اسے بچھا کر سجدے میں گر پڑی۔ دو تین منٹ بعد مریدنی فضیلت نے دروازہ کھول کر باہر جھانکا اور گھبرائے ہوئے انداز میں نوکرانی بلقیس کو بھی اندر بلالیا۔ بند دروازے کے پیچھے کیا ہو رہا تھا۔ کچھ پتا نہیں تھا۔ فضا میں ایک سنسنی سی تھی۔ کئی ملازمائیں برآمدے میں اور صحن میں دم بخود کھڑی تھیں۔ کچھ ڈری ڈری سرگوشیاں کررہی تھیں۔ اسی اثنا میں نوکرانی بلقیس اڑی اڑی رنگت کے ساتھ کمرے سے نکلی اور حویلی کے دوسرے حصے کی طرف بڑھی۔ شاید وہ کسی کو بلانے گئی تھی۔ صفیہ کی والدہ نے ایک بار پھر کمرے میں جانا چاہا مگر مریدنی فضیلت نے دروازہ اندر سے بند کر رکھا تھا۔ ادھیڑ عمر عورت کے رونے کے باوجود اس نے دروازہ نہیں کھولا۔ چند منٹ بعد قدرت اللہ کا باریش مرید بہت تیز قدموں کے ساتھ کمرے کی طرف آتا دکھائی دیا۔ بلقیس اسی کے ساتھ کبھی بھاگتی اور کبھی چلتی ہوئی آرہی تھی۔ مرید کے آواز دینے پر فضیلت نے اندر سے دروازہ کھولا اور اسے اندر لے گئی۔ مرید زیادہ دیر وہاں نہیں رہا۔ ایک دو منٹ میں ہی باہر نکل آیا۔ اس کا چہرہ لٹکا ہوا تھا۔ ادھیڑ عمر عورت اور شانی تیزی سے اندر داخل ہوئیں..... صفیہ فوت ہوچکی تھی۔ اس کا لوتھڑ سے چہرہ کپڑے کی طرح سفید تھا۔ آنکھیں ادھ کھلی تھیں۔ یہ خوبصورت آنکھیں جیسے اس پہیلی پر غور کرتے کرتے بے نور ہوگئی تھیں کہ آغازِ شباب کے ان پہلے پہلے دنوں میں اس سے کیا قصور ہوگیا تھا کہ اسے موت کی سزا دے دی گئی تھی۔ ابھی تو اس کے ہاتھوں پر مہندی نہیں رچی تھی۔ ابھی تو اس کی سکھیوں نے سہاگ کے گیت نہیں گئے تھے۔ ابھی تو اس نے کچھ دیکھا ہی نہیں تھا زندگی میں۔

صفیہ کی والدہ بچھاڑیں کھا کھا کر گرنے لگی۔ دوسری عورتیں اسے سنبھالنے کی کوشش کرنے لگیں۔ حویلی کے اس حصے میں کہرام سا مچ گیا۔ شانی کی آنکھوں سے بھی آنسوؤں کے دھارے بہہ نکلے۔ اسے بھابو کی موت یاد آگئی تھی۔ دکھیاری ماری چودہ سالہ بیٹی کے رخسار چومتی چلی گئی۔ وہ اس کے ہاتھوں اور پاؤں پر بوسے دینے لگی۔ اس سے لپٹنے اور جھنجوڑنے لگی۔

عورتیں اس روتی پیٹتی عورت کو کھینچ تان کر باہر لے گئیں۔ وہ دیر تک دھاڑیں مار مار کر روتی رہی، پھر وہ واویلا کرنے لگی "ہائے حضرت جی! تم کہاں گئے ہو۔ تم تو کہتے تھے اگلی جمعرات کو وہ اپنے پاؤں پر چل کر اپنے پنڈ جائے گی..... دیکھو حضرت جی..... دیکھو وہ اپنے پاؤں پر چل کر نہیں جارہی، وہ دوسروں کے کندھوں پر جارہی ہے۔ اب کہاں چلے گئے ہو تم۔ اب میری سنتے کیوں نہیں ہو؟"

ایک عورت نے سختی سے صفیہ کی ماں کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ "نہ بر کتے ایسی باتیں نہ کر۔ ایسی باتوں کا وبال پڑتا ہے۔ جو اللہ کی مرضی تھی وہ ہوگیا۔ اللہ کے کاموں میں کسی کو دخل نہیں ہوتا۔"

وہ مسلسل آہ و بکا کرتی رہی۔ عورتیں اسے تسلی دینے کی ناکام کوشش میں مصروف رہیں۔ شانی کے سینے میں انگارے سے دہک رہے تھے۔ وہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ سب کچھ سمجھ رہی تھی۔ یہاں وہی کچھ ہوتا تھا جو شاید پرانے زمانے کے ظالم و جابر حکمرانوں کے درباروں میں ہوتا تھا۔ یہ لوگ مخلوقِ خدا کو بدترین اذیتوں سے گزارتے تھے اور رونے بھی نہیں دیتے تھے۔

ڈیڑھ دو گھنٹے بعد حویلی سے باہر شور و غل سنائی دیا۔ بہت سے لوگ ایک ساتھ بول رہے تھے۔ ان میں سے ایک آواز زیادہ بلند اور تلخ تھی۔ یہ کوئی جواں سال شخص تھا جو ہر شتم لے کارندوں سے تند لہجے میں بات کررہا تھا۔ "اتنے بے رحم نہ بنو۔ تم نے بھی خدا کو جان دینی ہے۔ تم نے بھی ایک دن قبر میں اترنا ہے....." اڑتے اڑتے سے جملے شانی کے کانوں میں پڑے۔

پھر شور و غل تیز ہوگیا۔ کئی افراد نے نعرہ زنی جیسا انداز اختیار کرلیا۔ یوں لگا جیسے ایک چھوٹا سا جلوس ہے۔ جو کسی مسئلے پر ایوانِ اقتدار کے سامنے سراپا احتجاج بنا ہوا ہے۔ تاہم یہ سلسلہ زیادہ دیر جاری نہیں رہ سکا۔ کچھ کرختی برستی آوازیں آئیں اور شور و غل کی صدا بلند ہوتے ہوتے معدوم ہوگئی۔ بس ایک وہی جواں سال شخص تھا جو اب بھی گاہے بگاہے نہایت تلخ آواز میں بولتا تھا۔

پندرہ بیس منٹ بعد شانی کی "ساتھی ملازمہ حمیدہ" باہر سے آئی۔ شانی نے اس سے پوچھا "باہر کیسا شور تھا حمیدہ؟"

وہ آزردہ لہجے میں بولی "صفو کے رشتے دار تھے۔ اس کی میت اپنے گاؤں شامیوال لے جانا چاہتے تھے۔ وڈے مالک جی (تاؤ حشام) نے منع کردیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ صفو

کو یہیں پر دفنایا جائے گا۔"

"ایک بندہ بڑی اونچی آواز میں بول رہا تھا۔ وہ کون تھا؟"

"اس وچاری کا چاچا ہے۔ رو رو کر اس کا برا حال ہے۔ اس کو بڑی مشکل سے لے کر گئے ہیں چوہدری صاحب کے بندے۔"

"صفو کے یہ رشتے دار آئے کہاں سے ہیں؟" شانی نے پوچھا۔

"یہ کیوہ برادری ہے۔ اس برادری کے بہت سے لوگ یہاں آس پاس ہی ایک گاؤں شامیوال میں رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ آس پاس کے پنڈوں میں بھی یہ لوگ موجود ہیں۔"

"تاؤ حشام میت کو یہاں سے بھیج کیوں نہیں رہا؟"

حمیدہ نے ڈرے ہوئے انداز میں دائیں بائیں دیکھا اور سرگوشی کے لہجے میں بولی "شاید چوہدریوں کو ڈر ہے کہ شور شرابا شروع نہ ہوجائے۔ پچھلی سردیوں میں کبوہوں کی ایک عورت پھوٹے مالک کی جیپ کے نیچے آکر مرگئی تھی۔ یہ لوگ اس کی لاش اٹھا کر گوجرانوالہ لے گئے تھے اور سڑک بند کردی تھی۔ شاید وڈے مالک کو ڈر ہے کہ اب بھی کوئی ایسا ہی مسئلہ نہ ہوجائے۔"

چھوٹے مالک کا خطاب یہاں اسی پندرہ سولہ سالہ لڑکے کے لیے استعمال ہوتا تھا جو یہاں "راجا اندر" بن کر رہ رہا تھا۔ ایک سال پہلے وہ یقیناً اور بھی کم عمر ہوگا۔ وہ چرس کے نشے میں بھی رہتا تھا۔ غالباً اسی نشے میں ڈرائیو کرتے ہوئے اس نے کسی عورت کو کچلا تھا۔ شانی نے پوچھا "پھر کیا بنا اس عورت کے مرنے کا؟"

"بنا کیا تھا جی، مالکوں کے ہتھ بڑے لمبے ہیں۔ الٹا بندے کے دینے پڑ گئے۔ جن لوگوں نے جلوس نکالا تھا ان میں سے چار پانچ کو پکڑ کر لی گئی۔ بعد میں ان کے گھر والے چوری چوری آکر وڈے مالک کے سامنے ہتھ پاؤں جوڑتے رہے۔" حمیدہ نے ذرا توقف کیا اور بولی "اب بھی یہ لوگ منتیں کررہے ہیں۔ جو کچھ ہونا تھا وہ تو ہوگیا۔ اگر چپ رہیں گے تو وڈے مالک سے کچھ رقم شقم مل جائے گی۔ اگر شور کریں گے تو الٹا مشکل میں پھنسیں گے۔ پرانی تکلیف بھول جائے گی، نئی تکلیفیں شروع ہوجائیں گی۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ وڈا مالک اور اس کا پتر جو چاہے کرتے رہیں۔ کوئی ان کے خلاف آواز نہ نکالے۔"

حمیدہ بولی "وڈا مالک اکیلا نہیں ہے۔ پلس کا وڈا

"اب یہ ریڈی ایٹر اور کاربوریٹر جیسے موٹے موٹے الفاظ استعمال کرکے مجھے مرعوب کرنے اور بے وقوف بنانے کی کوشش مت کرو، مجھے پتا ہے اس گاڑی کی صرف پکچر ٹیوب خراب ہے۔"

تھانیدار اس کے ساتھ ہے اور حضرت صاحب اس کے ساتھ ہیں، وڈے تھانیدار کی دشمنی تو شاید کوئی مول لے بھی لے مگر حضرت صاحب کی دشمنی کون مول لے سکتا ہے۔" حمیدہ نے خوفزدہ انداز میں کانوں کو ہاتھ لگائے۔ "میں نے ان لوگوں کو دیکھا ہے جن سے حضرت صاحب ناراض ہوجاتے ہیں۔ اللہ ماف کرے..... اللہ ماف کرے۔ کسی ویری دشمنی کو بھی ایسی سزا نہ ملے۔" حمیدہ کے چہرے پر خوف کے تاریک سائے تھے۔

"سزا سے تمہارا کیا مطلب ہے؟" شانی نے پوچھا۔

"سزا تو سزا ہی ہوتی ہے جی..... اور سب کو پتا ہے کہ حضرت صاحب کے پاس جنات اور دوسری ہوائی چیزیں ہیں۔ وہ بہت کچھ کرسکتے ہیں۔ اور ہم نے اپنی آنکھوں سے ہوتے ہوئے دیکھا بھی ہے۔ باقی باتیں تو چھوڑیں جی۔ ابھی کچھ دن پہلے کچھ لوگوں نے حضرت صاحب کے ساتھ بدتمیزی کی تھی..... وہ سارے اب بھگت رہے ہیں۔ وہ جو موٹی عورت جالاں یہاں حویلی میں آئی تھی وہ بھی ان لوگوں میں شامل تھی۔ شاید آپ نے بھی دیکھا ہو، اس کے سارے پنڈے پر ساڑ نکل آیا تھا۔ ساری کی ساری سوج گئی تھی۔ رات دن روتی کرلاتی تھی اور اپنی گلتیوں کی مافی مانگتی تھی۔ پتا نہیں کہ بچی بھی ہے کہ نہیں۔ دس پندرہ دن پہلے مالکوں نے اسے شہر بھجوا دیا تھا۔"

شانی کے لیے یہ نئی اطلاع تھی کہ جالاں کی تکلیف بہت بڑھ گئی تھی..... اور اب وہ شہر میں ہے۔ اگر جالاں کی تکلیف بڑھ گئی تھی تو پھر یہ سوچا جاسکتا تھا کہ چوہدری بشیر بھی بری

حالت میں ہو۔ وہ تو جالاں سے پہلے بیمار ہوا تھا۔ اب حمیدہ بتا رہی تھی کہ کچھ اور لوگ بھی اس تکلیف کا شکار ہوئے ہیں۔ اس بارے میں شانی نے حمیدہ سے پوچھا تو وہ بولی ''وڈے مالک کا ایک بھتیجا چوہدری بشیر لاہور میں رہتا ہے۔ وہاں اس کا کپڑے کا کارخانہ ہے۔ اس پر کوئی جھگڑا شکوا ہوا تھا۔ سنا ہے کہ چوہدری بشیر نے حضرت صاحب کے گریبان پر ہاتھ ڈال دیا تھا۔ چوہدری بشیر کے بندوں نے حضرت صاحب کے مریدوں کو دھکے دیے تھے۔ جن جن لوگوں نے یہ کام کیا وہ سب کے سب سزا بھگت رہے ہیں۔ ان میں وڈے مالک کا بھتیجا چوہدری بشیر بھی ہے۔ سنا ہے کہ اس کی حالت جالاں سے بھی زیادہ خراب تھی۔''

شانی حیرانی کے عالم میں یہ سب کچھ سن رہی تھی۔ شاید حمیدہ اس بارے میں مزید بھی کچھ بتاتی مگر اسی اثنا میں کچھ دیہاتی عورتیں روتی پیٹتی اندر آ گئیں۔ یہ بدنصیب صفیہ کی رشتے دار تھیں۔ چوہدریوں نے ان پر ''احسان'' کرتے ہوئے انہیں مرنے والی کا منہ دیکھنے کی سہولت فراہم کی تھی۔ بہرحال کسی مرد کو اندر آنے کی اجازت نہیں دی گئی تھی۔ ان بیس پچیس عورتوں کے اندر آتے ہی حویلی کا منظر مزید سوگوار ہو گیا۔

اس رات آخری پہر نوعمر صفیہ کو خاموشی کے ساتھ گاؤں کے قبرستان میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔ فضا میں سراسیمگی، خوف اور نادیدہ جبر کی لہر تھی۔ ایک ہنستی کھلکھلاتی خوش رو لڑکی منوں ٹی کے نیچے جا کر سو گئی تھی..... چوہدریوں کا بس چلتا تو شاید اس کی قبر بھی نہ بناتے۔ اس کے ٹکڑے کر کے دریا میں بہا دیتے یا کہیں جلا کر راکھ کر دیتے۔

تین چار روز تک سوگواری کی کیفیت موجود رہی۔ نوکرانیوں کا آپس کا ہنسی مذاق منقطع رہا۔ چھوٹا مالک اور اس کی رنگ برنگی کھیل بھی کہیں دکھائی نہیں دیے۔ حویلی کے کسی نامعلوم کمرے سے رات کے وقت صفیہ کی ماں کے رونے کی باریک آواز آتی رہی..... پھر بتدریج یہ سب کچھ بدل گیا۔ صفیہ اور اس کی ماں والے کمرے کو دھو کر اچھی طرح صاف کیا گیا۔ نئی چادریں بچھائی گئیں۔ نئے تکیے رکھے گئے۔ صفیہ کی ذاتی چیزیں ایک نیلے میز پوش پر ڈھیر کی گئیں۔ خوشبو والا تیل، دو کنگھیاں، کانچ کی چوڑیاں، کسی میلے ٹھیلے سے خریدے جانے والے رنگین پراندے اور سستے سے جھمکے، ایک سرمے دانی، ایک بوسیدہ سا بٹوا جس میں چند روپے کی ریزگاری تھی۔ یہ سب کچھ میز پوش میں لپیٹ کر اس کی ماں تک پہنچا دیا گیا۔ ایک کہانی ختم ہو گئی۔ کوئی نئی کہانی شروع کرنے کے لیے وہ نیم پختہ کمرا کسی نئے مکین کا منتظر ہو گیا۔ لیکن کیا کہانیاں واقعی ایسے ختم ہو جاتی ہیں؟

ظلم واقعی اسی طرح چھپ جاتا ہے؟ صفیہ مر جاتی ہے لیکن مارنے والوں کے ہاتھوں پر اس کا خون تو چمکتا رہتا ہے۔ یہ خون دستانوں کے اندر سے بھی اپنی جھلک دکھاتا رہتا ہے۔ اور یہ خون صرف قاتلوں کے ہاتھوں پر ہی نہیں جمتا، پورے معاشرے کے ہاتھوں پر جمتا ہے اور یہ اپنی جگہ موجود رہتا ہے..... انصاف طلب کرتا ہے۔

ہاں چند دن بعد بتدریج سب کچھ معمول پر آ گیا۔ رنگیلے شہزادے کی جھلک پھر نظر آنے لگی۔ جواں سال نوکرانیاں (جو دراصل رکھیلیں ہی تھیں) اپنے مستقبل کو بھول کر پھر چہلیں کرنے لگیں۔ ان کی گناہ آلودہ سرگوشیاں پھر فضا میں تیرنے لگیں۔ بیوی نما رکھیل تمام کے کمرے میں ٹی وی اور وی سی آر چلنے لگا۔ اس چار دیواری میں شانی کی حیثیت ایک کم ترین ملازمہ کی تھی۔ کالی دھوتی اور سفید قمیص میں وہ روزانہ تقریباً سولہ گھنٹے کام کر رہی تھی..... ڈھور ڈنگر اور چار عدد گھوڑوں کی ساری دیکھ بھال شانی اور حمیدہ کے سپرد تھی۔

انہیں گوبر تک اٹھانا پڑتا تھا اور پھر اپلے تک تھاپنے پڑتے تھے۔ باسی روٹی کے ٹکڑوں اور چھان بورے وغیرہ کو رات ہی پانی میں بھگو دیا جاتا تھا۔ صبح سویرے اس میں گل بنولہ اور بھوسا وغیرہ ملا کر بھینسوں کے لیے گتاوا تیار کیا جاتا تھا۔ اسی طرح گھوڑوں کے آگے چارا دانہ ڈالا جاتا تھا۔ سردی میں جانوروں کو نہلانا اور ان کے چھپروں کے نیچے سے صفائی کرنا دشوار ترین کام تھے۔ گوبر سنبھالنے اور اپلے تھاپنے کے لیے دوپہر کا وقت مقرر تھا۔ سہ پہر کے فوراً بعد ایک بار پھر گتاوے اور راتب کی تیاری شروع ہو جاتی تھی۔ عموماً کٹا ہوا چارا باہر سے آ جاتا تھا لیکن کبھی کبھی حمیدہ اور شانی کو خود بھی دستی ٹوکے پر چارا کترنا پڑتا تھا۔ ایسے پُرمشقت کاموں کے دوران میں ڈشکری چھیدو ان کے آس پاس موجود رہتی تھی اور سستی کی صورت میں بلالحاظ گندی گالیاں دینے لگتی تھی۔ خاص طور سے شانی کے ساتھ اس کا رویہ زیادہ سخت تھا۔ وہ شانی کو کسی وقت طنزیہ انداز میں رجیہ سلطانہ کہہ کر بھی پکارتی تھی۔ اس خطاب کا تعلق یقیناً اس بارکٹائی سے تھا جو چند دن قبل شانی اور حضرت صاحب کی بیبیوں کے درمیان ہوئی تھی۔ شانی کے اندازے کے مطابق اس حویلی میں چند ہی لوگوں کو معلوم تھا کہ شانی نارپور کی چھوٹی چوہدرانی ہے۔ جن لوگوں کو معلوم تھا انہیں تاؤ حشام وغیرہ نے غالباً زبان بند رکھنے کی ہدایت کی ہوئی تھی۔ شانی کو ڈولے کے بارے میں

بھی تک کچھ معلوم نہیں ہوا تھا کہ وہ کہاں ہے۔

ایک دن دودھ والے برتن راکھ سے اچھی طرح مانجھنے کے بعد شانی اور حمیدہ ذرا ستانے کے لیے چارپائی پر بیٹھی تھیں کہ چھیدو کی صورت نظر آ گئی۔ وہ دونوں پھر سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ آج انہیں تین چار گھنٹے ہرا چارا بھی کترنا تھا۔ پہلے شانی ''مٹھے'' دیتی رہی اور حمیدہ ٹوکا چلاتی رہی۔ پھر ٹوکا چلانے کی باری شانی کی آ گئی۔ یہ بڑا مشقت والا کام تھا۔ سردی کے باوجود تھوڑی ہی دیر میں شانی اور حمیدہ پسینے سے تر ہو گئیں۔ اس وقت شانی دستی ٹوکے کو گھما رہی تھی جب بیک اس کی نگاہ سیڑھیوں کی طرف اٹھ گئی۔ چوبارے کو جانے والی کچی سیڑھیوں کے بالائی سرے پر پندرہ سولہ سالہ موٹا مالک کھڑا تھا۔ اس کی آنکھیں حسبِ معمول سرخ تھیں۔ چہرہ کھچا ہوا اور رخساروں کی ہڈیاں نمایاں تھیں۔ اس نے اپنا موٹی لباس یعنی چمکیلا دھوتی کرتہ پہن رکھا تھا۔ پاؤں میں تلے دار کھسہ، گلے میں سونے کا کنٹھا تھا۔ اس کی مسیں بھیگ چکی تھیں، ٹھوڑی اور کلوں کی نچلی جانب سیاہی مائل بال نظر آتے تھے۔ شانی نے اسے دھیان سے دیکھا تو وہ گڑبڑا کر اندر چلا گیا۔ مشقت کے سبب شانی کی پتلی قمیص بھیگ کر اس کے جسم سے چپک رہی تھی، سر بھی ننگا تھا۔ اس نے بے ساختہ دوپٹہ درست کرنے کے لیے اپنا ہاتھ بڑھایا۔ لیکن دوپٹہ وہاں کہاں تھا؟ چھوٹے مالک کے اس عشرت کدے میں نوکرانیوں کو جو ''یونیفارم'' دی جاتی تھی اس میں دوپٹہ ناپید تھا۔ یعنی سرے سے وہ لباس ہی ختم کر دیا گیا تھا جو رنگیلے شہزادے کی نگاہوں اور جواں سال ''لونڈیوں'' کے جسموں کے درمیان رکاوٹ بن سکتا تھا۔ شانی نے اپنی بھیگی ہوئی قمیص جسم کے مختلف حصوں سے جدا کی اور ایک بار پھر ٹوکے کی دستی گھمانے میں مصروف ہو گئی۔ تاہم اس مرتبہ اس کے کام میں پہلے جیسا انہماک نہیں تھا۔ دورانِ مشقت اپنا ڈولتا ہوا جسم اسے بری طرح محسوس ہو رہا تھا۔

چارا کترنے کے بعد وہ دونوں ستانے کے لیے بیٹھ گئیں۔ اس مرتبہ چھیدو نے ذرا مہربانی کا ثبوت دیتے ہوئے انہیں آرام کرنے دیا۔

سورج ڈھلنا شروع ہو گیا تھا، سائے لمبے ہو رہے تھے۔ بیرونی دیوار پر شراب کی ٹوٹی ہوئی بوتلوں کے ہزاروں رنگ برنگے ٹکڑے درجنوں طرح کی شعاعیں منعکس کر رہے تھے۔

بڑے دروازے سے باہر کسی پہریدار نے خودکار رائفل داغنی شروع کر دی۔ تڑتڑ کی ہولناک آواز نے قرب و جوار کو لرزا

''سر! آپ کو اس میٹرس پر چلتے ہوئے کافی دیر ہو گئی ہے، میرا خیال ہے اب تو آپ اسے خرید ہی لیں گے؟''

دیا۔ پرندے شاخوں سے پرواز کر گئے۔ یہ ہوائی برسٹ تھا۔ اس طرح کے برسٹ دن میں دو چار بار ضرور چلائے جاتے تھے۔ غالباً اس طرح اپنے نادیدہ دشمنوں کو خبردار کیا جاتا تھا کہ وہ کسی طرح کی مہم جوئی کی حماقت نہ کریں۔ اس حویلی کے نمک خوار پوری طرح چوکس اور مسلح ہیں۔ اس کے علاوہ یہ ہوائی فائرنگ آس پاس کی رعایا (اہلِ دیہہ) کو بھی مرعوب رکھتی تھی اور انہیں وقتاً فوقتاً یاد دلاتی رہتی تھی کہ حویلی مضبوط اور طاقتور ہے۔

اپلے تھاپنے کے لیے بہت تھوڑا وقت بچا تھا۔ شانی اور حمیدہ ذرا کمر سیدھی کرنے کے بعد اٹھ کھڑی ہوئیں۔ تازہ اور باسی گوبر کا ڈھیر موجود تھا۔ اس گوبر کو خشک گوبر کے چورے اور بھوسے کے ساتھ ملا کر گول گول تھاپا جاتا تھا اور پھر سوکھنے کے لیے زمین یا دیواروں پر چسپاں کر دیا جاتا تھا۔ پہلے دنوں کے اپلے جو نیچے سے گیلے ہوتے تھے، انہیں اکھاڑ کر جوڑے کی صورت میں جھونپڑی کی طرح زمین پر کھڑا کر دیا جاتا تھا تاکہ وہ دوسری طرف سے بھی سوکھ جائیں۔ حمیدہ نیم خشک اپلوں کو جھونپڑی کی صورت کھڑا کرنے لگی۔ شانی نے قمیص کی آستینیں اڑسیں اور حسبِ معمول دل پر جبر کرتی ہوئی گوبر کے ڈھیر کے پاس آ بیٹھی..... فائرنگ کے بعد پرندے پھر آ آ کر درختوں کی شاخوں پر بیٹھنے لگے تھے۔ ایک مرغا اور مرغی آگے پیچھے بھاگتے ایک بچھڑے کے پاؤں کے درمیان سے گزر گئے۔ بچھڑا اچھلا اور گوبر آلود پانی کے چھینٹے بلقیس کے چہرے پر پڑے۔ وہ بچھڑے پر اور اس کے پیدا کرنے والوں پر لعن طعن کرنے لگی۔ شانی نے ابھی گوبر

میں ہاتھ ڈالا ہی تھا کہ چھیدو دندناتی ہوئی وہاں پہنچ گئی.....

''نی رجیہ سلطانہ آج تو نے گوئے (اپلے) نہیں تھاپنے'' چھیدو نے حکم صادر کیا۔

''پھر کیا کرنا ہے؟'' شانی نے پوچھا۔

''آج تو نے چتکبرے گھوڑے کو کھر کھرا کرنا ہے'' چھیدو کے بجائے بلقیس نے کہا۔ لہجہ طنزیہ تھا۔

شانی گھبرا گئی۔ اسے پہلے ہی ڈر تھا کہ کہیں چھیدو اسے کسی گھوڑے کو کھریرا کرنے کا نہ کہہ دے۔ اس نے اپنی حویلی میں ملازموں کو درجنوں دفعہ گھوڑوں کا کھریرا کرتے دیکھا تھا۔ آہنی کنگھے سے گھوڑے کے فالتو بال اور گرد وغیرہ صاف کی جاتی ہے۔ وہ کھریرا کرتو سکتی تھی لیکن اسے گھوڑے کی دوستی سے بہت زیادہ ڈر لگتا تھا۔ اس کا پھیکا چہرہ دیکھ کر بلقیس زہریلے انداز میں مسکرائی دوسری نوکرانیاں بھی دلچسپی سے شانی کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ ان میں سے زیادہ تر کی آنکھوں میں رمزیہ کیفیت تھی۔ اس کیفیت کے ساتھ ایک گدلی سی بیہودہ سی چمک بھی نظر آ رہی تھی۔

چھیدو نے مذاق اڑانے والے لہجے میں کہا ''نی تو بچی بچی کھر کھرے کے چکر میں پڑ گئی ہے۔ کوئی کھر کھرا شر کھرا نہیں کرنا۔ چل اٹھ نہا دھو کر دوجے کپڑے پہن لے اور خشبو بھی لگا لے تھوڑی سی۔ مری ہوئی بچھیوں کی بو آ رہی ہے پنڈے سے۔ چل اٹھ جا۔''

نوکرانیوں کی شوخ نظریں مسلسل شانی پر تھیں۔ شانی تب تو بات کی تہ تک نہیں پہنچی لیکن شام کے بعد جب وہ اپنے نیم گیلے بالوں میں کنگھی کر رہی تھی اچانک اس کے پورے جسم میں ایک تیز سرد لہر دوڑ گئی۔ اسے دوپہر کا وہ منظر یاد آیا جب تاؤ حشام کے شی بیٹے نے اسے چوبارے کی سیڑھیوں پر سے دیکھا تھا۔ اس کی بیمار آنکھوں میں عجیب سا تاثر نظر آیا تھا۔ کہیں..... کہیں وہ نشے باز لڑکا آج اسے کسی امتحان میں تو نہیں ڈالنے والا؟ شانی نے بڑے کرب کے ساتھ سوچا۔

رات نو بجے تک اس کے اندیشے درست ثابت ہو گئے۔ یہ گاؤں کی رات تھی۔ آٹھ ساڑھے آٹھ بجے ہی قرب و جوار میں خاموشی چھانا شروع ہو جاتی تھی۔ نو بجے کے قریب چھیدو آئی اور شانی سے بولی ''نی کیا کر رہی ہے ادھر، چل آ میرے ساتھ اوپر ایک کمرے کی صفائی کرنی ہے۔''

شانی تذبذب میں تھی۔ اس کے دل میں وسوسے پیدا ہو رہے تھے مگر چھیدو کے ساتھ جائے بغیر گزارا بھی نہیں تھا۔ وہ طویل سانس لیتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

چھیدو اسے لے کر سیڑھیاں چڑھی اور چوبارے میں آ گئی۔ ایک کمرا تو وہ تھا جس میں چھوٹا مالک اپنی رکھیل ''کوکی'' کے ساتھ رہتا تھا۔ اس کے ساتھ ایک دوسرا کمرا تھا۔ چھیدو نے اس دوسرے کمرے کا دروازہ کھولا اور شانی سے بولی۔ ''اس کو ذرا ٹھیک ٹھاک کر دے۔''

شانی نے چاروں طرف دیکھا۔ کمرا ٹھیک ٹھاک ہی تھا۔ ایک طرف دیہاتی طرز کی کرسیاں پڑی تھیں۔ ایک طرف رنگین پایوں والا پلنگ تھا۔ ایک ٹی وی، وی سی آر اور ٹیپ ریکارڈر بھی کمرے میں موجود تھے۔ الماری میں پنجابی فلموں کی بے شمار آڈیو کیسٹس کا ڈھیر تھا۔ دیواروں پر فلمی ایکٹرسوں کے پوسٹر چسپاں تھے۔ شانی نے ایک خاص بات نوٹ کی۔ ان پوسٹرز میں زیادہ تر ایکٹرسوں نے پتلون قمیص یا نی شرٹ اور ٹراؤزر وغیرہ رکھے تھے۔ ان کے بال جدید انداز میں ترشے ہوئے تھے۔ شاید ایسے پوسٹرز ڈھونڈ ڈھونڈ کر لگائے گئے تھے۔ عین ممکن تھا کہ یہ تاؤ کے بیٹے کا ہی کام ہو۔ شانی کو یاد آیا کہ وہ اپنی بغل میں جو ''چھمک چھلو'' لیے پھرتا ہے وہ بھی ایسے ہی کپڑوں اور حلیے میں نظر آتی ہے۔ پتا نہیں، اس معاملے کا کیا پس منظر تھا۔

شانی نے اِدھر اُدھر بکھری چیزیں سمیٹیں، کرسیوں کی گدیاں وغیرہ درست کیں۔ بستر کی چادر ٹھیک کی۔ اسی اثنا میں تاؤ کا لڑکا اندر آ گیا۔ شانی کی رگوں میں لہو اچھل کر رہ گیا۔ یقین وہی کچھ ہو رہا تھا جس کا اندیشہ تھا۔

لڑکے نے دروازے کی اندر سے کنڈی چڑھائی اور ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کے ہونٹوں سے سگریٹ لگا تھا۔ اس کے اندر آتے ہی ایک تیز بو سارے کمرے میں پھیل گئی۔ شانی کو چرس کی بو کا تجربہ نہیں تھا۔ تاہم یہ بات یقینی تھی کہ یہ چرس ہی کی بو ہے۔ وہ اتنی تیزی سے سگریٹ پھونک رہا تھا کہ تھوڑی دیر میں سارے کمرے میں دھواں پھیل گیا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ اپنے اندرونی اضطراب کو چھپانے، اور خود فراموشی کے حصول کے لیے اتنی شدت سے چرس نوشی کر رہا ہے۔ شانی نے اس کے سراپا کو غور سے دیکھا۔ وہ اسے ایک بگڑے تگڑے نوعمر لڑکے کی طرح لگا۔ شانی نے دکھ بھرے لہجے میں کہا ''کیوں اس طرح برباد کر رہے ہو خود کو؟ یہ نشہ تمہیں اندر سے جلا کر راکھ کر دے گا۔''

وہ کرخت لہجے میں بولا ''زیادہ استانی بننے کی کوشش نہ کر۔ میں کا کا نہیں ہوں۔''

''لیکن کام تو تم کاکوں والے ہی کر رہے ہو۔ بندہ اپنی عمر سے چھوٹا بڑا نہیں ہوتا۔ اپنی عقل سمجھ سے ہوتا ہے۔''

وہ کرسی پر کچھ اور بھی پھیل کر بیٹھ گیا۔ یوں لگا کہ شانی

کے بات کرنے سے اس کی وہ بے نام جھجک ختم ہو گئی ہے جو اسے بے تحاشا کش لینے پر مجبور کر رہی تھی۔ اس نے پہلی بار بے باکی سے شانی کے سراپا کی طرف دیکھا اور نئے سگریٹ کو آگ دکھا دی۔ شانی نے رندھے ہوئے گلے کے ساتھ کہا۔ ''مجھے یقین ہے کہ اگر تمہاری ماں زندہ ہوتی تو تم کم از کم اس حالت میں نہ ہوتے۔ ماں جیسی بھی ہو مگر.....''

''اوئے..... زیادہ ٹرٹر نہ کر'' تاؤ کے بیٹے نے تیزی سے شانی کی بات کاٹی۔ اس کی آنکھیں انگارہ ہو گئی تھیں اور چہرہ آگ کی طرح تپ رہا تھا۔ اس نے نئے سگریٹ کو پاؤں سے مسلا اور شانی سے نظر چرا کر آتشیں لہجے میں بولا ''چل کپڑے اتار اپنے۔''

شانی کے پورے جسم میں سوئیاں سی چبھ گئیں۔ وہ اس نوعمر لڑکے کی دیدہ دلیری پر ششدر رہ گئی۔ یہ دیدہ دلیری اسے کس نے دی تھی؟ شاید تاؤ حشام کے اثر و سوخ اور اس کی بے مہار طاقت نے..... اور شاید ان عورتوں کی ناتوانی اور مجبوری نے جو اس کمرے میں اس چرسی کے ساتھ محصور ہوتی تھیں۔ اور شاید اس معاشرے نے بھی جو لوگوں کو بس اپنے ہی دکھ پر چیخنا سکھاتا ہے۔

شانی ساکت کھڑی تھی۔ کمرے میں بلب کی زرد روشنی تھی۔ جنریٹر چلنے کی دور افتادہ آواز بتا رہی تھی کہ یہ واپڈا کی روشنی نہیں ہے۔ تاؤ کے بیٹے نے شانی کو ساکت کھڑے دیکھا اور ایک بار پھر نہایت کرخت لہجے میں بولا ''سنا نہیں تو نے میں کیا کہہ رہا ہوں؟''

شانی نے لرزتی کانپتی آواز میں کہا۔ ''کچھ خدا کا خوف کر چھوٹے''

چھوٹے کے لفظ نے جیسے اسے اور بھی سیخ پا کیا۔ وہ تڑپ کر اٹھا اور تن کر کھڑا ہو گیا..... اس نے اپنے چکیلے کرتے کے نیچے سے بھرا ہوا سیاہ پستول نکال لیا اور عجیب لہجے میں پھنکارا ''میں نے تجھے کہا، زیادہ استانی بننے کی کوشش نہ کر۔ اور جو میں کہہ رہا ہوں'' اس کے ہونٹوں کی طرح اس کی آنکھیں بھی بول رہی تھیں۔ اور یہ کہہ رہی تھیں۔ ''میں سب جانتا ہوں تیرے بارے میں تو دشمن کی بیٹی ہے اور دشمن سلوک کی حق دار ہے۔''

شانی پتھر کی طرح جامد کھڑی رہی۔ پستول لڑکے کے ہاتھ میں تھا۔ پستول کے دستے پر اس کی گرفت اتنی سخت تھی کہ اس کے ہاتھ کی ایک ایک ہڈی نمایاں ہو گئی تھی۔ اس دوران اس کی جان کی رو بحال ہو گئی۔ رو بحال ہونے سے الماری میں رکھا ایک خود بخود آن ہو گیا۔ غالباً رو منقطع ہونے سے پہلے وہ آن تھا۔ ایک بے ہودہ پنجابی گانا، کان پھاڑ دینے والے شور کے ساتھ کمرے میں گونجنے لگا۔ لڑکے نے ڈیک بند کرنے کی کوشش نہیں کی اور اسی شور میں بلند آواز سے بولا ''دیدے پھاڑ پھاڑ کر کیا دیکھ رہی ہے میری طرف۔ میں سچ کہتا ہوں۔ میں گولی مار دوں گا..... میں سچ کہتا ہوں.....'' وہ ہیجانی انداز میں آگے بڑھا اور اس نے ''برمیٹا'' پستول کی سرد نال شانی کی کنپٹی سے لگا دی۔

شانی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس کے ہونٹ لرزنے لگے۔ شاید اس کیفیت کو لڑکے نے شانی کی پسپائی سمجھا۔ وہ اس کی کنپٹی پر دباؤ بڑھاتے ہوئے بولا ''جلدی کر..... شاباش..... جلدی کر'' اس کے ساتھ ہی اس نے بائیں ہاتھ سے خود بھی شانی کا لباس کھینچنے کی کوشش کی.....

شانی گھومی اس کا تھپڑ اتنی زور سے لڑکے کے گال پر پڑا کہ وہ لڑکھڑا کر دو تین قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اگر ڈیک کا شور نہ ہوتا تو شاید اس طوفانی تھپڑ کی آواز نیچے تک جاتی۔ کم از کم کوکی نام کی اس رکھیل تک تو ضرور۔ جاتی جو آج ''چھٹی'' منا رہی تھی اور ساتھ والے کمرے میں موجود تھی۔ تھپڑ کھا کر لڑکے کے چہرے پر زلزلے کے آثار نمودار ہوئے۔ وہ کسی زخم کھائے جانور کی طرح شانی کی طرف جھپٹا اور پستول کی نال اس کی گردن میں گھسیڑ دی۔ شانی کو یوں لگا کہ پستول کی نال اس کے گوشت میں گھس کر ہڈی تک پہنچ جائے گی۔ وہ لڑکھڑا کر دیوار سے جا لگی۔ وہ چنگھاڑا ''تو نے مجھے تھپڑ مارا ہے۔ میں تیری جان نکال لوں گا۔ میں قتل کر دوں گا تجھے۔''

شانی بے باکی سے اس کی شعلہ فشاں آنکھوں میں دیکھتی رہی۔ ایک عجیب سا یقین اور نامعلوم سا اطمینان اس کے رگ و پے میں سرایت کرتا جا رہا تھا۔ وہی کیفیت جس کا تعلق اس کے خداداد وجدان سے تھا۔ وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی ''چلا دو گولی..... مار دو مجھے۔''

''میں..... سچ مچ..... مار..... دوں..... گا'' وہ ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولا۔ لہجے میں جنونی کیفیت تھی۔

''مار دو..... سچ مچ۔'' وہ ترکی بہ ترکی بولی۔

''میں کہتا ہوں..... اتار دے کپڑے..... نہیں تو میں نے..... نہیں تو میں نے، گھوڑا دبا دینا ہے۔'' اس کی آواز میں بے حد وحشت تھی۔

''دبا دے گھوڑا۔'' شانی کا لہجہ مضبوط تر تھا۔ وہ ہر طرح کی صورتِ حال کے لیے تیار تھی۔ جیسی زندگی وہ جی رہی تھی۔ اس میں موت کی کوئی حقیقت نہیں رہ گئی تھی۔

چند سیکنڈ تک صورتِ حال جوں کی توں رہی۔ دونوں کی

نگاہیں ایک دوجے میں پیوست رہیں۔ یہ بے پناہ گمبھیر لمحے تھے، کچھ بھی ہوسکتا تھا۔ وہ نشے میں تھا اور فرطِ غضب سے سرتاپا لرز رہا تھا۔ پھر اس نے شانی کو دھکیل کر پلنگ پر گرانا چاہا۔ دونوں ایک دوسرے سے الجھ کر کرسیوں پر گرے، لڑکے کا پستول والا ہاتھ دیوار سے ٹکرایا۔ پستول سے میگزین نکل کر دور جاگرا۔ شانی بالکل بپھری ہوئی تھی۔ ایک جلالی کیفیت نے اسے سرتاپا ڈھانپ لیا تھا اس نے کئی زناٹے کے تھپڑ لڑکے کے منہ پر رسید کیے۔ ساتھ ساتھ وہ چلا رہی تھی ''..... بے غیرت..... بدذات..... کمینے۔''

یہ سارا شور اباڈیک کی سماعت شکن آواز میں دب کر رہ گیا تھا۔ شانی کے طوفانی تھپڑ کھا کر تاؤ کا بیٹا جیسے ہکا بکا رہ گیا۔ یوں لگا جیسے اس کا نشہ ہرن ہو رہا ہے اور اس کے اندر کی ساری سختی و جبروت سناٹے میں آرہی ہے۔ وہ ساکت نظروں سے شانی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جیسے سمجھ نہ پا رہا ہو کہ اس موقع پر کیا کرے۔ جنگلی جانور کی طرح شانی پر پل پڑے..... یا یونہی بیٹھا رہے۔ شانی کا طیش اپنے عروج پر تھا۔ وہ اس کا گریبان جھنجوڑ کر چلائی ''گولی کیوں نہیں مارتا کمینے..... پکڑ پستول..... چلا گولی..... میں تیرے سامنے ہوں۔ چلا گولی۔''

وہ سکتے کی کیفیت میں بیٹھا رہا۔

وہ ہیجانی انداز میں آگے بڑھی۔ اس نے ٹی وی ٹرالی کے نیچے پڑا ہوا میگزین اٹھایا اسے پھر سے ''چھوٹے مالک'' کے پسٹل کے ساتھ اٹیچ کیا۔ پسٹل بدستور ''چھوٹے مالک'' کے ہاتھ میں تھا۔ شانی نے پسٹل کی نال پکڑ کر اپنے سینے پر دل کے مقام پر رکھ لی۔ دوسرے ہاتھ سے اسے جھنجوڑتے ہوئے بولی ''چلا گولی۔ اب سوچتا کیا ہے۔ میں تیار ہوں تیرے ہاتھوں ... مرنے کے لیے۔''

وہ پتھر کے مانند ساکت تھا، اس کا رنگ لمحوں میں زرد ہوگیا تھا۔ شانی کے ہیجان نے اسے سرائز کر دیا تھا۔ وہ غیر محسوس طور پر اپنا ہاتھ پیچھے کی طرف کھینچ رہا تھا۔ شانی نے پھر ایک جھٹکے سے پسٹل کی نال اپنے سینے میں دھنسائی۔ اس کی شہادت کی انگلی کو اپنے ہاتھ سے موڑ کر ٹریگر پر رکھا اور چیخ کر بولی ''تو تو بڑا شیر جوان بنتا تھا۔ اب اتنا سا گھوڑا بھی نہیں دبا سکتا..... کمینے۔ میں نے نہیں کپڑے اتارنے تیرے سامنے..... قتل کردے مجھے..... قتل کردے۔''

شانی نے اس پر تھپڑوں کی بارش کردی۔ اس کا نچلا ہونٹ پھٹ گیا۔ بال بکھر گئے۔ سیاہ پسٹل اس کے ہاتھ میں کسی بے کار کھلونے کی طرح دبا ہوا تھا..... اسے بری طرح پیٹنے کے بعد شانی نے فرش پر بیٹھ کر اپنا سر گھٹنوں میں دیا اور ہچکیوں سے رونے لگی۔ ڈیک پر فی میل سنگر کی آواز زور شور سے گونج رہی تھی۔ ''آ سینے نال لگ جا شاہ کر کے.....''

کئی منٹ تک رونے کے بعد شانی نے گھٹنوں سے سر اٹھایا تو اس نے دیکھا کہ تاؤ کا بیٹا جوں کا توں فرش پر بیٹھا ہے۔ وہ ایک طرف جھکا ہوا تھا اور اس کا سارا وزن اپنے دائیں ہاتھ پر تھا۔ اس دباؤ کے سبب اس کا دایاں کندھا اوپر کو اٹھا ہوا تھا۔ پسٹل اس کے سامنے پڑا تھا۔ اس کا نچلا ہونٹ خون آلود تھا۔ گریبان پھٹنے سے سینہ اور پیٹ عریاں ہوگیا تھا۔ اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے۔ بے حد گمبھیر لیکن خاموش آنسو۔ جب اس نے محسوس کیا کہ شانی اس کی جانب دیکھ رہی ہے تو اس کے رونے میں شدت آگئی۔ آنسو گرنے کی رفتار تیز ہوگئی اور سینے سے گا ہے گا ہے ایک ہچکی بلند ہونے لگی..... یہ ایک بالکل مختلف صورتِ حال تھی۔ اس صورتِ حال نے بتدریج شانی کے دل پر اثر کرنا شروع کیا۔ وہ ایک دو منٹ تک ساکت نظروں سے اسے دیکھتی رہی پھر اٹھی اور طوفان مچاتے ہوئے ڈیک کو آف کر دیا۔ اس کے بعد وہ لڑکے کے قریب آئی۔ کئی سیکنڈ تک سوچتی رہی تب اس نے بیٹھ کر اشک بار لڑکے کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ اس نے ایک نہایت غصیلے جھٹکے کے ساتھ شانی کا ہاتھ پیچھے ہٹایا۔ اپنی جگہ سے اٹھا اور پلنگ پر اوندھا گر کر دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔

اس مرتبہ شانی نے اسے رونے دیا۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ اس کے سینے کا زہریلا غبار اس کی آنکھوں کے راستے نکل رہا ہے۔ وہ کم و بیش دس منٹ تک اسی طرح روتا اور ہچکیاں لیتا رہا۔ تب بتدریج اس کی آواز مدھم پڑ گئی۔ شانی نے اس کا بریتا پسٹل دراز میں رکھ دیا تھا۔ وہ ایک بار پھر اس کے قریب جا بیٹھی۔ اس مرتبہ اس نے شانی کا ہاتھ تو اپنے کندھے سے نہیں جھٹکا۔ شانی دھیرے دھیرے اس کا کندھا سہلانے لگی۔ پھر اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ وہ اسی طرح اوندھا لیٹا رہا اور آنسو اس کی آنکھوں سے رستے رہے۔ اس کے رخسار پر شانی کی انگلیوں کے گہرے نشان تھے۔ اس کا سر شانی کے زانو سے چھو رہا تھا۔ ان لمحوں میں وہ شانی کو ایک بچے کی طرح لگا۔ ایک نادان بچہ جو کسی غلطی کے سبب بے طرح رسوا اور پشیمان ہوا تھا..... شانی اس کے سرخ رخسار کو نرمی سے سہلانے لگی۔

قریباً ایک گھنٹے بعد شانی اور تاؤ حشام کا بیٹا آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ رات اپنے نصف کی طرف بڑھ رہی تھی۔ جزبز

ایک بار پھر چلنا شروع ہوگیا تھا۔ اس کی فراہم کی ہوئی توانائی سے بلب کی روشنی بھی کم اور بھی زیادہ ہوجاتی تھی۔ اس روشنی میں شانی نے تاؤ کے بیٹے کا چہرہ دیکھا۔ اس چہرے پر جب غصے کا بھوت سوار تھا تو یہ بدصورت اور کریہہ نظر آتا تھا۔ لیکن اب یہ دھلا دھلایا تھا اور اس کے کرخت نقوش میں ایک عجیب سی حلاوت داخل ہوگئی تھی۔ بظاہر معمولی تبدیلی تھی لیکن شانی کو نظر آرہی تھی۔

شانی کے ساتھ کشمکش میں تاؤ کے بیٹے کا گریبان پھٹ گیا تھا اور سینہ عریاں ہوگیا تھا۔ اب اس نے پھٹے ہوئے کرتے کی جگہ دوسرا کرتہ پہن لیا تھا۔ کرتے کی یہ تبدیلی شانی کی موجودگی میں ہی ہوئی تھی۔ شانی نے اس کے سینے پر دو جگہ ایک نام لکھا ہوا دیکھا تھا۔ دیہات کے میلے ٹھیلوں میں لوگ انمٹ روشنائی سے ایسے نام اور پھول بوٹے اپنی جلد پر نقش کرواتے ہیں۔ جو نام شانی نے لکھا ہوا دیکھا وہ کوکی تھا۔ کوکی اسی رنگین تتلی کا نام تھا جو اس چار دیواری میں ہمہ وقت تاؤ کے بیٹے کے ساتھ نظر آتی تھی۔ وہ بظاہر ایک عام سی بازاری لڑکی تھی۔ شانی نے اب تک اس چار دیواری میں جو کچھ دیکھا تھا، اس سے تو یہی پتا چلتا تھا کہ یہ لڑکی یہاں، بس ہوس دل لگی کا سامان ہے۔ مگر اب سینے پر کندہ اس کا نام پڑھ کر شانی کو اپنی رائے ناقص محسوس ہونے لگی.....

بڑی حکمت، نرمی اور بڑے اصرار کے ساتھ شانی نے تاؤ کے بیٹے کو گفتگو پر آمادہ کرلیا تھا۔ اس کے لب و لہجے میں ابھی تک تلخی اور طیش موجود تھا۔ بہر حال یہ غنیمت تھا کہ وہ شانی کے سوالوں کے جواب دے رہا تھا۔ اس نے شانی کو جو کچھ بتایا۔ اس سے شانی کو تاؤ حشام، تاؤ حشام کی بیوی بچوں اور اس چار دیواری کے بارے کافی معلومات حاصل ہوئیں۔

یہ جگہ نار پور سے قریباً تیس میل دور تھی۔ قریب ترین شہر بھی یہاں سے کم و بیش پچیس میل کے فاصلے پر تھی۔ یہ خاص دیہاتی علاقہ تھا۔ اس گاؤں کا نام میانہ معلوم ہوا۔ تاؤ حشام نے اپنے چچیرے ممیرے بھائیوں کی طرح بس شادی پر اکتفا نہیں کیا تھا۔ اس نے اعلانیہ طور پر چار شادیاں کی تھیں۔ دو بیویاں تو نار پور میں تھیں۔ ایک ڈسکہ کی تھی۔ ایک یہاں اس گاؤں میانہ میں۔ یہ سب سے چھوٹی تھی۔ اسے مرے ہوئے سات آٹھ سال ہو چکے تھے۔ اس بیوی سے تاؤ کا صرف ایک بچہ تھا..... اور وہ یہی ''چھوٹا مالک'' تھا۔ چھوٹے مالک کا اصل نام معراج دین تھا۔ تاؤ پیار سے راجو کہتا تھا۔ راجو کی ماں تاؤ کی لاڈلی بیوی تھی۔ اسی طرح راجو بھی لاڈلا تھا۔ یہ لوگ خاندان کے دوسرے افراد سے زیادہ ملتے جلتے نہیں تھے۔ راجو کی باتوں سے پتا چلتا تھا کہ اس حویلی کے رہنے والے، فاخر کی شادی یا بھابو کی تدفین جیسے واقعات میں بھی شریک نہیں ہوئے تھے۔ ہاں راجو کو یہاں کے کچھ دوسرے مکینوں کی طرح اتنا پتا ضرور چل گیا تھا کہ شانی اس کے چچازاد، اللہ بخشے فاخر کی بیوی تھی اور اس کی پہچان یہاں دشمن کی بیٹی کے طور پر ہے۔

شانی نے چھوٹے مالک یعنی راجو سے کہا ''تم کہتے ہو کہ تمہارا ابا تم سے پیار کرتا ہے۔ اگر وہ سچ مچ پیار کرتا ہے تو پھر وہ تمہیں تمہاری حرکتوں سے روکتا کیوں نہیں ہے۔''

''کون سی حرکتیں؟''

شانی جرأت سے بولی ''یہ سب کچھ جو تم کر رہے ہو۔ رات دن نشے کے سگریٹ پھونکتے ہو۔ شراب پیتے ہو۔ نوکرانیوں کے ساتھ ہر حرکت کرتے ہو۔ ایک لڑکی تم نے کمرے میں رکھی ہوئی ہے۔ کیا تمہارے ابے کو ان باتوں کا پتا نہیں؟''

ایک لمحے کے لیے لگا کہ وہ شانی کی بات پر بھڑک اٹھے گا۔ لیکن پھر اس نے اپنی تلخی پر قابو پایا۔ اس نے ایک گہری سانس آہ کی طرح لی اور قدرے بے پروائی سے بولا۔ ''ابا مجھ کو کیوں روکے گا۔ ابے نے ہی تو یہ سب کچھ کر رکھا ہے۔''

''کیا مطلب۔ یہ لڑکیاں تمہارے آلے دوالے ابے نے جمع کی ہوئی ہیں؟''

''ہاں۔ اسی نے کی ہوئی ہیں۔'' اس کے لہجے میں غصے کی لہر سی محسوس ہوئی۔

''کیوں؟''

''بس..... ہے کوئی بات۔''

''مجھے نہیں بتاؤ گے؟'' شانی نے بڑے خلوص اور درد مندی سے اس کی سرخ آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

وہ چند لمحے سوچتا رہا پھر اس نے پکے سگریٹ کا ایک گہرا کش لیا اور کہا ''میرا ابا میرا دھیان کسی کی طرف سے ہٹانا چاہتا ہے۔ وہ چاہتا ہے..... کہ کوکی میرے دماغ سے نکل جائے بالکل ہی نکل جائے۔''

شانی نے حیرت سے کہا ''لیکن..... کوکی تو تمہارے ساتھ رہ رہی ہے۔''

''نہیں..... یہ وہ کوکی نہیں ہے۔'' اس نے بڑے درد سے کہا ''اس کا تو بس نام کوکی ہے۔''

''کیا مطلب؟ کوکی نام کی دو لڑکیاں ہیں؟''

''نہیں کوکی ایک ہی ہے۔ یہ جو میرے ساتھ رہتی ہے

اس کا نام تو میں نے کوکی رکھا ہے۔"

شانی پہلے تو الجھی لیکن پھر جلد ہی بات کی تہ تک پہنچ گئی۔ تاؤ حشام کا یہ نشئی بیٹا کسی لڑکی سے محبت کرتا تھا۔ وہ لڑکی اس سے دور ہو گئی تھی۔ اب اس کا غم غلط کرنے کے لیے اس نے بگڑے تگڑے چوہدریوں جیسا انداز اختیار کیا تھا۔ وہ خود کو چرس اور شراب کے نشے میں غرق کر رہا تھا۔ اس کے ابے نے بھی اس حوالے سے اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق پتر سے پورا پورا تعاون کیا تھا۔ اس نے اپنے نوعمر بیٹے کے اردگرد جوان نوکرانیوں کی بھیڑ لگا دی تھی۔ غالباً اس کا خیال تھا کہ تندمزاج بیٹا ان رنگ رلیوں میں کھو کر اپنی ناقابلِ قبول ضد بھول جائے گا اور لگتا تھا کہ وہ اپنے مقصد میں کافی حد تک کامیاب بھی رہا ہے۔ نوعمر بیٹا اپنا رونا دھونا بھول کر اردگرد کے خوبصورت کھلونوں سے کھیلنا شروع ہو گیا تھا..... وہ جس لڑکی کی زلفوں کا اسیر تھا، اس کا نام کوکی تھا۔ اپنا دل بہلانے کے لیے اس نے اپنی رکھیل کا نام بھی کوکی رکھ لیا تھا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے شانی نے اس کے سینے پر کوکی کا نام لکھا دیکھا تھا۔ یہ اسی گمشدہ محبت کی نشانی تھی۔ وہ اپنی رکھیل کو پتلون شرٹ پہناتا تھا کیونکہ کوکی کو اس نے زیادہ تر اسی لباس میں دیکھا تھا۔ اس کے کمرے میں جو فلمی پوسٹر آویزاں تھے ان میں بھی یہی پہناوا دکھائی دیتا تھا۔

یہ "چھوٹے مالک" کا ایک بالکل مختلف روپ سامنے آیا تھا۔ شانی کو یوں لگا جیسے یہ بگڑا چوہدری زادہ گمراہ ہونے کے ساتھ ساتھ مظلوم بھی ہے۔ اس کے ابے کا کردار بھی قابلِ مذمت تھا۔ ایک غلط کار بیٹے کو راہِ راست پر لانے کے لیے ایک بے راہرو باپ نے گمراہ کن راستہ اختیار کیا تھا۔

شانی نے پوچھا "وہ لڑکی جس سے تم پیار کرتے ہو، اب کہاں ہے؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا "کچھ پتا نہیں۔ ابے نے اور بھا قادر نے اسے پتا نہیں کہاں غائب کر دیا ہے۔"

"تم نے اسے ڈھونڈنے کی کوشش کی ہے؟" شانی نے پوچھا۔

"ہاں کی تھی۔" وہ قدرے بیزاری سے بولا۔ یوں لگا جیسے اس لڑکی کا ذکر اب اسے تکلیف دے رہا ہے۔ وہ ایک تلخ حقیقت کو بھول کر اپنی بدمستی میں گم رہنا چاہتا تھا۔

"لڑکی اسی پنڈ کی تھی؟" شانی نے پوچھا۔

"نہیں۔" اس نے مختصر جواب دیا۔

"کہاں کی تھی؟"

"پاک پتن کی۔" وہ جان چھڑانے والے انداز میں بولا۔

شانی کے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ وہ چونک کر راجو کے لال بھبھوکا چہرہ دیکھنے لگی۔ پاک پتن شریف کا ذکر تو شانی نے کوتاہ قد ڈولے سے سنا تھا۔ اس نے غور کیا..... اور پھر ایک دم کئی کڑیاں اسے آپس میں ملتی محسوس ہوئیں۔ تاؤ کے اس بیٹے کا نام راجو تھا، اور اس لڑکے کا نام بھی راجو تھا جس سے پاک پتن کی کوکب پیار کرتی تھی، اور ڈولا جسے ڈھونڈنے نکلا ہوا تھا۔ پھر ایک اور بات شانی کی سمجھ میں آئی۔ کوکی شاید کوکب کا ہی گھریلو نام تھا..... یقیناً یہی بات تھی۔ شانی کے جسم میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایک کہانی کے خدوخال اس کے سامنے واضح ہو گئے۔ کوتاہ قد ڈولا، کوکب نامی لڑکی سے پیار کرنے والے لڑکے کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے یہاں تک آ پہنچا تھا..... اور وہ ٹھیک جگہ پہنچا تھا۔ یہ وہ چار دیواری تھی جہاں راجو نام کا مطلوب "چوہدری زادہ" موجود تھا۔

"اس طرح میری طرف کیا دیکھ رہی ہو" راجو قدرے غصے سے بولا۔

"کچھ نہیں..... بس..... ایک بات میری سمجھ میں آئی ہے۔"

"کیا بات؟"

"تم بڑے تھوڑے دل کے ہو۔ بلکہ میں کہوں گی کہ بزدل ہو۔"

"دیکھو، میں نے اب تک تمہارا بڑا لحاظ کیا ہے۔ بڑا لحاظ کیا ہے۔" اس کی سرخ آنکھوں میں ایک بار پھر نمی تیر گئی۔

"بہادر وہ نہیں ہوتا جو بے لحاظ ہو۔ بہادر تو وہ ہے جو اپنے غصے پر قابو پا لیتا ہے۔ اس حساب سے تو تم نے بہادری ہی دکھائی ہے۔ میں جو تمہیں بزدل کہہ رہی ہوں تو ایک اور وجہ سے کہہ رہی ہوں۔"

وہ تحصیلی نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔

شانی نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "کسی سے پیار کرنا اور پھر ہمت ہار دینا بھی تو بزدلی ہے..... تم نے ہمت ہار دی ہے۔ اس لڑکی کو بھول بھال کر اپنی عیاشیوں میں کھو گئے۔ وہی کچھ کرنے لگے ہو جو تمہارا ابا چاہتا ہے۔ اپنے ابے کے سامنے اور زمانے کے سامنے ہار مان لی ہے تم نے۔ کیا میں غلط کہہ رہی ہوں۔"

"ہاں، غلط کہہ رہی ہو۔" وہ کھوکھلی آواز میں بولا "میں نے..... میں نے بہت ڈھونڈنے کی کوشش کی ہے اسے۔ پتا نہیں اس کے ماں باپ اسے لے کر کہاں چلے گئے ہیں۔ یا پھر اس کا شاید پاک پتن میں ہی کہیں چھپ گئے ہیں۔ میں اپنے چچا زاد بھائی کے ساتھ ان کے پیچھے کراچی تک گیا ہوں۔ مجھے پتا نہیں چلا۔ مجھے تو لگتا ہے..... مجھے تو لگتا ہے۔" وہ بیچ میں چپ ہو گیا۔

شانی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "دیکھو راجو! اگر مجھے کچھ بتانے ہی لگے ہو تو ساری بات بتاؤ۔ ہو سکتا ہے کہ میں تمہاری کچھ مدد کر سکوں۔"

اس نے تحصیلی نظروں سے شانی کو گھورا۔ جیسے یہ زبان سے نہیں دیکھ رہا ہو، تم میرے پیو کے شکنجے میں پھنسی ہوئی ایک بے بس عورت ہو۔ تم میری کیا مدد کرو گی۔

شانی نے اصرار سے کہا "تم کیا کہنے لگے تھے۔ تمہیں کیا لگتا ہے۔"

اس نے سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے اور ذرا جھجکتے ہوئے کہا۔ "مجھے لگتا ہے..... کہ شاید وہ حرامزادی مجھ سے پیار شیار کرتی ہی نہیں تھی۔ بس دل لگی کر رہی تھی مجھ سے۔ اگر اس کے دل میں کچھ ہوتا تو کیا وہ اس طرح لک (چھپ) کر بیٹھی رہتی۔ اسے تو میرے قریب ٹھکانے کا بھی تھوڑا بہت پتا تھا۔ وہ پہنچنے کی کوشش کرتی۔ کوئی سناں (پیغام) ہی مجھ تک پہنچاتی۔" اس نے آنکھ سے بہنے والے آنسو کو الٹے ہاتھ سے پونچھنے کی کوشش کی۔

"کوشش تو اس نے کوشش کی ہو۔ لڑکی تو پھر لڑکی ہوتی ہے۔ اسے سو طرح کے بندھنوں نے باندھ رکھا ہوتا ہے۔ وہ جب تک ہی جا سکتی ہے ناں۔ اور پھر اس بیچاری کی عمر ہی کتنی تھی۔ ابھی تو تمہاری عمر بھی پندرہ سولہ سال سے زیادہ نہیں تھی۔ وہ تم سے کچھ چھوٹی ہی ہو گی۔"

"میں 17 ویں سال میں چڑھ چکا ہوں۔ وہ مجھ سے کافی چھوٹی ہی تھی۔"

"بہرحال تم دونوں چھوٹی عمر میں ایک بڑے چکر میں پھنس گئے ہو۔ یہ عمر تو اسکول جانے اور ہنسنے کھیلنے کی ہوتی ہے۔ مجھے تو میں حیران ہو رہی ہوں تمہاری عمر دیکھ کر اور تمہارا مو دیکھ کر۔"

وہ کچھ نہیں بولا۔ بس ناراض نظروں سے فرش کو گھورتا رہا۔ شانی نے اس سے پوچھا کہ کوکی نام کی اس لڑکی سے اس کی ملاقات کہاں اور کیسے ہوئی۔ کچھ دیر تک ہچکچانے اور ہچکچاتے رہنے کے بعد راجو نے جو کچھ بتایا، اس سے صورت حال پوری طرح واضح ہو گئی۔ اب شبے کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی۔ راجو ہی وہ چوہدری زادہ تھا جس کی تلاش میں ڈولا جگہ جگہ بھٹکتا ہوا یہاں پہنچا تھا۔ راجو نے اپنے اور کوکی یعنی کوکب کے بارے میں جو کچھ بتایا وہ مختصر الفاظ میں یوں تھا۔

"یہ کوئی ڈیڑھ سال پہلے کی بات تھی۔ پاک پتن شریف کے میلے میں تاؤ حشام کے کچھ گھر والے پاک پتن پہنچے۔ عقیدت مندوں کا ہجوم میلے کی تاریخوں سے پہلے ہی شہر میں ڈیرا جمانا شروع کر دیتا ہے۔ ایسے لوگوں کی رہائش کے لیے مکانات کرایے پر اٹھائے جاتے ہیں۔ تاؤ حشام کے گھر والے قریباً تین ہفتے پہلے پاک پتن پہنچ گئے تھے۔ راجو بھی ان میں شامل تھا۔ جس گھر میں راجو اور اس کے عزیزوں نے رہائش رکھی اس کے ساتھ والے مکان میں کریانہ فروش سیف اللہ کی رہائش تھی۔ سیف اللہ کی دو بیٹیاں تھیں۔ جن میں سے چھوٹی کوکب تھی۔ کوکب اور اس کی بڑی بہن دونوں کالج اور اسکول میں پڑھ رہی تھیں۔ دونوں اپنے آپ کو خوب سنوار کر رکھتی تھیں۔ چھوٹی کوکب نے شہری لڑکیوں کی طرح باقاعدہ بال ترشوا رکھے تھے اور نئی تراش کے کپڑے پہنتی تھی۔ اسے کپڑوں کی ڈیزائننگ کا شوق تھا اور وہ شام کے وقت ایک ڈیزائننگ سکھانے والے اسکول میں بھی جاتی تھی۔ پاک پتن میں قیام کے دوران میں ہی راجو اور کوکب کی نگاہیں لڑ گئیں۔ یہ تعلق دو تین ہفتوں کے اندر ہی طوفانی محبت میں بدل گیا اور میانہ گاؤں کا یہ نوعمر "چوہدری زادہ" شہری کوکب پر مر مٹا۔ عرس ختم ہونے کے دس بارہ روز بعد ہی راجو پھر پاک پتن آ دھمکا اور کوکب کے اردگرد منڈلانے لگا۔ کوکب بھی بری طرح اس چکر میں پھنس چکی تھی۔ غریب کریانہ فروش سیف اللہ نے چوہدری زادے راجو کے سامنے ہاتھ جوڑے اور اس سے کہا کہ وہ ایک عزت دار بندہ ہے یہ سب کچھ برداشت نہیں کر سکتا۔ کوکب کی عمر ابھی تھوڑی ہے لیکن اگر وہ واقعی اس کے بغیر نہیں رہ سکتا تو پھر اپنے ماں باپ کو پاک پتن بھیجے تاکہ اس معاملے کو کوئی مناسب شکل دی جا سکے۔

راجو نے واپس میانہ آ کر اپنے چچازاد قادرے اور باپ حشام کو سب کچھ بتایا اور ان کو مجبور کیا کہ وہ پاک پتن جا کر کوکب کے بڑوں سے بات کریں۔ چوہدری حشام کے لیے یہ سب کچھ قطعی طور پر ناقابلِ قبول تھا۔ وہ بیٹے کو ہم پلہ لوگوں میں بیاہ کر لمبی چوڑی جائداد حاصل کرنے کا پروگرام رکھتا تھا۔ اس نے معاملے کی سنگینی دیکھی تو وہی کچھ کیا جو ایسے موقعوں پر سرمایہ دار، زمیندار اور وڈیرے کرتے ہیں۔ اس نے پاک پتن پہنچ کر کریانہ فروش سیف اللہ کو بری طرح ڈرایا دھمکایا اور

بیٹی سمیت روپوش ہونے پر مجبور کر دیا۔

بعد ازاں تاؤ حشام نے جو کچھ کیا، وہ شانی کے سامنے تھا اور راجو بھی اس سے مکمل طور پر بے خبر نہیں تھا۔ تاؤ حشام نے نومحر بیٹے کو اس کی لگن سے چھٹکارا دلانے کے لیے، اپنے مزاج کے مطابق قدم اٹھایا۔ نشتو وہ پہلے ہی کرتا تھا۔ اب تاؤ نے اس کے لیے جنس کو بھی ارزاں اور عام کر دیا۔ اس کے اردگرد جوان لڑکیوں کی بھیڑ لگا دی۔ غالباً اس کا خیال تھا کہ عورتوں کے درمیان چند مہینے گزار کر، راجو کی، نئی نئی جوانی کا ابال ٹھنڈا ہو جائے گا اور کوکی کا بھوت اس کے سر سے اتر جائے گا۔ اگر دیکھا جاتا تو تاؤ حشام اپنے اس مقصد میں کافی حد تک کامیاب بھی ہوا تھا۔ قطع نظر اس کے کہ باپ کی یہ ''کامیابی'' بیٹے کو مکمل بربادی کی طرف لے جا رہی تھی۔

شانی نے بڑی توجہ اور ہمدردی سے راجو کی باتیں سنیں اور اس کرب کو محسوس کیا جو یہ بگڑا ہوا چوہدری زادہ ابھی بھی اپنے سینے کی گہرائی میں محسوس کرتا تھا۔

شانی نے نرمی سے اپنا ہاتھ راجو کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے کہا ''اگر میں یہ کہوں کہ میں تمہاری مدد کر سکتی ہوں تو پھر؟''

''کیا کہنا چاہتی ہو؟'' وہ ذرا حیرانی سے بولا۔

''اگر میں کہوں کہ میں کوکب کے سلسلے میں تمہاری مدد کر سکتی ہوں تو کیا تم اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کرو گے؟''

''تم کوکب کے بارے میں کیا جانتی ہو؟''

''میں کچھ نہیں جانتی، لیکن میرا دل کہتا ہے کہ میں کسی نہ کسی طور تمہاری مدد کر سکتی ہوں۔ مگر جب تمہاری طرف دیکھتی ہوں تو دل بجھ جاتا ہے۔ اگر وہ لڑکی واقعی تم سے محبت کرتی ہے تو پھر تمہیں اس حالت میں دیکھ کر اس کا دل بھی ضرور بجھ جائے گا۔ سچی بات یہ ہے راجو کہ تم نے اپنے آپ کو بہت ہی نیچے گرا لیا ہے۔''

وہ بدستور الجھی ہوئی نظروں سے شانی کا چہرہ تک رہا تھا۔ ''تم تو ایسے باتیں کر رہی ہو جیسے تم نے اسے کہیں دیکھا ہے۔'' وہ بولا۔

اس سے پہلے کہ شانی جواب میں کچھ کہتی نیچے صحن کی طرف سے رونے کی باریک لیکن تیز آواز سنائی دی۔ نوحے کی طرح بلند ہوتی اور ڈوبتی ہوئی آواز۔ یہ صفیہ کی ماں تھی جو بدنصیب بیٹی کو یاد کر کے رات کے سناٹے میں آہ و بکا کر رہی تھی۔ درد کچھ ایسا تھا اس کے رونے سے دل پگھلتا محسوس ہوتا تھا۔ عورت کی آواز سنی تو راجو کے چہرے پر رنگ سا آ کر گزر گیا۔ اس کی نظریں خود بخود جھک گئیں۔

شانی نے تاسف بھرے لہجے میں کہا ''میں نے کہا راجو! تم نے خود کو بہت نیچے گرا لیا ہے۔ اتنا نیچے کہ دل کانپ جاتا ہے۔ یہ لڑکی تمہاری وجہ سے مری ہے۔ اس سے پہلے بھی پتا نہیں کیا کیا تمہارے ہاتھوں ہو چکا ہے۔''

اس کا چہرہ ایک بار پھر غصے سے تمتمانے لگا لیکن وہ بولا کچھ نہیں۔ بس ایک جھٹکے سے اٹھا۔ سگریٹوں کی ڈبیا جیب میں ڈالی۔ پستول اپنے چمکیلے کرتے کے نیچے اڑسا اور لمبے ڈگ بھرتا باہر نکل گیا۔

اگلے روز کئی چبھتی ہوئی نظروں نے شانی کو دیکھا۔ ان میں دیگر نوکرانیوں کے علاوہ چھیدو کی طنزیہ مسکراہٹ بھی شامل تھی۔ وہ شانی کی تمام حرکات و سکنات کا جائزہ لے رہی تھی، جیسے ان حرکات و سکنات سے کل رات کی روداد جان لینا چاہتی ہو۔ بلقیس اور فرزانہ کی دبی دبی سرگوشیاں بھی شانی نے سنیں۔

وہ حمیدہ کے ساتھ اپنے روزمرہ کے کام میں لگی رہی۔ شام سے ذرا پہلے وہ تھک کر چور ہو چکی تھی۔ لیکن آج ایک اضافی کام بھی کرنا پڑ گیا۔ دودھ دھونے والا ملازم رکھا کہیں گیا ہوا تھا۔ چھیدو نے دو بھینسوں کو دھونے کی ذمہ داری شانی پر ڈال دی۔ وہ اپنی حویلی میں کبھی کبھی شوقیہ دھویا کرتی تھی مگر آج تو یہ سب کچھ قید بامشقت کا حصہ تھا۔ شانی گھٹنوں میں پیتل کی بالٹی دبائے دودھ کی دھار کا رخ درست رکھنے کی کوشش کر رہی تھی جب تاؤ حشام آیا اور ایک دوسرے شخص کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ چھیدو کا بیٹا یعنی راجو بھی ان کے ساتھ تھا۔ شانی کو دودھ دھوتے دیکھ کر تاؤ بھڑک اٹھا۔

گرج کر چھیدو سے بولا ''چھیدو کم بختے! اس حرامزادی کو کس کام پر لگایا ہے تو نے۔ دودھ سڑ جائے گا جاؤ دودھ کا..... میں نے تجھ سے کہا تھا اس منحوس کے لیے خاوند ڈھونڈنے ہیں۔ گوبر اور گھوڑی کی لد تو کرے میں ڈال کر اس کے سر پر.....''

قادرے کے دانت نکل آئے۔ راجو بھی ہولے سے مسکرایا لیکن تیسرے شخص کا چہرہ تقریباً سپاٹ ہی رہا۔ یہ تھا۔ یہ دوسری بار تھی کہ اس چار دیواری میں شانی نے اس کی شکل دیکھی تھی۔ بہرحال یہ احساس اسے اکثر ہوتا رہتا تھا کہ بابر اور قادر وغیرہ اس کے آس پاس ہی کہیں موجود ہیں۔

تاؤ کی کنپٹی کا زخم ڈوبتے۔ سورج کی روشنی میں دمک رہا تھا۔ غالباً وہ ہلکے سے نشے میں بھی تھا۔ اس نے شانی کو دیکھا

سے پکڑ کر بھینس کے پہلو سے اٹھایا اور برآمدے کی طرف دھکیل دیا۔ بالٹی گر گئی اور دودھ کوبر پر بکھر گیا۔ تاؤ نے اپنا دیسی جوتا اتارا اور شانی کے کندھوں اور پشت پر بے دریغ ضربیں رسید کیں۔ وہ لڑکھڑا کر گر گئی اور اپنا چہرہ بازوؤں میں چھپالیا۔ تاؤ حشام کی پھنکار اس کے کانوں میں گونجی ''حرامزادی! تو نے حویلی کو ساڑا تھا۔ تیرے ایک ایک انگ کو علیحدہ علیحدہ آگ لگاؤں گا۔ تو دیکھتی رہ کرتا کیا کیا ہوں تیرے ساتھ۔'' پھر تاؤ اپنے بیٹے کو مخاطب کر کے کمال بے باکی سے بولا ''اوئے رجا! یہ بن بیاہی زنانی ہے تیری۔ میری بات سمجھ رہا ہے ناں تو؟''

راجو نے اثبات میں سر ہلایا

''کوئی آکڑ شاکڑ تو نہیں دکھاتی تجھے؟'' راجو نے نفی میں سر ہلایا۔ تاؤ شانی کو سنانے کے لیے بلند آواز میں بولا ''اگر آکڑ دکھائے تو بتانا مجھے۔ اسے باغ والے ڈیرے پر بھیج دوں گا۔ پندرہ دی ڈشکروں کی روٹی شوٹی پکائے گی تو مت ٹھکانے آجائے گی اس کی'' تاؤ نے ''روٹی شوٹی'' معنی خیز لہجے میں کہا تھا۔

تین چار منٹ تک شانی کو سب کے سامنے ذلیل کرنے کے بعد تاؤ حشام، بیٹے کے ساتھ اوپر چوبارے کی طرف چلا گیا۔ قادرا اور بابر بھی اس کے ساتھ تھے۔ چوبارے پر تین چار فٹ اونچی پکی منڈیر تھی۔ اس منڈیر میں رخنے سے بنے ہوئے تھے، جیسے قبائلی علاقے کے مکانوں میں اکثر نظر آتے ہیں۔ ایسے رخنے کسی ہنگامی صورتِ حال میں مورچا بند اور فائرنگ کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ پنجاب کے جن دیہات میں شانی گھومی تھی۔ وہاں اس قسم کا منظر اسے کہیں دکھائی نہیں دیا تھا۔

تاؤ حشام، قادرا اور بابر وغیرہ چوبارے کی چھت کا جائزہ لینے لگے۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے آنے والے دنوں میں انہیں کسی طرح کا خطرہ لاحق ہے۔ پتا نہیں کیوں شانی کا دھیان اپنے میکے کی طرف اور اپنے بچھڑے ہوئے پیاروں کی طرف چلا گیا۔ کیا وہ اسے تلاش کر رہے تھے؟ اگر کر رہے تھے تو کس شدت سے کر رہے تھے؟ چوہدری بشیر کے درجنوں چچیرے، ممیرے اور خلیرے بھائیوں کی حویلیوں میں سے وہ مطلوبہ حویلی کیسے ڈھونڈ سکتے تھے۔ ایسے اور اس طرح کے بے شمار سوالات شانی کے ذہن میں کلبلانے لگے۔

ایک دو بار اس کی نگاہ بابر کی نگاہ سے بھی ٹکرائی۔ تاہم بابر کا چہرہ سپاٹ رہا اور اس کی نگاہ میں بھی کسی طرح کا کوئی تاثر نہیں ابھرا۔ کچھ دیر بعد وہ لوگ واپس چلے گئے۔ شانی کمرے میں گھس کر کچھ دیر تک آنسو بہاتی رہی پھر سنبھل گئی۔ یوں لگتا تھا کہ اب تکلیف اور شرمساری کے احساسات اس پر تادیر اثر نہیں کرتے۔ تاؤ وغیرہ کے جانے کے تھوڑی ہی دیر بعد شانی کو ایک صورت نظر آئی اور اس کے بجھے ہوئے دل میں ہلکی سی لہر پیدا ہوئی۔ یہ ڈولا تھا۔ آج کئی دنوں بعد اس کی صورت دکھائی دی تھی۔ اب وہ زنانہ کپڑوں میں نہیں تھا۔ اس نے اپنی وہی پہلے والی بوسیدہ پتلون اور کوٹ پہن رکھا تھا۔ اس نے بتایا کہ دو ملازموں کے نہ آنے کی وجہ سے اسے دو تین روز کے لیے یہاں بھیجا گیا ہے۔ اپنی خوش طبعی کے برعکس وہ کافی سنجیدہ دکھائی دیتا تھا۔ چہرہ بھی مرجھایا ہوا تھا۔ ظاہر تھا کہ قید و بند کی طوالت اس پر اثر انداز ہو رہی تھی۔ اسے واپسی کی کوئی راہ نظر نہیں آتی تھی اور مستقبل بھی مخدوش تھا۔

شام کے بعد کھانے کے وقت شانی کھانے کی چنگیر اپنے سامنے رکھ کر بیٹھی رہی۔ اس کا ایک لقمہ اٹھانے کو دل نہیں چاہتا تھا..... اور یہ کوئی آج کی بات نہیں تھی روزانہ ہی ایسا ہو رہا تھا۔ وہ چنگیر سامنے رکھ کر بیٹھی رہتی۔ آنسو اس کے حلق میں گرتے رہتے۔ اسے رستم کی حالتِ زار یاد آتی اور اس کے کھانے کا منظر اس کی نگاہوں کے سامنے گھومتا۔ اس کا دل سو ٹکڑوں میں تقسیم ہو جاتا۔ وہ رستم تک پہنچنے اور کسی طرح اس کی مدد کرنے کے حیلے سوچتی رہی..... آج بھی یہی صورتِ حال تھی۔ ڈولا اپنے مخصوص لہجے میں بولا ''باجی جی! آپ کتنی دیر سے ایک ہی نوالہ ہاتھ میں گھما رہی ہیں۔''

شانی نے جیسے اس کا سوال سنا ہی نہیں۔ کھوئے کھوئے لہجے میں بولی ''ڈولے! رستم کے بارے میں کسی نئی بات کا پتا چلا؟''

ڈولے نے ایک گہری سانس لی اور بولا ''ہاں باجی جی۔''

شانی چونک کر اسے دیکھنے لگی۔ ڈولے نے بھی کھانے کی چنگیر ایک طرف کھسکا دی۔ اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ اس کے پاس کوئی اہم اطلاع ہے۔ اہم اور گمبھیر۔ شانی کا دل تیز رفتار سے دھڑکنے لگا۔ اسے محسوس ہوا کہ اسے کچھ ہو جائے گا۔ وہ رونے لگے گی یا پھر غش کھا کر گر جائے گی۔ رستم کے حوالے سے پچھلے چند دن شانی نے بڑی تکلیف میں گزارے تھے۔ اس کا خیال ایک لمحے کے لیے بھی اس کے دل سے جدا نہیں ہوا تھا۔ وہ خشک آنکھوں کے ساتھ دن رات روتی رہی تھی۔

ڈولے نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا ''باجی! مجھے پتا ہے کہ یہ لوگ ایک دو دن میں رستم کو پولیس کے حوالے کرنے والے ہیں۔''

''پولیس کے حوالے؟'' شانی نے حیرانی سے کہا۔

''جی ہاں۔ یوں لگتا ہے کہ انہوں نے رستم کے بارے میں پتا چلنے کی ہر حسرت نکال لی ہے۔ اب شاید وہ چاہتے ہیں کہ پولیس بھی کھل کھلا کر اس سے اپنے حساب چکا لے۔ پتا ہے کہ پولیس کے ساتھ رستم کا پرانا ناکرا تھا۔ چند سال پہلے بھی پنڈی کے قریب رستم نے پولیس کی ایک پارٹی کو زخمی کر مارا پیٹا تھا۔ اس لڑائی میں زخمی ہونے والا ایک پولیس اہلکار دو ہفتے پہلے ہی اسپتال میں مرا ہے۔ اخباروں میں اس خبر کا چرچا ہوا ہے اور اس کے ساتھ ہی رستم کے خلاف قتل کا تازہ مقدمہ بھی درج ہوا ہے۔ میرے اندازے کے مطابق، چوہدری یہ بات بڑی اچھی طرح جانتے ہیں کہ رستم کسی بھی صورت پھانسی سے بچ نہیں سکتا۔ اسی لیے اب انہیں قانون کی باتیں یاد آرہی ہیں۔''

''تمہیں یہ سب کچھ کیسے پتا چلا ہے؟''

''یہ ساری باتیں دو دن پہلے حویلی کے بڑے کمرے میں ہوئی ہیں۔ چھ سات بڑے بڑے چوہدری وہاں موجود تھے۔ تاؤ حشام اور قادرا وغیرہ بھی تھے۔ ان کی باتوں سے محسوس ہوتا ہے کہ رستم کے ساتھی اور دوست اسے بڑے زور شور سے تلاش کر رہے ہیں۔ لاہور اور نارپور میں چوہدریوں کے ٹھکانوں کی ایک دو جھڑپیں بھی ہوئیں ہیں جن میں تین آدمی زخمی ہوئے ہیں۔'' ڈولے نے ایک لمحہ توقف کرنے کے بعد پوچھا۔ ''باجی جی! رستم کا کوئی دوست ''زوار'' نام کا بھی ہے؟''

''ہاں۔ ہے تو'' شانی نے کہا۔

''چوہدریوں کی باتوں سے پتا چلتا ہے کہ یہی دوست رستم کو پناہ دے کر بھاگ دوڑ کر رہا ہے۔ وہ کافی اثر رسوخ والا ہے۔ رستم کی تلاش میں بھی کسی سے پیچھے نہیں ہے۔ شاید چوہدریوں کو شک پڑ گیا ہے کہ رستم کے تجن دوست یہاں تک پہنچ جائیں گے اس لیے وہ فٹافٹ رستم کو پکڑوا دینا چاہ رہے ہیں۔''

''اور کیا سنا ہے تم نے؟''

ڈولے کا چہرہ بجھ سا گیا۔ یوں لگا کہ اسے کرب محسوس ہو رہا ہو۔ پہلے تو چپ رہا پھر گہری سانس لے کر بولا ''باجی جی! میرے کانوں تک پہنچا ہے اس سے تو یہ پتا چلتا ہے کہ رستم کو ذلیل کر کے پولیس کے حوالے کیا جائے گا۔ خدشہ ہوگا کہ پورے علاقے میں رستم سیال کی دہشت ہے۔ کچھ عرصہ پہلے تک لوگ اس کے نام سے کانپتے تھے اور بہت سے شاید اب بھی کانپتے ہوں گے۔ چوہدری چاہتے ہیں کہ رستم کی دہشت کی جگہ اب ان کی دہشت قائم ہو۔ وہ رستم کو لوگوں کے سامنے جتنا ذلیل کریں گے ان کی پگڑیوں کے شملے اتنے ہی اونچے ہوں گے.....''

''کیا کریں گے وہ؟'' شانی نے پوچھا۔

''م..... مجھے نہیں پتا جی..... پر بندے کو ذلیل کرنے کے سو طریقے ہوتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ رستم کی گرفتاری کے وقت کوئی ڈراما بھی رچایا جائے۔ یہ بتایا جائے کہ رستم کو عام دیہاتیوں نے پہچانا اور پکڑا..... اور پھر مار مار کر پولیس کے سپرد کر دیا۔'' ڈولے نے چند لمحے توقف کیا، پھر پُرسوچ لہجے میں بولا ''ہو سکتا ہے جی کہ رستم کو جان بوجھ کر بھاگنے کا موقع دیا جائے اور پھر دیہات کے لوگوں سے کہا جائے کہ اسے پکڑ لیں۔''

''پر یہ ساری کی ساری باتیں تم نے سن کیسے لیں؟'' شانی نے پوچھا

ڈولے نے تفصیل سے بتایا کہ کس طرح حویلی کے بڑے کمرے میں چوہدریوں کا اجلاس ہوا تھا اور کس طرح حقوں کی چلمیں وغیرہ بھرنے کے دوران میں اس نے اپنے کان ان کی گفتگو پر لگائے رکھے۔

ڈولا کافی آزردہ دکھائی دیتا تھا اور اس آزردگی کی وجہ یہ گفتگو ہی تھی جو پرسوں رات اس کے کانوں میں پڑی تھی۔ ڈولا شانی کے حوالے سے بھی خاصا دکھی تھا۔ وہ یہاں شانی کی بدتر حالت دیکھ رہا تھا اور دیگر لوگوں کی طرح اس کا خیال بھی یہی تھا کہ شانی چھوٹے مالک کی KEEP کے طور پر رہ رہی ہے۔ شانی نے اس کے خیال کی نفی کی اور اسے تسلی دی۔ شانی کو ڈولے اور اردگرد کے دیگر احوال کی سن گن بھی ملی۔ ڈولے سے اس اطلاع کی تصدیق ہوئی کہ جلالاں اور چوہدری بشیر کے علاوہ بھی کئی لوگ پُراسرار جلدی بیماری کا شکار ہوئے ہیں..... ڈولے کے مطابق، یہ کہا جا رہا تھا کہ بیماری کا شکار ہونے والے لوگ وہی ہیں جو پچھلے ماہ لاہور والی کوٹھی میں حضرت صاحب کے ساتھ ''گستاخی'' کے مرتکب ہوئے تھے۔

اس رات شانی اپنے کمرے میں سو رہی تھی۔ ڈولا کام کاج کے بعد حویلی کے مردانے میں واپس چلا گیا تھا (شانی نے ابھی جان بوجھ کر اسے یہ خبر نہیں سنائی تھی کہ وہ جس لڑکے کی تلاش میں ہے، اس کا کھوج لگ گیا ہے) ایک آہٹ کے سبب شانی کی آنکھ کھلی۔ اس نے لائٹ کا بٹن دبایا مگر روشنی

نہیں ہوئی۔ اسے یاد آیا کہ لائٹ گئی ہوئی ہے اور جنریٹر بھی شام سے خراب ہے۔ سونے سے پہلے اس نے لالٹین کی لو مدھم کر کے اسے بستر کے نیچے کھسکا دیا تھا۔ اس نے لالٹین نکالی۔ کمرے کا جائزہ لیا۔ کھڑکیاں اندر سے بند تھیں، لیکن دروازے کو کنڈی نہیں چڑھائی گئی تھی۔ یہاں رات کو دروازے کی کنڈی اندر سے چڑھانے کی اجازت نہیں تھی۔ بس دروازے کو بھیڑا جا سکتا تھا۔ ساری ملازمائیں ایسا ہی کرتی تھیں..... اکیلی جوان عورت جب اپنی خواب گاہ کو اندر سے کنڈی لگاتی ہے تو ایک طرح سے اپنا اختیار استعمال کرتی ہے..... وہ اختیار جس کا تعلق اس کی عزت و ناموس کی سلامتی سے ہوتا ہے۔ لیکن یہاں تو کسی کو ایسا اختیار حاصل ہی نہیں تھا۔ جو کچھ حاصل تھا چھوٹے مالک کو حاصل تھا..... اور وہ جب اور جس وقت چاہے من مانی کر سکتا تھا۔ لہٰذا یہاں شب و روز دروازے کھلے رہتے تھے اور سروں پر دوپٹہ رکھنے کی ممانعت تھی۔ شانی کو یاد آیا تین دن پہلے دوپہر کے وقت صرف دھوپ سے بچنے کے لیے اس نے سر پر ایک تولیہ رکھا تھا۔ چھید دیجیل کی طرح جھپٹ کر آئی تھی اور تولیہ کھینچ کر دور پھینک دیا تھا۔

یکایک شانی کو اپنے خیال سے چونکنا پڑا۔ آہٹ دوبارہ سنائی دی تھی۔ اس مرتبہ وہ خاصی واضح تھی۔ شانی کے ذہن میں سب سے پہلے یہاں کے ''راجا اندر'' کا خیال ہی آیا۔ کیا وہ اس کے دروازے کے سامنے موجود تھا۔ لیکن اگر یہ وہی تھا تو پھر ایسے یوں دبے پاؤں آنے اور رکے رہنے کی کیا ضرورت تھی؟

اچانک دروازہ کھلا اور وہ اندر آ گیا۔ لیکن وہ چھوٹا مالک نہیں تھا اس کی لمبی چوڑی جسامت ہی بتا دیتی تھی کہ وہ تاؤ کا پتر راجو نہیں ہے۔

''سلاماں لیکم۔'' اس نے اندر آتے ہی آہستگی سے کہا۔ شاید اسے اندیشہ تھا کہ اسے دیکھ کر شانی چلانا ہی شروع نہ کر دے۔

شانی یک ٹک اسے دیکھتی رہی۔ وہ ذرا آگے آیا تو شانی نے دیکھا اس کا چہرہ ایک کالے منڈاسے میں چھپا ہوا ہے۔ وہ نیلے رنگ کی شلوار قمیص میں تھا۔ پاؤں میں گرگابی تھی۔ اندر آتے ہی اس نے دروازے کو بھیڑ دیا تھا۔ اچانک اس نے اپنی قمیص کے نیچے سے پستول نکالا اور شانی کی گردن سے لگا دیا۔ ''اگر آواز نکالو گی تو یہیں پر ڈھیر کر دوں گا۔ ایک سیکنڈ کی دیر نہیں لگاؤں گا'' وہ بے حد کرخت لہجے میں بولا۔

شانی جہاں کی تہاں بیٹھی رہ گئی، ڈھاٹا پوش کے بائیں ہاتھ میں ایک بڑا سا سیاہ کپڑا تھا۔ اس نے کپڑا ایک طرف رکھا اور ہاتھ بڑھا کر لالٹین کی لو کچھ اور مدھم کر دی پھر اس نے سیاہ کپڑے کو پھیلایا اور شانی سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''برقع پہن لو فٹافٹ.....''

''کیوں؟''

''تمہیں میرے ساتھ چلنا ہے'' وہ ایک ایک لفظ چبا چبا کر دے کر بولا۔

''کہاں؟ کون ہو تم؟''

''سوال نہیں کرنے، صرف وہ کرنا ہے جو کہہ رہا ہوں۔'' اس نے پستول بے رحمی سے شانی کی پسلیوں میں چبھویا۔ اس کے لب و لہجے نے شانی کو سمجھا دیا کہ وہ ان لوگوں میں سے جو موقع پڑنے پر ہر حد تک جا سکتے ہیں۔

شانی کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ اگلے ایک منٹ میں وہ سخت کشمکش میں رہی۔ دوسری طرف پستول بردار کا لہجہ خوفناک ہوتا جا رہا تھا۔ شانی کو اپنے ہاتھ برقع کی طرف بڑھانے پڑے۔ اس نے جان بوجھ کر بہت آہستہ آہستہ برقع پہنا۔ ساتھ ساتھ تو اس کا ذہن بھی تیزی سے مصروف تھا۔ اہم ترین سوال یہی تھا کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔

جب وہ برقع پہن کر بٹن وغیرہ بند کر چکی تو پستول بردار کا لہجہ قدرے نرم ہو گیا وہ بولا ''ایک بات ذہن میں رکھو میں تمہارا دشمن نہیں خیر خواہ ہوں، تمہاری مدد کر رہا ہوں۔''

''لیکن.....''

''لیکن ویکن کچھ نہیں..... جو میں کہہ رہا ہوں کرتی جاؤ یہ تمہارے بھلے میں ہے۔''

پتا نہیں کیوں، شانی کو نامعلوم شخص کے لہجے میں خلوص کی جھلک نظر آئی۔ درپیش حالات کے باوجود اسے یقین آ گیا وہ اس کا خیر خواہ ہے۔ اس نے شانی کو چپل پہننے کا حکم دیا۔ دروازہ تھوڑا سا کھول کر باہر برآمدے میں جھانکنے کے بعد اس نے جلدی سے شانی کا بازو پکڑا اور اسے لے کر کمرے سے باہر آ گیا۔ یہ رات کے قریباً بارہ بجے کا وقت تھا۔ جنریٹر بند ہونے کی وجہ سے چاروں طرف تاریکی چھائی تھی۔ بس ادھر چوبارے میں لالٹین یا گیس لیمپ کی مدھم روشنی موجود تھی۔ چھوٹے مالک کے کمرے سے ریڈیو کی مدھم آواز آ رہی تھی۔ یقیناً ٹرانسسٹر ریڈیو نہیں ہوگا۔ جون نغمہ سرا تھا۔ محبت کے دم سے یہ دنیا حسیں ہے۔

محبت نہیں ہے تو کچھ بھی نہیں ہے۔

محبت کا وعدہ وفا کرنے والو

نماز محبت ادا کرنے والو..... چھوٹا مالک جس

کمرے سے گھنگروؤں کی آواز آیا کرتی تھی یا پھر ''سینے نال لا کے نماز ادا کر کے'' جیسے گانے گونجا کرتے تھے، آج ایک درد اور سوز بھرا نغمہ سنائی دے رہا تھا۔ شاید کل رات کے واقعے نے اس کے ذہنی رویے میں مثبت تبدیلی پیدا کی تھی۔ وہ خبیث کی بدبو سے نکل کر ایک بار پھر محبت کی مہک کی طرف رجوع کر رہا تھا۔ بہرحال یہ ایک قیاس تھا۔ اس کے متعلق یقین سے کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا تھا۔

شانی کا ہاتھ بدستور پستول بردار کے ہاتھ میں تھا۔ وہ چوکنی نظروں سے اردگرد دیکھتا ہوا آگے بڑھا اور حویلی کی پچھلی طرف میں پہنچ گیا۔ برقع شانی کے جسم پر قدرے لمبا تھا اور اس طرح سے یہ اچھا ہی ہوا تھا۔ شانی کی کالی دھوتی برقع میں نہ چھپ گئی تھی۔ بصورت دیگر دھوتی پر برقع مضحکہ خیز نظر آتا۔ وہ آگے بڑھے..... دڑبے میں بند کسی مرغ نے بانگ کی اذان دی اور ڈھارے کی طرف ایک چھترے نے اپنے منہ سے ''بھے بھے'' کی سستی بھری آواز نکالی۔ حویلی کے دروازے پر شانی نے ایک حیرت انگیز منظر دیکھا۔ ایک بند بوری کے اندر بے چین حرکت ہو رہی تھی اور اس میں سے کی بہت مدھم آواز سنائی دیتی تھی۔ غالباً کسی کی ہتھکیں کس کے اور اس کا منہ باندھ کر اسے بوری میں بند کر دیا گیا تھا۔ پستول بردار نے بڑی آہستگی سے بوری کا دروازہ کھولا۔ دروازے سے باہر رکھوالی کے دو کتے پڑے تھے۔ ان میں سے ایک گٹھے کے قریب بے سدھ پڑے تھے۔ دوسرے میں تھے کیونکہ ان کے پیٹ کی حرکت سانس کی موجودگی کی نشاندہی کرتی تھی۔ انہیں کچھ کھلا کر بے ہوش کیا گیا تھا۔ یہاں شانی کو دیسی جوتی کا ایک پاؤں اور ایک منظر دکھائی پڑا نظر آیا۔ یہ چیزیں یہاں تھوڑی دیر پہلے کسی کی کشمکش کی نشاندہی کرتی تھیں۔

پستول بردار شانی کو ساتھ لیے ایک بند ٹریکٹر کے پاس سے ذرا اور تیزی سے مکئی کے ایک کھیت میں گھس گیا۔ شانی کو اپنے ساتھ کھینچتا جا رہا تھا..... گاہے بگاہے وہ آہستہ سے بول اٹھتا۔ ''گھبراؤ مت۔ چلتی جاؤ'' بھرا ہوا پستول اس کے ہاتھ میں تھا۔

رات تاریک اور نیم خنک رات تھی۔ آسمان پر بادلوں کے ٹکڑے تھے جن کے سبب تاروں کی روشنی بھی وقفے سے ماند پڑ جاتی تھی۔ ایک ٹیڑھی میڑھی پگڈنڈی پر چلتے ہوئے وہ تیزی سے فریما ایک فرلانگ دور آ گئے۔ گاؤں کا خیال ان کے دائیں جانب تھے۔ کھیتوں کے درمیان انہیں تھوڑی سی جگہ خالی نظر آئی۔ یہاں سے شالا وغیرہ کاٹا گیا تھا۔ یہاں شانی کو دو سائے دکھائی دیے۔ ان کے پاس ہی ایک دیہاتی تانگا کھڑا تھا۔ قریب پہنچ کر شانی کو پتا چلا کہ جو دو سائے کھڑے ہیں ان میں سے ایک مرد اور ایک عورت ہے۔ عورت نے ٹوپی والا دیسی برقع پہن رکھا تھا۔ مرد کی عمر باسٹھ چوبیس سال ہوگی۔ وہ اپنے لباس اور حلیے سے کوچوان دکھائی دیتا تھا۔

اسی دوران میں ایک تیسرا سایہ نگاہ شخص مکئی کے پودوں کی اوٹ سے نکل آیا۔ پستول بردار کی طرح اس کے چہرے پر بھی سیاہ ڈھاٹا تھا۔ اسے دیکھ کر پستول بردار نے کہا۔

''لو جی! آپ کا کام ہو گیا ہے۔''

کوچوان نے شانی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ''چلو بھین جی (بہن جی) بیٹھ جاؤ'' کافی عرصے بعد شانی نے اپنے لیے ''بھین جی'' کا لفظ سنا تھا۔ سخت پریشانی اور غیر یقینی کیفیت کے باوجود اسے یہ لفظ اچھا لگا اسی دوران میں ''دیہاتی آسمان'' سے بدلیاں ہٹ گئیں اور تاروں کی نمایاں روشنی قرب و جوار کا منظر اجاگر کرنے لگی..... شانی نے نئے آنے والے ڈھاٹا پوش کو دیکھا۔ اس کی فقط آنکھیں نظر آ رہی تھیں پتا نہیں کیوں شانی کو یہ آنکھیں بری نہیں لگیں۔

پستول بردار کا لہجہ بھی اب بہت نرم اور ہمدردانہ تھا۔ اس نے شانی کو بازو سے پکڑ کر تانگے پر بٹھایا اور بولا ''فکر نہیں کرنا۔ میں بھی تانگے کے پیچھے آؤں گا۔ چاننی ہونے سے پہلے ہم تمہیں محفوظ جگہ پر پہنچا دیں گے۔''

شانی حیرت سے ان نامعلوم دیہاتیوں کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس نے کہیں سن رکھا تھا کہ جب بندے کی مصیبتیں حد سے بڑھ جاتی ہیں اور خلاصی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تو آسمان سے فرشتے اترتے ہیں..... کیا آج رات بھی اس کام کے لیے کوئی فرشتہ یا فرشتے اترے تھے۔ یا پھر یہ بھی انسان ہی تھے۔ انسان جو کسی وقت کچھ بھی کر سکتے ہیں، کئی روپ بدل سکتے ہیں۔ کوچوان نما شخص کی آواز نے شانی کو ایک بار پھر چونکایا ''بھین جی! بیٹھ جاؤ تانگے پر۔''

ایک لفظ کے لیے شانی کے دل میں آیا کہ وہ تانگے کی طرف قدم بڑھائے مگر پھر اگلے ہی لمحے رستم کا خیال بے پناہ شدت کے ساتھ اس کے ذہن میں آ سمایا..... وہ یہاں اس چار دیواری میں موجود تھا اور بے پناہ اذیتیں جھیل رہا تھا۔ اس کی یہاں موجودگی کی وجہ بھی وہ خود ہی تھی۔ تو کیا وہ اسے یہاں چھوڑ کر چلی جائے؟ یہ کیسے ہو سکتا تھا۔ رستم کا غم طوفانی لہروں کی طرح اس کے دل و دماغ سے ٹکرایا اور اس کی ہستی کو تہ و بالا کر گیا۔ اس کے پاؤں مکئی کے اس کھیت میں جم کر رہ

گئے..... کل رات وہ دیر تک سوچتی رہی تھی کہ رستم تک کیسے پہنچ سکتی ہے۔ اس حوالے سے اس کے ذہن میں ایک موہوم سا نقشہ بھی بنا تھا، لیکن آج رات سب کچھ الٹ پلٹ ہو گیا تھا۔

اس مرتبہ پستول بردار نے ذرا کڑے لہجے میں کہا "دیکھو، ہمارے پاس زیادہ ٹائم نہیں ہے۔ کسی وقت کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ تم جلدی سے تانگے میں بیٹھ جاؤ۔"

فیصلہ بہت مشکل تھا لیکن اسے لمحوں میں کرنا ضروری تھا۔ اگر ان لوگوں کی کوشش سے شانی واقعی آزاد ہو جاتی تو وہ رستم کی آزادی کے لیے بہت کچھ کر سکتی تھی۔ وہ زوار اور شیری تک پہنچ کر انہیں ساری صورتِ حال سے آگاہ کر سکتی تھی۔ اس کے علاوہ اسے معلوم تھا کہ ایک بڑا پولیس افسر حاجی حیات خان، رستم کے گہرے دوستوں میں سے ہے۔ چند ہی لمحے میں درجنوں خیالات اس کے ذہن میں آئے اور چلے گئے۔ ایک گہری سانس لے کر اس نے اپنے قدم تانگے کی طرف بڑھا دیے۔

برقع پوش عورت شانی کے ساتھ تانگے کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ کوچوان جو تنومند شخص تھا، اگلی سیٹ پر آ گیا۔ کچھ دیر بعد تانگا ایک ہچکولے کے ساتھ حرکت میں آ گیا۔ دونوں ڈھاٹا پوش افراد تیزی سے کمی کے پانچ فٹ اونچے پودوں کے پیچھے اوجھل ہو گئے۔ گاؤں کی طرف سے برسٹ چلنے کی آواز آئی، لیکن خطرے کی بات نہیں تھی، یہ معمول کا برسٹ تھا۔

..... ایک سخت ناہموار کچے راستے پر چلنے کے بعد تانگا ایک نہر کی پٹری پر آ گیا یہ پٹری بھی خاصی ناہموار تھی تاہم کچے راستے سے بہتر ہی تھی۔ کھیتوں میں کہیں کہیں ٹریکٹر یا ٹیوب ویل چلنے کی مدھم آواز سنائی دیتی تھی۔ قرب و جوار گہری تاریکی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ وہ تینوں مکمل خاموشی کے ساتھ سفر کر رہے تھے۔ برقع پوش عورت نے تو ایک بار بھی زبان نہیں کھولی تھی۔ پستول بردار نے شانی سے کہا تھا کہ وہ بھی تانگے کے پیچھے پیچھے آ رہا ہے، لیکن عملی طور پر ایسا ہوا نہیں تھا۔ تانگے کے پیچھے دور دور تک کسی کے آنے کے آثار نہیں تھے۔ غالباً پستول بردار نے صرف شانی کی تسلی کے لیے ایسا کہا تھا۔

گمبھیر خاموشی کو توڑنے کے لیے شانی نے کوچوان سے پوچھا۔ "ہم کہاں جا رہے ہیں بھائی؟"

"بھین جی! ابھی تھوڑی دیر میں آپ کو سب کچھ پتا چل جائے گا۔ آپ بالکل پریشان نہ ہوں۔" اس کے لہجے میں ٹھہراؤ تھا تاہم اس ٹھہراؤ کی تہ میں پریشانی کی لہر بھی محسوس ہوتی تھی۔

گھوڑے کو اونچے نیچے راستے پر ہانکتے ہوئے کوچوان گاہے بگاہے عقب میں بھی دیکھ لیتا تھا۔ جیسے اسے تعاقب کا اندیشہ ہو۔ یہی اندیشہ شانی کے ذہن میں بھی بدرجہ اتم موجود تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے بار بار "کوچوان کتوں" کے بے سدھ جسم آ جاتے تھے اور حرکت کرتی ہوئی بند بوری تصور میں نمایاں ہو جاتی تھی۔

برقع پوش عورت بالکل گم صم بیٹھی تھی۔ شانی کو چوبیس سے اس کے بارے میں پوچھنا ہی چاہتی تھی کہ ایک آواز نے ان تینوں کو بری طرح چونکا دیا، "ٹھہر دھیئے" یہ خاص طرح کی آواز تھی اور کیکر کے درختوں میں سے آئی تھی۔ کوچوان نے منہ سے بچ بچ کی آواز نکال کر تانگا روک دیا۔ شانی نے برقع کی اوٹ سے دیکھا، ایک ہٹا کٹا گنجا پولیس والا توند مٹکاتا تانگے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کے عقب میں چھریرے جسم کا سنتری تھا۔ کیکر کے درختوں میں پوتھین کی بنی ہوئی ایک جھونپڑی سی نظر آ رہی تھی۔ جھونپڑی کے سامنے پولیس کی نیلی پلیٹ والی ایک کھٹارا و بدحال موٹر سائیکل کھڑی تھی۔ موٹر سائیکل کے کیریئر پر سبز لہسن کا ایک بڑا گٹھا اور گنے کے گٹھے بندھے ہوئے تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ چیزیں کسی غریب کاشت کار نے نذرانے کے طور پر پولیس والوں کو دی ہوں گی۔

گنجے پولیس والے نے جو اپنے کندھے کے پھول سے اے ایس آئی ظاہر کرتا تھا، گرج کر کوچوان سے پوچھا "کہاں جا رہے ہو بھئی..... خیر سے؟"

کوچوان شاید اس سوال کے لیے پہلے سے تیار تھا۔ اس نے نیچے اتر کر غمزدہ آواز میں کہا "میری سس فوت ہو گئی جی۔ ابھی ایک گھنٹا پہلے اطلاع آئی ہے۔ بالکل بھلی چنگی تھی۔ ہمیں تو یقین نہیں آ رہا جی۔"

"کہاں جانا ہے خیر سے؟" تھانیدار نے ذرا غرا کر ہوئے کہا۔

"ٹالی پور جناب۔"

"یہ ساتھ کون ہے خیر سے؟" لگتا تھا کہ "خیر سے" تھانیدار کا تکیہ کلام تھا کوچوان نے بدستور غمزدہ آواز میں کہا

"یہ سفید برقع والی میری بڈی (بیوی) ہے۔ دوسری اس کی بھین ہے۔ ہمارے گھر رہنے آئی ہوئی تھی۔"

"میانہ سے آئے ہو؟" تھانیدار نے درست تلفظ لگاتے ہوئے پوچھا۔

"جی مائی باپ۔"

تھانیدار اور اس کے ماتحت نے ایک بار پھر

شانی کے کالے برقع اور دوسری عورت کے سفید برقع کو دیکھا اور پھر ایک دو قدم پیچھے ہٹ گئے غالباً وہ انہیں جانے کی اجازت دینے کا ارادہ رکھتے تھے۔ لیکن..... اسی لمحے میں ایک اور شخص پوتھین کی جھونپڑی میں سے نکلا۔ وہ عام دیہاتی لباس میں تھا اس نے اپنی چھوٹی چھوٹی داڑھی اور سر کے بالوں کو مہندی لگا رکھی تھی۔ شانی نے محسوس کیا کہ اس شخص کو اپنی طرف آتے دیکھ کر کوچوان ایکدم بے چین ہو گیا ہے۔

داڑھی والے کے ہاتھ میں ٹارچ تھی اور وہ ذرا ڈگمگاتا ہوا تانگے کی طرف آیا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ وہ گہری نیند سے بیدار ہوا ہے۔ اس نے آنکھیں سکیڑ کر دھیان سے کوچوان کو دیکھا اور بولا "اوئے صدیق، تو یہاں کیسے؟"

"مم..... میری سس فوت ہو گئی ہے چاچا کرامت....."

"اوہو" چاچا کرامت نے ہونٹ سکیڑے، پھر اس کا دھیان پیچھے گیا اس نے پوچھا "یہ ساتھ کون کون ہے؟"

کوچوان صدیق کے بجائے تھانیدار نے کہا "اک اس کی گھر والی ہے خیر سے۔ دوسری گھر والی کی بھین ہے۔"

چاچا کرامت جس کے طور اطوار پولیس کے مخبروں جیسے تھے ٹارچ کی روشنی ایک ساتھ سفید اور کالے برقع پر ڈالتے ہوئے بولا "اوئے یہ تیری گھر والی نے برقع کب سے لینا شروع کر دیا ہے؟"

"بک..... کبھی کبھی لے لیتی ہے۔" صدیق نے کہا۔

چاچا کرامت جیسے چونک سا گیا۔ وہ گھوم کر تانگے کے پچھلے حصے کی طرف آ گیا۔ اس نے ٹارچ کی روشنی سفید برقع پر ڈالی اور بولا "کڑیے! کیا ہوا تمہاں جی کو؟"

برقع کی رگوں میں سنسناہٹ دوڑنے لگی۔ معاملہ خراب ہو رہا تھا۔

"اوئے تو بولتی کیوں نہیں۔" اس مرتبہ تھانیدار نے کہا۔

یہ وقت تھا جب شانی کی نگاہ عقب میں، دور مکئی کھاد کے کھیتوں کی طرف گئی۔ کیکر اور شیشم کے درختوں کے پیچھے روشنیاں چمکتی نظر آ رہی تھیں۔ یہ متحرک روشنیاں تھیں جو کسی جانب سے آگے بڑھ رہی تھیں جہاں سے وہ تینوں آئے تھے۔ شانی کے دل نے پکار کر کہا کہ تاؤ حشام کو حویلی سے نکل جانے کی خبر ہو گئی ہے۔ اس کا دل سینے میں دھڑکنے لگا۔ اسی دوران میں شاید کوچوان صدیق نے بھی متحرک روشنیاں دیکھ لی تھیں۔ اس کی حرکات و سکنات پہلے سے زیادہ اضطراب آ گیا۔ گنجا تھانیدار تیزی سے آگے بڑھا، اس نے اپنا ہاتھ سفید برقع کی طرف بڑھایا، اس سے پہلے کہ اس کا ہاتھ برقع تک پہنچتا، برقع میں تیز حرکت پیدا ہوئی۔ برقع میں چھپے ہوئے شخص نے اپنی ٹانگ کی بھرپور ضرب تھانیدار کے سینے پر لگائی، اس کے ہونٹوں سے ادغ کی کربناک آواز نکلی اور وہ اپنی توند سمیت پٹری پر گرا۔ برقع پوش کے دونوں ہاتھوں میں لمبی نال کا ماؤزر دبا ہوا تھا۔ تھانیدار کو زمین بوس کرنے کے بعد اس نے بے دریغ "چاچا کرامت" کی ٹانگوں پر فائر مارا۔ وہ چیخ کر دائیں پہلو پر گر گیا۔ اس دوران میں سنتری نے کندھے سے اپنی تھری ناٹ تھری رائفل اتارنا چاہی تھی کہ کوچوان صدیق نے اسے اپنے جن چھپے میں لے کر..... اور گھما کر تانگے کی "بم" سے مارا اور رائفل اس کے سوکھے سڑے ہاتھوں سے چھین لی۔ تھانیدار ابھی تک زمین پر گرا ہوا تھا برقع والے شخص نے اسے ڈرانے کے لیے اس کے قریب زمین پر فائر کیے..... ساتھ ہی گالیوں کی بوچھاڑ کر دی۔ تھانیدار بدحواسی میں اٹھ کر پٹری سے نیچے اتر گیا۔ برقع پوش نے پھرتی کے ساتھ تانگے سے اتر کر موٹر سائیکل کی چابی اگنیشن میں سے کھینچ لی اور واپس تانگے میں آ بیٹھا اس کا چہرہ ابھی تک برقع میں چھپا ہوا تھا۔ وہ درمیانے قد کاٹھ کا سخت جان اور پھرتیلا شخص لگتا تھا۔ کوچوان صدیق پہلے ہی اپنی نشست سنبھال چکا تھا۔ اس نے چخ چخ کی آواز نکال کر چابک ہوا میں لہرایا اور گھوڑے کو دوڑا دیا۔ کرامت نامی شخص وہیں پٹری کی مٹی میں لوٹ پوٹ ہو رہا تھا۔ اس کے لباس کے کسی حصے سے دیسی شراب کی کپی نکل کر زمین پر لڑھک گئی تھی۔

اونچی نیچی پٹری پر تانگا دو دفعہ اچھلتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ برقع پوش نے اپنا برقع چہرے سے ہٹا کر سر پر رکھ لیا۔ وہ نہایت چوڑے جبڑوں اور عقابی آنکھوں والا ایک اٹھائیس تیس سالہ شخص تھا۔ چہرے پر زخموں کے چھوٹے بڑے نشان اس کے جنگجوانہ طبیعت کو ظاہر کرتے تھے۔ اس نے ماؤزر میں کچھ مزید گولیاں بھریں اور شانی کو تسلی تشفی دی۔

فاصلے پر حرکت کرنے والی روشنیاں مسلسل دکھائی دے رہی تھیں۔ ان کی صحیح تعداد کا اندازہ لگانا مشکل تھا اور نہ ہی ان کی نوعیت کے بارے میں قیاس کیا جا سکتا تھا۔ یہ دور دراز دیہاتی علاقہ تھا۔ تاؤ حشام کی حویلی میں بس ایک دو گاڑیاں ہی تھیں۔ زیادہ تر آمد و رفت ٹریکٹر ٹرالیوں اور گھوڑوں پر ہی ہوتی تھی۔ اگلے پانچ دس منٹ میں صورتِ حال کافی حد تک تبدیل ہو گئی۔ متحرک روشنیاں تیزی سے قریب آ رہی تھیں۔ اب سرد ہوا کی لہروں پر کبھی کبھی کسی انجن کی مدھم آواز بھی

سنائی دے جاتی تھی۔ پہلے یہ روشنیاں منتشر سی تھیں اور غالباً ان کی رفتار بھی کم تھی۔ مگر اب وہ ایک قطار میں آ رہی تھیں اور ان کا رخ سیدھا تانگے ہی کی جانب تھا۔ اس سے قیاس کیا جا سکتا تھا کہ پیچھے آنے والوں کو گنجے پولیس والے اور اس کے ماتحت کی معاونت بھی حاصل ہو گئی ہے۔ برقع والے شخص نے جب دیکھا کہ صورتِ حال مخدوش ہو رہی ہے تو وہ کوچوان صدیق سے مخاطب ہو کر بولا ''صدیق! اس طرح چلتے رہے تو پکڑیں جائیں گے۔ تم تانگا آبادی کی طرف موڑ دو۔''

''پر یہاں تو مڑنے کا رستہ بھی نہیں ہے۔'' صدیق بولا۔

''کوئی بات نہیں تم تانگا کھیتوں میں اتارو۔ رستہ نکل آئے گا'' برقع پوش نے مضبوط لہجے میں کہا۔

تانگہ پہلے خطرناک زاویے سے آگے کو جھکا پھر سبزی کے کھیتوں میں اتر گیا..... یہ سفر پہلے سے بھی دشوار ثابت ہوا۔ صدیق اور برقع پوش کو گاہے بگاہے اتر کر تانگے کو کھڈوں میں سے کھینچنا پڑ رہا تھا۔ دوسری طرف متحرک روشنیاں قریب تر آتی چلی جا رہی تھیں۔ یہ دو جیپس تھیں۔ ایک دو موٹر سائیکل تھیں۔ جو چار روشنیاں خاصے فاصلے پر تھیں وہ شاید ٹریکٹر ٹرالیوں کی تھیں۔ موٹر سائیکل زیادہ تیزی سے قریب پہنچ رہے تھے۔ پھر شانی کو رائفل کے فائر سنائی دیے۔ روشنیوں کے رخ اور فائرنگ سے اندازہ ہوتا تھا کہ پیچھے آنے والوں نے تانگے کو نہر کی پٹری سے اترتے دیکھ لیا ہے۔ اب تصادم کے امکانات بڑھ گئے تھے۔

جونہی راستہ ہموار ملا کوچوان صدیق نے تانگے کی رفتار بڑھا دی۔ گھوڑا سخت ہانپا ہوا تھا۔ پھر بھی اس نے مالک کے اشارے پر پوری جان لگا دی۔ سامنے ہی آبادی کے آثار نظر آ رہے تھے۔ ایک مسجد کے بلند مینار تاروں بھرے آسمان کے پیش منظر میں نمایاں دکھائی دے رہے تھے۔ ''میرا خیال ہے کہ تانگا چھوڑ دیں۔'' برقع پوش نے ہیجانی لہجے میں کہا۔

کوچوان صدیق نے سر ہلا کر تائید کی۔ انہوں نے تانگا روکا اور نیچے اتر آئے۔ کوچوان صدیق نے گھوڑے کی راسیں خاص طریقے سے گھوڑے کے عقبی تختے سے باندھ دیں۔ اس کے بعد اس نے چابک ہلا کر منہ سے لخ لخ کی آواز نکالی۔ گھوڑا ایک بار پھر ہموار راستے پر بھاگنا شروع ہو گیا۔ یہ راستہ آبادی کے پہلو کو چھوتا ہوا آگے نکل جاتا تھا۔ گھوڑے کے بھاگنے سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ اسی طرح خالی تانگے کے ساتھ کافی دور تک جائے گا۔ کوچوان صدیق اور برقع پوش شخص شانی کو لے کر تیزی سے آبادی میں داخل ہوئے۔ آبادی میں داخل ہونے سے پہلے برقع پوش نے تھانیدار کی موٹر سائیکل کی چابی چارے کے کھیتوں میں پھینک دی تھی اور برقع اتار کر بغل میں دبا لیا تھا۔ ماؤزر بدستور اس کے ہاتھ میں تھا۔ برقع پوش کے انداز سے عیاں تھا کہ اسے گاؤں میں اپنی منزل کا پتا ہے۔ رات کے اس آخری پہر گاؤں کی گلیاں یکسر سنسان تھیں۔ بس کہیں کہیں ٹھٹھرے ہوئے آوارہ کتوں اور بلیوں کی جھلک نظر آتی تھی۔ وہ ایک گلی میں بندھے ہوئے دو گدھوں کے قریب سے گزرے۔ سردی سے بچاؤ کے لیے ان کی پشت پر بوریے باندھ دیے گئے تھے۔ رات کے اس پہر ہر خوابیدہ شے کی طرح جانور بھی نیند یا گہرے مراقبے میں دکھائی دیتے تھے۔ ایک تنگ سی گلی میں بہت سے چھوٹے چھوٹے شامیانے لگے تھے۔ یہ میلوں ٹھیلوں میں لگائی جانے والی عارضی دکانیں تھیں۔ یہ دکانیں بھی گہری تاریکی اور خاموشی میں غرق تھیں۔ اس گلی سے گزرنے کے فوراً بعد برقع پوش ایک بند دروازے کے سامنے ٹھہر گیا۔ اس نے دروازے پر زور سے دستک دی اور پکار کر بولا ''جبرو! دروازہ کھول..... جلدی کر جبرو دروازہ کھول۔''

اس نے تین چار بار زور سے دستک دی۔ اندر لالٹین کی روشنی چمکی، پھر کھٹ پھٹ کی آوازیں آئیں اور دروازہ کھل گیا۔ لمبے قد اور لمبے بالوں والا ایک کالا سا شخص سامنے کھڑا تھا۔ برقع پوش کو دیکھ کر وہ بولا ''بادشاہ تم؟''

''اوہاں۔ پیچھے ہٹ۔'' برقع پوش نے جھنجلائے ہوئے لہجے میں کہا اور شانی کے ساتھ اندر چلا گیا۔

اس نیم پختہ مکان میں اوپر نیچے تین چار کمرے تھے۔ برقع پوش جسے بادشاہ کہا گیا تھا، شانی اور کوچوان صدیق کے ساتھ بالائی کمرے میں چلا گیا۔ یہاں شانی کو بھرے بھرے جسم والی ایک جواں سال لڑکی نظر آئی۔ اس کے بال خاصے لمبے تھے اور وہ نیند سے بیدار ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ ایک ادھیڑ عمر عورت بھی تھی۔ کمرے میں کھنگروؤں کے جوڑے، طبلے اور سارنگی وغیرہ دیکھ کر شانی کو پتا چل گیا کہ یہ ناچنے گانے والے لوگ ہیں، ادھیڑ عمر عورت غالباً نائیکا تھی۔ کان رنگت والے جبرو کے چہرے پر چیچک کے بے شمار داغ تھے اور وہ صورت سے ہی دلال قسم کی شے نظر آتا تھا اندازہ ہوتا تھا کہ برقع پوش بادشاہ اور لمبے بالوں والی لڑکی میں پرانی شناسائی ہے۔ بادشاہ نے مختصر الفاظ میں دونوں عورتوں کو بتایا کہ کچھ لوگ ان کے پیچھے لگے ہوئے ہیں اور انہیں فوری طور پر پناہ کی ضرورت ہے۔

لمبے بالوں والی تیز طرار لڑکی نے زیادہ سوال جواب کیے بغیر شانی، بادشاہ اور کوچوان صدیق کو ایک پچھلے کمرے میں پہنچا دیا۔ دروازے کو باہر سے تالا چڑھا دیا۔ باقی دروازے بھی بند کر دیے اور لالٹینیں وغیرہ بجھا دیں۔

چار پانچ منٹ اسی طرح گزرے..... اور پھر وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ اس گاؤں کی سوئی ہوئی پُرسکون آبادی دیکھتے ہی دیکھتے ہلچل کا شکار ہو گئی۔ دو تین گاڑیاں، ایک دو موٹر سائیکل اور کئی گھڑ سوار شور مچاتے گاؤں میں گھس آئے۔ ان کے بلند للکارے اور آوازے گاؤں کے ایک کونے سے دوسرے تک گونجنے لگے۔ گھروں کے دروازے کھٹکھٹائے جانے لگے۔ لالٹینیں وغیرہ روشن ہونے لگیں۔ قریبی گلی سے چند گھڑ سوار تیزی سے گھوڑے دوڑاتے اور باتیں کرتے گزر گئے۔ ایک دو قہقہے شانی اور بادشاہ کے کانوں میں بھی پڑے۔

ایک بھاری آواز نے گالی دیتے ہوئے کہا ''وہ..... پنڈ کے اندر ہی ہیں۔ تاؤ کو قبرستان والے رستے پر ناکا لگا دینا چاہیے۔''

''آگے، ماں کے سر میں جائیں گے، ڈیک نالے میں پکا بھلا پانی ہے۔''

رات کا باقی حصہ خاصی سنسنی اور افراتفری میں گزرا۔ گاؤں کی پوری آبادی ہی جیسے جاگ پڑی تھی۔ پتا چل رہا تھا کہ تاؤ حشام کے کارندے گھروں کی تلاش لے رہے ہیں۔ مشکوک لوگوں کے ساتھ گالم گلوچ بھی کر رہے تھے۔ گاؤں کے پرلے کنارے سے ایک دو بار فائرنگ کی آوازیں بھی آئیں۔ بہرحال غنیمت تھا کہ وہ لوگ اس مکان تک نہیں پہنچے۔ جب دن چڑھ گیا تو قدرے سکون محسوس ہوا۔ لمبے بالوں والی لڑکی کا نام نیناں تھا۔ وہ یہاں بابا گاماں والا کے عرس پر دھمال ڈالنے کے لیے آئی ہوئی تھی۔ وہ ایک دیہاتی طوائف تھی اور مقامی بدمعاش، بادشاہ کے ساتھ اس کی جان پہچان حال ہی میں ہوئی تھی۔ کمرے میں نیناں نے بادشاہ کو بتایا کہ جبرو گاؤں سے سن گن لے کر آیا ہے تانگا ڈیک نالے کے پاس ''پرانے پنڈ'' سے ملا ہے۔ چوہدریوں کے ہرکاروں نے وہاں ایک ایک گھر کی تلاشی لی ہے۔ اب زیادہ لوگ نالے کے ساتھ ساتھ اگلے علاقے کی طرف نکل گئے ہیں۔ کچھ ''پرانے پنڈ'' میں ہیں۔ گھوڑے بہت یہاں گاؤں میں ہیں۔ جبرو کے مطابق تانگے والے بھی بھاگنے والوں کو سرگرمی سے تلاش کر رہے تھے۔ لیکن ان کا زور بھی ''پرانے پنڈ'' کی طرف تھا۔

اندازہ ہوتا تھا کہ خطرہ ٹل گیا ہے۔ لیکن ابھی پوری طرح دور نہیں ہوا تھا..... لمبے بالوں والی نیناں نے پچھواڑے والے کمرے کے اندر ہی ان تینوں کے لیے کھانے کا انتظام کیا۔ یہ کھانا حلوہ پوری، دہی کلچے اور چائے پر مشتمل تھا۔ شانی نے بس چند گھونٹ چائے پی۔ اس نے بادشاہ نامی شخص سے کئی بار پوچھا کہ وہ کس کے کہنے پر یہ سب کچھ کر رہا ہے اور کیوں کر رہا ہے؟

وہ ہر بار اس سوال کو ٹال گیا۔ کبھی مسکرا کر، کبھی کوئی دوسری بات شروع کر کے اور کبھی صرف خاموش رہ کر۔ وہ جو کچھ بھی تھا لیکن مضبوط اعصاب کا مالک دکھائی دیتا تھا۔ اس نے چند گھنٹے پہلے ایک شخص کو گولیاں ماری تھیں..... اور پولیس مقابلے کی فضا پیدا کی تھی۔ اس کے باوجود وہ پُرسکون تھا اور ہر قسم کی صورتِ حال کے لیے تیار نظر آتا تھا۔ شانی نے اس سے دوسرا سوال یہ پوچھا کہ وہ اسے کہاں لے جانا چاہتا ہے۔

اس سوال کا جواب بھی بادشاہ نے مبہم انداز میں ہی دیا۔ اس نے کہا کہ وہ اسے کسی ایسی جگہ تک پہنچائے گا جہاں وہ بالکل محفوظ ہو گی اور جہاں چاہے جا سکے گی۔

دن چڑھنے کے بعد شانی نے چوبارے کی ایک کھڑکی سے اردگرد کا منظر وضاحت سے دیکھا۔ وہ حیران رہ گئی۔ یہ آبادی اسے کچھ جانی پہچانی لگ رہی تھی۔ خاص طور پر گاؤں کی مسجد کے مینار اور گاؤں کے وسط میں مزار کا سفید اور سبز گنبد۔ ایک دم اسے پتا چلا کہ یہ کٹھولی گاؤں ہے۔ کٹھولی گاؤں اس کی جنم بھومی رنگ والی سے صرف بارہ تیرہ کوس کے فاصلے پر تھا۔ یہ فاصلہ کم نہیں تھا تو بہت زیادہ بھی نہیں تھا۔ یہ ہوائیں اس کی ''رنگ والی'' کو چھو کر آ رہی تھیں۔ ان جھونکوں میں اس کے کھیتوں کی مہک تھی۔ عین ممکن تھا کہ سامنے اڑتے پرندوں کی ڈار کچھ دیر پہلے اس کے میکے کے اوپر سے گزری ہو۔ اس کی آنکھوں میں نمی تیر گئی۔ اپنے گلی کوچوں سے قریب ہونے کے باوجود کتنی دور تھی وہ۔ وہ نمناک نظروں سے دیکھنے لگی۔ یہ وہی کٹھولی گاؤں تھا جہاں وہ اپنی سہیلی سکینہ کے ساتھ بڑی رازداری کے ساتھ پہنچی تھی۔ اس کے مرحوم بھائی عادل نے لٹھ بازی کے مقابلے میں ہارنے کے بعد چوہدری فاخر کو مزہ چکھانے کا پروگرام بنایا تھا۔ اس کی جان خطرے میں تھی۔ شانی یہاں پہنچی تھی اور چوہدری فاخر کے دوستوں کو خبردار کیا تھا۔ بعد ازاں کٹھولی کے دو بدمعاشوں نے شانی اور سکینہ کو گھیر لیا تھا اور رستم نے بروقت مداخلت کر کے انہیں بچایا تھا۔

یہ سارے مناظر چند سیکنڈ کے اندر شانی کے پردۂ تصور

پر چمک گئے۔ شانی نے چوبارے کی کھڑکی کی درز میں سے دیکھا۔ گاؤں کے اطراف میں اور اطراف کی گلیوں میں بہت سی ''شامیانہ دکانیں'' سجی ہوئی تھیں۔ کھیل تماشوں کے تمبو اور جھولے وغیرہ بھی تھے۔ یقیناً یہ سب میلے کی تیاریاں تھیں۔ شانی کو ایک دو جگہ پولیس والے بھی نظر آئے۔ یقیناً چوہدریوں کے کارندے بھی اپنی شکار کی بو سونگھتے پھر رہے تھے۔

پتا نہیں کیوں رہ رہ کر شانی کے ذہن میں ایک خیال اٹھتا تھا۔ اس کے دل سے آواز آتی تھی کہ اسے تاؤ حشام کی آہنی گرفت سے نکال کر یہاں لانے والا تاؤ حشام ہی کا کوئی بندہ ہے۔ کوئی باہر کا بندہ اتنی بلند دیواروں اور رکاوٹوں کو اتنی آسانی سے نہیں گرا سکتا تھا۔ درجنوں کمروں میں سے سیدھا شانی کے کمرے تک پہنچا، حویلی کے جنریٹر کو بند یا خراب کرنا، پہریداروں کی مشکیں کسنا، کتوں کو بے ہوش کرنا، یہ اور اس جیسے کئی دوسرے کام اسی جانب اشارہ کرتے تھے۔ جب وہ اس انداز میں سوچتی تھی تو آپوں آپ اس کے ذہن میں بابر کا خیال آجاتا تھا۔ اس کا دل گواہی دینے لگتا تھا کہ یہ جو کچھ کیا ہے، اس کل کے دشمن اور آج کے دوست نے کیا ہے۔ شانی نے اس کرخت دشمن کی آنکھوں میں احسان مندی اور وابستگی کی ایک ایسی جھلک دیکھی تھی جس کی گہرائی کو صرف وہی محسوس کر سکتی تھی۔ شانی کی نگاہ میں بار بار اس دوسرے ڈھاٹا پوش (نقاب پوش) کی آنکھیں آجاتی تھیں جو انہیں کل رات مکئی کے کھیت میں تانگے کے پاس ملا تھا۔ عین ممکن تھا کہ وہ آنکھیں، بابر کی ہی ہوں۔ اور عین ممکن تھا کہ اب وہی بابر اپنے بھائی بندوں کے ساتھ مل کر شانی کو ''ڈھونڈ'' بھی رہا ہو۔

رات ہوئی تو شانی کے دل میں عجیب سا مدوجزر پیدا ہونے لگا۔ وہ بہ ظاہر تاؤ حشام کی گرفت سے نکل کر دور آگئی تھی لیکن اس کی ڈوریں ابھی تک وہیں تاؤ کی حویلی سے بندھی ہوئی تھیں۔ یہ ایسی ڈوریں تھیں، جنہیں بڑی سے بڑی زمینی طاقت بھی توڑ نہیں سکتی تھی۔ ان ڈوروں کا تعلق رستم سیال سے تھا۔ رستم سیال جو تاؤ کی حویلی کے ایک تاریک کمرے میں چاول کی چھال پر سراپا زخم اور مجسم حسرت بنا پڑا تھا۔

حویلی کی بات اور تھی۔ وہاں چاروں طرف آہنی دیواریں تھیں اور موت کے پہرے تھے۔ یہاں کٹھولی گاؤں کے اس چوبارے میں بھی وہ گو خطرات کے گھیرے میں تھی لیکن یہ خطرات ایسے تھے کہ ان سے ٹکرا کر راستہ بنایا جا سکتا تھا۔ بادشاہ اور کوچوان صدیق کا خیال تھا کہ انہیں کم ... دو تین دن مزید یہاں رکنا پڑے گا۔ اس کے بعد یہاں سے آگے نکلنے کا سوچا جا سکے گا۔ لیکن شانی میں مزید انتظار کرنے کی سکت نہیں رہی تھی۔ رات کو جب گاؤں کے اس مکان میں سب سو گئے اور قریبی برآمدے میں مالک مکان جبرو کے خراٹے بھی گونجنے لگے تو شانی اوپر کھڑکی میں آبیٹھی اور یہاں سے نکل جانے کے بارے میں سوچنے لگی۔ اس کے کانوں میں ڈولے کے الفاظ گونج رہے تھے۔ ڈولے نے کہا تھا کہ رستم کو بس ایک دو دن میں دلآزار طریقے سے پولیس کے حوالے کیا جا سکتا ہے۔ ڈولے نے یہ بھی بتایا تھا کہ پولیس بے جا سرگرمی سے رستم کو تنگ کر رہی ہے کیونکہ پنڈی میں رستم کے ہاتھوں زخمی ہونے والے پولیس اہلکار نے کئی ماہ تک اسپتال میں زیر علاج رہنے کے بعد دم توڑ دیا ہے۔

رستم کی مدد کے لیے وقت بہت کم تھا۔ شانی کو ہر صورت یہاں سے نکلنا تھا اور کسی طور رستم کے ساتھیوں تک اپنی آواز پہنچانی تھی۔ ضروری نہیں تھا کہ وہ اس کام کے لیے راولپنڈی ہی پہنچے۔ اگر وہ اس دور دراز جگہ سے نکل کر کسی ایسے مقام تک پہنچ جاتی جہاں سے فون کیا جا سکتا تو بھی وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو سکتی تھی۔ وہ جانتی تھی یہاں سے نکلنے میں جان کا شدید خطرہ ہے۔ لیکن یہ جان اور یہ زندگی اسے اتنی عزیز ہرگز نہیں رہی تھی کہ وہ اسے بچانے کے لیے منصوبہ بندیاں کرتی۔ اس کی زندگی اس وقت صرف دو ہستیوں کے گرد گھومتی تھی۔ منا اور رستم ..... اور یہ دونوں ہی لیوا مصیبتوں میں گرفتار تھے۔ منا کسی نامعلوم مقام پر اس کے لیے بلک رہا تھا اور ..... رستم زندہ ہوتے ہوئے بھی زندہ نہیں تھا۔ پھر وہ کیوں بچاتی اور سنبھالتی اپنی ترس ناک زندگی کو۔ اسے نیناں کی زبانی معلوم ہوا تھا کہ کل میلے کا بھرپور دن ہوگا۔ خاص طور سے شام کے وقت بہت رش ہو جائے گا۔ شانی اس رش کے بارے میں اور اس نیم تیرگی کے بارے میں سوچ رہی تھی جو کل شام یہاں کٹھولی گاؤں میں ڈال لینے والی تھی۔ یہ گہما گہمی اور نیم تیرگی اس کی مددگار ثابت ہو سکتی تھی۔ اس نے کمرے میں لٹکا ہوا نیناں کا کریم رنگ کا برقع دیکھ لیا تھا یہ برقع اسے یہاں سے نکلنے میں بہت مدد دے سکتا تھا۔ اس نے کل شام کے لیے اپنے ذہن میں ایک نقشہ سا بنایا اور پھر اس نقشے میں رنگ بھرنے لگی۔ گاؤں کی گلیوں میں پولیس کے سنتریوں کی سیٹیاں تھیں۔ پہریداروں کے آوازے تھے ''جاگدے رہنا بھائیو۔''

میں پہلی بار..... بالکل پہلی بار شانی ایک ایسے انداز سے سوچ رہی تھی جسے عام زبان میں منصوبہ بندی یا پلاننگ کہا جاتا ہے۔ وہ سوچ رہی تھی اور اس کے سینے میں آنسوؤں کا طوفان جمع ہو رہا تھا۔

رات جیسے تیسے گزر گئی۔ اگلے روز صبح سویرے شانی کو کسی قریبی کمرے سے طبلے کی دھن دھن اور گھنگروؤں کی چھن چھن سنائی دی۔ اس نے ذرا آگے بڑھ کر دیکھا۔ نیناں ایک طبلہ نواز کے ساتھ دھمال کی ریہرسل میں مصروف تھی۔ اس کے لمبے بال چاروں طرف بکھرے ہوئے تھے اور وہ انہیں ناچنے کے دوران میں بڑے جوش سے دائیں بائیں حرکت دے رہی تھی۔ یہ لمبے بال اس نے خاص طور سے دھمال وغیرہ کے لیے ہی پالے ہوئے تھے۔ وہ پسینہ پسینہ ہو رہی تھی۔ شانی محویت سے اسے دیکھتی رہی۔ نجانے کیوں آج صبح سے ہی اسے محسوس ہو رہا تھا کہ کچھ انوکھا ہونے والا ہے۔ اس کی چھٹی حس اسے کسی اہم واقعے کی اطلاع دے رہی تھی۔

دفعتاً شانی کی نگاہ نیناں سے ہٹ کر کمرے کی دیوار پر گئی اور وہ بری طرح چونک گئی۔ وہاں ایک جانے پہچانے شخص کی تصویر آویزاں تھی۔ یہ وہی بہروپیا حضرت صاحب تھا۔ شانی حیران رہ گئی۔ ایک دو منٹ بعد یہ دیکھ کر شانی کی حیرت میں اضافہ ہوا کہ نیناں نے اپنا رقص ختم کرنے کے بعد تصویر کے سامنے باقاعدہ جھک کر تعظیم پیش کی پھر وہ شانی کی طرف مڑی اور اسے دیکھ کر ذرا سا چونک گئی۔ ''یہ کون ہے؟'' شانی نے تصویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''اپنے پیر و مرشد ہیں۔ بڑے اونچے درجے والے ہیں۔ ان کی ایک نظر سے قسمت بدلتی ہے۔ تم ان کو جانتی ہو؟'' نیناں کے لہجے میں حیرانی تھی۔

شانی نے ایک لمبی آہ بھر کر نفی میں سر ہلایا۔ نیناں حضرت صاحب کی شان میں قصیدے پڑھنے لگی۔ ادھیڑ عمر نائیکا بھی اس حوالے سے زمین آسمان کے قلابے ملانے میں مصروف ہو گئی۔ ان کی باتوں سے نتیجہ نکلتا تھا کہ حضرت صاحب کا شمار اس صدی کے گنے چنے کامل پیروں میں ہوتا ہے۔ اور یہ شانی کی بدقسمتی ہے کہ وہ علاقے کے اتنے بڑے فیض بخش درویش کے تعارف سے محروم ہے۔ ادھیڑ عمر عورت کی تو زبان رکنے میں نہیں آ رہی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ اس نے ''بہروپیے'' کی نابغانہ تعریفوں کا ٹھیکہ لے رکھا ہے۔

جاہل عورت کی باتیں ختم ہوئیں تو شانی نے نیناں سے اپنا مدعا بیان کیا۔ اس نے نیناں سے کہا کہ وہ اس دھونی کرتے سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتی ہے۔

''ہاں یہ تمہارے لیے ضروری بھی ہے۔'' نیناں نے اثبات میں سر ہلایا ''ٹھہرو میں تمہارے لیے کوئی جوڑا دیکھتی ہوں۔''

وہ اندر گئی اور چند منٹ بعد ایک نسبتاً سادہ سی شلوار قمیص لے آئی۔ ''لو یہ پہن کر دیکھو۔ بالکل نیا ہے۔ میں نے ایک بار بھی نہیں پہنا۔''

شانی نے اندر جا کر اپلوں اور گتادے کی بو والے کپڑے بدلے۔ لباس اسے ٹھیک آیا تھا۔ نیناں نے اسے تعریفی نظروں سے دیکھتے ہوئے اس کی کمر پر ہاتھ رکھا۔ ''ہائے نی، تیری کمر تو مجھ سے بھی پتلی ہے۔''

شانی سمٹ کر پیچھے ہٹ گئی۔ نیناں کی تعریفی نظریں بدستور شانی کے سراپا پر رہیں۔ وہ بے باکی سے بولی۔ ''بڑی 'بندے مار' قسم کی کڑی ہے تو..... تجھ پر تو عاشق ہونے کو دل کرنے لگا ہے۔''

شانی کے چہرے پر شرم اور غصے کی ملی جلی سرخی پھیل گئی۔ وہ ٹٹولنے والی نظروں سے شانی کو دیکھتی رہی۔ جیسے خاموشی کی زبان میں پوچھ رہی ہو۔ ''گیا گیا پواڑے ڈال کر آئی ہو اپنے پیچھے۔''

شانی اپنی توجہ ہٹانے کے لیے کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ نیناں کے انداز سے عیاں تھا کہ وہ اب شانی کے مکمل کوائف جاننے کے لیے اس سے دھیمے دھیمے سوال جواب شروع کر دے گی..... تاہم اسی دوران میں بادشاہ کی تیز آواز سنائی دی۔ اس نے نیناں کو ایک لوفر سا خطاب دینے کے بعد اس سے چائے پلانے کی فرمائش کی تھی۔

نیناں اپنے لمبے بالوں کے نیچے پتلی کمر لچکاتی ہوئی باہر نکل گئی۔ اس کے جانے کے بعد شانی بہروپیے قدرت اللہ اور علاقے میں اس کے اثر و رسوخ کے بارے میں سوچتی رہی اور حیران ہوتی رہی۔ یہ شخص بڑی تیزی سے اپنے ہاتھ پاؤں پھیلاتا جا رہا تھا۔

سہ پہر کے فوراً بعد ہی کٹھولی کی رونق میں اضافہ ہونا شروع ہو گیا۔ گلی کوچوں میں رنگ برنگے کپڑوں والے مرد، زن اور بچے ہجوم کرنے لگے۔ ڈھول ڈھما کے، باجے گاجے کا شور، خوانچہ فروشوں کی آوازیں، لاؤڈ اسپیکرز پر ہونے والے مختلف اعلانات، جنریٹرز کی گھوں گھوں، پنجابی گانوں کی کان پھاڑنے دینے والی موسیقی، جھولوں کی چوں چوں، جھولنے والوں کی پُرمسرت چیخاریں۔ وہ سب کچھ موجود تھا جو دیہی میلوں ٹھیلوں کا خاصہ ہوتا ہے..... قرب و جوار میں بسنے والی مخلوق، اور پکوڑوں کی مخصوص مہک پھیلی ہوئی تھی۔ اور دم بدم بڑھتی جا رہی تھی۔ شانی کی نگاہیں گاہے بگاہے کریم کے اس ریشمی برقع کی طرف اٹھ جاتی تھیں جو کمرے میں کھونٹی پر لٹکا تھا۔ وہ اندھیرا ہونے کا انتظار کر رہی تھی۔ شانی وہ نہیں جانتی تھی کہ اس کا منصوبہ دھرے کا دھرا رہ جائے گا۔ اس کی ہر سوچ ملیا میٹ ہو جائے گی۔ اور اس کی ''سوچوں'' کی جگہ ایک اور طرح کا ہنگامہ شروع ہو جائے گا۔

ابھی چوبارے کی مغربی کھڑکی میں سورج غروب ہونے کا منظر باقی تھا۔ خنک ہوا کے جھونکوں میں پرندوں کی آوازیں دکھائی دینے لگی تھیں۔ اچانک کوئی شخص بھاگتا ہوا سیڑھیاں چڑھا۔ میلے کے شور میں سے اس کی پکارتی ہوئی آواز سنائی دی۔ ''نیناں..... اور نیناں۔ کدھر ہو تم؟''

نیناں ساتھ والے کمرے سے باہر نکلی (بادشاہ بھی کمرے میں تھا) ''کیا ہوا؟'' نیناں نے مختصر برآمدے میں آ کر پوچھا۔

''ایک بڑی دھماکو خبر ہے بھئی'' جبرو نے ہیجانی لہجے میں کہا ''رستم سیال پکڑا گیا ہے۔''

''کیا..... ؟'' نیناں نے چلا کر پوچھا۔

''او سچ کہہ رہا ہوں..... رستم سیال پکڑا گیا ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے..... قبرستان کی طرف..... مولوی حشمت کے مکان کے پاس سے..... اللہ دی قسم خود دیکھ کر آیا ہوں میں۔ اور تم ہی ہے۔ لوگ اسے مارتے اور کھینچتے ہوئے ادھر ہی آ رہے ہیں۔'' جبرو کی سانس سینے میں نہیں سما رہی تھی۔

شانی پتھر کی طرح ساکت کھڑی تھی۔ اس کے کان جیسے سن ہو گئے تھے۔ اتنے میں بادشاہ بھی اپنی دھوتی اور قمیص ٹھیک کرتا ہوا باہر نکل آیا۔ ''کیا ہوا؟'' اس نے پوچھا۔

''رستم سیال پکڑا گیا ہے۔'' ایک اور بندے نے جبرو کی بات پر نمودار ہو کر گواہی دی۔ ''وہ دیکھو جی..... وہ لوگ اسے پکڑ کر لا رہے ہیں اس طرف۔'' اس نے گلی کی طرف انگلی اٹھائی۔

شانی نے دیکھا۔ وہ نہ دیکھتی تو اچھا تھا۔ شانی نے سنا، نہ سنتی تو اچھا تھا..... مشتعل دیہاتیوں کا ایک جمِ غفیر تھا۔ وہ ہلڑ سے لیتا اور چنگھاڑتا دھاڑتا ہوا میلے کے مرکز کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس جمِ غفیر کے درمیان کوئی تھا۔ کوئی گھسیٹا جا رہا تھا، مارا جا رہا تھا، جس پر مغلظات کی بارش ہو رہی تھی۔ کھینچنے والے بے شمار تھے۔ وہ اکیلا تھا۔ نظر نہیں آتا تھا۔ محسوس کیا جا سکتا تھا کہ وہ ان کے درمیان ہے۔ چوبارہ نما جگہ پر سے کٹھولی گاؤں جہاں تک نظر آتا تھا وہاں تک ہلچل دکھائی دینے لگی تھی۔ اڑتی دھول میں مختلف آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ ''کون پکڑا گیا؟..... واقعی پکڑا گیا؟ سچ مچ پکڑا گیا۔'' لوگ سفید اور سبز گنبد والے مزار کے قریب جمع ہو رہے تھے۔ یہ مزار اس چوبارہ نما جگہ سے تھوڑے ہی فاصلے پر تھا۔

اور پھر وہ شانی کو نظر آیا..... ہاں یہ وہی مظلوم تھا۔ وہی قسمت کا مارا تھا جس کی نگاہ نے کسی کو چاہنے کی حماقت کی تھی۔ جس کے دل نے کسی کو اپنے اندر بسایا تھا اور باقی ہر شے کو باہر نکال دیا تھا۔ ہاں یہ وہی تھا جس نے پوری زندگی ایک لمحے کی خطا پر قربان کرنے کی ٹھانی ہوئی تھی۔ وہ شانی کو نظر آنے لگا۔ آج وہ زنانہ کے بجائے مردانہ لباس میں تھا۔ اس کے گلے میں رسی تھی۔ اس کی قمیص لیر و لیر تھی۔ اس کی شلوار کو جیسے کئی کتوں نے ایک ساتھ بھنبھوڑا تھا۔ اس کے لمبے بال اس کی ریشمی داڑھی میں کہیں الجھے ہوئے تھے۔ ہجوم میں جو لوگ سب سے آگے تھے، وہ یقیناً تاؤ حشام اور چوہدری قادرے وغیرہ کے کارندے ہی ہو گے۔ ان کے ہاتھوں میں کوکوں والی چمکیلی لاٹھیاں بندوقیں اور کلہاڑیاں صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ وہ بظاہر لوگوں کو اسے مارنے سے روک رہے تھے کہ وہ زخم زخم رستم کو جان سے ہی نہ مار ڈالیں۔

رستم کو مزار کے سامنے چورا ہے میں اوندھے منہ گرا دیا گیا۔ وہ گرد میں اٹ گیا اور خاک کا حصہ نظر آنے لگا۔ پُرجوش لوگ اسے دیکھنے کے لیے دھکم پیل کرنے لگے۔ ایک دوجے پر گرنے لگے۔ چوہدریوں کے نیلی پگڑیوں والے ہرکارے انہیں لاٹھیوں سے دھکیل کر پیچھے ہٹا رہے تھے۔ ایک شخص نے رستم کے گلے میں سے رسی کا پھندا نکال لیا۔

میلے کی ساری آوازیں دھیرے دھیرے خاموش ہو گئی تھیں۔ ان آوازوں پر ایک نئی طرح کا شور غالب آ گیا تھا۔ یہ پُرجوش لوگوں کا شور تھا۔ پھر لاؤڈ اسپیکر پر ایک بھاری آواز ابھری، کسی نے تقریر کرنے والے لہجے میں کہا ''دیکھنے والے دیکھ لیں۔ برے کا انجام برا ہوتا ہے۔ یہ جو پانا پرانا کتا آپ کے سامنے مٹی میں لبڑا (لتھڑا) پڑا ہے..... یہ کل کا رستم سیال تھا، جو ماں بہن کو ماں بہن نہیں سمجھتا تھا، جو بندے کو کیڑے کی طرح مارتا تھا۔ جس کی اکھ میں سؤر کا بال اور جس کی گردن میں لوہے کا سریا تھا۔ آج یہ موت کو ترس رہا ہے..... دیکھنے والے دیکھ لیں۔''

مجمع میں سے کسی نے رستم کے سر پر ٹھوکر ماری اور پوچھا ''چوہدری جی! یہ پکڑا کیسے گیا؟''

جواب ملا ''خوشی کی بات ہے کہ اس بھین بدمعاش کو زنجیریں ڈالنے کا ثواب ہمارے پنڈ کے حصے میں آیا ہے۔ یہ حرامزادہ اپنے دو چمچوں کے ساتھ مولوی حشمت کے گھر کے ساتھ کھاد کے کھیت میں چھپا ہوا تھا۔ پکی بات ہے کہ یہ تینوں رات پڑنے کا انتظار کر رہے تھے۔ کسی لمبی واردات کا پروگرام تھا ان کتوں کا۔ سب سے پہلے مختار ارائیں نے اسے دیکھا۔ اس نے ممبر مجید کو خبر دی۔ اس کے بعد چوہدری حشام کے جی دار جوانوں نے اچانک ہلہ بول کر اسے چھاپ لیا۔ اس کے ساتھی بھاگنے میں کامیاب ہو گئے۔ پر امید ہے کہ وہ بھی پکڑے جائیں گے۔''

بہت سی ملی جلی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ کوئی پولیس کو بلانے کا کہہ رہا تھا۔ کوئی کہہ رہا تھا کہ اس کا منہ کالا کرو اور گدھے پر بٹھا کر پنڈ کا چکر لگواؤ..... کسی کا خیال تھا کہ اسے گلے میں رسی ڈال کر گلیوں میں گھسیٹا جائے۔ ظاہر ہے کہ یہ مشورے دینے والوں میں نار پوری چوہدریوں کے کارندے پیش پیش تھے۔ یہ سارا ڈراما انہی کا اسٹیج کیا ہوا تھا۔ اس دوران میں چند ہٹے کٹے پولیس والے بھی اس بے پناہ ہجوم میں نظر آنے لگے۔

نار پور کے ایک خوبرو جوان چوہدری نے مائیک ہاتھ میں لیا اور گلا پھاڑ کر چلایا۔ ''یہ ہمارے بزرگوں کا قاتل ہے۔ اس نے حویلی کو آگ لگائی۔ اس نے ہماری نسل کو ختم کرنا چاہا۔ اس کی سزا تو یہ ہے کہ اسی جگہ اسی مٹی پر، زندہ زندہ اس کی کھال اتاری جائے اور پھر اس کے ٹوٹے کر دیے جائیں..... پر..... پر ہم قانون کو اپنے ہتھ میں نہیں لیں گے۔ ہم اسے پلس کے حوالے کریں گے..... ہاں ایسا کرنے سے پہلے ہم اسے مزہ ضرور چکھائیں گے۔''

''ہاں، مزہ... چکھائیں گے۔'' بہت سی آوازیں ایک ساتھ بلند ہوئیں۔

ہجوم میں پھر سے دھکم پیل ہونے لگی۔ پولیس والے اس دھکم پیل میں گم ہوتے دکھائی دیے۔ نوجوان چوہدری لال پیلا ہو کر اور للکار کر بولا۔ ''بھا قادر! ڈالو اس کتے کے گلے میں رسی اور پورے پنڈ میں گھسیٹو اس کتے کے تخم کو۔ آئندہ کسی کو رستم سیال بننے کی جرأت نہ ہو۔ اگر اس کے..... '' پھر وہ اپنی بات ادھوری چھوڑ کر کسی شخص پر دھاڑا ''پیچھے ہٹو..... پیچھے ہٹو۔ کوئی پانی نہ پلائے اس خنزیر کو..... کوئی نہ پلائے۔''

ایکدم شور و غل بڑھنے لگا۔ شانی نے دیکھا۔ لوگ گلیوں میں تھے، چھتوں پر تھے، اور کھڑکیوں میں تھے۔ نیناں، نائیکا، کوجوان صدیق، بادشاہ، جبرو، سب چوبارے کی ادھ کھلی کھڑکیوں سے چمٹے ہوئے تھے اور چوراہے کا ڈرامائی منظر دیکھ رہے تھے۔ اور وہ جو اس خونی ڈرامے کی..... ذمے دار تھی، وہ بھی دم بخود دیکھ رہی تھی۔ اسے لگ رہا تھا جیسے اس نے ابھی ابھی رستم کے پستول سے گولیاں نکالی ہیں۔ جیسے ابھی ابھی اسے بے رحم حالات کے سپرد کیا ہے۔

پھر اس نے دیکھا، سرخ چمکیلے کپڑوں والا تاؤ اور آگے بڑھا اور اس نے رسی پھر سے رستم کے گلے میں ڈال دی۔

یہ قیامت کے لمحے تھے، یہ حشر کی گھڑیاں تھیں۔ شانی محسوس کر رہی تھی کہ وہ زمین آسمان کے درمیان معلق ہو گئی ہے۔ دو طاقتیں تھیں جو اسے بے پناہ قوت سے اپنی اپنی طرف کھینچ رہی تھیں۔ ایک طاقت کہہ رہی تھی۔ شانی تو اب بھی آگے نہ بڑھی تو پھر کب بڑھے گی۔ اب بھی تیرا دل موم نہ ہوا تو پھر کب ہوگا۔ وہ تیرے لیے مر رہا ہے۔ ایڑیاں رگڑ رگڑ کر۔ سسک سسک کر، بھوکا پیاسا، بے یار و مددگار، تیرے لیے تڑپتا ہوا۔ اور اپنے ہی لہو میں ڈوبا ہوا۔ اگر تو اب بھی بس دیکھتی ہی رہی تو کیا کبھی تو اپنے آپ کو معاف کر سکے گی؟ اور کیا مرنے کے بعد بھی تیری روح سکون پا سکے گی؟

جواب نفی میں تھا۔ جواب یہ تھا کہ، اب بھی بس تماشائی بن کر نہ رہ جا۔ اگر کچھ اور نہیں کر سکتی تو چل پھر خود بھی تماشا بن جا۔ نکل اس چار دیواری سے اور اسی کشتی پر سوار ہو جا جس پر وہ تیرا دیوانہ سوار ہے۔ ڈوب جا اس کے ساتھ۔ اس کے ہاتھوں میں ہاتھ دے کر مر جا۔ یہی راہِ محبت میں بے بس ہو جانے والوں کا وتیرہ رہا ہے۔

دوسری طاقت کہہ رہی تھی۔ شانی جہاں زہر کے اتنے پیالے پیے ہیں۔ یہ آخری پیالہ بھی دل کڑا کر کے پی جا۔ اگر تو اس چار دیواری سے نکلی تو تیرے ساتھ ہی تیرے خاندان اور تیرے بزرگوں کی عزت کا جنازہ بھی نکل جائے گا۔ یہ بات آج تک بس ایک قیاس ہے، ٹھوس حقیقت بن جائے گی۔ دنیا پر ثابت ہو جائے گا کہ ہاں..... وڈی آپا کی بیٹی، چوہدری ارشاد کی دھی رانی، ایک ڈاکو قاتل سے پیار کرتی تھی۔ اس سے ''معاملہ'' تھا اس کا۔ ہزاروں انگلیاں رنگ والی کی طرف اٹھ جائیں گی۔ بے شمار زہریلی نگاہیں تیرے پیاروں کا جینا حرام کر دیں گی۔ تو دنیا کا کوئی نہیں، ان سب کی گناہ گار ٹھہرے گی جو اب بھی پیچھے ہٹے نہیں، تیری سلامتی اور عزت کی دعائیں مانگتے ہیں۔ اور یہ سب کر کے بھی تو کیا کر لے گی؟ اس بدنصیب کو تو تو پھر بھی بچا سکے گی۔ پی لے، یہ زہر کا آخری پیالہ بھی۔ اپنے سارے

ماں باپ کی روحوں کے سامنے سرخرو ہو جا۔

طاقتیں کھینچ رہی تھیں۔ دباؤ بے پناہ تھا۔ لمحے بڑے ہوتے تھے۔ شانی کو لگا جیسے اس کی ہستی مٹ جائے گی۔ وہ دو دھاری تلوار سے ریزہ ریزہ ہو کر کھلی گاؤں کی اس نیم تاریک گلی میں بکھر جائے گی..... اور پھر وہ واقعی بکھر گئی۔ وہ ٹوٹ کر بکھر گئی، محبت و ہمدردی کا منہ زور جذبہ کسی طوفانی لہر کی طرح اس کے اندر سے اٹھا اور ہر مصلحت و اندیشے کو تنکے کی طرح بہا لے گیا۔ اس لمحہ کی بے پناہ طاقت کے سامنے صفت شانی نے خود کو سنگریزے کی طرح بے حقیقت پایا۔ اسے کچھ پتا نہیں چلا وہ کب کمرے سے نکلی، کب سیڑھیوں کی طرف بڑھی۔ اسے پہلا جھٹکا تب لگا جب وہ صحن سے زائد سیڑھیاں طے کر چکی تھی۔ اسے پیچھے سے پکارنے والا بادشاہ تھا۔ اس نے شانی کو ایک زوردار جھٹکا دیا۔ ''کیا کرتی ہو؟ دماغ خراب ہو گیا ہے۔ وہ لوگ ٹوٹے کر دیں گے تمہارے۔''

''خدا کے لیے چھوڑ دو۔'' شانی کراہی۔ اس نے اپنا جسم جھٹکا تو بادشاہ جو غیر متوازن کھڑا تھا، لڑکھڑا کر گر گیا۔ شانی کی آستین پھٹی اور وہ بادشاہ کی گرفت سے نکل گئی۔ لیکن اس دوران میں اوپر سے نیناں نے ملازم اکی کو آواز دی ''اکی! اسے روکو۔ یہ باہر نہ نکلے۔''

اکی بے جسم کے اکی نے شانی کے سامنے آنا چاہا۔ مگر مجبور تھا۔ میں ایسے نہیں رکا کرتیں۔ جو جھاگ اڑاتے جذبے بندوں کے پیچھے بہت دیر تک جمع ہوتے ہیں۔ وہ طاقت سے نکلتے ہیں۔ اکی نے شانی کو روکنے کی کئی کوششیں کیں اور پھر بیرونی دروازے تک پہنچتے پہنچتے طاقت ہار دی۔

اب شانی گلی میں تھی۔ چوراہے کی طرف اس کے جھپٹنے کی سمت تھی۔ یہ ایک ایسی غیر مرئی لیک تھی جس کے تاثر کو لفظوں میں بیان نہ کیا جا سکے۔ لوگ مڑ مڑ کر حیرت سے اس کی طرف دیکھتے تھے اور پھر دم بخود رہ جاتے تھے۔ وہ گلی، رستہ بنائی، دھکے کھائی اور دھکے دیتی بڑھتی گئی۔ پھر دیکھنے والوں نے دیکھا کہ ایک نسوانی جسم آگے بڑھا اور اس نے خود کو رستم پر برسنے والی چمکیلی تلوار کے سامنے ڈال دیا۔

اس کے لیے جیسے ہر شے دم بخود ہو گئی۔ ہر جاندار اور بے جان شے نے اپنی سانس روک لی۔ لاٹھیاں اور تلواریں اٹھانے والے ہاتھ بھی رک گئے۔ بس دور کہیں کسی مکان سے لاؤڈ اسپیکر پر یہ نغمہ گونجتا رہ گیا۔ بوہے باریاں تے کنداں ٹپ کے.....

پر سب سے پہلے سرخ کپڑوں والے چوہدری قادر نے کی غضب ناک آواز ہی گونجی تھی ''اوہو..... ہو ہو لوگو بھئی دیکھ لو سارے۔ آنکھیں کھول کر دیکھ لو۔ یہ اچی پگ والے چوہدری ارشاد کی دھی ہی ہے نا؟ میری نظریں دھوکا تو نہیں کھا رہیں؟''

ایک ساتھ بہت سی آوازیں بلند ہوئیں۔ لوگ ان کے گرد گھیرا تنگ کرتے چلے گئے۔ تاؤ حشام نے دہاڑ کر کہا۔ ''لو بھائیو! اب تو کسی کو شک شبہ نہیں رہنا چاہیے۔ یہ ہے حرامی رستم سیال اور یہ ہے اس کی حرافہ معشوق۔ دونوں ہیر رانجھا بن کر آپ کے سامنے بیٹھے ہیں۔ ان دونوں نے ہی مل کر حویلی میں لاشیں گرائیں اور حویلی کو ساڑ کر سواہ کیا۔ اب سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہو تم لوگ۔''

شانی کھڑی ہو گئی۔ پتا نہیں اس میں اتنی جرأت کہاں سے آ گئی تھی۔ وہ روتے ہوئے بولی۔ ''میں اس اللہ والے کے مزار کے سامنے بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں۔ حویلی کو آگ کسی نے نہیں لگائی۔ کسی نے حویلی کو جان بوجھ کر نہیں جلایا۔ وہاں ہر طرف گولیاں چل رہی تھیں۔ زیادہ گولیاں حویلی والے ہی چلا رہے تھے۔ کوئی گولی تیل کے ڈرموں میں لگ گئی اور آگ لگ گئی.....''

تاؤ بولا۔ ''واہ..... واہ..... سبحان اللہ..... کیا بات ہے۔ کیا عشق ہے۔ ایک قاتل بدمعاش کی جان بچانے کے لیے دولت بی بی کی پوتری اور چوہدری ارشاد کی شرماں والی دھی رانی ساری خلقت کے سامنے صفائیاں پیش کر رہی ہے..... اس سارے سین کی تو مووی بنی چاہیے۔ واہ..... واہ۔''

وہ بولتی چلی گئی۔ ''پاک کتاب لا کر میرے سر پر رکھ دو۔ میں جو کہہ رہی ہوں سچ کہہ رہی ہوں۔ میرے اور..... رستم کے درمیان کوئی ''بات'' نہیں ہے۔ کوئی ایسا واسطہ نہیں ہے جس کی وجہ سے مجھے اور میرے بزرگوں کو شرمندہ ہونا پڑے۔ میں بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں۔ اگر آپ.....''

شانی کی بات منہ میں رہ گئی۔ تاؤ نے گالیاں بکتے ہوئے اسے زوردار دھکا دیا۔ وہ رستم کے عین سامنے گری۔ شانی جانتی تھی رستم اسے یک ٹک دیکھ رہا ہے اور دیکھتا چلا جا رہا ہے۔ شاید وہ اپنی حس بصارت پر یقین کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ رستم کے عین سامنے گر کر شانی نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ لمبے گرد آلود بالوں نے اس کے نقوش ڈھانپ رکھے تھے۔ ان بالوں کے اندر سے اس کی آنکھیں

چمکتی دکھائی دیتی تھیں۔ ان خون سے لتھڑی آنکھوں میں جیسے زندگی ایک لہر کی طرح سرایت کرتی جارہی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ یہ آنکھیں بتدریج زندہ ہورہی ہیں۔

شانی نے روتے روتے رستم کی طرف دیکھا۔ پھر ایک درد بھری آواز بے ساختہ اس کے ہونٹوں سے نکلی۔ ”رستم! مجھے معاف کردو۔“

رستم کی آنکھیں کرب میں ڈوب گئیں۔ یوں لگا جیسے اس فقرے نے اس کے زخم زخم جسم پر دوا رکھنے کے بجائے تیزاب ڈال دیا ہو۔ اس فقرے کے سبب جو اذیت اس نے محسوس کی تھی وہ اس کی آنکھوں میں نمی لے آئی۔ اس کے خشک زخمی ہونٹ مضبوطی سے بھنچ گئے۔

ان کے گرد قیامت کا شور تھا۔ کوئی کہہ رہا تھا۔ ”مٹی کا تیل چھڑک کر زندہ جلادو ان زانیوں کو۔“

کسی نے کہا۔ ”پتھر مار مار کر مار دو۔“

وہ دونوں ان تمام آوازوں اور اذیتوں سے دور ہوگئے۔ ان لمحوں میں وہ بس ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ شانی نے کرب میں ڈوب کر کہا۔ ”تمہیں کہا تھا نا رستم! مجھ سے دور ہوجاؤ۔ میری نحوست تمہیں برباد کردے گی۔ کہیں کا نہیں چھوڑے گی..... میں نے کہا تھا۔“

رستم کا اندرونی کرب بڑھ گیا۔ اس بات نے پہلی بات سے بڑھ کر اسے دکھ پہنچایا تھا۔ آنکھ کی نمی آنسو بن کر چھلک گئی اور مٹی میں جذب ہوگئی۔

”مم..... میں کچھ نہیں کرسکتی رستم! میں تم سے زیادہ بے بس ہوں۔ میں بس اتنا کرسکتی ہوں کہ تمہارے ساتھ مرسکتی ہوں..... مم..... میں آگئی ہوں مرنے کے لیے۔“

رستم کا کرب بیکراں ہوگیا۔ اس کے جسم میں پہلی بار جنبش پیدا ہوئی۔ اس نے دھیرے سے نفی میں سر ہلایا۔ اس مختصر سی جنبش میں ایسی طاقت تھی جسے الفاظ کے احاطے میں لانا ناممکن تھا..... رستم کے زخم زخم جسم میں کوئی شے کروٹ لے رہی تھی۔ دھیرے دھیرے بیدار ہورہی تھی.....

کسی نے عقب سے دو زوردار ٹھوکریں رستم کی پشت پر ماریں مگر لگا کہ یہ ٹھوکریں رستم کو نہیں کسی کو اور ماری گئی ہیں۔ وہ بدستور شانی کی آنکھوں میں دیکھتا رہا۔ اس کے سیاہ ہونٹوں میں حرکت پیدا ہوئی۔ وہ کچھ کہنے کی کوشش کررہا تھا مگر آواز شانی کے کانوں تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ آواز شانی تک پہنچانے کی جدوجہد میں اس کے گلے کی رگیں پھول گئیں۔ رستم کی گردن پر دو تین گہرے زخم تھے۔ یوں لگتا تھا کہ ان زخموں نے اس کے بولنے کی صلاحیت متاثر کی ہے۔

شانی اس کی طرف کچھ اور جھک گئی۔

کچھ نوجوان لڑکے کہیں سے ایک گدھا گھیر کر لے آئے۔ شور بلند ہورہا تھا۔ ”گدھے پر بٹھاؤ..... منہ کالا کرو۔“ جوش و خروش بڑھتا جارہا تھا۔

چوہدری کے کارندوں کو یہ تجویز بہت پسند آئی۔ گدھے کی پشت پر چوبی پالان بندھا ہوا تھا..... اسے کھولا جانے لگا۔ کچھ لڑکے گدھے کے گلے میں ڈالنے کے لیے رسی تلاش کرنے لگے۔

دوسری طرف چار آنکھیں ایک دوجے کو دیکھ رہی تھیں۔ رستم نے ایک بار پھر اپنے سینے کی پوری قوت صرف کرتے ہوئے اپنی آواز شانی کے کانوں تک پہنچانی چاہی۔ اس کے ہونٹوں سے بس بیٹھی ہوئی ایک مدھم سرگوشی ہی نکل پائی۔ ”بی بی..... آپ..... کیوں آئیں؟“

وہ ہنسی۔ ”تم بڑے ظالم ہو رستم..... تم مارتے ہو..... اور درد نے بھی نہیں دیتے۔“

وہ پھر بے حد قوت صرف کرکے بہت مدھم آواز میں بولا۔ اس مرتبہ اس نے کل پانچ الفاظ کہے۔ پانچ الفاظ کا ایک انوکھا اور بظاہر بے معنی جملہ۔ اس نے کہا۔ ”بی بی..... آپ..... میرے ساتھ چلیں۔“

وہ شدت سے رونے لگی..... وہ بے اختیار تھی..... وہ اس سے بڑھ کر بے اختیار تھا اور وہ یوں جانے کی بات کررہا تھا جیسے ابھی تک انیکسی کے کمرے میں..... رات کے سناٹے میں..... بیٹھا ہو۔ وقت کی ساری راسیں اس کے ہاتھ میں ہوں۔

شانی نے ہمت کرکے اس کی آنکھوں میں دیکھا اور سرتاپا کانپ گئی۔ پوری جان سے لرز گئی۔ زخم زخم رستم کی اشک بار آنکھیں شاید وہی بات کہہ رہی تھیں جو اس نے کچھ عرصہ پہلے انیکسی کے کمرے میں کہی تھی۔ اس نے کہا تھا۔ ”بی بی! چوہدریوں کے یہ دو ناگوں والے کتے گنتی میں دو گنا یا تین گنا بھی ہوں تو میں انہیں چیر کر نکل جاؤں گا۔ یہ دروازے، یہ دیواریں اور یہ بندوقیاں ہمارا راستہ نہیں روک سکتیں۔ آپ بس ایک بار چلنے کی حامی بھریں، پھر دیکھیں میں ان کرائے کے ٹٹوؤں کو کس طرح اُدھیڑ کر نکلتا ہوں۔“

شانی نے دیکھا، رستم کے ماتھے اور گلے کی رگیں پھولتی جارہی ہیں۔ اس کے اعضا میں سختی پیدا ہورہی ہے۔ ایک عجیب ہیجانی کیفیت بتدریج اسے اپنے حصار میں لے رہی تھی۔ اس کے زخمی ہونٹوں نے ایک بار پھر زخمی سرگوشی کی۔

”بی بی جی..... آؤ..... یہاں سے چلے جائیں۔“

وہ روتے ہوئے بولی۔ ”کیسے جاؤ گے رستم..... کیسے جاؤ گے۔ یہ تو تمہیں دو قدم نہیں چلنے دیں گے۔ ابھی..... اسی جگہ مار دیں گے۔“

”نہیں بی بی!“ اس نے بڑے کرب سے نفی میں سر ہلایا۔ خون اس کی باچھوں سے بہہ رہا تھا اور اس کے دائیں کان سے ٹپک رہا تھا اور پتا نہیں کہاں کہاں سے رس رہا تھا۔

”نہیں رستم..... یہ فلم نہیں ہے۔ یہ زندگی ہے..... یہ ناقابل فلم ہے..... یہ مار دے گی۔ ابھی دو منٹ میں ہم دونوں کو ختم کردے گی۔“

اس کی آنکھوں میں جنون تھا لیکن اس جنون میں عجیب سا ٹھہراؤ تھا جیسے مہیب سمندر اوپر سے پرسکون ہوتے ہیں۔ اس نے عجیب ڈرامائی لہجے میں نہایت مدھم سرگوشی کی۔

”بی بی! بس ایک بار میرا..... ہاتھ پکڑ لیں۔ بس ایک بار..... پھر..... میں رکوں گا نہیں۔“

اس نے اپنا خون آلود کمزور ہاتھ شانی کی طرف بڑھا دیا۔ ہواؤں میں اس کے فقرے کی گونج تھی۔ ”پھر میں رکوں گا نہیں..... پھر میں رکوں گا نہیں۔“

شانی ششدر تھی۔ وہ جانتی تھی، کیا ہونے والا ہے۔ اگلے چند سیکنڈ میں ان دونوں کے ٹکڑے ہوسکتے تھے۔ رستم اپنی پوری قوت سے تڑپتا پھڑکتا تو بھی دو چار بندوں کو گھائل کرسکتا تھا۔ اس کے بعد وہی ہونا تھا جو حقیقت میں ہوتا ہے..... اور جو افسانوں میں نہیں ہوتا۔

وہ محل کی آنکھ سے دیکھ رہی تھی اور ٹھیک دیکھ رہی تھی کہ کوئی دوسرا عشق کی آنکھ سے دیکھ رہا تھا اور شاید وہ اپنے سر پر ٹھیک دیکھ رہا تھا۔

چند سیکنڈ صدیوں پر بھاری تھے۔ یہ قیامت کی کشمکش تھی۔ شانی کے پاؤں ٹھوس زمین پر تھے اور مضبوطی سے جمے ہوئے تھے مگر عشق کی بلاخیزی تند پہاڑی دریاؤں کا مزاج رکھتی ہے۔ یہ پاؤں ٹکنے نہیں دیتی۔ یہ دلیل اور منطق کی آزاد دنیا ہے۔ آگ میں کودتی ہے۔ کچے گھڑے پر سوار ہے۔ شانی کے جسم و جاں میں ایک عجیب بے نام لہر اٹھی اور اس نے اسے گرد و پیش سے یکسر بیگانہ کردیا۔ اس نے روتے اپنا ہاتھ ہولے سے بڑھایا اور رستم کے زخمی ہونٹوں سے دبا دیا۔

قیامت کی گردش جیسے تھوڑی دیر کے لیے رک گئی..... شاید شانی کا دل بھی۔ وہ چند سیکنڈ زمان و مکاں سے آزاد تھے۔ پھر شانی نے رستم کا ہاتھ اٹھایا اور بے ساختہ اپنے ہونٹوں سے لگا کر چوم لیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو موتیوں کی طرح گرے اور رستم کے ہاتھ پر پھسل گئے۔ اس ہاتھ پر زخم تھے، چوٹیں تھیں اور سگریٹ سے داغے جانے کے نشان تھے۔ شانی نے اس ہاتھ اور کلائی کو کئی جگہ سے چوما اور اسے اپنے گھٹنے پر رکھ کر اس پر اپنا رخسار رکھ دیا۔

اس نے اپنی آنکھیں بند کرلی تھیں۔ اس کے بعد جو کچھ ہونے والا تھا، وہ اسے دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔ دیکھنے کی سکت ہی نہیں رکھتی تھی۔ وہ بس مرجانا چاہتی تھی بڑی جلدی کے ساتھ۔ اس نے اپنی آنکھوں میں مرنے کی تصویر سجالی تھی اور جان لیوا منظر میں سہنے کے لیے تیار تھی۔

چند سیکنڈ بعد اس نے محسوس کیا کہ رستم کا ہاتھ ایک جھٹکے کے ساتھ اس کے ہاتھ سے جدا ہوگیا ہے۔ شاید رستم نے خود ایسا کیا تھا یا پھر کسی نے اسے کھینچ لیا تھا۔ اس کے بعد جو آوازیں شانی کے کانوں تک پہنچیں، ان سے پتا چلا کہ رستم ایک وحشی چنگھاڑ کے ساتھ کسی سے ٹکرایا ہے۔ چند چیخیں، بلند ہوئیں، چند للکارے گونجے۔ شانی کو اپنے اردگرد گھمسان کا رن پڑتا محسوس ہوا۔ اس نے آنکھیں نہ کھولنے کی قسم کھا رکھی تھی لیکن وہ اس قسم کو نبھا نہ سکی۔ اس نے دیکھا گیس کے ہنڈولوں اور بلبوں اور بانسوں سے لگی ہوئی ٹیوب لائٹوں کی روشنی میں رستم کسی خون آلود عفریت کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے اپنے قریب موجود کسی چوہدری کے ہاتھ سے چھوٹے دستے کی کلہاڑی چھین لی تھی اور اب دیوانہ وار اسے چلا رہا تھا۔ جو سامنے آرہا تھا، زخم کھا رہا تھا اور گر رہا تھا۔ شانی اور رستم کے گرد لوگوں کا حلقہ جو کچھ دیر پہلے بہت تنگ ہوگیا تھا، اب وسیع تر ہوتا جارہا تھا۔ ایک ہولناک ہراس تھا جو اس مختصر سی جگہ پر پھیل گیا تھا۔ یوں نظر آتا تھا کہ تماشے کی خاطر ہجوم میں لایا جانے والا کوئی خونی جانور اچانک آزاد ہوگیا ہے۔ پھر رستم نے اچانک تڑپ کر ایک گری ہوئی رائفل اٹھالی..... وہ اس رائفل کو سیدھا کرنا چاہ رہا تھا..... مگر اس کے لیے مہلت درکار تھی۔ اس کے سیکڑوں دشمن اسے اتنی مہلت دینے کو ہرگز تیار نہیں تھے۔ شدید ہراس کے چند سیکنڈ گزر گئے تھے۔ قادرے نے جیسے ہوا میں جست لگاتے ہوئے نیم جان رستم کو عقب سے دبوچ لیا اور گھما کر زمین پر دے مارا۔ رستم، شانی کے قریب گرا تھا۔ اس نے شانی کا ہاتھ تھام لیا۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے وہ شانی کو لے کر یہاں سے نکل جانا چاہتا ہے۔ یہ آنکھیں بند کرکے جناب میں کود جانے والی دیوانگی تھی اور دیوانگی ایسی ہی ہوتی ہے۔ ابھی رستم پوری طرح اٹھا بھی نہیں تھا کہ درجنوں افراد اس سے

چٹ گئے۔ رائفل کے پھل کی طرح اس کے ''ہاتھ کی شاخ'' سے جدا کر لی گئی۔ اسے مارا اور گھسیٹا جانے لگا مگر اس کا ہاتھ بدستور شانی کی کلائی پر تھا۔ کئی افراد شانی کا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرنے لگے مگر یہ انسان کی گرفت نہیں تھی۔ یہ جذبے کی گرفت تھی اور جذبہ بھی وہ جو اپنی مثال آپ ہے۔ وہ شانی کا ہاتھ نہیں چھڑا سکے۔ وہ رستم کے ہاتھ پر ایک ٹوٹی ہوئی لاٹھی سے ضربیں لگانے لگے۔ اس کے بازو کو نوچنے کھسوٹنے لگے اور گرفت کمزور کرنے کے لیے اسے دانتوں سے کاٹنے لگے لیکن وہ ہاتھ..... وہ کمزور ہاتھ شانی کی کلائی پر جما رہا۔ ہاں..... جی دار مرد جب اپنی محبوبہ کا ہاتھ تھامتا ہے تو پھر یہ گرفت مستقل ہوتی ہے۔ لاؤڈ اسپیکر پر آواز پکار رہی تھی۔

ڈونگے پانیاں دے وچ، دیوے پئے
بلدے
مقدراں دے لکھے مل نیوں سکدے

شانی کی آنکھیں بند تھیں۔ وہ اپنے اردگرد قیامت کا شور سن رہی تھی۔ رستم کو یوں مارا جا رہا تھا جیسے وہ گوشت پوست کا انسان نہیں ربڑ کا پتلا ہے۔ اس کے باوجود وہ اپنی کمزور مزاحمت جاری رکھے ہوئے تھا جیسے مزاحمت نہ کر رہا ہو، اتمام حجت کر رہا ہو۔ ان کے اردگرد جو شور تھا اس کی نوعیت اب بدل گئی تھی۔ للکاروں کا آہنگ اور ہو گیا تھا۔ جملے بھی نئے تھے۔ ان جملوں میں اب پولیس کا ذکر نہیں تھا۔ فوری سزائے موت کا ذکر تھا۔

ایک موٹی بھدی آواز گرجی۔ ''مار دو ان زانیوں کو۔ اسی جگہ ٹوٹے کر دو۔''

ایک دوسری آواز نے تائید کی۔ ''ہاں مار دو، پار کر دو دونوں کو۔''

فضا کی سنسنی خیزی یکلخت ہی کئی گنا بڑھ گئی۔ شانی کی آنکھیں بند تھیں مگر وہ ان بند آنکھوں سے ہی نارپوری چوہدریوں کے وحشت سے بگڑے ہوئے چہرے اور ان کی شعلہ بار آنکھیں دیکھ رہی تھی۔ مشتعل ماحول نے چوہدریوں کو یہ موقع فراہم کر دیا تھا کہ وہ اسی جگہ اسی وقت اپنے کلیجے ٹھنڈے کر لیں۔ اسے اور رستم کو مار کر اور لاشیں گلیوں میں گھسیٹ کر اپنے خونی انتقام کو پایۂ تکمیل تک پہنچا دیں۔ انہیں کوئی روکنے والا نہیں تھا۔ کسی میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ ان کی راہ میں آ سکے۔ یقیناً اس بپھرے ہجوم میں کچھ لوگ مختلف سوچ بھی رکھتے ہوں گے۔ دو چار ایسے بھی ہوں گے جو رستم اور شانی پر رحم کھا رہے ہوں گے۔ شاید ان سب میں بابر بھی ہو۔ میانہ کا چھوٹا مالک بھی ہو..... لیکن انتقام کے اس چنگھاڑتے طوفان میں ان کی آوازیں کچھ معنی نہیں رکھتی تھیں۔ شاید اسی لیے وہ بھی خاموش ہو گئے تھے۔

لیکن ظلم تو ظلم ہوتا ہے، بڑھتا ہے تو مٹ جاتا ہے۔ خون تو خون ہوتا ہے، ٹپکتا ہے تو جم جاتا ہے۔ جب فرعون خدائی دعویٰ کرتا ہے تو ایک موسیٰ ضرور اس کے دعوے کو باآواز بلند رد کرتا ہے۔ یہ ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے اور ہوتا رہے گا۔ یہی قدرت کا نظام ہے۔ یہی فطرت کا تقاضا ہے۔ نارپور کے چوہدری جب شانی کا ہاتھ کسی صورت رستم کے ہاتھ سے نہیں چھڑا سکے تو ایک للکارتی ہوئی آواز بلند ہوئی۔ ''رُک جا چوہدری قادرے، رُک جا، پیچھے پلٹ جا۔''

سماعت شکن شور پل چند لمحہ کے لیے تھما۔ آواز نے پہلے سے زیادہ جوش و خروش کے ساتھ کہا۔ ''قانون کو اپنے ہاتھ میں نہیں لینے دیں گے۔ یہ ظلم ہے، یہ نا انصافی ہے..... یہ نہیں ہونے دیں گے۔''

''ہاں، یہ نہیں ہونے دیں گے۔'' کئی آوازوں نے پہلی آواز کا ساتھ دیا۔

یہ کون لوگ تھے؟ یہ کیا کہہ رہے تھے؟ شانی نے ڈوبتے ذہن کے ساتھ سوچا۔

شاید یہ وہی لوگ تھے جن کو قدرت جابروں کے سامنے کلمۂ حق کہنے کے لیے کھڑا کرتی ہے..... قدرت انہیں وسیلہ بناتی ہے اور اپنے ہونے کا اظہار کرتی ہے۔

پہلی آواز نے ایک بار پھر للکار کر کہا۔ ''قانون سب کے لیے ایک سا ہونا چاہیے۔ چوہدری! اس بندے کو چھوڑ دو۔''

''تم قانون کے مامے مت بنو۔ مارے جاؤ گے۔'' ایک چوہدری گرجا۔

''زیادہ زور سے چلاؤ گے تو جھوٹ سچ نہیں ہو جائے گا چوہدری!'' پہلی آواز گرجی۔

''ہماری پردہ دار عورتوں کے ساتھ تمہارے پُتر منہ کالا کریں گے تو یہ ہماری عورتوں کی قسمت..... اگر تمہاری عورت کے ساتھ ایک ڈاکو نے رشتہ جوڑا ہے تو وہ موت کا حقدار ہے..... واہ واہ..... کیا بات ہے۔ کتنا کھرا انصاف ہے۔ تجھے تو ڈی کچہری کا جج ہونا چاہیے تھا چوہدری حشامے۔''

آواز میں بے پناہ زہر تھا۔

یہ زہر بھری آواز کس کی تھی؟ پھر شانی نے پہچان لیا۔ یہی زہر بھری آواز جواں سال صفیہ کی موت کے بعد حشام کی حویلی میں گونجی تھی۔ بعد میں نوکرانی حمیدہ نے شانی

بتایا تھا کہ یہ صفیہ کے چاچے کی آواز ہے۔ ہاں، یہ وہی آواز تھی۔ آج اس میں پہلے کی نسبت سو گنا زیادہ زہر تھا اور آج یہ آواز اکیلی بھی نہیں تھی۔ بیسیوں دیگر آوازیں اس کے ساتھ شامل تھیں۔ ایک بلند لہر تھی جو لہروں کے درمیان سے اٹھی تھی اور زور پکڑتی جا رہی تھی۔

ہاں..... صفیہ مر جاتی ہے لیکن..... مارنے والوں کے ہاتھوں پر اس کا خون تو چمکتا رہتا ہے اور یہ خون صرف قاتلوں کے ہاتھوں پر ہی نہیں جمتا، پورے معاشرے کے ہاتھوں پر جمتا ہے۔ یہ اپنی جگہ موجود رہتا ہے اور انصاف طلب کرتا رہتا ہے۔

دیکھتے ہی دیکھتے شانی کے اردگرد شور غل کے سارے زاویے اور آہنگ بدل گئے۔ اسے یوں لگا جیسے دو متحارب گروہ پوری شدت کے ساتھ ایک دوسرے سے ٹکرا گئے ہیں۔ چاروں طرف زلزلے کی کیفیت محسوس کر کے شانی نے پھر آنکھیں کھول دیں۔ خدا کی پناہ ناقابلِ یقین منظر تھا۔ لاٹھیاں چل رہی تھیں۔ سر پھٹ رہے تھے۔ کلہاڑیوں کے پھل بڑی بے رحمی کے ساتھ جسموں سے ٹکرا رہے تھے۔ شانی نے اپنے عین سامنے ایک شخص کے چہرے پر کلہاڑی کا بلیڈ لگتے دیکھا۔ اس کی سانولی پیشانی سے خون کا فوارہ چھوٹا اور وہ ڈکراتا ہوا دو ٹیوب لائٹوں پر گر کر انہیں چکنا چور کر گیا۔ تین افراد ایک شخص کو لاٹھیوں سے دیوانہ وار پیٹ رہے تھے اور وہ مٹھائی کے بڑے بڑے تھالوں پر لوٹ پوٹ ہو رہا تھا۔ شانی نے اپنے پاؤں کی طرف دیکھا۔ ایک چوہدری کی انتڑیاں پیٹ سے باہر تھیں اور وہ لڑنے والوں کے قدموں تلے مٹی کی طرح روندا جا رہا تھا۔

شانی کا ہاتھ ابھی تک رستم کے خون آلود ہاتھ میں تھا۔ یوں لگتا تھا کہ یہ ہاتھ شانی کے جسم کا حصہ بن چکا ہے۔ شانی کو رستم کے دائیں ہاتھ میں ایک کمانی دار چاقو دکھائی دیا۔ چوہدری قادرے کی طرف سے کیا جانے والا کلہاڑی کا ایک طوفانی وار رستم نے جھک کر بچایا اور چاقو دستے تک اس کے پیٹ میں گھسیڑ دیا۔ قادرا چلا کر دُہرا ہوا اور پھر اوندھے منہ گر گیا۔ تماشے کے لیے لایا جانے والا گدھا قادرے کو تقریباً لتاڑتا ہوا کسی جانب نکل گیا۔ دو کلہاڑی بردار یہ منظر دیکھ کر بڑی دہشت سے رستم پر جھپٹے لیکن اس سے پہلے کہ وہ پہنچتے، کبوہ برادری کے دو لٹھ بازوں نے انہیں روک لیا۔ اسی دوران میں رستم نے ایک اور شخص کو بڑی دہشت سے زخمی کیا اور شانی کو اپنے ساتھ کھینچتا ہوا مزار کی طرف بڑھا۔

شانی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس طرف کیوں جا رہا ہے لیکن وہ اس کے ساتھ آگے بڑھتی جا رہی تھی۔ پھر حقیقت اس پر واضح ہوئی۔ ایک اسٹارٹ جیپ پر کبوہ برادری کے تین افراد کھڑے تھے اور رستم کو پکار پکار کر اپنی طرف بلا رہے تھے۔ یہ ایک کھلی جیپ تھی۔ چند ہی سیکنڈ میں رستم اور شانی دونوں جیپ پر تھے۔ ٹرٹرٹر کی خوفناک آواز سے فائرنگ ہوئی۔ جیپ میں موجود ایک کبوہ پٹ سے جیپ کے فرش پر گرا۔ اس کے ساتھ ہی رستم بھی دُہرا ہو گیا۔ شانی کے دماغ میں فوراً آیا کہ رستم کو گولی لگ گئی ہے، تاہم چند لمحے بعد رستم سیدھا ہوا تو یہ بھیانک خیال غلط ثابت ہوا۔ رستم کے ہاتھ میں مضروب کبوہ کے ہاتھ سے گرنے والا ماؤزر تھا۔ اس نے ماؤزر سیدھا کیا اور پلٹ کر کئی فائر کیے۔ شانی ایک بار پھر آنکھیں بند کرنے پر مجبور ہو گئی۔ اس نے جیپ کی طرف بڑھنے والے دو تین کلہاڑی برداروں کو زخمی ہو کر گرتے دیکھا۔ جیپ ایک طوفانی جھٹکے سے آگے بڑھی۔ شانی اور رستم دونوں فرش پر گر گئے۔ یہ ان کے حق میں اچھا ہی ہوا تھا۔ وہ وہیں گرے رہے۔ جیپ نے کئی شامیانوں کے بانس اُکھاڑے اور توڑے..... اور قرب و جوار کو تاریکی میں ڈبوتی ہوئی مزار کی مخالف سمت میں بڑھی۔ مزار کے اردگرد سماعت شکن شور تھا اور فائرنگ کی پُرہول آوازیں تھیں۔ شانی نے دیکھا ماؤزر رستم کے دونوں ہاتھوں میں بڑی مضبوطی سے تھما ہوا ہے اور لمبے بالوں کے اندر سے اس کی آنکھیں یوں چمک رہی ہیں جیسے جھاڑیوں میں کوئی خوفناک درندہ گھات لگائے بیٹھا ہو۔ وہ عقب میں دیکھ رہا تھا۔

☆☆☆

شانی اور رستم ایک جھونپڑا نما مکان میں موجود تھے۔ اس میں تین کمرے تھے۔ ایک برآمدہ اور ایک کھلا سا صحن تھا۔ یہ بستی ایک بڑے ڈیک نالے کے کنارے کنارے دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ شانی اور رستم کو یہاں تک لانے والے افراد نے اپنی کھٹارا جیپ کافی دور درختوں کے درمیان چھوڑ دی تھی اور پیدل یہاں تک پہنچے تھے۔ ان تین افراد میں سے ایک کی ٹانگ میں گولی لگی تھی اور اسے اٹھا کر بستی تک لایا گیا۔ باقی دونوں افراد میں سے ایک نہایت گٹھے ہوئے جسم اور گھونگریالے بالوں والا تیس بتیس سالہ شخص تھا۔ اس کے دونوں کانوں میں سونے کی چھوٹی چھوٹی بالیاں تھیں۔ اس نے دھوتی کرتہ پہن رکھا تھا۔ اس کی شخصیت رعب دار اور متاثر کن تھی۔ اس کا ساتھی ستائیس اٹھائیس سال کا چھریرے بدن والا شخص تھا۔ اس کا رنگ اپنے ساتھی کی نسبت صاف تھا اور ناک کا بانسا بھی کافی اونچا تھا۔ شانی کو پتا چلا تھا کہ یہی

صفیہ کا چاچا عارف کبوہ ہے۔ اس کے چہرے پر وہی تمتماہٹ جھلک تھی جو انقلابی سوچ رکھنے والے نوجوانوں کا خاصہ ہوتی ہے۔ بظاہر یہی لگتا تھا کہ سونے کی بالیوں والا سانولا شخص اور عارف کبوہ دوست ہیں اور فی الوقت شانی اور رستم "والے شخص" کی بستی میں مہمان کی حیثیت سے موجود ہیں۔

میلے کے خونریز ہنگامے سے اس بستی تک پہنچنے کا سفر قریباً ایک گھنٹے میں طے ہوا۔ یہ سارا کچے کا سفر تھا۔ اس جھونپڑا نما مکان میں بھی شانی اور رستم کو قریباً ایک گھنٹا ہو چلا تھا۔ شانی کے اندازے کے مطابق یہ رات نو بجے کا وقت تھا۔ رات کی نیم سرد تھی۔ کمرے میں ایک لالٹین روشن تھی۔ کچے فرش پر کھجور کی ایک بڑی چٹائی بچھائی گئی تھی۔ دو عدد دبان کی چارپائیاں دیوار کے ساتھ کھڑی تھیں۔ ایک کونے میں تین بستی ٹرنک تھے۔ ایک پڑچھتی پر المونیم کے برتن اور گھٹیا چینی کی پلیٹیں ترتیب سے رکھی تھیں۔ کھڑکی کے پاس بہت سے پتھر، چنگیر اور ٹوکرے دھرے تھے..... جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس گھر کے رہنے والے سرکنڈوں سے ایسی اشیا بنانے کا کام کرتے ہیں۔

عارف کبوہ اور اس کا گٹھیلے جسم والا مسلح ساتھی شانی اور رستم کو تسلی دینے اور کچھ ضروری اشیا فراہم کرنے کے بعد کمرے سے باہر جا چکے تھے۔ باہر جاتے ہی انہوں نے کھولی کے کتے کھلے چھوڑ دیے تھے اور بستی کے پہرے داروں کو چوکس کر دیا تھا۔ اب شانی اور رستم اس نیم روشن کمرے میں تنہا تھے۔ رستم چٹائی پر بیٹھا تھا۔ اس نے دیوار سے ٹیک لگا رکھی تھی۔ دونوں گھٹنے اوپر اٹھے ہوئے تھے اور پیشانی گھٹنوں پر ٹکی ہوئی تھی۔ شانی کو اس کا چہرہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ بس لمبے خون آلود بال ہی نظر آتے تھے۔ رستم نے جیپ سے جو ماؤزر اٹھایا تھا وہ اب اس کے پہلو میں دھرا تھا۔

شانی بہت دیر تک اپنے اندر حوصلہ جمع کرتی رہی پھر اس نے دھیمے لہجے سے کہا۔ "رستم!"

"جی بی بی جی!" اس نے گھٹنوں پر سر جھکائے جھکائے سعادت بھری اور بیٹھی ہوئی آواز میں کہا۔

"میں نے بہت دکھ دیا ہے تمہیں۔"

اس نے نفی میں سر کو جنبش دی۔

"میں خود کو اس قابل بھی نہیں سمجھتی کہ تم سے معافی مانگ سکوں۔"

اس نے پھر نفی میں سر ہلایا۔ "خدا کے لیے بی بی!" اس کے ہونٹوں سے گھٹی گھٹی آواز نکلی۔

"رستم! میں خون خرابے کو رد کرنا چاہتی تھی۔" وہ دل فگار آواز میں بولی۔ "مجھے ڈر تھا رستم کہ چوہدری بشیر کے ساتھ تمہاری لڑائی ہو جائے گی۔ تم چوہدری کو مار دو گے۔ پھر کوٹھی کے لوگ تمہیں بھی زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ م..... مجھے مرنے کا بھی ڈر تھا۔ اگر انیکسی میں گولیاں چلتیں تو وہ معصوم بھی لپیٹ میں آ جاتا..... م..... میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ میں نے تمہارے پستول سے گولیاں....." وہ کوشش کے باوجود بات مکمل نہ کر سکی۔ اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

چند سیکنڈ تک خاموش رہنے کے بعد اس نے پھر سلسلۂ کلام جوڑا۔ "رستم! مجھ سے جو کچھ ہوا وہ کسی اور کے لیے نہیں تھا صرف مرنے کے لیے تھا۔ مرنے کی زندگی کے لیے تھا اور شاید تھوڑا بہت بھابو کے لیے تھا۔ میری اس غلطی کے لیے تم جو چاہو سزا مجھے دے سکتے ہو۔ میں اُف نہیں کروں گی..... اور میں صرف بات ہی نہیں کر رہی ہوں، میں دل و جان سے ہر کفارے کے لیے تیار ہوں۔ یہ ماؤزر تمہارے سامنے پڑا ہے۔ بے شک مجھے گولی مار دو۔"

"خدا کے لیے بی بی..... خدا کے لیے۔" اس نے ایک بار پھر بے قراری سے نفی میں سر ہلایا۔ چہرہ بدستور گھٹنوں میں چھپا تھا۔

"میں جانتی ہوں رستم! تمہارے ساتھ بہت ظلم ہوا ہے۔ تمہیں بدترین ذہنی اور جسمانی تکلیفیں دی گئی ہیں اور یہ سب میری وجہ سے ہوا ہے۔ میں گناہ گار ہوں تمہاری۔ مجھے بتاؤ رستم! میں کیسے مداوا کر سکتی ہوں۔ کس طرح تمہارے زخموں پر مرہم رکھ سکتی ہوں..... تم جو کہو رستم! میں کرنے کے لیے تیار ہوں اور میں جانتی ہوں، سب کچھ کرنے کے بعد میں بھی کچھ نہ کر سکوں گی، کچھ بھی نہیں رستم!"

ایک سسکی رستم کے گھٹنوں کے عقب سے بلند ہوئی۔ اس نے اپنا چہرہ اٹھایا۔ خدا کی پناہ! اس کے چہرے پر دنیا جہاں کا کرب سمٹ آیا تھا۔ آنکھیں انگارہ تھیں۔ آنسو آتشیں سیال کی طرح سرخ آنکھوں سے اتر کر خون آلود داڑھی میں جذب ہو رہے تھے۔ پیشانی کی رگ جیسے بے پناہ اذیت کے زیرِ اثر تڑپ رہی تھی۔ اس نے شانی کی طرف دیکھا اور بڑی ہی عاجزی سے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔

"نہ بی بی!" اس کے زخمی ہونٹ بس اتنا ہی کہہ سکے۔

ان دو الفاظ میں اذیت، منت سماجت، التجا اور فریاد کے سارے رنگ سمٹ آئے تھے۔

شانی نے اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے اور انہیں رخسار

سے لگا کر ان پر اپنے آنسو گرانے لگی۔ اس کا سارا جسم لرزاں تھا۔ اچانک شانی کی نگاہ چٹائی پر پڑی۔ خون کے دو تین قطرے نپ سے کھجور کی چٹائی پر گرے..... پھر ایک ادر گرا۔ یہ خون رستم کے سر سے رس رہا تھا۔ یوں تو اس کے جسم پر کئی زخم تھے، تاہم سر کا کوئی زخم ابھی تک خون اُگل رہا تھا۔ شانی نے اس کے لمبے بالوں میں سے خون کا ماخذ ڈھونڈنا چاہا مگر ناکام رہی۔ سارے بال خون میں لتھڑے تھے اور سر سے چپکے ہوئے تھے۔ عارف کبوہ جو چیزیں اس کمرے میں رکھوا گیا تھا ان میں گرم دودھ کا جگ، مکئی کی روٹی، گرم پانی کی بالٹی، ٹھنڈے پانی کی بالٹی، زخموں پر لگانے کے لیے ایک دیسی مرہم، روئی اور پٹیاں وغیرہ شامل تھیں۔

جب شانی رستم کے سر کا خونچکاں زخم ڈھونڈنے میں ناکام ہوئی تو اس نے گرم پانی میں تھوڑا سا ٹھنڈا پانی ملا کر اسے نیم گرم کیا۔ بالٹی کا باقی ٹھنڈا پانی اس نے ایک گھڑے میں اُنڈیل دیا۔ ٹھنڈے پانی والی خالی بالٹی اس نے رستم کے سامنے رکھ دی۔ وہ اس کا سر دھونا چاہتی تھی۔ رستم کے چہرے پر شدید ہچکچاہٹ کے آثار تھے مگر شانی کا مصمم ارادہ اور دوٹوک رویہ دیکھ کر اسے اپنی ہچکچاہٹ پر قابو پانا پڑا۔ شانی نے بڑی نرمی اور احتیاط سے رستم کا سر دھویا۔ سر کے وسط اور عقب میں دو زخم زیادہ گہرے تھے۔ ایک زخم کو تو ''اسٹیچنگ'' کی ضرورت تھی مگر یہ سہولت یہاں میسر نہیں ہو سکتی تھی۔ مقامی طریقہ کار کے مطابق شانی نے ایک انگیٹھی میں سے کچھ راکھ لے کر ان زخموں سے خون کا اخراج بند کیا اور پھر ایک چوڑی پٹی ٹھوڑی کے نیچے سے نکال کر باندھ دی۔ سر کے عقبی زخم کے لیے ایک پٹی کو سر کے گرد بل دینا پڑا۔ اس پٹی نے پیشانی کے ایک زخم کو بھی ڈھانپ لیا۔ یہ سب کرتے ہوئے شانی نے اپنی دودھیا کلائی کے تیل کو چھپائے رکھے تھا۔ یہ تیل کسی کی ناقابلِ شکست گرفت کی نشانی تھا۔ رستم کی قمیص دھجیوں کی صورت اختیار کر چکی تھی۔ یہ دھجیاں شانی نے رستم کے جسم سے علیحدہ کر دیں۔ رستم کی کمر دیکھ کر آنسوؤں کا ایک آبشار شانی کے حلق میں گرنے لگا۔ اس کا دل چاہا وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دے مگر ایسا کر کے وہ ماحول کو گمبھیر کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے صاف روئی نیم گرم پانی میں بھگوئی اور بڑی احتیاط سے رستم کی کمر کو خون آلود گرد سے صاف کیا پھر وہ اپنی انگلیوں کی پوروں سے زخموں پر راکھ اور مرہم لگاتی گئی۔ ایک دو جگہوں پر اسے پٹی بھی باندھنا پڑی۔ جسم کی اندرونی چوٹوں اور پٹھوں کی ٹوٹ پھوٹ کا اس کے پاس کوئی علاج نہیں تھا۔ جب وہ رستم کی پنڈلیوں اور پاؤں کی چوٹوں کی طرف آئی تو وہ تڑپ کر پیچھے ہٹ گیا۔ اس کی آنکھوں میں آتشیں آنسو تھے۔ اس کا چہرہ گواہی دے رہا تھا کہ اب یہ سب کچھ اس کی برداشت سے باہر ہو گیا ہے۔ وہ شانی کو اپنی خدمت گزاری کرتے ہوئے مزید نہیں دیکھ سکتا۔ اس نے اصرار کے ساتھ روئی اور مرہم وغیرہ شانی کے ہاتھ سے لے لیے۔

شانی نے اسے دودھ پلایا۔ وہ روٹی کے چند لقمے بھی دینا چاہتی تھی، تاہم اسے اندازہ ہوا کہ رستم کے گلے کی اندرونی چوٹیں سنگین ہیں۔ دودھ جیسی رقیق چیز بھی اسے حلق سے اتارنا مشکل ہو رہی تھی۔ وہ بمشکل چند لفظ بول سکتا تھا۔ شانی نے کہیں پڑھا تھا کہ گلے کے اندر ایک صوتی خانہ (ساؤنڈ بکس) ہوتا ہے۔ اسے نقصان پہنچے تو بندے کی گویائی متاثر یا سلب ہو سکتی ہے۔ رات دھیرے دھیرے سرکتی رہی۔ شانی اپنے آنسو خاموشی سے حلق میں گراتی رہی اور پارہ پارہ رستم کی دیکھ بھال میں مصروف رہی۔

شانی اور رستم نے اگلے چوبیس گھنٹے اسی بند کمرے میں گزار دیے۔ شانی اس بستی میں اسی لباس کے ساتھ آئی تھی جو اسے رقاصہ نیناں نے کھولی گاؤں میں فراہم کیا تھا۔ یہ ایک ناچنے والی کا لباس تھا اور شانی کو اپنے جسم پر کانٹا محسوس ہوتا تھا۔ ویسے بھی میلے کی دھینگا مشتی میں یہ کپڑے خستہ حال ہو چکے تھے۔ ایک مقامی عورت نے شانی کو ایک شلوار قمیص دی۔ وہ کافی کھلی تھی، تاہم شانی کو تن ڈھانپنے سے غرض تھی۔ رستم کے پھٹے پرانے لباس کی جگہ بھی اسے ایک دھوتی کرتہ فراہم کر دیا گیا تھا۔ ان چوبیس گھنٹوں میں تین چار بار عارف کبوہ اور اس کا ساتھی کمرے میں آئے۔ ایک بار ان کے ساتھ ایک قبول صورت عورت بھی تھی۔ عارف کبوہ کے ساتھی کا نام دراج تھا۔ وہ ذات کا مہتم تھا..... اور ڈیک نالے کے کنارے آباد اس مہتم بستی کا سردار تھا۔ بستی کے زیادہ تر لوگ سرکنڈوں اور بانس سے مختلف اشیا تیار کرتے تھے۔ اس کے علاوہ ان لوگوں میں شکار کو بھی پیشے کی حیثیت حاصل تھی۔ دراج مہتم اور عارف کبوہ میں یارانہ تھا۔ عارف کبوہ نے ہوشیاری کا ثبوت دیا تھا اور میلے میں ہونے والی لڑائی کے بعد شانی اور رستم کو اپنے گاؤں میں لے جانے کے بجائے دراج کے پاس اس مہتم بستی میں لے آیا تھا۔ عارف کبوہ نے شانی اور رستم کو بتایا کہ میلے میں ہونے والی اس لڑائی میں تیرہ بندے جان سے مارے گئے ہیں۔ ان میں سے دو تار پورہ اور ایک کبوہ ہے۔ قریباً تیس افراد کو گولیوں اور کلہاڑیوں سے زخم آئے تھے اور انہیں گوجرانوالہ اور وزیر آباد کے اسپتالوں کی طرف روانہ کر دیا گیا تھا۔ عارف کبوہ کی زبانی شانی کو یہ

معلوم ہوا کہ تاؤ کا بھتیجا چوہدری قادر اشد یدزخمی ہے۔

عارف کبوہ بڑے بیچارگی کے لہجے میں بولتا تھا۔ وہ شلوار قمیص پہنا تھا اور کبوہ برادری کے دوسرے مقامیوں کے برعکس کچھ ذہین بھی نظر آتا تھا۔ اس کے کرتے کے نیچے ہر وقت پستول کی موجودگی ثابت ہوتی تھی۔ دوسری طرف دراج مہتم بظاہر سادہ سا سردار دکھائی دیتا تھا۔ وہ درمیانے قد کا مگر نہایت مضبوط جسم کا مالک تھا۔ اسے دیکھ کر ہی کہا جا سکتا تھا کہ لوہے کی طرح سخت اور جنگلی سانڈ کی طرح طاقتور ہے۔ وہ جب پہلی بار شانی اور رستم کے پاس آیا تو اس کے کندھے سے ایک خوفناک کلاشنکوف لٹک رہی تھی اور کمر کے گرد کارتوس کی فول بیلٹ تھی۔ وہ مرنے اور مار دینے والا شخص دکھائی دیتا تھا۔

اس نے رستم کو مخاطب کرتے ہوئے بڑے جذبے سے کہا۔ ''ہم مہتم ہوتے ہیں۔ یاروں کے لیے سر کٹا دیتے ہیں۔ ہم پیدا کرنے والے کی، ہمارے ہوتے ہوئے کوئی تم ادھر کی طرف میلی نجر سے نہیں دیکھ سکتا۔''

عارف کبوہ بولا۔ ''علاقے میں بڑی ٹین شن ہے۔ نار پور کی بار چوہدری زنانیوں کی طرح چوڑیاں ڈال کر بیٹھ گئے اور پولیس کو آگے کر دیا ہے۔ پولیس نے ہمارے تین بندوں کے ساتھ کے قریب بندے پکڑے ہیں۔ انہیں دھمکایا گیا ہے۔ ڈرایا دھمکایا جا رہا ہے۔ ہم بھی سب کچھ اپنے سامنے ہوتا دیکھ رہے ہیں۔ ایک ایک زیادتی کا بدلہ لیں گے۔''

شانی نے کہا۔ ''آپ لوگ ہماری خاطر بہت تکلیف اٹھا رہے ہیں..... یہ بہت بڑا احسان ہے آپ کا..... کیا یہ جگہ محفوظ ہے۔ میرا مطلب ہے اگر نار پور والے اس طرف آ گئے تو.....؟''

دراج نے سینہ پھلایا اور اپنی کلاشنکوف پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔ ''بی بی! یہ اِک ''سکنٹ'' میں دس گولیاں نکالتی ہے۔ یہ ٹرگر (فرلانگ) تک جو شے سامنے آئے اس کو ریزہ ریزہ کر دیتی ہے..... سمجھو کہ اکھ جھپکنے کی دیر میں دس بندے موری کر سکتی ہے۔ اگر بلی ماروں نے ادھر آنے کی جرأت (بہادری) کی تو کسم سے لاشوں کا ڈھیر لگا دیں گے۔ ہم کا بچہ بچہ تم دونوں پر زندگی وار دے گا۔ ہم کسی کے پیچھے ہٹنے والے لوگ نہیں ہیں۔''

شانی نے کہا۔ ''لیکن..... بھائی، ہم اپنے لیے کسی طرح کا خطرہ نہیں چاہتے۔'' شانی نے کہا پھر وہ عارف کبوہ سے مخاطب ہو کر بولی۔ ''اگر کسی طرح تم ہم دونوں کو کسی قریبی شہر پہنچا دو تو ہمارے لیے بہت اچھا ہوگا۔ ہم پکی سڑک کے راستے اس علاقے سے نکل جائیں گے اور اگر ایسا نہیں ہو سکتا تو پھر کسی طرح رستم کے دوستوں سے رابطہ کرا دو۔ میرے پاس دو فون نمبر موجود ہیں۔''

عارف کبوہ نے نفی میں سر ہلایا۔ ''بی بی! آپ غلط سوچ رہی ہو۔ یہاں سے نزدیک ترین پکی سڑک بھی پینتیس میل کے فاصلے پر ہے۔ باقی رہی ٹیلی فون والی بات تو اس کی کوشش کی جا سکتی ہے مگر جس قسم کے حالات ہیں، بہتر یہی ہے کہ ابھی کسی باہر کے بندے کو یہاں بلا کر اس کی جان کو خطرے میں نہ ڈالا جائے۔ پولیس اور بلی ماروں کے بندے چپے چپے پر تم دونوں کو ڈھونڈ رہے ہیں خاص طور سے پولیس والے بہت شیر ہو رہے ہیں۔ اسپتال میں ان کا ایک بندہ بہت دیر تک بیمار رہنے کے بعد پندرہ بیس دن پہلے مرا ہے۔ وہ اس بندے کا قتل رستم پر ڈال رہے ہیں۔''

دراج نے سینہ پھلا کر شانی کو مخاطب کیا۔ ''او نکڑی (چھوٹی) تو خون شون کی باتیں چھوڑ۔ ہم نے بھیسلہ کیا ہے کہ تم دونوں کا اصل مسلا ہی حل کر دیں گے۔ ایک دم کلاص، سب کچھ صاف۔ ہم اگلے دو دن کے اندر اندر تم دونوں کی شادی کر دیں گے۔ تم دونوں کلمے پڑھ کر ایک ہو جاؤ پر دیکھیں گے کہ تم کو کون مائی کا لال ایک دوجے سے دور کرتا ہے۔''

شانی حیرت سے دراج کی طرف دیکھتی چلی گئی۔ کتنی آسانی سے کتنی بڑی بات کر دی تھی اس نے۔ رستم بھی سرخ آنکھوں سے دراج کو دیکھنے لگا۔ اس کے ماتھے اور گلے کی رگیں پھول گئیں۔ دراج نے سوچوں کو تاؤ دے کر کہا۔ ''رستم! تم بھادر (بہادر) پیو کے بھادر پتر ہو اور بھادروں کی کدر کرنا مہتموں کے کھون میں شامل ہے۔ میں دیکھوں گا تم دونوں کو ایک ہونے سے کون روکتا ہے۔ میں دیکھوں گا۔'' اس کے ساتھ ہی وہ عارف کبوہ کو اپنے ساتھ لے کر طاقتور سانڈ کی طرح جھومتا ہوا باہر نکل گیا۔

رات کو عجیب واقعہ ہوا۔ نیم جان رستم چٹائی پر لیٹا تھا۔ شانی چارپائی پر نیم دراز تھی۔ شانی کے بہت اصرار کے باوجود رستم نے دوسری چارپائی پر لیٹنا پسند نہیں کیا تھا۔ شانی کا ذہن ہزار ہا سوچوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ سوچوں کی اس یلغار میں گاہے گاہے دراج کا وہ عجیب و غریب فقرہ بھی اُبھر کر گونجتا تھا اور شانی کو شرمندگی کے سمندر میں ڈبو دیتا تھا۔ دراج نے پتا نہیں کیوں ایسی بات کہی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ وہ شانی اور رستم کو ایک کر دے گا۔ کتنی بڑی، کتنی مہیب بات کتنی آسانی سے کہہ ڈالی تھی اس نے۔ سوچتے سوچتے شانی

کی آنکھ لگ گئی..... اس کی آنکھ شور سے کھلی۔ اس نے جلدی سے چٹائی کی طرف دیکھا۔ رستم موجود نہیں تھا۔ بس خالی گدیلا تھا اور پھول دار تکیہ تھا۔ اچانک اسے اندازہ ہوا کہ اس نیم پختہ مکان سے باہر زبردست ہنگامہ ہو رہا ہے۔ پہلا خیال شانی کے ذہن میں یہی آیا کہ نارپوری چوہدری یا پولیس کے لوگ موقع پر پہنچ گئے ہیں۔ اس نے اوڑھنی لے کر چپل پہنی اور کھڑکی سے باہر دیکھا۔ مشعلوں اور لالٹینوں کی روشنی میں اسے عجیب منظر نظر آیا۔ رستم کے ہاتھ میں وہی کلاشنکوف تھی جو کل شانی نے دراج کے کندھے پر دیکھی تھی۔ دو تین مہتم رستم سے چمٹے ہوئے تھے اور اسے روکنے کی دیوانہ وار کوشش کر رہے تھے۔ شانی کے دیکھتے ہی دیکھتے رستم نے دو افراد کو کلاشنکوف کے کندھے سے کاری ضربیں لگائیں اور خود کو چھڑا کر لنگڑاتا ہوا بستی کی مخالف سمت میں بھاگا۔ دو دن میں ہی اس کے نحیف و زخمی جسم میں اتنی طاقت نجانے کہاں سے آ گئی تھی۔

شانی نے دیکھا کہ ایک شخص رستم کے پیچھے لپک رہا ہے۔ یہ بستی کا سردار دراج تھا۔ اس نے چند قدم بھاگنے کے بعد رستم کو عقب سے دبوچ لیا۔ دونوں اوپر نیچے پکی زمین پر گرے۔ دراج، رستم کو صرف روکنا چاہتا تھا..... رستم بھی خود کو دراج سے صرف چھڑانا چاہتا تھا لیکن چند ہی سیکنڈ میں یہ جدوجہد باقاعدہ لڑائی میں بدل گئی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو کاری ضربیں لگائیں۔ اب باقی لوگ مداخلت نہیں کر رہے تھے۔ شاید انہیں یقین تھا کہ ان کا نہایت زور آور اور پھرتیلا سردار زخمی رستم پر قابو پالے گا مگر عملی طور پر ایسا نہیں ہوا۔ بے شک دراج سانڈ کی طرح طاقتور اور چیتے کی طرح پھرتیلا تھا مگر اس کے مقابل کوئی عام شخص نہیں تھا، رستم سیال تھا۔ لڑائی بھڑائی میں جس کی صلاحیت یکتا تھی۔ جس کے بارے میں لاہور کے ایک بڑے پولیس افسر نے کہا تھا۔ ''یہ شخص اپنے مدمقابل کو قتل کرنے کی خداداد صلاحیت رکھتا ہے۔'' زخمی ہونے کے باوجود چند ہی سیکنڈ میں رستم نے دراج مہتم کو لتاڑ کر رکھ دیا۔ دونوں کیچڑ سے بھرے ہوئے ایک جوہڑ میں لڑ رہے تھے اور لت پت تھے۔ رستم کے سر کی ایک خوفناک ٹکر دراج کے چہرے پر لگی اور وہ ڈکراتا ہوا پشت کے بل جوہڑ میں گرا۔ رستم کلاشنکوف لہراتا ہوا کنارے کی طرف بڑھا، تاہم اس دوران میں دراج کے دوست عارف کبوہ نے جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے عقب سے رستم کو دبوچ لیا۔ اردگرد کھڑے افراد نے بھی اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور رستم کو روکنے کے لیے اس سے چمٹ گئے۔ رستم کے جسم میں جیسے کوئی جناتی قوت تھی۔ وہ درجن بھر افراد کی گرفت سے نکلنے کی دیوانہ وار کوشش کر رہا تھا۔ لگتا تھا کہ شاید نکل بھی جائے گا۔ غنیمت یہی تھا کہ اس نے ابھی تک فائر نہیں کیا تھا۔

جونہی شانی کا سکتہ ٹوٹا وہ دوڑتی ہوئی باہر نکلی اور مشعل برداروں کے درمیان سے رستہ بناتی رستم کے سامنے آ گئی۔ وہ غضب کے عالم میں سینے کی پوری قوت سے چیخ رہا تھا مگر آواز چند فٹ سے زیادہ دور نہیں جا رہی تھی۔ جو الفاظ شانی کی سمجھ میں آ سکے وہ یہ تھے۔ ''زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ ایک ایک کو مار دوں گا، ختم کر دوں گا۔''

اس کے بدن میں ناقابلِ مزاحمت طوفان کی ہلچل تھی لیکن جب شانی نے اس کے سینے پر دونوں ہاتھ رکھے تو یہ طوفان جیسے ایکا ایکی اپنے کناروں میں سمٹنے لگا۔ شانی نے اس کے دونوں کندھے تھام لیے۔ ''نہیں رستم..... نہیں رستم..... تم کہیں نہیں جاؤ گے۔'' اس نے بار بار کہا۔ رستم کے اعضا کی تشنجی کیفیت دھیرے دھیرے مدھم پڑنے لگی۔

چند منٹ بعد رستم، شانی کے ساتھ ایک بار پھر جھونپڑی کے کمرے میں موجود تھا۔ کیچڑ میں لتھڑی ہوئی کلاشنکوف زخمی دراج کے پاس واپس پہنچ چکی تھی۔ رستم کے کئی پرانے اور نئے زخم خون اُگلنے لگے تھے۔ وہ ایک دم نڈھال سا ہو کر چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اس نے دیوار سے ٹیک لگائی۔ سر اپنے گھٹنوں پر رکھ کر چہرہ شانی کی نظروں سے اوجھل کر لیا۔ اس کے کیچڑ میں لتھڑے ہوئے بال پنڈلیوں پر جھول رہے تھے۔ شانی نے بے ساختہ اس کے کندھے پر سر رکھا اور سسکنے لگی۔ ''نہیں رستم! میں تمہیں یہ سب نہیں کرنے دوں گی۔ میں تمہیں زندہ دیکھنا چاہتی ہوں۔ وہ لوگ تمہیں نہیں چھوڑیں گے۔ وہ سب اکٹھے ہو چکے ہیں۔ پولیس ان کے ساتھ ہے۔ عام لوگ ان کے ساتھ ہیں.....''

وہ خاموش بیٹھا رہا جیسے جواب دینا ہی نہ چاہتا ہو۔ جیسے اسے ڈر ہو کہ جواب دیتے ہوئے اس سے کوئی گستاخی ہو جائے گی۔

اس کے کئی زخموں کے منہ پھر کھل گئے تھے۔ شانی ایک بار پھر اس کی مرہم پٹی میں مصروف ہو گئی۔ عارف وغیرہ نے احتیاط کے طور پر کمرے کا دروازہ باہر سے بند کر دیا تھا۔

اگلے روز رستم دیر تک سویا رہا۔ شانی جاگتی رہی اور اس کے اردگرد موجود رہی۔ رستم سیدھا لیٹا تھا۔ اس کے لمبے بالوں کی ایک لٹ خم کھا کر اس کی ناک سے چھو رہی تھی۔ ناک سے آتی جاتی ہر سانس کے ساتھ یہ لٹ حرکت کرتی تھی۔

[illegible] کی نیند میں خلل ڈالتی تھی۔ شانی محویت سے دیکھتی [illegible] کا دل چاہا اس لٹ کو آہستگی سے ہٹا کر رستم کے کان [illegible] پیچھے اُڑس دے مگر ایسا..... کرتے ہوئے اسے عجیب [illegible] محسوس ہو رہی تھی۔ شرم ایک سنسناہٹ کی طرح اس [illegible] دوڑ جاتی تھی۔ وہ اس کے چہرے کو دیکھتی رہی۔ [illegible] خوش میں عجیب سی حلاوت تھی، تاہم حالتِ نیند میں [illegible] ''تکلیف اور دکھ سے متاثر نظر آتی تھی..... وہ [illegible] اور اس کے سینے میں کچھ رستا رہا۔ پھر اس نے [illegible] رستم کی کیچڑ آلود لٹ آہستہ سے اس کے چہرے [illegible] کان کے پیچھے اُڑس دی۔

[illegible] دبی دبی ہنسی کی آواز سنائی دی اور شانی بری [illegible] چونک گئی۔ اس نے دیکھا کہ کمرے کی شکستہ کھڑکی کی [illegible] میں سے دو تین عورتیں اندر جھانک رہی تھیں۔ شانی [illegible] تو وہ ہنستی ہوئی تیزی سے پلٹ گئیں۔ یہ مہتم عورتیں [illegible] انہوں نے گھاگرے اور چولیاں وغیرہ پہن رکھی [illegible]۔ شانی اپنے آپ میں خجل سی ہوئی اور رستم سے کچھ دور [illegible] بیٹھ گئی۔

[illegible] کے وقت جب شانی، رستم کو ہلدی ملا دودھ پینے پر [illegible] رہی تھی ایک بار پھر کچھ لڑکیاں اور بچے کھڑکی کے آس [illegible] آئے۔ ان کی دبی دبی ہنسی بھی شانی کو سنائی دی۔ [illegible] فوراً جھڑکی عورت کمرے میں داخل ہوئی جو تین دن [illegible] عارف کبوہ اور دراج مہتم کے ساتھ اندر آئی تھی۔ شانی [illegible] تھی کہ یہ کھلیا دراج کی بیوی ہے۔ اس کا نام ماکھو تھا۔ [illegible] رنگ کی اٹھائیس تیس سالہ اور قدرے فربہ عورت [illegible] کے ہاتھوں میں چاندی کے وزنی کڑے اور کانوں [illegible] وغیرہ اسے دوسری عورتوں سے ممتاز کرتے تھے۔ یہ [illegible] کے بجائے کڑھائی دار شلوار کرتہ پہنتی تھی۔ [illegible] گریبان پر بے شمار سیپیاں اور چاندی کے ستارے [illegible] ہوئے تھے۔ بستی کی دیگر اہم عورتوں کا لباس بھی [illegible] تھا۔ ماکھو کے ساتھ دو تین اور عورتیں بھی کمرے [illegible] عارف کبوہ بھی ان کے ساتھ تھا۔

[illegible] سنجیدہ تھی لیکن دوسری عورتوں کی آنکھوں میں ہلکی [illegible] دکھائی دیتی تھی۔ ماکھو نے اپنائیت بھرے لہجے [illegible] طلب کرتے ہوئے کہا۔ ''چل کڑی! تو ہمارے [illegible] کمرے میں آ جا۔ بندے اور جناتی کا ایک [illegible] اچھا نہیں لگتا۔ وہاں ہم آپس میں گل بات بھی [illegible] کریں گی۔ تمہارا دل لگا رہے گا۔''

[illegible] تو ماکھو کی صحیح تھی لیکن شانی کو رستم کی فکر بھی تھی۔ شانی نے تذبذب کی نظروں سے رستم کو دیکھا۔ عارف کبوہ بولا۔ ''میری بہن! اس کے بارے میں فکرمند ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہم ہیں ناں، ہر طرح خیال رکھیں گے۔''

شانی جب سے عارف کبوہ سے ملی تھی، اس کے لہجے میں شانی کو سچائی، جذبہ اور خلوص ہی دکھائی دیا تھا۔ اس کے دل نے گواہی دی کہ عارف جو کہہ رہا ہے درست کہہ رہا ہے۔ رستم پتھر کی طرح ساکت بیٹھا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ اس نے فی الوقت سب کچھ شانی پر چھوڑ دیا ہے۔ (رستم کے دل و دماغ کے اندر کیا چل رہا تھا اس بارے میں شانی کو کچھ معلوم نہیں تھا)

شانی نے رستم سے ایک دو باتیں کیں۔ اسے دوا اور مرہم پٹی کے بارے میں چند ہدایتیں دیں اور ماکھو کے ساتھ کمرے سے نکل آئی۔ عارف کبوہ کمرے میں رستم کے پاس ہی رہ گیا۔ شانی کو جس دوسرے مکان میں لایا گیا، وہ پہلے مکان کے ساتھ ہی تھا، تاہم قدرے بڑا اور کشادہ تھا۔ یہ پختہ اینٹوں سے بنایا گیا تھا۔ بیرونی چار دیواری جو آٹھ دس فٹ اونچی تھی پکی تھی، صحن بھی کچا تھا۔ مکان کے کسی بھی حصے میں پلاستر نہیں کیا گیا تھا۔ کمروں کی دیواروں پر سستی قسم کی دو چار رائفلیں اور کلہاڑیاں آویزاں تھیں۔ اس نیم پختہ مکان کو سرکنڈوں سے بنی ہوئی اشیا سے سجانے کی کوشش کی گئی تھی۔ یہی سردار دراج اور اس کی بیوی ماکھو کا ٹھکانا تھا۔ چند ہی گھنٹوں میں شانی کو یہاں وی آئی پی مہمان کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ بستی بھر کی عورتیں اسے دیکھنے کے لیے آنے لگیں۔ وہ آپس میں سرگوشیاں کرتی تھیں اور ان کی سرمہ لگی آنکھوں میں شوخی کروٹ لیتی محسوس ہوتی تھی۔ ان میں سے کئی نے چاندی، شیشے اور پلاسٹک وغیرہ کے زیورات پہن رکھے تھے۔ ان کے رنگ گندمی یا سانولے تھے۔ بالوں کو خاص انداز میں مینڈیوں کی شکل میں بنایا گیا تھا۔ شانی ان کے لیے ایک عجوبے کی طرح تھی۔

شانی کے کھانے پینے کا خاص خیال رکھا جا رہا تھا۔ دودھ، مکئی اور جوار کی روٹی، گڑ والے چاول، مرغی کا گوشت یہاں کے خاص کھانے تھے۔ رات کو ماکھو نے کہا۔ ''کسی چیز کی ضرورت ہو تو بالکل شرم نہ کرنا۔ ہم چاہتے ہیں کہ تم اور رستم دو چار دن میں ہی بٹے کٹے ہو جاؤ۔''

شانی بولی۔ ''میں نے تمہارے خاوند سے منت کی تھی کہ کسی طرح رستم کے ساتھیوں تک رستم کے بارے میں اطلاع پہنچا دے۔ پتا نہیں کہ اس نے کچھ کیا ہے کہ نہیں۔''

ماکھو پھنکار مار کر شانی کے سامنے بیٹھ گئی اور بولی۔ ''تم

اتنا بھکر کیوں کرتی ہو۔ ملوک سی جندڑی ہے تمہاری۔ اس کو اتنی مصیبت میں مت ڈالو۔ وہ عارمیر (عارف) ہے ناں میرے بندے کا یار، وہ آج اپنے پنڈ واپس جا رہا ہے۔ وہ پڑھا کو اور ہوشیار بندہ ہے۔ وہ ٹھیک موقع دیکھ کر رستم کے ساتھیوں کو اس کے بارے میں جرور بتا دے گا۔''

''وہ واپس کیوں جا رہا ہے؟'' شانی نے پوچھا۔

''اس کا جانا جروری ہے نکڑی! وہ جیادہ دیر اپنے پنڈ سے غیب رہے گا تو پلس کو اس پر شک ہوگا۔ پلس والے ہر جگہ تم دونوں کو ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔ اللہ مولا کا شکر ہے کہ ابھی وہ ہمارے علاقے سے دور دور ہیں.....''

اگلے دن عجیب واقعہ ہوا۔ بہت سی عورتیں مکان کے برانڈے میں جمع ہوگئیں اور کوئی مقامی گیت گانے لگیں۔ سازوں کے طور پر ڈھولکی کے علاوہ اک تارا، بانسری، طبلہ وغیرہ استعمال کیے جا رہے تھے۔ یہ خوشی کا گیت تھا جس میں دریا کے کنارے سرکنڈوں میں شیاروں کے ناچنے اور محبوب سے ملنے کا ذکر تھا۔ ان لڑکیوں کا ذکر تھا جو اپنے نازک کومل ہاتھوں سے سرکانوں کے چھلکوں اور سوکھی ہوئی داب سے خوبصورت آرائشی چیزیں بناتی ہیں۔ ایسی چیزیں جن کو دیکھ کر شہری بابو..... بنانے والیوں کے ان دیکھے ہاتھوں پر عاشق ہو جاتے ہیں۔ ایسے ہی کئی خوشی بھرے گیت مہتم لڑکیوں نے گائے۔ شانی نے اندازہ لگایا کہ شاید ان لوگوں کا کوئی تہوار قریب آ رہا ہے۔

رات کو مشعلوں کی روشنی میں بھی بہت سے مرد و زن اور بچے جمع ہوئے۔ بچوں میں سے کچھ نیم سرد موسم کے باوجود بالائی لباس نہیں پہنے ہوئے تھے۔ پہلے گانے بجانے کا سلسلہ ہوتا رہا پھر مکان کے سامنے احاطے میں موجود مردوں کے جمگھٹے میں سے کچھ مردوں نے اٹھ کر ڈھول کی تھاپ پر ناچنا شروع کر دیا۔ ان میں سے کچھ لوگ مقامی طور پر تیار کی گئی ایک سفید شراب بھی پی رہے تھے۔ الاؤ کے گرد ناچتے ہوئے ان کے چہرے تمتمانے لگے اور حرکات و سکنات میں ایک خوشی بھرا جوش نمایاں ہوتا چلا گیا۔ صحن کے اندر عورتیں مسلسل گانے بجانے میں مصروف تھیں۔ شانی کمرے کی کھڑکیوں میں سے یہ سارے مناظر دیکھ رہی تھی۔

اچانک ایک گھڑسوار مردوں کے جمگھٹے کی طرف نمودار ہوا۔ اس کے سر پر بڑا سا پگڑ اور کندھے پر رائفل تھی۔ تین چار مزید کلہاڑی بردار افراد بھی اس کے ساتھ تھے۔ یہ لوگ تیزی سے صحن کی طرف آئے۔ اس سے پہلے کہ اندر موجود عورتیں دروازہ اپنی طرف سے بند کرتیں، وہ دندناتے ہوئے اندر گھس آئے۔ پگڑ والے ہٹے کٹے نوجوان نے رائفل سونت لی۔ عورتیں چیخ اٹھیں۔ وہ سیدھا ایک نوجوان لڑکی کی طرف بڑھا۔ اس سجی سنوری لڑکی نے اٹھ کر بھاگنا چاہا لیکن پگڑ والے نوجوان نے لپک کر اسے دبوچ لیا۔ باقی عورتوں نے اسے چھڑانے کی کوشش کی مگر کلہاڑی بردار نے للکارے مار کر عورتوں کو پیچھے ہٹا دیا۔ دھینگا مشتی میں سجی سنوری لڑکی کا لہنگا پھٹ گیا۔ تنومند نوجوان نے ایک نعرہ مارا اور اسے اٹھا کر اپنے کندھے پر ڈال لیا۔ مردوں کی طرف سے کئی افراد نے مزاحمت کرنے کے لیے آئے مگر پگڑ والے نے بائیں ہاتھ سے لڑکی کو کندھے پر دبوچے رکھا اور دائیں ہاتھ سے کئی ہوائی فائر کیے۔ شانی نے دیکھا لڑکی کے ہاتھ اپنے یا پگڑ والے کے خون سے لتھڑے ہوئے تھے۔ جب پگڑ والا لڑکی کو لے کر بیرونی دروازے کی طرف بڑھا تو لڑکی نے یہ خون آلود ہاتھ ایک ادھیڑ عمر شخص کے کندھے پر ثبت کر دیے جیسے اس کے کندھے پر اپنی نشانی چھوڑ کر جا رہی ہو۔ شانی نے دیکھا کہ ڈھولک بجانے والی کچھ عورتیں اس ہنگامے کے باوجود مسلسل ڈھولک بجا رہی تھیں۔ باہر الاؤ کے گرد کچھ مہتم مرد بھی بدستور بجور رقص تھے۔ اچانک شانی کی سمجھ میں آیا کہ یہ سب کچھ کھیل تماشے کا حصہ ہے..... خوشی منانے کے اس مقامی طریقے میں غالباً کسی قدیم واقعے کی جھلک پیش کی گئی تھی..... مختلف برادریوں اور قبیلوں میں شادی کے لیے لڑکیوں کو اغوا کرنے کی رسم بہت پرانی ہے..... پگڑ والے نے لڑکی کو اپنے آگے سفید گھوڑے پر بٹھایا اور الاؤ کا ایک چکر مکمل کرنے کے بعد اسے گھوڑے سے اتار دیا۔ وہ بھاگتی اور ہنستی ہوئی عورتوں کے درمیان واپس آ گئی۔ اس کے ہاتھوں پر غالباً کسی پرندے کا خون لگایا گیا تھا۔ اس خون کی چھاپ اس نے اپنے ''اغوا'' کے وقت اپنے باپو کے کندھے پر لگائی تھی۔ یہ ناچ گانا رات دس گیارہ بجے تک جاری رہا۔ کھیا دراج اس میں پیش پیش تھا، تاہم عارف کبوہ کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

رات سونے سے پہلے ماکھو نے اسے بتایا کہ ''عارمیر واپس چلا گیا ہے۔ شانی نے ماکھو سے ناچ گانے کے بارے میں پوچھا۔ ماکھو نے اس کا کوئی واضح جواب نہیں دیا۔ جب شانی نے پوچھا کہ کیا یہ سب کسی تہوار کے حوالے سے ہے تو ماکھو نے مبہم انداز میں اثبات میں جواب دیا۔ شانی نے صاف محسوس کیا کہ وہ کچھ چھپا رہی ہے۔ شانی نے ماکھو سے رستم کی خیر خیریت دریافت کی پھر گفتگو کا رُخ مقامی حالات کی طرف مڑ گیا۔

ماکھو نے اپنے مخصوص لب و لہجے میں شانی کو جو کچھ بتایا

اس سے پتا چلا کہ یہ مہتموں کی بستی ہے اور ڈیک نالے کے علاقے اس طرح کی دو بستیاں اور بھی ہیں۔ یہ لوگ خانہ بدوش تو نہیں تھے، تاہم سیلانی مزاج رکھتے تھے اور آوارہ گردی کی عادتیں ان میں موجود تھیں۔ یہ زبردست قسم کے شکاری بھی تھے۔ ان میں سے کچھ لوگ ایسے تھے جو مسلمان ہونے کے باوجود اب بھی جنگلی سؤر کا گوشت کھا جاتے تھے یا ویسے ہی لامذہب لوگ تھے۔ ماکھو نے جو کچھ بتایا اس سے پتا چلا کہ نرسل (سرکنڈا) سے گھریلو استعمال کی مختلف اشیا بنانا ان لوگوں کا پیشہ تھا۔ ویسے یہ خود کو راجپوتوں کی شاخ قرار دیتے تھے۔ عموماً شہروں اور قصبوں سے کچھ فاصلے پر چھپروں یا کچے مکانوں میں رہائش رکھتے تھے۔ مقامی کبوہ برادری کے ساتھ ان لوگوں کے اچھے تعلقات تھے۔ ماکھو سے باتوں کے دوران میں شانی کو ایک نئی بات یہ بھی معلوم ہوئی کہ کبوہ برادری کے مقامی لوگوں نے لڑکی کی موت کا مسئلہ ابھی تک نہیں کھولا۔ وہ صفیہ کی قبر کشائی کا ارادہ رکھتے ہیں اور اس کا پوسٹ مارٹم کرانا چاہتے ہیں۔ باتیں کرتے ہوئے ماکھو کا بیٹا شانی کو محبت بھری نظروں سے دیکھتی تھی اور اس کے بال سنوارنے لگ جاتی تھی۔ وہ شانی کے لیے سچی ہمدردی محسوس کر رہی تھی اور ماضی کے حوالے سے اسے کریدنے کی کوشش بھی کر رہی تھی۔ اس نے شانی کو بتایا۔ ''ہمارے ایک سردار مہتم ہیں۔ سر پر ہاتھ رکھ کر بندے کا ہر دکھ درد دور کر دیتے ہیں۔ میں کہیں ان سے جرور ملاؤں گی۔ تم دیکھنا کتنا چین ملتا ہے تمہیں۔ پھر سے جندہ نہ ہو جاؤ تو میرا نام بدل دینا۔''

اسی دوران میں شانی نے کھڑکی سے دیکھا۔ بہت سے مشعل بردار مہتم ایک چارپائی اٹھائے بستی کی طرف آ رہے تھے۔ پہلے تو وہ سمجھی کہ شاید کوئی جنازہ ہے مگر چارپائی پر جو ساکن غیر متحرک جسم تھا وہ حرکت کر رہا تھا۔ وہ سرتاپا ایک سفید چادر میں چھپا ہوا تھا۔

''یہ کیا ہے؟'' شانی نے پوچھا۔

ماکھو بولی۔ ''ہماری آبادی کی ایک جنانی (عورت) سہ شہر میں نوکری کرتی تھی۔ اُدھر بیمار پڑ گئی۔ وہاں وڈے ہسپتال میں ایک مہینے تک اس کا علاج شلاج ہوتا رہا ہے۔ ٹھیک ہو گئی ہے اور واپس آئی ہے۔''

چارپائی والی عورت کو ایک قریبی جھونپڑے میں لے گئے۔ یہ خاصا بڑا مکان نما جھونپڑا تھا۔ کافی رات ہونے کے باوجود یہاں بہت سے مرد و زن جمع ہو گئے اور خوشی بھری آوازیں آنے لگیں۔

☆☆☆

اگلے روز دوپہر کو شانی نے کمرے کی کھڑکی سے عجیب منظر دیکھا۔ بہت سے مہتم مکان کے صحن اور باہر گلی میں جھنڈیاں لگا رہے تھے۔ صحن اور گلی کو خوب اچھی طرح صاف بھی کیا گیا تھا۔ دو افراد مسلسل ڈھول اور بانسری بجانے میں مصروف تھے۔ ایک گیدڑ کے گلے میں پٹا ڈال کر اسے گلی کے بچوں بیچ باندھا گیا تھا۔ اس گیدڑ کی پشت ایک پھول دار ریشمی کپڑے سے ڈھانپی گئی تھی۔ صحن کے ایک گوشے میں پیتل کے دو بڑے بڑے پتیلوں میں کچھ پکایا جا رہا تھا۔ ایک مہتم لڑکی اپنی چاندی کی تھیلی چمکاتی ہوئی شانی کے پاس سے گزری تو شانی نے پوچھا۔ ''بہن! یہ کیا ہو رہا ہے؟''

''ہم کو کیا پتا؟'' لڑکی نے کہا اور مسکراتی ہوئی آگے نکل گئی۔

ایک ادھیڑ عمر عورت آگے بڑھی۔ اس نے محبت سے شانی کے سر پر ہاتھ پھیرا اور بولی۔ ''نکڑی! آج تیری ڈھولک ہے۔ کل دیاہ ہونا ہے تیرا..... رستم سیال کے ساتھ۔'' شانی کے سر پر جیسے کسی نے وزنی ہتھوڑا مار دیا تھا۔ وہ حیرانی سے ادھیڑ عمر مہتم عورت کی طرف دیکھتی چلی گئی۔ دیاہ یعنی شادی کا لفظ اس کی سماعت کو مفلوج کر رہا تھا۔

''یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟'' شانی نے ششدر لہجے میں پوچھا۔

''ہائے ہائے نکڑی! اس میں اتنا حریان ہونے کی کیا بات ہے۔ تمہارا دیاہ ہو رہا ہے، کوئی تمہیں اٹھا کر تو نہیں لے جا رہا ہے۔ ہمارے وڈ وڈیرے ایک جمانہ پہلے کہہ گئے ہیں جب کسی جوان جنانی کا کھاوند مر جائے تو اس پر چادر ڈالو۔ اس کام کا اتنا بڑا اجر ہے کہ کوئی کھیال بھی نہیں کر سکتا۔ جتنا اجر چادر ڈالنے والوں کو ہوتا ہے اتنا اس کو بھی ہوتا ہے جس پر چادر ڈالی جائے (شادی کی جائے)''

شاید بوڑھی عورت کچھ اور بھی کہتی مگر شانی کے ذہن میں تو آندھی چل رہی تھی۔ وہ تیزی سے دوسرے کمرے میں آ گئی۔ اب اسے پتا چل رہا تھا کہ رات کو جو کھیل تماشے ہوئے تھے وہ بھی اس ''شادی'' کی تقریب کا حصہ ہی تھے۔

یہ کیا ہو رہا تھا؟ کیسے ہو رہا تھا؟ کیا رستم کو اس ساری صورتِ حال کا علم تھا؟ اگر اسے علم تھا تو کیا یہ سب اس کی مرضی سے ہو رہا تھا؟ عورتوں نے شانی کے سامنے کھل کر کوئی بات نہیں کی تھی مگر عارف کبوہ اور دراج وغیرہ تو رستم کے سامنے کھل کر بات کرتے تھے۔ چار دن پہلے دراج نے شانی اور رستم کے سامنے ہی کہا تھا کہ وہ کلمے پڑھوا کر ان دونوں کو ایک کر دے گا۔ رستم کی صورت شانی کی نگاہوں میں گھومنے

لگی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ شانی سے پوچھے بغیر رستم یہ سب کچھ کیسے ہونے دے رہا تھا۔ اتنا بڑا اقدم اور ایسی بے خبری کے عالم میں..... ایسی من مرضی کے ساتھ۔ شانی کے سینے میں ٹیسیں سی اٹھنے لگیں۔ اسے لگا جیسے اس کے سینے کے اندر کوئی عظیم الشان شے ٹوٹ رہی ہے۔ اس میں دراڑیں پڑ رہی ہیں۔

وہ ایک بار پھر کھڑکی میں آ گئی۔ آنکھوں میں موجود نمی نے اردگرد کے مناظر کو دھندلا رکھا تھا۔ وہ رستم سے ملنا چاہتی تھی..... وہ اسے دیکھنا چاہتی تھی..... کبھی کبھی دل کی آرزو بڑی جلدی پوری ہو جاتی ہے۔ جونہی شانی کھڑکی میں آئی، رستم اسے کھیا دراج کے گھر سے نکلتا دکھائی دیا۔ دو مہتم جن کے کندھوں سے رائفلیں لٹک رہی تھیں اس کے عقب میں تھے۔ اندازہ ہوتا تھا کہ انہوں نے رستم پر نگاہ رکھی ہوئی ہے جیسے انہیں اندیشہ ہو کہ باہر آنے کے بعد رستم کچھ بھی کر سکتا ہے..... شانی آج کئی دن بعد اس کی صورت دیکھ رہی تھی۔ اس کے سر پر ابھی تک پٹیاں بندھی تھیں۔ چال میں بھی لنگڑاہٹ موجود تھی، تاہم اس نے لباس بدلا ہوا تھا۔ اس کے جسم پر ریشمی لاچہ اور کرتہ تھا۔ اپنے کندھے کے زخم کو بائیں ہاتھ سے سہلاتے ہوئے اس نے جنگلی گیدڑ کی طرف دیکھا۔ مہتم بچوں نے اس کے سامنے کھانے پینے کی بہت سی مزیدار اشیا ڈال دی تھیں۔ رستم کو دیکھ کر یہ بچے رستم کے گرد جمع ہو گئے اور خوف آمیز اپنائیت کے ساتھ اسے دیکھنے لگے۔ رستم کے چہرے پر حیرانی کے تاثرات تھے پھر اس کی نگاہ اوپر اٹھی اور وہ کھڑکی میں شانی کو دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ دونوں کئی سیکنڈ تک ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ دونوں ہی کی آنکھوں میں سوالات تھے..... وہ دونوں ہی جیسے ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے، یہ کیا ہو رہا ہے؟ کیا ہو رہا ہے؟

شانی کی آنکھوں میں آنسوؤں کی چمک تھی۔ ان آنسوؤں کو دیکھ کر رستم کے چہرے پر نظر آنے والے کرب میں اضافہ ہو گیا۔ وہ ایک دم زیادہ بے قرار و بے چین نظر آنے لگا۔ ان دونوں کے درمیان پچیس تیس میٹر سے زیادہ فاصلہ تھا۔ وہ ایک دوسرے کو دیکھ سکتے تھے مگر بات نہیں کر سکتے تھے۔ تب شانی نے دیکھا کہ رستم ایک جواں سال مہتم سے کچھ پوچھ رہا ہے۔ یہ مہتم کھیا دراج کی بیوی ماکھو کا بھائی تھا۔ ان دونوں کے درمیان قریباً دو منٹ تک بات ہوئی پھر شانی نے دیکھا کہ رستم ایک دم مشتعل ہو گیا ہے۔ کچھ وہی کیفیت اس پر طاری ہو گئی تھی جو تین چار دن پہلے ہوئی تھی۔ وہ اپنے زخمی جسم کو تیزی سے حرکت دیتا ہوا رنگ برنگی جھنڈیوں کی طرف بڑھا اور انہیں توڑ توڑ کر پھینکنے لگا۔ پھر اس کا دھیان پیتل کے بڑے بڑے دیگچوں کی طرف گیا۔ اس سے پہلے کہ کوئی کچھ کرتا، اس نے دونوں دیگچے اُلٹا دیے۔ چاروں طرف افراتفری پھیل گئی۔ مہتم ہو کر بھاگ گئے۔ مہتم عورتیں دروازوں میں سمٹ گئیں۔ رستم نے ایک ڈھولچی کو پکڑا اور اس سے ڈھول کر دیوار سے دے مارا۔ زوردار دھماکے کے ساتھ خوراکی کرتا ہوا گیدڑ بے طرح خوفزدہ ہوا اور انہار سانپ کی مضحکہ خیز کوششیں کرنے لگا۔ کئی مہتم مردوں نے اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا اور اسے سنبھالنے کی کوشش کرنے لگے۔ وہ خود کو چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا اور پوری قوت چلا رہا تھا، تاہم اس کی آواز اتنی بیٹھ چکی تھی کہ بمشکل اس کے اپنے کانوں تک ہی پہنچ سکتی ہو گی۔

یہ منظر دیکھ کر شانی کے ہاتھ پاؤں سرد ہو گئے۔ وہ کھڑکی سے ہٹی اور بے دم سی ہو کر کمرے میں رکھی چارپائی پر بیٹھ گئی۔ واقعات میں عجیب سی تیزی آ گئی تھی۔

پانچ دس منٹ اسی طرح گزر گئے۔ باہر موجود ہنگامہ اب سرد ہو گیا تھا۔ کچھ دیر بعد شانی نے محسوس کیا کہ رستم اس کی طرف آ رہا ہے۔ وہ غالباً اکیلا آ رہا تھا۔ دروازہ کھلا تھا پھر بھی اس نے دستک دی۔ شانی نے کہا۔ ”آ جاؤ!“

وہ آ گیا۔ وہیں دہلیز پار کر کے کھڑا ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اس کے چہرے پر زلزلے کی کیفیت تھی۔ اس نے کچھ بولنے کی کوشش کی۔ گلے کی رگیں پھول گئیں۔ بس کھیں کھیں کی آواز نکل کر رہ گئی۔ اس نے بڑے کرب کے ساتھ صحن میں اُلٹے ہوئے دیگچوں اور بکھری ہوئی جھنڈیوں کی طرف اشارہ کیا پھر شانی کی طرف دیکھ کر نفی میں سر ہلانے لگا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ یہ جو کچھ ہو رہا تھا اس نے نہیں کیا۔ نہ ہی اس کی مرضی سے ہو رہا تھا۔ شانی کے ذہن میں مدوجزر تھا۔ اس نے آنسو پونچھتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔ ”مجھے پتا تھا رستم..... مجھے پتا تھا۔“

وہ اس کے قریب چلی آئی۔ وہ بولا۔ چند ٹوٹے پھوٹے الفاظ بمشکل شانی کے کانوں تک پہنچ پائے۔ ”میں نہیں..... سوچ بھی نہیں سکتا.....“

شانی نے آنسو بہاتے ہوئے پھر اثبات میں سر ہلایا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس موقع پر رستم سے مزید کیا کہے۔ وہ اس کے زخموں کے بارے میں بات کرنا چاہتی تھی اس کی ”آواز“ کے بارے میں کچھ کہنا چاہتی تھی جو پہلے سے زیادہ خراب اور ناقابلِ سماعت تھی..... لیکن وہ کچھ بھی نہ کہہ

سکی۔ وہ بس اس کی طرف دیکھتی رہی۔ اس کے چہرے پر کرب، مایوسی اور بے چارگی کے ایسے تاثرات تھے جو صرف دیکھے جاسکتے تھے، بیان نہیں کیے جاسکتے تھے۔ شاید یہ ویسے ہی تاثرات تھے جو ایک عرصہ پہلے رنگ والی کی حویلی میں شانی کا طمانچہ کھا کر اس کے چہرے پر نمودار ہوئے تھے۔ اس سے پہلے کہ شانی کچھ کہہ پاتی۔ وہ مڑا اور لنگڑاتا ہوا باہر نکل گیا۔ اس کے انداز میں تسلیم و رضا کی ایک ایسی کیفیت تھی جو ایک شدید لیکن میٹھی چبھن کی طرف شانی کے سینے میں گہرائی تک اتر جاتی تھی۔ وہ درد سے بے حال ہوتی تھی مگر یہ درد اچھا بھی لگتا تھا۔ عجیب دیوانہ تھا وہ۔ بے مثال جذبے اور رویے تھے اس کے۔ کسی وقت تو وہ شانی کو اتنا الو کھا لگتا تھا کہ وہ بالکل چکرا جاتی تھی۔ وہ اس کی سمجھ سے بالاتر ہو جاتا تھا۔ تاؤ حشام کے بندی خانے میں رستم کے حوالے سے شانی نے جو کچھ دیکھا تھا وہ ابھی تک اس کے ذہن میں تازہ تھا۔ وہ خود فراموشی کی کیفیت وہ اذیت پسندی، وہ رقصِ مستانہ..... رستم کے جانے کے بعد وہ دیر تک کمرے میں بند رہی۔ ہاں، اس کے سینے میں مدوجزر تھا۔ آنسو بے وجہ ہی آنکھوں سے اُمڈے پڑ رہے تھے۔ رستم کی حالت زارِ لمحہ لمحہ اس کے دل پر چرکے لگا رہی تھی۔ اچانک کچھ قدموں کی چاپ اُبھری اور پھر دروازے پر دستک ہوئی۔ شانی نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ سامنے درمیانی عمر کی قریباً دس مہتم عورتیں کھڑی تھیں۔ ان میں ماکھو سب سے آگے تھی۔ یہ ساری عورتیں ممتاز حیثیت کی حامل تھیں کیونکہ ان سب نے چاندی کے زیورات پہن رکھے تھے۔ ان کی آنکھوں میں شانی کے لیے اپنائیت اور ہمدردی تھی۔ وہ اپنے کپڑے سنبھالتی اور زیورات کڑکڑاتی ہوئی شانی کے اردگرد بیٹھ گئیں۔ ماکھو نے محبت سے شانی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور بولی۔ ''بکڑی! یہ پر تیرے لیے بڑا... چنگا ہے۔ وہ جتانی بڑی کھش قسمت ہوتی ہے جسے کوئی بندہ اپنے من سے چاہتا ہے..... اور وہ چاہتا ہے تجھے..... دیکھ ہم دس جتانیاں تیرے چاہنے والے کی سہارش بن کر تیرے پاس آئی ہیں۔ ہماری برادری کے دس بڑے کھاندان ہیں۔ ہر کھاندان کی ایک بڑی جتانی تیرے سامنے ہے اور تیری منت کرتی ہے کہ تو اپنے چاہنے والے کی ووہٹی بن جا۔ وہ ہر طرح سے تیرے لیے اچھا ہے۔ وہ ان ساری دشمنیوں کے سامنے دیوار بن جائے گا جو تیرے چاروں پاسے گھیرا ڈال رہی ہیں۔ اگر وہ.....''

''آپ آپ..... یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟'' شانی نے بے حد پریشانی سے اس کی بات کاٹی۔

''ہم وہی کہہ رہی ہیں بکڑی جو تیرے اپنے من میں بھی ہے۔'' ایک دوسری عورت نے مسکراتے لہجے میں کہا۔ ''شرع میں شرم نہیں۔ شرم تو لچے پن میں ہوتی ہے۔ یہ تو وہ کام ہے جس میں اللہ کھش اور اللہ کا رسول بھی کھش۔ تم دونوں ایک دوجے کو چاہتے ہو۔ بس یہی بات یاد رکھو، باقی سب کچھ بھول جاؤ۔ جگ والوں کو تو کوئی کھش کر سکا ہے نہ کر سکے گا۔''

ماکھو نے شانی کے رخسار پر ہاتھ پھیرا۔ ''من جانکڑی من جا! تمھیں تو پتا ہے کیا ہوگا؟'' اس نے ایک لمحہ توقف کیا اور بڑے پیار سے بولی۔ ''ہم سب کے سب..... سارے بستی والے بھگ ہڑتال کر دیں گے..... تیری جان مصیبت میں ڈال دیں گے۔''

اچانک ایک شور سا شانی کے کانوں میں داخل ہونے لگا۔ اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ پہلو بدلا اور گردن لمبی کر کے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ وہاں بیسیوں مہتم گھر کے سامنے جمع ہو چکے تھے اور ابھی مزید آ رہے تھے۔ ان میں عورتیں، بچے، مرد سب شامل تھے۔ قریباً چالیس پچاس عورتیں اور لڑکیاں اگلی صف میں تھیں۔ ان کے ہونٹوں پر دبی دبی مسکراہٹیں تھیں۔ کئی ایک کے ہاتھوں میں دف نما ساز تھے۔ اچانک انہوں نے ایک ساتھ سروں کو جنبش دی اور گانا شروع کر دیا۔ یہ ایک قدیم پنجابی گیت تھا۔ اس میں گورکھی اور مقامی بولیوں کی آمیزش تھی۔ دوہے کی طرز کے اس گیت کا مفہوم کچھ اس طرح تھا۔

من جا پیاری من جا
ہماری راج دُلاری من جا
تیرا ماہی بڑی دور سے آیا ہے
اُس کا مکھڑا زخموں نے گہنایا ہے
اُس کے جسم میں کانٹے ٹوٹے ہیں
اپنے پرائے سب اُس کے چھوٹے ہیں
دیکھ لی! اُس کے بھیڑے حالوں کو
دیکھ لی! اُس کے پاؤں کے چھالوں کو
بڑا پیاسا ہے..... اپنا روپ پلا دے اُس کو
گلے لگا لے اُس کو
تو اُس کی ووہٹی بن جا
من جا پیاری من جا
راج دُلاری من جا
پنج دریاؤں کی کوکھ سے اُبھرنے والے اس قدیم گیت کی لے بلند ہو رہی تھی.....

مشکلات کے بھنور میں پھنسی شانی کی داستانِ حیات کے مزید واقعات اگلے ماہ پڑھیے

حقیقت کے دھاگوں سے بُنے گئے قاتل خوابوں کا تانا بانا۔ ایک ڈاکٹر ان خوابوں سے پریشان تھا اور اس کی پریشانیوں نے ایک وکیل کو عاجز کر رکھا تھا۔

قاتل خواب

احمد صغیر صدیقی

''میں ایسے متعدد وکیلوں کو جانتا ہوں جو اچھے ماہرینِ نفسیات کی خدمات حاصل کرتے رہتے ہیں۔'' جان میلون نے کہا۔ ''تاہم یہ پہلا موقع ہے کہ میں ایک سائکاٹرسٹ کو دیکھ رہا ہوں جسے کسی اچھے وکیل کی ضرورت ہے۔''

ڈاکٹر مارٹن نے کہا۔ ''میلون تمہاری بات خاصی پُرمذاق ہے'' وہ ہنسے بغیر بولا۔ ''تم نے ایک آدھ بار مجھ سے مدد لی ہے'' اس کے وجیہہ چہرے پر ایک ہلکی سی لکیر پیدا ہوئی جسے مسکراہٹ کہا جا سکتا تھا۔ ''مثلاً گیفورڈ کیس میں۔''

''تم نے گیفورڈ کیس کو عمدگی سے سنبھالا تھا۔'' میلون نے تعریف کی۔ ''اور میں نے اس کا دفاع بھی خوب کیا تھا۔ حالانکہ ہم دونوں کو علم تھا وہ شخص کسی الو کی طرح صحیح الدماغ ہے۔'' ذرا سا ٹھہر کر اس نے کہا۔ ''بلاشبہ جیوری کے سامنے تم.....'' وہ بولتے بولتے

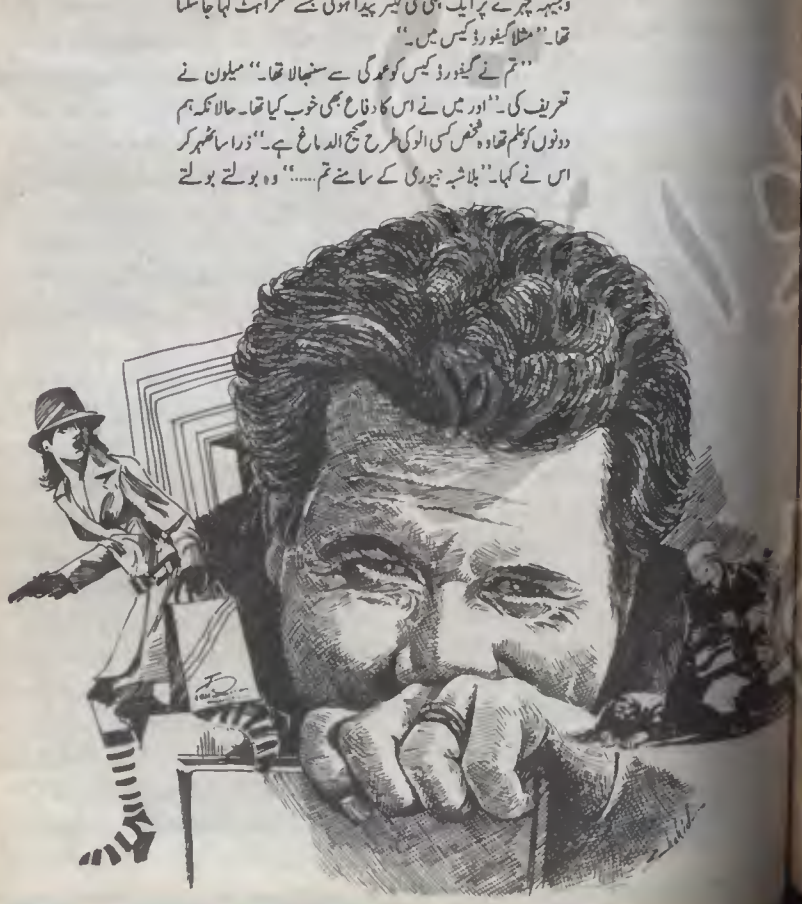

یکا یک چپ ہوگیا۔ وہ اس وقت انجل سٹی ہال بار میں بیٹھے ہوئے تھے۔ انہیں ڈاکٹر نے مدعو کیا تھا۔

"مگر یہ صورتِ حال مذاق والی نہیں ہے۔" ڈاکٹر نے کہا۔ اس نے میلون کے خالی گلاس کو دیکھتے ہوئے بارٹینڈر کو اشارہ کیا۔ "مجھے مشورے کی بھی ضرورت ہے اور مدد کی بھی۔"

"کیا تمہارا چالان وغیرہ کر دیا گیا ہے۔" میلون نے پوچھا۔

"یا....."

"یہ قتل کا معاملہ ہے۔" ڈاکٹر مارٹن نے کہا۔ "میرے قتل کا۔"

مزید مشروب آیا تو میلون نے اسے لے لیا اور جوئے سے بولا۔ "مجھے اور میرے ساتھی کو کچھ باتیں کرنی ہیں تمہارے عقبی کمرے میں۔ پانچ منٹ بعد دو گلاس اور بھیج دینا ساتھ میں پانی بھی۔"

ایک منٹ بعد وہ عقبی کمرے میں نشست سنبھال چکا تھا۔ پھر اس نے اپنے نئے کلائنٹ کی سمت دیکھا۔ یعنی ڈاکٹر مارٹن الیکوٹنڈر مارٹن کی طرف جو ایک دراز قد کھلاڑیوں جیسے بدن والا آدمی تھا۔ اس کے بال سیاہ تھے مگر کنپٹیوں پر سپیدی اتر رہی تھی۔

اس وقت اس کے چہرے پر کچھ زردی سی پھیلی ہوئی تھی۔

"ہاں تو تم کسے قتل کرنے کا منصوبہ بنا رہے ہو؟" مختصر جسامت والے قانون داں نے خوش دلی سے پوچھا۔ "کوئی ایسا شخص جسے میں بھی جانتا ہوں؟"

"صورتِ حال خاصی دشوار ہے۔" ڈاکٹر نے کہا۔

"قتل عموماً دشوار ہی ہوتا ہے۔" میلون نے کہا۔ "چلو بتاؤ۔"

"میرا ایک مریض ہے۔ میں اس کا نام تمہیں نہیں بتا سکتا....."

مشہور ماہرِ نفسیات تھوڑا سا رکا۔ اس نے لمبی سانس لی اور بولا۔ "خیر چھوڑو، میلون۔ تم چکر چلا کر معلوم ہی کر لو گے۔ اس کا نام جون ایوارٹ ہے۔"

میلون ہنکارا بھر کر رہ گیا۔ اس وقت کسی تبصرے کا موقع نہ تھا۔ ڈاکٹر مارٹن مہنگا ڈاکٹر تھا اور اس کے مریض عموماً لکھ پتیوں کے بلبلے ہی کے ہوتے تھے۔ چھوٹا سا مشورہ بھی بہ مشکل فری میں دیتا تھا۔ اسے ایک عمدہ معاوضے کی امید تھی۔

"زیادہ عرصے کی بات نہیں ہے۔ ایوارٹ میرے پاس آیا۔" ڈاکٹر نے بات جاری رکھی۔ "میں اسے جانتا تھا۔ کسی مریض کے طور پر نہیں بلکہ ایک دوست کی طرح۔ کئی بار اس کے گھر بھی جا چکا تھا۔ وہ میرے پاس اس لیے آیا تھا کہ اسے عجیب و غریب خواب دکھائی دے رہے تھے۔"

"بہت سے لوگ خواب دیکھتے رہتے ہیں۔" میلون نے کہا۔

ڈاکٹر مارٹن نے اس کی بات ان سنی کر دی اور کہا..... "وہ مجھے قتل کرنے والا ہے۔"

اسی وقت جوئے دو مزید گلاسوں کے ساتھ نمودار ہوا۔ اس کی ٹرے میں پانی کا بھی ایک گلاس تھا۔ اس نے تینوں گلاس میز کے وسط میں رکھ دیے۔

ڈاکٹر نے ایک گلاس اٹھا کر گھونٹ بھرا اور بولا۔ "وہ جو خواب دیکھ رہا تھا نہایت لرزہ خیز تھے..... خوفناک قسم کے مجرمانہ نوعیت کے۔ اور جب صبح کو اس کی آنکھ کھلتی تھی تو وہ خود کو بری طرح سست پاتا تھا۔ تھکا ہوا اور ایسا جیسے رات بھر وہ سویا ہی نہ ہو۔"

"کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ حفظِ ماتقدم کے طور پر اپنے لیے دیوانگی کو اپنا دفاع بنانے کے چکر میں ہے۔" میلون نے کہا۔ "میرا مطلب ہے ہوسکتا ہے وہ اپنی بیوی کو، یا اپنے کسی لکھ پتی چچا وغیرہ کو ہمیشہ کے لیے رخصت کرنے کا ارادہ رکھتا ہو۔ میں تو یہی کہوں گا کہ وہ بالکل ٹھیک جا رہا ہے۔"

ڈاکٹر مارٹن نے ایک سگریٹ نکال کر جلائی اور بولا..... "تمہارے پاس کچھ وقت ہو تو میں تمہیں چند نوٹس دکھانا چاہوں گا جو میرے آفس میں ہیں۔" ڈاکٹر اس کے مزاحیہ جملوں کو مکمل طور سے نظر انداز کیے جا رہا تھا۔

میلون نے اپنا گلاس خالی کر دیا اور بولا۔ "ٹھیک ہے۔"

ڈاکٹر مارٹن کا آفس لیک روڈ پر تھا اور تقریباً ویسا ہی تھا جیسا میلون نے سوچا تھا۔ لفٹ بوائے، ایک کریم کلر کا امتزاج وینٹنگ روم۔ نہایت آرام دہ کرسیوں والا۔ میزوں پر الیسٹریٹڈ ٹرے۔ اور ایک ری سپشنسٹ جس کے بالوں کا رنگ زمین پر بچھے کارپٹ سے ملتا جلتا تھا اور کپڑوں کا رنگ کمرے کے فرنیچر کلر سے مماثل تھا۔

"اوہ مسٹر میلون۔" ری سپشنسٹ نے میلون کو دیکھ کر خوشی کا اظہار کیا۔

میلون نے ری سپشنسٹ کو یاد کرنے کی کوشش کی۔

ڈاکٹر مارٹن آہستہ سے ہنسا اور بولا۔ "مس آدم، کبھی کسی کا چہرہ اور نام نہیں بھولتی۔ میک جیکسن کے مقدمے پر یہ میرے ساتھ موجود تھی جس کا دفاع تم نے عمدگی سے کیا تھا۔"

"اس میں تمہاری مدد شامل تھی۔" میلون نے انکساری برتی۔

"مس آدم۔" ڈاکٹر نے اپنے کمرے کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ "مجھے دن بھر کے لیے غیر حاضر سمجھو۔"

ڈاکٹر مارٹن کے پرائیویٹ آفس کے آگے اس کے ری سپشن روم کی وہی حیثیت تھی جو آفتاب کے سامنے چراغ کی ہوتی ہے۔ یہ بہت آرام دہ اور پرسکون تھا اور آرٹسٹک انداز میں آراستہ تھا۔ یہاں ہر چیز اعلیٰ درجے کی تھی اور بہت مہنگی۔ زمین پر پڑا زرد ی مائل سبز دبیز قالین دو انچ موٹا تھا۔

"کسی نے بھی حتیٰ کہ مس آدم نے بھی یہ نوٹس نہیں دیکھے ہیں۔" ڈاکٹر مارٹن نے کہا۔ "مسٹر ایوارٹ پہلی بار میرے پاس

مشورے کے لیے اپریل کی تیرہ تاریخ کو آیا تھا۔ اس وقت تک اس کے خوابوں نے کوئی خاص اہمیت اختیار نہیں کی تھی۔ پھر بھی....."

اس نے ایک فولڈر کھولا اور اسے بلند آواز سے پڑھنے لگا۔ "تاریخ تیرہ اپریل۔ میں نے خواب دیکھا کہ میں بستر سے اٹھا، کپڑے پہنے، گھر سے باہر نکلا اور پھر EL ٹرین میں بیٹھ کر ہیوی جسے کی سمت چل دیا۔ میں ایک ایسے اپارٹمنٹ میں داخل ہوا جو ٹھوس اسٹریٹ سے کوئی آدھے بلاک پر تھا۔ اپارٹمنٹ مقفل تھا۔ میں نے اس کے دروازے کو توڑ دیا۔ اندر ایک بستر پر خوفناک بوڑھی عورت پڑی ہوئی تھی۔ میں نے ایک چاقو سے اس کا گلا کاٹ ڈالا چاقو مجھے اس کے کچن میں ملا تھا۔ پھر میں نے سارا اپارٹمنٹ الٹ پلٹ کر دیا۔ مگر وہاں سے مجھے کوئی قیمتی چیز نہ مل سکی۔ پھر غصے میں آکر میں نے اپارٹمنٹ میں آگ لگا دی اور وہاں سے نکل گیا۔ خواب اسی جگہ ختم ہوگیا تھا مگر میں جاگا تھا اپنے بستر پر۔ میرا جسم پسینے سے تر تھا اور میں نڈھال ہو رہا تھا۔"

ڈاکٹر نے فولڈر رکھ دیا اور بولا۔ "اس قسم کے خواب غیر معمولی نہیں ہوتے۔ مجھے اس پر کوئی تعجب نہ تھا کہ ایوارٹ میرے پاس نے رازدارانہ انداز میں آیا تھا۔ وہ یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ کوئی نوٹ لیا جائے۔ یہ نوٹ بھی میں نے اس کے جانے کے بعد جلد میں لکھا تھا۔ اس نے کہا۔ "اسے لکھ لینا ضرور..... کہ میں نے ہے مگر یہ پہلی اس کی ہے۔ اس نے تیرہ اپریل کو اپنا خواب سنایا تھا۔ اس نے یہ خواب پچھلی رات میں دیکھا تھا یعنی بارہ تاریخ کو۔"

اس نے ایک اخباری تراشہ میلون کے ہاتھ میں دیا جس پر تیرہ اپریل کی تاریخ تھی۔ "یہ مجھے اخبار میں بس اتفاق سے نظر آ گیا تھا۔" ڈاکٹر نے کہا۔ اس میں ایک بوڑھی عورت کے لرزہ خیز قتل کی خبر تھی۔ اس کا گلا اپنی ریڑھ کی ہڈی میں ایک سرد لہر اضطراب محسوس ہوئی۔ عورت کو اس کے اپارٹمنٹ سے باہر تھی جسے آگ لگا دی گئی تھی۔ اور کمرے کی طرح الٹ پلٹ دیا گیا تھا۔ اس کا گلا جس چاقو سے کاٹا گیا تھا وہ خود اس کے کچن سے اٹھایا گیا تھا۔

"بے شک اسے اتفاق کے کھاتے میں ڈالا جا سکتا تھا" ڈاکٹر نے کہا۔ "مگر بعد میں اس نے ایک اور خواب دیکھا تھا۔ اس میں وہی ایونیو پر بنے ایک اپارٹمنٹ میں گھسا تھا جس میں ایک بوڑھی عورت رہتی تھی۔ اس عورت کو بھی اس نے کچن سنک پر رکھے ہوئے چاقو سے ہلاک کیا اور بھاگ لیا تھا۔"

میلون نے ڈاکٹر سے دوسرا اخباری تراشہ لیا جس میں ایک بوڑھی عورت کے قتل کی خبر تھی جو پیشے کے اعتبار سے ایک اسٹینو تھی۔

"اور یہ خواب اس نے سات مئی کو دیکھا تھا۔" ڈاکٹر نے اخباری تراشے پر 8 مئی کی تاریخ تھی۔

"اس کے دو مزید خواب ہیں۔" ڈاکٹر بولتا رہا "تقریباً اسی

"آخر یہ اس بے چارے کو گھونسا مار کیوں نہیں دیتا؟ اتنا ترسا کیوں رہا ہے؟"

نوعیت کے۔ ایک لڑکی کا خواب جسے ایک بار سے اٹھایا گیا تھا اور نیل فوائلر سے ہلاک کیا گیا تھا جو وہ اپنے پرس میں رکھے ہوئے تھی۔ یہ خواب اس نے 2 جون کو دیکھا تھا۔" اس نے ایک اور اخباری تراشہ میلون کی طرف بڑھایا جس پر 3 جون کی تاریخ تھی "اور ایک اور خواب جو..... مگر بہتر ہے کہ اسے تم خود پڑھ لو۔ یہ خواب اس نے پچیس جون کو دیکھا تھا۔ یہ حقیقتاً اسی رات میں ہوا تھا، آدھی رات سے ذرا پہلے۔"

میلون نے چوتھا تراشہ پڑھا۔ پھر اسے ایک طرف رکھ کر اس نے مختصر نظروں سے ڈاکٹر کی طرف دیکھا۔

"اور اب" ڈاکٹر مارٹن نے کہا۔ "وہ مجھے قتل کرنے والا ہے۔"

میلون نے کہا۔ "پھر تو تمہیں کسی قانون دان کی نہیں بلکہ باڈی گارڈ کی ضرورت ہے۔" میلون کو محسوس ہوا کہ بولتے ہوئے اس کی آواز بیٹھ رہی ہے۔ اس نے ہنسنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہوسکا۔

ڈاکٹر کی توجہ ادھر نہ تھی۔ اس نے یہ نوٹس اپنی دراز میں ڈال دیے اور بولنے لگا۔ "پچھلی رات اس نے خواب دیکھا کہ وہ یہاں آیا ہے، رات گئے۔ اس نے خواب میں دیکھا۔ کہ وہ گھنٹی بجا رہا ہے۔ میں نے دروازہ کھول کر اسے اندر بلا لیا ہے۔ تمہیں شاید معلوم نہ ہو مگر یہ میرا آفس بھی ہے اور گھر بھی۔ اس کمرے کے عقب میں ایک بیڈ روم ہے، باتھ روم ہے۔ اور کچن بھی ہے۔ مگر داخلے کا راستہ استقبالیہ کی طرف سے ہی ہے۔"

وہ رکا تو میلون نے کہا۔ "کہتے رہو۔"

"اس نے خواب میں دیکھا کہ وہ میرے کنسلٹنگ روم میں آیا ہے۔ جہاں ہم اس وقت ہیں۔ میں اپنی میز کے پیچھے جا بیٹھا۔ اچانک اس نے مجھ پر حملہ کیا اور پھر اس نے میرے کچن سے حاصل کردہ چاقو سے مجھ پر وار کرنے شروع کر دیے۔"

ذرا دیر کے لیے وہاں خاموشی رہی۔ کمرے کی خوشگوار بیت جیسے ختم ہوگئی۔

''کیا تم بچ گئے تھے؟'' میلون نے مسکرا کر..... دریافت کیا۔

''نہیں۔'' ڈاکٹر نے بھی سرسری لہجے میں جواب دیا۔ پھر وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور پُرسکون لہجے میں پوچھا۔

''کچھ پیو گے؟''

''ضرور۔'' میلون نے کہا۔ اس نے ڈاکٹر مارٹن کو اس دروازے سے داخل ہوتے دیکھا جو کچن کا تھا۔ پھر اس نے آنکھیں بند کرلیں اور تصور کی آنکھ سے لکھ پتی اسپورٹ مین جون ایوارٹ کو اسی کمرے میں بیٹھے ڈاکٹر کو اپنی خوفناک روداد سناتے دیکھنے لگا۔ اس نے تصور ہی میں ڈاکٹر مارٹن کے بیڈروم کو بھی دیکھنے کی کوشش کی اور استعجابیہ اور اس کے کنسلٹنگ روم کی سجاوٹ کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس کے ڈیکوریشن کو دیکھنے کی کوشش کی۔ پھر اس نے جلدی سے آنکھیں کھول دیں کیوں کہ ڈاکٹر ڈرنکس کے ساتھ لوٹ آیا تھا۔

''شکریہ۔'' اس نے گلاس کو لیتے ہوئے کہا..... ''اچھا تو اب یہ بتاؤ تم کس قسم کا مشورہ مجھ سے چاہتے ہو؟ میں کیا کہوں.....؟ یہاں سے چلے جاؤ، حفاظت کے لیے ایک گن خرید لو یا پولیس کو مطلع کردو؟''

''تم اسے میری حماقت سمجھ لو۔'' ڈاکٹر نے کہا۔ ''مگر میں نے ایک گن خرید لی ہے۔ میں یہاں سے دوسری جگہ نہیں جانا چاہتا۔ اور چونکہ یہ معاملہ جون ایوارٹ کا ہے، میں اس مسئلے کو پولیس کے پاس بھی نہیں لے جانا چاہتا۔''

''پھر جب تم نے خود مسئلے کے حل سوچ لیے ہیں تو مجھ سے بات کی کیا ضرورت تھی؟'' میلون نے پوچھا۔

ڈاکٹر مارٹن مسکرایا۔ ''میں نے سوچا شاید تم ایک عمدہ کہانی سننا پسند کرو گے اور کچھ دیر میرے ساتھ بیٹھو گے۔'' اس نے میلون کا گلاس پھر سے بھر دیا۔

''تمہاری ذرہ نوازی ہے۔'' میلون نے کہا۔ ''تاہم اب جبکہ کسی بھی لمحہ قتل کردیے جانے والے ہو، بہتر ہوگا کہ میری کنسلٹنگ فیس کا ایک چیک ضرور کاٹ دو۔'' ڈاکٹر مارٹن نے مسکرا کر انٹرکام کا بٹن دبا دیا۔ اسپیکر سے میٹھی سی آواز ابھری ''یس؟''

''جان میلون کے نام ان کی قانونی خدمات کے صلے میں ایک چیک بنا دو۔'' ڈاکٹر نے کہا۔ ''پانچ سو ڈالر کا۔ اور اسے ڈاک کے ذریعے ان کے آفس بھیج دو۔''

میلون کا جی چاہا کہ وہ ڈاکٹر سے کہے وہ چیک اسی کو دے! اس طرح ڈاک کا خرچ بچ جائے گا۔ مگر اس نے کچھ نہیں کہا۔

ڈاکٹر نے اسی طرح مسکراتے ہوئے اسے دیکھا اور بولا۔ ''اگر میں کل تک زندہ رہا تو میں اس چیک کا پیمنٹ رکوا دوں گا۔''

واپسی پر میلون جوئے کے بار پر کچھ دیر کے لیے رکا۔ وہ چند باتوں پر غور کرنا چاہتا تھا۔ سب سے پہلی توجہ تو اسے جہاز جیسی بلکوں والی مس آدم کو دینی تھی۔ وہ سوچتا جا رہا تھا کہ کس طرح اس لڑکی سے ملاقات کی سبیل نکالی جاسکتی ہے۔ اس کے بعد اہم ترین مسئلہ اس آدمی کا تھا جو اپنے قاتل ہونے کے خواب دیکھ رہا تھا۔

ڈرنکس کے دو گلاس اور انہماک کے کچھ لمحات کے بعد اس نے یہ تمام کہانی جوئے کو سنا دی۔ مگر اس نے تھوڑی سی تبدیلی کر دی تھی اور اپنے اس دوست کا قصہ بنا دیا تھا جو بیٹی میں تعطیلات گزارنے گیا تھا۔ جوئے نے کہانی سنی اور کہا کہ اس نے تقریباً اسی قسم کا واقعہ کسی آنٹی سے بھی سن رکھا ہے۔ وہاں ایک ہنگری نژاد شخص بھی موجود تھا۔ یہ کہانی سن کر اس نے اپنے ایک بھتیجے کا قصہ چھیڑ دیا۔ اسی وقت ادھر اخبار کا ایک رپورٹر آگیا۔ اس کہانی سے متاثر ہو کر اس نے اپنے ایک دوست کا واقعہ سنانا شروع کر دیا جو نہرا سکا میں واقع ایک قبرستان میں چلا گیا تھا جہاں اس کے ساتھ ایک بہت عجیب.....

میلون نے فیصلہ کیا کہ اسے اب بار سے اٹھ جانا چاہیے۔

اپنے آفس پہنچ کر اس نے اپنی سیکریٹری سے کہا۔

''دیکھو۔ کل صبح کو ڈاک میں تمہیں پانچ سو ڈالر کا ایک چیک ملے گا۔ کوشش کرو کہ ایک سو ڈالر کا کوئی چیک کسی قریبی دکان سے کیش ہو جائے۔ اس میں سے کچھ حصہ تم اپنی تنخواہ کے طور پر لے لینا۔ مگر جونہی وہ چیک ملے بلا تاخیر اسے کیش کرا لینا۔''

''کیوں؟'' میگی نے پوچھا۔ اس نے اپنا ہیٹ اٹھایا اور بولی۔ ''کیا چیک دینے والا فیصلہ بدل سکتا ہے؟''

''نہیں۔'' میلون نے کہا۔ ''مجھے امید نہیں کہ وہ کل صبح تک زندہ رہے گا۔ اپنا کوٹ پہن لو۔ باہر بہت سردی ہے۔''

میگی نے کوٹ پہن لیا۔ ''کرایہ واجب ہو چکا ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''مگر آپ کو سو ڈالر چاہیے ہیں کیش۔''

''ہاں کسی سے ملنا ہے۔'' میلون نے اسے بتایا۔ ''مزید سوال مت کرنا۔''

اس کے بعد وہ اپنے کمرے میں چلا گیا اور بیٹھ کر دیر تک غور و خوض کرتا رہا۔ آخر میں اس نے ڈائریکٹری سے مسز ایوارٹ کا ٹیلیفون نمبر ڈھونڈا۔ پھر فون کیا۔ دوسری طرف سے ایک پُروقار آواز سنائی دی۔ اس نے اسی طرح کے پُروقار لہجے میں کہا۔ ''ہم مسز اولیری کے آفس سے بول رہے ہیں۔ آج رات مسز اولیری کو مسز ایوارٹ سے ملنا تھا مگر ایڈریس کہیں کھو گیا ہے.....''

ذرا دیر بعد ایک پرانے لفافے پر وہ پتا لکھ رہا تھا جہاں مسز جون ایوارٹ سے ملاقات ہو سکتی تھی۔ بلیو کیسینو نو بجے کے بعد۔

لمحہ بھر تک اس نے سوچا پھر اس نے ڈاکٹر مارٹن کا نمبر ڈائل کیا۔

''مس آدم۔ میں میلون بول رہا ہوں..... نہیں نہیں مجھے ڈاکٹر سے بات نہیں کرنی۔ میں تم سے بات کرنا چاہتا ہوں..... ہاں ہاں میں جانتا ہوں..... کیوں کا جواب یہ ہے کہ تم بہت پُرکشش شخصیت کی مالک ہو..... آج رات کا کھانا میرے ساتھ کھانا پسند کرو گی؟''

چند لمحے وقفہ کے بعد اس نے کہا۔ ''ونڈرفل..... بس ٹھیک ہے..... میں وہاں پہنچوں؟''

وہ جو پارک پر رہتی تھی۔ میلون نے فون بند کر دیا۔ غسل خانے میں جا کر اس نے سوچا مس آدم کے لیے ڈرنکس کے پھولوں کا گلدستہ لے جائے گا۔ مگر پھر اس نے خیال مسترد کر دیا۔ جو ٹائم اس لڑکی کے ساتھ تھا اس سے یہی پتا چلتا تھا کہ اسے بس ایک دوستانہ مسکراہٹ درکار تھی اور پوپ کارن کی ایک تھیلی۔ یا شاید کچھ عمدہ کھانا اور پھر بلیو کیسینو میں۔ ویسے بھی اسے اس لڑکی سے کیا لینا دینا تھا۔ مسئلہ کچھ معلومات کے حصول کا تھا۔

معلوم نہیں وہ اپنی پسند کا لباس بھی پہنتی ہے یا نہیں..... اس نے سوچا۔ بلاشبہ اس کا لباس بہت عمدہ تھا۔ ڈاکٹر مارٹن نے ہوشمندی سے کام لیا تھا۔ نہ زنانہ جیسے سپید لباس کے بجائے اسے ہلکی لائنوں والے لباس میں رکھا تھا۔

جب وہ مس آدم کو لینے اس کی رہائش گاہ پہنچا اس نے دیکھا کہ اس نے واقعی اپنی پسند کا لباس پہن رکھا ہے۔ وہ فرکوٹ جو اس نے پہن رکھا تھا ہرگز ڈاکٹر مارٹن کی منشا کے مطابق نہیں تھا۔

''مسٹر میلون۔ میں بہت شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے فون کیا۔''

''مس آدم میں بے حد ممنون ہوں کہ تم نے مجھے مایوس نہیں کیا۔''

وہ سوچ رہا تھا کہ فرکوٹ تلے اس نے کیا پہن رکھا ہوگا۔

معلوم ہوا کہ یہ گلابی رنگ کا اسٹرپ لیس لباس ہے۔ اس کی پشت بھی اسی طرح کی تھی۔ البتہ وہ لباس پر نظر ڈالتے ہوئے یہ سوچ رہا تھا کہ لڑکی کی تنخواہ تو اتنی نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ اس قدر قیمتی لباس پہن سکے۔

مس آدم مسکرائی اور بولی۔ ''اسے میں نے خود بنایا ہے۔''

میلون نے حیرت اور کھسیاہٹ سے اسے دیکھا پھر مسکراتے ہوئے بولا۔ ''اچھا تو اور صلاحیتوں کے ساتھ تم ذہن بھی پڑھ لیتی ہو۔''

مس آدم نے اپنی خوب صورت مسکراہٹ قائم رکھی اور میلون کے لیے کسی قسم کی مائنڈ ریڈنگ کی ضرورت نہ تھی۔ آپ سمجھ رہے ہیں کہ اس کو حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ اور یقیناً سوچا ہوگا کہ میں نے اسے اس طرح کا لباس نہیں پہن سکتی۔ چونکہ اسے میں نے خود بنایا ہے۔ اس کی قیمت تقریباً انیس ڈالر بنتی تھی۔ بازار میں یہی ڈریس چار گنا قیمت پر ملے گا۔''

میلون نے ٹھنڈی بھرنے کی اداکاری کی اور کہا۔ ''کاش تم مجھے بیس سال پہلے ملی ہوتیں تو میں آج بہت متمول آدمی ہوتا۔''

ڈنر، چھ ڈرنکس، اور دو مرتبہ رقص کے بعد میلون کو کئی باتیں معلوم ہو چکی تھیں۔ ڈاکٹر مارٹن کے آفس میں داخلے کا بس ایک ہی راستہ تھا۔ لڑکی کی قوتِ حافظہ بہت اچھی تھی، فوٹوگرافک میموری۔ ڈاکٹر مارٹن ونڈرفل آدمی تھا۔ اس کی تمام خواتین مریضائیں اس کی والہ و شیدا تھیں۔ ہاں۔ اس کے مریضوں کی بڑی تعداد عورتوں کی تھی۔

''اور اب اس کے مریضوں میں ایک اور.....''

مس آدم کی بات ختم نہیں ہوئی تھی کہ میلون چونک گیا۔ جون ایوارٹ بلیو کیسینو میں داخل ہوا تھا۔ اس نے منہ بنایا۔ یہ آدمی اسے ہرگز کوئی نفسیاتی مریض نہیں لگ رہا تھا۔ زیادہ سے زیادہ اسے کچھ ضروری غذا اور تھوڑی سی ورزش کی ضرورت تھی اور بس۔

یہ لکھ پتی اسپورٹس مین خاصا لحیم شحیم آدمی تھا۔ چھ فٹ لانبا..... مضبوط بدن مگر فربہی کی سمت مائل۔ اس کے نقش دوستانہ تھے۔ جلد کا رنگ کچھ سرخی مائل تھا۔ صاف لگتا تھا کہ زندگی کی ہر ضروری آسائش اسے میسر ہے۔

میلون نے پلکیں جھپکا کر اس کے ساتھ آنے والی عورت کو دیکھا۔

وہ عمدہ نسل کی کسی گھوڑی جیسی تھی جسے اچھی طرح پالا گیا ہو۔ اس کے براؤن رنگ کے بال عمدگی سے بنے ہوئے تھے۔ اس کے بدن پر جچتا ہوا سا لباس تھا۔ اس کے نقوش بھی اس کے جسم کی طرح تناسب میں تھے۔ اس کے لباس کا رنگ بھی براؤن تھا اور یقیناً کسی بڑی دکان کا تھا۔

مس آدم کچھ زیرِ لب بڑبڑائی۔

میلون نے اسے دیکھا اور پوچھا ''تم اسے جانتی ہو؟''

''عورت؟'' مس آدم نے کہا۔ ''یہ جون ایوارٹ کی بیوی ہے۔ اور ڈاکٹر مارٹن کی مریناؤں میں سے ایک ہے۔ پتا نہیں عورتوں میں کیا جنون پیدا ہو گیا ہے کہ وہ ڈاکٹر مارٹن کی مریضہ بننے میں فخر محسوس کر رہی ہیں۔ میں سمجھتی ہوں وہ جس بہانے اس کے پاس آتی ہے مناسب نہیں۔ کہتی ہے اسے ایک خواب دکھائی دیتا ہے کہ اس کی شادی کسی جا کی سے ہو گئی ہے۔''

میلون نے پوچھا۔ ''اچھا تو یہ شخص جو اس کے ساتھ ہے اس کا شوہر ہے۔''

''ہاں خیال تو یہی ہے۔'' مس آدم نے کہا ''اسے ایک اچھے ماہر نفسیات کی ضرورت ہے اور مجھے ایک مزید ڈرنک کی۔''

''تم نے صحیح کہا۔'' میلون نے کہا اور ویٹر کو آرڈر دے دیا۔

یہ چند گھنٹوں کے بعد کی بات ہے۔ میلون اپنے بستر پر بیٹھا ہوا سوچ رہا تھا کہ وہ اسی لباس میں سو جائے یا اسے تبدیل کر لے۔ یہ ایک الجھن تھی اور شاید سکہ اچھال کر ہی اس کا فیصلہ ہو سکتا کہ فون کی گھنٹی بجی تھی۔

اس نے طے کیا کہ فون نہیں اٹھائے گا۔ فون کالیں جو رات گئے کی جاتی ہیں ہمیشہ کسی مصیبت کا پیش خیمہ ہوتی ہیں۔ اور وہ خاصا تھکا ہوا تھا۔ مگر..... اس نے ریسیور اٹھا ہی لیا۔ مصیبت ہے تو ہو۔ وہ متجسس بھی ہو گیا تھا۔

دوسری طرف ڈاکٹر مارٹن تھا۔ اس کے لہجے سے ہیجان ظاہر ہو رہا تھا اور وہ بہت تیزی سے بول رہا تھا۔

''میلون..... وہ میرے گھر کے لیے چل چکا ہے۔''

''نان سنس۔'' میلون نے جماہی لیتے ہوئے کہا۔ ''اب خود تمہیں کسی اچھے سے سائکاٹرسٹ سے رجوع کرنا چاہیے۔'' کہنے کو تو اس نے کہہ دیا مگر فوراً اسے احساس ہوا کہ اس سے غلطی ہوئی ہے کچھ اس نے عجلت سے اضافہ کیا ''تم کچھ آرام کرو۔ ایوارٹ نے جس وقت بلیو کیسینو چھوڑا تھا اس کی حالت بالکل ٹھیک تھی۔ کسی کلہاڑی کے ساتھ اس کی رنجشیں چوبیس گھنٹوں سے پہلے مشکل لگتی ہے۔ دروازہ مقفل کر دو اور سو جاؤ۔''

''میلون..... وہ دروازے پر پہنچ چکا ہے۔''

''اسے گولی مار دو۔'' تھکے تھکے لہجے میں میلون نے کہا۔

''میلون..... میری گن.....''

پھر آواز رک گئی اور کچھ ایسی آوازیں ابھریں جو ناقابلِ فہم سی تھیں۔ اس کے بعد بالکل خاموشی چھا گئی۔

مختصر جسامت والا قانون داں بستر کے کنارے بیٹھ کر تیزی سے سوچنے لگا۔ پھر اس نے طے کیا وہ بعد میں سو لے گا اس وقت اسے پولیس کو فون کرنا چاہیے۔ اس نے ہومی سائڈ اسکواڈ کے کیپٹن وان فلان کو فون کیا۔

بالآخر ایک غنودہ آواز سنائی دی۔ یہ وان کی آواز تھی۔ ''تم نشے میں تو نہیں ہو؟''

''ہو سکتا ہے۔'' میلون نے کہا۔ ''مگر میں سن کر سمجھ ضرور لیتا ہوں کہ معاملہ قتل کا ہے۔ لہٰذا میں چاہوں گا کہ تم میرے ہوٹل کے دروازے پر آ کر مجھے ساتھ لے لو پھر میں تمہیں تفصیل بھی بتا دوں گا بس پندرہ منٹ میں پہنچ جاؤ۔''

سائرن بجاتی کار دس منٹ بعد ہی پہنچ گئی۔ پچھلی سیٹ پر بیٹھا وان ابھی تک اپنے لباس کی نوک پلک درست کر رہا تھا۔ میلون نے بھی دیر نہیں کی تھی۔ اس نے لیک روڈ کا پتا دیا۔ پھر وہ وان کے ساتھ ہی بیٹھ گیا اور اسے تفصیل سے آگاہ کرنے لگا۔

''اوہ..... ڈاکٹر مارٹن'' ..... درمیان میں وان نے صرف ایک بار مداخلت کی۔ ''جون ایوارٹ'' اس نے دوسری بار اسی طرح کی مداخلت پھر کی..... ''تو کیا اس شخص کا دماغ چل گیا ہے؟''

''لگتا تو یہی ہے۔'' میلون نے کہا۔ اسے نیند ستا رہی تھی۔

اطلاعی گھنٹی کا جواب کسی نے نہیں دیا۔ پھر دروازہ پیٹا گیا جب بھی ڈاکٹر مارٹن نہیں نکلا۔

میلون کو اپنے بدن میں سرد لہر دوڑتی محسوس ہوئی۔

نگراں کو بیدار کر کے اس کی کنجی سے اپارٹمنٹ کھولنے میں تھوڑا وقت لگا۔ استقبالیہ خالی بھی تھا اور تاریک تھا۔ البتہ اندرونی آفس کے دروازے پر روشنی تھی۔ وان نے دروازے کو دھکا دے کر کھولا۔

ایک تیز نگاہ اس نے دوڑائی اور ٹیلیفون پر ہاتھ ڈالا۔ پھر اس نے اپنے آفس فون کر کے ضروری سامان اور افراد طلب کیے۔

''کچھ چھونا نہیں۔'' میلون نے کہا اسے خیال ہی نہیں رہا تھا کہ وہ ہومی سائڈ کے کیپٹن سے مخاطب ہے جو شعبۂ تفتیش قتل کا سربراہ تھا۔

اس سے قبل کہ وان کے آدمی پہنچتے، دونوں نے باتیں طے کر لی تھیں۔

سب سے اہم بات یہ تھی کہ اس وقت اس اپارٹمنٹ میں سوائے ان دونوں کے کوئی دوسرا ذی روح موجود نہ تھا۔

وہ چاقو جس سے ڈاکٹر مارٹن کا گلا کاٹا گیا تھا خود اسی کے کچن کا تھا جو اس کے کنسلٹنگ روم کے عقب میں واقع تھا۔

وہ پستول جو ڈاکٹر مارٹن کے ہاتھ میں دبی ہوئی تھی، آئیو جونسن تھی اعشاریہ تھری ٹو۔ اس سے حال ہی میں گولی چلائی گئی تھی۔

مس آدم نے درست بتایا تھا۔ اس آفس اپارٹمنٹ میں داخلے کا بس ایک ہی راستہ تھا۔ جو استقبالیہ میں سے ہو کر جاتا تھا۔

جوں ہی وان کے آدمی جائے واردات پر پہنچ گئے، میلون کیپٹن وان کو بلا کر ایک طرف لے گیا۔

''اب تمہارے آدمی اپنا کام کر لیں گے۔ آؤ چلتے ہیں۔'' کیپٹن ان حالات میں یہاں سے ہٹنے کے لیے تیار نہ تھا۔

''جون ایوارٹ۔'' میلون نے اسے یاد دلایا ''یقیناً ڈاکٹر کا نشانہ خطا گیا ہوگا۔ اور ڈاکٹر کے نوٹس کے مطابق ایوارٹ یہاں سے گھر ہی گیا ہوگا۔''

کیپٹن کی سمجھ میں فوراً آ گیا۔ اس نے اپنے آدمیوں کو ضروری ہدایات دیں اور چل دیا۔ نیچے انہوں نے پریس کے آدمیوں کو جمع دیکھا۔

''میں صبح تک کسی نہ کسی کو پکڑ لوں گا۔'' کیپٹن نے انہیں یقین دلایا۔

میلون کو افسوس ہوا۔ اچھا ہوتا کہ کیپٹن نے یہ جملہ نہ کہا ہوتا۔

پولیس کار بہت خاموشی سے اس عمارت کے سامنے جا رکی جس میں جون ایوارٹ رہتا تھا۔ ایک خودکار لفٹ انہیں لے کر اوپر ایوارٹ کا پینٹ ہاؤس تھا۔

گھنٹی بجانے سے نہ کوئی فائدہ ہوا نہ دروازہ پیٹنے سے۔ کوئی جواب نہیں نکلا۔ کافی تاخیر کے بعد ایک سوتی ہوئی سی آواز دروازے کے اندر سے سنائی دی۔

''کون ہے؟''

''پولیس۔'' وان دہاڑا۔

دروازہ اچ بھر کھلا۔ دوسری طرف زنجیر لگی ہوئی تھی۔ وان نے پولیس دکھایا۔ پھر زنجیر کھٹکی اور دروازہ کھل گیا۔

صاف ظاہر تھا کہ مسز ایوارٹ نیند سے اٹھ کر آئی تھی۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ چہرہ میک اپ سے عاری تھا۔ اس نے جسم پر ایک گاؤن روب ڈال رکھا تھا۔

''اوہ۔'' اس نے کہا..... ''لگتا ہے ہمارا شوفر..... البرٹ کسی مشکل میں پڑ گیا ہے۔'' اس نے جماہی لی اور بولی۔ ''سوری..... تم لوگوں کو انتظار کرنا پڑا۔ میں بہت گہری نیند میں تھی۔ اور خادمہ آج چھٹی پر ہے۔''

''میں آپ کے شوہر سے ملنا چاہتا ہوں۔'' وان نے کہا۔

وہ ہلکی سی مسکرائی۔ ''تم ضرور اس سے مل سکتے ہو مگر بات نہیں کر سکو گے۔ وہ بستر پر بے سدھ پڑا ہے اسی طرح جس طرح میں نے اسے سلایا تھا۔ خیر تم کوشش کر لو۔''

وہ دونوں کونے کے کمرہ میں گئی۔ وہاں ایک بڑا سا ڈرائنگ روم..... الٹرا ماڈرن کہا جا سکتا تھا۔ اس کے پیچھے موجود کھڑکی کی جھلکیاں، میلون کو نظر آ رہی تھیں۔ ادھر ایک چوڑی سی راہداری تھی جس میں عمدہ قسم کی تصویریں آویزاں تھیں۔ بہت سے دروازے تھے جو ہر طرف کھلتے تھے۔

مسز ایوارٹ ایک دروازے پر رکی اس نے دستک دی۔

جواب بستکوں سے بیزار ہو چکا تھا۔ اس نے بڑھ کر ناب کو گھمایا۔

''وہ مردوں کی طرح سویا ہوا ہے شاید۔''

ایوارٹ نے معذرتی لہجے میں کہا۔

وہ غلط نہ تھا۔ وہ درست تھا۔ ایوارٹ سویا ہوا نہیں تھا۔ وہ مرا پڑا تھا۔

بستر پر بری طرح سکڑا ہوا تھا۔ تاہم اس کے جسم پر کمبل نہیں ڈالا گیا تھا۔ اس کا ایک بازو باہر نکلا ہوا تھا جس کی آستین چڑھی ہوئی تھی۔ اس کے بدن پر عمدہ قسم کا سلیپنگ سوٹ ہے۔ اور اس کے بال خون سے مزید رنگین ہو رہی تھی جو اس گولی کے سوراخ کا کرشمہ تھا جو اس کے ماتھے پر لگی تھی۔

مسز ایوارٹ کے منہ سے ایک چیخ نکلی اور فضا لرز اٹھی۔

میلون نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''دیکھنا ہے کہ یہ گولی آئیو جانسن اعشاریہ تھری ٹو کی ہے یا نہیں۔ میرا خیال ہے یہ گولی اسی پستول کی ہوگی۔''

☆☆☆

''میں کوئی توہم پرست آدمی نہیں ہوں۔'' میلون نے کہا۔ اس نے جوئے عرف انجیل سے کہا۔ اور اپنا گلاس منہ سے لگا کر مشروب کا گھونٹ لیا۔

''مگر میلون۔'' اس کے ساتھی کیپٹن وان نے سادگی سے کہا۔ ''میں نے پریس والوں سے کہا تھا کہ میں جلد ہی قاتل کو پکڑ لوں گا۔''

''ابھی صبح میں کچھ وقت باقی ہے۔'' میلون نے کہا۔

جوئے نے مداخلت کی اور بولا۔ ''میلون۔ تم نندا سے ہو رہے ہو۔ جاؤ اور جا کر سو جاؤ۔''

''اچھا اچھا۔ دو گلاس اور لاؤ۔''

''نہیں۔ اب کل پینا۔'' جوئے نے کہا اور بار کی طرف چل دیا۔

''میں خود بھی توہمات کا قائل نہیں ہوں۔'' کیپٹن نے کہا۔ ''مگر یہ بات ہے بہت عجیب۔ یعنی ایک شخص قتل کے خواب دیکھتا ہے۔ پھر وہ ایک اچھے ماہرِ نفسیات سے ملتا ہے، اسے بتاتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ واقعی اسی نوعیت کے قتل ہو رہے ہیں۔ وہ اپنے فنگر پرنٹس نہیں چھوڑتا۔ اسے کوئی نہیں دیکھ پاتا۔ اور کسی کو، اس کے گھر والوں کو بھی کچھ پتا نہیں چلتا کہ وہ رات میں گھر سے نکل گیا ہے۔ مگر..... وہ گھر سے نکلتا بھی نہیں۔ ہے نا یہ سب عجیب اور ناقابلِ فہم معاملہ؟''

جوئے دو گلاس اور لے آیا اور بولا ''ایک ایسا ہی واقعہ میری ایک آنٹی کے ساتھ بھی.....'' اس نے بے خیالی کے ساتھ بات جاری رکھی.....

''پھر وہ خواب دیکھتا ہے کہ اس نے ڈاکٹر کو قتل کر دیا ہے۔ اس کے بعد وہ اپنے بستر پر لیٹ جاتا ہے۔ اور سو جاتا ہے۔ ہو سکتا ہے وہ پھر.....''

میلون نے اپنی پیٹھ میں سرد لہر دوڑتی محسوس کی۔

''وہ ڈاکٹر کو چاقو مارتا ہے، ڈاکٹر اسے گولی مار دیتا ہے۔ دونوں کے درمیان آٹھ بلاک کا وسیع فاصلہ ہے۔ جو ہر وقت برقرار رہتا ہے۔ تو پھر یہ سب باتیں کیونکر ہوتی ہیں آخر میں اپنی رپورٹ میں کیا لکھوں؟''

تھوڑا سا رک کر اس نے بدمزگی سے کہا۔ ''اور میں نے

پریس والوں سے وعدہ کیا تھا کہ.....''

''لعنت بھیجو ان پر۔'' میلون نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''جب تک سورج نہیں نکلتا صبح نہیں ہوتی۔ چلو۔ ہمارے پاس وقت ہے ہم کسی کو پکڑتے ہیں۔ ابھی۔''

☆☆☆

سورج نکل آیا تھا اور جوئے عرف اینجل بھی نکلا ہوا تھا۔ وان کافی کا مگ تھامے ہوئے اسے دیکھ کر غرایا..... ''کیا تم کبھی سوتے نہیں؟''

''نہیں۔ اگر میرا دوست میلون بیدار ہو۔'' جوئے نے کہا۔

اس کو اس کیس کے بارے میں سطحی معلومات مل چکی تھیں۔ مسز جون ایوارٹ تفتیش کے آگے ہار چکی تھی اور اس نے اقبالِ جرم کرلیا تھا۔ اس نے میلون کو ہی اپنے وکیل دفاع بنالیا تھا اور میلون اسے بچانے کے لیے دیوانگی کا سہارا لینے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ کیوں کہ..... بہرحال وہ عورت کئی ماہ سے اپنے دماغی مرض کے ضمن میں ایک سائکاٹرسٹ کے زیرِ علاج تھی۔ میلون کے پاس اب ایک اور پانچ سو ڈالر کا چیک آچکا تھا جسے وہ بینک کھلتے ہی کیش کرانا چاہتا تھا۔

''میلون، تم فکر مت کرو۔ مشروب کی ادائی تم جب چاہو کرسکتے ہو'' جوئے نے خوشی سے کہا۔ پھر وہ کیپٹن، وان سے بولا..... ''اور کیپٹن میں دعوے سے کہتا ہوں کہ وہ اس عورت کو صاف بچالے گا۔ چاہو تو میں بیس ڈالر کی شرط تم سے لگا سکتا ہوں۔''

وان نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''اگر یہ عورت جرم قبول نہ کرتی تو میرے لیے اچھا ہوتا۔'' پھر اس نے میلون سے پوچھا۔ ''میلون! تم نے کس طرح جانا کہ اس میں عورت ملوث ہے۔''

''کس طرح جانا؟ میں نے کس طرح جانا؟'' میلون نے ماتھا رگڑتے ہوئے بڑبڑانا شروع کردیا۔

جوئے نے آہستہ سے کہا۔ ''یہ نشے میں ہے۔'' اس نے کیپٹن سے کہا۔ ''کیپٹن تم چپ رہ کر سنو یہ کہتا کیا ہے۔''

''ڈاکٹر سے کنسلٹ کرنے کے لیے ایوارٹ کو استعفا لیے سے گزرنا پڑتا ہوگا۔'' میلون نے بالآخر کہا۔ ''مگر میں نے دیکھا تھا کہ مس آدم نے اسے نہیں پہچانا تھا۔ حالانکہ وہ چہرے کبھی نہیں بھولتی۔ اس نے کیسینو میں مسز ایوارٹ کو فوراً پہچان لیا تھا مگر ایوارٹ کو نہیں۔ مسز ایوارٹ ڈاکٹر کی مریضہ تھی اور وہاں جاتی رہی تھی۔ اور وہ ان عورتوں میں سے تھی جو ڈاکٹر پر فریفتہ تھیں۔'' رک کر اس نے کافی کا گھونٹ لیا۔ ''میری سمجھ میں نہیں آتا، آخر یہ عورتیں کسی وکیل پر کیوں فریفتہ نہیں ہوتیں؟''

''ہاں.....'' کیپٹن نے اسے موضوع کی طرف بلایا۔

''ڈاکٹر مارٹن نے ایوارٹ کو مار ڈالنے کے لیے ایک بہت خوبصورت پلان بنایا تھا تاکہ وہ اس کی بیوہ سے شادی کرکے خود بھی لکھ پتی بن سکے۔'' میلون نے پھر بولنا شروع کردیا..... ''جب بھی اسے اخبار میں کوئی پراسرار اور لرزہ خیز قتل کی خبر ملتی تھی وہ تراشے کاٹ لیتا تھا۔ پھر کچھ نوٹ بناتا تھا۔ ایوارٹ کے ساتھ فرضی ملاقات کے۔ ہاں میں یہی کہہ رہا ہوں کہ ایوارٹ اس کے پاس کسی خواب وغیرہ کا مسئلہ لے کر کبھی نہیں گیا تھا۔ اور جب اس کے پاس متعدد قتل کی وارداتوں کے تراشے اور نوٹس جمع ہوگئے تھے تو اس نے مجھے بلا کر یہ کہانی سنائی۔'' رک کر اس نے کہا ''اور تم یقین کرو میں نے ابتدا ہی سے اس پر کبھی اعتبار نہیں کیا تھا۔ میرا خیال تو یہ جھوٹا قصہ ہے۔''

''وہ کیوں؟ کس طرح؟'' کیپٹن نے پوچھا۔

میلون نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''پروگرام یہ تھا کہ مسز ایوارٹ اپنے شوہر کو رات گئے ڈاکٹر مارٹن کے ہاں لے جاتی۔ پھر ڈاکٹر مجھے مطلع کرنے کے بعد ایوارٹ کو گولی مارتا۔ ایوارٹ کے ہاتھ میں اس کے کچن کا ایک چاقو پھنسا جاتا۔ بے شک ڈاکٹر کے پلان میں ایک سقم تھا جسے کیپٹن وان نے ذہانت کے ساتھ نوٹ کرلیا تھا۔''

وان نے حیرت سے آنکھیں پٹ پٹا کر میلون کو دیکھا مگر بولا نہیں۔

''چاقو تک پہنچنے کے لیے ایوارٹ آفس سے گزر کر کچن میں جاسکتا تھا تبھی وہ چاقو اٹھاتا پھر پلٹتا۔ اور یہ سب کچھ وہ بھلا ڈاکٹر کے سامنے کس طرح کرسکتا تھا جو کہ بیدار تھا اور اس کا منتظر بھی۔ اس کے ہاتھ میں پستول بھی دیا ہوا تھا۔ اور فون کال کی وجہ سے میں بھی متوقع تھا وہاں۔''

ذرا سی خاموشی ہوئی تو کیپٹن نے کہا۔ ''ہاں یہ بات تو میرے ذہن میں ابھری تھی۔''

''ڈاکٹر کا پلان بہت عمدہ تھا۔ مگر اس میں ایک کسر رہ گئی تھی'' میلون نے کہا۔ ''دراصل مسز ایوارٹ نے اپنا ذہن بدل لیا تھا۔ اس نے ڈاکٹر مارٹن کو کسی وجہ سے اپنے دماغ سے کھرچ دیا تھا۔ اس کی کئی وجوہات ہوسکتی تھیں۔ ہوسکتا ہے اسے معلوم ہوگیا ہو کہ ڈاکٹر کے متعدد معاشقے ہیں۔ یا ہوسکتا ہے کہ ایوارٹ کی ساری دولت وہ اکیلے ہی حاصل کرنا چاہتی ہو.....'' ٹھہر کر اس نے جوئے سے

ملک الموت، ایک مگ کافی اور لاؤ۔ آج صبح کو دس بجے عدالت میں پہنچنا ہے۔ اور نو بج رہے ہیں۔''

''تمہیں شیو اور باتھ کی بھی ضرورت ہے۔'' جوئے نے سادگی سے کہا۔ ''ذرا اونچی آواز سے بولنا تاکہ میں بھی سن سکوں۔'' پھر وہ ہٹ گیا۔

''میں نے سارے سیٹ اپ کو سمجھ لیا تھا۔'' میلون نے کہا۔ ''اس کی آخری فون کال تک۔ مجھے تو یہ اندازہ تھا کہ وہ مجھ سے فون پر اب کہے گا کہ گیا۔ مگر اس سے قبل ہی لائن کٹ گئی۔ وہ بھی ڈیڈ ہوگیا تھا تاہم ایک ادھورا جملہ ضرور اس کے منہ سے نکلا تھا..... میلون میری گن..... اور بولتے ہوئے اس کے لہجے میں زبردست حیرت بھی تھی اور شاک بھی جسے میں نے فوراً ہی نوٹ کرلیا تھا۔''

جوئے نے آواز لگائی۔ ''ذرا اونچی آواز میں بولو۔''

''پھر میں سمجھ گیا۔'' میلون نے کہا..... ''یہ حیرت اس لیے تھی کہ ڈاکٹر کو اپنی گن ڈیسک کی دراز سے غائب ملی تھی۔ اس لیے بھی وہ متعجب ہوا تھا کہ اسے نشے میں دھت ایوارٹ کی توقع تھی مگر اس نے دیکھا کہ وہاں صرف مسز ایوارٹ تھی اور اس کے ہاتھ میں پہلے سے طے شدہ کچن کا چاقو دبا ہوا تھا۔ وہ اسقدر متعجب ہوا تھا کہ فون اس کے ہاتھ سے گر گیا تھا اور وہ اسی عالم میں بیٹھا رہ گیا۔ موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے عورت نے چاقو کے وار سے اس کا نرخرہ ادھیڑ دیا تھا۔ اس نے پھر وہ گن ڈاکٹر کے ہاتھ میں تھما دی جس سے اس نے پہلے ہی اپنے شوہر کا کام تمام کر رکھا تھا۔ پھر وہ واپس آگئی تھی۔ اور سکون سے بستر پر گر کر سو گئی تھی۔ حتیٰ کہ لوگوں نے اسے شور مچا کر بیدار کیا تھا۔''

''لیکن اسے یہ توقع کیوں تھی کہ وہ بچ نکلے گی؟'' وان نے پوچھا۔

''وہ یقیناً بچ سکتی تھی۔'' میلون نے کہا ''اگر درمیان میں کوئی دوسرے ہوتے۔''

جوئے تازہ کافی مگ کے ساتھ آگیا۔

''میں سمجھتا ہوں اس کا پہلا منصوبہ کچھ اور تھا۔ وہ ڈاکٹر کو ڈاکٹر کے آفس میں لا رہی تھی۔ ہاں ڈاکٹر اسے قتل کرتا۔ پھر وہ کسی ترکیب سے ڈاکٹر کو چھرے سے ہلاک کرتا اور پھر یہ فیصلہ پولیس پر چھوڑتی کہ وہ طے کریں کس نے کیا تھا۔'' میلون نے کہا۔ ''مگر یہ پلان الٹ گیا تھا کیوں کہ ایوارٹ کو کسی طرح بھی وہ نشے کی حالت میں آٹھ بلاک دور لے جاسکتی تھی۔ اس نے اچھی طرح چڑھالی تھی لہٰذا اس نے منصوبے میں تبدیلی کردی۔ اور پھر اسے اس صورت میں پایۂ تکمیل تک پہنچایا جو تمہارے سامنے آیا تھا۔''

''مگر میلون۔'' وان نے کہا..... ''عورت کو ڈاکٹر کا پستول کیسے ملا؟''

''مسز ایوارٹ بہت ہوشیار عورت ہے کیپٹن'' میلون نے کہا۔ ''وہ متبادل سوچ کے رکھتی تھی ایک چال ناکام ہوجائے تو دوسری چال کامیاب ہوجائے۔ وہ بہرحال اپنے پاس اسلحہ رکھنا چاہتی تھی۔ اس نے ڈاکٹر کی گن غالباً اسی سہ پہر کو اس کے آفس سے اڑائی ہوگی۔''

کچھ توقف کے بعد وان نے پوچھا۔ ''ایک بات اور ہے۔ تم نے کہا کہ تمہیں شروع ہی سے ڈاکٹر کی کہانی مصنوعی لگی تھی۔ کیوں؟''

''یاد کرو۔ ڈاکٹر مارٹن کے نوٹس۔ ان نوٹس کے مطابق جس میں لکھا تھا کہ جب ایوارٹ قتل کے خواب دیکھتا تھا تو بہت تھکی ہوئی حالت میں بیدار ہوتا تھا۔ اور ہر بار یہ وارداتیں حقیقی ثابت ہوتی تھیں۔ ہر قتل اور ہر بیان کردہ خواب ایک ہی وقت میں رونما ہوتے تھے۔ مگر پھر اس نے خواب دیکھا تھا کہ وہ ڈاکٹر کو قتل کرنے جارہا ہے یعنی ایوارٹ نے اس بار جو خواب دیکھا تھا وہ قتل کے رونما ہونے سے پہلے دیکھا تھا۔'' میلون نے جماہی لی ''اگر ڈاکٹر کا قتل حقیقی ہوتا تو یہ بھی دوسرے خوابوں کے مانند نظر آتا۔ اسی وقت جب ایوارٹ اسے دیکھ رہا تھا۔'' اس نے رک کر کہا..... ''یا پھر اس کے الٹ طریقے سے بھی ہوسکتا تھا..... اچھا میں اب گھر چلتا ہوں۔''

دس بجنے میں پندرہ منٹ تھے جب میلون اپنے آفس میں داخل ہوا۔ اس نے جلدی سے شیو کیا، غسل کیا اور اپنا اچھا سا سوٹ پہنا۔ اسے کورٹ روم میں پہنچنا تھا۔ اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔

مگی نے اسے حیرت سے دیکھا اور بولی۔ ''دس بجے عدالت پہنچنا ہے۔''

میلون نے بریف کیس اٹھایا۔ دوسرے ہاتھ سے اس نے ایک چیک میز پر ڈالا۔ ''اسے فوراً بینک لے جاؤ۔'' اس نے مگی سے کہا۔ ''کیش کرا کے اپنی تنخواہ کے لیے کچھ رقم رکھ لینا اور میرے لیے سو ڈالر چھوڑ دینا۔ آج رات مجھے کسی سے ملنا ہے۔'' وہ دروازے کی طرف بڑھا پھر رکا۔ اس نے ہاں سے ایک مزاحیہ سا لفافہ نکالا جس پر کسی کا نام اور پتا درج تھا۔

''اور ہاں۔ تم باہر جارہی ہو تو میرا ایک کام کردینا...

میرا مطلب پاپ کارن کا ایک بیگ خرید کر اسے گفٹ پیپر میں پیک کرکے مس آدم کے پتے پر بھیج دینا۔''

بیوہ

محمود احمد مودی

ہر ذی روح یہ چاہتا ہے کہ اس کی عزت کی جائے ـــ اس سے محبت کی جائے۔ چاہے جانے کی خواہش ہر دل میں جاگزیں ہوتی ہے ـــ محبت کو پانے کی معصوم سی خواہش ـــ اور دوسری وہ صفات ہیں جو اس ذات کے اندر ملفوف ہیں۔ صفات ہی کسی بھی شخصیت کا ہنر ہوتی ہیں۔ ایک ایسی ہی دوشیزہ کا ماجرا جو اپنی صفات میں یکتا تھی۔ لیکن لمحہ بہ لمحہ اس کی حیات کشمکش کا شکار ہو رہی تھی۔

ایک شوہر کے قتل سے شروع ہونے والی کہانی جس کی بیوی قاتل گردانی جارہی تھی

بیل تین سال بعد اس علاقے میں آیا تھا۔ یہ اس کا پرانا اور جانا پہچانا علاقہ تھا جہاں اس نے طویل وقت گزارا تھا۔ کبھی وہ اپنے بھائی جیک کے ساتھ یہاں رہا کرتا تھا۔ پھر وہ ویٹز ویلا چلا گیا جہاں وہ ایک امریکی کمپنی کی طرف سے آئل ڈرلنگ کا کام کرتا تھا۔ اس کی عدم موجودگی میں اس کے بھائی نے کیتھی نامی کسی لڑکی سے شادی کرلی تھی مگر کچھ عرصہ پہلے ہی اسے اطلاع ملی تھی کہ جیک قتل ہوگیا ہے۔

اس کے بارے میں متضاد خبریں تھیں۔ کوئی کہہ رہا تھا کہ اس نے خودکشی کی ہے، کوئی کہہ رہا تھا کہ یہ کام اس کے کسی دشمن کا ہے اور کسی کا خیال تھا کہ اس قتل میں جیک کی نوجوان اور نوخیز بیوی کیتھی ملوث ہے۔ صحیح صورتِ حال سے آگاہ ہونے کے لیے بیل خود ہارٹس ول آیا تھا جہاں اس نے اپنی زندگی کا طویل عرصہ اپنے بھائی جیک کے ساتھ گزارا تھا۔

مارچ کا مہینہ تھا اور بارش بھی ہو رہی تھی ایسے میں ہارٹس ول نہایت حسین منظر پیش کر رہا تھا۔ وہ اپنے اس شہر کے چپے چپے سے واقف تھا۔ یہاں عام عمارتیں بھی تھیں، جوا خانے اور شراب خانے بھی۔ اس شہر میں کئی غیر قانونی کام ہوتے تھے۔ انڈر ورلڈ والوں کا یہاں خاصا عمل دخل تھا۔ یہاں کی سیاست بھی عجیب تھی۔ اس میں زیادہ تر بدعنوان اور بدنام زمانہ لوگ شامل تھے۔

بیل بارش میں بھیگتا ہوا ہوٹل اسکوبی پہنچا۔ جیسا یہ شہر تھا ویسا ہی اس کا ہوٹل تھا، بے رونق اور بے ہنگم، ہوٹل کے دروازے پر دربان تک نہیں تھا۔ بیل نے وہاں رک کر سامنے والی اسٹریٹ کی طرف دیکھا۔ گارسٹ کے ڈرگ اسٹور کے اوپر ایک کھڑکی نظر آرہی تھی جو بالکل تاریک تھی۔ اس کھڑکی کے نیچے ایک بورڈ لگا ہوا تھا جس پر لکھا تھا: ''جیک اسٹوڈیوز ..... ٹوٹو آرٹس''

تھوڑی دیر تک بیل وہاں کھڑا اپنے بھائی جیک کے اسٹوڈیو ... کی طرف دیکھتا رہا پھر سرد آہ بھر کر ہوٹل میں داخل ہوگیا۔ اس نے ..... کاؤنٹر کلرک سے ایک کمرا طلب کیا جس نے اس کے سامنے رجسٹر رکھ دیا۔ نام کے خانے میں بیل نے اپنا نام ایڈورڈ جانسن لکھ دیا۔ دیر پیا لوٹس ول کا لکھ دیا۔ ایسا اس نے اپنے آنجہانی بھائی کی بیوہ کیتھی سے بچنے کے لیے کیا تھا۔ وہ فی الحال اسے یہ نہیں بتانا چاہتا تھا کہ وہ کون ہے۔

اپنا سامان ہوٹل کے کمرے میں رکھنے کے بعد بیل نیچے آگیا اور سڑک کے کنارے ایک بینچ پر بیٹھ گیا جہاں بارش کا پانی نہیں آرہا تھا۔ وہاں پہلے سے ایک ادھیڑ عمر شخص بیٹھا تھا۔ وہ پرانے سے اوورکوٹ میں تھا وہ پیری تھا ـــ اس کا پرانا دوست۔ اس کا تعلق ہارٹس ول کے ایک اخبار ''کوریئر'' سے تھا۔ اس نے بیل کو دیکھتے ہی اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ بیل نے اس کی طرف پاٹ نظروں سے دیکھا تو وہ سمجھ گیا کہ بیل اپنے بھائی جیک کی موت کی وجہ سے افسردہ ہے۔ اس نے بیل کو مختصراً جیک کی موت کا قصہ سنایا اور کہا ''لوگ حیران تھے کہ تم جیک کی آخری رسوم میں بھی نہیں آئے، آخر کیوں؟''

''مجھے کسی نے فون نہیں کیا تھا..... البتہ جیک کی بیوی کیتھی، جس سے میں کبھی نہیں ملا..... اس نے مجھے خط لکھا تھا'' بیل نے کہا۔

''تم جیک کی شادی میں بھی تو نہیں آئے تھے نا؟'' پیری نے کہا تو بیل سوچنے لگا کہ اگر وہ آجاتا تو جیک کو اس لڑکی سے شادی نہ کرنے دیتا۔ اسے یہ سوچ سوچ کر غصہ آرہا تھا کہ اگر جیک کیتھی سے شادی نہ کرتا تو شاید ابھی تک زندہ ہوتا۔

''دراصل کسی کو پتا نہیں تھا کہ وہ پستول لوڈڈ ہے۔'' پیری نے کہا ''انشورنس والے بھی زیادہ چھان بین نہیں کر رہے ہیں۔ سب کا یہی خیال ہے کہ وہ گولی اتفاقیہ چل گئی تھی جس سے جیک

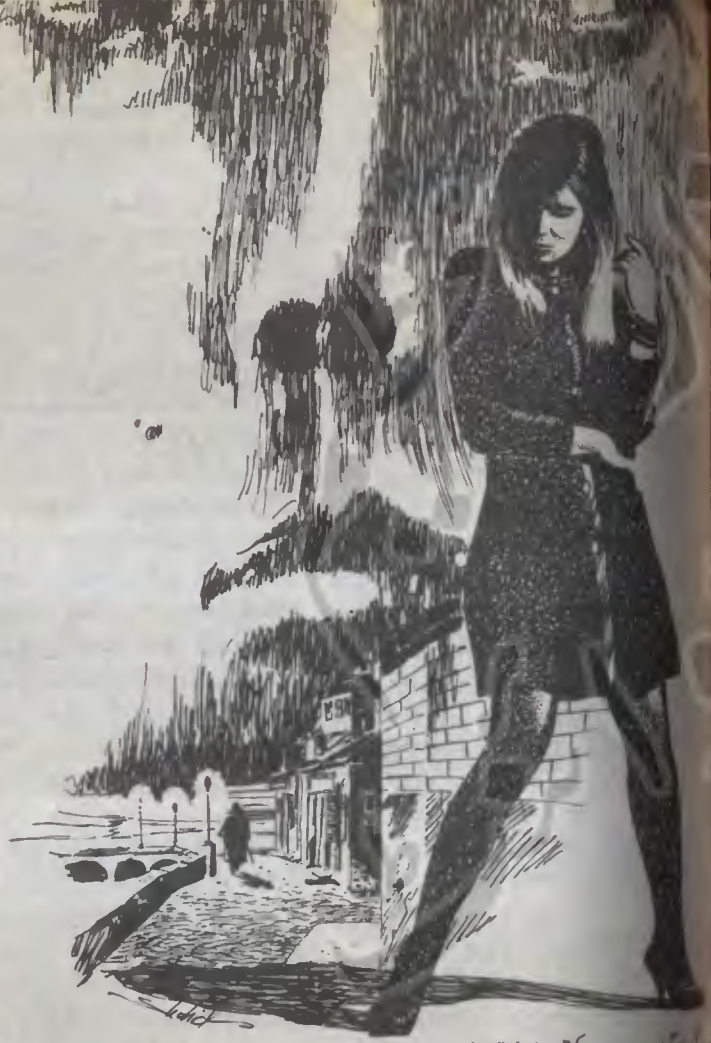

ہلاک ہوگیا..... اس میں کیتھی کا کوئی قصور نہیں تھا۔'' پیری نے بیل کو سمجھانے کی کوشش کی۔

''یہ لڑکی کیتھی..... امر بیل ہے جو انسان کے گرد لپٹتی ہے اور اس کا سارا خون چوس لیتی ہے۔'' بیل نے ناگواری سے کہا ''اس کی طرف داری مت کرو۔ میں اس کے بارے میں چھان بین کرنے کے بعد ہی یہاں آیا ہوں۔''

''تم نے اسے دیکھا نہیں ہے۔ اس سے ابھی ملے نہیں ہو جبھی ایسی بات کر رہے ہو۔'' پیری کی آواز میں احتجاج تھا۔ بیل کو یاد آیا کہ اس کے پاس کیتھی کا ایک پورٹریٹ تھا جس میں وہ شرمیلی لگ رہی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ اپنی صورت سے بہت معصوم لگتی تھی۔ اس نے پیری سے کہا ''میں اس سے مل کر اس کا اور پتا لگانے کی کوشش کروں گا کہ جیک کی موت میں اس کا کیا کردار ہے۔ میں اپنے طور پر انکوائری کروں گا اور دوسرے لوگوں کو بھی چیک کروں گا۔'' یہ کہہ کر وہ وہاں سے چل دیا۔

ہارٹس ول میں زیادہ تبدیلی نہیں آئی تھی البتہ وہاں کے پولیس چیف جلدی جلدی بدلتے رہتے تھے۔ اس وقت کولنز وہاں کا پولیس چیف تھا۔ بیل سیدھا اس کے پاس پہنچا اور اپنا تعارف

کرایا۔ وہ سرخ و سفید چہرے والا بھاری بھرکم انسان تھا جس کی آنکھیں سبز تھیں۔ اس نے بیل سے بڑی گرم جوشی سے مصافحہ کیا اور کہا ''مجھے تمہارے بھائی جیک کی موت کا بے حد افسوس ہے۔ اس بے چارے کی شادی کو ڈیڑھ ماہ ہی تو گزرا تھا کہ وہ چل بسا۔''

''اسے قتل کیا گیا ہے۔'' بیل نے زور دیتے ہوئے کہا۔

وہ جان وہاں مائیک آگیا، ہارٹس ڈل کا چیف سراغ رساں تھا اور سادہ کپڑوں میں تھا۔ اس نے سرسری انداز سے بیل کو ہیلو کہا جس کا بیل نے بھی سرسری انداز سے جواب دیا۔ پولیس چیف کولنز نے بیل سے کہا ''مجھے تمہارے دکھ کا اندازہ ہے۔ تمہارے بھائی جیک نے وہ پستول ایک چوکیدار سے خریدا تھا اور اپنے لھرلا کر اپنی بیوی کیتھی کو دکھایا تھا، کیتھی غالباً یہ نہیں جانتی تھی کہ پستول لوڈ ہے۔ وہ اس معاملے میں اناڑی سی تھی۔ وہ ایسی عورت نہیں تھی جو کسی کو مار سکے۔ اور پھر جیک تو اس کا شوہر تھا..... بہرحال وہ پستول چل گیا اور گولی جیک کے لگ گئی.....''

یہ کہتے ہوئے کولنز اٹھا اور الماری کھول کر اس میں سے کوئی فائل نکالنے لگا۔ پھر اس نے مڑ کر کہا۔ ''اس پستول میں کوئی خرابی تھی جس کی وجہ سے یہ مشکل سے چلتا تھا۔'' یہ کہہ کر اس نے الماری سے سفید کپڑے میں لپٹا ہوا وہ پستول نکال کر بیل کو دکھایا جس سے جیک ہلاک ہوا تھا۔ پستول کے پانچ کارتوس تو نکل کر باہر آگئے مگر چھٹا اندر ہی پھنسا رہا۔ ''یہ تھی اصل خرابی'' کولنز نے کہا ''یہ ایک کارتوس اندر پھنسا ہوا تھا جس کا علم نہ کیتھی کو تھا اور نہ جیک کو..... پھر وہ پستول چل گیا۔ میں نے تمہیں پوری بات بتا دی۔ اب تمہارا جو جی چاہے کرو۔ یہ محض ایک اتفاقی حادثہ تھا۔ تم پیری سے پوچھ لو۔''

''جب یہ حادثہ پیش آیا تو پیری کہاں تھا؟'' بیل نے پوچھا۔

''وہیں..... جیک کے پاس۔'' پولیس چیف نے جواب دیا ''دراصل پیری ہی جیک کو اس کے گھر چھوڑنے گیا تھا۔ راستے میں جیک نے اسے بتایا کہ اس نے پستول خریدا ہے تو پیری نے اسے دیکھنے کی خواہش ظاہر کی..... اس طرح وہ اس کے گھر جا پہنچا۔ کیتھی وہاں موجود تھی۔ ان تینوں نے اس پستول کو دیکھا پھر جیک نے وہ پستول کیتھی کو دیا جس نے اپنے ہاتھ میں لے کر اسے دیکھا..... اور اس وقت وہ چل گیا۔'' یہ کہہ کر کولنز خاموش ہوگیا، بیل زمین کو گھور رہا تھا۔ اس نے ابھی تک کچھ نہیں کہا تھا۔

''کیتھی کے ہاتھ سے وہ پستول چلا، گولی جیک کے لگی اور کیتھی بے ہوش ہوگئی'' کولنز نے کہا ''اسے دو روز تک اسپتال میں رکھا گیا جہاں اس کی حالت بہت خراب تھی۔ کبھی وہ ہنستی تھی اور کبھی روتی تھی۔ اس کی حالت دیوانی عورت کی سی تھی۔''

''اوہ میرے خدا.....!'' بیل نے کہا ''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جیک کو وہ پستول خریدنے کی کیا ضرورت تھی؟''

''میرے خیال میں اپنی حفاظت کے لیے ہر شخص پستول خرید سکتا ہے۔'' کولنز نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

''کولنز! جب میں اور جیک چھوٹے تھے تو میں نے اس کے لیے ایک پستول خریدا تھا۔'' بیل نے کہا۔ ''میں اس کا بڑا بھائی ہوں۔ ہم دونوں گلہریوں کو مارنے جنگل میں نکل جاتے تھے۔ ایک بار ایسا ہوا کہ جیک ایک گلہری کا نشانہ لے رہا تھا کہ میں اتفاقاً اس کے سامنے آگیا مگر میری قسمت اچھی تھی کہ میں بال بال بچا، اس دن کے بعد سے جیک نے پستول کو کبھی ہاتھ نہیں لگایا۔ وہ فوج میں گیا تھا مگر ہتھیاروں سے نفرت کی وجہ سے وہاں سے نکال دیا گیا۔'' یہ کہہ کر بیل ایک لمحے کے لیے خاموش ہوا پھر اس نے کہا۔ ''پستول سے اس قدر نفرت کرنے والے نے اپنی شادی کے بعد اس کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ شادی کے بعد اسے اپنی جان خطرے میں محسوس ہوئی ہوگی۔ تمہارا کہنا ہے کہ کسی کو پتا نہیں تھا پستول لوڈ ہے۔ یہ بات کیتھی اور پیری کہہ رہے ہیں۔ ممکن ہے وہ دونوں جھوٹ بول رہے ہوں۔''

''ممکن ہے ایسا ہو'' کولنز نے سر جھٹک کر کہا۔ ''بہرحال یہ پستول جیک کا ہے۔ اگر تم یہ لینا چاہتے ہو تو پہلے یہ فارم بھرو۔ اس پر دستخط کرو۔'' یہ کہہ کر اس نے ایک فارم میز کی دراز سے نکال کر بیل کے آگے رکھ دیا۔

''جیک نے یہ پستول کسی سے خریدا تھا؟'' بیل نے پوچھا۔

''چارلی نام کے ایک چوکیدار سے'' کولنز نے جواب دیا۔

بیل نے اس فارم کو بھرا اور اس پر دستخط کرنے کے بعد پستول اٹھا کر اپنی جیب میں ڈال لیا۔

''مسٹر بیل! تم نے کہا کہ ممکن ہے کہ کیتھی اور پیری جھوٹے ہوں۔'' کولنز نے کہا ''مگر میرا تجربہ اور اندازہ بتا رہا ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو جانتے تک نہیں۔ اس لیے میرے حساب سے یہ کیس بند ہو چکا ہے۔''

''اگر میں اس کیس کی اپنے طور پر چھان بین کروں تو.....؟''

''جیسی تمہاری مرضی.....'' کولنز نے کہا ''مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔''

☆☆☆

اس کمرے میں فرنیچر نام کی کوئی چیز نہیں تھی اور فرش پر کوئی کارپٹ تھا۔ کھڑکیاں پردوں سے عاری تھیں۔ سورج کی ایک بلا کمرے میں جل رہا تھا اور کمرے میں موجود لڑکی کے

[illegible] تولیہ تھا۔ یہ جیک کا اسٹوڈیو تھا جو اس کا گھر بھی تھا۔ [illegible] کیتھی تھی..... جیک کی بیوی..... کیتھی کو پتا نہیں تھا کہ اس [illegible] اس کے علاوہ کوئی اور بھی موجود ہے وہ اول جلول سی [illegible] عمر اور موٹا شخص تھا جس کے جسم پر ڈھیلا ڈھالا [illegible] بیل اسی آدمی کا تعاقب کرتا ہوا یہاں تک آیا تھا۔ بیل [illegible] وہ دیکھ رہا تھا کہ کیتھی غالباً نہانے کے لیے غسل [illegible] تھی جہاں اسے کوئی چیز یاد آگئی تھی اور وہ اسی چیز کو [illegible] نکالنے کے لیے تولیہ لپیٹے باہر آگئی تھی۔ کیتھی اس [illegible] خاصی پروقار لگ رہی تھی۔ وہ ضرور نہا باہر آگئی تھی [illegible] وہ بے لباس حالت میں اِدھر اُدھر پھرنے والی لگ [illegible]۔ اس کے انداز میں بے حیائی نہیں تھی۔ اچانک [illegible] آدمی پر پڑ گئی تو وہ خوف زدہ ہوگئی۔

''کون ہو تم؟ یہاں کیوں آئے ہو؟'' اس نے خود کو [illegible] ہوئے کہا ''باہر نکل جاؤ۔''

بیل جیک کا پستول اپنے ہوٹل میں چھوڑ آیا تھا۔ اس وقت [illegible] ہتھیار کے تھا پھر بھی اس نے آگے بڑھ کر اس موٹے کو [illegible] تو موٹا اچھل پڑا۔ بیل نے وقت ضائع کیے بغیر اس کے [illegible]۔ موٹا دور جا گرا۔ بیل نے اسے سنبھلنے کا موقع نہیں دیا۔ [illegible] آدمی کے دونوں بازو بیل کی گرفت میں تھے۔ اس نے [illegible] گردن پر قینچی ڈال رکھی تھی۔ بیل اس آدمی کو پہچان چکا [illegible] تھا۔ اس علاقے کا خطرناک بدمعاش..... مگر بیل [illegible] خوفزدہ نہیں ہوا۔ اس نے اس کی خوب مرمت کی۔ پھر [illegible] کیتھی سے کہا ''پولیس کو فون کرو.....''

''فون خراب ہے۔'' کیتھی نے کہا۔

''[illegible] پہنو اور باہر جاؤ، یا تو پولیس کو فون کرو یا اگر کوئی [illegible] نظر آجائے تو اسے ساتھ لے آؤ۔'' بیل نے کیتھی کو [illegible] فوراً اندر چلی گئی اور پل بھر میں لباس پہن کر باہر [illegible] اور بیل، ڈلن کی تلاشی لے چکا تھا۔ اس کی جیبوں [illegible] فرش پر پڑا تھا۔ ڈلن خونخوار انداز میں کبھی [illegible] اور کبھی بیل کو [illegible]

[illegible] آؤ اور پولیس کو ساتھ لانا'' بیل نے کیتھی سے کہا تو [illegible] دیکھتی ہوئی باہر چلی گئی۔ اس کے انداز اور چال [illegible] بیل کو اندازہ ہوگیا تھا کہ کیتھی اس طرح کی عورت [illegible] وہ اسے سمجھ رہا تھا۔ کیتھی کے جانے کے بعد ڈلن [illegible] جانے والی نظروں سے بیل کو دیکھا۔

''[illegible] کیوں آئے تھے؟'' بیل نے ڈلن سے سوال کیا [illegible] ساتھ کیا کرنے والے تھے؟''

''[illegible] نے والا تھا..... یہ کیسے بتاؤں؟'' ڈلن نے دانت نکالے۔ [illegible] چیف سراغ رساں مائیک کو بلاؤں گا۔ وہ تمہیں زیادتی کے کیس میں اندر کردے گا۔'' بیل نے کہا ''وہ شخص زیادتی کے کیس کا ماہر ہے۔''

''تم میرے باس اسمتھ کو نہیں جانتے۔'' ڈلن نے کہا۔

''خوب جانتا ہوں۔ وہ جزیرے کا مالک ہے۔ اس پر اس کی بادشاہت ہے۔ وہاں اس کے ہوٹل، جوا خانے اور کلب چل رہے ہیں۔ وہ ہارٹس ڈل کے انتخابات میں بھی دولت خرچ کرتا ہے اور سیاسی اثر رسوخ رکھتا ہے۔'' بیل نے کہا ''مگر مائیک اس سے نہیں ڈرتا۔ وہ اسمتھ گروپ کے ایک آدمی کو ختم کرنے میں بھی نہیں ہچکچائے گا۔ وہ سر پھرا انسان ہے۔''

''بیل.....! کیتھی اب واپس نہیں آئے گی۔'' ڈلن نے بیل کی بات کاٹتے ہوئے کہا ''اس عورت نے دس روز پہلے تمہارے بھائی کو ہلاک کیا ہے..... ابھی تو اس کے دماغ سے بارود کی بو بھی نہیں گئی ہوگی۔''

بیل نے اس پستول سے..... جو اس نے ڈلن کی جیب سے نکالا تھا، اسے کونے میں دھکیل دیا اور اس کے سینے پر نال رکھتے ہوئے کہا ''تم..... یہاں..... کیوں..... آئے تھے.....؟''

یکایک ڈلن نے پلٹی کھائی۔ اس نے اتنی تیزی سے حرکت کی تھی کہ بیل ہکا بکا رہ گیا۔ پستول اب پھر ڈلن کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے بیل کو ہاتھ اٹھانے کا حکم دیا اور پستول اس کی ناف پر رکھ دیا۔ دوسرے ہاتھ سے اس نے بیل کی تلاشی لی اور اس کا پرس نکال لیا۔

اس نے کہا ''میں تم پر رحم کھا رہا ہوں کہ تمہیں اس شہر سے باہر جانے کا کرایہ دے رہا ہوں۔ یہ پکڑو..... اور دفع ہو جاؤ۔''

بیل جانے کے لیے آگے بڑھا تو پیچھے سے ڈلن نے اسے دھکا دیا مگر پھر اسے غسل خانے میں چلنے کا حکم دیا۔ بیل کے پاس اس کا حکم ماننے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ جیسے ہی وہ غسل خانے میں داخل ہوا اس کی چھٹی حس نے خطرے کا احساس دلایا۔ وہ تیزی سے جھکا اور ڈلن کے پستول کا دستہ اس کے سر کے بجائے اس کے کندھے پر پڑا۔ وہ باتھ ٹب میں جا گرا۔ دروازہ بند ہوگیا اور اس کے تالے میں چابی گھومنے کی آواز آئی۔ پھر اس نے ڈلن کے قدموں کی آواز سنی۔ وہ اپارٹمنٹ سے باہر جا رہا تھا۔

بیل نے غسل خانے کا جائزہ لیا۔ اسٹینڈ پر دو تولیا لٹکا ہوا تھا جو کیتھی اپنے جسم پر لپیٹ کر باہر آئی تھی۔ تولیے کے کونے پر ہوٹل دلفورڈ کا نام لکھا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ آج کل کیتھی اس ہوٹل میں رہ رہی تھی۔ اگر ایسا تھا تو وہ غسل کرنے یہاں کیوں آئی تھی؟ پھر بیل کو یاد آیا کہ ہوٹل دلفورڈ میں ایک منزل پر صرف ایک مشترکہ باتھ روم تھا اس لیے کیتھی اپنے اپارٹمنٹ آئی ہوگی۔

کچھ دیر بعد بیل اٹھا۔ اس نے باتھ روم کے دروازے پر

اپنے کندھے سے ٹکریں مارنی شروع کر دیں۔ آٹھویں ٹکر میں دروازہ کھل گیا۔ باہر فرش پر بیل کا پرس پڑا تھا۔ ڈلن نے وعدے کے مطابق اس میں شہر سے باہر جانے کا کرایہ چھوڑا تھا۔ باقی رقم لے اڑا تھا۔

باہر آنے کے بعد بیل نے اس اپارٹمنٹ کا تفصیلی جائزہ لیا۔ بیڈ روم کی الماری کھلی ہوئی تھی اور تمام کپڑے بیڈ پر ایک ڈھیر کی صورت میں پڑے تھے۔ وہ غالباً جیک کے کپڑے تھے۔ پورے اپارٹمنٹ میں بیڈ اور الماری کے سوا اور کوئی فرنیچر نہیں تھا۔ پھر اس کی نظر فون پر پڑی تو اس نے انکوائری کا نمبر ڈائل کر کے اس سے ہوٹل ولفورڈ کا نمبر معلوم کیا۔ نمبر لے کر اس نے ہوٹل رابطہ کیا اور مسز کیتھی جیک کے کمرے میں ملانے کو کہا۔ دوسری طرف سے کیتھی کی آواز آئی۔

''میں ایڈورڈ جانسن بول رہا ہوں۔'' بیل نے ماؤتھ پیس میں کہا ''وہی ایڈورڈ جس نے تم سے کہا تھا کہ پولیس لے آؤ..... کیا وہ پولیس قطب شمالی کا چکر کاٹ کر آ رہی ہے؟''

''مسٹر ایڈورڈ! میں نے تم سے وعدہ نہیں کیا تھا کہ پولیس لے آؤں گی۔ تم نے کہا اور میں خاموشی سے چلی آئی۔'' کیتھی نے کہا۔

''تو کیا تم فون بھی نہیں کر سکتی تھیں؟'' بیل نے غصے سے کہا ''تم نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا کہ تمہارا فون خراب ہے جبکہ اس وقت میں اسی فون سے بات کر رہا ہوں۔''

''مسٹر..... میں آج کل جن حالات سے گزر رہی ہوں ایسے میں کسی پر بھی بھروسا کرتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔'' کیتھی نے کہا اس کا لہجہ معذرت خواہانہ تھا۔

''بہر حال..... تمہارا وہ موٹا دوست جو میرے قابو میں تھا، بھاگ نکلا ہے اور اس نے مجھے زخمی بھی کر دیا ہے۔'' بیل نے کہا ''وہ کسی چیز کی تلاش میں تھا۔ اس نے تمہارے اپارٹمنٹ کی تلاشی بھی لی ہے۔ کچھ اندازہ ہے کہ وہ کیا چیز ہو سکتی ہے؟''

''میں کیا کہہ سکتی ہوں۔'' کیتھی نے سرد آہ بھری۔ ''اس گھر کی ہر چیز میں نے بیچ دی ہے یا پھینک دی ہے..... سوائے اپنے آنجہانی شوہر جیک کے چند کپڑوں کے.....''

''ٹھیک ہے..... اپنا خیال رکھنا۔'' بیل نے کہا۔ ''کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ تم میرے ساتھ ڈنر کرو اور اس دوران میں ایسے آدمی پر نظر رکھوں جو تمہاری تلاش میں ہو؟''

''شکریہ..... میں ڈنر کر چکی ہوں۔'' کیتھی نے کہا۔

''تو ٹھیک ہے..... میں کچھ دیر بعد تمہارے ہوٹل آتا ہوں۔'' بیل نے کہا ''تمہارے شوہر کے پاس فوٹوگرافی کے چند نادر اور بیش قیمت آلات تھے، میں ان کے سلسلے میں ہی یہاں آیا ہوں۔ یہ خالصتاً کاروباری معاملہ ہے۔''

''مگر میں نے تو لبرٹی لون کمپنی سے کہا ہے کہ وہ ان آلات کی فروخت کے سلسلے میں میری مدد کرے۔'' کیتھی نے کہا ''تم میرے پاس آ سکتے ہو۔ میں تم سے خود معذرت کر لوں گی۔''

''ٹھیک ہے..... میں آ رہا ہوں۔'' بیل نے یہ کہہ کر سلسلہ منقطع کر دیا۔ پھر اس نے جیک کے کپڑوں کی الماری کو چیک کرنا شروع کر دیا۔ اس کی نظر بکرے کی کھال سے بنے ہوئے ایک چھوٹے بیگ پر پڑی۔ اس نے بیگ کھول کر دیکھا اور مسکرا دیا۔ اس میں ٹوتھ برش، کنگھا، نیل فائل، ریزر، شیونگ برش وغیرہ الگ الگ خانوں میں آج بھی اسی طرح رکھے تھے جس طرح برسوں پہلے رکھے جاتے تھے۔ اچانک اس کی نظر جیک کی ایک قمیص پر پڑی جس کی جیب پر ایک سوراخ تھا۔ اس سوراخ کے کناروں پر کپڑا بھورا نظر آ رہا تھا۔ وہ شاید جلنے سے ایسا ہوا تھا۔ اس نے قمیص وہیں چھوڑی اور فون پر پولیس چیف کولنز سے رابطہ کیا اور ڈلن کے بارے میں بتاتے ہوئے کہا کہ اسے فوراً گرفتار کیا جائے۔ اس کی وہ باقاعدہ رپورٹ درج کرانے آ رہا ہے، کولنز نے اسے ڈلن کو گرفتار کرنے کی یقین دہانی کرا دی۔ بیل اپارٹمنٹ سے باہر آ گیا۔ بکرے کی کھال والا بیگ اس کی جیب میں نہیں سما رہا تھا اس لیے اس نے اسے نکال کر اپنی بغل میں دبا لیا اور نیچے پہنچا۔

بارش ابھی تک ہو رہی تھی۔ لگ رہا تھا کہ رات بھر ہوتی رہے گی۔ اچانک اس کی نظر لبرٹی لون کمپنی کے بورڈ پر پڑی۔ یہ وہی کمپنی تھی جس کے بارے میں کیتھی نے بتایا تھا کہ اس نے جیک کا فوٹوگرافی کا سامان اور قیمتی آلات اس کمپنی کو دینے کے لیے کہا ہے۔ ابھی وہ اس کمپنی کے بورڈ کو دیکھ رہا تھا کہ اسے مائیک نظر آ گیا..... ہارلس ول کا چیف سراغ رساں۔ وہ کسی گہری سوچ میں تھا۔ وہ سیدھا اپنی سیاہ سیڈان کی طرف چلا گیا تھوڑی دیر بعد سیڈان وہاں سے روانہ ہو گئی۔ ذرا سا غور کرنے کے بعد بیل نے اندازہ لگایا کہ مائیک سامنے والے آفس سے نکلا تھا جو دراصل لبرٹی لون کمپنی کا آفس تھا۔ پھر اسے یاد آ گیا کہ جیک کی موت کے بعد اس کی بیوی نے تمام سامان اسی کمپنی کو دیا تھا۔ بیل اسی آفس میں داخل ہوا اور اس نے کاؤنٹر پر کھڑے ادھیڑ عمر شخص سے کہا ''پولیس تمہیں پریشان کر رہی ہے۔ ہے نا.....؟''

''ایسی کوئی بات نہیں۔'' اس شخص نے جواب دیا ''پولیس سے ہمارے تعلقات ہمیشہ اچھے رہتے ہیں مگر تم.....؟''

''میں نے مائیک کو تمہاری دکان سے نکلتے دیکھا تھا اس لیے پوچھ لیا۔'' بیل نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''دراصل لیفٹیننٹ مائیک فوٹوگرافی کے چند آلات دیکھنے

[illegible] ادھیڑ عمر شخص نے کہا ''کل رات لوز ول کے کسی ڈیلر [illegible] کا پڑا تھا اور اس کا فوٹوگرافی کا قیمتی سامان اڑا لیا گیا [illegible]''

''وہ.....'' یہ کہہ کر بیل خاموشی سے واپس چلا آیا۔ پہلے [illegible] مائیک..... دونوں ہی گدھوں کی طرح جیک کے [illegible] منڈلا رہے تھے۔ بیل سیدھا پالی کے شراب خانے کی [illegible] بڑھتا چلا گیا۔

☆☆☆

پالی کے شراب خانے میں ایک بوڑھا شخص بیل کے پاس [illegible] نمائش کرنے کی کوشش کی مگر وہ [illegible] سے پہلے ہی محروم تھا اس لیے موسوڑوں کی نمائش کر کے رہ [illegible]

''میرا نام چارلی ہے۔'' بوڑھے نے اپنا تعارف کرایا تو [illegible] یاد آ گیا کہ یہ وہ چوکیدار ہے جس سے جیک نے پستول [illegible] تھا۔

''خدا گواہ ہے مسٹر بیل..... کہ میں نے تمہارے بھائی [illegible] اس پستول کی خرابی کے بارے میں بتا دیا تھا۔'' چارلی [illegible] رانہ لہجے میں بیل سے کہا ''میں نے اسے وہ خرابی دکھا [illegible] کی جو اس کے انجیکٹر میں تھی..... مگر اس نے مجھ سے کہا [illegible] مسئلہ نہیں اسے جس کام کے لیے پستول کی ضرورت ہے، [illegible] اس خرابی سے کوئی فرق نہیں پڑے گا.....''

''چارلی! گیا جیک نے تمہیں بتایا تھا کہ اسے پستول کی [illegible] کیوں پڑ گئی ہے؟'' بیل نے سوال کیا۔

''نہیں..... میں نے پستول کے ساتھ کارتوسوں کا ایک ڈبا [illegible] تو اس نے منع کر دیا اور کہا کہ اس کے پاس کارتوس ہیں۔ [illegible] میں خدا کو حاضر ناظر جان کر کہتا ہوں کہ جس وقت میں [illegible] وہ پستول دیا اس وقت وہ لوڈ نہیں تھا۔''

بیل خاموشی سے چارلی کو دیکھتا رہا اور اس کے مزید بولنے [illegible] کرتا رہا۔ چارلی نے کہا۔ ''جس روز تمہارا بھائی قتل ہوا وہ [illegible] رات تھی اور اس روز میرا آف ڈے تھا، اس رات میں [illegible] دیکھا، تمہیں بتاؤں؟''

''ضرور..... اگر کوئی کام کی بات ہو تو.....'' بیل نے کہا۔

''تمہارا کیا خیال ہے کہ جب تمہارا بھائی اپنے اپارٹمنٹ [illegible] کتنے افراد تھے؟'' چارلی نے الٹا سوال کر دیا۔

''مجھے دو کا معلوم ہے..... کیتھی..... یعنی جیک کی بیوی اور [illegible]'' بیل نے جواب دیا۔

''بہر حال..... اس رات میں ایسے ہی سڑکوں پر آوارہ [illegible] تھا۔'' چارلی نے کہا ''جب میں اس سڑک پر آیا تو میں نے اوپر سے..... یعنی جیک کے اسٹوڈیو سے کسی کو نیچے کی طرف بھاگ کر اترتے دیکھا۔ وہ پستہ قد اور موٹا سا تھا۔''

''وہ..... ڈلن ہوگا'' بیل نے کہا۔

''ممکن ہے وہی ہو مگر میں نے اسے پہچانا نہیں تھا۔'' چارلی یہ کہتے ہوئے اٹھا اور شراب خانے سے باہر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد خرانٹ شکل والا ایک شخص اس کی میز کے پاس پہنچا۔ اس کی آنکھوں میں سفاکی اور چہرے پر کرختگی تھی۔ وہ ڈلن تھا۔ اس نے بیل سے کہا۔

''تمہیں اس شہر میں دوبارہ دیکھ کر خوشی ہوئی۔''

''کیوں جھوٹ بول رہے ہو؟'' بیل نے ڈلن کے سرخ بالوں کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا ''میں جانتا ہوں کہ تم کیا محسوس کر رہے ہو.....''

ڈلن نے کہا۔ ''جس بار میں تم اس وقت بیٹھے ہو، میں اسی کا مالک ہوں۔'' یہ کہہ کر اس نے قہقہہ لگایا۔ ''اب کیا میں اپنے کاروباری امور کی نگرانی بھی نہ کروں؟''

''خیر..... یہ بتاؤ کہ تمہاری سیاست کیسی چل رہی ہے؟'' بیل نے کہا۔

''تم نے سنا ہوگا کہ رونالڈ بیمار ہے۔'' ڈلن نے کہا تو بیل کی نظروں کے سامنے رونالڈ کا چہرہ گھوم گیا۔ وہ ہارلس ول کا بے تاج بادشاہ تھا۔ یہاں اسی کی حکمرانی تھی۔ اس نے ڈلن کو ڈیٹرائٹ سے خاص طور پر بلوایا تھا تاکہ اپنی ''سلطنت'' کے چند مسائل پر قابو پا سکے۔ اس علاقے میں رونالڈ کا مدمقابل اسمتھ تھا اور ڈلن نے اسمتھ کے خلاف ایک محاذ تیار کیا تھا۔ رونالڈ کو یقین دلایا تھا کہ اسمتھ اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ اس نے ایسی حکمت عملی تیار کی تھی کہ اسمتھ کو بے دست و پا کر کے رکھ دیا تھا۔ رونالڈ، ڈلن کی کارکردگی سے بہت خوش اور مطمئن تھا مگر اب وہ بیمار ہو گیا تھا۔

یکایک بیل اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ اسے جاتے دیکھ کر ڈلن نے کہا ''ارے ارے کہاں چل دیے؟ ابھی تو میں تم سے تمہارے بھائی کے قتل پر افسوس کا اظہار بھی نہیں کر سکا۔''

''تو اب کر لو.....'' بیل نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

''دراصل میں نے جیک کی موت سے پہلے اس کے لیے ایک چھوٹا سا کام کیا تھا۔'' ڈلن نے کہا تو بیل کی آنکھوں میں الجھن کے آثار نمودار ہو گئے۔

''اگر تم میرے ساتھ کار تک چلو تو بہت اچھا ہوگا۔ میں تمہیں کچھ تصویریں دکھانا چاہتا ہوں۔'' ڈلن نے کہا اور آگے بڑھ گیا۔

بیل نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے پیچھے پیچھے چل دیا۔ وہ دونوں کچن کے ذریعے عقبی راستے سے نکل کر باہر آئے تھے۔ اسی

لمحے فائر کی تیز آواز گونجی اور ایک نارنجی رنگ کا شعلہ ولسن کی طرف لپکا۔ ایک ایک کر کے لگاتار تین فائر ہوئے اور ولسن اُچھل کر پیچھے کی طرف گرا۔ بیل نے خود کو اس سے بچایا تو ولسن کا جسم کوڑے دان پر جا گرا۔ بیل نے ایک لمحے میں فیصلہ کیا۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا اور وہاں سے باہر کی طرف دوڑ لگا دی۔

باہر تیز بارش ہو رہی تھی۔ بیل سڑک پر دوڑتا چلا گیا۔ کچھ دور تک دوڑنے کے بعد وہ رک گیا پھر اس نے تیز قدموں سے آگے بڑھنا شروع کیا۔ وہ اپنے ہوٹل "اسکوبی" پہنچا اور سیدھا اپنے کمرے میں گھس گیا۔ اس کے سامان کو کسی نے الٹ پلٹ دیا تھا۔

اس کا مطلب یہ تھا کہ وہاں کوئی آیا تھا۔ اس نے پستول کی تلاش میں بیگ میں ہاتھ مارا تو پتا چلا کہ وہ بھی غائب ہے۔ اس نے فون کی طرف بڑھنا چاہا مگر پھر اپنے کمرے سے باہر نکل گیا۔ باہر سڑک پر پولیس کار کا سائرن بج رہا تھا۔ بیل نے اِدھر اُدھر دیکھا اور ایک سمت دوڑ لگا دی۔ ایک سگریٹ اسٹور سے اس نے "کوریئر" کا نمبر ملایا اور پیری کے بارے میں پوچھا۔ وہاں سے بتایا گیا کہ پیری نہیں ہے، البتہ اسے دفتر سے پیری کے لاجنگ ہاؤس کا فون نمبر اور پتا مل گیا تھا جہاں پیری رہ رہا تھا۔ بیل نے پیری کا نمبر ملایا۔

دوسری طرف پیری ہی تھا۔ اس نے پیری کی آواز سنتے ہی کہا۔ "تم نے مجھے یہ کیوں نہیں بتایا تھا کہ جس رات میرا بھائی قتل ہوا تھا اس رات تم اس کے اسٹوڈیو میں تھے؟"

"میں نے تمہیں بتانے کی کوشش تو کی تھی ....." پیری نے نرمی سے کہا۔

"اچھا' مجھے ایک کار اور کچھ رقم کی ضرورت ہے۔" بیل نے کہا۔

"کار تو میرے پاس ہے مگر رقم نہیں ہے۔" پیری نے جواب دیا۔

"چلو کوئی بات نہیں ..... اسمتھ تو چیک بھی لے لے گا۔" بیل نے کہا "مگر مجھے اس کے جزیرے تک پہنچنے کے لیے بھی تو کچھ رقم چاہیے نا۔" دوسری طرف خاموشی رہی، پھر پیری کی آواز ابھری۔

"مجھے صرف دس منٹ دے دو۔ اس کے بعد تم جہاں کہو گے میں تمہیں پہنچا دوں گا۔" بیل نے پیری کو بتایا کہ وہ کہاں کھڑا ہے پھر سلسلہ منقطع کر دیا۔

اس کے بعد اس نے اپنی جیب سے شراب کی چھوٹی بوتل نکالی جو اس نے کچھ دیر پہلے خریدی تھی، وہ بوتل اخبار میں لپٹی ہوئی تھی جیسے ہی اس نے اخبار کھولا، اس کی سرخی دیکھ کر چونک گیا۔ لکھا تھا "نئی دلہن نے اپنے شوہر جیک کو ہلاک کر دیا۔"

"یہ ہارلس! اس کوریئر کی آٹھ روز پرانی کاپی تھی۔ وہ اس خبر کو پڑھتے پڑھتے مسکرانے لگا۔ پھر اس نے زیرِ لب کہا "ٹھیک ہے مسٹر مہ! دیکھتا ہوں کہ تم اس چکر سے کیسے نکلتی ہو۔"

☆☆☆

تھوڑی دیر بعد بیل اور پیری ایک پرانی کار میں جزیرے کی طرف جا رہے تھے۔ بیل نے پیری سے کیتھی کے بارے میں پوچھا تو اس نے کہا "میں کیتھی کو زیادہ نہیں جانتا۔ اس سے میری پہلی ملاقات شادی والے دن ہوئی تھی۔ البتہ سمندر کے کنارے ایک ہوٹل میں اس کا گانا ضرور سنا تھا میں نے ..... تھوڑا بہت اس کا پس منظر بھی جانتا تھا۔ وہ ایک یتیم لڑکی ہے مگر باعزت خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ اسکول میں اس کا تعلیمی ریکارڈ شاندار رہا۔ اس نے انڈیانا پولیس کے ایک میوزک اسکول میں داخلہ لیا تاکہ وہاں سے میوزک سکھانے کی سند حاصل کر سکے مگر وہ اس میں ناکام رہی۔ بہرحال بعد میں اس نے ایک میوزک گروپ جوائن کر لیا اور عمدہ کارکردگی کا مظاہرہ کرنے لگی۔ اگر وائرس انفیکشن کی وجہ سے اس کی آواز اور گلا خراب نہ ہوتا تو شاید وہ آج بھی بہترین گلوکارہ ہوتی۔" یہ کہہ کر پیری خاموش ہو گیا۔

"یہ سب سن کر مجھے کیا کرنا چاہیے؟" بیل نے پوچھا۔

"کیتھی کو اس کے حال پر چھوڑ دو۔" پیری نے پُرسکون لہجے میں کہا۔

"میں نے یہ بھی سنا ہے کہ قتل والی رات جیک کے اسٹوڈیو میں کوئی تیسرا آدمی بھی موجود تھا!" بیل نے پیری کی طرف دیکھے بغیر سوال کیا "اس کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ وہ مونا اور پستہ قامت تھا اور قتل کے بعد بڑی عجلت میں وہاں سے بھاگا تھا۔"

"بیل! یہ انوا ہوں کا شہر ہے۔ یہاں تم کچھ بھی سن سکتے ہو۔" پیری نے گاڑی موڑتے ہوئے کہا اور پھر "کوریئر" کے دفتر کے سامنے روک دی۔ اس کے بعد اس نے بیل کی طرف گھوم کر دیکھا۔

"سنو پیری! تم نے وہ قمیص دیکھی تھی جو اس رات جیک نے پہن رکھی تھی؟" بیل نے پوچھا۔

"ہاں ..... وہ پیلی قمیص تھی۔ وہ مجھے اس لیے یاد رہ گئی کیونکہ اس کے سامنے والے حصے میں جلے کا نشان تھا ..... جیسے سگریٹ کی وجہ سے پڑ جاتا ہے۔ جس وقت فائر ہوا، جیک سگریٹ پی رہا تھا۔ فائر کی آواز سن کر اور جیک کو گولی لگتے دیکھ کر کیتھی بے ہوش ہو گئی تھی۔ میں نے اسے بستر پر لٹایا اور پولیس کو فون کر دیا۔ میں حلفیہ کہہ سکتا ہوں کہ کیتھی کی بے ہوشی ڈراما نہیں تھی۔" پیری نے تفصیل سے پوری بات بتائی۔ کچھ دیر بعد اس

نے کہا۔ "اب میں سمجھا کہ تم پیرا ڈائز آئی لینڈ کیوں جا رہے ہو۔"

اس کی بات سن کر بیل نے اقرار میں سر ہلایا تو اس نے کہا۔ "بات جیک کے اسٹوڈیو میں میرے ..... جیک کے اور کیتھی کے درمیان نہیں تھا۔ تم لوگوں کے کہنے میں مت آؤ۔ انہوں نے یہاں ہوں کا بازار گرم کر رکھا ہے۔" یہ کہتے ہوئے اس کے لہجے میں تلخی آ گئی۔ "ہارلس دل کی صورتِ حال خراب ہے۔ رونالڈ مرحوم بے وجہ سے مر رہا ہے اور اس لیے یہاں کے سیاسی معاملات میں دلچسپی کی رغبت کمزور ہو چکی ہے۔"

"یہ میں سن چکا ہوں۔" بیل نے کہا۔

"ولسن اب بھی ہمارے ساتھ ہے۔" پیری نے کہا "یہ اسی وجہ ہے کہ اسمتھ ابھی تک اس علاقے کے معاملات سے دور ہے۔ اگر ولسن نہ ہوتا تو نہ جانے اسمتھ اس شہر کا کیا حشر کرتا۔ اس نے تمام انتظامی معاملات اپنے ہاتھ میں لے رکھے ہیں۔ اس کے تمام کاغذات اور اہم دستاویزات کے علاوہ اس کی "بلیک بک" بھی ولسن کے پاس ہے۔ اگر ولسن کو کچھ ہوا تو وہ بلیک بک سیدھی وکیل کے پاس چلی جائے گی۔ وکیل کو قانونی تحفظ حاصل ہے۔ اس طرح ان لوگوں نے پولیس اور قانون کی طرف سے اپنے دفاع کی آخری دیوار تعمیر کر لی ہے۔ پولیس چیف ہنٹر کو صرف اپنی تنخواہ سے مطلب ہے ..... جبکہ ولسن کو تو تم جانتے ہو۔ بہرحال صورتِ حال خاصی پیچیدہ ہے کسی وقت بھی بہت بڑی گڑبڑ ہو سکتی ہے۔" یہ کہہ کر پیری خاموش ہو گیا۔

پھر اسے کچھ یاد آیا تو اس نے اپنی جیب سے پچاس ڈالر کا نوٹ نکال کر بیل کی طرف بڑھایا "یہ لو ..... یہ تو میں بھول ہی گیا تھا۔"

بیل نے وہ نوٹ لے لیا اور پیری کار کا دروازہ کھول کر اترتے جاتے اس نے بیل کو ایک پستول بھی دیا اور اس سے کہا۔ "تم جزیرے کی طرف جا رہے ہو ..... یہ رکھ لو۔ اس کی ضرورت پڑ سکتی ہے تمہیں ....." بیل نے مسکراتے ہوئے پستول لیا اور اپنے کوٹ کی جیب میں ٹھونس لیا۔ پھر اس نے کار چلائی اور ہوٹل اسکوبی پہنچا۔ وہاں ایک پولیس کار دیکھ کر وہ رکا تھا لہٰذا وہ کار سیدھا نکال لے گیا اور ہوٹل ولفورڈ پہنچا جو تھی۔ اس کے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا جس میں کیتھی ٹھہری تھی۔ وہ کھڑکی کے پاس ایک کرسی پر بیٹھی کچھ پڑھ رہی تھی۔ اس نے دروازے پر دستک دی تو کیتھی نے نظر اٹھا کر بیل کی طرف دیکھا اور اٹھ کر اس کی طرف بڑھی اس وقت وہ بہت عمدہ لگ رہی تھی اور اس میں اس کا حسن جلوہ دکھا رہا تھا۔ اس کے چہرے پر مدھم سی مسکراہٹ تھی۔

"آؤ ..... آؤ ....." اس نے خوشگوار لہجے میں بیل سے کہا۔

"میرا باہر جانے کا موڈ ہے۔ لمبی ڈرائیو پر ..... پھر کسی اچھی جگہ رات کا کھانا کھائیں گے۔" بیل نے کہا۔

"ضرور مسٹر ایڈورڈ جانسن!" کیتھی نے مسکراتے ہوئے کہا "اس بارش میں تو لانگ ڈرائیو میں اور بھی مزہ آئے گا ..... مگر میں ذرا لباس بدل لوں۔ تم بیٹھو ....." یہ کہہ کر اس نے اپنی ڈریسنگ ٹیبل کی دراز سے ایک بکس نکالا اس میں چاکلیٹ بھری ہوئی تھی۔ اس نے بکس بیل کے سامنے کرتے ہوئے کہا "یہ لو ..... بے فکر ہو کر کھاؤ ..... اس میں زہر نہیں ہے ..... دیکھو ..... ابھی دو ہفتے پہلے ہی تو میں نے اپنے شوہر کو مارا ہے اب اتنی جلدی میں دوسرا قتل تو نہیں کر سکتی ....." اس کی آواز میں چھپا ہوا طنز بیل نے واضح طور پر محسوس کیا۔ وہ اس کے سنہرے چمک دار بالوں اور زندگی سے بھرپور آنکھوں کو دیکھتا رہ گیا جو لمحے بھر کو بجھ کر پھر روشن ہو گئی تھیں۔

بیل نے ایک چاکلیٹ لیتے ہوئے کہا۔ "ہم دو اجنبی ہیں اور قتل کے موضوع پر بات کر رہے ہیں .....!"

وہ کیتھی کو بغور دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ یہ معصوم سی اور بے ضرر نظر آنے والی حسینہ کیا اپنے شوہر کو قتل کر سکتی ہے؟ کیا یہ اداکاری کر رہی ہے؟

"دراصل یہ بات میں نے تم سے اس لیے کہہ دی کہ جب ہم دونوں عوامی مقامات پر ساتھ جائیں گے تو لوگ میرے ساتھ تم پر بھی انگلیاں نہ اٹھائیں ..... بعد میں تم سوچو گے کہ میں نے تمہیں اندھیرے میں رکھا۔" کیتھی نے کہا۔

"میرے خیال میں یہ کام ہر عورت نہیں کر سکتی اور جو کرے گی وہ اس شہر میں نہیں رہ سکتی۔"

"یہ ایک حادثہ تھا ..... اتفاقی حادثہ۔" بیل نے محسوس کیا کہ کیتھی کی آواز میں تلخی آ گئی تھی۔

"میں نے صرف سرخی پڑھی تھی۔" بیل نے سنجیدگی سے کہا "جس میں لکھا تھا، دلہن نے جیک کو ہلاک کر دیا، سرخی میں حادثے کا لفظ نہیں تھا۔ ان الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے جیسے تم نے ارادی طور پر اپنے شوہر کو ہلاک کیا تھا۔"

"مگر یہ حادثہ تھا ....." اس نے اصرار کیا۔

"پھر تو تم کوریئر اخبار پر ہتکِ عزت کا مقدمہ دائر کر سکتی ہو۔" بیل نے کیتھی سے کہا "عدالت تمہیں اس سے نصف ملین کے قریب رقم دلوا سکتی ہے۔"

کیتھی استہزائیہ انداز میں مسکرا کر رہ گئی۔ پھر وہ اندر چلی گئی تھوڑی دیر بعد وہ تیار ہو کر باہر آ گئی۔ اس نے بیل سے کہا "مقدمے بازی کے لیے بھی پیسہ چاہیے۔ جبکہ اس وقت میری

حالت یہ ہے کہ میرے پاس لگ بھگ بیس ڈالر ہیں اور میرے شوہر کے چھوڑے ہوئے بہت سارے بل..... ظاہر ہے ان کی ادائیگی کے لیے مجھے اپنا فرنیچر فروخت کرنا پڑا۔ جیک کے فوٹو گرافی کے آلات فروخت کرنے پڑے..... یا پھر انشورنس ہے..... مگر لوگوں کی زبانیں تو بند ہوں..... اس کے بعد ہی انشورنس کمپنی سے مجھے رقم مل سکتی ہے۔"

"تم کسی اچھے وکیل کی خدمات حاصل کرلو۔" بیل نے کہا۔

"سوچوں گی۔" کیتھی نے آگے بڑھتے ہوئے کہا "ویسے میری پوری زندگی جدوجہد کرتے گزری ہے۔ میں آسائشوں کے لیے ترستی رہی ہوں۔ تمہاری نصیحت پر عمل کروں گی، نصف ملین ڈالر کم نہیں ہوتے۔"

"تم یہ مقدمہ جیت سکتی ہو۔" بیل نے کہا "کوریئر کو ثابت کرنا ہوگا کہ تم نے اپنے شوہر جیک کو قتل کیا ہے، وہ نہیں کرسکے گا۔"

"ٹھیک ہے..... اب چلیں؟" کیتھی نے مسکراتے ہوئے کہا تو بیل نے آگے قدم بڑھا دیے اور وہ دونوں ہوٹل ولفورڈ سے باہر نکل آئے۔ وہ دونوں واٹر اسٹریٹ تک بے مقصد اور بے معنی باتیں کرتے رہے۔ پھر ان کی کار دریا کے کنارے کنارے دوڑنے لگی۔ ہر طرف دھند اور کہر چھائی ہوئی تھی۔ بارش بھی ہو رہی تھی۔ اس دھند میں بھی دور سے ہی "پیراڈائز آئی لینڈ کیسینو" کا بورڈ نظر آرہا تھا۔

"کبھی وہاں گئی ہو؟" بیل نے کیتھی سے پوچھا۔

"صرف ایک بار۔" کیتھی نے جواب دیا۔

"کیا سیر و تفریح کے لیے گئی تھیں؟" بیل نے سوال کیا۔

"نہیں..... صرف سیر و تفریح کے لیے نہیں گئی تھی۔ مگر کہہ بھی سکتے ہیں۔" کیتھی نے جواب دیا۔

☆☆☆

اسمتھ اس پورے علاقے کا مالک تھا۔ یہ علاقہ۔ شہر کی حدود سے باہر تھا۔ یہاں نہ شہر کے اعلیٰ افسران کی چلتی تھی اور نہ ولسن کی۔ پیراڈائز آئی لینڈ کیسینو کے پارکنگ لاٹ میں تیز روشنی نظر آرہی تھی جس میں نصف درجن سے زائد کاریں کھڑی تھیں۔ اسمتھ کے متعدد چھوٹے بحری جہازوں میں سے ایک جہاز اس وقت بھی دریا کے ساتھ بنے ہوئے پلیٹ فارم پر لنگر انداز تھا۔ کیتھی اور بیل اس جہاز پر سوار ہوئے اور صرف آٹھ منٹ کے سفر کے بعد وہ اس علاقے میں پہنچ گئے۔ جہاں تک نہ شہر کا کوئی سرکاری افسر آسکتا تھا اور نہ ہی ولسن یہاں قدم رکھنے کی جرأت کرسکتا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ اس وکٹورین طرز کی خانقاہ میں کھڑے تھے جسے اسمتھ نے ایک نائٹ اسپاٹ میں بدل دیا تھا۔ اس کا استقبالیہ جگمگا رہا تھا۔ فرش پر سرخ قالین بچھے تھے اور جگہ جگہ شفاف بلوریں فانوس لٹک رہے تھے۔ ایک سیاہ فام ملازم کی راہ نمائی میں وہ تیسری منزل پر پہنچے۔

اوپر کی منزل کی آرائش دیکھ کر بیل اور کیتھی حیران رہ گئے۔ چاروں طرف دیواروں پر عریاں عورتوں کی پینٹنگز لگی تھیں۔ زرق برق لباسوں میں، بینڈ ایک دھن بجا رہا تھا۔ مختصر لباسوں والی ویٹریس کھانا اور مشروبات سرو کررہی تھیں۔ ایک ویٹرس نے بیل اور کیتھی کو ایک میز پر پہنچایا جس پر مدھم سی نیلی روشنی تھی۔ اس کے اوپر شیشے کی چھت تھی جس پر برستی بارش عجیب منظر پیش کررہی تھی۔

کھانے کے دوران کیتھی تو سنجیدہ رہی مگر بیل ہنسی مذاق بھی کرتا رہا اور کسی بھوکے کی طرح جلدی جلدی کھانا بھی کھاتا رہا۔ اچانک اٹھارہ انیس سال کا ایک لڑکا اس کے پاس آیا اور اسے کہنی ماری۔ بیل نے چونک کر زرد چہرے والے اس لڑکے کو دیکھا اور اسی وقت اس کا ہاتھ اپنے ہولسٹر کی طرف گیا جس میں پستول تھا۔

"مسٹر اسمتھ تم سے ملنا چاہتے ہیں۔" لڑکے نے کہا۔

بیل نے کیتھی کی طرف دیکھا۔ وہ کھانا کھاتے رک گئی تھی۔

"تم کھانا کھاؤ..... میں ذرا مسٹر اسمتھ سے مل آؤں۔" بیل نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔ پھر اس نے نیپکن اٹھایا اور جان بوجھ کر نیچے گرا دیا مگر جب اس نے جھک کر وہ نیپکن اٹھایا تو اسی دوران وہ اپنا پستول بڑی مہارت سے کیتھی کے بیگ کے پاس ڈال چکا تھا۔ یہ وہی پستول تھا جو اسے پیری نے دیا تھا۔ کیتھی نے پستول دیکھ لیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں خوف نظر آیا مگر اس نے زبان سے کچھ نہیں کہا۔

بیل اس لڑکے کے ساتھ چل دیا۔ وہ دونوں اس مختصر ہال کے سرے پر پہنچے۔ وہاں پہنچتے ہی لڑکے نے پستول نکال کر بیل کی پرتان لیا اور تلاشی دینے کو کہا۔ بیل نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ مطمئن ہونے کے بعد لڑکے نے دروازہ کھول دیا اور بیل کا ہاتھ پکڑ کر اندر دھکیل دیا اور پھر دروازہ بند کرکے واپس چلا گیا۔

سامنے بیضوی شیشے کی میز کے عقب میں اسمتھ بیٹھا تھا۔ وہ سیاہ سوٹ میں تھا۔ اسمتھ کی رنگت میدے کی طرح سفید تھی مگر اس کے نقوش کسی نیگرو کے سے تھے۔ اس کے چہرے سے اس کی عمر کا اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔ اسمتھ کے پاس ایک سیاہ کتا بیٹھا تھا۔ وہ بیل کو دیکھتے ہی غرایا مگر اسمتھ نے اس پر ہاتھ پھیرا تو خاموش ہوکر بیٹھ گیا۔

"مسٹر اسمتھ..... اپنے کتے کو قابو میں رکھنا..... اگر آئندہ وہ مجھ پر غرانے کی کوشش کی تو میں اس کے دانت توڑ دوں گا۔" بیل نے بے خوف انداز سے کہا۔

"مجھے..... اب آرام سے کرسی پر بیٹھ جاؤ۔" اسمتھ نے بیل سے کہا۔ اس کی نظریں بیل پر جمی ہوئی تھیں۔

"تمہارے پالتو کتے ڈلن نے آج مجھے بڑا نقصان پہنچایا ہے۔" بیل نے اسمتھ سے کہا۔ "وہ میرے بھائی کے اپارٹمنٹ میں گھس گیا تھا۔ وہاں اس نے مجھ سے میرا پرس چھین لیا اور مجھے وہاں سے جانے کا کرایہ دیا تھا۔ میں اسے چھوڑوں گا نہیں۔"

"مجھے ڈلن پاگل ہوگیا ہے۔" اسمتھ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ممکن ہے، ویسے میں نے سنا ہے کہ جس رات میرا بھائی مرا تھا اس رات کسی نے ڈلن کو اس کے اسٹوڈیو سے بڑی عجلت میں بھاگتے دیکھا تھا۔"

"یہ نہیں ہوسکتا، کوئی تمہیں دھوکا دے رہا ہے۔" اسمتھ نے سر ہلاتے ہوئے کہا "بہرحال تم مجھ سے اپنی رقم لے لو۔ یہاں تمہارا بل کتنے کا بنا ہے؟ تم نے ادائیگی کردی؟"

"نہیں..... میرا بل تین سو کا بنا ہے جو میں چیک کی صورت میں دوں گا۔"

"ٹھیک ہے..... تم چیک دے دو اور مجھ سے اپنی رقم لے لو۔"

بیل نے اپنی جیب سے چیک بک نکالی اور چیک کاٹ کر اسمتھ کو دے دیا۔ اسمتھ نے اس کو رقم نقد ادا کردی پھر بیل اٹھا تو اسمتھ نے اسے آواز دی۔ "ٹھہرو..... آج تم نے اپنے بھائی کے فلیٹ سے کوئی چیز لی تھی؟"

بیل یہ سن کر چونک اٹھا اور سوچنے لگا کہ وہ ابھی تک یہ لوگ بیل تک نہیں پہنچ سکے جس کی انہیں تلاش ہے۔ پتا نہیں وہ کیا ہے یا ڈلن اس کی تلاش میں جیک کے اسٹوڈیو گیا تھا مگر وہ وہاں نہیں ملا۔ پھر اس نے بیل کے ہوٹل والے کمرے کی تلاشی لی۔

"مسٹر اسمتھ! میں نے اپنے بھائی جیک کے اسٹوڈیو سے ایک رومال والا چھوٹا بیگ لیا تھا..... وہ شیونگ کٹ ہے جو میرے ڈیڈی کا ہے۔"

"جھوٹ مت بولو۔" اسمتھ نے غراتے ہوئے کہا۔

"جو چاہو سمجھو۔" بیل نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"رونالڈ مر رہا ہے۔ اس کے علاوہ کوئی دوسرا شخص میری سیاست کو اتنا نہیں سمجھتا جتنا تم سمجھتے ہو۔" اسمتھ نے کہا "مجھے ایک مضبوط آدمی کی ضرورت ہے۔"

"اور تم نے اس کے لیے ولسن کو اپنے ساتھ ملا لیا ہے، ہے نا؟" بیل نے تلخ لہجے میں کہا۔

"تم اس شہر میں سٹی انجینئر تھے مگر ولسن سے اختلاف کی وجہ سے تمہاری ملازمت گئی تھی۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟" اسمتھ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"مسٹر اسمتھ! پارٹس دل پر تمہارا قبضہ ہوتا ہے یا تمہارے مخالف گروپ کا..... مجھے اس سے کوئی غرض نہیں ہے۔ مجھے غرض ہے تو صرف اس بات سے کہ میرے بھائی کا قاتل کون ہے۔" بیل نے کہا اور واپسی کے لیے مڑ گیا۔ اسمتھ نے کتے کو اشارہ کیا اور وہ اچانک ہی بیل پر جھپٹ پڑا۔ بیل نے کتے کے گھونسا مارنا چاہا تو کتے نے اس کا بایاں ہاتھ منہ سے دبوچ لیا اور دونوں فرش پر گر گئے۔ کتا اسے بری طرف بھنبھوڑ رہا تھا۔ بیل نے اپنا سیدھا ہاتھ پوری قوت سے کتے کے مارا۔ اسی وقت کمرے کا دروازہ زوردار آواز کے ساتھ کھلا۔ اسمتھ نے نہ جانے کس زبان میں کتے سے کچھ کہا تو کتے نے بیل کا ہاتھ چھوڑ دیا اور اپنے مالک کے پاس چلا گیا۔

کھلے دروازے میں کیتھی کھڑی تھی۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھا جس کا رخ اسمتھ کی طرف تھا۔ کیتھی کو دیکھتے ہی اسمتھ کو گویا سکتہ ہوگیا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے کیتھی کو دیکھے جا رہا تھا۔ بیل نے اپنی زخمی ہاتھ کو دیکھا جسے اسمتھ کے کتے نے بھنبھوڑا تھا۔ پھر وہ تیزی سے کیتھی کی طرف بڑھا۔ اس کے ہاتھ سے پستول لیا اور دونوں باہر چلے گئے۔

باہر والے ہال کے دوسرے سرے سے زرد چہرے والا وہی لڑکا آرہا تھا جو بیل کو اسمتھ کے پاس لے گیا تھا۔ اس نے بیل اور کیتھی کو اجنبی نظروں سے دیکھا اور سیدھا چلا گیا۔ راستے میں انہیں کسی نے نہیں روکا۔ بحری جہاز پر سوار ہونے کے بعد کیتھی نے بیل کے ہاتھ کی کسی حد تک مرہم پٹی کی، اتفاق سے اس کے بیگ میں سے ایک سفید اسکارف نکل آیا تھا۔ اس نے وہ اسکارف بیل کے زخمی ہاتھ پر لپیٹ دیا۔ وہ بے حد خوف زدہ نظر آرہی تھی۔ کنارے تک پہنچتے پہنچتے وہ اسکارف بھی خون آلود ہوچکا تھا اور کیتھی اور بیل کے کوٹ بھی۔

کار میں بیٹھتے ہی کیتھی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ وہ روتے روتے کچھ کہہ بھی رہی تھی جو بیل کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ بیل نے اسے رونے دیا۔ اس دوران اس نے پیری کا پستول واپس اس بکس میں رکھ دیا جس میں رکھ کر پیری نے اسے دیا تھا۔ بیل نے کیتھی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے تسلی دی تو کیتھی کھڑکی کی طرف منہ کیے بیٹھی رہی۔

"تمہیں مجھ سے نفرت ہے نا؟" اچانک کیتھی نے گلوگیر لہجے میں کہا تو بیل چونک کر اسے دیکھنے لگا۔

"ہاں بیل..... تم مجھ سے نفرت کرتے ہو۔"

"مگر میں ایڈورڈ جانسن ہوں....." بیل نے کہنا چاہا تو کیتھی نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"میں تمہیں پہلی نظر میں ہی پہچان گئی تھی۔ آخر تم میرے آنجہانی شوہر جیک کے بھائی ہو۔ اب ایسا بھی نہیں تھا کہ میں تمہیں نہ پہچانتی۔"

بیل نے خاموشی سے پیری کی کار اسٹارٹ کی اور آگے بڑھا دی حالانکہ اس کا ایک ہاتھ زخمی تھا جس کی وجہ سے اسے کار چلانے میں خاصی پریشانی ہو رہی تھی مگر وہ ہمت سے کام لیتا رہا۔ اسے یاد آ رہا تھا جب اسے جیک نے کیتھی کی تصویر بھجوائی تھی اور لکھا تھا کہ وہ اس لڑکی سے شادی کر رہا ہے..... تو نہ جانے کیوں کسی حد تک وہ حسد اور رقابت کا شکار ہو گیا تھا۔ اس نے کیتھی کی تصویر کو صرف ایک بار دیکھا تھا پھر اپنی الماری میں ڈال لیا تھا۔

"ہم کہاں جا رہے ہیں بیل؟" یکایک کیتھی نے سوال کیا۔

"ہم آکشن یارن جا رہے ہیں جہاں چیزیں نیلام ہوتی ہیں۔" بیل نے جواب دیا۔ "جانتی ہو وہ کہاں ہے؟"

"اچھا..... وہاں جہاں میں نے اپنا فرنیچر بھجوایا تھا..... مگر وہ تو اس وقت بند ہو گا۔" کیتھی نے کہا۔

"مگر چارلی تو وہاں ہو گا نا۔" بیل نے کار کی رفتار بڑھاتے ہوئے کہا۔

"پہلے تم اپنا زخمی ہاتھ کسی ڈاکٹر کو تو دکھا لو۔" کیتھی نے کہا۔

"میرا ہاتھ ٹھیک ہے اس کی فکر مت کرو۔" بیل نے جھوٹ بولا۔

اسی دوران اس کی کار کی ٹکر ایک ٹرک سے ہوتے ہوتے رہ گئی۔ کیتھی خوف زدہ نظروں سے کبھی بیل کو دیکھ رہی تھی اور کبھی اس کے زخمی ہاتھ کو۔ پھر انہیں آکشن یارن کا بورڈ نظر آ گیا۔ خاصی بڑی جگہ تھی۔ اس کا دروازہ بھی بہت بڑا تھا۔ پوری جگہ میں مدھم زرد بلب جل رہے تھے۔

دروازے پر کار روک کر بیل باہر نکلا اور اس نے کیتھی سے کہا "بس میں دو منٹ میں آیا، تم یہیں رکو۔"

گیٹ مقفل نہیں تھا۔ بیل اطمینان سے اندر چلا گیا۔ آگے والے حصے میں گھریلو سامان رکھا تھا۔ اس کے بعد والے حصے کی طرف بڑھتے ہوئے بیل ٹھٹک گیا۔ وہاں کوئی پڑا ہوا تھا۔ قریب پہنچ کر بیل کو اندازہ ہوا کہ وہ شخص مر چکا تھا۔ اس کے ہاتھ میں پستول دبا ہوا تھا اور اس کے اردگرد خون کا تالاب سا بن چکا تھا۔

☆☆☆

وہ لاش چارلی کی تھی جو اس جگہ کا چوکیدار تھا۔ اس کا منہ اور آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ اس کی گردن میں گولی ماری گئی تھی۔ اس کے علاوہ اس کے سینے اور پیٹ کو بھی نشانہ بنایا گیا تھا۔ چارلی کی لاش کا جائزہ لینے کے بعد بیل نے آگے بڑھ کر وہاں رکھے فرنیچر کو دیکھا۔ یہ وہی فرنیچر تھا جو کیتھی نے جیک کی موت کے بعد اس کے واجبات ادا کرنے کے لیے نیلام گھر بھجوایا تھا۔ فرنیچر کے ساتھ بیل کو اپنی ماں کا پرانا صندوق نظر آیا جو کھلا ہوا تھا۔ صندوق کے برابر میں چھوٹی میز رکھی تھی۔ یہ اس کے ڈیڈی کی میز تھی۔ بیل افسردہ نظروں سے اپنے گھر کی ان چیزوں کو دیکھتا رہا۔ پھر اسے کوئی خیال آیا تو اس نے اس میز کو الٹا دیا۔ اب اس کے چاروں پائے بیل کے سامنے تھے۔

ایک خیال کے تحت اس نے ایک پائے کو غور سے دیکھا تو اسے اس میں خول محسوس ہوا۔ اس نے اندر ہاتھ ڈالا تو سلور کی ایک ٹیوب ہاتھ میں آئی۔ بیل نے اسے کھینچ کر باہر نکالا۔ پھر اس نے وہ ٹیوب کھولی اور اس میں ایک فلم رول دیکھ کر مسکرا دیا۔ اس نے وہ ٹیوب اپنی جیب میں ڈال لی۔ اس ساری محنت کی وجہ سے اس زخمی ہاتھ میں شدید درد ہونے لگا تھا اور خون بھی بہنے لگا تھا۔ وہ جلدی جلدی باہر نکلا جہاں کیتھی میں کار میں بیٹھی اس کا انتظار کر رہی تھی۔ بیل پر نظر پڑتے ہی اس نے کہا "تمہارا ہاتھ کیسا ہے؟"

"وہ تو ٹھیک ہے مگر..... تمہیں سردی تو نہیں لگ رہی؟" بیل نے گویا کیتھی کے سوال کو ان سنا کرتے ہوئے پوچھا۔

"میں ٹھیک ہوں، تم کس کے پاس گئے تھے؟" کیتھی نے پوچھا۔

"چارلی کے پاس..... اس نے جیک کو پستول بیچا تھا۔" بیل نے جواب دیا۔ اچانک اس نے کہا۔ "مجھے اس کیس کے بارے میں کچھ بتاؤ گی؟"

"تم سب کچھ جانتے ہو۔" کیتھی نے کہا۔

"اس رات اپارٹمنٹ میں تم، جیک اور پیری تھے۔" بیل نے بڑبڑانے والے انداز سے کہا۔ "اور جب پستول چلا تو وہ تمہارے ہاتھ میں تھا؟"

"ہاں..... مجھے بس اتنا یاد ہے۔" کیتھی نے رندھی ہوئی آواز میں کہا "کہ اس کے چہرے پر شدید تکلیف کے آثار نمودار ہوئے اور وہ لہراتا ہوا فرش پر گر گیا۔"

"اس کے بعد تمہیں اسپتال میں ہوش آیا تھا؟" بیل نے پوچھا۔

"نہیں..... مجھے گھر میں ہی اپنے بستر پر ہوش آیا تھا۔ تمہیں اس کے بعد میں ان لوگوں نے مجھے اسپتال بھجوا دیا تھا۔ تمہیں اس

کے بعد چارلی نے کیا بتایا ہے؟ کیا کوئی اور بات بتائی ہے؟"

"اس نے کچھ نہیں بتایا۔" بیل نے سرد آہ بھری۔ "تمہیں پتا ہے کہ جیک نے یہ پستول کیوں خریدا تھا؟"

"نہیں، مجھے کچھ پتا نہیں۔ میرا خیال ہے کہ اسے اس کی ضرورت تھی۔" کیتھی نے جواب دیا۔

"تم ولسن کو جانتی ہو؟" بیل نے پوچھا۔

"میں اس سے ایک بار ملی تھی۔" کیتھی نے کہا "جس دن میں، میں گائی تھی، وہ اس کا مالک ہے۔"

"ارے وہ تو نہ جانے کس کس چیز کا مالک ہے۔" بیل نے اسے کہا "ایک بار اس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ میرا بھی مالک ہے اور مجھے خرید چکا ہے۔ اس نے مجھے خریدنے کی کوشش کی تھی۔"

"مگر تم بہت اچھے انسان ہو۔" کیتھی نے فخر سے کہا۔ "تم بکنے والے نہیں ہو گے۔" پھر ان دونوں کے درمیان خاموشی چھا گئی۔

جب وہ ہوٹل دلفورڈ پہنچے تو لیفٹیننٹ مائیک نے ان کا استقبال کیا جو نہ جانے کب سے کیتھی کے کمرے میں براجمان تھا۔ اس کے ساتھ ایک پولیس والا بھی تھا۔ جس نے فوراً بیل کو حراست میں لے لیا۔ مائیک نے آگے بڑھ کر بیل کی تلاشی لی۔ پھر اس نے بیل سے کہا "وہ پستول کہاں ہے؟"

"کون سا پستول؟" بیل نے الٹا سوال کر دیا۔

سنتے ہی مائیک نے ایک زوردار تھپڑ بیل کے منہ پر رسید کیا مگر چیخ کیتھی کے حلق سے نکلی۔

"لے آؤ اسے..... نیچے ہال میں....." مائیک نے اپنے ساتھ موجود پولیس والے سے کہا پھر اس نے کیتھی سے کہا "اور تم بھی آ جاؤ....."

☆☆☆

بیل کے کانوں میں آواز آئی۔ "یہ شخص..... جس کا نام بیل ہے..... آج کل اس پر خون سوار ہو رہا ہے۔" اس کے بعد وہ نہیں سن سکا۔ اس کا ذہن ڈوبنے لگا۔ پھر اس نے اپنا زخمی ہاتھ کی گرفت میں محسوس کیا۔ کسی نے اس کے ہاتھ کو اینٹی سپٹک محلول سے دھویا اور اس پر دوا لگا کر پٹی باندھنے لگا۔ مرچیں تھیں تو بیل نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ وہ سٹی ہال کے تہ خانے میں پہنچتے ہی پہچان گیا کیونکہ کسی زمانے میں جب یہ تعمیر ہو رہا تھا تو اس نے یہاں انجینئر کی حیثیت سے کام کیا تھا۔

بیل کنکریٹ کے فرش پر لیٹا ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے ستارے رقص کر رہے تھے۔ دو ڈاکٹر اس کے ہاتھ کی مرہم پٹی کر رہے تھے جن میں سے ایک ادھیڑ عمر تھا اور دوسرا جوان۔ وہ اپنا کام کرتے رہے اور بیل حالات پر غور کرتا رہا۔

اس دوران ڈاکٹروں کے ذریعے بیل کو پتا چلا کہ ولسن کو کسی نے شوٹ کر دیا ہے۔ اس کے جسم سے جو گولیاں برآمد ہوئی ہیں وہ اس گولی جیسی ہیں جو میک کے جسم سے نکالی گئی تھی۔ میک کو اسی پستول کی تلاش تھی جو جیک نے چارلی سے خریدا تھا۔ اس کا واضح مطلب یہ تھا کہ ہوٹل اسکوبی سے بیل کے کمرے سے کسی نے وہ پستول چرا کر ولسن کو گولی ماری تھی تاکہ سارا الزام بیل پر آ جائے۔ کھیل بڑی مہارت سے کھیلا گیا تھا کیونکہ اب تک مائیک نے بیل سے جو پوچھ گچھ کی تھی اس میں اس کے اور اس کے ساتھی پولیس والے کے علاوہ کوئی تیسرا موجود نہیں تھا اور نہ اس کا باقاعدہ بیان لیا گیا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ یہ سب کام مائیک اپنے طور پر کر رہا تھا..... اور وہ یقیناً کسی کا آلۂ کار بن گیا تھا۔

دونوں ڈاکٹر، بیل کے ہاتھ کی ڈریسنگ کرنے کے بعد واپس چلے گئے، ان دونوں کو بیل سے ہمدردی تھی۔ وہ مائیک کا ساتھی پولیس والا اندر آیا تو بیل نے اس سے پوچھا۔ "مسز جیک کہاں ہے؟" اس کی آواز میں نقاہت تھی۔

"دوسرے کمرے میں" پولیس والے نے جواب دیا "مائیک کو شک ہے کہ اس نے تمہارے بھائی کو قتل کیا ہے۔ اس لیے وہ اس سے تفتیش کر رہا ہے۔"

"مگر..... " کہتے کہتے بیل نے اٹھنے کی کوشش کی تو پولیس والے نے اسے اٹھنے نہیں دیا اور کہا "مائیک کے ساتھ تعاون میں ہی تمہاری بھلائی ہے۔"

"وہ کس طرح کا تعاون چاہتا ہے مجھ سے؟" بیل نے کراہتے ہوئے کہا۔

"مائیک کا خیال ہے کہ تمہارے..... یا تمہاری بھابی..... کے پاس ولسن کی بلیک بک کی نقل ہے۔" پولیس والے نے کہا۔ "یہ وہ کاپی ہے جو جیک نے تیار کی تھی اور وہ اس کے ذریعے نہ جانے کیا مقصد حاصل کرنا چاہتا تھا۔"

"اوہ..... تو یہ مسئلہ ہے!" بیل نے دل میں کہا اصل مسئلہ یہ نہیں تھا کہ ولسن کو کس نے ہلاک کیا ہے..... بلکہ یہ تھا کہ بلیک بک کی وہ نقل کہاں ہے..... کس کے پاس ہے جو جیک نے بنائی تھی؟ حالات بگڑ رہے تھے۔ کسی بھی وقت کوئی بڑا دھماکا ہو سکتا تھا۔ اسمتھ اور مائیک کے درمیان تعلقات پہلے ہی کشیدہ تھے اب ہارلس ول پر کنٹرول کے لیے وہ دونوں پاگل ہو رہے تھے۔

پولیس والا بیل کو اپنے ساتھ باہر لے گیا اور ہال میں بائیں طرف مڑ گیا۔ اس نے بیل کو سہارا دے رکھا تھا کیونکہ بیل بے حد نقاہت محسوس کر رہا تھا۔ وہ بڑی مشکل سے چل رہا تھا۔ پھر وہ

ایک کمرے میں داخل ہوگئے جہاں کیتھی بھی موجود تھی۔ مائیک سامنے میز کے عقب میں بیٹھا تھا۔ کیتھی کا چہرہ سفید ہو رہا تھا۔ اس نے بیل کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا شاید اسے پتا ہی نہیں چلا کہ بیل آیا ہے۔ وہ مائیک کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''پھر.....؟'' مائیک کیتھی سے کہہ رہا تھا۔'' پھر جیک نے وہ پستول تمہارے ہاتھ میں دیا۔ تمہارے پاس موقع تھا۔ جیک بالکل سامنے تھا۔ تم نے اسے مارنے کا ارادہ کیا..... کیونکہ تم جیک سے طلاق لینا چاہتی تھیں اور اس سلسلے میں دو روز پہلے تم ایک وکیل کے پاس بھی گئی تھیں۔'' یہ کہہ کر مائیک ایک لمحے کو رکا۔ پھر اس نے کہنا شروع کیا'' جیک مالی مشکلات میں گھرا ہوا تھا۔ وہ جوئے میں ہار گیا تھا۔ جوئے خانے والے اس سے رقم وصول کرنے کے لیے اس پر دباؤ ڈال رہے تھے۔ شاید اسی لیے جیک نے وہ پستول خریدا تھا۔ یا پھر ممکن ہے کہ جیک نے وہ پستول تم پر دباؤ ڈالنے کے لیے خریدا ہو..... وہ تم سے کوئی ایسا کام کرانا چاہتا تھا جو تم کرنا نہیں چاہتی تھیں۔''

کیتھی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کا چہرہ سفید پڑ چکا تھا اور آنکھوں میں خوف تھا۔

''بہر حال جیک کو رقم کی ضرورت تھی..... اس نے کچھ تصویریں بیچی تھیں..... ایسی تصاویر ملک بھر کے بڑے بڑے جوا خانوں میں نام نہاد آرٹ کے قدردان لگاتے ہیں..... میں ایسی ہی ایک تصویر تمہیں دکھاتا ہوں۔''

مائیک کی بات سنتے ہی کیتھی کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ اس کے حلق سے کراہنے کی سی آواز نکلی۔ مائیک نے ایک پوسٹ کارڈ کے سائز کی تصویر میز کے دراز سے نکالی جسے دیکھنے سے پہلے کیتھی نے دونوں ہاتھوں سے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ وہ تصویر کیتھی کی تھی جس میں وہ نہانے کے ٹب سے نکل کر تولیے کی طرف ہاتھ بڑھا رہی تھی۔ وہ برہنہ تصویر بلاشبہ کسی گندے ذہن کی عکاس تھی۔

''یہ اس تصویر کی کاپی ہے جو دوسری اسی طرح کی تصویروں کے ساتھ جیک نے آرٹ کے شوقین لوگوں کے ہاتھوں فروخت کی تھی۔'' مائیک نے کہا'' یعنی جیک نے اپنی بیوی کو بھی ساری دنیا کے سامنے قدرتی لباس میں پیش کردیا..... جس پر تم یقیناً اس سے ناراض ہوئی ہوگی..... اور اسی لیے تم نے اسے قتل کردیا۔''

اسی لمحے بیل کے حلق سے بے معنی سی آواز نکلی تو کیتھی نے مڑ کر اسے دیکھا۔ بیل یہ سب سن کر چکرا گیا تھا..... وہ لڑکھڑاتا ہوا باہر نکل آیا۔ اس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا۔ مائیک کے اسی انکشاف نے اسے چکرا کر رکھ دیا تھا۔ وہ بری طرف ہانپ رہا تھا۔ اسی وقت مائیک بھی باہر آگیا۔ اسے دیکھتے ہی بیل نے ہانپتے ہوئے کہا'' مائیک! اسے چھوڑ دو..... کیتھی کو جانے دو۔''

''مگر کیوں؟'' مائیک نے کہا۔

''مجھے پتا ہے کہ ولسن کی بلیک بک کہاں ہے۔'' بیل نے کہا ''میں تمہیں اس جگہ لے چلوں گا..... مگر اسے جانے دو۔''

بیل کی بات سن کر مائیک کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ آگئی اس نے اپنے ماتحت پولیس والے سے کہا'' کیتھی کو اس کے ہوٹل چھوڑ آؤ۔'' پھر اس نے بیل سے کہا'' اصل مسئلہ یہ ہے کہ تمہارے بھائی جیک نے اسی بلیک بک کی ایک کاپی تیار کی تھی..... ہمیں اس کی ضرورت ہے۔ وکیل کو جو کاپی بھجوائی گئی تھی وہ ہم نے اس کے دفتر سے غائب کرالی ہے۔''

''تمہاری باتوں سے لگ رہا ہے کہ اس کاپی میں دھماکا خیز انکشافات کا سامان ہے..... اگر وہ منظرِ عام پر آیا تو قیامت آجائے گی۔'' بیل نے مسکراتے ہوئے کہا تو جواب میں مائیک بھی مسکرا دیا۔ اسی اثنا میں مائیک کے کمرے کا دروازہ کھلا اور وہ پولیس والا باہر آیا جس سے مائیک نے کہا تھا کہ وہ کیتھی کو اس کے ہوٹل پہنچا دے۔

اس پولیس والے نے بیل سے کہا'' وہ تمہیں اندر بلا رہی ہے۔''

بیل اندر چلا گیا۔ کیتھی بری طرح رو رہی تھی۔ اس کا میک اپ بگڑ چکا تھا۔ بیل کو دیکھتے ہی اس نے ہچکیاں لیتے ہوئے کہا۔'' مجھے معاف کردینا بیل! میری وجہ سے تمہیں.....'' بیل غور سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ کیتھی نے پھر کہا۔'' مجھے معاف کردینا..... مجھے.....''

''کیتھی! تمہیں چاہیے تھا کہ مجھے خط لکھ کر تمام حالات سے باخبر کردیتیں۔'' بیل نے سنجیدگی سے کہا۔

''کیا تم میری بات پر یقین کرلیتے؟'' کیتھی نے سوال کیا تو بیل چپ رہا۔ کیتھی نے کہا۔'' وہ اچھا انسان نہیں تھا۔ جیک نے میرے ساتھ بہت زیادتی کی..... بہت.....''

اسی وقت مائیک نے دروازہ کھول کر اندر جھانکتے ہوئے کہا'' بیل..... جلدی آؤ..... ہمیں دیر ہو رہی ہے۔''

بیل نے کیتھی کی طرف دیکھے بغیر دروازے کی طرف قدم بڑھا دیے۔ چلتے ہوئے اس کے زخمی ہاتھ میں تکلیف محسوس ہوئی تو اس کے حلق سے کراہ نکل گئی۔

''بیل! میں تمہیں بتاؤں گا کہ اس بلیک بک میں کیا ہے۔'' مائیک نے آگے بڑھتے ہوئے کہا'' ہم نے جیک کی خدمات حاصل کی تھیں اور اس سے ولسن کے بارے میں تمام اہم راز اس کے اڈوں سے متعلق معلومات اور دوسری چیزیں جمع کی تھیں جن کو ایک مائیکرو فلم کی صورت میں جیک سے محفوظ کرالیا تھا۔

ان کی ایک نقل اپنے وکیل کو بھجوادی تھی تاکہ اگر کسی وقت ولسن کے ساتھ کچھ ہوجائے تو وہ فلم کام میں لائی جاسکے۔ خیر..... وکیل کے پاس سے وہ فلم غائب کرانا کوئی مسئلہ نہیں تھا لیکن تمہارے بھائی جیک نے چالاکی دکھادی۔ اس نے اس مائیکرو فلم کی ایک کاپی بنا کر اپنے پاس رکھ لی تاکہ بعد میں ولسن کو بلیک میل کرسکے۔ ظاہر ہے ہمیں یہ بات معلوم ہوگئی تھی لہٰذا ہم جیک سے اس فلم کا مانگ رہے تھے.....''

''اچھا' اب چلو۔'' بیل نے مائیک کی بات کاٹ کر بے صبری سے کہا۔ مائیک چپ ہوگیا۔ باہر بارش رک چکی تھی۔ رات مکمل سیاہ تھی۔

☆☆☆

مائیک کی کار سڑک پر دوڑ رہی تھی۔ جیسے ہی وہ ولفورڈ ہوٹل کے سامنے پہنچے تو بیل نے کہا'' مائیک! ایک منٹ کے لیے کار روکو..... میں ذرا پیری کی کار لاک کردوں۔''

پیری کی کار ہوٹل کے سامنے کھڑی تھی۔ بیل نے نیچے اتر کر پیری کی کار لاک کی مگر اس دوران اس نے اندر سے پیری کا پستول نکال کر اپنی جیب میں ڈال لیا اور واپس مائیک کی کار میں آن بیٹھا۔ کار پھر چل پڑی۔ کچھ دیر بعد ہی وہ واشنگٹن اسٹریٹ پر ولسن ہاؤس پہنچ گئی۔ مگر جیسے ہی مائیک کی نظر چارلی کی لاش پر پڑی تو اسے زور کا جھٹکا لگا۔ وہ گھٹنے کے بل بیٹھ کر اس کا جائزہ لینے لگا۔

''میں شرط لگا سکتا ہوں کہ تم نے جو گولیاں جیک اور ولسن کے جسم سے نکالی ہیں ویسی ہی گولیاں چارلی کے جسم میں بھی ملیں گی۔'' بیل نے سرد لہجے میں کہا اور آگے بڑھ کر اس چھوٹی سی لاش کا جائزہ لینے لگا۔ مائیک کی تیز نظروں نے اسے دیکھ لیا تھا اور اس نے اس نتیجے پر پہنچ گیا تھا کہ ضرور مطلوبہ فلم کی نقل اسی میز میں کہیں پوشیدہ ہے۔ وہ اٹھ کر میز کی طرف آیا اور اس کا بغور جائزہ لینے لگا۔ یکایک وہ چونکا۔

اس نے دروازے کی طرف دیکھا اور میز کی آڑ میں جھکتے ہوئے بیل سے سرگوشی کی'' چھپ جاؤ..... دروازے پر کوئی ہے۔''

مائیک نے اپنا پستول نکال لیا اور بیل نے اپنے کوٹ کی جیب میں رکھے ہوئے پیری کے پستول پر ہاتھ جما لیے..... ان کی نظریں دروازے پر تھیں۔ پھر دروازہ کھلا اور کوئی اندر داخل ہوا۔ وہ ڈلن تھا جیسے ہی اس کی نظر چارلی کی لاش پر پڑی تو وہ خوف سے اچھل پڑا۔ مائیک اور بیل ایک ساتھ اپنی جگہ سے اٹھے۔ مائیک کے ہاتھ میں پستول تھا۔ جس کا رخ ڈلن کی طرف تھا۔ ''ڈلن! اپنی جگہ سے حرکت مت کرنا۔'' مائیک نے کڑک دار آواز میں کہا تو ڈلن ایک بار پھر زور سے اچھلا اور بے یقینی سے ان دونوں کو دیکھنے لگا۔ اس کی گویائی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ یکایک کہاں سے نمودار ہوگئے۔ مائیک نپے تلے قدموں سے ڈلن کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کی نظریں ڈلن پر تھیں۔ وہ بیل کو بھول چکا تھا۔ ڈلن بھی صرف مائیک کی طرف متوجہ تھا۔ بیل نے اپنے کوٹ میں موجود پستول کے دستے پر اپنی گرفت مضبوط کرلی تھی۔ وہ بھی صورتِ حال کو غور سے دیکھ رہا تھا۔

''بیل.....! اس کا پستول نکال لو۔'' مائیک نے بیل کی طرف دیکھے بغیر کہا مگر بیل نے اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی۔

''میں تمہارے حکم پر عمل کرنے کا پابند نہیں ہوں'' بیل نے کہا تو مائیک نے چونک کر بیل کو دیکھا۔ اس کے بدلے ہوئے تیور دیکھ کر اس کی چھٹی حس نے اسے خطرے کا احساس دلایا۔ اس نے پستول والا ہاتھ سیدھا کرنے کی کوشش کی ہی تھی کہ بیل نے کوٹ کی جیب سے پیری کا پستول نکال کر مائیک کے ہاتھ پر فائر کیا جس کے ساتھ ہی اس کا سرکاری پستول اس کے ہاتھ سے نکل کر فرش پر گر گیا۔

یہ دیکھتے ہی ڈلن نے دروازے کی طرف بھاگنا شروع کیا مگر بیل نے اسے جانے کا موقع نہیں دیا۔ اس نے ڈلن کی ٹانگوں کا نشانہ لیا تھا مگر کلک کی آواز آئی۔ پستول نہیں چل سکا۔ یہ آواز ڈلن نے سن لی تھی لہٰذا وہ واپس مڑا اور اپنے پستول سے بیل پر فائر کیا۔ بیل کا ہیٹ اڑ کر دور جا گرا۔ اسی لمحے اس کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے پستول نے آگ اگلی۔ دراصل اس نے چلا کر ڈلن کو فائر کرنے سے باز رکھنے کی کوشش کی تھی اور بولتے ہوئے اس کی انگلی کا دباؤ ٹریگر پر بڑھ گیا تھا۔ وہ اور ڈلن یہ سمجھ رہے تھے کہ پستول خالی ہے مگر ایسا نہیں تھا۔ پہلی مرتبہ وہ چلا نہیں تھا مگر دوسری مرتبہ ٹریگر دبنے پر چل گیا۔ اس کے ساتھ ہی ڈلن کا موٹا اور بھدا جسم لہرا کر فرش پر گر گیا۔ اسی وقت بیل کی نظر مائیک پر پڑ گئی۔ اس کا ہاتھ زخمی تھا مگر وہ بیل کو غافل دیکھ کر اپنے اس پستول کی طرف ہاتھ بڑھا رہا تھا جو بیل کے فائر کی وجہ سے فرش پر گر گیا تھا۔

''نہیں مائیک.....'' بیل نے مسکراتے ہوئے کہا'' کیوں بے وقوفی کی حرکت کررہے ہو؟''

''وہ فلم کہاں ہے؟ میں اسے جلا کر راکھ کردوں گا۔'' مائیک نے بڑی مشکل سے کہا اس کے ہاتھ سے مسلسل خون بہہ رہا تھا۔

''میری بات غور سے سنو۔'' بیل نے سخت لہجے میں کہا'' تم ابھی ابھی..... فوراً شیرف کو بھی فون کرو گے اور ڈسٹرکٹ اٹارنی کو بھی..... تم ایمبولینس بھی منگواؤ گے۔ میں شیرف اور ڈی اے کو وہ فلم دوں گا' سمجھ گئے؟''

دو ہی طرف ڈلن کے جسم سے بڑی تیزی سے خون بہہ رہا تھا۔ مائیک نے ایک نظر ڈلن کو دیکھا پھر کینہ توز نظروں سے بیل کو گھورتے ہوئے بولا۔ ”کمینے! وہ فلم کہاں ہے؟“

”وہ فلم شیرف کو ملے گی اب بکواس بند کرو۔ میں یہاں زیادہ خون بہانا نہیں چاہتا۔“ بیل نے کہا۔

☆☆☆

بیل نے پیری کی کار اس کے گھر کے سامنے پارک کی اور اتر کر عمارت میں داخل ہوگیا۔ یہ ایک اپارٹمنٹ ہاؤس تھا۔ ایک اپارٹمنٹ کے باہر پیری کا نام لکھا تھا۔ بیل نے دستک دی مگر کوئی جواب نہیں ملا۔ اس نے اپنی مخصوص ماسٹر کی سے اس کا دروازہ کھولا اور اندر داخل ہوگیا۔ اچھا خاصا اپارٹمنٹ تھا۔ اسے بڑی نفاست سے سجایا گیا تھا۔ پیری کے بستر پر بیٹھ کر بیل نے اس کا پستول نکالا اور اس کا میگزین باہر نکال لیا۔ اس میں تین گولیاں موجود تھیں جبکہ دو استعمال ہو چکی تھیں کیونکہ دو خانے خالی تھے۔ مگر ان دونوں کے درمیان ایک گولی کی جگہ خالی تھی۔

بیل نے پستول کو دوبارہ بند کر کے میز پر رکھ دیا۔ پھر وہ اس کے بستر پر آگیا۔ بستر پر سفید چادر بچھی ہوئی۔ دونوں تکیوں پر سفید غلاف تھے مگر ایک غلاف میں جلا ہوا سوراخ دیکھ کر وہ چونکا یہ ایسا نشان تھا جیسا سگریٹ کے جلنے سے ہوتا ہے۔ اس نے سر ہلا کر تکیے کو اس کی جگہ رکھا اور جوتے اتار کر اطمینان سے بستر پر دراز ہوگیا۔ تھکا ہوا تو تھا ہی لہٰذا لیٹتے ہی سو گیا۔

”بیل!“ یہ پیری کی آواز تھی جس نے اسے گہری نیند سے جگا دیا تھا۔ پیری سامنے کھڑا اپنا کوٹ اتار رہا تھا۔ اس کے چہرے اور آنکھوں سے تھکن اور پریشانی نمایاں تھی۔

”ایسا لگ رہا ہے تم آسمان سے نازل ہوئے ہو۔“ پیری نے سنجیدگی سے کہا تو بیل مسکرا کر رہ گیا۔

”سناؤ، کیا خبر لائے ہو؟“ بیل نے پیری سے کہا۔

”ڈلن نے اعتراف کرلیا ہے کہ اس نے ولسن اور جارلی کو قتل کیا ہے..... اصل فلم ڈی اے تک پہنچ گئی ہے اور وہ کل اس حوالے سے ایک پریس کانفرنس کرے گا۔ اس سارے معاملے میں اسمتھ بھی ملوث ہے۔ بلکہ مرکزی کردار وہی ہے، لگتا تو ایسا ہی ہے۔“ پیری نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا ”ویسے کل کی رات ہارلس ول کی ہنگامہ خیز رات تھی، میں تو اخبار کے دفتر میں اپنے سٹی ڈیسک سے اٹھ ہی نہیں پا رہا تھا۔“ یہ کہہ کر وہ مسکرایا اور بولا ”ویسے تم نے کمال کردیا۔ تمہاری آمد کے باعث ہمارے شہر سے جرائم کے چند بڑے نام تو ختم ہوئے ویسے تم ہمیشہ مسائل میں پھنستے ہو، اور دوسروں کو ان سے نکالتے ہو۔“

تھوڑی دیر خاموشی رہی۔ پھر بیل نے کہا ”میں نے سنا ہے کہ جس رات جیک قتل ہوا تھا اس رات کوئی پستہ قد موٹا سا آدمی اس کی سیڑھیوں سے عجلت میں اترتا دیکھا گیا تھا۔ میرا اندازہ ہے وہ تم تھے۔“

”مجھے تم پستہ قد تو کہہ سکتے ہو مگر میں موٹا نہیں ہوں بیل۔“ پیری نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

”اگر تم اپنے بیڈ پر رکھا ہوا یہ تکیہ اپنے اوورکوٹ کے اندر رکھ لو تو یقیناً موٹے لگو گے۔“

”یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟“ پیری نے چونک کر کہا۔

”میرا اندازہ ہے کہ تم شروع سے ہی کیتھی پر عاشق تھے مگر اس نے تمہیں لفٹ نہیں دی تھی۔ تم اسے پھول اور تحائف بھیجتے رہتے تھے۔ خاص طور سے جیک کی موت کے بعد تمہاری توجہ اس پر زیادہ بڑھ گئی تھی کیونکہ اس دوران تم نے اپنا خیال رکھنا شروع کردیا تھا۔ اپنے بال نوجوانوں جیسے کٹوا لیے تھے تاکہ تم اپنی عمر سے کم نظر آؤ۔“

”بیل! تم شاید اس تصویر کے بارے میں نہیں جانتے جو تمہارے بے غیرت بھائی نے بنائی تھی۔“ پیری نے غصے سے کہا۔

”میں نے جیک کی قمیص میں سوراخ دیکھا تھا۔ ویسا ہی سوراخ تمہارے اس تکیے میں بھی ہے..... جیسے گولی کا سوراخ..... پھر تمہارے پستول کا ایک چیمبر بھی خالی ہے۔“ بیل نے کہا۔

”کہتے رہو..... میں سن رہا ہوں۔“ پیری بولا۔

”جیک نے چارلی سے پستول خریدا تھا مگر گولیاں نہیں.....“ بیل نے کہا ”اس کا مطلب یہ ہے کہ جیک اس پستول کو استعمال نہیں کرنا چاہتا تھا۔ صرف کسی کو دھمکانے یا ڈرانے کے لیے اس نے یہ پستول خریدا تھا۔ ممکن ہے کیتھی کو ڈرانے کے لیے اس نے یہ سب کیا ہو..... اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ایسا نہ ہو۔ ایک بات تمہیں بتا دوں..... جیک پستول سے بہت ڈرتا تھا۔ جب پستول کیتھی کے ہاتھ میں تھا تو جیک نے اس کی نال پکڑ کر اس میں سے خالی کارتوس نکالا جس نے اس کی قمیص میں سوراخ کردیا اور وہ وہاں سے جل گئی۔ ساتھ ہی جیک کا سینہ بھی جل گیا۔ یہی تکلیف کیتھی نے اس کے چہرے پر دیکھی تھی جو گولی کی نہیں بلکہ جلنے کی تھی۔ پھر کیتھی بے ہوش ہوگئی اور پستول فرش پر گر پڑا۔“

”تم کچھ بھول گئے۔“ پیری نے کہا۔ ”میں اپنا پستول وہاں لایا..... میرے ذہن میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔ ممکن ہے میرے لاشعور میں کوئی خوف ہو۔ بہرحال میرے پاس میرا پستول تھا اور میں چاہتا تھا کہ جیک اس کا موازنہ اپنے پستول سے کرے۔“

”اوہ.....“ بیل نے کہا۔ ”اس کا مطلب یہ ہوا کہ جیک نے کیتھی کو اس کے بستر پر لے گیا تھا۔ اس دوران تم نے پستول اٹھا کر چیک کیا اور اسے کھول کر اس کے گولی چلنے میں خرابی کو دیکھا۔ بس اسی وقت تمہارے ذہن میں یہ بات آئی کہ کیوں نہ اس آدمی کو ہی مار دیا جائے جو بجا طور پر سزا کا مستحق ہے۔“ یہ کہہ کر بیل کچھ دیر خاموش رہا پھر اس نے کہا ”لہٰذا تم نے خالی خول نکالے اور اس چیمبر میں ایک صحیح گولی ڈال دیا جس میں انجیکشن کی خرابی تھی۔ فائر کی آواز کو کم کرنے کے لیے تم نے تکیہ استعمال کیا لہٰذا تم نے اس طرح جیک کو قتل کردیا۔ اب تمہارے سامنے دو سوراخ تھے جو تمہیں جلد از جلد بھرنے تھے۔ جیک کی قمیص کا سوراخ اور تکیے کے غلاف کا سوراخ۔ تم نے قمیص کو نظر انداز کردیا کیونکہ اس کے سوراخ کو حادثے یا شکار کا نشان سمجھا جاسکتا تھا مگر تکیہ چھپانا تھا لہٰذا تم نے اسے اپنے اوورکوٹ میں گھسایا اور بھاگتے ہوئے سیڑھیوں سے اترے اور اسے اپنی کار میں رکھ دیا۔“ یہ کہہ کر بیل خاموش ہوگیا۔

پیری اٹھ کر میز کی طرف گیا جہاں بیل نے اس کا پستول رکھا تھا۔ اس نے نظر اٹھا کر پستول کی طرف نہیں دیکھا۔ اس نے بوتل سے گلاس میں شراب انڈیل اور کرسی پر بیٹھ کر پینے لگا۔

”یہ بہت برا شہر ہے اور یہاں کی سیاست تو بہت بری ہے۔“ بیل نے کہا۔ ”یہاں کے حالات نے میرا دماغ ہلا کر رکھ دیا ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے اپنے جوتے پہنے اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

”بیل!“ پیری کی آواز سنتے ہی بیل رک گیا۔ اس کا خیال تھا کہ پیری پستول ہاتھ میں لیے اس کا نشانہ لیے ہوئے ہے..... ایسا نہیں تھا۔ پیری ابھی تک کرسی پر بیٹھا تھا۔ وہ یکایک ہانپنے لگا تھا۔ اس کے چہرے پر فکر و پریشانی نظر آرہی تھی۔

”اب تم کیا کرو گے بیل؟“ پیری نے اس سے سوال کیا۔

”میں کچھ نہیں کروں گا۔ تم اب اس احساس کے ساتھ زندہ رہو گے کہ تم نے جیک کو قتل کیا ہے۔ پتا نہیں تم راتوں کو چین کی نیند سو سکو گے یا نہیں..... بہرحال میں یہ بات کسی کو نہیں بتاؤں گا۔ کیتھی کے..... اسے میں ضرور بتاؤں گا۔“ یہ کہہ کر بیل چلا گیا۔ پیری اسی طرح اپنی جگہ بیٹھا تھا۔

☆☆☆

صبح کی سرد ہوا میں چلتا ہوا بیل ہوٹل اسکوبی پہنچا راستے میں اس نے بس اسٹیشن سے کچھ معلوم کیا تھا۔ اپنے کمرے میں آکر اس نے ہوٹل ولفورڈ کا نمبر ملایا اور مسز جیک سے بات کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ دوسری طرف سے کیتھی کی آواز سنائی دی تو بیل نے کہا۔ ”میں نے تمہیں جگا دیا؟“

”ہاں، جگایا تو ہے مگر مجھے خوشی ہے کہ تم نے صحیح وقت پر جگا دیا۔“ دوسری طرف سے کیتھی نے شگفتہ لہجے میں کہا۔

”میں جا رہا ہوں۔ وہاں پہنچ کر تمہیں تفصیلی خط لکھوں گا۔“ بیل نے جلدی سے کہا ”اس دوران تم روزنامہ کوریئر کے خلاف ہتک عزت کا مقدمہ دائر کرنے کی تیاری کرلو۔ میں ایک وکیل کو فون کردوں گا۔ وہ تمہاری قانونی مدد کرے گا۔“

”لیکن تم..... اتنی جلدی..... واپس جا رہے ہو؟“ کیتھی نے رک رک کر سوال مکمل کیا۔

”ہاں..... مجھے اپنا کام مکمل کرنا ہے۔ میرا انتظار ہو رہا ہوگا۔ ویسے بھی برسات کا موسم آنے والا ہے۔ وہاں مجھے ایک سڑک کی تعمیر مکمل کرانی ہے۔“ بیل نے کہا ”بس ایک گھنٹے بعد ہی بذریعہ بس لوزول چلا جاؤں گا جہاں سے بذریعہ طیارہ میامی جاؤں گا۔ وہاں ایک رات قیام کرنے کے بعد ویز ویلا روانہ ہو جاؤں گا۔“

”اچھا.....“ کیتھی نے بڑے مایوس لہجے میں کہا۔

”لہٰذا خدا حافظ..... جب تمہیں ہتک عزت کے مقدمے میں کامیابی کے بعد نصف ملین ڈالر مل جائیں تو مجھ سے ملنے ویز ویلا ضرور آنا۔“ بیل نے کہا۔

”اچھا..... اچھا..... بیل..... خدا حافظ.....“ کیتھی نے کہا اور سلسلہ منقطع کردیا۔

فون بند کرنے کے بعد وہ نہانے غسل خانے میں چلا گیا۔ ابھی وہ نہا کر نکلا ہی تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ اس نے دروازہ کھولا تو سامنے کیتھی کو کھڑے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک سوٹ کیس تھا۔ اس کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ سفر کے لیے تیار ہے۔

”بیل! میں تمہارے ساتھ چلوں گی۔“ کیتھی نے کہا تو بیل کا منہ حیرت سے کھل گیا، وہ آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھنے لگا۔

”مگر اس مقدمے کا کیا ہوگا جو تم کوریئر اخبار کرنے والی ہو؟“ بیل نے پوچھا تو کیتھی نے اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

”جہنم میں جائے وہ اخبار بھی..... اور یہ شہر بھی۔“ کیتھی نے کہا ”ٹھیک ہے..... جیک نے ایک غلطی کی تھی جس کی اسے سزا مل گئی۔ ضروری نہیں کہ اس کا بھائی بھی اس جیسی غلطی کرے..... میں زندگی کا باقی سفر تمہارے ساتھ طے کرنا چاہتی ہوں۔ تمہیں اس پر کوئی اعتراض تو نہیں؟“

”ہرگز نہیں۔“ بیل نے کہا اور کیتھی اس کے سینے سے لگ گئی۔

پہلا رنگ

مور کا پنکھ

کاشف زبیر

کاشف زبیر ہمارے آپ کے جانے مانے اور پسندیدہ مصنف ہیں۔ ان کی تحریر کی سب سے خاص خوبی ان کا سادہ و سلیس اندازِ بیان ہے۔ جو پڑھنے والے کو فوراً اپنے ٹرانس میں لے لیتا ہے۔ اس دفعہ بھی وہ جانے پہچانے کردار شامی اور تیمور کی دلچسپ نوک جھوک کے ساتھ حاضر ہیں۔ شامی اور تیمور کو حسبِ معمول دادا حضور نے ایک مشن سونپ دیا ہے۔ اب دیکھتے ہیں کہ وہ اس میں کتنے کامیاب رہتے ہیں۔

شگفتہ فقروں سے آپ کے لبوں پر ہنسی بکھیر دینے والا سرورق کا پہلا خوبصورت رنگ

نوشی نے شرما کر شامی کی طرف دیکھا اور لجاتے ہوئے اس سے گلاب کی کلی لے لی۔ شامی کے دل کی کلی کھل گئی تھی۔ اس نے بے حد جذباتی لہجے میں کہا۔

''نوشی ڈارلنگ! یہ تو صرف ایک گلاب کی کلی ہے جسے میں پھپھو جان کی گلابوں کی کیاری سے اپنی جان پر کھیل کر توڑ کر لایا ہوں۔ میں تمہارے لیے آسمان سے تارے توڑ کر لا سکتا ہوں۔ اصلی گھی اور شہد لا سکتا ہوں۔ حد یہ کہ ذاتی قابلیت پر نوکری بھی حاصل کر سکتا ہوں۔ نوشی! اگر تم میرا ساتھ دینے کا وعدہ کرو تو ہم دنیا کے اس نکڑ سے چلے جائیں گے جہاں بندہ اور بندے کی ذات ہوگی۔ تیمور بھی نہیں ہوگا۔'' آخری جملہ اس نے دل میں کہا تھا۔

نوشی نے ادائے محبوبی سے کلی سونگھی اور مزید ادا کے ساتھ بولی۔ ''سوچوں گی۔''

''کب تک؟'' شامی نے گڑبڑا کر پوچھا۔ ''جب دادا حضور مجھے چن پور روانہ کر دیں گے اور ابا حضور میرے ساتھ مل جوتنے والے بیل کا سا سلوک فرمائیں گے۔''

اچانک تیمور سین میں داخل ہوا اور اس نے فلمی ولن کی طرح اعلان کیا۔

''نوشی تمہارے ساتھ چن پور نہیں جائے گی بلکہ یہ میرے ساتھ لندن جائے گی کیوں نوشی ڈیئر!'' تیمور نے نوشی کو گلاب کی مزید ایک کلی پیش کی۔ ظاہر ہے یہ کلی بھی پھپھو جان کے گلابوں کے تختے سے درآمد کی گئی تھی۔ مالی حق نواز اس تختے پر عقاب کی سی نظر رکھتا تھا۔ مجال ہے کہ کوئی گلابوں کو ہاتھ بھی لگا جائے بغیر اس کی اجازت کے اور اس کی اجازت مشکل سے ہی مگر دس کا نوٹ ہاتھ پر رکھتے ہی مل جاتی تھی۔ بقول شامی

''حرام کھانے میں حق نواز کسی طرح فولاد خان سے کم نہیں ہے۔''

شامی کا موڈ یہ دیکھ کر سخت آف ہو گیا کہ نوشی نے دوسری کلی بھی اسی ادائے محبوبی سے قبول کر لی اور مزید ادا کے ساتھ پرانا جواب دیا۔ ''سوچوں گی۔''

''تیمور..... مارِ آستین!'' شامی نے اسے للکارا۔ ''آج تو میرے ہاتھوں جامِ شہادت نوش کرے گا یا.....''

''تو میرے ہاتھوں جہنم رسید ہوگا۔'' تیمور نے جملہ مکمل کیا۔

''ایسا کیوں نہیں کرتے کہ آپس میں فیصلہ کر لو۔ اس طرح میں فیصلے کی زحمت سے بچ جاؤں گی۔'' نوشی نے مشورہ دیا۔

شامی نے تیمور کو گھورا۔ ''بیٹے! شرافت سے میرے راستے سے ہٹ جاؤ ورنہ.....''

''میں خود ہٹ جاؤں گا۔'' تیمور نے ایک بار پھر جملہ مکمل کیا۔ اس پر شامی نے شیر کی دہاڑ ماری اور چیتے کی طرح تیمور پر چھلانگ لگا دی مگر اگلے لمحے اس نے خود کو فرش پر پڑے پایا۔ تیمور اسے اٹھا رہا تھا۔ ''طبیعت تو ٹھیک ہے بھائی! یہ صبح صبح کیا ہو رہا ہے۔''

شامی تیمور پر دوسرے حملے کا سوچ رہا تھا کہ اچانک اسے اردگرد تبدیلی کا احساس ہوا۔ نوشی نظر سے غائب تھی۔ اس نے تیمور سے دریافت کیا۔ ''نوشی کہاں گئی؟''

تیمور نے برا سا منہ بنایا۔ ''بھائی اب اٹھ جا! میں غلطی سے تجھے اٹھانے آ گیا ہوں۔ اب جلدی سے تیار ہو جا۔ آج یونیورسٹی کا آخری دن ہے۔''

آخری دن کیوں ہونے لگا؟'' شامی نے خفگی سے کہا [illegible] سے اٹھتے ہوئے خدا کا شکر ادا کیا کہ یہ خواب تھا۔ [illegible] تیمور سے نہیں لڑنا پڑا۔ ایک زمانے میں تیمور کو [illegible] کا بھوت سوار ہوا تھا اور اس نے چند مہینے ایک [illegible] ٹوٹوں سے مار بھی کھائی تھی۔ بقول شامی کہ اسے [illegible] پاؤں چلانا آئے تھے اور وہ بھی غلط سمت میں۔ [illegible] اپنے حریف سے مار ہی کھاتا رہتا تھا۔ بہرحال اس [illegible] شامی نے تیمور کے معاملے میں عدم تشدد کی پالیسی [illegible] بلکہ جنگ اگر زبانی کلامی سے بڑھ جاتی تو نقصان [illegible]

''آخری دن اس لیے میرے بھائی کہ کل سے چھٹیاں [illegible] یونیورسٹیاں، کالجز اور اسکول بند ہو جائیں گے۔'' [illegible] عجلت سے کہا تو شامی کھسیا گیا۔

''[illegible] یار ذہن سے نکل گیا تھا۔'' وہ دوبارہ بستر پر دراز [illegible]

[illegible] ذہن میں گھسی شے کو نکال تاکہ کسی اور شے کے لیے جگہ [illegible] تیمور نے جاتے ہوئے کہا۔

[illegible] بیٹے اس غلط فہمی میں نہ رہنا کہ نوشی میرے سوا کسی کی [illegible] شامی نے چیلنج کیا۔

''بھائی نوشی بھی تجھے ہی مبارک ہو۔'' تیمور نے جواب دیا۔

شامی بستر سے اچھل کر تیمور کے پیچھے بھاگا اور زبردستی اس کے ساتھ کمرے میں گھس گیا۔ ''تو سچ کہہ رہا ہے نا میرے یار!''

''ہاں اور فی الحال تو دفع ہو جا۔ مجھے چینج کرنا ہے۔ یونیورسٹی کو دیر ہو رہی ہے۔''

''میں بھی تیرے ساتھ چل رہا ہوں۔'' شامی نے جوش و خروش سے کہا۔ ''مجھے معلوم ہے کہ کوئی کلاس تو ہوگی نہیں۔ تم لوگ آپس میں ہلا گلا کرو گے۔''

''مجھے معاف رکھو۔ وہاں کولیگز میں میری ریپوٹیشن بہت اچھی ہے۔ تجھے ساتھ لے کر میں اسے خراب نہیں کرنا چاہتا۔''

مگر شامی ان سنی کر کے اپنے کمرے میں آ گیا۔ اس کا جانے کا ارادہ بھی نہیں تھا۔ کمرے میں آتے ہی وہ بستر پر گر کر دوبارہ خوابِ خرگوش کے ارادے باندھ رہا تھا کہ نظام دین نے دخل در نامعقولات کرتے ہوئے اسے دادا جان کی طلبی کا پیغام پہنچایا۔ شامی نے رحم طلب نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''نظام دین! کیا تم دادا تک میری طبیعت کی خرابی کی اطلاع نہیں پہنچا سکتے۔''

''چھوٹے نواب! اس صورت میں وہ مزاج پرسی کو

تشریف لے آئیں گے۔'' نظام دین نے اسے عواقب سے آگاہ کیا۔ ''بہتر ہے آپ دس منٹ میں آجائیں۔''

''دادا حضور کا موڈ کیسا ہے؟'' شامی نے تشویش سے پوچھا۔ نوری طلبی عام طور سے اس کے حق میں نیک ثابت نہیں ہوتی تھی۔

''کچھ کہا نہیں جاسکتا چھوٹے نواب!'' نظام دین نے احتیاط سے کہا۔

''اچھا میں ضروریات سے فارغ ہوکر آتا ہوں۔'' شامی نے بادلِ ناخواستہ کہا اور مختصر باتھ لے کر نیچے آیا جہاں دادا حضور اخبار میں اسٹاک ایکسچینج والا صفحہ دیکھ رہے تھے۔ مارکیٹ میں انہوں نے خاصا پیسا لگایا تھا۔ رفتہ رفتہ وہ خود بھی خاصے ماہر ہوگئے تھے۔ شامی کو دیکھ کر انہوں نے اخبار رکھ دیا۔

''برخوردار! کل سے تمہاری چٹھیاں ہورہی ہیں۔'' انہوں نے نہ جانے سوال کیا تھا یا اسے اطلاع دی تھی۔

''جی دادا حضور!'' شامی نے جلدی سے صفائی پیش کی۔ ''دراصل آخری دن کوئی کلاس تو ہوتی نہیں۔ بس لڑکے مل لیتے ہیں۔''

وقار الملک نے اس کی وضاحت سنی ہی نہیں۔ وہ کچھ سوچ رہے تھے۔ شامی نے سکون کا سانس لیا۔ معاملہ اس کا نہیں تھا۔ دادا جان کی طلبی کسی اور وجہ سے تھی۔ آخر وقار الملک نے سر اٹھایا۔

''برخوردار! اس بار ہم گرمی شہباز بسیرا میں گزارنے کی سوچ رہے ہیں۔''

''جی دادا جان!'' شامی نے کہا۔ شہباز بسیرا انتہا گلی سے ذرا آگے ایک پُرفضا مقام پر وقار الملک کی پہاڑی حویلی تھی۔ گرمیوں میں وہ اکثر اس طرف جاتے تھے۔ شامی کے لیے یہ اچھی خبر تھی کہ دادا جان اسے چن پور والی حویلی روانہ نہیں کررہے تھے۔

''شمشاد نے ایک مہینے پہلے اطلاع بھیجی تھی کہ وہاں بعض پریشان کُن واقعات پیش آئے ہیں۔ اس نے وضاحت نہیں کی اور اس کے بعد سے شہباز بسیرا کا فون خراب ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ تم اور تیمور جاکر وہاں کے معاملات کا جائزہ لو اور ہمیں اطلاع کرو۔ ہمارا ارادہ دس بارہ دن میں جانے کا ہے۔''

مسائل کا سن کر شامی کی روح فنا ہوگئی۔ اسے مسائل سے وحشت ہوتی تھی۔ اسے سیدھے سادے کام کرنا پسند تھا اور اس نے ابھی نوشی کو مرعوب کرنے کا آغاز کیا تھا اور دادا جان اسے شہباز بسیرا بھیج رہے تھے۔ نوشی نے بڑی مشکل سے انہیں معاف کیا تھا۔ وہ اگلے روز ہی ان کے گھر آپہنچی تھی۔ شامی اور تیمور نے بمشکل اسے دادا جان تک جانے سے روکا تھا۔ اگر نوشی ان کی شکایت کردیتی تو شامی کو اپنی حد تک یقین تھا کہ اگلے دن کا سورج وہ چن پور کی حویلی میں دیکھے گا۔ نوشی ٹھنڈی پڑ گئی لیکن اس نے اس شرط پر معاف کرنے کا اعلان کیا کہ وہ اس کے ساتھ اس ریستوران تک چلیں اور اسے ڈنر کرائیں اور انہوں نے ہوٹل والوں کے ساتھ جو فراڈ کیا تھا اس پر ان سے بھی معافی مانگیں۔ اس پر تیمور نے فوراً انکار کردیا۔

''تم بڑے شوق سے دادا جان کو بتادو۔ میں ہرگز یہ ذلت برداشت نہیں کروں گا۔''

''پلیز، پلیز نوشی! کوئی اور سزا دے لو۔'' شامی نے گڑگڑا کر کہا۔ ''اس شہر میں ہماری عزت ہے۔''

''اس پر بھی ایسی حرکتیں کرتے پھر رہے ہو۔'' نوشی نے طنز کیا۔ ''اگر میری شرط قبول نہیں ہے تو میں تمہارے دادا جان سے بات کروں گی۔ اس روز میری بھی بہت بے عزتی ہوئی تھی۔ اپنی عزت کا اتنا خیال ہے۔''

''تیمور! یہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔'' شامی کو جوش آگیا۔ ''ہمیں ریستوران والوں کے سامنے بات صاف کردینی چاہیے۔''

''اور بے عزت ہونا چاہیے۔'' تیمور نے منہ بنایا۔ ''مس نوشی! آپ کے ساتھ اس دن جو ہوا وہ سراسر اس شخص کا قصور ہے۔ آپ نے معافی منگوانی ہے تو اس سے منگوائیں۔''

''میری میز پر تم آئے تھے۔'' نوشی نے غرا کر کہا۔

''اور بیٹے دادا جان کبھی نہیں مانیں گے کہ صرف میں قصوروار ہوں۔ نوشی کی گواہی کے بعد تو بڑا مجرم ثابت ہوگا۔ اگر دادا نے مجھے چن پور بھیجا تو تجھے بھی بطورِ سزا ہمیشہ کے لیے اپنے پاس رکھ لیں گے۔'' اس بات نے تیمور کو متفکر کردیا۔

''او کے، میں تمہارے ساتھ چلنے کو تیار ہوں لیکن میں معافی نہیں مانگوں گا۔''

''چل تیری طرف سے بھی معافی مانگ لوں گا۔'' شامی خوش ہوگیا۔ جب وہ ریستوران پہنچے تو ان کی صورتوں پر چھائی بے چارگی دیکھ کر انوشہ کو ترس آگیا اور اس نے انہیں معاف کردیا۔ ویسے بھی شامی نے جان پر کھیل کر اسے بچایا تھا ورنہ وہ ماری جاتی اور نامعلوم قبر میں ہمیشہ کے لیے دفن کردی جاتی۔ شاید اسی وجہ سے شامی اس پر اپنا حق بھی سمجھنے لگا تھا۔ اس کے بعد وہ ایک نئے جوش و خروش سے نوشی کو رام کرنے میں مصروف ہوگیا تھا حالانکہ اس کی کوشش کا نوشی پر خاص اثر نہیں ہورہا تھا مگر شامی کو یقین تھا کہ اس نے گنگ بردس والے فارمولے پر عمل کیا تو ایک نہ ایک دن نوشی کے دل میں اس کے لیے نرم گوشہ پیدا ہوجائے گا۔ جیسے پانی قطرہ قطرہ پتھر پر گرتا رہے تو اس میں سوراخ ہونے پر اس پر کائی ضرور پیدا

ہوجاتی ہے۔ گزشتہ چند دن میں اس کی محبت کا انڈکس پوائنٹ نوشی کی طرف گامزن تھا۔ نوشی کا انداز بتانے لگا تھا کہ وہ اس سے کسی قدر متاثر ہونے لگی ہے اور شاید چند دن یا چند ہفتے کی محنت کے بعد وہ اقرارِ محبت والے مرحلے تک جا پہنچتا مگر اس سے پہلے دادا جان نے ہمیشہ کی طرح اس کے منصوبے کو تلپٹ کرتے ہوئے اپنا حکم جاری کردیا تھا۔ شامی میں انکار کی ہمت نہیں تھی البتہ شامی نے ڈرتے ڈرتے دریافت کیا۔

''دادا جان! کیا میری روانگی چند دن بعد نہیں ہوسکتی؟''

وقار الملک نے نفی میں سر ہلایا۔ ''برخوردار! خاطر جمع رکھو تم جس کی خاطر چند دن بعد جانے کی بات کررہے ہو وہ بھی ہمارے اور اپنے باپ کے ساتھ شہباز بسیرا آئے گی۔''

''سچ دادا جان!'' شامی مارے سرشاری کے بے ساختہ کہہ گیا اور پھر بوکھلا گیا۔ ''مم..... میرا مطلب.....''

''ہم ایس ایس قدوائی اور اس کی لڑکی کی بات کررہے ہیں اور دوسری بات تم قیامت تک بھی کوشش کرتے رہو تب بھی اس لڑکی کو اپنی طرف مائل نہیں کرسکتے۔ وہ اس قسم کی لڑکی نہیں ہے۔''

شامی نے دادا جان سے اختلاف کی حماقت نہیں کی ورنہ اس کے خیال میں دادا جان آج کل کی لڑکیوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے۔ اس کے لیے اتنا ہی کافی تھا کہ نوشی شہباز بسیرا آرہی تھی۔ اب اسے کسی بھی مسئلے کی کوئی فکر نہیں تھی۔ وہ ہر مسئلہ حل کرسکتا تھا۔ دادا جان اسے بغور دیکھ رہے تھے۔ اس نے عرض کیا۔

''دادا جان! مسئلہ کیا ہے؟''

''ہمیں نہیں معلوم۔ اگر معلوم ہوتا تو اب تک ہم تم جیسے مسئلے کو کہنے کے بجائے حل نہ کرچکے ہوتے۔'' وقار الملک تلخ ہوکر بولے۔ ''ایس ایس قدوائی ہمارا مہمان ہو، اور ہم نہیں جانتے کہ اس کے سامنے ہماری ذرا سی بھی سبکی ہو۔''

''آپ فکر ہی نہ کریں دادا جان! میں اور تیمور آج ہی واپس ہوجائیں گے۔''

''اب اتنی جلدی بھی نہیں ہے۔ ہم نے جیپ منگوالی ہے اس پر جانا۔ ایک مہینے رکنا ہوگا۔''

شامی خوشی سے ناچنا اور گانا چاہتا تھا مگر دادا جان کے سامنے سنجیدہ رہنا ضروری تھا ورنہ عین ممکن تھا وہ اسے یہیں چھوڑ جاتے۔ تیمور کی یونیورسٹی سے واپسی تک کا وقت اس نے بے قراری کے عالم میں ٹہلتے گزارا تھا اور جب وہ دو بجے واپس نہیں آیا تو شامی نے اپنی پیکنگ شروع کردی۔ اسی وقت نظام دین نے اسے وقار الملک کی جانب سے ایک امانت پہنچائی۔ یہ اشیا انہیں کل صبح لے کر جانی تھیں۔ یہ دیکھ کر وہ دہل گیا کہ سامان میں دادا جان کی بارہ بور کی رائفل اور اعشاریہ تیئیس کے ریوالور کے کارتوس بھی شامل تھے۔ اسے اسلحے سے وحشت ہوتی تھی۔ دادا جان کے نزدیک یہ بھی اس کی ناخلفی کی نشانی تھی۔

☆☆☆

ٹاس کے بعد تیمور رضا نے اسٹیئرنگ سنبھالا تھا۔ طے پایا تھا کہ پنڈی پوائنٹ کی طرف جانے والے راستے تک تیمور ڈرائیو کرے گا۔ دادا جان نے انہیں براہِ راست شہباز بسیرا جانے کا حکم دیا تھا لیکن ان دونوں نے اس حکم کی متفقہ خلاف ورزی کرتے ہوئے پہلے مری جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ جون کے پہلے ہفتے میں جب ملک بھر کے میدانی علاقوں میں گرمی عروج پر ہوتی ہے، مری اور دوسرے ہل اسٹیشن سیاحوں سے بھرے ہوتے ہیں۔ شامی اور تیمور چاہتے تھے کہ شہباز بسیرا جیسی ویران جگہ جانے سے پہلے مری کے شہر میں چند یادگار لمحے گزار لیں۔ شہباز بسیرا ایک گاؤں سے ذرا فاصلے پر سڑک سے کوئی سو فٹ کی اونچائی پر پہاڑ کے کنارے پر واقع خوبصورت سا سمر ہاؤس تھا۔ اگرچہ شہباز بسیرا کے نام سے کسی پتھریلی اور سنگین قسم کی حویلی کا تصور ابھرتا تھا لیکن درحقیقت یہ سرخ پتھریلی اور گلابی اینٹوں والا دو منزلہ سمر ہاؤس تھا جسے وقار الملک نے خاص طور سے جدید ڈیزائن کے مطابق بنوایا تھا۔ اس سمر ہاؤس

بے نظیر و بے مثال عطریات

جن کی گھر گھر دھوم مچی ہے

گلستانِ عالم کے پھولوں گلاب، چنبیلی، موتیا، رات کی رانی جیسے تازہ قسم کے پھولوں جس میں مشک عنبر اور دوسری قیمتی اشیا شامل کی گئی ہیں۔ ہمارے ہر عطر کی خوشبو ابتدائی فرحت بخش اور رُوح پرور ہونے کی وجہ سے دل و دماغ میں سکون اور تازگی کے احساس کے ساتھ زندگی میں نئے جوش اور ولولے کا باعث بنتی ہیں

صد بہار عطر قیمت 340 روپے | عطر مجموعہ قیمت 400 روپے

روح گلاب عطر قیمت 280 روپے | جنت الفردوس قیمت 265 روپے

اسکے علاوہ جس عطر کی ضرورت ہو گھر بیٹھے ایک خط لکھ کر بذریعہ وی پی پارسل سے طلب فرمائیں۔

دوکاندار حضرات ہول سیل نرخ پر ہر قسم کی خوشبوعات، ٹوپی، تسبیح، رومال، جاء نماز، سرمہ، کنگھے اور شیشے منگوانے کیلئے لکھیں۔

فیری پرفیومرس fp

پوسٹ بکس نمبر 2209 کراچی - 74600

میں چھ بیڈ، منز، دو ڈرائنگ روم اور ایک وسیع ڈائننگ ہال کے ساتھ لائبریری، اسٹڈی اور ایک چائے نوشی کے لیے مخصوص کمرا تھا۔ سمر ہاؤس کا عقبی حصہ پہاڑ کے کنارے پر تھا اور اس پر اوپر نیچے کی منزلوں پر دو وسیع ٹیرس تھے۔ نیچے کئی سو فٹ گہری ڈھلان تھی جس پر سبز رنگ چھایا تھا۔ چاروں طرف گھنے جنگلات تھے اور نیچے کھلے جنگلی پھولوں کی مہک اوپر تک آتی تھی۔ بائیں جانب سے ڈھلان کے ساتھ ساتھ ایک کشادہ پتھریلا ڈرائیو وے اوپر تک آتا تھا جس کے دونوں طرف باغ سجا تھا۔ بڑے بڑے پتھروں کے درمیان زمین سے سبزہ پھوٹا پڑ رہا تھا۔ اسی لان پر ذرا آگے ڈھلان پر ملازموں کے لیے سرونٹ کوارٹرز تھے۔ ایک چوکیدار اور ایک مالی کے ساتھ سمر ہاؤس کا نگران شمشاد خان تھا۔ وہ سمر ہاؤس میں رہتا تھا۔ مقامی باشندہ تھا۔ جب وقار الملک یا ان کے خاندان والے شہباز بسیرا آتے تھے تو شمشاد خان باورچی اور خدمت گار کا بندوبست بھی کرتا تھا۔

بعد میں وقار الملک نے چھوٹا ڈرائنگ روم تفریح گاہ میں بدل دیا تھا۔ وہاں میوزک اور ویڈیو کے لیے جدید ترین آلات نصب کیے گئے تھے۔ خاص قسم کی سیٹلائٹ ڈش سے دنیا بھر کے چینل دیکھے جاسکتے تھے۔ شمشاد خان، وقار الملک اور ان کے پوتوں کی پسند کے لحاظ سے میوزک اور ویڈیوز کا بندوبست کر کے رکھتا تھا۔ اس وجہ سے تیمور اور شامی بور ہونے سے بچ جاتے تھے۔ اس کے باوجود وہاں ہفتہ دس دن بعد ان کے لیے وقت گزارنا دشوار ہو جاتا تھا اور وہ واپس جانے کے لیے بے تاب ہو جاتے تھے۔ شہباز بسیرا کی طرف روانگی کے وقت ان کا ارادہ تھا کہ نتھیا گلی میں کریں گے۔ بارہ بجے وہ مری میں مال روڈ پر تھے۔ مال روڈ کی رونقیں دیکھ کر شامی کے چہرے پر بھی رونق آ گئی تھی۔

''واللہ! کتنے عرصے بعد اچھا منظر دیکھنے کو مل رہا ہے۔''

''اور کل رات جو تو نوشی کو فون پر ڈائیلاگ بول رہا تھا کہ تو اس کے بغیر ایک ایک دن گن گن کر گزارے گا اور اس کے بغیر تجھے ہر منظر ویران نظر آئے گا۔''

شامی کھسیا گیا۔ ''وہ وقت تو شہباز بسیرا پہنچنے کے بعد شروع ہوگا۔'' شامی نے چاروں طرف دیکھا اور ایک لڑکی کی طرف اشارہ کیا۔ ''اس سرمئی بالوں والی لڑکی کے بارے میں کیا خیال ہے جس نے نیلا لباس پہن رکھا ہے۔''

''نیک خیال ہے۔'' تیمور بولا۔ ''لڑکیوں کے چکر میں نہ پڑ۔ مجھے یاد آیا کہ میرے پاس ایک بھی اچھی جیکٹ نہیں ہے۔ راولپنڈی سے چلتے وقت خیال نہیں آیا تھا۔ خیر اب لے لیتا ہوں۔ شہباز بسیرا خاصی بلندی پر ہے۔'' تیمور سڑک کراس کر کے ریڈی میڈ گارمنٹس کی دکانوں کی طرف بڑھ گیا۔ شامی لڑکی میں دلچسپی لے رہا تھا۔ لڑکی ایک شاپنگ اسٹور کے سامنے اس طرح کھڑی تھی جیسے اسے کسی کا انتظار ہو۔ چہرے سے وہ شوخ اور بے باک لگ رہی تھی۔ اگر وہ ان کے ساتھ لنچ پر آمادہ ہو جاتی تو وقت اچھا گزرتا۔ آسمان پر بادل تھے اور موسم خنک ہو رہا تھا۔ اس خنکی کو محسوس کرنے کے لیے ہر فرد باہر نکل آیا تھا۔ کسی قدر ہچکچاہٹ کے ساتھ شامی جیپ سے اتر کر اس کی طرف بڑھا۔

''معاف کیجیے گا، کیا آپ اکیلی ہیں؟''

لڑکی نے سرد نظروں سے دیکھا۔ ''اگر ہوں تب بھی آپ کو اعتراض۔''

''نہیں، اعتراض تو کوئی نہیں ہے۔ دراصل اس قسم کی تفریح گاہ میں اکیلے پھرنے میں مزہ نہیں آتا۔''

''مجھے تو آتا ہے۔'' لڑکی اسی انداز میں بولی۔ ''اگر آپ نے مزید کوئی بات نہیں کرنی تو تشریف لے جاسکتے ہیں۔''

شامی جھینپ کر اس کے پاس سے ہٹ گیا۔ اسے لڑکی پر شدت سے غصہ آ رہا تھا۔ اس نے شامی کی پُرخلوص پیشکش کتنی بے دردی سے ٹھکرا دی تھی۔ وہ اس سے فلرٹ تو نہیں کر رہا تھا۔ لڑکی نے جینز پر ڈھیلی سی نیلے رنگ کی شرٹ پہنی ہوئی تھی۔ دوپٹے کے تکلف سے آزاد تھی۔ شامی نے اندازہ لگایا کہ اس کا تعلق برگر فیملی سے ہے۔ اگر ان کے پاس وقت ہوتا تو شامی اس لڑکی کا چیلنج ضرور قبول کرتا۔ نصف گھنٹے بعد تیمور جیکٹ لے کر واپس آ گیا۔

''یار بھوک لگ رہی ہے۔'' شامی نے پیٹ پر ہاتھ پھیرا۔ ''میں نے صبح روانگی کے چکر میں ناشتا بھی ڈھنگ سے نہیں کیا تھا۔'' تبھی تیمور نے پوچھا۔ ''لڑکی کہاں گئی؟''

شامی نے منہ بنایا۔ ''ایسے ہی بور تھی۔''

''یعنی ہاتھ نہیں آ گئی۔'' تیمور مسکرایا تھا۔

انہوں نے ایک ریستوران میں لنچ کیا..... تین بجے وہ مری سے روانہ ہوئے۔ سامان میں سو گیلن ڈیزل بھی تھا۔ اگرچہ شہباز بسیرا میں بجلی تھی لیکن اکثر بجلی غائب ہو جاتی تھی اور ایسے میں ڈیزل کا جنریٹر چلانا پڑتا تھا۔ اتنی بلندی پر اے سی اور فریج کی ضرورت نہیں تھی۔ نیچے کھائی میں بہنے والے چشمے سے پانی کھینچنے کے لیے ڈیزل سے چلنے والا سکشن پمپ لگا تھا۔ اس کے لیے بھی ڈیزل کی ضرورت پڑتی تھی۔ پانچ بجے ان کی جیپ شہباز بسیرا کے نزدیک پہنچ گئی۔ بلندی سے شمشاد خان نے ان کی جیپ دیکھ لی اور وہ ان کے لیے استقبال کے لیے سمر ہاؤس کے ڈرائیو وے میں موجود تھا۔

''کیسے ہو شمشاد خان؟'' تیمور نے جیپ سے اترتے

ہوئے دریافت کیا۔

''آپ کے سامنے ہوں۔'' شمشاد خان مسکرایا۔ ''آپ بے خبر سے آئے ہیں۔''

''سمجھا کرو شمشاد خان!'' شامی مسکرایا۔ ''ذرا مری کی سیر بھی کی تھی۔''

''مجھے معلوم تھا۔'' شمشاد خان ہنسا۔ ''اسی وجہ سے میں مطمئن تھا۔''

''سامان اتروا لو اور جیپ گیراج میں کر دینا۔'' تیمور نے اسے چابی تھمائی۔ ''موسم کیسا جا رہا ہے؟''

''کل رات بارش ہوئی تھی اور انگیٹھی جلانی پڑی تھی۔ اگر آج رات بارش نہ ہوئی تو کمبل میں گزارہ ہو جائے گا۔''

تیمور اور شامی اوپر اپنے بیڈ رومز میں آئے۔ صاف ستھرے اور تمام سہولتوں کے ساتھ چھوٹے لان کی طرف کے یہ بیڈ رومز انہیں پسند تھے۔ وہ جب آتے یہیں ٹھہرا کرتے تھے۔ شامی اُچھل کر بستر پر دراز ہو گیا۔

''اُفوہ تھک گئے۔'' اس نے انگڑائی لی۔ ''آج رات میں بھرپور سوؤں گا۔''

''تم دو باتیں بھول رہے ہو۔ اول دادا جان نے ہمیں یہاں پر اس لیے بھیجا ہے کہ شمشاد خان سے مسئلہ دریافت کر کے ان کے آنے سے پہلے اسے حل کر لیں۔ دوسرے یہ میرا کمرا اور میرا بستر ہے اور آپ کا کمرا سامنے ہے۔ آپ تشریف لے جاسکتے ہیں۔''

''ضرور۔'' شامی بستر سے اٹھا اور اپنے کمرے میں جانے کے بجائے کچن کا رخ کیا۔ شمشاد خان نے باورچی رکھا تھا۔ یہ چھوٹے سے قد کا اور مسکراتے چہرے..... کا شخص تھا۔ اس وقت وہ مرغی روسٹ کرنے کی تیاری کر رہا تھا۔ شامی نے اسے چائے بنانے کو کہا اور عقبی ٹیرس کی طرف نکل گیا۔ یہ پورا ٹیرس ڈھلان کے اوپر خلا میں تھا۔ لکڑی سے بنے ٹیرس کو فولادی پائپوں کی مدد سے پلیٹ فارم بنا کر قائم کیا گیا تھا۔ گرما کی بارشوں کی وجہ سے سبزہ اتنا تھا کہ اس کے سوا کوئی رنگ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس سبزے سے ایسی مہک اٹھ رہی تھی جو شامی کو اپنی روح میں اترتی محسوس ہوتی تھی اور شامی کے ذہن میں شاعرانہ خیال آنے لگے تھے خاص طور پر نوشی کے بارے میں۔

خانساماں نے اسے بھاپ اڑاتا چائے کا مگ دیا۔ اس کا نام دلبر خان تھا۔

''دلبر خان! تم کب سے اِدھر ہو؟''

''صاحب دو مہینے سے۔ ہم کو کھانا پکانا بھی آتا ہے اور صفائی مفائی بھی کر لیتا ہے۔''

''اچھا یعنی تم مستقل ملازم ہو۔''

''جی صاحب! رات کے کھانے میں کیا پسند کرے گا۔ ہمیں سب بنانا آتا ہے۔ اُدھر مری میں دس سال نوکری کیا ہے ہوٹلوں میں۔''

''نہیں ابھی موڈ نہیں ہو رہا ہے۔'' شامی نے انکار کر دیا۔ ''مرغی کافی ہے اور ہاں یہاں پر مسئلہ کیا ہوا ہے؟''

''کیا مسئلہ صاحب! ہم سمجھا نہیں۔'' دلبر خان نے نفی میں سر ہلایا۔

''اسے کچھ نہیں معلوم شامیر صاحب!'' عقب سے شمشاد خان کی سرد آواز آئی۔ ''افسوس آپ وقار الملک کے پوتے ہو کر ایسی باتیں کر رہے ہیں۔''

دلبر خان فوری طور پر کھسک گیا اور شامی کھسیا گیا۔ ''دراصل دادا حضور کی نوابی ہم تک آتے آتے عوامی ہو گئی ہے۔''

''پھر بھی نوکروں سے اس قسم کی باتیں بعض اوقات بدنامی کا باعث بن جاتی ہیں۔'' شمشاد خان ملائمت سے بولا۔ ''نواب صاحب ایسی باتوں کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔''

''شمشاد خان! مجھے شاہی ادب و آداب سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔'' شامی بےزاری سے کہا۔ ''دادا حضور نے کسی مسئلے کے بارے میں فرمایا تھا کہ شامتِ اعمال کے سبب مجھے اسے حل کرنا ہے۔''

شمشاد خان نے افسوس سے اس نوجوان کو دیکھا جو سنجیدہ ہونے کے لیے تیار نہیں تھا۔

''اس پر رات کے کھانے کے بعد بات ہوگی۔'' اس نے جواب دیا اور وہاں سے چلا گیا۔ چائے پی کر شامی نے باتھ روم کا رخ کیا۔ دلبر خان نے اس کا سامان اوپر پہنچا دیا تھا۔ یہی نہیں بلکہ اس نے شامی کے کپڑے بھی نفاست سے تہ کر کے الماری میں رکھ دیے تھے۔ سفر میں ذرا تھکن ہوئی تھی حالانکہ انہوں نے انجوائے زیادہ کیا تھا اور گرد مٹی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا مگر شامی نے گرم پانی سے غسل کا لطف لیا اور سیٹی بجاتا محض تولیے میں باتھ روم سے برآمد ہوا تھا کہ سیٹی کی لے اس کے حلق میں پھنس گئی۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ کمرے میں اتنی حسین اور دلکش پہاڑی لڑکی موجود ہوگی۔ سیب جیسی سنہری رنگت اور سیب جیسے گال، سبزی مائل آنکھیں، ستواں ناک اور سرسراتے سرخی مائل ریشمی بال۔ وہ مقامی لباس پہنے تھی لیکن تناسب کی دلکشی اس ڈھیلے لباس میں بھی نمایاں تھی۔

"تت..... تم کون ہو؟" شامی ہکلایا۔

لڑکی اسے دیکھ کر شرما گئی۔ اس نے نظریں جھکا کر کہا۔ "میں دلبر خان کا بی بی ہے۔ اِدھر کام کرتا ہے۔" اتنی دلکش اور خوبصورت لڑکی دلبر خان کی بیوی تھی۔ یہ جان کر شامی کا صدمے سے برا حال ہوگیا۔ قد میں اس سے چھ سات انچ کم اور عمر میں لڑکی سے دس بارہ سال بڑا دلبر خان کسی طور اس لڑکی کے قابل نظر نہیں آتا تھا۔ اب اسے قدرت کی ستم ظریفی نہیں تو اور کیا کہا جا سکتا تھا کہ حور لنگور کو عطا کر دی تھی۔ معاً شامی کو اپنی حالت کا احساس ہوا اور وہ جلدی سے پردے کی آڑ میں ہوگیا۔

"تم جاؤ، مجھے کپڑے پہننے ہیں۔"

لڑکی خود بھی اس کو دیکھ کر جھینپی جا رہی تھی۔ اجازت ملتے ہی تیر کی طرح کمرے سے نکل گئی۔ لڑکی کے جانے کے بعد شامی نے دلبر خان کی قسمت پر رشک اور لڑکی کے مقدر پر افسوس کرتے ہوئے لباس پہنا اور فوری طور پر یہ اطلاع دینے تیمور کے پاس جا پہنچا جو بستر پر دراز پاؤں ہلا رہا تھا۔

"مجھے معلوم ہے۔" دس منٹ تک شامی کی ہمدردی سے لبریز جذباتی تقریر سننے کے بعد تیمور نے اطمینان سے کہا۔ "مجھے اس نے بتایا ہے۔ میرا سامان بھی وہی سیٹ کر کے گئی ہے۔"

شامی بھنا گیا۔ "پہلے نہیں بتا سکتا تھا۔ اتنی دیر تک بکواس کرتا رہا۔"

"دریں چہ شک! آپ بکواس ہی کرتے ہیں اور اس کے لیے اتنا دکھی ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ اپنے شوہر کے ساتھ خوش ہے۔ یہاں کے لوگوں کے لیے کوئی انوکھی بات نہیں ہے۔ تم جانتے ہو گریجویٹ شمشاد خان کی بیوی بالکل جاہل اور عمر میں اس سے سات سال بڑی ہے۔"

"نہیں۔" شامی دنگ رہ گیا۔ "اگر یہ سچ ہے تو بے حد افسوسناک ہے۔"

"بیٹے ایسے سچ یہاں جا بجا بکھرے ہیں اس لیے ان چکروں میں نہ پڑ۔"

شامی نے بادلِ ناخواستہ تیمور سے اتفاق کیا مگر رات کھانے کی میز پر گل کو دیکھ کر اس کا افسوس پھر سے تازہ ہوگیا تھا۔ وہ کھانا لگا رہی تھی اور گھر کی صفائی ستھرائی اور دوسرے کام بھی اس کے ذمے تھے۔ دلبر خان کے ہاتھ میں ذائقہ تھا۔ اس نے ایسا شاندار بروسٹ بنایا تھا کہ وہ دونوں آج تک کھائے سارے بروسٹ بھول گئے تھے۔ ساتھ میں قندھاری نان تھے۔ کھانے کے بعد جب دلبر خان نے الائچی کی خوشبو والا خاص کشمیری قہوہ پیش کیا تو وہ دل و جان سے اس کی فنکاری کے قائل ہوگئے۔ تیمور نے کہا۔

"دلبر خان بالکل مستحق ہے کہ اسے ایسی بیوی ملے۔ مرد کی قابلیت اس کی شکل صورت اور عمر میں نہیں اس کے ہنر میں ہوتی ہے۔"

"اس لحاظ سے میں کسی افریقی جشن کے قابل بھی نہیں ہوں۔" شامی نے سرد آہ بھر کر سچ بولا۔

"سچ فرمایا، آؤ ذرا شمشاد خان سے بات ہو جائے۔" تیمور نے گھنٹی بجائی تو گل حاضر ہوگئی۔ یہ نام اس پر سجتا تھا۔

"گل! شمشاد خان کو بلاؤ۔"

گل کے جانے کے بعد شامی نے موسم سے زیادہ سرد آہ بھری۔ "کیسے نصیب ہیں اس بے چاری کے؟"

"تقریباً اتنی اور اسی نوعیت کی ہمدردی مجھے انوشہ کے ساتھ ہے۔" تیمور بولا۔

شامی کے کچھ کہنے سے پہلے شمشاد خان آ گیا۔ "تیمور صاحب آپ نے یاد کیا؟"

"شمشاد خان! تم اس خاندان کے پرانے نمک خوار ہو اور مجھے امید ہے کہ تم نے شہباز بسیرا کو اچھی طرح سنبھال رکھا ہے۔ اب بتاؤ وہ مسائل کیا ہیں جن کا ذکر تم نے دادا جان سے کیا تھا۔ دادا جان چاہتے ہیں کہ ان کی آمد سے پہلے یہ مسائل حل ہو جائیں اور انہیں اپنے مہمانوں کے سامنے سبکی نہ ہو۔"

"مہمان؟" شمشاد خان چونکا۔

"دادا جان کے قریبی دوست اور ان کی صاحبزادی۔" تیمور نے آگاہ کیا۔

شمشاد خان سوچنے لگا۔ کچھ دیر بعد اس نے کہا۔ "معاملہ کچھ پُراسرار سا ہے۔ مجھے شبہ ہے کہ بعض افراد یہاں گھسنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔"

"جو جانتے ہو تفصیل سے بتاؤ۔" تیمور نے اسے ٹوکا۔

شمشاد خان نے گہری سانس لی۔ "بہتر جناب! میں ہر ممکن تفصیل کے ساتھ بتانے کی کوشش کروں گا۔"

اس سلسلے کا پہلا واقعہ کوئی چار مہینے پہلے آخر فروری میں پیش آیا تھا۔ ایک رات پہلے شدید برف باری ہوئی تھی۔ سردی کی شدت کی وجہ سے شمشاد خان اور ملازمین اپنے اپنے گھروں میں دُبکے ہوئے تھے۔ عادت کے مطابق شمشاد خان نے صبح سویرے پورے شہباز بسیرا کا چکر لگایا اور اسے پچھلی منزل کے عقبی بیڈ روم کی کھڑکی کھلی نظر آئی تھی۔ اسے حیرت ہوئی کیونکہ اس نے رات سونے سے پہلے تمام کھڑکیاں اور دروازے چیک کیے تھے اور انہیں اندر سے بند پایا تھا۔ پھر یہ کھڑکی کس نے کھولی۔ چوروں کا سوچ کر شمشاد خان نے

[illegible] پورے مکان کو چیک کیا۔ تہ خانہ تک دیکھ لیا۔ [illegible] گرم کرنے کے سسٹم کے ساتھ سامان رکھنے کی جگہ [illegible] اسے نہ تو کوئی چور ملا اور نہ ہی کوئی چیز اپنی جگہ سے [illegible]۔ گھر کا معائنہ کر کے وہ باہر نکلا اور اسے سامنے [illegible] ڈرائیوے اور اس بیڈ روم کی کھڑکی تلے کسی فرد کے [illegible] نشانات نظر آئے۔ کھڑکی تک آنے جانے کے [illegible] تھے۔ شمشاد خان ایک بار پھر چوکنا ہوگیا۔ اس نے [illegible] کو بلا لیا۔ ان سے نشانات کے بارے میں پوچھا [illegible] نے لاعلمی ظاہر کی تھی۔ وہ ساری رات اپنے کوارٹرز [illegible] تھے۔ شمشاد خان نے دیکھا کہ نشانات دائیں طرف [illegible] طرف سے آ رہے تھے۔ یہ ڈھلان بھی آگے جا کر [illegible] مل جاتی تھی اور اسے عبور کرنا نسبتاً مشکل کام تھا۔ اگر [illegible] باہر سے آیا تھا تو اس کے لیے سب سے آسان [illegible] ڈرائیوے تھا۔

[illegible] کوئی شے غائب نہیں ہوئی تھی اور نہ ہی کسی کے اندر [illegible] کے آثار تھے اس لیے شمشاد خان نے اس واقعے کو اتنی [illegible] نہیں دی کہ وقار الملک سے اس کا تذکرہ کرتا لیکن اس [illegible] شہباز بسیرا کے روزنامچے میں اس واقعے کا اندراج کر لیا [illegible] روزنامچے میں ہر خاص اور معمول سے ہٹ کر پیش آنے [illegible] واقعات کا اندراج ہوتا تھا۔ مارچ میں برف پگھلنے کا عمل [illegible] ہوگیا۔ شمشاد خان نے آخر مارچ تک پورے سرہاؤس [illegible] اور ضروری مرمت کرائی۔ یہ کام وہ سیزن کے آغاز [illegible] کرایا کرتا تھا۔ موسم کی وجہ سے جو جو خرابیاں ہوتی تھیں [illegible] کروا لیا کرتا تھا۔ سرہاؤس کا بیرونی رنگ درست کیا [illegible] اور یہ کام شمشاد خان اپنی نگرانی میں کروا رہا تھا۔ اس [illegible] مزدور بلوائے تھے۔ اچانک ایک رنگ کرنے والے نے [illegible] "صاحب ادھر آؤ..... یہ دیکھو۔"

[illegible] کرنے والا سیڑھی لگا کر بائیں طرف جس دیوار پر [illegible] وہ اسٹڈی روم کے ساتھ تھی۔ اوپر روشن دان تھا۔ رنگ [illegible] اسی طرف اشارہ کر رہا تھا۔

[illegible] کیا ہوا ہے؟"

[illegible] صاحب! روشن دان کی کنڈی ٹوٹی ہے۔"

[illegible] شمشاد خان سیڑھی پر چڑھ کر اوپر پہنچا۔ شیشے کا دُہرے [illegible] یہ روشن دان دو فٹ چوڑا اور کوئی ڈیڑھ فٹ اونچا تھا۔ [illegible] کے بعد ایک اوسط جسامت کا فرد بہ آسانی اندر جا سکتا [illegible] سے بارہ فٹ اونچی سیڑھی میسر ہوتی۔ کنڈی اندر کی [illegible] اور ایسے ٹوٹی تھی جیسے کسی طاقتور شخص نے زور لگا کر [illegible] ہوں اور کنڈی کو توڑ دیا ہو۔ شمشاد خان پریشان ہوگیا۔ اس نے فوری طور پر اسٹڈی کا معائنہ کیا لیکن باریک بینی سے دیکھنے کے باوجود کہیں ایسے آثار نظر نہیں آئے کہ کسی چیز کو چھیڑا گیا ہو۔ اسٹڈی میں ایک تجوری بھی تھی جو کتابوں کی الماری کے عقب میں پوشیدہ تھی اور الماری ایک خاص طریقے سے ایک طرف سرکتی تھی تب اس کے عقب میں چھپی تجوری سامنے آتی تھی۔ شمشاد خان الماری کھسکانے کے طریقے سے واقف تھا لیکن اس تجوری کو کھولنے کا طریقہ صرف نواب صاحب کے علم میں تھا۔ اسے بیک وقت چابی اور نمبروں کو ملا کر کھولا جاتا تھا۔ تجوری میں کیا تھا اس کا علم بھی صرف نواب صاحب کو تھا۔ حفظِ ماتقدم کے طور پر شمشاد خان نے روشن دان میں سلاخیں لگوائیں اور اسٹڈی کے مضبوط دروازے میں ایک لاک اور لگوا دیا۔ اسٹڈی کی کھڑکی پر پہلے ہی لوہے کی مضبوط گرل تھی۔ تجوری کھولنے کے آثار بھی نظر نہیں آئے تھے۔

اس بار بھی شمشاد خان نے وقار الملک کو اطلاع کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ کنڈی شاید کسی ملازم سے صفائی کرتے وقت ٹوٹ گئی تھی اور اس نے ڈر کے مارے بتایا نہیں تھا لیکن تیسرا واقعہ ایسا پیش آیا جس نے شمشاد خان کو مجبور کر دیا کہ وہ نواب صاحب کو اطلاع کرے۔ اپریل کا آخر تھا۔ دو دن سے موسم ابر آلود تھا اور وقفے وقفے سے بارش جاری تھی۔ رات کھانے کے بعد شمشاد خان نے حسبِ معمول سرہاؤس کا چکر لگایا اور عقبی ٹیرس کی طرف کھلنے والے ڈائننگ ہال کے دروازے سے باہر جھانکا اور اسے لگا کہ باہر ٹیرس میں کوئی شخص شیشے کے سامنے سے گزرا ہو۔ شمشاد خان پستول لے کر باہر نکلا اور نیم تاریکی میں ایک شخص اسے ریلنگ کود کر بائیں طرف کے چھوٹے لان کی طرف جاتا نظر آیا۔ شمشاد خان اس کے پیچھے لپکا تھا۔ ایک سایہ ڈرائیوے کی طرف بھاگتا نظر آیا۔ شمشاد خان نے اسے للکارا۔

"رک جاؤ ورنہ گولی مار دوں گا۔" مگر بھاگنے والا نہیں رکا تھا۔ شمشاد نے فوراً لگاتار فائر کیے۔ اس نے کوشش کی کہ مفرور کے پیروں کو نشانہ بنائے۔ تیسرے چوتھے فائر پر بھاگنے والا لڑکھڑا کر گرا مگر دوبارہ اٹھ کر لنگڑاتا ہوا جھاڑیوں اور درختوں میں غائب ہوگیا۔ شمشاد خان بھاگ کر وہاں تک آیا مگر اتنی دیر میں وہ شخص غائب ہو چکا تھا۔ اگر اسے گولی بھی لگی تھی تو معمولی زخم آیا تھا۔ فائرنگ کی آواز سن کر چوکیدار، مالی اور دلبر خان دوڑے آئے تھے۔ دلبر خان ایک دن پہلے ہی ملازم ہوا تھا۔ شمشاد خان نے انہیں مفرور شخص کے بارے میں بتا کر اس کے پیچھے بھیجا اور خود اندر جا کر ٹارچ لے آیا۔ اس جگہ کا معائنہ کیا جہاں بھاگنے والا گرا تھا۔ شمشاد خان کے اندازے کی تصدیق

ہوگئی۔ بارش ہو رہی تھی لیکن اتنی تیز نہیں تھی کہ زمین پر جمع خون بہا کر لے جاتی۔ یہ خون تینوں ملازموں نے بھی دیکھا تھا۔ اگلے روز شمشاد خان نے نواب صاحب کو فون کر کے صورتِ حال بتانے کی کوشش کی لیکن فون کی خرابی کی وجہ سے وہ درست طور پر بات نہیں کر سکا تھا اور اس کے بعد فون ڈیڈ ہو گیا تھا جو کوشش کے باوجود تا حال درست نہیں ہو سکا تھا۔

''تم مری تک آ کر فون کر سکتے تھے۔ یہاں اور لوگوں کے پاس بھی فون ہوگا۔'' شامی نے اعتراض کیا۔

''اس علاقے کے سارے فون ڈیڈ ہو گئے تھے۔'' شمشاد خان نے بتایا۔ ''اور مری تک آنے جانے میں کئی گھنٹے لگ سکتے تھے اور میں اتنی دیر کے لیے شہباز بسیرا سے دور نہیں رہنا چاہتا تھا۔''

''اس کے بعد تو کوئی واقعہ نہیں ہوا؟'' شامی نے پوچھا۔

''صرف دو دن پہلے میں مرتے مرتے بچا ہوں۔'' شمشاد خان نے گہری سانس لی۔

صبح سویرے بیدار ہونے کے بعد شمشاد خان ناشتے سے پہلے سیر کے لیے نکلتا تھا اور عام طور سے ڈرائیو وے سے ہوتا نیچے سڑک تک جاتا تھا مگر اس روز اس کے دل میں کیا آئی کہ وہ سرونٹ کوارٹرز کے عقب میں واقع ڈھلان پر اتر گیا۔ یہ ڈھلان نیچے ایک نالے تک جاتی تھی۔ نالے کے پار جنگل تھا۔ وہ نیچے اتر کر نالے تک جا پہنچا۔ بارش کا آغاز نہیں ہوا تھا اور نالا خشک پڑا تھا۔ شمشاد خان نے نالے کے پار جنگل میں قدم رکھا تھا کہ ایک گولی سنسناتی ہوئی اس کے پاس سے گزر کر درخت کے تنے پر لگی تھی۔ شمشاد خان فوری طور پر درخت کی آڑ میں ہو گیا تھا ورنہ عین ممکن تھا اسے دوسرا فائر چاٹ جاتا۔ شمشاد خان کے پاس پستول تھا مگر اسے کوئی شخص نظر نہیں آ رہا تھا۔ حملہ آور نے دور سے رائفل استعمال کی تھی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ کوئی شکاری ہو۔ ان پہاڑوں پر لومڑی اور بعض اوقات ہرن بھی مل جاتا تھا مگر اس میں اور کسی لومڑی میں خاصا فرق تھا۔

''سوال یہ ہے کہ کون شخص یہ سب کر رہا ہے اور اس کے مقاصد کیا ہیں؟'' تیمور نے سوال کیا۔

''اگر مجھے معلوم ہوتا تو اب تک سارا مسئلہ ہی حل ہو چکا ہوتا۔'' شمشاد خان نے گہری سانس لی۔ ''میں اس شخص یا اس کے مقاصد سے قطعی لاعلم ہوں۔ میری کسی شخص سے دشمنی نہیں ہے۔ اس حد تک تو بالکل نہیں ہے کہ وہ مجھے قتل کرنے پر تل جائے۔''

''تقریباً ہر شخص کو اپنے بارے میں یہی خوش فہمی ہوتی ہے۔'' شامی نے ملائمت سے کہا۔ ''لیکن دوسرے شخص کا خیال ذرا مختلف ہوتا ہے۔ خیال کے اس فرق سے بہت سی غلط فہمیاں جنم لیتی ہیں۔''

''آپ کا مطلب ہے کہ کوئی شخص میرا اس حد تک [illegible] ہے لیکن میں ایسا خیال نہیں کرتا۔'' شمشاد خان مسکرایا۔

''تم خود سوچو کوئی بلاوجہ تو کسی کے پیچھے نہیں پڑتا۔'' تیمور نے شامی کی تائید کی۔ ''اب شہباز بسیرا میں کوئی ایسی شے بھی نہیں ہے جس کی وجہ سے کوئی تمہیں راستے سے [illegible] چاہتا کہ آرام سے اس شے کو حاصل کر سکے۔''

''ممکن ہے ہو۔'' شمشاد خان عجیب سے لہجے میں بولا۔ ''آخر یہاں پر ایک تجوری بھی تو ہے۔ اس کو صرف نواب صاحب کھول سکتے ہیں۔''

''یہ اور عجیب بات ہے۔ تمہیں اس گھر میں رہنے کے باوجود تجوری میں کسی قیمتی شے کی موجودگی کا علم نہیں ہے [illegible] تیسرے فرد کو اس کا علم کیوں ہونے لگا۔''

''ممکن ہے وہ نواب صاحب کے دشمنوں میں سے [illegible] کوئی چور ہو اور اسے کسی ذریعے سے علم ہو گیا ہو۔ وہ مجھے راستے سے ہٹائے بغیر تجوری تک رسائی حاصل نہیں کر سکتا ہے۔''

''تم فکر نہ کرو۔ اب ہم بھی آ گئے ہیں۔ کوئی شخص [illegible] داخل نہیں ہو سکتا۔'' شامی نے سینہ تان کر کہا۔

''آپ کی بہادری والا قصہ میں نے اخبار میں [illegible] تھا۔'' شمشاد خان مسکرایا۔ ''آپ نے واقعی کمال کر دیا تھا۔''

''ارے..... وہ..... ایسے ہی معمولی سی بات تھی۔'' شامی نے بے پروائی سے شانے اُچکائے۔

''اچھا اب مجھے اجازت دیں۔'' شمشاد خان [illegible] وہاں سے چلا گیا۔

''اس کی اسٹوری میں کوئی تک نہیں ہے۔'' شامی [illegible]

''ایسا تو انڈین فلموں میں بھی نہیں ہوتا۔''

''ہالی ووڈ کی فلموں میں ہوتا ہے۔'' تیمور نے اس کی تائید کی۔ ''اور ساتھ ہی وہ ان بے تکے واقعات کی فلم کے آخر میں اتنی شاندار وجہ نکالتے ہیں کہ دنیا اش اش کرتی رہ جاتی ہے۔ ویسے تیرا مطلب ہے کہ شمشاد خان جھوٹ بول رہا ہے۔''

''یہی تو بات ہے۔ وہ گزشتہ بیس برس سے شہباز بسیرا کا نگران ہے اور اس نے آج تک کوئی غلط حرکت نہیں کی [illegible] ہی کسی معاملے میں جھوٹ بولا ہے۔ ہم اسے جھوٹا قرار [illegible] دے سکتے ہیں۔ کوئی نہ کوئی چکر ہے۔ خیر جب یہاں آ گئے [illegible] تو چکر کا بھی پتا چلا لیں گے۔'' شامی نے گھنٹی بجائی۔ ''کیا خیال ہے گل سے ایک بار اور نہ قہوہ بنوائیں۔''

مگر گل کے بجائے اس کا دلبر نمودار ہوا۔ ''جی صاحب

''کچھ نہیں بھائی۔'' شامی بجھے لہجے میں بولا۔ ''اب تم جا سکتے ہو۔''

''بس صاحب، کچن کا کچھ کام ہے۔ وہ کر کے جا رہے ہیں۔''

تیمور مسکرانے لگا۔ وہ دلبر خان کے جانے کے بعد گنگنایا۔ ''دل کے ارماں دل میں ہی رہ گئے''

''مجھے نیند آ رہی ہے۔'' شامی اس کی بات نظر انداز کر کے کھڑا ہو گیا۔ ''اب باقی کل دیکھیں گے۔''

''ظاہر ہے مجھے بھی عدسہ اٹھا کر کسی جاسوسانہ مشن پر روانہ نہیں ہونا ہے۔ مجھے تو یہ قابلِ دست درازی پولیس کیس لگ رہا ہے۔''

''دست اندازی۔'' شامی نے تصحیح کی۔

''جو کیس پولیس کے دست کی پہنچ سے باہر ہوں یہ اسے بھی اپنی حد میں لے آتی ہے۔ پولیس کے لمبے ہاتھوں کی اصطلاح بھی اسی وجہ سے وجود میں آئی ہے۔ بوقتِ ضرورت پولیس اپنے ہاتھوں کو گھٹا یا بڑھا لیتی ہے۔''

''درست فرمایا، پولیس کی دست درازی پر مزید ریسرچ بھی صبح کریں گے۔'' شامی نے جماہی لی۔ ''اس وقت مجھ پر پُرخوری کا خمار طاری ہے۔'' شامی اوپر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد تیمور نے اسٹڈی کا رخ کیا لیکن اس کا دروازہ لاک تھا۔ وہ ایک بار اسٹڈی روم کا معائنہ کرنا چاہتا تھا۔ اس نے شمشاد سے چابی طلب کی۔ شمشاد نے چابی اس کے حوالے کر دی۔

''تیمور صاحب! اسٹڈی ان لاک مت چھوڑیے گا۔ میں ہمیشہ اسے لاک رکھتا ہوں۔''

''تم فکر نہ کرو۔'' تیمور نے جواب دیا۔

اسٹڈی روم لائبریری کے ساتھ تھا۔ یہاں پر بھی کتابیں تھیں مگر دادا جان کے پسندیدہ موضوعات پر مبنی کتابیں تھیں اور انہیں ہاتھ لگانے کی بھی ممانعت تھی جبکہ لائبریری میں عمومی دلچسپی والی کتب تھیں۔ اسٹڈی کا پورا فرنیچر بلیک برما ٹیک کا تھا۔ بے حد مضبوط اور شاہانہ قسم کا۔ گردے کی شکل کی گلاس ٹاپ ٹیبل کے عقب میں وہ کتابوں والی الماری تھی جس کے عقب میں تجوری پوشیدہ تھی۔ تیمور کو اس تجوری کی موجودگی کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔ دادا جان سال میں ایک آدھ بار چند دنوں یا ہفتوں کے لیے یہاں آتے تھے۔ اتنی سی مدت کے لیے تجوری کا بھلا کیا مصرف ہو سکتا تھا۔

الماری کھسکانے کے لیے اس کے درمیانی شیشے کے ڈور کو کھول کر دوسری قطار میں رکھی کتابیں ہٹانے سے عقب میں وہ کھٹکا نمودار ہوتا تھا جسے دبانے سے الماری ایک طرف سرک جاتی تھی۔ تیمور کو یہ راز پتا تھا۔ اس نے الماری کھسکانے کے بعد اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کرے؟ میٹل کی سطح پر بے داغ اور بند تھی۔ اچانک اسے احساس ہوا کہ وہ شرلاک ہومز بننے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس نے جھینپ کر رخ کیا اور بستر پر دراز ہوتے ہی خواب خرگوش کے مزے لینے لگا۔ خوش قسمتی سے موسم ابر آلود نہیں رہا تھا اس لیے اسے جلانے کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔

صبح وہ ایک سہانا خواب دیکھ رہا تھا اور خواب میں اس کی یونیورسٹی کی ساتھی تین چار طرح دار قسم کی لڑکیاں تھیں کہ شامی نے نہایت غلط طریقے سے اس کے خواب میں خلل ڈالا۔ اس نے دو دن کی بڑھی ہوئی شیو تیمور کے رخسار پر پھیر دی۔ شامی کے بال بہ قول تیمور کسی بید کی طرح سخت اور زہریلے تھے۔ آنکھ کھولتے ہی اس نے پھاڑ کھانے والے انداز میں شامی سے کہا۔ ''یہ کیا خباثت ہے؟''

''براہِ مہربانی..... شائستگی اختیار کیجیے۔'' شامی پھرتی سے اس کی پہنچ سے دور ہو گیا۔ ''آخر آپ ایک شائستہ اور نجیب خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔''

''کاش کہ میں کسی قسائی خاندان کا نورِ چشم ہوتا۔'' تیمور نے سرد آہ بھری اور بستر پر آلتی پالتی مار کر قہر آلود نظروں سے شامی کی طرف دیکھا۔ ''تاکہ میں تیرے ساتھ شاید شائستہ سلوک کر سکتا۔''

''بعض اوقات جناب کی حرکتوں سے مجھے یہ شبہ ہوتا ہے کہ بچپن میں اصل تیمور رضا برطانیہ کے کسی قسائی بچے سے بدل گیا تھا۔'' شامی ہنسا ''تیمور رضا صاحب..... اٹھ جائیے اور ذرا باہر نکل کر دیکھیں کہ قدرت کا حسین منظر ہے۔ دھند چھائی ہوئی ہے۔ اوپر پہاڑ کی چوٹی دھوپ سے چمک رہی ہے۔ دھند کے درمیان سے سبز رنگ جھلک رہا ہے۔ اور ہاں نیچے جھنے پر جا بجا پانچ پہاڑی دوشیزائیں پانی بھر رہی ہیں۔''

یہ سنتے ہی تیمور نے بستر سے چھلانگ لگائی اور سردموسم کی پروا کیے بغیر لپک کر ٹیرس پر جا پہنچا ''کہاں ہے منظر؟ میرا مطلب ہے سورج کی دھوپ میں نہائی چوٹی.....'' تیمور نے ریلنگ سے تقریباً لٹک کر نیچے دیکھا۔ اگر شامی عقب سے اس کی قمیص پکڑ کر نہ کھینچتا تو عین ممکن تھا کہ وہ نیچے جھنے پر جا بجا بھرتی پہاڑی دوشیزاؤں پر جا گرتا۔

''بیٹے بیٹے..... سورج اوپر نکلتا ہے۔ نیچے صرف چار چہرے ہیں۔''

جھنے پر کھلکھلاتی لڑکیوں کی آوازیں اوپر تک آ رہی تھیں۔ وہ دونوں مسحور سے رہ گئے۔ خاصی دیر بعد شامی نے کھا جانے والی نظروں سے شامی کو دیکھا اور اس کے پاس بیٹھ گیا۔ ''آستین کے سانپ.....''

''سانپ.....'' دلبر خان... پراٹھا لاتے ہوئے بھونچکا رہ گیا..... ''سانپ ادھر کدھر ہوتا ہے صاحب..... وہ تو نیچے ملتا ہے ادھر راولپنڈی اسلام آباد کی طرف۔''

''بعض سانپ ہر قسم کی بلندی پر پائے جاتے ہیں.....'' شامی نے اسے آگاہ کیا۔

اس نوک جھونک میں ناشتا کیا گیا۔ بلاشبہ دلبر خان کے ہاتھ میں ذائقہ تھا۔ شامی اور تیمور کی مشترکہ رائے تھی کہ اس کے ہاتھ میں آشیانہ وقار کے باورچی سے کہیں زیادہ مزہ ہے بلکہ شامی نے اسے پیش کش بھی کر دی تھی ''ہم واپس جاتے وقت تمہیں ساتھ لے جائیں گے۔''

''سچ صاحب.....'' دلبر خان خوش ہو گیا۔ ''ہم ضرور جائے گا صاحب..... ادھر کرنے کے واسطے کچھ نہیں ہے۔''

''فکر نہ کرو..... وہاں تمہارے کرنے کے لیے بہت کچھ ہو گا۔ پھپھو جان دن میں صرف چھ بار کھاتی ہیں اور ہمارے جثے پر بھی مت جاؤ کھانے میں ہم بھی کسی سے کم نہیں ہیں۔'' شامی نے گویا اسے خبردار کیا۔

''میں جانتا ہوں صاحب..... ابھی پانچ پراٹھے بنائے تھے اور دس پوریاں تھیں۔''

میز پر اب صرف ایک پوری تھی باقی سب ان کے معدوں میں منتقل ہو چکا تھا۔ ناشتے کے بعد دلبر خان نے اپنا کشمیری قہوہ پیش کرنا چاہا، لیکن انہوں نے چائے کو ترجیح دی۔ ''جب تک صبح ایک چوتھائی لیٹر چائے حلق سے نہ اترے تو لگتا ہی نہیں کہ ناشتا بھی کیا ہے۔ شامی بولا ''یہ اپنا قہوہ رات کے لیے اٹھا رکھو۔'' ناشتا کر کے وہ باہر نکل آئے۔ سورج بلند ہوتے ہی منظر نکھر گیا تھا۔ دھند غائب ہو چکی تھی۔ سبز رنگ ماحول پر چھایا تھا جس میں دوسرے رنگ صرف پھولوں کے تھے۔ ڈرائیو وے سے اترتے ہوئے وہ ذرا نیچے تک آئے اور ایک بڑی سی چٹان پر بیٹھ کر دھوپ سینکنے لگے۔ سڑک یہاں سے تیس چالیس فٹ نیچے تھی۔

شامی نے گہری سانس لی۔ ''کاش کہ میں ہمیشہ یہاں رہ سکتا۔'' اس نے سڑک کے پار بھیڑیں ہانکتی لڑکی کو دیکھا۔

''تو ہر بار یہی بات کرتا ہے اور ایک ہفتے بعد واپس جانے کے لیے بے تاب ہو جاتا ہے۔''

''بس یار عجیب طبیعت پائی ہے۔'' شامی نے آہ بھری۔ ''ورنہ اب تک کہیں اور ہوتا۔''

''مثلاً چمن پور کی حویلی میں۔'' تیمور نے اپنے انداز میں سرد سے زیادہ سرد آہ بھری۔ ''کاش کہ میں اس پہاڑی گاؤں کا بیک فرد ہوتا۔''

''تیری خواہش ذرا سے فرق کے ساتھ پوری ہو سکتی ہے۔'' تیمور نے اسے آگاہ کیا۔

''کس فرق کے ساتھ۔'' شامی نے اشتیاق سے پوچھا۔

''مجھے نوابی خاندان کا طوق اپنے گلے سے اتار پھینکنا ہو گا۔ اس کے لیے تیار ہوں۔''

''اس کی ضرورت نہیں ہے۔ فرق خاندان کا نہیں لڑکیوں کے عمل و توقع کا ہو گا۔ تو اس پہاڑی گاؤں کے بجائے شہر میں رہ کر ایک عام فرد بن سکتا ہے۔ صحت اور رنگ و روپ کے معمولی فرق کے ساتھ یہی لڑکیاں وہاں بھی پائی جاتی ہیں۔''

''تجھ سے مجھے کچھ ایسی ہی توقع تھی۔'' شامی نے جوابی سرد آہ بھر کر ماحول کو مزید یخ بستہ کر دیا۔ ''تاریخ میں جب بڑے لوگوں کا ذکر آتا ہے تو سانپ ہمیشہ ان کی آستین میں پائے جاتے ہیں۔ میں اپنا سانپ گلے میں لٹکائے گھومتا ہوں۔''

''اتنا دکھی نہ ہو'' تیمور نے اسے تسلی دی۔ ''تاریخ میں ہمیشہ بڑے لوگوں کا ذکر آتا ہے۔ لہٰذا اس بات کا کوئی امکان نہیں کہ کوئی تاریخ داں غلطی سے تیرا ذکر کرے گا۔''

''تیمور آج کے لیے اتنی خباثت کافی ہے۔ دوسری صورت میں تو مقتول بھی کہلا سکتا ہے۔ چشمہ اس جگہ سے کوئی سو فٹ نیچے ہے اور پانی بے حد یخ..... لہٰذا تیری میت کو غسل بھی نہیں دینا پڑے گا۔''

تیمور بادلِ ناخواستہ ریلنگ سے دور ہو گیا۔ اوپر پہاڑوں پر دھوپ پھیلتی جا رہی تھی اور نیچے بدستور تاریکی تھی۔ آس پاس کی جھکوں میں پائے جانے والے جانور اپنی اپنی بولیاں بول رہے تھے۔ تیمور نے کمرے کا رخ کیا۔ ''ابھی میری نیند باقی ہے اور خواب کا بقیہ حصہ بھی دیکھنا ہے۔ جب دلبر خان ناشتا لائے تو مجھے جگا دینا'' تیمور جاتے ہی بستر پر گر گیا۔

''اٹھ جا..... ناشتا دلبر خان نہیں اس کی بیوی گل بناتی ہے اور اس وقت بھی وہ اپنے دستِ حنائی سے ورق والے پراٹھے تیار کر رہی ہے۔ ساتھ میں حلوا پوری بھی ہے۔ یہ سب ہضم کرنے کے لیے تیار ہے اس لیے میں تجھے اٹھانے آ گیا تھا۔ میرا ارادہ تھا اکیلے ناشتا کرنے کا۔''

''تیری اس حرکت پر میں تجھے تا قیامت معاف نہیں کروں گا۔'' تیمور رضا ایک بار پھر اچھل کر بستر سے اٹھا اور باتھ روم میں گھس گیا۔ شامی مسکراتے ہوئے چلا گیا۔ دس منٹ بعد تیمور نیچے پہنچا تو گنگناتے دلبر خان کو ناشتا لگاتے دیکھ کر اس

تائید کی۔

شامی نے اسے یوں دیکھا جیسے آج کل امریکا پاکستان کو دیکھ رہا ہے۔ مگر اس سے پہلے وہ اس سے کچھ کہتا' سڑک سے ایک نیلی مزدا گزری۔ ستر کے ماڈل کی یہ شاہانہ کار اب خال خال ہی باقی رہ گئی تھی۔ شامی ہکا بکا رہ گیا۔ تیمور نے اسے بازو سے ہلایا تو وہ چٹان سے نیچے گرتے گرتے بچا۔ ''یہ کیا حرکت ہے۔ ابھی میں گر جاتا۔'' اس نے خفگی سے کہا۔

''تو کیا ہوا میں تجھے اٹھا لیتا۔'' تیمور نے دانت نکالے ''یہ بتا کہ تو اچانک جام کیوں ہو گیا تھا؟''

''وہ یار ابھی جو نیلی مزدا گزری تھی اس میں وہی لڑکی تھی۔''

''کون سے والی' وہی لڑکی؟'' تیمور نے دریافت کیا۔

''یار جو مری میں ہمیں ملی تھی۔''

''ہمیں نہیں تمہیں.....'' تیمور نے تصحیح کی۔ ''میں نے تو صحیح سے اسے دیکھا بھی نہیں تھا۔ لیکن یہ بتاؤ کم تم نے اتنی تیزی سے گزرنے والی کار میں لڑکی کو دیکھ کیسے لیا اور مزے کی بات ہے کہ اسے پہچان بھی لیا، مان لیا تیرے اندر لڑکیوں کے معاملے میں کمپیوٹر نصب ہے اور باقی معاملات میں تو دنیا کے پہلے کمپیوٹر سے بھی گیا گزرا ہے۔''

''رائے کا پہلا حصہ ہی بہتر ہے۔'' شامی نے تبصرہ کیا اور اٹھ کر کر سڑک کی طرف دوڑا۔

''کہاں جا رہے ہو؟'' تیمور چلایا مگر شامی رکا نہیں۔ مجبوراً تیمور بھی اس کے پیچھے لپکا۔ شامی سڑک پر پہنچ کر اس سمت میں بھاگنے لگا جس طرف نیلی مزدا گئی تھی۔ تیمور کچھ دیر دوڑنے کے بعد شامی کو برا بھلا کہتے ہوئے سڑک کے کنارے درخت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ تگڑا ناشتا کر کے میراتھن دوڑنا اس کے بس سے باہر تھا جب اس کی سانس قابو میں آئی تو اس نے دوبارہ چلنا شروع کر دیا۔ کچھ دیر بعد اسے شامی آتا نظر آیا۔ اس کا چہرہ چمک رہا تھا۔

''یہ کیا حرکت فرمائی جناب نے؟'' تیمور بھنایا ہوا تھا۔

''میں نے اس لڑکی کا پتا چلا لیا ہے۔'' اس نے فاتحانہ انداز میں کہا۔ ''ذرا آگے ایک کوٹھی میں کھڑی ہے وہ نیلی مزدا.....''

''ضروری نہیں ہے یہ وہی نیلی مزدا ہو۔'' تیمور نے کہا۔ ''ایسی اور کاریں بھی ہوں گی۔''

''مجھے یقین ہے یہ وہی لڑکی ہے اور مزدا بھی وہی ہے۔''

''مگر اس بھاگ دوڑ کا فائدہ..... دس بارہ دن بعد نوشی آجائے گی۔''

''جب تک وہ آئے گی میں ذرا پریکٹس کر لوں گا۔'' شامی نے ڈھٹائی سے کہا۔

''بیٹے مجھے تیرا انجام عبرت ناک نظر آ رہا ہے [illegible] وقت کئی کشتیوں کی سواری کی کوشش فرما رہا ہے [illegible] نصیب چمن پور میں جا کر پھوٹے گا۔''

''صبح سویرے اتنا بھاری ناشتا کرنے کے بعد [illegible] اس قسم کے پُرفتور خیالات آنا تعجب خیز نہیں [illegible]

سارا دن وہ کھاتے اور گھومتے رہے۔ ذرا دیر [illegible] آتے تو دوبارہ بھوک لگ جاتی تھی۔ چھٹی بار [illegible] کھایا تو دونوں نیند اور تھکن سے بے حال تھے۔ شامی [illegible] گرتے ہی سو گیا تھا۔ البتہ تیمور کو کسی قدر تاخیر سے نیند [illegible] پھر رات اس کے پیٹ میں گڑبڑ شروع ہوئی جو [illegible] منفی نتیجہ تھی اور اس کے نتیجے میں اسے کئی بار باتھ روم [illegible] جانا پڑا تھا۔ چوتھی بار جب وہ واپس آیا تو پیٹ [illegible] تھا لیکن اب اس کی نیند..... غائب ہو گئی تھی خاصی دیر تک [illegible] میں لیٹا کروٹیں بدلتا رہا۔ سردی کل رات کی نسبت کم [illegible] اتنی کم بھی نہیں تھی کہ وہ کمبل کے بغیر لیٹ جاتا۔ تنگ [illegible] نے کمبل ایک طرف پھینکا سلیپنگ سوٹ پر ہی جیکٹ [illegible] سلیپر پہن کر باہر آ گیا۔ اس کا ارادہ کافی بنا کر کوئی [illegible] مووی دیکھنے کا تھا۔ وہ کچن میں آیا کافی کا پانی رکھ کر [illegible] ٹیرس سے باہر جھانکا۔ شیشے پر اوس کے قطرے جمع [illegible] باہر یقیناً خاصی سردی تھی۔ اچانک سے لگا جیسے ٹیرس [illegible] سایہ گزرا ہو۔ تاریکی اور شیشے پر نمی کی وجہ سے [illegible] نظر کا دھوکا جانا۔ مگر اگلے ہی لمحے اسے باہر سے آہٹ [illegible] جیسے کوئی شے کسی دوسری شے سے ٹکرائی ہو۔ تیمور کے [illegible] خطرے کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے جلدی سے کچن کی [illegible] بجھائی اور ڈائننگ ہال میں آیا۔ اس نے شیشے کے دروازے [illegible] سے باہر جھانکا مگر اوس دھندلائے شیشے کے باہر دیکھنا ممکن نہیں [illegible] تھا۔ اس نے اطمینان کا سانس لیا اور سر اندر کرنے [illegible] اس کی نظر فرش پر پڑے ایک ڈبے پر پڑی۔ یہ لیموں اور [illegible] تھا۔ تیمور نے جھک کر ڈبا اٹھا لیا۔ یہ خاصا وزنی تھا اور [illegible] کے گرنے کی آواز ہی اس تک آئی تھی۔ دروازہ بند کر [illegible] واپس ڈائننگ ہال میں آیا کافی کا پانی کھولنے لگا تھا [illegible] کر اس نے کافی مگ میں نکالی، چینی اور کریم ڈال کر [illegible] اپنے کمرے میں آ گیا۔ اس کا مووی دیکھنے کا ارادہ [illegible] تھا۔

روشنی میں اس نے ڈبے کا جائزہ لیا، کوئی فٹ [illegible] چھ انچ قطر کا یہ ڈبا اوپر سے بند تھا۔ اس نے گھما کر اس [illegible] کھولا۔ اندر سے اوزاروں سے بھرا ایک گھاچنی نکلا تھا۔ جس [illegible]

ہونے بڑے کئی درجن اوزار تھے۔ بے حد نفاست سے بنے [illegible] عام استعمال کے نہیں تھے بلکہ خاص کام کے لیے بنائے [illegible] تھے۔ ان میں کئی طرح کے لاک کھولنے والے اوزار بھی [illegible] تھے۔ تیمور کو لگا جیسے یہ اوزار نقب زنی کے لیے استعمال ہوتے [illegible] اس کا مطلب ہے ٹیرس سے کوئی چور گزرا تھا۔ وہ تیزی [illegible] ہوا اور نیچے کی طرف لپکا۔ اس نے اسٹڈی کا لاک کھولا [illegible] کمکا کر تجوری کا جائزہ لیا۔ مگر وہ بدستور بند تھی۔ چور [illegible] کھول سکتا تھا لیکن بند کرنے کی زحمت کیوں کرتا۔ اس کا [illegible] تھا کہ چور تجوری تک رسائی حاصل نہیں کر سکا تھا۔ شاید [illegible] کے بیدار ہونے اور کچن میں کھٹ پٹ کی آواز سے گھبرا [illegible] باہر سے ہی فرار ہو گیا تھا اور بھاگنے کے دوران اس کا یہ [illegible] ڈبا گر گیا تھا۔ تیمور نے پہلے شمشاد خان کو جگانے کا سوچا [illegible] پھر ارادہ ملتوی کر دیا۔ اس نے اپنے بیڈ روم سے سامنے [illegible] لمبے اور بائیں طرف کے لان کا جائزہ لیا۔ باہر کئی [illegible] پر گیس لیمپ جل رہے تھے..... ان کی روشنی میں منظر [illegible] کی قدر واضح تھا۔ البتہ دھند کی وجہ سے ماحول شاعرانہ حد تک [illegible] ناک تھا۔ سرہاؤس میں روشنی کے لیے چند طاقت ور [illegible] تھیں۔ جب جنریٹر چلایا جاتا تو یہ بھی چارج ہو جاتی [illegible]

چوکیدار رات آٹھ بجے گیٹ بند کر کے اپنے کوارٹر میں [illegible] چلا جاتا تھا۔ لیکن گیٹ بند کرنے سے صرف گاڑیوں کی [illegible] آمد و رفت بند ہوتی تھی۔ ورنہ کوئی بھی شخص بہ آسانی سرہاؤس [illegible] سکتا تھا۔ کیونکہ یہاں پر نقد رقم یا ایسی کوئی شے نہیں تھی جو [illegible] کے لیے باعث کشش ہوتی اس لیے حفاظتی انتظامات [illegible] خاص توجہ نہیں دی گئی تھی۔ فرنیچر اور دوسرا بھاری سامان [illegible] چرا کر نہیں لے جا سکتا تھا، مگر اب تیمور کو احساس ہو رہا تھا [illegible] سرہاؤس کس قدر غیر محفوظ ہے۔ صبح ناشتے پر وہ شامی سے [illegible] بارے میں بحث کر رہا تھا۔

''یار شہباز بسیرا کے گرد کم سے کم ایک چار دیواری اور [illegible] کو پہرے کی ضرورت ہے۔''

''وہ کس لیے؟'' شامی نے دل جمعی سے آلو بھرا پراٹھا [illegible] کھاتے ہوئے کہا۔ ''یہ اس کیا قیمتی شے ہے؟''

''ہم سے زیادہ قیمتی شے کیا ہو گی؟'' تیمور نے جواباً حملہ [illegible] پر حملے جاری رکھے۔ ''اب کوئی بھی آرام سے اندر گھس کر [illegible] گدھے بیچ کر سوتے حضرت شامیر کی گردن [illegible] لے۔''

شامی نے بادلِ ناخواستہ پراٹھے سے توجہ ہٹا کر تیمور کو [illegible] ''..... حضرت شامیر کیوں ..... اعلیٰ حضرت تیمور رضا کیوں نہیں۔ جناب تو سواری کے جملہ اسباب فروخت کر کے سوتے ہیں۔''

''بس تم بچ جاتے ہو۔'' تیمور نے ڈکار لی۔

''تیمور مسئلہ کیا ہے صبح سے تجھے شہباز بسیرا کی حفاظت کا معاملہ کھائے جا رہا ہے۔ جیسے تو ایک گھنٹے سے حلوا پوری کھا رہا ہے۔''

''اٹھاون منٹ سے۔'' تیمور نے تصحیح کی اور اپنی دو درجن پوری حلق سے اتاریں۔ ''یہ دلبر خان پوریاں بناتا جائے اور میں کھاتا جاؤں بس اب یہی زندگی کا مقصد رہ گیا ہے۔''

''اور وہ لندن پرواز کرنے کے ارادے جو ہیں۔''

''وہ بھی برقرار ہیں۔ ممکن ہے دلبر خان میرے ساتھ لندن چلا جائے۔''

''سچ صاحب۔'' کچن میں پوریاں تلتے دلبر نے چلا کر کہا۔ اسے اپنی تیز رفتار ترقی کا یقین نہیں آ رہا تھا۔ کل اسے اسلام آباد جانے کی نوید ملی تھی اور آج اسے لندن کے خواب دکھائے جا رہے تھے۔

''اگر تم نے اس طرح مجھے مزیدار چیزیں کھلانے کا سلسلہ جاری رکھا تو لندن جانے والے طیارے میں اپنی سیٹ پکی سمجھو۔''

''دلبر خان ہمارے ساتھ آشیانہ وقار میں رہے گا۔'' شامی نے فیصلہ کن انداز میں آلو کے پراٹھے کی ڈکار لی۔

''دلبر خان لندن جائے گا۔'' تیمور نے میز پر ہاتھ مارا۔

''دلبر خان دادا حضور کا ملازم ہے..... تمہارا نہیں۔''

''ٹھیک ہے..... تیمور بولا'' جب میں ایم بی اے مکمل کر لوں گا تو انعام میں دادا جان سے دلبر خان کو مانگ لوں گا۔''

''اس سے پہلے ہی میں انجینئرنگ مکمل کر کے دادا جان سے دلبر خان حاصل کر چکا ہوں گا۔'' شامی نے اعلان کیا۔

''چلو آپس میں لڑنے کے بجائے دلبر خان سے اس کی رائے معلوم کرتے ہیں وہ جو فیصلہ کرے گا۔ مجھے قبول ہو گا۔''

شامی نے دانت پیسے۔ ''چالاکی مت دکھاؤ۔ بقائمی ہوش و حواس لندن جانے سے کون انکار کر سکتا ہے۔ دلبر خان تم بتاؤ لندن جاؤ گے یا.....''

''چمن پور.....'' تیمور نے لقمہ دیا۔ اس پر شامی نے اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا۔

''ہم لندن جائے گا۔'' دلبر خان نے فوری فیصلہ سنا دیا۔ ''تمہارا ایک گاؤں والا لندن میں ہے سنا ہے بہت مزے کرتا ہے۔ اپنی ماں کو پکا مکان بنا کر دیا ہے۔''

''سوچ لو دلبر خان..... صرف تم جا سکتے ہو تمہاری بیوی

نہیں جاسکتی ہے۔" شامی نے اسے خبردار کیا۔

"کوئی بات نہیں۔" دلبر خان فراخ دلی سے بولا "ہم ادھر دوسری شادی کرے گا۔ ادھر گل کو رکھے گا کبھی ہم کو ادھر بھی آنا ہوگا۔"

تیمور نے دلبر خان کی دور اندیشی کی داد دی۔ مگر دلبر خان کی بدقسمتی گل اوپر کی صفائی سے فارغ ہو کر آتے ہوئے دلبر خان کی دوسری شادی کی بات سن چکی تھی۔ جب شامی اور تیمور ناشتے سے فارغ ہو کر روانہ ہوئے تو دلبر خان اپنی گل کے پیچھے سرونٹ کوارٹر کی طرف جا رہا تھا کہ لندن ہنوز دور است تھا اور فی الحال دلبر خان کو گل کے ساتھ رہنا تھا۔ اوپر آ کر تیمور نے اوزاروں والا ڈبا شامی کے سامنے رکھا۔ اس نے الٹ پلٹ کر دیکھا۔ "اس میں کیا ہے؟"

"نقب زنی کے آلات۔" تیمور نے کہا۔

"ماشاء اللہ ایم بی اے سے پہلے ہی جناب نے بزنس لائن بھی تلاش کرلی۔" شامی نے اسے شاباش دی۔

"بکواس نہ کر میں نواب وقار الملک کا پوتا اور نقب زنی کا پیشہ اپناؤں گا۔" تیمور خفا ہو گیا "شامی تیری سوچ اتنی گر جائے گی۔"

"تب برخوردار یہ سامان کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ فی زمانہ ہم صرف حسینوں کے دلوں پر نقب لگا سکتے ہیں اور اس کے لیے ان اوزاروں کی ضرورت نہیں ہے۔"

"یہ ڈبا مجھے رات ٹیرس پر ملا تھا۔" تیمور نے اسے تفصیل سے بتایا۔ "اس سے یہ ثابت ہوتا ہے....."

"کہ تیرا حلق تک بھر کر کھانا کھانا کام آ گیا ورنہ آنے والا تجوری پر ہاتھ صاف کر جاتا۔"

"پر یار تجوری میں ایسی کیا شے ہے۔ اگر کوئی قیمتی شے ہوتی تو دادا جان ہمیں ضرور آگاہ فرماتے۔"

"دادا جان ایک نواب بھی ہیں اور ان کے بہت سارے معاملات ممکن ہے ہماری نظروں سے بھی اوجھل ہوں۔" شامی نے سوچ کر کہا۔ "عین ممکن ہے دادا جان نے کوئی قیمتی شے تجوری میں رکھی ہو اور چور کو کسی طرح اس کا علم ہو گیا ہو۔"

"اس صورت میں دادا جان کو صورتِ حال سے فوری طور پر آگاہ کرنا ضروری ہے۔" تیمور بولا "ہم میں سے کوئی مری تک جا کر فون کردے۔"

"میرا خیال ہے شمشاد خان سے بھی مشورہ کرلیا جائے۔"

شمشاد خان فکرمند نظر آنے لگا تھا جب تیمور نے اس کے سامنے اوزاروں والا بکس رکھا۔ "آپ نے صبح مجھے کیوں نہیں بتایا۔"

"صبح تم کیا کر لیتے۔" شامی نے کہا "چلو جو ہوا سو ہوا اب کرلو۔"

"مجھے لگ رہا ہے کوئی بڑا چکر ہونے والا ہے۔" شمشاد خان کی پریشانی بڑھ گئی۔ "کاش کہ میں نواب صاحب سے بتا سکتا۔"

"فکر نہ کرو، میں مری جا کر آج ہی دادا جان کو بتاتا ہوں۔" شامی نے اسے تسلی دی۔

"آپ....." شمشاد خان کہتے کہتے رک گیا پھر کہنے لگا۔ "آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ میرا یہاں ہونا ضروری ہے۔ شامیر صاحب آپ چلے جائیں اور کوشش کریں کہ شام سے پہلے واپس آجائیں۔"

شمشاد خان نے نہ جانے کہاں سے خاصا انچ برآمد کیا۔ اس میں دو عدد رائفلیں اور تین پستول تھے۔ چوکیدار کے پاس اپنی رائفل تھی۔ مالی کو مسلح کر دیا اور انہیں حکم دیا گیا کہ باری باری چھ چھ گھنٹے پہرے پر رہیں۔ ایک پستول اس نے شامی کے حوالے کرنا چاہا مگر اس نے انکار کر دیا۔

"دھماکے دار اشیا سے مجھے اختلاجِ قلب ہوتا ہے۔"

"شامیر صاحب حفاظت کے لیے ضروری ہے۔" شمشاد خان نے اصرار کیا۔

"مجھے بھلا کیا خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔"

شامی کو جیپ پر جانا تھا۔ اس کے علاوہ وہاں صرف ایک موٹر سائیکل تھی جو شمشاد خان کے زیرِ استعمال رہتی تھی مگر جب شامی نے جیپ گیراج سے نکالنی چاہی تو اس کے انجن نے کام کرنے سے انکار کر دیا۔ شامی خاصی دیر کوشش کرتا رہا آخر شمشاد خان اس کی مدد کو آیا اور اس نے انکشاف کیا کہ ڈسٹری بیوٹر کے تار نکلے ہوئے تھے۔ اس نے تار لگائے اور انجن اسٹارٹ ہو گیا۔ شامی نے دلبر خان کا شکریہ ادا کیا اور مری کی طرف روانہ ہو گیا۔ تیمور نے اس سے کہا تھا کہ وہ اس کی بعد میں صرف آرام کرے گا اور اس کے بغیر کسی پر عیاں نہیں ہوگا۔ دراصل شامی کو گل کے حوالے سے خاصے خدشات تھے۔ فتنہ پرور خاصی بے باک ثابت ہوئی تھی اور بے خطر گل کے کمروں میں آتی جاتی تھی۔

شامی نے چند کلومیٹر کا فاصلہ طے کیا تھا کہ اسے پیچھے سے نیلی مزدا آتی نظر آئی اور چند منٹ میں اس نے جیپ کراس کرلیا۔ یہ دیکھ کر شامی کے جسم میں کرنٹ دوڑ گیا کہ مزدا وہی لڑکی ڈرائیو کر رہی تھی جو اسے مری میں ملی تھی۔ اس نے جیپ کی رفتار بڑھا دی۔ لیکن ان پُر پیچ راستوں پر وہ زیادہ ماہر ڈرائیور ثابت ہوئی تھی۔ چند منٹ بعد

نظروں سے اوجھل ہو چکی تھی۔ جب شامی نے مایوس ہو کر جیپ کی رفتار کم کر دی تو اسے نیلی مزدا سڑک کے کنارے کھڑی نظر آ گئی۔ لڑکی اس کے ساتھ کھڑی تھی کار کی طرف ہی دیکھ رہی تھی۔ جیپ کی آواز سن کر وہ مڑی اور ہاتھ سے اشارہ کرنے لگی۔ اس کے ہونٹوں پر دلکش مسکراہٹ تھی۔ آج اس نے براؤن رنگ کی اسکن ٹائٹ پتلون پر نیلی شرٹ پہن رکھی تھی۔ غالباً اسے نیلا رنگ زیادہ ہی مرغوب تھا۔ شامی نے کھڑکی سے سر نکالا اور پھر دانت نکالے۔

"زہے نصیب آج آپ خود رک رہی ہیں۔"

لڑکی نے غور سے اسے دیکھا "تم شاید وہی ہو جس نے مری کے مال روڈ پر مجھ سے فری ہونے کی کوشش کی تھی۔"

شامی کے دانت اندر چلے گئے۔ "بس بدقسمتی سے میں وہی شریف آدمی ہوں۔ یہ بتائیں کہ کیوں روکا ہے؟"

"مجھے پتا نہیں تھا کہ جیپ تم چلا رہے ہو ورنہ..... خیر اب رک ہی گئے ہو تو میری کار دیکھ لو چلتے چلتے رک گئی ہے۔"

اگرچہ آٹو موبائل کے فن میں شامی اتنا ہی کورا تھا جتنا کسی خوب صورت لڑکی کے سامنے عقل سے کورا ہو جاتا تھا لیکن اس نے یہ بات لڑکی سے نہیں کہی بلکہ ایک استادانہ اعتماد کے ساتھ کار کا بونٹ کھولا۔

"کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔ اگر کار ٹھیک نہ بھی ہوئی تو میری جیپ حاضر ہے۔ جہاں کہیں گی پہنچا دوں گا۔"

"مجھے تمہارے ساتھ نہیں جانا ہے..... بلکہ تمہیں میرے ساتھ جانا ہے گدھے کہیں کے۔"

شامی کو گدی سے لگی پستول کی نال سے زیادہ لڑکی کے لقب نے صدمہ پہنچایا تھا۔ اور اس نے سیدھا ہونے کی کوشش کی تو بونٹ ٹن سے اس کے سر سے ٹکرایا تھا۔ شامی نے آہ بھری۔ اتنی دیر میں لڑکی پھرتی سے اس سے دور ہو گئی۔ "چلو کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ جاؤ۔"

"بسر و چشم....." شامی نے سر پر ہاتھ پھیرا جہاں ایک چھوٹا سا گومڑ نکل آیا تھا اور ضرب شدید کی وجہ سے دنیا چند لمحے کے لیے اس کی آنکھوں کے آگے تاریک ہو گئی تھی۔ یہ غنیمت رہا تھا کہ وہ چکرا کر کھائی میں نہیں گرا تھا۔ "لیکن یہ پستول قطعی غیر ضروری ہے۔ یقین کرو میں راضی خوشی تمہارے ساتھ چلوں گا اور تمہاری کسی بھی دست درازی کا برا نہیں مناؤں گا۔"

لڑکی نے دانت پیستے ہوئے کہا "بکواس بند کرو۔ ایک منٹ کے اندر تم کار میں نہیں بیٹھے تو تمہارے اس بھوسے بھرے سر میں سوراخ کر دوں گی۔"

یہ شامی کے لیے دوسرا صدمہ تھا۔ اس نے شکوہ کیا۔

"خوب صورت لڑکی تم مسلسل میری توہین کر رہی ہو، خیر تمہیں اس کا حق حاصل ہے۔"

بادلِ ناخواستہ شامی نیلی مزدا کی ڈرائیونگ سیٹ پر آ بیٹھا تھا۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ اس کے ساتھ کچھ غلط ہو رہا ہے لیکن لڑکی کے حسن نے اس کی عقل پر پانی پھیر دیا تھا۔ لڑکی اس کے برابر میں آ بیٹھی اور اسے کار کی چابی دی۔ "ڈرائیو کرو..... واپس چلنا ہے۔"

"اور میری جیپ۔" شامی نے احتجاج کیا "اسے یہاں نہیں چھوڑ سکتا۔"

"جیپ کی نہیں اپنی فکر کرو۔" لڑکی کا لہجہ سرد تھا۔

"میری فکر کرنے کے لیے تم جو ہو۔" شامی خوشدلی سے بولا۔

شامی اس کی ہدایت کے مطابق ڈرائیو کرنے لگا۔ اچانک لڑکی نے اسے رکنے کا حکم دیا۔ شامی نے کار روک دی اور اس کا انجن بند کر دیا۔ لڑکی نے سیاہ شیشوں والا ایک بڑا سا چشمہ اس کی طرف بڑھایا۔ "اسے پہن لو....." شامی نے اس بار بھی حکم کی تعمیل کی اور بوکھلا گیا۔

"مجھے کچھ نظر نہیں آ رہا ہے۔"

"یہی تو میں چاہتی ہوں۔" لڑکی نے جواب دیا۔ اب میری نشست پر آ جاؤ۔

لڑکی نے اترنے سے پہلے چابی نکال لی تھی۔ شامی کھسک کر برابر والی نشست پر آیا اور لڑکی نے اتر کر ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی تھی۔ "کوئی ہوشیاری مت دکھانا۔ پستول ابھی بھی میرے ہاتھ میں ہے۔"

"جی بہتر۔" شامی سعادت مندی سے بولا "ویسے آپ پستول کے بغیر بھی کم خطرناک نہیں ہیں۔"

لڑکی نے روانگی سے پہلے اطمینان کر لیا تھا کہ شامی نے عینک درست طریقے سے پہنی ہے اور اسے باہر کا منظر نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس نے کار آگے بڑھا دی۔ شامی تاریکی میں تھا لیکن اس کی زبان مستقل چل رہی تھی۔ لڑکی نے کئی بار اسے ٹوکا۔ دھمکی دی اور تنگ آ کر خود چپ ہو گئی۔ نصف گھنٹے بعد کار رکی اور لڑکی نے اسے اترنے کا حکم دیا۔ شامی نے اس بار بھی حکم کی تعمیل کی۔ "مجھے کہاں لائی ہو؟"

"ابھی پتا چل جائے گا" لڑکی اس کا ہاتھ تھام کر لے جانے لگی، شامی نے چند سیڑھیاں چڑھیں اور اندر کی گرم فضا میں آ گیا۔ لیکن لڑکی نے اسے چشمہ اتارنے نہیں دیا۔ آخر ایک جگہ رک کر لڑکی نے خود اس کے چہرے سے چشمہ اتار لیا۔ شامی نے آنکھیں جھپکا کر چاروں طرف دیکھا، وہ ایک تقریباً

خالی کمرے میں کھڑا تھا جس میں آئرن کا سنگل بیڈ تھا اور ایک چھوٹی سی میز..... بیڈ پر فوم کا گدا تھا اور پاؤں والے حصے کی طرف تہ کیا کمبل تھا، شامی نے لڑکی کی طرف دیکھا تو وہ مسکرائی تھی۔ ''اب تم اس جگہ رہو گے۔''

☆☆☆

شام تک تیمور شامی کا انتظار کرتا رہا اور اس کی رنگین مزاجی کو برا بھلا کہتا رہا۔ تیمور کو سو فی صد یقین تھا کہ وہ مری کی رنگینیوں میں گم ہوگا۔ جب کہ شمشاد خان تشویش میں مبتلا تھا۔ ''تیمور صاحب شامی صاحب حالات سے واقف ہونے کے بعد بھی ایسی غیر ذمے داری نہیں دکھا سکتے ہیں۔ مجھے لگ رہا ہے۔ وہ کسی مصیبت میں ہیں۔''

''شامی بجائے خود ایک مصیبت ہے۔'' تیمور خفگی سے بولا ''تم لکھ کر رکھ لو۔ وہ کسی لڑکی کے چکر میں ہوگا۔''

''میرا خیال ہے مجھے جا کر دیکھنا چاہیے۔'' شمشاد خان نے رائے دی۔

''دیکھ لو اور بہتر ہے دادا جان کو فون بھی کر دینا' اس کی طرف سے مجھے امید نہیں ہے کہ اس نے فون بھی نہیں کیا ہوگا۔'' تیمور نے تائید کی تو شمشاد خان اپنی موٹر سائیکل پر روانہ ہوگیا۔ تیمور اب خود بھی فکر مند تھا۔ شامی کتنا ہی بے پرواہی اس حد تک غیر ذمے داری نہیں دکھا سکتا تھا کہ دادا جان کو فون ہی نہ کرے شام ہو چلی تھی اور اندھیرا تیزی سے چھایا تھا۔ دلبر خان نے ڈنر کے بارے میں پوچھا لیکن تیمور کی بھوک مر گئی تھی۔ دوپہر میں بھی اس نے صرف دو پلیٹ بریانی کھائی تھی اور شام کو چار عدد..... ہٹر سینڈوچز۔

''دلبر خان ابھی بھوک نہیں ہے۔ ایسا کرنا رات نو بجے تک تیار کر لینا۔ مینیو کیا ہے؟''

''بھیڑ کا بھنا گوشت ہے صاحب..... آپ کہیں تو کڑاہی بنا دوں۔ ساتھ میں چکور کے تکے ہوں گے۔ ابھی پرسوں پکڑا تھا۔''

''ہاں یہ ٹھیک رہے گا۔'' تیمور خوش ہوگیا۔ ''بس زیادہ مت بنانا۔ مجھے شامی کی فکر بھی ہے۔''

تیمور نے ایک بار پھر دل ہی دل میں شامی کو بے نقط سنائیں۔ جو رات کا پُر لطف ڈنر برباد کرنے پر تلا ہوا تھا۔ شمشاد ایک گھنٹے بعد موٹر سائیکل دوڑاتا شہباز بسیرا میں داخل ہوا تو اس کے تاثرات دیکھ کر تیمور کا ماتھا ٹھنکا۔ ''کیا ہوا شمشاد خان؟'' وہ لپک کر اس کے پاس آیا تھا۔

''گڑبڑ ہے صاحب..... یہاں سے کوئی بارہ کلومیٹر دور جیپ خالی کھڑی ہے اور شامیر صاحب غائب ہیں۔''

تیمور کو سکتہ ہوگیا۔ کچھ دیر بعد اس نے چونک کر کہا۔ ''اس کا مطلب ہے شامی مری گیا ہی نہیں۔''

''جی صاحب..... جیپ کا رخ مری کی طرف تھا اور وہ واپس آ رہے ہوتے تو جیپ کا رخ اس طرف ہونا چاہیاں جب میں گئی تھیں۔ میں نے چند مقامی افراد کو جیپ کی حفاظت پر لگا دیا ہے۔''

''اور شامی.....؟''

''صاحب میں پولیس اسٹیشن جا رہا ہوں۔ انہیں پولیس ہی تلاش کر سکتی ہے۔'' شمشاد نے دوبارہ موٹر سائیکل اسٹارٹ کی ''اگر پولیس اسٹیشن کا فون ٹھیک ہوا تو میں نواب صاحب کو بھی اطلاع دے دوں گا۔ مجھے لگ رہا تھا شامیر صاحب فون نہیں کر سکے تھے۔''

''ممکن ہے وہ جیپ روک کر کسی ضرورت کی وجہ سے نیچے اترا ہو اور.....''

شمشاد خان نے نفی میں سر ہلایا۔ ڈھلان پر صرف دو سو گز نیچے چرواہوں کا خاندان آباد ہے۔ انہوں نے بتایا کہ وہ دوپہر سے اس جیپ کو دیکھ رہے ہیں اور ڈھلان پر کسی کو حادثہ پیش آیا ہوتا تو انہیں اس کا علم ضرور ہوتا۔ تیمور صاحب آپ سب کو چوکنا کر دیں اور دروازے اندر سے بند کر لیں۔'' شمشاد خان ایک بار پھر موٹر سائیکل دوڑاتا نکل گیا اور تیمور تلملا کر رہ گیا کہ کرے تو کیا کرے۔

☆☆☆

شامی کا بھوک سے برا حال تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ مری میں ثنائیہ ریسٹورنٹ میں پُر تکلف قسم کا لنچ کرے گا مگر اس سے پہلے ہی یہ حسینہ اس سے ٹکرا گئی اور اسے پستول کی نوک پر یہاں لے آئی۔ وہ دادا جان کو اطلاع بھی نہیں کر سکا تھا۔ اب نہ جانے تیمور کا اس کی جدائی میں کیا حال ہوگا۔ ویسے اسے اتنی امید تھی کہ اب تک جیپ دریافت ہو چکی ہوگی اور اس کی گم شدگی کا علم ہو چکا ہوگا۔ لڑکی اسے کمرے میں بند کر کے نو دو گیارہ ہوگئی تھی۔ کمرا چار دیواری طرف سے بند تھا صرف اوپر ایک چھوٹا سا روشن دان تھا۔ کمرے کے ساتھ مختصر سا باتھ روم تھا، یہاں آنے کے بعد شامی کے دل میں کئی بار ذرا رنگین رنگین قسم کے خیالات آئے تھے کہ لڑکی اسے بہ غرضِ عشق اغوا کرا لائی ہے۔ یعنی اس کی عصمت خطرے میں تھی۔ دوسرے خیالات ذرا سنگین تھے جو شامی کو لرزانے کا سبب بن رہے تھے۔ شاید لڑکی نے مال روڈ پر اس کی بے تکلفی کا اتنا برا منایا تھا کہ اس سے بدلہ لینے پر تل گئی تھی اور اسی وجہ سے اسے اغوا کر کے لائی تھی۔

لڑکی کے عزائم اس کے پستول سے بھی واضح تھے۔ شامی نے اس قسم کے معاملات میں اناڑی ہونے کے باوجود محسوس کیا تھا کہ لڑکی نہ صرف پستول چلا سکتی ہے بلکہ اس قسم کے معاملات اس کے لیے نئے نہیں تھے۔ اس سے شامی کو خوف بھی محسوس ہوا تھا اس لیے اس نے بے چون و چرا لڑکی کے ہر حکم کی تعمیل کی تھی۔ لڑکی کو غائب ہوئے کئی گھنٹے گزر چکے تھے۔ شامی بار بار گھڑی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ پہلے وہ کمرے کے چکر لگاتا رہا لیکن رفتہ رفتہ اس کی ٹانگوں نے جواب دیا تو وہ بستر پر دراز ہوگیا۔ دوپہر کا کھانا گول۔ شام کی چائے اور دیگر لوازمات کے بھی آثار نہیں تھے۔ سات بجے شامی کو ڈنر بھی خطرے میں نظر آنے لگا تھا۔ روانگی سے پہلے دلبر خان نے اسے رات کا لذیذ ترین مینیو بتایا تھا تو شامی نے اسی وقت فیصلہ کر لیا تھا کہ اگر اس کا آخری وقت نہ آیا تو وہ بہر صورت ڈائننگ ہال کی میز پر ہوگا۔ مگر ملک الموت کے بجائے لڑکی اس کی راہ میں حائل ہوگئی تھی اور اس کے عزائم کسی قدر ملک الموت سے ملتے جلتے لگ رہے تھے۔ شامی کی تسلی کے لیے ایک ہی حوصلہ افزا بات تھی۔ اگر لڑکی نے اسے قتل کرنا ہوتا تو یہ کام وہ وہیں سڑک پر کر سکتی تھی' اسے یہاں تک لانے کی زحمت نہ کرتی۔

باہر مکمل طور پر سناٹا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے لڑکی اسے یہاں بند کر کے بھول گئی ہے۔ آٹھ بجے جب بھوک سے آنتوں نے فریاد شروع کی تو اس نے دروازہ پیٹنا شروع کر دیا۔ ''اے ظالم حسینہ! اگر مارنا ہے تو کھلا پلا کر مار..... بھوکا کیوں مارتی ہے؟ ارے کوئی ہے..... دروازہ کھولو..... مجھے کھانے کو دو۔''

مگر کوئی جواب نہیں ملا اور شامی تھک ہار کر دوبارہ بستر پر گر گیا۔ یہ خیال خاصا لرزاخیز تھا کہ لڑکی انتقاماً اسے بھوکا پیاسا مرنے کے لیے یہاں چھوڑ گئی تھی۔ اپنی وفات حسرت آیات کا سوچ کر شامی کا دل بھر آنے لگا تھا۔ اس نے خدا سے اپنے گناہوں کی معافی مانگی اور جن جن خواتین و حضرات کا دل دکھایا' ان سے بھی غائبانہ معذرت کی۔ تیمور سے سوری کی' گو دادا جان اور پھپھو جان کے مقابل اسے اکیلا چھوڑ کر جا رہا ہے اور ابھی مزید افراد سے معذرت کرنے پر غور کر رہا تھا کہ دروازہ کھلا اور لڑکی ایک ہاتھ میں موت اور دوسرے ہاتھ میں زندگی لیے اندر آئی۔ ایک ہاتھ میں پستول اور دوسرے ہاتھ میں کھانے کی ٹرے تھی۔ ٹرے دیکھ کر شامی اچھل پڑا۔ اس وقت اس کی مسرت کا یہ عالم تھا کہ کھانے کے بعد لڑکی اسے گولی بھی مارتی تو وہ راضی خوشی جان دے دیتا۔ لڑکی نے ٹرے چھوٹی میز پر رکھی اور شامی کی حالت دیکھ کر مسکرانے لگی۔ سادہ ڈبل روٹی اور تلا ہوا انڈا اس وقت شامی کو من و سلویٰ سے کم نہیں لگ رہا تھا۔ ''بھوکے ہو؟'' لڑکی نے پیار سے پوچھا۔

''صبح کا ناشتا بھی ڈھنگ سے نہیں کیا تھا'' شامی جیسے پھٹ پڑا ''اور دوپہر کے کھانے سے پہلے تم اغوا کر لائیں۔ اگر تم کچھ اور دیر کرتیں تو میں وفات پا چکا ہوتا۔''

''چچ..... چچ..... نواب وقار الملک کے پوتے کو میں اتنا کم ہمت نہیں سمجھتی تھی کہ ایک دن نہ کھانے سے وفات پا جائے۔'' لڑکی نے طنز آمیز افسوس کیا تو شامی کھسیا گیا۔

''وہ دراصل میں بچپن سے بھوک کا کچا ہوں۔ بالکل برداشت نہیں ہوتی'' پھر وہ چونکا ''تم دادا جان کو کیسے جانتی ہو؟''

''میں تو اور بھی بہت کچھ جانتی ہوں۔ وہ سب جو تم بھی نہیں جانتے'' لڑکی عجیب سے انداز میں مسکرائی۔

اس نے اپنی شرٹ کی جیب سے ایک کاغذ اور ایک بال پین نکال کر شامی کے سامنے بستر پر پھینک دیا ''اس پہ لکھو کہ تم خیریت سے ہو اور اس وقت تک خیریت سے رہو گے جب تک ہمارا مطالبہ تسلیم نہیں کر لیا جاتا۔''

''مطالبہ.....'' شامی چونکا ''کیا تم نے مجھے تاوان کے لیے اغوا کیا ہے؟''

''تو اور کیا..... تم سمجھ رہے ہو کہ میں تم پر عاشق ہوگئی ہوں؟'' لڑکی غرائی ''جو کہا ہے وہ لکھو ورنہ میں کھانے کی ٹرے واپس لے جاؤں گی۔''

شامی نے جلدی سے کاغذ اور پین اٹھایا اور لکھنے کے لیے میز سے ٹرے ہٹائی۔ اس نے للچائی ہوئی نظروں سے ڈبل روٹی اور انڈے کی طرف دیکھا۔ حالانکہ ناشتے میں یہی چیزیں بہ مشکل اس کے حلق سے اترا کرتی تھیں۔ ''ایک بات بتا دوں' اول تو دادا جان تمہارا مطالبہ مانیں گے نہیں..... اس معاملے میں وہ سخت انا پرست ہیں۔ سب کو مروا سکتے ہیں لیکن اپنی ناک کسی کے سامنے نیچی ہونے نہیں دے سکتے۔ کم سے کم مجھ جیسے ناکارہ آدمی کے بدلے وہ تمہارا کوئی مطالبہ تسلیم نہیں کریں گے۔''

''میں نے کہا نا..... وقار الملک کو ہم تم سے زیادہ بہتر جانتے ہیں۔ وہ ہمارا مطالبہ ضرور تسلیم کریں گے۔''

شامی نے تحریر لکھ دی ''ہم سے کیا مراد ہے؟ تمہارے ساتھ اور کوئی بھی ہے؟ کیا وہ اتنا بزدل ہے کہ میرے سامنے خود نہیں آ سکتا' تمہیں بھیج دیتا ہے؟''

''اس معاملے سے تمہارا کوئی تعلق نہیں ہے'' لڑکی نے سرد لہجے میں کہا اور رقعہ لے کر جانے لگی۔

''ایک منٹ..... تم نے اس تحریر میں مطالبہ تو لکھوایا ہی نہیں'' شامی نے اسے روکا ''..... یہ مطالبہ کیا ہوگا؟''

''مور پنکھ'' لڑکی نے مسکرا کر کہا اور کمرے سے چلی گئی۔ شامی چکرا گیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ مور پنکھ ان کا خاندانی نادر نمونہ

تھا۔ دادا جان کے قبلہ والد صاحب نے جنگِ عظیم اول میں کارہائے نمایاں سرانجام دیے تھے ایک موقع پر انہوں نے محاذِ جنگ پر ایک فرانسیسی کی جان بچائی تھی۔ یہ فرانسیسی سپاہی بے چارہ جیولر تھا اور نفیس زیورات ڈیزائن کرنے کے لیے مشہور تھا مگر اسے جبراً بھرتی کر کے جرمنوں سے لڑنے کے لیے بھیج دیا گیا تھا۔ اس نے ازراہِ شکر گزاری قبلہ والد صاحب کو (دادا جان کے) ایک مور پنکھ بنا کر دیا جس میں نادر ہیرے جواہرات جڑے ہوئے تھے۔ یورپ سے واپسی پر وہ مور پنکھ اپنے ساتھ لائے تھے اور اب یہ دادا جان کے پاس تھا' اس کے بارے میں ان کے والد صاحب نے وصیت کی تھی کہ اسے کسی صورت فروخت نہ کیا جائے جب تک مقصد بہت بڑا نہ ہو۔

''بے وقوف عورت!'' شامی نے ڈبل روٹی اور انڈے سے انصاف کرتے ہوئے کہا ''دادا جان مجھ جیسے ناکارہ شخص کے بدلے وہ نادر نمونہ ہرگز نہیں دیں گے۔''

اگرچہ ایک ڈبل روٹی اور انڈے سے اس کی شکم سیری نہیں ہوئی تھی لیکن کسی حد تک آسرا ہو گیا تھا اب اسے یقین تھا کہ صبح تک وہ بھوک سے فوت نہیں ہوگا۔ برتن صاف کر کے اس نے پانی پی کر اللہ کا شکر ادا کیا۔ رات ہوتے ہی سردی میں اضافہ ہو گیا تھا اور اسے شدت سے چائے کی طلب ہو رہی تھی لیکن اس کا کوئی امکان نہیں تھا اس لیے صبر شکر کے ساتھ کمبل اوڑھ کر لیٹ گیا۔

رات دو بجے تک پولیس نے جیپ ملنے والی جگہ کا چپا چپا چھان مارا تھا۔ معاملہ نواب وقار الملک کے پوتے کی گمشدگی کا تھا۔ پولیس نے بے چارے چرواہوں کو گرفتار کر لیا ان میں سے چند ذرا سرکش تھے۔ نوجوانوں نے جائے وقوعہ پر تفتیش بھی کی تھی جنہوں نے پولیس کے خلاف مزاحمت کی تھی۔ مقصد ان سے کوئی کام کی بات معلوم کرنے کے بجائے انہیں اپنی طاقت کا نمونہ دکھانا تھا۔ شمشاد خان نے تھانے سے نواب وقار الملک کو فون کیا ... اور اس کے بعد تھانے میں بھونچال آ گیا تھا۔ دارالحکومت کی سطح سے لے کر مقامی ڈی ایس پی تک کے فون آنے لگے تھے اور تھانے میں دستیاب تمام نفری شمشاد خان کے ساتھ روانہ کر دی گئی تھی۔ نواب صاحب نے صبح سویرے پہنچنے کو کہا تھا۔

شہباز بسیرا پر سوگ کی سی کیفیت تھی۔ ان پہاڑوں پر درندے بھی نہیں پائے جاتے تھے کہ ان پر شبہ ہوتا۔ زیادہ سے زیادہ لومڑ اور گیدڑ ملتے تھے لیکن وہ کسی انسان پر حملہ نہیں کرتے تھے۔ معاملہ واضح تھا کہ شامی کو کسی انسان نے ہی اغوا کیا ہے۔ درندہ بر ضا و رغبت اس طرح نہیں جا سکتا تھا حالانکہ تیمور کو اب بھی شبہ تھا کہ کسی لڑکی کے ورغلانے میں آ کر شامی اس کے ساتھ جا سکتا ہے مگر اس نے یہ شبہ (جو کسی حد تک درست تھا) اپنے تک محدود رکھا۔ ادھر پولیس والوں نے شہباز بسیرا میں مستقل ڈیرا ڈال لیا تھا۔ ان کا مقصد تو مفت میں کھانا پینا تھا لیکن شمشاد خان نے انہیں سچ مچ پہرے پر لگا دیا اور ان پر واضح کر دیا کہ اگر ان کی غفلت کی وجہ سے کوئی نقصان ہوا تو ان کی پٹیاں اتر جائیں گی۔ رات دو بجے اس نے مجبور کر کے تیمور کو سونے کے لیے بھیج دیا اب وہ شامی کے لیے اتنا پریشان تھا کہ رات کا کھانا بھی صحیح سے نہیں کھا سکا تھا۔ ساتھ اسے یہ فکر بھی کھائی جا رہی تھی کہ دادا جان کو کیا منہ دکھائے گا۔ جنہوں نے انہیں مسائل حل کرنے کے لیے بھیجا تھا مگر مسئلہ حل کرنے کے بجائے ان میں اضافہ ہی ہوا تھا اور دادا کو ایمرجنسی میں آنا پڑا تھا۔

صبح وہ سورج نکلتے ہی آن پہنچے تھے۔ شاید اندھیرے میں ہی چل پڑے تھے۔ ان کے ساتھ علاقے کا ڈی ایس پی کریم نواز بھی تھا۔ انہوں نے شمشاد خان سے حالات معلوم کیے۔ کریم نواز نے کہا..... ''نواب صاحب مجھے یہ اغوا کی واردات لگتی ہے۔ ادھر کچھ عرصے سے ایسی وارداتیں ہو رہی ہیں۔ شہروں سے آنے والے بڑے گھرانوں کے افراد کو اغوا کر لیا جاتا ہے۔ جرائم پیشہ افراد نے پہاڑوں پر ٹھکانے بنا رکھے ہیں جہاں وہ مغویوں کو رکھتے ہیں۔ مجھے شبہ ہے نواب صاحب آپ کا پوتا بھی ان کے ہتھے چڑھ گیا ہے۔''

''تو پولیس نے اب تک کیا کیا ہے؟'' وقار الملک تلخ لہجے میں بولے۔

''میں نے واردات والی جگہ کی دونوں جانب موجود پولیس پوسٹوں پر ناکا بندی کرا دی ہے اگر مجرم شامی کو لے کر ان چیک پوسٹوں پر سے گزرنے کی کوشش کریں گے تو پکڑے جائیں گے۔''

وقار الملک چراغ پا ہو کر ڈی ایس پی پر برس پڑے۔ ''تمہارے خیال میں ہمارے پوتے کو اتنی صفائی سے اغوا کرنے والے احمق ہوں گے کہ اب تک اسے لیے یہیں بیٹھے ہوں گے۔''

''میرے خیال میں مجرم شامی کو زیادہ دور لے جانے کی کوشش نہیں کریں گے کیوں کہ اس طرح ان کا بھانڈا پھوٹ سکتا ہے۔ اس لیے انہوں نے آپ کے پوتے کو کہیں پاس ہی چھپایا ہوگا۔ دن چڑھتے ہی پولیس آس پاس کے سارے علاقے اور ہر گھر چھان مارے گی۔''

وقار الملک، شمشاد خان کی طرف گھومے اور طنزیہ انداز میں بولے۔ ''ڈی ایس پی صاحب کو بتاؤ کہ اس علاقے میں کتنے گھر ہیں اور کن لوگوں کے ہیں جن کے دروازے پر ان کا ڈی آئی جی بھی کھٹکنے کی ہمت نہیں کر سکتا ہے۔''

Dr. Hamid General Homoeo (Pvt.) Ltd.
KARACHI : Tel:2211895,2628754 LAHORE : Tel:6363664, 6304657

ڈی ایس پی کھسیا گیا۔ ''جناب ہم پوری کوشش کریں گے۔''

''تب آپ تشریف لے جائیں اور جا کر کوشش کریں۔'' وقار الملک کا موڈ سخت خراب ہو رہا تھا۔ انہیں شدت سے غصہ آ رہا تھا اور غصہ اتارنے کے لیے فی الحال دو ہی افراد دستیاب تھے یعنی تیمور رضا اور شمشاد خان لہٰذا دونوں خاموشی سے سنتے رہے۔ خاصی دیر کی گھن گرج کے بعد مطلع صاف ہوا تو دونوں نے باری باری قسطوں میں نواب صاحب کو تفصیل بتائی۔ ساری بات سن کر انہوں نے خشمگیں نظروں سے شمشاد خان کی طرف دیکھا۔ ''یہ سب ہوتا رہا اور تم نے ہمیں بتانے کی زحمت گوارا نہیں کی۔''

''نواب صاحب میں اسے عام سی بات سمجھتا رہا اور میں نے اپنے طور پر تمام حفاظتی انتظامات بھی کر لیے تھے۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس طرح کی کوئی بات ہو جائے گی۔ میں شہباز بسیرا سے باہر جانا مناسب نہیں سمجھ رہا تھا کہ میری عدم موجودگی میں نامعلوم افراد کو موقع مل جائے گا بس اسی وجہ سے میری جا کر فون نہیں کر سکا تھا۔'' شمشاد خان کے لہجے میں ندامت تھی۔

''اور دادا جان ہمیں آئے ہوئے ایک ہی دن تو ہوا تھا۔'' تیمور نے بھی ڈرتے ڈرتے کہا۔ ''دادا جان مجھے لگتا ہے وہ لوگ کسی قیمتی شے کی تلاش میں ہیں۔ کیا آپ نے یہاں تجوری میں ایسی کوئی شے رکھی ہے؟''

وقار الملک کا خون کھول گیا تھا اپنے پوتے کے اس عاقبت نااندیش سوال پر وہ شمشاد خان کے سامنے پوچھ رہا تھا اور وقار الملک ملازموں کے سامنے اتنے نجی معاملات پر گفتگو کے خلاف تھے۔ انہوں نے کمال ضبط کے ساتھ کہا۔ ''اس پر بعد میں بات ہو گی۔ شمشاد خان کیا تم نے خود وہاں کے لوگوں سے معلوم کیا تھا؟''

''زیادہ نہیں سر کار، کیوں کہ مجھے پولیس کو بھی اطلاع دینی تھی اور آپ کو بھی مطلع کرنا تھا۔''

''تب تم جا کر وہاں کے لوگوں سے خود پوچھ گچھ کرو ممکن ہے کسی نے کچھ دیکھا ہو۔''

شمشاد خان جانے والا تھا کہ چوکیدار اندر آیا۔ ''صاحب جی ایک بچہ آیا ہے یہ پرچہ دیا ہے اس نے۔'' چوکیدار نے ایک چھوٹا سا تہ کیا ہوا پرچہ شمشاد کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے پرچہ کھول کر پڑھا اور پھر نواب صاحب کی طرف بڑھا دیا اور چوکیدار سے پوچھا۔ ''لڑکا کہاں ہے؟''

''جناب وہ تو پرچہ دیتے ہی بھاگ گیا تھا۔'' چوکیدار نے بتایا تو شمشاد خان کا پارا چڑھ گیا تھا۔

''گدھے، احمق؟ تم نے اسے جانے کیوں دیا۔'' وہ اس کی جانب لپکتے ہوئے بولا۔

شمشاد خان کے انداز میں غیر معمولی بات محسوس کر کے نواب صاحب نے جلدی سے ایک نظر پرچے پر ڈالی۔

''دادا حضور اور تیمور رضا میں یہاں فی الحال خیریت سے ہوں اور جس کے قبضے میں ہوں اس کا مطالبہ نہ مانا گیا تو میرے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ باقی سب خیریت ہے اور میں خیریت سے ہوں۔ آپ کا فرماں بردار شامیر۔'' نواب صاحب نے دستخط دیکھ کر بے تابی سے تیمور کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے پڑھا اور الجھن میں پڑ گیا۔

''دادا جان شامی کو اغوا کرنے والی کوئی لڑکی ہے۔''

''احمقانہ باتیں نہ کرو۔ رقعے میں کہاں لکھا ہے۔'' وہ جان خفگی سے بولے۔

''آپ آخری جملے پر غور کریں۔ اس نے لکھا ہے کہ میں خوش ہوں۔ وہ بھلا اپنے اغوا کرنے والوں کے ساتھ کیسے خوش ہو سکتا ہے۔ اس جملے سے اس نے بتانے کی کوشش کی ہے کہ اس کے آس پاس کوئی لڑکی بھی ہے۔''

وقار الملک نے سوچا اور سر ہلایا۔ ''عین ممکن ہے اسے کوئی بھی لڑکی گدھا بنا کر کہیں بھی لے جا سکتی ہے۔ چالاک مجرموں نے اس کی نفسیات کو پیش نظر رکھ کر کوئی خوبصورت لڑکی ساتھ کر دی ہو گی اور وہ بہ رضا و رغبت چلا گیا ہو گا۔''

تیمور نے دل ہی دل میں دادا جان کے تجزیے کی تائید کی اور بولا۔ ''لیکن دادا جان مجرم کیا مطالبہ کریں گے۔ شامیر کے بدلے۔''

''ہمیں کیا معلوم احمق جب کریں گے تو پتا چلے گا۔ اتنی زحمت انہوں نے کسی بڑے مفاد کے لیے ہی اٹھائی ہو گی۔ ہم سوچ رہے ہیں کہ اس کے باپ کو اطلاع دیں۔''

''ہاں لیکن بچی جان اور دوسروں کو نہ پتا چلے ورنہ وہ دھونا شروع کر دیں گی۔''

''اتنی عقل ہمیں بھی ہے۔'' وقار الملک نے کہا اور اپنے بیگ سے ایک سیلائٹ فون نکال کر چین پوری حویلی سے رابطہ کرنے لگے۔ یہ سیلائٹ فون پاکستان کے ہر حصے میں کارآمد تھا۔ اظہار سے بات کر کے اور اسے شامی کے اغوا کے بارے میں بتا کر نواب صاحب نے فون بند کر دیا۔ ''اظہار بھی آ رہا ہے۔''

''اور دادا جان وہ جو قدوائی صاحب اور ان کی بیٹی آ رہے تھے۔''

''وہ بھی آج شام تک آ جائیں گے۔ حالانکہ ہم نے روکا

تھا لیکن قدوائی بضد تھا اس کے پاس ایک ہاؤنڈ نسل کا کتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ کتے کی مدد سے شامی کا پتا چلایا جا سکتا ہے۔ یہ کتا ایک میل کے فاصلے سے کسی کی بو سونگھ کر اس کا سراغ لگا سکتا ہے۔''

نوشی کے آنے کا سن کر تیمور کو خوشی ہوئی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ شامی کی واپسی تک کا وقت وہ کیسے گزارے گا۔ کہیں مارے بوریت کے وہ مر نہ جائے۔ بہرحال اب اسے امید تھی کہ نوشی کے ساتھ وقت اچھا گزرے گا۔ خاص طور سے شامی کی عدم موجودگی میں۔ اس نے فوری طور پر بے تابی سے ایس ایس قدوائی اور نوشی کا انتظار شروع کر دیا تھا۔ نواب صاحب آرام کرنے اپنے بیڈ روم میں چلے گئے تھے۔ تیمور کو حکم دے کر کہ وہ شمشاد کے ساتھ رہے اور جیسے ہی کوئی نئی بات معلوم ہو انہیں مطلع کرے۔ شمشاد خان اس بچے کا پتا چلانے میں ناکام رہا تھا۔ چوکیدار کے مطابق بچہ سفاری تھا اور شاید چرواہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں چرواہوں والی چھڑی بھی تھی مگر ارد گرد وہ لڑکا نظر نہیں آیا تھا۔ ممکن ہے وہ بچہ کہیں اور سے آیا ہو۔

''تیمور اور شمشاد خان شام تک اس جگہ رہنے والے چرواہوں سے پوچھ گچھ کرتے رہے.... جہاں جیپ پائی گئی تھی۔ یہ چرواہے موسموں کے لحاظ سے اپنی جگہ بدلتے رہتے تھے جب سردی پڑتی تو نیچے وادیوں میں چلے جاتے تھے اور گرمیوں میں پہاڑوں پر آ جاتے۔ یہ چرواہے بھی کوئی دو مہینے پہلے آئے تھے۔ اس مقام سے نزدیک ترین مستقل بستی کوئی ڈیڑھ کلومیٹر کے فاصلے پر تھی اور اس کے مکین اس واردات کے بارے میں بے خبر تھے۔ شام کو وہ تھکے ہارے واپس آئے تو یہ دیکھ کر تیمور کی ساری تھکن اتر گئی کہ نوشی اپنے اماجان کے ساتھ آ چکی تھی۔ ان کے علاوہ دو افراد اور تھے ان کا تعلق ایک سیکورٹی ایجنسی سے تھا لیکن وہ سیکورٹی کے علاوہ بھی بہت کچھ کر سکتے تھے۔ وقار الملک نے شامی کے لکھے خط کی کسی کو ہوا بھی نہیں لگنے دی تھی۔ ایس ایس قدوائی اپنے ساتھ ایک عدد کتا لائے تھا جو شامی کو سونگھ کر تلاش کر سکتا تھا مگر اس کے لیے ضروری تھا کہ شامی اس سے ایک کلومیٹر کے فاصلے پر ہو۔ پہاڑی علاقے کی وجہ سے کتے کی سونگھنے کی حس کمزور پڑ سکتی تھی۔ کیونکہ یہاں پر ہواؤں کا اپنا سسٹم تھا۔

''کیسی ہیں آپ؟'' تیمور نے دریافت کیا۔

''ٹھیک ہوں، شامی کی کوئی خبر ملی؟'' نوشی نے فکر مندی سے پوچھا جو تیمور کو بالکل اچھی نہیں لگی۔

''میرا خیال ہے ٹھیک ہی ہو گا۔ اسے دادا جان کا پوتا ہونے کی وجہ سے اغوا کیا گیا ہے۔'' تیمور روانی میں بک گیا تھا پھر اسے یاد آیا کہ دادا جان نے پرچے والی بات کسی دوسرے کو نہیں بتائی تھی۔ بس چار افراد کے علم میں تھی بلکہ پرچے کی تحریر صرف تین افراد کے علم میں تھی اس لیے وہ محتاط ہو گیا۔

''کیا اسے اغوا کرنے والوں نے رابطہ کیا ہے؟''

''نہیں، ابھی تک تو کسی نے رابطہ نہیں کیا۔ اس سے مجھے شبہ ہوتا ہے کہ شامی خود کسی لڑکی کے چکر میں اس کے ساتھ نکل گیا ہے۔ ورنہ کوئی اتنی دیر اسے برداشت نہیں کر سکتا۔''

نوشی نے پُرملامت نظروں سے اسے دیکھا۔ ''اپنے کزن کے بارے میں آپ کے خیالات افسوس ناک ہیں جہاں تک میں اسے سمجھی ہوں وہ کھلنڈرا ضرور ہے لیکن فلرٹ نہیں۔''

تیمور نے سرد آہ بھری۔ ''افسوس تو مجھے بھی ہے لیکن آپ اسے صرف چند مہینوں سے جانتی ہیں، میں اسے بچپن سے جانتا ہوں۔''

''کل میرا ارادہ ہے کہ بوبی کو لے کر مری کے سارے علاقے میں چکر لگائیں گے۔ شاید کہیں سے خبر مل جائے۔'' نوشی نے اسے آگاہ کیا۔

''یہ حضرت بوبی کون ہیں؟''

''کتا ہے خاص ہاؤنڈ نسل کا ہے۔ سونگھنے میں کوئی دوسرا کتا اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔''

''گویا ہم لوگ کتا لے کر گھومیں گے۔'' تیمور نے ذرا تشویش کے ساتھ کہا۔

''ہم لوگ نہیں صرف میں اور بوبی۔'' نوشی نے تصحیح کی۔ ''یہ ذرا نازک مزاج کتا ہے۔ اجنبی اور نامانوس لوگوں کی موجودگی میں صحیح طریقے سے کام نہیں کر سکے گا۔''

''آپ کا اکیلے جانا صحیح نہیں ہو گا۔'' تیمور جلدی سے بولا۔ ''شامی بھی اکیلا گیا تھا۔''

''مجھے تو کوئی خطرہ نہیں ہے۔ میں اپنی حفاظت کر سکتی ہوں۔'' نوشی نے رکھائی سے کہا۔

☆☆☆

شامی کو ناشتا خاصی تاخیر سے ملا تھا اور اس کی آنتیں ایک بار پھر بل کھا رہی تھیں۔ مری آ کر اسے زیادہ ہی بھوک لگ رہی تھی۔ کھانا اسی لڑکی نے لا کر دیا۔ حسب معمول ڈبل روٹی اور تلا ہوا انڈا تھا۔ البتہ ساتھ میں ایک مگ میں کافی بھی تھی۔ شامی نے اس پر اللہ کا شکر ادا کیا۔ اس نے جلدی جلدی ڈبل روٹی حلق سے اتارتے ہوئے دریافت کیا۔ ''مجھے کب تک تمہاری تحویل میں رہنا پڑے گا۔''

''زیادہ دیر نہیں، ناشتا کر کے تم ایک پرچہ لکھو گے اور اس میں اپنے دادا جان سے کہو گے کہ وہ کل تک مور پکڑ منگوا لیں۔ وہ جہاں کہیں بھی ہے۔ وہ کل شام چھ بجے تک شہباز بسیرا میں ہونا

چاہیے۔"

"مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔" شامی نے ڈبل روٹی ختم کرتے ہوئے کہا "لیکن مجھے امید نہیں ہے دادا جان یہ مطالبہ مانیں گے۔ تمہیں مایوسی ہوگی۔"

"تم اس کی فکر نہ کرو۔" لڑکی نے رکھائی سے کہا۔

"تم نے اب تک اپنا نام نہیں بتایا۔"

"تم مجھے ایکس وائی زیڈ کہہ سکتے ہو۔"

"اس کے بجائے میں تمہیں نیلی کہنا پسند کروں گا۔ تمہیں نیلا رنگ پسند ہے جب سے دیکھ رہا ہوں نیلی قمیص ہی پہن رکھی ہے۔ بائی دے وے یہ بتانا کہ کیا تم شروع سے میری پیچھے تھیں۔"

"گدھے ہو تم ہمارے مطالبے کے بارے میں جان کر بھی ایسا سوال کر رہے ہو۔" لڑکی نے سرد لہجے میں کہا۔ شامی کھسیا گیا۔

"سوری، میرے ذہن سے نکل گیا تھا۔"

لڑکی طنزیہ انداز میں مسکرائی۔ "میں نے دیکھا ہے جب میں تمہارے سامنے آتی ہوں تو تمہارے ذہن سے باقی سب نکل جاتا ہے۔"

"تو اس میں بھی تمہارا قصور ہوا نا!" شامی نے ڈھٹائی سے کہا۔

لڑکی نے اسے کاغذ اور پین دے کر مطلوبہ تحریر لکھوائی اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ اس کے جانے کے بعد شامی کچھ دیر تک صورتِ حال پر غور کرتا رہا۔ اسے معلوم تھا کہ دادا جان ان لوگوں کا مطالبہ مان لیں گے اور مور پنکھ ان کے حوالے کر دیں گے۔ وہ کتنا ہی خائف ہوتا تھا مگر سوال یہ تھا کہ اپنا مطلب حاصل کر لینے کے بعد بھی وہ اس کو رہا کر دیتے؟ شامی لڑکی کو اچھی طرح دیکھ چکا تھا اور اس صورت میں وہ ان کے لیے خطرہ تھا۔ وہ اسے مار کر کسی کھائی میں پھینک سکتے تھے بلکہ غالب امکان تھا وہ یہی کرتے اور مور پنکھ لے کر فرار ہو جاتے۔ شامی نے کئی بار دادا جان کی تجوری میں یہ بیش قیمت نادر نمونہ دیکھا تھا اور دادا جان نے بتایا تھا کہ یورپ یا امریکا میں اس کی قیمت ایک ملین ڈالرز سے زیادہ تھی یعنی کوئی چھ کروڑ روپے۔ مجرموں نے بے حد چالاکی سے مور پنکھ مانگا تھا کیوں کہ نقد رقم طلب کرنا اور پھر اسے سنبھالنا اور خرچ کرنا بے حد مشکل کام تھا۔

شامی نے اوپر روشن دان کی طرف دیکھا۔ اگرچہ وہ اس سے باہر نہیں جا سکتا تھا لیکن روشن دان سے وہ باہر کا منظر دیکھ کر اندازہ کر سکتا تھا کہ فی الحال وہ کہاں ہے۔ آئرن راڈ سے بنے پلنگ پر چڑھ کر کبھی وہ روشن دان تک نہیں جا سکتا تھا لہٰذا اس نے گدا اتار کر ایک طرف رکھ دیا اور بغیر آہٹ کے پلنگ روشن دان کے عین نیچے دیوار کے ساتھ لگا دیا۔ اس کام میں خطرہ تھا۔ توازن بگڑتا اور وہ پلنگ سمیت نیچے آ گرتا۔ کسی نہ کسی طرح اس نے ہاتھ بڑھا کر روشن دان کا کنارہ تھام لیا اور پلنگ کے پائے اس حصے پر پاؤں جماتا روشن دان تک لے آیا۔ شیشے کے پار پہاڑیاں نظر آ رہی تھیں۔

لڑکی نے جس جگہ اس کو تاریک عینک پہنائی تھی وہ شہباز بسیرا سے کوئی پندرہ منٹ کی ڈرائیو کے فاصلے پر تھی اور اس کے بعد بھی لڑکی نے کوئی نصف گھنٹے ڈرائیو کی تھی یعنی وہ شہباز بسیرا سے مزید پندرہ منٹ کی ڈرائیو کے فاصلے پر تھا۔ پہاڑی اتار چڑھاؤ کی وجہ سے یہ فاصلہ تین چار کلومیٹر سے زیادہ نہیں تھا۔ شامی نے بغور دیکھا۔ پہاڑوں پر دور ایک لڑکی نظر آ رہی تھی۔ چند بڑے بنگلے بھی تھے اس کا مطلب تھا کہ وہ آبادی سے زیادہ دور نہیں تھا یہ جگہ بھی اسے کسی بنگلے کا حصہ لگ رہی تھی۔ شامی نے پائے پر اپنا سارا وزن ڈالا ہوا تھا۔ اچانک اسے چرچراہٹ کی آواز آئی اور وہ نیچے کی طرف جھکنے لگا۔ بدحواسی میں شامی نے اس پر سے پاؤں ہٹا لیا اور روشن دان کا کنارہ تھام کر لٹکنے لگا تھا پھر اس نے نیچے چھلانگ لگا دی۔ گرنے سے خاصی آواز پیدا ہوئی تھی۔ اس نے مڑے پاؤں کی پروا کیے بغیر پلنگ پھر اس پر بچھا گدا ڈال دیا اور کمبل تہ کر کے رکھنے لگا اسی لمحے دروازہ کھلا اور لڑکی اندر آئی۔ اس نے مشکوک نظروں سے شامی کی طرف دیکھا۔

"یہ آواز کیسی تھی؟"

"وہ میں گدا جھاڑ رہا تھا۔ کھٹمل ہیں۔ چین سے سونے بھی نہیں دیتے۔" شامی نے سادگی سے وضاحت کی۔ لڑکی کچھ دیر اسے تیز نظروں سے دیکھتی رہی۔

"کوئی غلط حرکت مت کرنا ورنہ وقت سے پہلے مارے جاؤ گے۔" لڑکی یہ کہہ کر چلی گئی۔ اور شامی اس کے جملے پر غور کرتا رہا۔ اس کا کیا مطلب تھا کیا اس کی موت کا وقت طے کر دیا گیا تھا۔ یہ سوچ کر شامی کو اتنی سردی میں بھی پسینے آنے لگے۔

☆☆☆

اس بار پرچہ بڑے پُراسرار انداز میں پہنچا تھا۔ شمشاد خان رات کے دس بجے شہباز بسیرا کے گرد چکر لگانے اور پہرے پر موجود محافظوں کو دیکھنے نکلا تھا کہ اسے لان میں ایک سفید گولا نظر آیا۔ اس نے اٹھایا تو پتھر پر لپٹا پرچہ تھا۔ اس نے پرچہ پتھر سے اتارا محافظوں سے اس بارے میں پوچھنے لگا مگر کسی نے پتھر پھینکنے والے کو نہیں دیکھا تھا۔ یہ کام کرنے والا بے حد ہوشیار تھا۔ شمشاد نے پرچہ فوری طور پر نواب صاحب تک پہنچایا تھا۔ اس بار بھی شامی کی تحریر تھی اور الفاظ اغوا کرنے والوں کے تھے۔

"دادا حضور، اگر آپ میری زندگی چاہتے ہیں تو کل شام تک مور پنکھ منگوا لیں، یہ ان کا مطالبہ ہے۔ باقی ہدایات بعد میں دی جائیں گی۔"

"احمق، الو۔" دادا جان نے رقعہ پڑھ کر شامی کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ اظہار ملک بھی تھے اور باپ کے آگے دم نہیں مار سکتے تھے۔ ان کا دل بیٹے کے لیے تڑپ رہا تھا۔

"اس نے ہمارے خاندان کا نام ڈبو دیا ہے۔ ایک لڑکی کے ہاتھوں اغوا ہو گیا۔"

شمشاد خان چونکا تھا۔ لڑکی کے ہاتھوں لیکن اس کا کیسے علم ہوا نواب صاحب۔

"اس خط کو پڑھو۔ "ان" کا لفظ وہ کسی لڑکی کے لیے لکھ سکتا ہے اور کوئی لڑکی ہی اسے رقعہ لکھنے پر مجبور کرتی ہے اگر سامنے مرد ہوتا تو وہ مر کر بھی نہ لکھتا۔"

"نواب صاحب اب کیا کرنا ہے۔ کیا پولیس کو اطلاع کریں؟" شمشاد خان نے پوچھا۔

نواب صاحب نے بدحواسی سے اسے دیکھا۔ "پولیس کیا کرے گی۔ اب تک اس نے کیا تیر مارا ہے۔ ہمیں لگ رہا ہے اس معاملے میں کوئی کچھ نہیں کر سکے گا۔ ہمیں مجرموں کا مطالبہ پورا کرنا پڑے گا۔" شمشاد خان کل تم اظہار کے ساتھ جاؤ گے اور اظہار تم مور پنکھ لے کر آؤ۔"

"جی بہتر ابا حضور۔"

"کل شام چھ بجے تک۔ بہتر ہے صبح سویرے نکل جانا اور ایک کار مری سے کرائے پر لے لینا تاکہ کوئی مسئلہ نہ ہو۔"

دوسری طرف تیمور کل کی مہم میں نوشی کے ساتھ شامل ہونے کے لیے ہاؤنڈ کتے سے دوستی کی ہر ممکن کوشش کر رہا تھا اور اسے چکر کے گوشت کے بنے کئی کباب کھلا چکا تھا۔ بوبی نے کباب کھا کر ڈکار کے بغیر ہضم بھی کر لیے تھے لیکن شکریے کے طور پر ہلکی سی دم بھی نہیں ہلائی تھی اور نہ ہی تیمور کی طرف توجہ دی تھی۔ تیمور سخت جھنجلایا اس کے پاس کھڑا تھا۔ اچانک عقب سے نوشی کی آواز آئی۔ "بوبی عام کتا نہیں ہے۔ یہ اس طرح کبھی مانوس نہیں ہو گا۔"

تیمور جھنجلا کر بولا "تو پھر کس طرح ہوگا۔"

"آخر آپ اس کے ساتھ مانوس کیوں ہونا چاہتے ہیں۔"

تیمور کے ذہن میں لیلیٰ والی تشبیہ آئی تھی لیکن اس نے زبان سے کہا تھا۔ "مجھے کتے اچھے لگتے ہیں۔"

"اچھا۔" نوشی نے معنی خیز انداز میں کہا۔ "اس سے پہلے آپ نے کبھی کتوں سے اپنا التفات ظاہر نہیں کیا۔"

"دراصل پھپھو صاحبہ کو کتے ناپسند ہیں اس لیے ہم میں سے کوئی کتوں سے اپنی خاندانی محبت نہیں جتاتا ہے۔" تیمور نے کھسیا کر کہا۔ "کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ میں موٹر سائیکل پر آپ کے ساتھ رہوں۔"

نوشی نے سوچا اور بولی۔ "اس پر مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔"

تیمور خوشی سے بے حال ہو گیا۔ "کل صبح کب نکلنا ہے؟"

"سورج نکلنے سے پہلے۔" نوشی نے کہا تو تیمور کی خوشی کافور ہو گئی۔

"اتنی صبح۔"

"ہاں یہ کام صبح کرنا ہے۔ اس وقت سڑکیں صاف ہوتی ہیں۔" نوشی بولی اور اندر چلی گئی۔

☆☆☆

رات کا کھانا حسبِ معمول ڈبل روٹی اور انڈے پر مشتمل تھا جو شامی نے کسی طرح زہر مار کر لیا بہرحال بھوک لگی تھی۔ جب لڑکی ٹرے لے کر چلی گئی تو شامی نے پلنگ کھڑا کر کے اس کا مڑا ہوا پایہ سیدھا کرنے کی کوشش کی اور اس کوشش میں پایہ اس کے ہاتھ میں آ گیا۔ مارے گئے۔ اس نے کراہ کر کہا۔ اب پلنگ پر لیٹنا بھی ممکن نہیں رہا تھا۔ وہ ہلتا اور دیوار سے ٹکراتا تو آواز سے ان لوگوں کو پتا چل جاتا۔ وہ رات فرش پر بھی نہیں گزار سکتا تھا۔ یہ لوہے کا کوئی سوا فٹ لمبا وزنی اور گول پائپ تھا۔ شامی نے اسے ہاتھ میں تولا تو اس کے ذہن میں نیا خیال آیا۔ یہ پائپ اچھا بھلا ہتھیار تھا۔ کسی کے سر پر پڑتا تو اسے پتا چل جاتا۔ شامی نے کسی نہ کسی طرح پائپ کو پلنگ کے نیچے نکالا دیا تھا۔ صبح سے پہلے یہ اس کے لیے بے کار تھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ جب لڑکی آئے گی تو وہ بے حد دکھ کے ساتھ اس کے سر پر پائپ مار کر اسے بے ہوش کرے گا اور یہاں سے فرار ہو جائے گا۔ مگر صبح اس کی آنکھ لڑکی کے جھنجھوڑنے پر کھلی تھی۔ "اب اٹھ جاؤ میں تمہارے باپ کی نوکر لگی ہوں جو ناشتا لے کر تمہارے جاگنے کا انتظار کروں۔"

شامی نے جماہی لی۔ "ظاہر ہے تم میری فرمائش پر تو مجھے اغوا کر کے نہیں لائی تھیں۔" پھر اسے اپنا پلان یاد آیا اور خود کو کوسا اس نے اچھا خاصا موقع گنوا دیا تھا۔ اب وہ اگر لڑکی کے سامنے پائپ نکال کر اس کے سر پر بجانے کی کوشش کرتا اس سے خاصا پہلے وہ اس کے سر میں سوراخ کر چکی ہوتی۔ وہ احتیاط سے بستر سے اٹھا اور باتھ روم کی طرف چل دیا۔ لڑکی وہیں رہی تھی۔ شامی متفکر ہو کر دل ہی دل میں دعا مانگنے لگا کہ وہ بستر پر بیٹھنے کی کوشش نہ کرے۔ عین ممکن تھا کہ اس کا پایا نکل جاتا اور وہ جان جاتی۔ اگرچہ پایہ اتفاقاً نکلا تھا لیکن یہ عین ممکن تھا کہ اسے بھی شامی کی سازش سمجھا جاتا اور لڑکی اسے کوئی سزا دیتی مثلاً اس کا

کھانا بند کر دیا جاتا یا کمرے سے پلنگ نکال دیا جاتا اور اسے فرش پر سونا پڑتا۔ شارٹ ہینڈ میں وہ باتھ روم سے فارغ ہو کر آیا اور جلدی سے پلنگ کے درست والے حصے پر بیٹھ گیا۔ لڑکی اس وقت پستول کا معائنہ کر رہی تھی۔ شامی زیادہ ہی زور سے بیٹھ گیا تھا۔ اچانک اسے محسوس ہوا کہ پایہ نکل رہا ہے اور کسی بھی لمحے زمین پر گر کر اس کا بھانڈا پھوڑ دے گا۔ اس نے ٹرے کی طرف ہاتھ بڑھایا اور جب اس کے اندازے کے مطابق پایہ فرش پر گرنے والا تھا اس نے ٹرے فرش پر گرا دی۔ خوش قسمتی سے پایہ بھی اسی وقت گرا اور اس کی آہنی جھنکار تانبے کی ٹرے کے فرش پر گرنے سے دب گئی۔ لڑکی نے چونک کر دیکھا اور سوچ میں پڑ گئی۔ شاید اس کے کانوں نے دوسری آواز بھی سنی تھی مگر وہ اس کی نوعیت نہیں سمجھ پائی تھی۔

''سوری۔'' شامی نے ذرا جھک کر ٹرے اٹھائی۔ وہ پلنگ سے اٹھنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا ورنہ پلنگ ہلتا اور اس کا راز فاش ہو جاتا۔ شامی نے ناشتا شروع کر دیا۔ اسے دھڑکا لگا تھا کہ کہیں لڑکی پلنگ کے نیچے نہ جھانک لے۔

''کیا بات ہے تم پریشان لگ رہے ہو؟'' لڑکی نے غور سے اسے دیکھا۔

''ہاں ڈیئر' تم نے مطالبے کا رقعہ بھیج دیا ہوگا۔'' شامی نے سرد آہ بھری۔ ''اب مطالبہ منظور ہوتا ہے یا نہیں دونوں صورتوں میں مجھے تم سے جدا ہونا پڑے گا۔''

''اچھا' میں اتنی اچھی لگتی ہوں۔'' وہ معنی خیز انداز میں بولی تو شامی کو پسینے آنے لگے۔ وہ اٹھلا کر اس کے نزدیک چلی آئی ''کتنی اچھی لگتی ہوں۔'' اس نے مطالبہ کرنے والے انداز میں پوچھا مگر شامی اس وقت مطالبہ پورا کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ اس نے تھوک نگلا۔

''بہت اچھی لگتی ہو لیکن ذرا دور ہو کر بات کرو۔''

شامی کو اصل خطرہ یہ تھا کہ کہیں وہ پلنگ پر نہ بیٹھ جائے اس کے بیٹھنے کی صورت میں پلنگ لازمی ہلتا اور اسے ایک عدد پائے کی عدم موجودگی کا پتا چل جاتا۔ وہ ہنسی اور ذرا دور ہو گئی۔ ''تمہارے بارے میں سنا تھا کہ عاشق مزاج ہو لیکن۔''

''میں حسن پرست ہوں لیکن عاشق مزاج نہیں۔'' شامی نے بھنا کر کہا۔ ''یہ افواہ تیمور کے بچے کی اڑائی ہوئی ہے وہ خود کون سا کم ہے۔''

''اس کے بارے میں بھی سنا ہے۔ تمہارے دادا جان تم دونوں کی جوڑی سے بے زار ہیں۔''

''یہی بات تو میں تم سے کہہ رہا تھا کہ وہ اس خاندانی نشانی کو میری خاطر تمہارے حوالے نہیں کریں گے۔ ہاں تم لوگ پانچ چھ لاکھ روپے مانگ لیتے تو شاید وہ غور کرتے۔ اتنا ہی میرا سالانہ خرچ ہے۔''

''تمہاری غلط فہمی ہے' ہمیں مور پنکھ مل جائے گا۔''

شامی نے ناشتا ختم کیا۔ چائے کا مگ میز پر رکھا تھا اس لیے گرنے سے بچ گیا ورنہ اس ظالم حسینہ سے امید نہیں تھی کہ وہ اسے دوسرا مگ لا کر دے۔ اس کے تاثرات سے لگتا تھا کہ اسے تین وقت ریڈ میڈ کھانا لا کر دینا ناگوار گزرتا ہے۔ ناشتے کے برتن لے جانے کے کچھ دیر بعد وہ دوبارہ کمرے میں آئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک اسپرے بوتل تھی۔ اس نے آتے ہی بلا تمہید شامی پر اسپرے شروع کر دیا۔ یہ بے حد بدبودار شے کا اسپرے تھا۔ شامی نے بوکھلا کر اسے روکنا چاہا تو اس نے پستول کا رخ شامی کی طرف کر دیا۔ ''خاموش بیٹھے رہو۔''

''یہ کیا حرکت ہے۔'' شامی جھنجلا گیا۔ ''کیا مجھے اس طرح سزا دے رہی ہو۔''

''یہی سمجھ لو۔ میرا بار بار تمہارے قریب آنے کو دل چاہ رہا تھا اس لیے احتیاطاً اسپرے کر رہی ہوں۔'' ذرا سی دیر میں اس نے شامی کو سر سے پاؤں تک اس بدبودار اسپرے میں نہلا دیا۔ بچا کھچا اسپرے اس نے بستر اور کمبل پر کر دیا تھا۔ شامی کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اسے قتل کر دے۔ وہ بہ مشکل ابکائی روکے ہوئے تھا۔ لڑکی اسپرے کر کے الٹے قدموں واپس چلی گئی تھی۔ اس کے جاتے ہی شامی باتھ روم کی طرف لپکا تھا۔

☆☆☆

تیمور رضا کو صبح سویرے اٹھنا دنیا کا سب سے پُرمشقت اور مشکل کام لگتا تھا مگر نوشی کا ساتھ دینے کے لیے اسے صبح چھ بجے اٹھنا پڑا تھا۔ نوشی کے ساتھ جانے میں ایک وجہ دادا جان بھی تھے اگر وہ گھر میں رہ جاتا تو۔ سارا دن ان کی باتیں سنتا رہتا۔ نوشی اسے بیدار تیار دیکھ کر مسکرائی تھی۔ عجلت میں اس نے ناشتا سمیٹا کیوں کہ نوشی نے صرف دو توس ایک گلاس اورنج جوس اور ایک کپ کافی لی تھی۔ اور صرف پانچ منٹ میں ناشتے سے فارغ ہو گئی تھی۔ ''اب چلو ورنہ میں جا رہی ہوں۔''

تیمور نے مسرت سے ناشتے کی میز پر بچی باقی اشیا کو دیکھا اور نوشی کے پیچھے لپکا۔ اس نے شمشاد خان سے کہا کہ موٹر سائیکل مانگ لی تھی۔ نوشی اپنی کار میں کتے بوبی سمیت ہوتی اور تیمور اس کے پیچھے پیچھے رہتا۔ ''پہلے کہاں جانا ہے؟'' تیمور نے موٹر سائیکل نکالتے ہوئے پوچھا۔

''میرا خیال ہے مری کی طرف چلتے ہیں۔''

''اچھا خیال ہے۔'' تیمور خوش ہو گیا۔ ''مال روڈ پر بھی چلیں گے۔''

''ہم شاپنگ کرنے نہیں جا رہے ہیں۔'' نوشی نے رکھائی سے کہا۔ کتے کا پنجرہ اس نے اگلی نشست پر رکھوا دیا تھا۔ شامی نے بوبی کی قسمت پر رشک کے ساتھ حسد بھی کیا تھا اور موٹر سائیکل اسٹارٹ کر کے نوشی کی کار کے پیچھے روانہ ہو گیا تھا۔ بوبی کو شامی کا ایک استعمال شدہ پاجامہ سنگھایا گیا تھا چند منٹ کے لیے یہ پاجامہ اس کی گردن میں باندھ دیا تھا تاکہ وہ اچھی طرح اس کی بو سے مانوس ہو جائے۔ کار کی کھلی کھڑکی سے بوبی سر نکالے شامی کی بو سونگھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ اس مقام سے گزرے جہاں شامی کی جیپ پائی گئی تھی۔ نوشی نے کار روکی اور بوبی چھلانگ لگا کر زمین سونگھنے لگا تھا۔ نوشی کار سے اتر آئی۔ ''شاید اس جگہ شامی کھڑا ہوا تھا اسے بو مل رہی ہے۔'' اس نے تیمور کو بتایا۔ ''دو دن بعد بھی اسے بو مل رہی ہے۔'' تیمور دنگ رہ گیا۔

''بو اتنی آسانی سے نہیں جاتی ہے اسے سونگھنے والی ناک ہونی چاہیے۔ بوبی کم آن۔ شاباش۔'' اس نے بوبی کی حوصلہ افزائی کی۔ ''تلاش کرو۔ دیکھو۔ بو کس طرف گئی ہے۔ شاباش بوبی۔''

تیمور نے سوچا اگر نوشی نے اتنی حوصلہ افزائی اس کی کی ہوتی تو وہ اب تک خود شامی کو تلاش کر چکا ہوتا۔ بوبی اس طرف منہ اٹھا کر بھونکنے لگا جس طرف سے وہ آئے تھے۔

''میرا خیال ہے شامی کو اغوا کرنے والے اسے اس طرف لے گئے تھے۔'' نوشی نے اشارہ کیا۔

''یعنی مری والا پروگرام کینسل۔'' تیمور مایوسی سے بولا۔

''نہیں' اب اس طرف آ ہی گئے ہیں تو مری تک جائیں گے۔ ممکن ہے راستے میں کوئی اور کلیو مل جائے۔ وہ ایک بار پھر مری کی طرف روانہ ہوئے۔ موسم سرد تھا اور آسمان پر بادل جمع ہو رہے تھے اور بارش کا امکان نظر آ رہا تھا۔ تیمور نے متفکر ہو کر بادلوں کی طرف دیکھا۔ اس نے پیراشوٹ کی ہلکی سی جیکٹ پہن رکھی تھی۔ یہ بوندا باندی سے تو بچا سکتی تھی لیکن بارش میں اس کا حشر نشر ہو جاتا اور ایسا ہی ہوا۔ مری تک جاتے جاتے اچانک موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ یہ جگہ ایسی تھی کہ وہ کہیں رک بھی نہیں سکتے تھے اور تیمور کار میں بیٹھ بھی جاتا تو شمشاد خان کی موٹر سائیکل کہاں چھوڑتا۔ مجبوراً دیر تک بھیگتا رہا۔ مال روڈ پر ایک مناسب جگہ

اگر دیکھتے ہوئے دانت اکھاڑ دینے کا ناکام علاج ہے تو دکھتے ہوئے سر' آنکھ' کان اور ناک کے بارے میں کیا خیال ہے؟

گردہ' مثانہ' پتے کی پتھری' گلٹیوں' رسولیوں' ہائیڈروسیلز' ہرنیا' اپنڈے سائٹس اور ٹانسلز کے

آپریشن کی ضرورت نہیں

شوگر کینکرین سے اب

اعضاء کٹوانے کی ضرورت نہیں

ڈائیلسز اور پیمانائٹس سے خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں

پیدائشی گونگا و بہرہ پن اور آنکھ کا ٹیڑھا پن قابل علاج ہے

چھائیاں' زردہ' چہرہ' عورتوں کے چہرے پر بال' بچوں کا دیر سے چلنا' بولنا' سیکھنا' بستر پر پیشاب کا نکل جانا' شوگر' دمہ' بلڈ پریشر' زنانہ' مردانہ بانجھ پن قابل علاج ہے

گوشت خور جانور کے کاٹے کا علاج مجرب کر کر ایں' پاگل کتے اور سانپ کے کاٹے کا سرشن ایک لاعلاج نہیں

پروفیسر ڈاکٹر نیاز اکمل
ہومیو پیتھک

(میڈیکل آفیسر زرعی ترقیاتی بنک پاکستان)
لوسار ہومیو پیتھک میڈیکل کالج نچاندنی چوک راولپنڈی
سابق لیکچرار فیصل شہید ہومیو پیتھک میڈیکل کالج بہاولپور

فری ہومیو پیتھک کلینک اینڈ ریسرچ سینٹر
ڈی۔ آئی۔ پی سرافہ مارکیٹ چراہ روڈ چوک صادق آباد مسلم ٹاؤن راولپنڈی
موبائل: 0320-4937697 فون: 051-4426447

کار پارک کر کے نوشی رکی تو وہ بھی چھینکتا ہوا کار میں آ بیٹھا۔ وہ سر سے پاؤں تک سرد پانی میں شرابور تھا۔ سامنے موجود ٹھیلے والے سے گرم چائے کا مگ پی کر اس کے ہوش ذرا ٹھکانے آئے تھے۔ ''کیا ہوا بوبی میاں نے راستے میں کوئی اشارہ دیا۔''

''نہیں۔'' نوشی نے کہا۔ اور سامنے گھومتے بچے سے کہا کہ وہ دکان سے ایک تولیا لا دے۔ موقع پا کر تیمور نے خود کو خشک کیا۔

''شکریہ مس نوشی اب واپسی کا کیا کریں۔''

نوشی نے آسمان کی طرف دیکھا۔ ''فی الحال تو بارش رکنے کے آثار نظر نہیں آ رہے ہیں۔ اس لیے اس جگہ رکو۔ بہتر ہے نئے کپڑے لے کر بدل لو۔ جب بارش رکے تو چلے آنا۔''

''ایسا کرتے ہیں بائیک یہیں چھوڑ دیتے ہیں اور میں دوسرے کپڑے پہن کر آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔''

''مرضی ہے تمہاری۔'' نوشی نے شانے ہلائے۔

''تمہارے کزن کا معاملہ ہے اگر بوبی ڈسٹرب ہو گیا تو اپنا کام درست طریقے سے نہیں کر سکے گا۔''

''اچھا۔'' تیمور نے کینہ توز نظروں سے بوبی کی طرف دیکھا۔ ''میں کوئی برساتی بھی لے لیتا ہوں۔''

پندرہ منٹ میں تیمور نے کپڑے لے کر بدلے اور بارش سے بچنے کے لیے ایک برساتی بھی لے لی اور ایک بار پھر نوشی کے تعاقب میں روانہ ہو گیا۔ نوشی احتیاطاً دائیں بائیں نکلنے والی سڑکوں پر بھی کار گھما رہی تھی مگر بوبی نے کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا تھا۔ ایک موقع پر اچانک موٹر سائیکل رک گئی اس کا پیٹرول ختم ہو گیا تھا۔ نوشی کو خاصی دیر بعد احساس ہوا کہ تیمور کی بائیک پیچھے نہیں ہے۔ وہ واپس آئی اور اپنے پاس موجود فاضل پیٹرول کین سے اس کی مدد کی' دوپہر تین بجے تیمور کا بھوک سے برا حال ہونے لگا۔ اس نے ناشتا بھی برائے نام کیا تھا۔ نوشی اپنے لیے دو عدد سینڈوچز بنا کر لائی تھی اور اس نے ڈرائیونگ کے دوران ہی لنچ کر لیا تھا۔ بہ مشکل نوشی اسے ایک بغلی ریستوران میں پہنچنے کے لیے پندرہ منٹ دینے کے لیے رکی تھی۔ شام چار بجے تک وہ واپس شہباز بسیرا کے علاقے میں آ گئے تھے۔

☆☆☆

شامی عام طور سے صنفِ نازک پر غور کرنے سے احتراز کرتا تھا مگر اس وقت وہ گالیاں اگلنے والی مشین بنا ہوا تھا اور ظاہر ہے اس کا ہدف لڑکی تھی اس پر بدبودار اسپرے کرنے کے بعد باتھ روم کا پانی بھی بند کر دیا تھا ورنہ وہ کم از کم ہاتھ ہی دھو لیتا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ لڑکی نے اس کے ساتھ ایسا سلوک کیوں کیا تھا۔ جمالیاتی ذوق کو ٹھیس پہنچانے والی حرکت کی تھی اس لڑکی نے بیڈ کے گرے پوش کی کوئی شے نہیں تھی اور کمبل بھی اسپرے سے بدبودار ہو چکا تھا۔ اس سے منہ صاف کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ شروع شروع میں بدبو سے اس کا دماغ خراب ہو رہا تھا مگر رفتہ رفتہ وہ عادی ہونے لگا۔

ذرا دیر بعد جب اس کا دماغ سوچنے کے قابل ہوا تو اس نے پلنگ کا نکلا پایہ اس کے نیچے سے نکال لیا اور پلنگ کو دیوار کے کونے سے اس طرح لگا دیا کہ وہ کسی صورت نہ ہلنے پائے مگر اس پر دباؤ پڑتا تو وہ دیوار سے سرک جاتا۔ شامی نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ لوہے کا پایہ اس حسینہ کے سر پر رسید کرنے میں اب کسی پس و پیش سے کام نہیں لے گا۔ اس نے بہت مروت دکھائی تھی۔ کوئی مرد اس کے ساتھ ایسا سلوک کرتا تو وہ اس کے ساتھ نہ جانے کیا کر چکا ہوتا مگر لڑکی کو بھی اس کے ردِعمل کی توقع تھی اس لیے وہ دوپہر کے وقت کھانا لے کر اندر نہیں آئی۔ اس نے دروازہ کھول کر ٹرے اندر سرکائی اور دروازہ کھٹ سے بند کر دیا۔ شامی دروازے کی طرف دوڑا۔ ''اے سنو' دروازہ کھولو مجھے پانی چاہیے۔ اب میں باتھ روم بھی نہ جاؤں کیا۔'' اس نے ٹرے اٹھا کر دروازے پر دے ماری۔ ''حرافہ دروازہ کھولو۔ تمہاری تو.....'' لیکن اس کی ساری چیخ و پکار رائیگاں گئی۔۔۔ لڑکی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ٹرے پر پاؤں مارنے سے تلا ہوا انڈا فرش پر بکھر گیا تھا البتہ تھیلی میں ہونے کی وجہ سے ڈبل روٹی محفوظ رہی تھی۔ اپنے جنون کا خاطر خواہ مظاہرہ کر کے شامی نے خالی ڈبل روٹی تھامی۔ اب وہ یہ سوچ رہا تھا اس پر عمل درآمد کرنے کے لیے ذرا حوصلے کی ضرورت تھی۔ اسے معلوم تھا لڑکی اب رات کو آئے گی اور شاید اس وقت بھی وہ کھانے کی ٹرے اسی طرح اندر پہنچا دے اور اندر آنے کی زحمت بھی نہ کرے جب کہ شامی کے پلان پر عمل درآمد کرنے کے لیے اس کا اندر آنا ضروری تھا۔ شامی اپنے اندر ہمت پیدا کرنے لگا۔

☆☆☆

شام تک راولپنڈی سے مور پنکھ لے کر اظہار الملک لوٹ آئے تھے۔ چمڑے اور لکڑی کے بنے خوبصورت بکس میں مور پنکھ رکھا تھا۔ احتیاطاً اظہار الملک سیکورٹی ایجنسی سے گارڈز بھی لائے تھے تاکہ مور پنکھ حفاظت سے یہاں تک لایا جائے۔ تیمور اور نوشی بھی ناکام لوٹ آئے تھے۔ ایس

ایس قدوائی اس نادر شے کو دیکھنے کے لیے بے تاب تھے۔ نواب صاحب نے ان کے سامنے مور پنکھ کیس سے نکالا تو سب کی نظریں اس پر جم کر رہ گئی تھیں۔ اس کے بیش قیمت ہیرے روشنی میں اس طرح چمک رہے تھے کہ مور پنکھ کے آس پاس قوسِ قزح کے رنگ بکھر گئے تھے۔

''خوبصورت۔'' ایس ایس قدوائی کے منہ سے نکلا تھا۔

''نواب صاحب یہ بے حد قیمتی بلکہ انمول ہے۔''

''ہاں۔'' وقار الملک تھکی ہوئی آواز میں بولے ''لیکن ہماری اولاد سے زیادہ قیمتی نہیں ہے۔ اگر بچے کی انگلی کو بھی نقصان ہوا تو ساری دنیا کے ہیرے جواہرات بھی مل کر بھی اس نقصان کو پورا نہیں کر سکیں گے۔''

''کاش مجرم رقم مانگ لیتے۔'' ایس ایس قدوائی نے حسرت سے کہا۔

''ہاں' انہوں نے اپنی پسند کی شے مانگی ہے اور ہم دینے پر مجبور ہیں۔''

شام چھ بجے کے قریب مجرموں کی جانب سے تیسرا رقعہ آن پہنچا تھا۔ اس بار انہوں نے شہباز بسیرا میں دودھ سپلائی کرنے والے لڑکے کو آلۂ کار بنایا تھا۔ اس نے بتایا کہ اسے آتے ہوئے ایک نقاب پوش لڑکی نے روکا تھا اور اسے یہ لفافہ دے کر شہباز بسیرا پہنچانے کو کہا تھا۔ لڑکے نے لفافہ شہباز بسیرا کے چوکیدار کے حوالے کر دیا تھا۔ اس نے لفافہ فوری طور پر اندر پہنچایا۔ شمشاد خان نے دودھ لانے والے لڑکے سے پوری طرح پوچھ گچھ کی اور پھر اسے جانے دیا۔ وہ کئی برس سے دودھ لا رہا تھا اور شمشاد خان اسے ذاتی طور پر جانتا تھا۔ اس لیے اس پر شک کرنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ شمشاد خان نے یہ بند لفافہ فوری طور پر نواب صاحب کو پہنچا دیا تھا۔ لفافے کے اندر سے ایک رقعہ نکلا تھا اس بار شامی کی تحریر کے بجائے اندر سے ایک ٹائپ کیا ہوا کاغذ نکلا تھا اس پر انگریزی میں ہدایات تھیں۔

''نواب صاحب' مور پنکھ شمشاد خان کے ذریعے بھیجا جائے۔ وہ اسے لے کر اپنی موٹر سائیکل پر مری سے مخالف سمت میں روانہ ہو۔ ہمارا آدمی راستے میں روک کر اس سے مور پنکھ لے لے گا۔ شمشاد خان اکیلا آئے اور کوئی اس کے پیچھے نہ آئے اگر ہمارے آدمی کو ذرا سا بھی شک ہوا تو وہ شمشاد خان کے پاس نہیں آئے گا۔ ہمیں مور پنکھ نہیں ملے گا لیکن آپ کا نقصان شدید ترین ہو گا۔ آپ کو آپ کا پوتا واپس نہیں ملے گا۔ اس لیے برائے مہربانی ہدایت پر پوری طرح عمل کریں اور کسی جذباتی حرکت سے گریز کریں۔ آپ کا پوتا مل جائے گا۔ شمشاد خان سات بجے نکلے۔ اگر کوئی گڑبڑ نہ ہوئی تو شامیر رات نو بجے تک آپ کے پاس ہو گا۔''

رقعہ پڑھ کر وقار الملک نے شمشاد خان کی طرف دیکھا۔ ''یہ کام تمہیں کرنا ہے۔''

''مجھے۔'' شمشاد خان گھبرا گیا۔ ''نواب صاحب میں اتنی بڑی ذمے داری نہیں اٹھا سکتا۔''

''شمشاد خان تم ہمارے پرانے نمک خوار ہو اور پھر رقعہ لکھنے والے نے تمہارا نام لے کر یہ کام کرنے کو کہا ہے اگر کوئی اور گیا تو وہ مور پنکھ وصول کرنے نہیں آئے گا۔ سوال ہمارے پوتے کی سلامتی کا ہے۔''

بادلِ ناخواستہ شمشاد خان اس کام پر راضی ہوا تھا۔ اس وقت ساڑھے چھ بجے تھے اور اسے سات بجے نکلنا تھا۔ تیمور اور نوشی باہر آئے۔ ''ہمیں شمشاد خان کا تعاقب کرنا چاہیے۔'' نوشی نے کہا۔

''وہ کس خوشی میں۔'' تیمور نے اعتراض کیا۔ ''جب کہ اغوا کرنے والے نے سختی سے منع کیا ہے۔''

''مجھے اس کی نیت اچھی نہیں لگ رہی ہے۔ تم نے بتایا کہ شامی کو کسی لڑکی نے اغوا کیا ہے اور وہ اس کے سامنے بھی

جسم موٹاپا چہرہ خوبصورت بنائیں
ڈائنا کلک
جسم موٹا اور چہرہ خوبصورت بنانے والی پاکستان کی واحد تسلیم شدہ دوا جسکے استعمال سے ایک دفعہ بڑھنے والا وزن اور حاصل ہونے والی جسمانی خوبصورتی ہمیشہ برقرار رہتی ہے۔ کیونکہ "ڈائنا کلک" مصنوعی اجزاء کی بجائے خالص اجزاء سے تیار کردہ ہے۔ "ڈائنا کلک" ہر عمر کے مرد اور جسم موٹا اور چہرہ خوبصورت بنانے کیلئے بلا خوف و خطر استعمال کر سکتے ہیں۔ "ڈائنا کلک" کے 4 ہفتوں کے استعمال سے جسم کے ہر حصے پر متناسب طریقے سے گوشت میں اضافہ کرتا ہے۔ چہرے کے داغ دھبے، چھائیاں، جھریاں، لکیریں دور کر کے گال بھرے بھرے خوبصورت شاداب بناتا ہے۔ جسمانی کمزوری، خون نہ بننا، خوراک بدن کو نہ لگنا، ایسے امراض کو دور کر کے جسم کو موٹا، طاقتور اور خوبصورت بناتا ہے۔ مکمل طور پر قدرتی اجزاء سے تیار کردہ گلوکوز کیساتھ معجز اثرات سے پاک قدرتی یونانی مرکب "ڈائنا کلک" قیمت 400 روپے (60 کیپسول) جو چار ہفتوں کی مکمل خوراک ہے۔ ایک خط لکھ کر بذریعہ V.P. منگوائیں۔ (نقل کرنے والوں سے ہوشیار رہیں)
DIANA (UANANI) LABORATORIES
P.O. BOX 102 (SHAIGAN) ISLAMABAD

آتی رہتی ہے اور ذرا غور کرو۔ اغوا کرنے والے مغوی سے اپنی شناخت چھپانے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں جب کہ یہ لڑکی شامی کے سامنے آتی ہے اس کا کیا مطلب ہوا؟''

''کہ وہ سرے سے شامی کو رہا کرنے کا ارادہ نہیں رکھتے ہیں۔''

''رائٹ۔ اور وہ اسے ساری عمر قید میں تو رکھ نہیں سکتے اس لیے ان کے لیے مناسب یہی ہوگا کہ شامی سے ہمیشہ کے لیے چھٹکارا حاصل کرلیں۔''

''اسے قتل کردیں گے۔'' تیمور کے منہ سے بے ساختہ نکلا تھا۔

''درست اور اگر اسے بچانا ہے تو ہمیں کچھ نہ کچھ کرنا ہو گا۔''

''لیکن ہم کیا کرسکتے ہیں؟''

''میرے ذہن میں ایک بات آرہی ہے۔'' لوشی سوچتے ہوئے بولی۔ ''رقعے میں شمشاد خان کو مری سے مخالف سمت جانے کو کہا ہے یعنی تاوان وصول کرنے والا اس سڑک پر کہیں ملے گا اگر ہم شمشاد خان سے آگے چلیں تو کسی کو تعاقب کا شبہ نہیں ہوگا۔''

''تجویز اچھی ہے لیکن اول تو اس پر عمل درآمد کی اجازت نہیں ملے گی۔ دوسرے ہم آگے رہے اور پیچھے کسی نے شمشاد خان سے مور پنکھ وصول کرلیا تو ہمیں کیسے پتا چلے گا۔''

''ہم اس سے ذرا آگے رہ کر اس پر نظر رکھیں گے۔ جہاں وہ رکے گا ہم بھی اس سے ذرا آگے رک جائیں گے اور ممکن ہے تاوان وصول کرنے والے کو دیکھ لیں۔''

''مجھے اس کام میں رسک نظر آرہا ہے۔''

''تو تم مت جاؤ میں خود چلی جاتی ہوں۔'' لوشی اپنی کار کی طرف بڑھ گئی۔ بوبی بدستور اس کی فرنٹ سیٹ پر براجمان تھا۔ تیمور اس کے پیچھے لپکا۔

''ارے سنو' میرا یہ مطلب نہیں ہے۔ مجھے شامی کے لیے خطرہ لگ رہا ہے۔''

''شامی ہے ہی خطرے میں۔'' لوشی بولی۔ ''اسے بچانے کے لیے ہمارا ہاتھ پاؤں ہلانا ضروری ہے۔ یہ بتاؤ چل رہے ہو یا نہیں؟''

''کیوں نہیں'' تیمور پچھلی نشست پر بیٹھ گیا ''کیا تمہارا بوبی بھی ساتھ چلے گا؟''

''ہاں'' لوشی نے کار اسٹارٹ کی اور شہباز بسیرا کے مین گیٹ سے نکلتی چلی گئی۔

اندر شمشاد خان کو بریف کیا جارہا تھا کہ اس نے کیوں اور کیسے اس کام کو انجام دینا ہے۔ مور پنکھ کا لیس ایک بیگ میں ڈال دیا گیا تھا اور بیگ شمشاد خان کی گردن میں لٹکا تھا۔ وقار الملک اسے پورچ تک چھوڑنے آئے تھے۔ ''شمشاد خان بہت احتیاط سے کام کرنا..... اغوا کرنے والوں کو کوئی موقع نہ دینا۔''

''آپ فکر نہ کریں نواب صاحب!'' شمشاد خان نے پُراعتماد انداز میں کہا ''انشاء اللہ شامیر صاحب' آج رات تک ہمارے درمیان ہوں گے'' اس نے بائیک کو کک لگائی اور روانہ ہوگیا۔ شام مری کے پہاڑوں پر اتر آئی تھی۔ اس کے جانے کے بعد وقار الملک چونکے تھے۔

''یہ بچے کہاں ہیں؟''

☆☆☆

شامی نے اپنی پتلون سے بیلٹ اتاری اور اس کا بکل نکال کر اس کی پن زور سے اپنے بائیں انگوٹھے میں چبھودی۔ پن انگوٹھے میں گھس گئی اور خون بہنے لگا۔ شامی نے یہ خون اپنی باچھوں پر لگایا اور تھوڑا سا ماتھے پر بھی لگالیا۔ اس کے بعد فرش پر اس زاویے سے لیٹ گیا کہ دروازہ کھلنے پر وہ لازماً لڑکی کو نظر آتا۔ چاہے وہ ذرا سا ہی دروازہ کیوں نہ کھولتی۔ اس نے اپنا دایاں ہاتھ ران کے ساتھ دبا لیا تھا اور اس ہاتھ میں لوہے کا پائپ تھا لڑکی یا آنے والے کو دروازے سے پائپ نظر نہیں آتا بلکہ قریب سے بھی یہ مشکل ہی نظر آتا۔ اب شامی کو فقط انتظار کرنا تھا لیکن یہ فقط انتظار بھی اتنا طویل اور طویل سے زیادہ صبر آزما ہوگا' اس نے سوچا نہیں تھا۔ وقفے وقفے سے اسے جسم کے مختلف حصوں میں کھجلی اٹھتی تھی۔ پھر فرش بھی ٹھنڈا لگنے لگا تھا۔ شام کے سات بج گئے تھے۔ سورج غروب ہوچکا تھا یا ہونے والا تھا۔ دونوں صورتوں میں سردی تیزی سے بڑھ رہی تھی اور فرش اسے باقاعدہ کاٹ رہا تھا۔ اسے بار بار پہلو بدلنا پڑتا تھا۔ جبکہ اسے دروازہ کھلنے پر ایسا تاثر دینا تھا۔ جیسے فرش پر اس کی لاش پڑی ہو لیکن اس صورت میں اسے کون لاش تسلیم کرتا جب کہ وہ اچھا خاصا رقص کررہا تھا اور دل ہی دل میں لڑکی کو برا بھلا کہہ رہا تھا۔ جب انتظار حد سے گزر گیا تو اس نے راست اقدام کیا اور حلق سے ایک زوردار اور پُردرد آواز نکالی۔ اس نے پوری کوشش کی کہ یہ اس کی آخری آواز لگے۔ اس کے بعد وہ منہ اور دیدے کھول کر ساکت لیٹ گیا۔ کچھ دیر بعد دروازے پر ہلکی سی آہٹ ہوئی تو شامی نے سانس تک روک لی تھی۔ لڑکی نے دروازہ کھولا اور اسے فرش پر پڑے دیکھ کر تیزی سے اندر آئی تھی۔

''مائی گاڈ! یہ کیا ہوا؟'' اس نے کہا اور شامی کی طرف جھکی تھی کہ اس نے عجلت میں لڑکی پر وار کردیا۔ وہ بھانپ کر

پھرتی سے ہٹی اور شامی کا وار خالی گیا طرفہ تماشا یہ کہ وہ بالکل اس کے پاس کھڑی تھی۔ شامی نے دونوں پاؤں اس کے ٹخنوں پر مارے اور وہ لڑکھڑا کر اس پر گری۔ شامی نے فوری طور پر اسے دبوچ لیا' وہ کراہی ''خبیث.....!''

''اور اپنے بارے میں کیا خیال ہے؟'' شامی نے اپنی گرفت مضبوط کرتے ہوئے لڑکی کو نیچے دبانے کی کوشش کی۔ اسے خطرہ تھا کہ کہیں لڑکی پستول نہ نکال لے۔ اس خوف کی وجہ سے اسے فی الحال یہ احساس ہی نہیں تھا کہ وہ ایک بے حد خوبصورت لڑکی سے جونک کی طرح چمٹا ہوا ہے۔ دوسری طرف لڑکی کی ہر ممکن کوشش تھی کہ وہ کسی طرح اپنی کمر سے بندھا پستول نکال لے۔ وہ بری طرح مچل رہی تھی اور شامی کے لیے اس پر قابو رکھنا دشوار ہوتا جارہا تھا۔ اچانک لڑکی نے کسی خوں خوار بلی کی طرح اس کے شانے پر منہ مارا اور شامی بلبلا گیا۔ وہ اس کی بوٹی نکالنے کی کوشش کررہی تھی۔ شامی نے ہاتھوں سے اسے جکڑا ہوا تھا۔ وہ جھٹکے دے کر شانہ چھڑانے کی کوشش کرنے لگا۔ ساتھ ہی وہ مناسب الفاظ میں لڑکی کو برا بھلا کہہ رہا تھا۔ ایک بار اس نے شانے کو جھٹکا دیا تو لڑکی کا سر فرش سے ٹکرایا تھا۔ لڑکی کے منہ سے کراہ نکلی تھی اور اس کے دانتوں کی گرفت بھی ڈھیلی ہوئی تھی۔ شامی نے دوسری بار زیادہ زور سے اس کا سر فرش سے مارا اور پھر لگاتار مارتا ہی چلا گیا۔ چند سیکنڈ میں لڑکی کے ہاتھ پیر ڈھیلے پڑ گئے تھے۔ جب اس نے مزاحمت اور مچلنا بند کردیا تو شامی نے ہانپتے ہوئے اسے چھوڑا اور اپنا شانہ تھام کر کھڑا ہوگیا۔ لڑکی نے اتنی زور سے کاٹا تھا کہ دانت شانے میں اتر گئے تھے اور وہاں سے خون رس رہا تھا۔ اچانک اس کی نظر لڑکی کے ہاتھ پر پڑی جو رفتہ رفتہ اپنی پتلی سی کمر سے بندھے پستول کی طرف جارہا تھا اور چند ہی انچ کے فاصلے پر رہ گیا تھا۔ جیسے ہی شامی کی نظر اس پر پڑی' لڑکی کو بھی احساس ہوگیا کہ شامی نے اسے دیکھ لیا ہے' اس نے پھرتی سے پستول نکالنے کی کوشش کی اور اس وقت شامی نے لات چلائی۔ لڑکی نے پستول نکال لیا تھا لیکن شامی کی لات سے وہ اس سے ہاتھ سے نکل کر بستر کے نیچے چلا گیا۔ اس بار شامی نے خواتین کے لیے اپنے دل میں موجود تمام مروت بالائے طاق رکھتے ہوئے دوسری ٹھوکر اس کے سر پر ماری اور لڑکی چیخ مار کر بے ہوش ہوگئی۔

اس ساری کش مکش کے دوران میں خاصا شور شرابا اور ہنگامہ ہوا تھا۔ شامی اور لڑکی دونوں نے چیخیں ماری تھیں مگر لڑکی نے کسی کو آواز نہیں دی تھی حالانکہ اس کا منہ آزاد تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ لڑکی اس جگہ اکیلی تھی۔ پھر بھی احتیاطاً شامی نے لوہے کا پائپ اٹھالیا تھا کہ کسی سے مڈبھیڑ ہوجائے اور اس کے کام آئے۔ شامی دروازے سے باہر نکلا۔ آگے بھی کمرا تھا اور اس سے آگے بھی کمرا ہی تھا۔ یکے بعد دیگرے کئی کمروں سے گزرتا ہوا وہ بالآخر ایک وسیع و عریض کوٹھی کے برآمدے تک آنے میں کامیاب رہا۔ رات تقریباً ہوچکی تھی اور افق پر معمولی سی روشنی برقرار تھی۔ شامی نے ایک شخص کو برآمدے کے آگے سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آتے دیکھا اور جیسے منجمد ہوگیا تھا۔ وہ شخص بھی اسے دیکھ کر حیران رہ گیا تھا پھر اس نے پستول نکال لیا ''اندر چلو برخوردار!''

☆☆☆

لوشی نے کار تقریباً ایک فرلانگ کے فاصلے پر روک لی تھی۔ یہاں سے شہباز بسیرا کے سامنے سے گزرنے والی سڑک کو صاف دیکھا جاسکتا تھا۔ ''اب ہم یہاں انتظار کریں گے جیسے ہی شمشاد زمان نکلے گا' ہم آگے روانہ ہوجائیں گے۔ اس کی رفتار کی مناسبت سے آگے سفر کریں گے۔ یہ تمہارا کام ہوگا کہ عقب میں اس پر نظر رکھو اور مجھے بتاؤ کہ وہ اب کتنے فاصلے پر ہے۔''

آپ بھی بھرپور طاقت کے مالک بنیئے طبی دنیا میں کامیاب اور لاجواب نسخہ

مرد حضرات ہی پڑھیں۔

برسوں سے ہمارے ماہر طب خصوصاً ایسے مریضوں کے لیے جو اپنی ناسمجھی کی بنا پر بیک وقت امراض میں مبتلا ہو کر طرح طرح کے علاج سے مایوس ہوگئے تھے انکے لیے اپنے تجربے و تحقیقات انتھک محنت لگن اور کاوشوں سے ایسا نسخہ تیار کرنے میں کامیاب ہوگئے جس نے کئی ناکارہ بوڑھوں کو بہت کم دنوں میں جوان مرد بنا دیا اور مایوس گئے گزرے کمزور نوجوان ایک ایک ہفتے آزما کر یہ ثابت کردکھایا کہ یہ جو ہر واقعی بے نظیر کامیاب چشمہ ہے آپکی خدمت میں پیش کرتے ہوئے فخر محسوس کررہے ہیں کہ اس کے استعمال سے جسم میں نیا اور تازہ خون پیدا ہونے لگتا ہے چہرے پر سرخی آتی ہے پیروں میں چستی توانائی ظاہر کرکے صحت کو قابل رشک بنا دیتا ہے اور آپکو وہ تمام خوشیاں میسر ہوجاتی جنکے لیے آپ ایک مدت سے محروم رہے ہیں آج ہی ایک خط اپنی مکمل کیفیت لکھ کر جوابی لفافے کے ہمراہ ہمیں روانہ کریں آپکو یہ نسخہ فوراً روانہ کردیا جائے گا۔

حکیم اینڈ سنز
پوسٹ بکس نمبر 2159 کراچی 74600 پاکستان

''او کے!'' تیمور پیچھے کی طرف منہ کر کے بیٹھ گیا۔ ٹھیک سات بجے اسے موٹر سائیکل کی ہیڈ لائٹس کی روشنی سڑک پر آتی نظر آئی ''چلو..... وہ آ رہا ہے'' تیمور نے اضطراب سے کہا اور نوشی نے کار آگے بڑھا دی۔

تیمور عقب میں دیکھ رہا تھا۔ ''ہاں' نظر آ رہا ہے..... اب نہیں نظر آ رہا..... ہاں' ٹھیک ہے اسی رفتار سے چلتی رہو۔''

''خدا کے لیے چپ رہو'' نوشی نے تنگ آ کر کہا ''مجھے بھی عقبی آئینے میں یہ سب نظر آ رہا ہے۔''

''تم نے کہا تھا' پیچھے نظر رکھوں'' تیمور خفا ہو گیا ''اب نہیں بولوں گا۔''

نوشی نے سکون کا سانس لیا۔ کچھ دیر بعد اسے احساس ہوا کہ عقبی آئینے میں موٹر سائیکل کی روشنی نظر آنا بند ہو گئی ہے۔ اس نے بریک لگائی ''یہ شمشاد خان کہاں رک گیا؟''

''مجھے کیا پتا'' تیمور کا منہ بدستور پھولا ہوا تھا۔

نوشی نے مڑ کر دیکھا۔ سڑک کئی مقامات سے بل کھا رہی تھی اور اسے کہیں پر بھی موٹر سائیکل کی روشنی نظر نہیں آ رہی تھی ''وہ واپس تو نہیں چلا گیا؟''

''شمشاد خان کو سفر کرنا تھا' جب تک اسے کوئی روک نہ لیتا'' تیمور نے جواب دیا۔

''اس کا مطلب ہے اسے کسی نے روک لیا ہے'' نوشی نے تشویش سے کہا اور کار موڑنے کی کوشش کرنے لگی۔ سڑک اس مقام سے خاصی تنگ تھی اور اس نے بہ مشکل کئی مراحل میں کار کو ریورس کیا تھا۔ اچانک بوبی جواب تک بردباری سے چپ بیٹھا تھا۔ بھونکنے لگا اور وہ بھی بے حد جوش و خروش سے۔ اس کا منہ کھڑکی سے نکلا ہوا تھا۔

''شاید اسے شامی کی بو مل رہی ہے۔''

''یہ کتا ہی نکما ہے'' تیمور ابھی تک خفا تھا ''اگر شامی کو اغوا کرنے والوں نے نہلانے نہیں دیا ہے تو اس کی بو پورے مری میں کسی بھی جگہ سے محسوس کی جا سکتی تھی۔''

''خبردار' جو تم نے بوبی کے خلاف ایک لفظ کہا'' نوشی غرائی اور بوبی بدستور بھونکے جا رہا تھا۔

''اسے تو چپ کراؤ'' تیمور نے عاجز آ کے کہا ''ورنہ تاوان وصول کرنے والا ہوشیار ہو جائے گا۔''

نوشی نے سر ہلا کر بوبی سے کہا ''کوائٹ بوبی!''

اور بوبی بھونکنا بند کر کے صرف ہلکی سی اف اف کرنے لگا۔ کچھ بعد دیگرے نوشی نے کئی موڑ کاٹے لیکن شمشاد خان کہیں نظر نہیں آیا۔ اگر وہ واپس گیا ہوتا تو دور سڑک پر اس کی موٹر سائیکل کی روشنی تو نظر آتی۔ ''کیا تاوان لینے والا شمشاد خان کو بھی لے گیا ہے؟'' تیمور نے سوال کیا۔

''احمقانہ باتیں مت کرو۔ اسے لے جا سکتے ہیں' اس کی بائیک کو نہیں۔''

''اس سڑک سے کہیں اور جانے کا راستہ بھی نہیں ہے۔''

''اور یہ جو دائیں بائیں بند راستے ہیں؟'' نوشی نے پوچھا۔

''یہ اوپر نیچے واقع کوٹھیوں کی طرف جاتے ہیں۔ ہر ایک یہی ہے۔''

''ممکن ہے شمشاد خان ان راستوں میں سے کسی راستے پر گیا ہو'' نوشی نے رائے دی۔

''لیکن ہمیں کیسے پتا چلے گا اور سوال یہ ہے کہ اسے ایسا کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ جب کہ اسے صراط مستقیم پر سفر کرنے کی ہدایت تھی۔''

بوبی جو اب تک سامنے دیکھ کر اف اف کر رہا تھا' اچانک اس نے کھڑکی سے منہ نکالا اور ایک پہاڑی کی طرف دیکھ کر بھونکنے لگا۔ ''اسے بو مل رہی ہے'' نوشی چلائی ''یہ شامی اس پہاڑی کے اوپر ہے' کیا اوپر کی طرف جانے کا کوئی راستہ ہے؟''

''ہاں' ذرا آگے ہے'' تیمور یادداشت پر زور دے کر بولا ''لیکن کیا تمہیں یقین ہے کہ.....''

''ہاں' اس کے بھونکنے کا انداز بتا رہا ہے کہ اسے بو مل رہی ہے۔ مجھے یقین ہے شامی اس پہاڑی پر ہی ہے۔''

''تو بوبی اب تک چپ کیوں تھا؟'' تیمور نے اعتراض کیا۔

''ممکن ہے شامی کسی ایسی جگہ قید ہو جہاں سے اس کی بو باہر نہ آ رہی ہو اور اب وہ کھلی فضا میں ہو اور بوبی کو اس کی بو مل گئی ہو' یہی راستہ ہے نا؟'' اس نے بل کھا کر پہاڑ کے اوپر کی طرف جاتے راستے کی طرف اشارہ کیا۔

''ہاں' یہی ہے'' تیمور نے سر ہلایا تو نوشی نے کار اس راستے پر ڈال دی۔ پتھروں کی مدد سے بنتہ کیا ہوا راستہ ظاہر ڈھلان نظر آنے کے باوجود زیادہ مشکل نہیں تھا۔ کار آرام سے اوپر چڑھتی چلی گئی۔ نیچے سے مختصر نظر آنے والی پہاڑی اوپر سے خاصی کشادہ ثابت ہوئی تھی اور اس پر کوئی درجن بھر سے زیادہ کوٹھیاں اور کاٹیجز پھیلے ہوئے تھے۔ نوشی نے کار ایک کاٹیج کے سامنے روک دی جو ویران نظر آ رہا تھا۔ بوبی کی بھونک نوشی کی ہدایت پر ایک بار پھر اف اف میں بدل گئی تھی۔ کار سے اتر کر نوشی نے بوبی کو بھی اتار لیا تھا ''اب یہ ہمیں وہاں لے جائے گا' جہاں شامی ہے۔''

☆☆☆

شامی دم بہ خود سا اندر آیا تھا۔ پستول سے زیادہ اچانک ہونے والے شاک نے اسے مفلوج کر دیا تھا۔ اس وجہ سے وہ بے چون و چرا کیے اندر آ گیا ورنہ وہ مزاحمت کرتا تو شاید شمشاد خان کھلی جگہ پر فائر کرنے کا خطرہ مول نہ لیتا۔ شامی کے لڑکھڑاتے لہجے میں کہا ''مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی۔ شمشاد بھائی..... تم بھی ان کے ساتھی نکلے' نمک حرام!''

''میں ساتھی نہیں ہوں'' شمشاد خان نے اسے اندر کی طرف دھکیلا ''یہ منصوبہ میرا بنایا ہوا ہے۔''

''تت..... تم'' شامی ایک بار پھر بھونچکا رہ گیا۔

''ظاہر ہے' ورنہ کسی باہر کے آدمی کو مور پنکھ کے بارے میں کیا معلوم۔'' وہ مسکرایا اور اچانک تیور بدل کر بولا ''یہ بتاؤ' باہر کیسے نکلے..... اور شاہانہ کہاں ہے؟''

''کون شاہانہ؟'' شامی نے پوچھا تو شمشاد خان نے ایک پستول والا ہاتھ اس کے منہ پر مارا اور شامی کے چودہ طبق روشن ہو گئے تھے۔ وہ چکرا کر زمین پر گر پڑا اور رفتہ رفتہ اس کا ذہن تاریکی میں ڈوبنے لگا۔ اس کی طرف سے مطمئن ہو کر شمشاد خان اندر آیا۔ جہاں شاہانہ فرش پر پڑی گہرے گہرے سانس لے رہی تھی۔ زمین سے سر ٹکرانے سے اس کا پھٹ گیا تھا۔ شمشاد نے جلدی سے اسے سہارا دے کر اٹھایا۔

''شاہانہ! تم ٹھیک ہو نا؟''

''ہاں..... وہ حرامی مجھے دھوکے سے مار کر نکل گیا'' شاہانہ نے ڈولتے لہجے میں کہا۔

''اس کی فکر نہ کرو۔ تم ادھر بستر پر آ جاؤ'' شمشاد نے اسے سہارا دے کر لٹایا اور بھاگ کر اس کے لیے پانی لے آیا۔ پانی پی کر شاہانہ کے حواس بحال ہوئے تو اس نے شمشاد کو ساری کہانی سنائی کہ شامی نے کس طرح اس پر غلبہ پا لیا تھا۔ شمشاد نے اس کا شانہ تھپکا ''فکر نہ کرو' باہر بے ہوش پڑا ہوا شامی اسے ٹھکانے لگا کر واپس جا رہا ہوں۔''

''اور مور پنکھ؟'' شاہانہ بے تابی سے بولی تھی۔

''اس میں ہے'' شمشاد نے بیگ سے مور پنکھ والا کیس نکالا۔ شاہانہ کی باچھیں کھل گئی تھیں۔ اس نے جھپٹ کر کیس سے مور پنکھ نکالا اور والہانہ انداز میں اسے چومنے لگی۔

''بس' اب اسے احتیاط سے رکھو اور کل صبح ہوتے ہی نکل چلیں جانا..... میں کچھ عرصے میں آ جاؤں گا۔''

''میری خاطر تم ملازمت چھوڑ دو گے'' شاہانہ نے عجیب سے لہجے میں پوچھا۔

''تمہاری خاطر ملازمت کیا' میں بیوی بچے اور اپنا ملک بھی چھوڑ دوں گا۔ ہم یورپ یا امریکا کے کسی ملک میں ٹھاٹ سے رہیں گے۔''

''اب تم جاؤ' ایسا نہ ہو کسی کو تم پر ہی شک ہو جائے'' شاہانہ نے کہا تو شمشاد کھڑا ہو گیا۔

''ہاں..... لیکن پہلے اسے ٹھکانے لگانا ہے'' اس کا اشارہ شامی کی طرف تھا۔ وہ باہر آیا جہاں شامی بدستور بے سدھ پڑا ہوا تھا۔ ''مجھے افسوس ہے چھوٹے نواب صاحب!'' اس نے استہزائیہ انداز میں کہا اور پستول کا رخ شامی کی طرف کر دیا۔

☆☆☆

''بوبی! خاموشی سے چلنا ہے' شاباش..... ہماری رہنمائی کرو'' نوشی نے کتے سے کہا تو وہ سعادت مندی سے سر ہلا کر آگے چلنے لگا۔ بوبی انہیں سیدھا ایک وسیع احاطے والی کوٹھی میں لے گیا۔ اس کوٹھی کا مین گیٹ ذرا سا کھلا تھا۔ انہوں نے اندر جھانکا تو ان دونوں کی باچھیں کھلی تھیں۔ احاطے میں موٹر سائیکل کھڑی تھی۔ برآمدے کی جانب سے آنے والی ہلکی روشنی میں انہیں شمشاد کی موٹر سائیکل شناخت کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ نوشی نے آہستہ سے کہا ''مجھے شمشاد خان مشکوک لگ رہا ہے۔ اس کی بائیک یہاں کیا کر رہی ہے؟''

''تم رکو' میں اندر دیکھ کر آتا ہوں'' تیمور نے جرأت کا مظاہرہ کیا ''اگر میں پھنس جاؤں تو تم فوراً واپس جا کر مدد لانا۔''

''میں تب کیوں جاؤں' ابھی جاتی ہوں'' نوشی بولی ''لیکن خدا کے لیے کوئی جذباتی قدم نہ اٹھانا۔ کہیں تم بھی غائب ہو جاؤ'' نوشی کہتی ہوئی بوبی کے ساتھ واپس چلی گئی تھی۔

تیمور محتاط قدموں سے اندر آیا۔ کوٹھی کا احاطہ خالی اور خاموش تھا لیکن برآمدے اور اندر کی روشنیاں ظاہر کر رہی تھیں کہ وہاں لوگ تھے۔ کہیں دور جنریٹر چلنے کی مدھم آواز آ رہی تھی۔ تیمور سیڑھیاں چڑھ کر برآمدے میں آیا۔ اس کا دل شدت سے دھڑک رہا تھا اور اسے رہ رہ کر شامی پر غصہ آ رہا تھا۔ اگر کہیں سے اچانک کوئی مسلح فرد نکل آتا تو اس کی جواں مرگی کی ساری ذمے داری شامی پر عائد ہوتی یا کسی حد تک نوشی اس کی ذمے دار ہوتی جو اسے یہاں لائی تھی اور وہ بالکل نہتا تھا۔ اچانک اسے اندر سے شمشاد کے بولنے کی آواز آئی۔

تیمور نے کھلے دروازے والے کمرے میں جھانکا' یہ خالی تھا۔ شمشاد خان کی آواز اندر سے آرہی تھی۔ وہ دوسرے کھلے دروازے کی طرف بڑھا۔ اندر جھانکنے پر اسے سب سے پہلے شمشاد خان نظر آیا۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھا۔ پھر اس کی نظر فرش پر بے سدھ پڑے شامی پر گئی۔ شمشاد اس سے مخاطب تھا اور اس کے الفاظ بتا رہے تھے کہ وہ شامی کو قتل کرنے جا رہا تھا پھر تیمور نے پستول کا رخ شامی کی طرف ہوتے دیکھا تو اس کے جسم میں سنسنی کی لہری دوڑ گئی تھی۔ وہ بے ساختہ آگے بڑھا اور اس نے عقب سے شمشاد خان کو ٹکر ماری اور اسے لیتا ہوا فرش پر جا گرا۔ شمشاد کے ہاتھ سے پستول نکل گیا تھا۔ اس نے تڑپ کر تیمور کو خود پر سے اچھال دیا۔ تیمور دوبارہ اس کی طرف جھپٹا۔ مگر شمشاد خان سنبھل گیا تھا۔ اس نے بائیں ہاتھ سے لگاتار دو گھونسے تیمور کے منہ پر رسید کیے اور وہ دوبارہ فرش پر جا گرا۔ اس کا رخسار پھٹ گیا تھا اور منہ میں بھی خون کا ذائقہ محسوس ہو رہا تھا۔ مگر اس وقت چوٹوں کے بجائے اس کی توجہ شمشاد خان کی طرف تھی جو پستول کی جانب لپک رہا تھا اور یہی اس کی غلطی تھی۔ تیمور کو شامی کے پاس ایک پائپ پڑا نظر آیا۔ اس نے پائپ اٹھایا اور اندھا دھند اسے گھماتا شمشاد خان کی طرف لپکا۔ شمشاد خان پستول اٹھا کر سیدھا ہوا تھا کہ پائپ عقب سے آ کر اس کی دائیں آنکھ پر لگا۔ وہ حلق پھاڑ کر چلایا۔ فوراً ہی اس کی مضروب آنکھ سے خون کے قطرے بہہ نکلے تھے۔ تیمور نے دوسرا وار اس کے سر پر کیا اور شمشاد خان زمین بوس ہو گیا۔ تیمور نے جلدی سے پستول اس کے ہاتھ سے لے لیا اور پائپ ایک طرف پھینک دیا۔ وہ شامی کی طرف لپکا اور اسے ہلا ہلا کر آوازیں دینے لگا..... اس کا چہرہ ایک طرف سے سوجا ہوا تھا۔ بہر حال وہ ہوش میں آ رہا تھا۔ تیمور نے پیار سے اس کا چہرہ سہلایا "شامی! میری جان..... اٹھو....."

"تیمور کے بچے! تو جہنم میں بھی آ گیا" شامی نے آنکھیں کھول کر کراہ کر کہا۔

"وہاں تو اپنے اعمال کے سبب بعد میں سزا بھگتنے کو جائے گا فی الحال دادا جان کو بھگتنے کے لیے تیار رہ..... تیری خاطر انہیں اپنا خاندانی نادر نمونہ تاوان کے طور پر دینا پڑا۔"

اس بار شامی کو پوری طرح ہوش آ گیا۔ اس نے شمشاد کو بے سدھ پڑے دیکھا اور ایک دوسرے کو معلومات فراہم کرنے میں دس پندرہ قیمتی منٹ ضائع کیے اور جب مور پنکھ کا خیال آیا تو سب سے پہلے وہ شمشاد خان کی طرف لپکے لیکن اس کا بیگ خالی تھا۔ "تیمور مور پنکھ اس حرافہ کے پاس ہے جو مری میں مجھے ملی تھی۔" شامی کے بتانے پر تیمور پوری سرگرمی سے شاہانہ کو تلاش کرنے لگا۔ کوٹھی بڑی سہی لیکن دس منٹ میں انہوں نے اس کا چپا چپا چھان مارا تھا مگر نہ تو شاہانہ ملی اور نہ مور پنکھ..... ذاتی طور پر ان دونوں کو شاہانہ کے نہ ملنے کا افسوس تھا۔

"کاش..... کہ وہ ایک بار ہاتھ آ جاتی" شامی نے حسرت سے کہا "میں اس پر بھی وہی اسپرے کرتا۔"

"تیرے پاس سے اب بھی گندی سی بو آ رہی ہے" تیمور نے ناک سکیڑی۔

"یہ تو کچھ بھی نہیں ہے' جب اس نے اسپرے کیا تو میرا دماغ پھٹنے لگا تھا۔"

"اس وجہ سے بو بی تجھے تلاش نہیں کر پا رہا تھا۔" تیمور نے سر ہلا کر کہا' اس سے پہلے کہ شامی اس سے بو بی کے بارے میں دریافت کرتا' کوٹھی کے احاطے میں کئی گاڑیاں آ کر رکی تھیں۔

☆☆☆

"شمشاد خان کا کہنا ہے کہ اسے شاہانہ نامی لڑکی نے اس کام کے لیے ورغلایا تھا" ایس پی وقار الملک کو رپورٹ دے رہا تھا شامی' تیمور اور نوشی بھی وہاں موجود تھے۔

"بکواس کرتا ہے وہ اس نے میرے سامنے اعتراف کیا تھا کہ اس نے وہ سارا پلان بنایا ہے" شامی بولا۔

"شاہانہ کا نام لے کر وہ اپنی جان بچانے کی کوشش کر رہا ہے۔"

"اور جب میں نے شمشاد کو دیکھا تو وہ شامی کو قتل کرنے جا رہا تھا" تیمور نے بتایا "اگر اس کے ہاتھ میں پستول رہتا تو وہ شامی کے ساتھ مجھے بھی قتل کر دیتا۔"

"اور ہماری بہت سارے مسائل سے جان چھوٹ جاتی" وقار الملک نے زیر لب اتنی آہستگی سے کہا کہ ان کے پاس کھڑے تیمور' شامی اور نوشی ہی سن سکے تھے۔ پھر وہ ایس پی سے بولے "اس لڑکی کی گرفتاری کے لیے پولیس کیا کر رہی ہے؟ مور پنکھ اس کے ہی پاس ہے۔"

"میں یہی بیان کرنے جا رہا ہوں" ایس پی بولا "شمشاد خان سے حاصل کردہ معلومات کی روشنی میں اس کی گرفتاری کے لیے کوشش جاری ہے۔"

شمشاد خان نے پولیس کے چھترول کی تاب نہ لاتے ہوئے ساری کہانی اگل دی تھی۔ شاہانہ اس سے ایک سال پہلے مری میں ملی تھی۔ وہ سیاحوں کو دھوکے سے لوٹ کر اپنا گزارہ کرتی تھی۔ اسے نہ جانے شمشاد خان میں کیا نظر آیا کہ اس کے ساتھ ہو گئی۔ شمشاد نے اسے رہائش فراہم کی تھی اس کو پیسے بھی دیتا تھا۔ شاہانہ اسے پسند آ گئی تھی لیکن وہ اس کو پیشہ نہیں تھا اور شاہانہ اسے اکساتی تھی کہ وہ ایک ہی بار ہاتھ مار کر اس کے ساتھ بیرون ملک نکل جائے مگر شمشاد سے ٹالتا رہتا تھا۔ ایک بار اتفاق سے شمشاد کے منہ سے نکلا کہ سامنے مور پنکھ کے بارے میں نکل گیا کہ یہ بیش قیمت نادر نمونہ اس کے پاس ہے۔ شاہانہ اس کے پیچھے پڑ گئی کہ انہیں یہ چرا کر ملک سے بھاگ جانا چاہیے۔ اس کے پاس حسن کی طاقت تھی اور ذہانت کی بھی کمی نہیں تھی۔ اس نے بالآخر شمشاد خان کو قائل کر لیا تھا۔ سارا منصوبہ اس نے بنایا اور شمشاد خان کو اس پر عمل درآمد کا طریقہ بھی سمجھایا۔ شمشاد نے اس پر کامیابی سے عمل بھی کیا لیکن اپنی بدقسمتی سے پھنس گیا' اسے اندازہ نہیں تھا کہ تیمور اور نوشی اس سے آگے کراس پر نظر رکھے ہوئے ہیں۔

شمشاد خان کو خوش قسمتی سے یہ کوٹھی مل گئی تھی۔ اس کے جاننے والے نے خریدی تھی اور وہ اسے نئے سرے سے بنوانا چاہتا تھا۔ اس نے کوٹھی شمشاد خان کے حوالے کر دی تھی شمشاد خان نے اسے شامی کو چھپا کر رکھنے کے لیے استعمال کیا تھا۔ شمشاد نے دعویٰ کیا کہ اس کا شامی کو قتل کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا بلکہ مور پنکھ حاصل کرنے کے بعد وہ اسے بے ہوش کر پٹی باندھ کر سڑک پر چھوڑ دیتے مگر تیمور نے اسے اپنی آنکھوں سے شامی کو قتل کرنے کی کوشش کرتے دیکھا تھا۔ شمشاد نے کوشش کی تھی کہ جرم کا ملبا مفرور ساتھی شاہانہ پر ڈال دے۔ مور پنکھ بھی اس کے پاس تھا اور وہ غائب تھی۔

"اب تک تو وہ لڑکی ملک سے باہر جا چکی ہوگی" وقار الملک نے ایس پی سے کہا "پولیس اسے روکنے کے لیے کیا کر رہی ہے؟"

"ہمارے پاس اس لڑکی کا کوئی ریکارڈ نہیں ہے' صرف حلیے اس کی مدد سے ہم اسے ملک سے باہر جانے سے نہیں روک سکتے' نہ جانے شاہانہ بھی اصل نام ہے یا نہیں؟"

"بہتر ہوگا' اس بارے میں مری پولیس سے معلوم کریں۔ وہ خاصے عرصے سے وہاں مجرمانہ سرگرمیوں میں مصروف رہی تھی۔ ظاہر ہے پولیس سے تعاون کے بغیر اس کا پتا کیسے چلتا ہوگا" وقار الملک کے لہجے میں موجود طنز محسوس کر کے ایس پی کھسیا گیا' اس نے اپنی ٹوپی اور چھڑی اٹھائی۔

"نواب صاحب' جیسے ہی کوئی پیش رفت ہوگی' میں آپ کو مطلع کروں گا۔"

"اگر وہ لڑکی مل جائے اور اس کے پاس سے مور پنکھ بھی برآمد ہو جائے تو ضرور زحمت کیجیے گا۔ ورنہ یہ زحمت بھی کرنے کی ضرورت نہیں ہے" نواب صاحب بھی کھڑے ہو گئے تھے۔

ایس پی کے جانے کے بعد نواب صاحب ان کی طرف متوجہ ہوئے۔ شامی اور تیمور دونوں مرہم پٹی کروا چکے تھے مگر دادا جان کے ہاتھوں انہیں اپنی خیریت مشکوک لگ رہی تھی مگر خلاف توقع انہوں نے نرمی سے ان کی طبیعتوں کے بارے میں پوچھا اور تسلی دی۔ شامی نے ڈرتے ڈرتے دادا جان سے دریافت کیا۔

"دادا جان! کیا آپ کو مور پنکھ جانے کا دکھ نہیں ہے؟"

"دکھ کیسا..... مور پنکھ پہلے ہی ہم دے چکے ہیں" وہ مسکرائے۔

"دے چکے ہیں" وہ تینوں دنگ رہ گئے تھے "کب..... کس کو..... کیوں دادا جان؟"

"قبلہ والد بزرگوار کی وصیت تھی کہ اس نادر شے کو صرف انتہائی ضرورت کے وقت استعمال کیا جائے۔ چند سال پہلے ہمارے ملک نے یورپ کے ایک ملک سے جدید آبدوزوں کا سودا کیا تھا۔ جس ادارے سے یہ سودا ہوا تھا اس کا مالک اس فرانسیسی فن کار کا بیٹا تھا جس نے قبلہ والد کو مور پنکھ بنا کر تحفے میں پیش کیا تھا۔ جب آبدوزوں کی ٹیکنالوجی کا معاہدہ ہونے لگا تو فرانسیسی فنکار کے بیٹے نے اپنے باپ کے بنائے فن پارے کی واپسی کی شرط ہماری حکومت کو پیش کر دی۔ حکومت نے ہم سے رابطہ کر کے یہ فن پارہ منہ مانگے داموں لینے کی پیش کش کی۔"

"تو وہ آپ نے حکومت کو بیچ دیا تھا" شامی جلد بازی سے بولا۔

نواب صاحب نے اسے قہرناک نظروں سے گھورا اور گرج کر بولے "تم ہمیں یعنی نواب وقار الملک کو ایسا شخص سمجھتے ہو جو اپنے ملک کے لیے ذرا بھی ایثار نہ کر سکے۔ ہم نے خود وہ مور پنکھ اس فرانسیسی فنکار کے بیٹے کو تحفے میں دیا اور اس نے نہ صرف ٹیکنالوجی کے معاہدے پر دستخط کر دیے بلکہ ہمیں مور پنکھ کا ایک مصنوعی جواہرات والا نمونہ بھی بنا کر تحفے میں دیا۔ وہ تو ہمیں مور پنکھ کی قیمت بھی دینا چاہ رہا تھا لیکن ہم اس کی قیمت کیسے لیتے..... نالائق' گدھے..... تم نے ایسا سوچا بھی کیسے؟"

کمرے میں وقار الملک گرج رہے تھے اور وہ دم سادھے سن رہے تھے۔

تحیر

منظر امام

زندگی کے بارے میں ہر شخص کا نظریہ مختلف ہوتا ہے ۔۔۔ ہر شخص کوئی نہ کوئی طلب و خواہش ضرور رکھتا ہے ۔۔۔ کسی کو دولت حاصل کرنے کا شوق ہوتا ہے ۔۔۔ محبت کو پانے کا عزم ۔۔۔ طاقت ور بننے کا جنون ۔۔۔ مشہور ہوجانے کی آرزو ۔۔۔ ایسے ہی کرداروں کے گرد گھومتی داستانِ تحیر جو کسی نہ کسی جذبے کے اسیر تھے۔

طاقت کے نشے میں چور بدمستوں کی کارروائیاں جو ہر جگہ اپنا اختیار چاہتے تھے

انور کمال واقعی باکمال فنکار تھا۔ اس کی انگلیاں جادو جگایا کرتیں۔ اس وقت بھی ایک عورت اس کے سامنے بیٹھی ہوئی تھی اور کچھ پولیس والے بھی موجود تھے۔ ان ہی میں اس کا دوست ایس پی برکی بھی تھا۔ وہی اس عورت کو انور کمال کے پاس لے کر آیا تھا۔

''پیارے' آج پھر تمہارا امتحان ہے'' برکی نے انور کمال سے کہا پھر اس عورت کی طرف اشارہ کیا ''یہ ہیں بیگم مجید' انہوں نے اس ڈاکو کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔''

''وہ کم بخت میرے شوہر کو پستول کے زور پر کمرے سے باہر لے آیا تھا'' بیگم مجید نے بتایا ''اور انہیں واش روم میں بند کردیا جبکہ میں اس دوران میں اس کے سامنے رہی تھی۔''

''تو پھر آپ نے اسے غور سے دیکھا ہوگا؟''

''ہاں' بہت غور سے۔''

انور کمال نے برش اور رنگ سنبھال لیے۔ کینوس پر اس نے پنسل رکھی اور بیگم مجید سے سوال کیا ''اب بتائیں' اس ڈاکو کا چہرہ گول تھا یا لمبوترا؟''

''گول تھا'' بیگم مجید نے جواب دیا۔

''بالکل درست۔''

انور کمال کی ماہر انگلیاں کینوس پر اسکیچ بناتی جارہی تھیں۔ درمیان میں وہ بیگم مجید سے کچھ پوچھ بھی لیتا تھا۔ ٹھیک پندرہ منٹ کے بعد اس نے کینوس سامنے کردیا۔

اس تصویر کو دیکھ کر بیگم مجید کی آنکھیں پھٹی رہ گئیں تھیں ''خدا کی قسم! یہ بالکل وہی ہے' بالکل وہی ہے۔ ذرا سا بھی فرق نہیں ہے۔''

''صاحب! یہ تو راٹھور ہے'' ایک سارجنٹ نے ایس پی برکی سے کہا۔

''ہاں' میں نے بھی پہچان لیا ہے'' برکی مسکرادیا پھر انور کمال سے مخاطب ہوا ''میرے دوست' تم نے ایک بار پھر ہماری مشکل آسان کردی۔ تمہارا ہنر واقعی ہمارے کام آرہا ہے۔''

''لیکن اس میں میرے دماغ کی چولیں ہل کر رہ جاتی ہیں'' انور کمال نے کہا ''تم لوگ تو اپنا کام کرا کے چلے جاتے ہو لیکن جو مجھ پر گزرتی ہے' وہ بتا نہیں سکتا۔''

''یہ تو واقعی بہت کمال کا فن ہے'' بیگم مجید نے کہا ''میرا خیال ہے کہ کیمرے سے بھی اتنی صاف تصویر نہیں آسکتی تھی۔''

وہ سب لوگ انور کمال کا شکریہ ادا کرکے چلے گئے۔

انور کمال نے یہ ہنر ریل کے ایک سفر میں سیکھا تھا۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب وہ کراچی سے لاہور جارہا تھا۔ اس کا ارادہ این سی اے میں داخلہ لینے کا تھا۔

پاکستان کا سب سے بڑا آرٹ کالج۔ جہاں کی دیواریں تک آرٹ کا نمونہ تھیں۔ اس نے بی اے کرلیا تھا لیکن اس کا رجحان آرٹ کی طرف تھا۔ کراچی میں اس نے ابتدائی تعلیم حاصل کرلی تھی لیکن آرٹ میں بہتر مستقبل کے لیے اس کا لاہور جانا ضروری تھا۔

اس زمانے میں درخشاں اس کے ساتھ ہوا کرتی تھی۔

ایک خوبصورت اور طرح دار لڑکی جس کی زلفوں کے سائے کبھی کبھی انور کمال کے شانوں پر بکھر کر رہ جاتے اور اس کی راتیں اور سانسیں معطر ہوجایا کرتیں۔

وہ انور کمال کی طرح آرٹ کی دلدادہ نہیں تھی بلکہ انور کمال کو سمجھاتی رہتی تھی ''یار! یہ بتاؤ' یہ تمہارا آرٹ تمہارا کیا پیٹ بھرے گا؟''

''اس ملک میں بے شمار آرٹسٹ ہیں جن کی تصویریں ہزاروں اور لاکھوں میں فروخت ہوتی ہیں۔''

''بالکل درست.....! لیکن وہ ہیں کتنے' ان کی تعداد نے میں نمک کے برابر ہے'' درخشاں کہتی ''اور یہ وہ آرٹسٹ ہیں جن کی اپنی بہت مضبوط لابی ہے۔ اس کے علاوہ اس قسم کا ٹ بننے کے لیے بہت سرمائے کی ضرورت ہوتی ہے اور بیک گراؤنڈ ایسا ہونا چاہیے جو کہیں کئی برسوں تک سپورٹ کرسکے۔''

درخشاں کی باتیں اپنی جگہ بالکل درست تھیں۔ اس کے باوجود انور کمال پر جنون سوار ہوگیا تھا کہ وہ این سی اے سے ل فیلڈ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرے گا۔ اس نے اپنے گھر والوں سے پیسے مانگے' دوستوں سے مانگے اور تھوڑے بہت پیسے لے کر لاہور کے لیے روانہ ہوگیا۔

لاہور روانگی سے دو دن پہلے درخشاں نے اسے ایک بری خبر سنائی ''جانو! میرے گھر والے تمہارے اس شوق سے بہت نالاں ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اگر درخشاں کی شادی اس سے ہوگئی تو درخشاں بھوکی مرے گی۔''

''بکواس کرتے ہیں وہ!''

''تمہارے کہنے سے کیا ہوتا ہے لیکن ان کے سامنے تو حقائق ہیں'' درخشاں نے کہا ''اس ملک میں آرٹ کی قدر ہی کیا ہے۔''

''تو پھر کیا چاہتے ہیں وہ؟''

''انہوں نے میری شادی کہیں اور کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔''

''کیسے ہوسکتا ہے تم میری محبت ہو۔ کیا انہیں یہ نہیں معلوم کہ ہم برسوں سے ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں؟''

''انہیں سب معلوم ہے لیکن مصیبت یہ ہے کہ اس معاشرے میں آرٹ کی طرح محبت کی بھی کوئی قیمت نہیں ہے'' درخشاں نے کہا ''زندگی کچھ اور ہے اور وہ بہت تلخ ہوتی ہے۔''

انور کمال نے فوری طور پر لاہور جانے کا ارادہ ملتوی کردیا تھا۔ وہ درخشاں کے گھر پہنچ گیا۔ اس نے درخشاں کے گھر والوں سے بات کی لیکن وہ کسی طرح بھی اس کی بات سننے کے لیے تیار نہیں تھے۔ وہ انور کمال سے بہت مایوس ہوچکے تھے اور انہیں اپنی درخشاں بہت عزیز تھی۔

انور کمال جانتا تھا کہ اب اس کے شور کرنے اور احتجاج کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ درخشاں انور کمال سے بے پناہ محبت کرتی تھی۔ اس کے باوجود اس کی تربیت ایسی ہوئی تھی کہ وہ کسی طرح بھی انور کمال کا ساتھ نہیں دیتی۔

ایسا کبھی ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ وہ خاموشی سے انور کمال کو اپنا لے۔ لہٰذا اس کی شادی طے... ہوگئی اور نکاح بھی ہوگیا۔ انور کمال سوائے اپنے سر کو ٹکرانے کے اور کچھ نہیں کرسکا تھا۔ ایک بار پھر دنیا کے بازار میں چاہت بیوپار بن گئی۔

کئی دنوں تک سوگ میں ڈوبے رہنے کے بعد اس نے ایک فیصلہ کرلیا۔ اب وہ ہر حال میں ایک بڑا اور مشہور آرٹسٹ بن کر دکھائے گا۔ محبت کی ناکامی اس کے لیے مہمیز ثابت ہوئی تھی۔

اور عام طور پر ایسا ہی ہوتا ہے۔

محبت کی ناکامی یا تو تباہ کردیتی ہے یا پھر انسان کمال کو چھو لیتا ہے۔ انور کمال نے کمال کو چھو لینے کا ارادہ کرلیا تھا۔ اس نے ایک بار پھر رختِ سفر باندھا اور ایک بار پھر لاہور کے لیے روانہ ہوگیا۔

اور ٹرین کے ڈبے میں اس کی ملاقات ایک بہت بڑے آدمی سے ہوگئی۔ وہ ایک ادھیڑ عمر باوقار سا آدمی تھا۔ سفید کرتے اور پاجامے میں وہ مٹتی ہوئی تہذیب کا نمائندہ دکھائی دے رہا تھا۔

اس کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک تھی۔ جب وہ کسی پر اپنی نگاہیں مرکوز کردیتا تو دیکھنے والوں کو محسوس ہوتا جیسے اس کی نگاہیں براہِ راست اس کے دل میں اترنے لگی ہوں۔

انور کمال کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔ ہرے بھرے کھیت اور ان کے درمیان پہاڑ جیسی زندگی گزارنے والے لوگ۔

''برخوردار! کہاں کا ارادہ ہے؟'' اس کی آواز نے انور کمال کو چونکا دیا تھا۔

''جناب! لاہور جارہا ہوں۔'' انور کمال نے بتایا۔

''رہائش کیا کراچی میں ہے یا لاہور میں؟'' دوسرا سوال کیا گیا۔

''کراچی میں' لاہور این سی اے میں داخلے کے لیے جارہا ہوں۔'' انور کمال نے بتایا۔

''اوہ' اس کا مطلب یہ ہوا کہ آرٹس وغیرہ سے دلچسپی ہے؟''

''جی ہاں۔''

''کس میڈیم میں کام کرتے ہو؟''

اس وقت انور کمال چونک اٹھا تھا۔ ان صاحب نے خالصتاً پروفیشنل لینگویج استعمال کی تھی۔ اس نے بتانا شروع کیا۔ وہ صاحب بہت دلچسپی سے اس کی باتیں سنتے رہے۔ انور کمال نے ان کو اپنے بارے میں سب کچھ بتادیا تھا۔ اپنی محبت' درخشاں کا حال اور محبت ختم ہوجانے کے اسباب۔ اس نے اس شخص کو نہ جانے کیا سمجھ کر ان کو سب کچھ بتادیا تھا۔

''برخوردار! لوگوں کے خدشات بالکل درست ہیں'' ان صاحب نے کہا ''یہ معاشرہ ہی ایسا ہے۔ یہاں آرٹ وغیرہ کی قدر نہیں کی جاتی اور خاص طور پر اس کے لیے تو بہت پریشانیاں ہیں جو آرٹ کو اپنا روزگار بنانا چاہتا ہے۔''

''جی ہاں اور میرا بھی یہی مقصد ہے'' انور کمال نے جواب دیا ''شوق تو اپنی جگہ ہے لیکن میں کمرشلی بھی کامیاب ہونا چاہتا ہوں۔''

''چلو پھر میں تم کو ایک بات بتاتا ہوں'' ان صاحب نے کہا ''یہ ہنر زندگی بھر تمہارے کام آئے گا اور تم مجھے دعائیں دو گے۔'' انہوں نے اپنے بیگ سے سفید کاغذ کی ایک شیٹ اور ایک پنسل نکال لی ''تم نے جس سے محبت کی ہے' ذرا اسے اپنے دھیان میں لاؤ۔''

''وہ کیوں جناب؟''

''تم اسے دھیان میں لاؤ تو سہی اور میرے دو تین سوالوں کے جواب دیتے جاؤ۔''

انور کمال درخشاں کو اپنے دھیان میں لے آیا تھا۔ ان صاحب نے انور سے صرف تین سوالات کیے تھے اس دوران میں ان کی انگلیاں کاغذ پر چلتی رہی تھیں۔ کچھ دیر بعد انہوں نے وہ کاغذ انور کمال کے سامنے رکھ دیا ''یہی تمہاری محبت ہے نا؟''

انور کمال اس تصویر کو دیکھ کر اچھل پڑا۔ ہو بہو درخشاں۔ جیسے اس شخص نے درخشاں کی بلیک اینڈ وائٹ تصویر اتار کر سامنے رکھ دی ہو۔

''یہ..... یہ تو کمال ہو گیا جناب!'' انور کمال کی آواز لرز رہی تھی ''یہ..... یہ ہنر.....''

''یہ میں تمہیں سکھا سکتا ہوں'' ان صاحب نے کہا ''اسی سفر کے دوران۔ اور میرا خیال ہے کہ تم اگر کراچی واپس جا کر اسی کی پریکٹس جاری رکھو تو وہ سب کچھ حاصل کر لو گے جس کے لیے تم اتنی محنت کرنا چاہتے ہو۔''

''ارے صاحب! یہ آپ کا احسان ہو گا'' انور کمال نے ان کا ہاتھ تھام لیا۔ ''میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ مصوری کا ایک پہلو ایسا بھی ہو سکتا ہے۔''

''چلو' قلم کاغذ سنبھالو۔ میں تمہیں اس کا سبق دینا شروع کرتا ہوں۔''

اور واقعی' لاہور تک پہنچتے پہنچتے انور کمال کو یہ ہنر آ گیا تھا۔ ان صاحب نے قریب بیٹھے ہوئے دو تین مسافروں پر پریکٹس بھی کروائی تھی۔ انور کمال کو زندگی گزارنے اور شہرت حاصل کرنے کا ایک راستہ مل گیا تھا۔

اس نے آرٹ کی مزید تعلیم کا ارادہ ترک کر دیا اور واپسی کی ریل سے کراچی آ گیا تھا۔ کراچی آ کر اس نے اپنی پریکٹس شروع کر دی اور بہت کم عرصے میں اس نے وہ سب کچھ حاصل کر لیا جس کی اسے خواہش تھی لیکن اس کی درخشاں اب اس کے پاس نہیں تھی' وہ اپنے پیا کے گھر جا چکی تھی۔

☆☆☆

روبینہ نام تھا اس لڑکی کا جو ایک بہت قیمتی گاڑی سے اتر کر سپر اسٹور کی طرف بڑھ گئی تھی۔

وہ اس وقت اکیلی نہیں تھی بلکہ دو عدد خطرناک صورت محافظ بھی اس کے ساتھ تھے۔ ان دونوں کے شانوں سے کلاشن لٹکی ہوئی تھی اور وہ کچھ فاصلے سے چل رہے تھے۔

ظاہر تھا کہ اس لڑکی کو کوئی خاص اہمیت حاصل ہے اور اس کا تعلق کسی ایسے ہی طاقت ور گھرانے سے ہے۔ وہ بہت خوبصورت تھی' آہستہ آہستہ دلوں کو تباہ کرتا ہوا حسن۔

اس پر اس کی خوبصورت ڈریسنگ اور اس کے چلنے کے انداز کے ساتھ ساتھ اس کی شاندار گاڑی اور محافظوں کی موجودگی نے اسے دوسروں سے بالکل الگ کر دیا تھا۔

بہت ممکن تھا کہ راہ چلتے ہوئے کچھ نوجوانوں نے اسے دیکھ کر ٹھنڈی سانسیں بھی لی ہوں لیکن اس سے زیادہ ان کی ہمت نہیں ہو سکی تھی۔ روبینہ سپر اسٹور کے اندر داخل ہو رہی تھی کہ ایک نوجوان سے ٹکرا گئی۔ اس نوجوان کے ہاتھ میں [illegible] پیکٹس تھے۔ جو اس کی ٹکر سے گر گئے۔ اس وقت [illegible] دونوں محافظ اس سے کچھ فاصلے پر تھے۔

روبینہ آگے بڑھنے لگی تھی کہ اس نوجوان نے آواز دے کر اسے روک لیا ''محترمہ! یہ درست ہے کہ آپ [illegible] میں مبتلا ہیں لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ آپ [illegible] بغیر آگے بڑھ جائیں۔''

''میں نے کبھی ایکسکیوز کرنا نہیں سیکھا'' [illegible]

''اور میں نے کسی کو کبھی اس طرح نہیں جانے دیا [illegible] مجھے اپنی غلطی کو نہ ماننے والے بھی اچھے نہیں لگتے۔''

''جانتے ہو میں کون ہوں؟''

''وہ تو آپ کے ساتھ نظر آنے والے دو رضاکار [illegible] ثابت کر رہے ہیں کہ آپ کوئی اونچی چیز ہیں' اس نوجوان نے کہا۔

''کیا اس کے باوجود تمہیں ڈر نہیں لگا؟''

''کس بات کا ڈر؟'' نوجوان مسکرا دیا ''وہ بے چارے حکم کے غلام میرا کیا بگاڑ لیں گے۔ بہرحال اس وقت [illegible] آپ کو جانے دے رہا ہوں۔''

''کیا ڈر گئے؟''

''نہیں محترمہ! میں نے ڈرنا تو سیکھا ہی نہیں [illegible]'' نوجوان نے کہا ''بات صرف اتنی ہے کہ آپ مجھے اچھی لگی ہیں اور یاد رکھیں۔ میں نے آپ کو پسند کر لیا ہے۔''

روبینہ اس نوجوان کی جرأت اور ہمت پر حیران رہ گئی۔ اتنی دیر میں اس نوجوان نے اپنے پیکٹ اٹھائے اور مسکراتا ہوا ایک طرف روانہ ہو گیا۔ اس دوران میں وہ دونوں محافظ بھی قریب آ چکے تھے۔ ان کی نگاہیں سوالیہ انداز سے روبینہ کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ روبینہ نے انہیں کچھ نہیں بتایا تھا۔ وہ انہیں نظر انداز کرتی ہوئی اسٹور میں داخل ہو گئی۔

شاپنگ میں بھی اس کا دل نہیں لگ رہا تھا۔ [illegible] نوجوان اس کی نگاہوں کے سامنے آ کر کھڑا ہو جاتا۔ [illegible] تیکھے تیور اور اپنی جرأت کے ساتھ۔ اتنا ہی نہیں [illegible] خوبصورت بھی تھا پھر اس کی باتیں۔ روبینہ نے ایسی باتیں [illegible] نہیں سنی تھیں یا تو اس کا احترام کیا جاتا یا لوگ اس سے [illegible] کرتے۔ اس کے قریب ہونے اور اس انداز سے [illegible] کرنے کی ہمت کسی نے نہیں کی ہو گی۔

اس نے بے دھیانی کے عالم میں دو چار چیزیں [illegible] اور اپنی گاڑی... میں آ کر بیٹھ گئی۔ اس کے بیٹھتے ہی [illegible] نے گاڑی چلا دی تھی جبکہ اس کے دونوں محافظ پیچھے والی گاڑی [illegible]

تھے۔

اچانک روبینہ کو وہ نوجوان دکھائی دے گیا۔

وہ ایک بائیک پر تھا اور یقینی طور پر روبینہ کی گاڑی کا تعاقب ہی کر رہا تھا۔ روبینہ کو اس کی ہمت اور جرأت پر اور بھی حیرت ہونے لگی۔ اگر وہ چاہتی تو گاڑی رکوا کر محافظوں کو اشارہ کرتی اور وہ اس کے ٹکڑے کر دیتے۔

لیکن روبینہ کو اس کی یہ بہادری خود بھی بہت اچھی لگی تھی۔

ایک بار اس نوجوان نے اس کی گاڑی کے قریب اپنی بائیک لا کر اس کی طرف دیکھ کر آہستہ سے ہاتھ ہلایا اور اس کی بائیک فراٹے کے ساتھ آگے چلی گئی۔ غیر ارادی طور پر روبینہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی تھی۔

کچھ دیر کے سفر کے بعد گاڑی ایک شاندار کوٹھی کے احاطے میں داخل ہو گئی۔ وہ بائیک دکھائی تو نہیں دے رہی تھی لیکن نہ جانے کیوں روبینہ کو یقین تھا کہ وہ نوجوان اس کا تعاقب کرتے ہوئے یہاں تک ضرور پہنچ گیا ہو گا۔

وہ ابھی گاڑی سے اتر کر اپنے کمرے کی طرف جا ہی رہی تھی کہ ایک ملازم نے اس کو روک کر کہا ''مس' چیف نے آپ کو یاد کیا ہے۔''

''کہاں ہیں اس وقت؟''

''لاؤنج میں بیٹھے ہیں'' اس نے بتایا۔

''او کے' تم چلو میں آتی ہوں۔''

پندرہ منٹ کے اندر وہ کپڑے تبدیل کر کے لاؤنج میں آ چکی تھی۔ لاؤنج کے وسط میں ایک شاندار صوفے پر وہ بیٹھا تھا جسے چیف کہا گیا تھا۔

وہ ایک دیوہیکل ادھیڑ عمر کا باوقار سا آدمی تھا۔ اس کے قدموں کے پاس ڈوبرمین کا ایک خونخوار کتا بیٹھا تھا جو روبینہ کو دیکھتے ہی لپک کر اس کے پاس آ گیا۔ روبینہ نے اسے تھپتھپا کر ایک طرف بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔ وہ اپنی دم ہلاتا ہوا ایک طرف جا کر بیٹھ گیا۔

''ہیلو سوئٹ ہارٹ!'' اس نے روبینہ کو مخاطب کیا ''آج کہاں کہاں ہو آئیں؟''

''کہیں نہیں بابا! بس مارکیٹ گئی تھی اور وہاں سے واپس آ گئی'' روبینہ نے کہا۔

''تمہارے لیے ایک کام نکل آیا ہے'' اس نے کہا ''اور میں اس معاملے میں تمہارے علاوہ اور کسی پر بھروسا نہیں کر سکتا۔''

''جانتی ہوں بابا! بس اس کا نام پتا بتا دیں۔''

''ایسے نہیں' ہم اپنی سوئٹ ہارٹ کو اس طرح تو اس کے پاس نہیں جانے دیں گے'' چیف نے کہا ''کل رات کو ہم نے اس کے لیے ایک پارٹی ارینج کی ہے۔ اس پارٹی میں تم اس سے ملو گی' ایک آفر کے ساتھ۔''

''اور پھر میرا کام شروع ہو جائے گا۔''

''اوہ مائی بے بی'' چیف نے اس کے گال پر تھپکی دی ''اب جاؤ' آرام کرو۔''

روبینہ اپنے شاندار کمرے میں آ گئی۔ کمرے میں آنے کے بعد اس نے دروازہ بند کیا اور بستر پر لیٹ گئی۔ اس وقت اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ یہ بے بسی کے آنسو تھے۔ اپنی توہین کے احساس کے آنسو تھے۔

اچانک اس کے موبائل کی گھنٹی بج اٹھی۔ اس نے موبائل کی طرف دیکھا۔ یہ کوئی نیا نمبر تھا۔ اس نے حیران ہو کر موبائل اپنے کان سے لگا لیا تھا۔

''آداب'' دوسری طرف سے کسی کی آواز آئی ''آپ نے مجھے پہچانا نہیں ہو گا؟''

''کون ہو تم؟''

''میں وہ ہوں' جس سے اگر غلطی ہو جائے تو وہ فوراً ایکسکیوز کر لیتا ہے'' دوسری طرف سے آواز آئی۔

''تم.....'' روبینہ نے اس کی آواز پہچان لی تھی ''تم کو میرا موبائل فون نمبر کیسے معلوم ہوا؟''

''تلاش کرنے والے سب کچھ معلوم کر لیتے ہیں۔''

''تو پھر تم کو یہ بھی معلوم ہو گیا ہو گا کہ میں کون ہوں؟''

''اسی لیے تو اور بھی زیادہ پسند کرنے لگا ہوں۔''

روبینہ کو نہ جانے کیوں اس کی باتیں اچھی لگ رہی تھیں۔ اسے اس نوجوان پر غصہ نہیں آ رہا تھا۔ شاید زندگی میں پہلی بار کوئی ایسا ملا تھا۔ جس نے روبینہ کے اندر ہلچل مچا دی تھی۔

☆☆☆

اس نے ایک بار کسی سے عشق کیا تھا۔ پھر وہ اسی کا ہو کر رہ گیا۔ وہ عشق بھی شاید یک طرفہ ہی تھا۔ وہ لڑکی اسے دکھائی دی۔ وہ کالج جانے کے لیے بس اسٹاپ پر کھڑی تھی۔ اس لڑکی میں ایسی کوئی بات نہیں تھی کہ کوئی اس کی خوشنودی کی خاطر اپنے آپ کو برباد کر دے۔ لیکن عشق تو اسی کا نام ہے۔ کامران نے ایک پھول والے کی دکان سے گلاب کے دو پھول خریدے اور لڑکی کے برابر سے گزرتے ہوئے اس نے وہ پھول اس کے قدموں میں رکھ دیے۔

بس اس نے اتنا ہی کیا تھا۔ وہ پھول رکھ کر آگے بڑھ

گیا۔ اس لڑکی کے ساتھ کھڑی ہوئی اس کی کالج کی سہیلیاں بھی حیران ہو کر یہ ماجرا دیکھتی رہی تھیں۔

اس لڑکی کا یہ حال ہو گیا تھا جیسے وہ زمین میں گڑ جانے والی ہو۔ شرمندگی کے احساس نے اسے اپنی گرفت میں لے لیا تھا ''یہ کیا ماجرا ہے نائلہ!'' اس کی دوستوں نے دریافت کیا ''کون تھا یہ آدمی؟''

''میں اسے نہیں جانتی'' نائلہ نے بتایا ''یہ ایک بار پہلے بھی ایسی حرکت کر چکا ہے۔ میں اس وقت بازار میں امی کے ساتھ شاپنگ کر رہی تھی کہ یہ سامنے سے آیا اور اس نے آج کی طرح میرے قدموں میں پھول رکھ دیے۔''

''کیا اس کے سوا کوئی اور حرکت نہیں کی؟''

''نہیں' وہ تو میری طرف دیکھتا بھی نہیں ہے'' نائلہ نے بتایا ''اس بار بھی اس نے پھول رکھے اور سیدھا چلا گیا اور آج بھی ایسا ہی ہوا ہے۔''

''بے چارہ ..... اپنی دیوی کے چرنوں میں پھول کی بھینٹ چڑھاتا ہے'' کسی دوست نے تبصرہ کیا۔

''کچھ بھی ہو' مجھے تو الجھن ہوتی ہے نا'' نائلہ نے کہا ''کتنا برا لگتا ہے' آس پاس کھڑے ہوئے لوگ بھی دیکھتے ہیں تو نہ جانے کیا سوچتے ہوں گے۔''

''اب ایسی حرکت کرے تو اسے پکڑ لینا' یہ تو واقعی بدنامی والی بات ہے۔''

کچھ دنوں کے بعد وہ پھر دکھائی دیا۔ نائلہ پہلے کی طرح اپنی دوستوں کے ساتھ اسٹاپ پر کھڑی تھی کہ وہ ہاتھوں میں پھول لیے آیا اور نائلہ کے قدموں پر رکھ کر آگے بڑھنے ہی والا تھا کہ نائلہ نے اسے آواز دے کر روک لیا۔ اس کے ساتھ اس کی سہیلیاں بھی تھیں۔

''تم نے یہ کیا تماشا لگا رکھا ہے؟'' نائلہ نے غصے سے پوچھا۔

''اپنے آپ کو مکمل کرنے کی کوشش کر رہا ہوں'' اس نے جواب دیا۔

صرف ایک لمحے کے لیے نائلہ کی آنکھیں اس سے ملی تھیں اور اسے ایسا لگا جیسے وہ ان آنکھوں میں ڈوبتی جا رہی ہو۔ بہت ہی خوبصورت اور خواب ناک آنکھیں تھیں اس نوجوان کی۔

''دیکھو' میں تماشا بن کر رہ گئی ہوں'' نائلہ نے کہا ''تم ایسا مت کیا کرو۔''

''اگر میری وجہ سے تمہیں پرابلم ہو رہی ہے تو آئندہ ایسا نہیں ہوگا'' اس نے جواب دیا ''لیکن ایسا بھی نہیں ہو سکتا کہ میں اپنا یہ سلسلہ بند کر دوں۔ تم جہاں کھڑی ہو' میں یہاں پھول اتارا رہوں گا۔ چاہے تم ہو یا نہ ہو۔''

''آخر کیوں' تم یہ سب کیوں کرنا چاہتے ہو؟'' نائلہ نے پوچھا۔

ان کے اردگرد نائلہ کی سہیلیاں اور کچھ لوگ بھی آ کر کھڑے ہو گئے تھے۔ وہ سب بہت حیرت اور دلچسپی سے اس نوجوان کو دیکھ رہے تھے جو شاید کسی اور دنیا سے آیا تھا۔

اس کے چہرے پر بلا کی بے نیازی تھی۔ وہ روشن آنکھوں والا نوجوان سربراہ کسی لڑکی سے اپنی محبت کا اظہار کر رہا تھا لیکن وہ اظہار ایسا تھا کہ لوگ اسے حیرت اور احترام سے دیکھ رہے تھے۔

اس نوجوان نے ان سبھوں پر ایک اچٹتی ہوئی نگاہ دوڑائی اور گردن جھکا کر آگے بڑھ گیا۔ اسے شاید کسی بات کی پرواہی نہیں تھی۔ وہاں کھڑے ہوئے لوگ مختلف تبصرے کیے جا رہے تھے ''پاگل معلوم ہوتا ہے'' کسی نے کہا۔

''نہیں پاگل نہیں ہے' تم نے اس کی آنکھیں نہیں دیکھیں ..... یہ عام انسانوں کے بھیس میں اللہ کا کوئی مجذوب بندہ ہے۔''

لوگ باتیں کر رہے تھے اور نائلہ کے سامنے اس کی وہ روشن اور گہری آنکھیں اپنی پوری جادوگری کے ساتھ موجود تھیں۔ اب شاید وہ خود بھی اس کے عشق میں مبتلا ہو گئی تھی۔

کالج پہنچی تو اس کی سہیلیاں وہاں بھی یہی تذکرہ کرتی رہیں۔ ان تمام معاملات میں ایک بات کنفرم تھی کہ وہ کوئی عام چھچھورا آدمی نہیں تھا' جس نے صرف پریشان کرنے یا چھیڑنے کے لیے یہ حرکت شروع کی ہو بلکہ وہ جو کچھ بھی کر رہا تھا' وہ بے اختیار ہو کر کر رہا تھا۔ وہ نوجوان عشق کے شاید ایسے کسی درجے پر فائز تھا جہاں تک ان کی نگاہیں پہنچ نہیں پا رہی تھیں۔

نائلہ نے اس بس اسٹاپ کی طرف جانا چھوڑ دیا لیکن اس نوجوان کا وہی معمول رہا۔ وہ ہر صبح اسی جگہ آ کر دو پھول رکھ جاتا جہاں نائلہ کھڑی ہوا کرتی تھی۔

اس اسٹاپ پر آنے والوں کو یہ ساری داستان معلوم ہو چکی تھی۔ وہ سب روزانہ کے آنے جانے والے تھے۔ وہ اس نوجوان کا احترام کرنے لگے تھے جو شاید جذب کی کیفیت میں تھا یا اپنی تکمیل کے مراحل طے کر رہا تھا۔

☆☆☆

انور کمال کے ایس پی دوست برکی نے انور کو پھر ایک مشکل میں ڈال دیا تھا ''یار! اس عورت کے ساتھ بہت ظلم ہوا ہے'' اس نے بتایا ''ایک کم بخت نے اس کی آنکھوں کے سامنے اس کے شوہر اور بچے کو گولیاں مار کر ہلاک کر دیا ہے۔''

''اوہ خدا!'' انور کمال نے ایک گہری سانس لی ''آخر یہ سب کیوں ہو رہا ہے؟ کیا ہمارے یہاں انسانی زندگی کی اب کوئی ویلیو نہیں رہی؟''

''شاید اب کوئی اہمیت نہیں ہے'' برکی نے کہا ''اور اس کی وجہ ہم پولیس والوں کی مجبوری ہے۔ مجرموں کے خلاف ہمارے ہاتھ باندھ دیے گئے ہیں۔ ہم جہاں کسی کو پکڑتے ہیں' وہیں سفارشوں کا سیلاب امڈ آتا ہے اور ہم بے بس ہو کر رہ جاتے ہیں۔''

''خیر بتاؤ' اس خاتون کے ساتھ کیا ہوا؟''

''بتایا نا کہ اس بے چاری کے گھر میں ایک ڈاکو گھس آیا تھا۔ اس نے اس خاتون کے چار سال کے بچے اور شوہر کو گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ اس کے بعد اس خاتون کی ذہنی حالت بہت خراب ہو گئی ہے۔ وہ کبھی کچھ بتاتی ہیں' کبھی کچھ بتاتی ہیں۔ اب ان حالات میں اس مجرم کا اصل حلیہ کیسے معلوم ہو سکتا ہے؟''

''اس کی بھی ایک تکنیک ہوتی ہے کہ وہ جو کچھ بتاتی جائے میں اسے اسکیچ کرتا رہوں'' انور کمال نے کہا ''چاہے دو سو تصویریں بنانی پڑیں۔ پھر ان میں مشترکہ مماثلت تلاش کی جاتی ہے' اس کے بعد اصل چہرے کا اسکیچ بنتا ہے لیکن یہ عمل خاصا دیر طلب ہے۔ دس بارہ دن لگ سکتے ہیں۔''

''کچھ بھی ہو' میں اس حرام زادے پر ہاتھ ڈالنے کے لیے بے چین ہو رہا ہوں'' برکی غصے سے اپنے دانت پیسنے لگا تھا ''ایسے شیطانوں کو ہر حال میں ان کے انجام تک پہنچا دینا چاہیے۔''

''اور میں اس کام میں تمہارے ساتھ ہوں'' انور کمال نے کہا ''کیا وہ خاتون یہاں آ سکتی ہیں؟''

''یہاں تو نہیں آ سکتیں' تمہیں خود جانا ہوگا۔''

''ٹھیک ہے' تم مجھے لے چلو اس کے پاس۔''

برکی اسی وقت انور کمال کو اپنے ساتھ لے گیا اور جب انور نے اس عورت کو دیکھا تو زمین نے اس کے پاؤں تھام لیے۔ اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگا تھا۔

وہ عورت اس کی محبت درخشاں تھی۔

درخشاں ..... رنگ و روپ سے بجھی ہوئی لڑکی۔ اس وقت اجاڑ صورت میں اس کے سامنے کھڑی تھی۔ انور کمال کو بھی اس نے پہچان لیا تھا۔ پھر نہ جانے کیا ہوا؟ اس کے ضبط کا دامن اس کے ہاتھوں سے چھوٹ گیا۔ وہ روتی ہوئی انور کمال کے سینے سے آ لگی۔ اس وقت انور کمال بھی رو رہا تھا۔

درخشاں اتنے برسوں کے بعد اس سے ملی بھی تو کس انداز اور کن حالات میں ملی تھی۔ برکی یہ صورتِ حال دیکھ کر حیران رہ گیا ''کیا تم دونوں ایک دوسرے کو جانتے ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں' برسوں سے'' انور نے بتایا ''اور برسوں کے بعد ایک دوسرے سے مل رہے ہیں۔''

اس دوران میں درخشاں نے اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ وہ سامنے والے صوفے پر جا کر بیٹھ گئی تھی۔ ''اب شاید کام آسان ہو جائے۔'' برکی نے کہا۔

''ہاں' اب تو میں اپنی جان لڑا دوں گا کہ اس کم بخت کو کسی طرح کیفرِ کردار پر لے آؤں'' انور کمال نے کہا پھر درخشاں کی طرف دیکھا ''درخشاں! میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ میں اس سانحے پر کس طرح تعزیت کروں' تم پر تو ایک پہاڑ ٹوٹا ہے اور میرے پاس الفاظ نہیں ہیں کہ میں تمہیں یہ بتا سکوں کہ تمہارے آنسو براہِ راست میرے دل پر گرے ہیں۔''

برکی اس دوران میں کمرے سے باہر چلا گیا تھا۔

وہ دونوں ایک دوسرے کو اپنی کہانیاں سناتے رہے۔ درخشاں کی شادی ہو گئی تھی۔ شوہر محبت کرنے والا اور خیال کرنے والا تھا۔ ایک بیٹا پیدا ہوا اور جب وہ پانچ سال کا ہوا تو درخشاں پر قیامت ٹوٹ پڑی۔

ایک بے رحم شخص نے اس کی مانگ اور اس کی گود دونوں اجاڑ دی تھی۔ درخشاں کے ذہن میں اس کا چہرہ تو تھا لیکن وہ چونکہ خود الجھی ہوئی تھی اس لیے وہ چہرہ بھی الجھ گیا تھا۔

اس کے ذہن میں گرہیں سی پڑ گئی تھیں اور اب انور کمال کو اس کی یہ گرہیں کھولنی تھیں۔

☆☆☆

وہ پانچ یا چھ سال کی ایک خوبصورت بچی تھی۔

وہ بچی ایک لاش کے پاس سکتے کے عالم میں خاموش کھڑی تھی۔ اس لاش کے جسم سے بہنے والے خون نے اس کے پیروں کو بھی رنگین کر دیا تھا۔ وہ اس لاش سے چمٹ کر رونا چاہتی تھی لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے کیا کرنا چاہیے؟ وہ لاش اس کے باپ کی تھی۔

اس وقت دو گاڑیاں اس کے پاس آ کر رک گئیں۔ ان میں سے پانچ چھ آدمی اتر کر اس لاش اور اس بچی کے پاس آ گئے۔ سب سے آگے ایک ادھیڑ عمر دیو قامت سا آدمی تھا۔ جسے وہ لوگ چیف کہہ کر مخاطب کر رہے تھے۔

چیف نے آ کر اس بچی کے شانے پر پیار سے اپنا ہاتھ

رکھ دیا۔ پھر اس نے اپنے آدمیوں سے کہا ''اس بچی کو بہت احتیاط اور حفاظت سے ہمارے یہاں پہنچا دو۔''

اس بچی کو گاڑی میں بٹھا کر چیف کے گھر پہنچا دیا گیا تھا۔

اور اب یہاں سے اس کی زندگی کا ایک نیا سفر شروع ہوا۔

وہ چیف کے سامنے جا کر کھڑی ہو گئی تھی۔

اس کی آنکھوں کے آنسو اب خشک ہو گئے تھے۔ چیف ستائشی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے اس بچی سے کہا ''بیٹا! اب تم میرے ساتھ رہو گی' اب میں تمہارے باپ کی جگہ ہوں' ٹھیک ہے۔''

''ٹھیک ہے لیکن مجھے وہ آدمی چاہیے جس نے ابو کو مارا ہے' اس بچی نے کہا۔

''شاباش!'' چیف مسکرا دیا ''تم ایک بہادر بچی ہو۔ تم اطمینان رکھو' میں اس کمینے کو تمہارے قدموں میں لا کر ڈال دوں گا۔ جس نے میرے دوست کی جان لی ہے۔ تم نہیں جانتیں کہ میرے لیے تمہارے باپ کی کتنی اہمیت تھی۔ اس پوری دنیا میں بس وہی میرا دوست تھا اور اس کمینے نے مجھ سے میری زندگی کی کمائی چھین لی۔ خیر' تم آج سے میری بیٹی ہو۔ میرے گھر میں رہو گی' نام کیا ہے تمہارا؟''

''روبینہ!'' اس بچی نے بتایا۔

اور اس دن سے روبینہ چیف کے یہاں رہنے لگی تھی۔

چیف نے ہر طرح سے اس کا خیال رکھا تھا۔ روبینہ کا اس پوری دنیا میں سوائے اس کے باپ کے اور کوئی بھی نہیں تھا۔ اس کا باپ ایک نیک اور ایماندار آدمی تھا۔ لیکن اس کی دوستی چیف جیسے آدمی سے تھی۔ دونوں بچپن کے دوست تھے لیکن دونوں کی راہیں مختلف ہو گئی تھیں۔ روبینہ کا باپ زندگی کی دوڑ میں مالی اعتبار سے بہت پیچھے رہ گیا تھا۔

اور اب اس کے باپ کا مرڈر ہو چکا تھا۔

مارنے والے کی روبینہ کے باپ سے کوئی دشمنی نہیں تھی۔ وہ چیف کا دشمن تھا لیکن چیف نہیں ملا تو اس نے غصے اور جھلاہٹ میں روبینہ کے باپ کو ٹھکانے لگا دیا تھا۔

روبینہ نے چیف کے یہاں پرورش پانی شروع کر دی۔

اس نے وہاں رہ کر تعلیم حاصل کی۔ کرائے' جوڈو اور نہ جانے کیا کیا سیکھا۔ چیف اس پر بے پناہ بھروسا کیا کرتا تھا۔ اس نے سارے معاملات میں روبینہ کو اپنا رازدار بنا رکھا تھا۔

روبینہ کا رنگ و روپ بھی غضب کا تھا۔ انتہائی اسمارٹ' بے دھڑک اور دلیر لڑکی۔ چیف نے اس کے جوان ہونے کے بعد اسے انتہائی اہم کاموں کے لیے استعمال کرنا شروع کر دیا تھا۔

روبینہ چیلنج سمجھ کر اس کام کو ہاتھ میں لیتی اور انتہائی ہوشیاری کے ساتھ کام مکمل کر کے اپنا دامن بچا کر نکل آتی۔ روبینہ کے پاس کسی چیز کی کمی نہیں تھی۔ وہ جب چلتی تو سیکیو محافظ اس کے ساتھ ہوا کرتے۔ شاندار گاڑیاں اس کے اشارے کی منتظر ہوتیں۔ لاکھوں روپے اس کے لیے بینک میں رکھ دیے گئے تھے۔

زندگی کی ہر آسائش' ہر نعمت اس کے پاس تھی سوائے محبت کے۔

ابھی تک کسی میں اتنی ہمت نہیں ہو سکی تھی کہ وہ اس کے قریب آنے کی کوشش کرتا۔ لوگ یا تو اس کا احترام کیا کرتے یا پھر اس سے خوف زدہ رہتے۔

اور وہ نوجوان پہلا شخص تھا جس نے اپنی دلیری سے روبینہ کے دل کے دروازے پر دستک دے دی تھی۔ اس کے قریب پہنچ چکا تھا۔ روبینہ کو یہ احساس تھا کہ وہ نوجوان آگ سے کھیل رہا ہے۔ نہ جانے کیوں چیف کو یہ کبھی پسند نہیں آیا تھا کہ روبینہ کسی میں دلچسپی لے۔ وہ کسی کو بھی روبینہ کے قریب نہیں آنے دیتا تھا۔

ایک دو نوجوانوں نے روبینہ کے قریب ہونے کی کوشش کی تھی لیکن وہ بے چارے اپنے پیروں پر کھڑے نہیں رہ سکے تھے۔ چیف کے آدمیوں نے انہیں ادھیڑ کر رکھ دیا تھا۔

ایک دن روبینہ چیف پر پھٹ پڑی تھی ''بابا! آج میں آپ سے ایک سوال پوچھنا چاہتی ہوں اور شاید یہ میری زندگی کا سب سے اہم سوال ہے۔''

''ہاں جانِ بابا! بتاؤ کیا پوچھنا ہے تمہیں؟''

''بابا! انسان کی زندگی میں ہر قسم کی آسائش کے ساتھ ساتھ ایک اور چیز کی بھی ضرورت ہوتی ہے'' روبینہ نے کہا ''اور وہ ہے محبت۔ آپ نے میرے اردگرد جہاں اپنے پیار کا حصار کھینچ رکھا ہے۔ وہاں خوف اور دہشت کی فضا بھی قائم کر دی ہے۔ لوگ میرے قریب آنے سے کتراتے ہیں۔ کوئی مجھے ان نگاہوں سے نہیں دیکھتا۔ جن نگاہوں سے کوئی مرد کسی عورت کو دیکھا کرتا ہے۔ معاف کرنا بابا! میں بہت صاف صاف بات کر رہی ہوں۔''

''نہیں جانِ من! تم بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو'' چیف نے ایک گہری سانس لی ''چلو' آج تمہیں یہ راز بتا ہی دیتا ہوں۔ تم کسی کی امانت ہو۔''

''میں امانت ہوں؟'' روبینہ کے ذہن کو ایک جھٹکا لگا تھا

''میں کس کی امانت ہوں؟''

''میرے بیٹے شہروز کی'' چیف نے بتایا۔

''آپ کا بیٹا شہروز!'' روبینہ حیران رہ گئی تھی ''میں نے کبھی آپ کے بیٹے کے بارے میں نہیں سنا۔''

''یہ ایک لمبی کہانی ہے'' چیف نے کہا ''وہ فرانس میں ہے۔ وہ معذور اور ذہنی طور پر کمزور ہے۔ میں نے اس کی ماں سے محبت کی تھی۔ ہماری شادی فرانس ہی میں ہوئی۔ شہروز وہیں پیدا ہوا تھا۔ بچپن ہی سے معذور اور ذہنی طور پر کمزور تھا۔ اس کی ماں کچھ برسوں کے بعد چل بسی تھی۔ میں نے شہروز کو یہاں لانا مناسب نہیں سمجھا۔ اسی لیے کسی کو نہیں معلوم کہ میری کوئی اپنی اولاد بھی ہے۔ وہ فرانس میں کئی نگرانوں کے ساتھ رہتا ہے۔ وہ ذہنی طور پر صرف کمزور ہے' پاگل نہیں ہے۔''

''افسوس ہوا بابا یہ سن کر لیکن میں..... میرا مطلب ہے کہ میں کیا کر سکتی ہوں؟''

''تم جس وقت میرے پاس آئی تھیں اور تمہارے باپ کا مرڈر ہوا تھا۔ میں نے اسی وقت یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ صرف تم ہی میرے بیٹے شہروز کی زندگی کی ساتھی بن سکتی ہو۔ تم میں وہ خوبیاں ہیں کہ تم میرے بیٹے کو سنبھال سکو اور اسے زندگی کی طرف واپس لا سکو۔''

روبینہ سب سمجھ گئی تھی۔

چیف کی عنایتوں کا مقصد اس کی سمجھ میں آ گیا تھا۔ چیف اسے اپنے معذور بیٹے کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھانا چاہتا تھا۔ اس لیے اس نے کسی کو روبینہ کے قریب نہیں آنے دیا تھا۔

ایسی صورت میں اس دلیر نوجوان عامر کی آمد اس طرح تھی جیسے وہ آگ کے سمندر سے گزرتا ہوا روبینہ کی طرف بڑھ رہا ہو۔

☆☆☆

نائلہ کو وہ کئی دنوں سے دکھائی نہیں دیا تھا۔

نائلہ نے اس اسٹاپ پر جانا ترک کر دیا تھا۔ جہاں وہ نوجوان اس کے قدموں میں پھول رکھ کر چلا جاتا تھا اور اب وہ کئی دنوں کے بعد پھر اسی اسٹاپ پر آئی تھی۔

دو پھول زمین پر گرے ہوئے تھے۔ بہت ممکن تھا کہ یہ پھول وہی' اس کے عاشقانہ قدموں کی بھینٹ چڑھا کر گیا ہو لیکن وہ خود دکھائی نہیں دیا تھا۔

نائلہ کو کچھ بے تابی سی ہونے لگی تھی۔

اگر اس شخص نے اس سے محبت کی تھی تو یہ کیسی محبت تھی۔ جیسے کسی دیوی سے پجاری کی عقیدت۔ وہ اس کے بارے میں سوچتی رہتی۔ وہ کون ہے' کہاں رہتا ہے' کیسی زندگی ہے اس کی۔ اس کا گھر کیسا ہو گا۔ اس کی رہائش کیسی ہو گی۔ اس نوجوان کے حوالے سے طرح طرح کے خیالات اس کے ذہن میں آتے تھے لیکن اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

چوتھے یا پانچویں دن وہ دکھائی دے گیا۔

نائلہ اس وقت کچھ ہٹ کر ایک درخت کی آڑ میں کھڑی ہوئی تھی۔ بس اسٹاپ سے اس درخت کا فاصلہ اچھا خاصا تھا لیکن بس اسٹاپ کی طرف جانے والے اسی درخت کے پاس سے ہو کر گزرتے تھے۔

نائلہ کو وہ نوجوان دکھائی دے گیا۔ وہ اپنی کھوئی کھوئی کیفیت میں اس درخت کے پاس سے گزرتا چلا گیا۔ نائلہ نے اس کے ہاتھ میں پھول دیکھ لیے تھے۔ اس نے دونوں پھول اس جگہ رکھے جہاں نائلہ کھڑی ہوا کرتی تھی اور واپسی کے لیے جب وہ درخت کے قریب سے گزرنے لگا تو نائلہ آڑ سے نکل کر اس کے سامنے آ گئی۔ ''بات سنو'' اس نے نوجوان کو مخاطب کیا۔

نوجوان نے گردن اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ ایک لمحے کے لیے نائلہ کو ایسا لگا جیسے وہ اس کی آنکھوں میں ڈوبتی جا رہی ہو۔ کیسی گہری آنکھیں تھیں اس کی۔ نہ جانے ان آنکھوں میں کتنے بھید بھرے ہوئے تھے۔

''تم..... تم یہ سب کیوں کرتے ہو؟'' نائلہ نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے پوچھا۔

''اپنی تسکین کے لیے۔'' اس نے ٹھنڈے لہجے میں جواب دیا۔

''تم یہ بات پہلے بھی کہہ چکے ہو لیکن تم ہو کون اور مجھ میں ایسی کیا خوبی ہے کہ تم میرے لیے ایسی حرکت کرتے ہو۔''

''میں تم میں اپنے آپ کو دیکھتا ہوں'' اس نے جواب دیا ''اور میں نے تم سے وعدہ کیا تھا کہ میں اب کبھی تمہارے سامنے نہیں آؤں گا لیکن آج تم خود میرے سامنے آ گئی ہو۔''

''میں تمہاری وجہ سے الجھ کر رہ گئی ہوں'' نائلہ نے کہا ''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہارے ساتھ کیا رویہ اختیار کروں۔ تم اگر ایک طرف میری بدنامی کا سبب بن رہے ہو تو دوسری طرف میری حیرت میں اضافہ بھی ہوتا جا رہا ہے۔''

''کیا تم یہ سب جاننا چاہو گی؟'' نوجوان نے اچانک دریافت کیا۔

''ہاں' کیونکہ میں تقریباً پاگل ہو چکی ہوں۔''

''تو پھر آؤ میرے ساتھ'' اس نے کہا ''میں نے اپنی زبان سی لی تھی۔ ہونٹوں پر خاموشی کی مہر لگا لی تھی لیکن یہ سب کچھ تم دریافت کر رہی ہو۔ اسی لیے تمہیں بتانا ہی پڑے گا

کیونکہ میرے لیے پوری کائنات میں تم سے زیادہ اہم اور کوئی نہیں ہے' آؤ۔''

☆☆☆

انور کمال کو ایک بار پھر درخشاں مل گئی تھی۔

وہ درخشاں جو اس کی محبت تھی جس کے لیے اس نے اپنی راہیں متعین کی تھیں۔ جس کے لیے خواب دیکھے تھے۔ وہ ایک بار پھر اس کے سامنے آ گئی تھی۔ اپنی پوری حشر سامانیوں کے ساتھ لیکن اجاڑ اور ویران۔

اور اب انور کمال کے سامنے ایک ٹارگٹ تھا۔ درخشاں کی خوشیوں کے قاتل کی تلاش۔ اس کا دوست برکی اس پورے مرحلے میں اس کے ساتھ رہا تھا۔ انور نے درخشاں کو سامنے کرسی پر بیٹھا رکھا تھا اور خود اس کے سامنے ایزل لیے کھڑا تھا۔

''ہاں' اب بتاؤ درخشاں' وہ درخشاں کو ہدایات دے رہا تھا'' اپنی آنکھیں بند کرو اور اس وحشی کو تصور میں لاؤ جس نے تمہاری دنیا اجاڑی ہے۔ تم اس کا چہرہ یاد کرو۔ مجھے بتاؤ' اس کا چہرہ لمبوترا..... گول تھا' کتابی تھا..... کیسا تھا؟ شاباش' بتاتی جاؤ۔''

درخشاں آنکھیں بند کیے بتاتی جا رہی تھی۔

انور کمال اس کے بتائے ہوئے چہرے کی اسکیچنگ کر رہا تھا۔ ایک گھنٹے کی محنت کے بعد بالآخر ایک چہرہ ایسا بن ہی گیا۔ جس کو دیکھ کر درخشاں اچھل پڑی تھی۔ ''ہاں ہاں' بالکل یہی یہی چہرہ تھا۔''

''اوہ گاڈ!'' برکی نے ایک گہری سانس لی ''یہ تو منیر اعظم ہے۔'' اس نے بتایا ''ہم پولیس والے بہت اچھی طرح جانتے ہیں اس کو۔''

''کون منیر اعظم!'' انور کمال نے دریافت کیا۔

''اب صورتِ حال کچھ اور ہو گئی ہے انور۔'' برکی نے کہا ''پہلے میں نے یہ سمجھا تھا کہ یہ کسی غنڈے یا ڈاکو وغیرہ کا کام ہے لیکن ایسا نہیں ہے' درخشاں کے شوہر کو منیر اعظم نے مارا ہے۔''

''وہی تو پوچھ رہا ہوں کون منیر اعظم؟''

''چیف کا خاص آدمی!'' برکی نے بتایا ''اب تم یہ پوچھو گے کہ یہ چیف کون ہے؟ تو اس کے لیے صرف اتنا جان لو کہ اس شہر کے انڈر ورلڈ کا بے تاج بادشاہ ہے۔ کون سا ایسا جرم ہے جو اس سے منسلک نہیں ہے۔ انتہائی طاقت ور اور خوفناک آدمی ہے۔''

''وہ سب تو ٹھیک ہے لیکن منیر اعظم یا اس چیف کی درخشاں کے شوہر سے کیا دشمنی ہو سکتی ہے؟''

''یہاں آ کر معاملہ کچھ الجھ گیا ہے۔'' برکی نے کہا پھر درخشاں سے مخاطب ہوا ''آپ یہ بتائیں کہ آپ کے شوہر کہاں کام کرتے تھے؟''

''کوئی فرم تھی' گریس ٹریڈنگ' اس میں چیف اکاؤنٹنٹ تھے'' درخشاں نے بتایا۔

''اوہ خدا' اب شاید معاملہ سمجھ میں آ رہا ہے۔ گریس ٹریڈنگ اسی چیف کی ہے۔ اس نے اپنی دولت کو جائز کرنے کے لیے بزنس کا سہارا لے رکھا ہے۔ اس کی اس شہر میں ویسے تو کئی کمپنیاں ہیں لیکن گریس ٹریڈنگ سب سے اہم ہے۔''

''اور درخشاں کے مرحوم شوہر وہاں چیف اکاؤنٹنٹ تھے۔ تو معاملہ کچھ اس طرح صاف ہوتا جا رہا ہے کہ بہت ممکن ہے کہ درخشاں کے شوہر چیف کے کسی ایسے راز سے واقف ہو گئے ہوں کہ چیف کے لیے خطرہ پیدا ہو گیا اور اس نے یہی مناسب سمجھا ہو کہ ان کو راستے سے ہٹا دیا جائے اور اس لپیٹ میں بچہ بھی آ گیا۔''

''جب تم نے یہاں تک اندازہ لگا لیا ہے تو پھر ان لوگوں پر ہاتھ کیوں نہیں ڈالتے؟''

''یہ کام اتنا آسان نہیں ہے انور!'' برکی نے کہا ''ان کم بختوں کے ہاتھ بہت لمبے ہیں اور ہمارے ملک کی یہ بدقسمتی رہی ہے کہ ہم سیاست دانوں اور بیوروکریسی کے ہاتھوں کھلونا بن کر رہ گئے ہیں۔ بہرحال ہم ان کے خلاف شہادتیں جمع کر رہے ہیں۔''

''کم از کم اس قاتل پر تو ہاتھ ڈال سکتے ہو نا۔ درخشاں نے اس آدمی کی تصویر شناخت کر لی ہے۔''

''مشکل تو ہے لیکن ناممکن نہیں۔ ہمارا اگلا ٹارگٹ اب وہی ہو گا۔''

☆☆☆

کسی نے روبینہ کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔

دہشت سے روبینہ کی آنکھیں کھل گئی تھیں۔ اس نے خواب گاہ میں جلنے والے بلب کی روشنی میں اس آدمی کو پہچان لیا تھا۔ یہ وہی دلیر نوجوان تھا عامر' جو نہ جانے کس طرح اس کے کمرے میں گھس آیا تھا۔

عامر اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کر رہا تھا۔ روبینہ نے اس بات پر اپنی گردن ہلا دی۔ عامر نے اس کے منہ سے اپنا ہاتھ ہٹا لیا تھا۔

''خدا کی پناہ! تم یہاں کیسے آ گئے' کیوں آئے ہو؟''

''تم سے ملنے کے لیے'' عامر اس کے سامنے کرسی پر بیٹھ

گیا تھا" میں نے سوچا کہ اتنی آسانی سے ملاقات تو نہیں ہوسکتی۔ خود ہی اپنی جان پر کھیلنا پڑے گا اور یہ دیکھو' محبت کی خاطر اپنی جان پر کھیل کر تمہارے پاس آ گیا ہوں۔"

"خدا کی پناہ۔ تم نے یہ کیسا خطرہ مول لیا ہے؟" روبینہ نے کہا "تم شیروں کی کچھار میں آ گئے ہو۔ یہاں ہر طرف مسلح محافظ گھومتے رہتے ہیں۔ ذرا سی بھنک پڑ گئی تو تمہارے ٹکڑے کر دیں گے۔"

"جانتا ہوں میں لیکن محبت تو اندھی ہوتی ہے نا۔"

کیا تم واقعی مجھ سے محبت کرنے لگے ہو۔"

"اب اور کیسا ثبوت چاہیے تمہیں؟"

"تو پھر تم مجھے یہاں سے نکال لے جاؤ۔ میں یہاں نہیں رہنا چاہتی۔ یہ گھر میرے لیے دوزخ بن گیا ہے۔"

"آخر کیوں' یہ تمہارا اپنا گھر ہے۔ اس کا سربراہ تمہارا باپ ہے۔"

"نہیں' نہ تو یہ میرا اپنا گھر ہے اور نہ ہی اس کا سربراہ میرا باپ ہے بلکہ وہ مجھے اپنے بیٹے پر قربان کرنے کے لیے میری پرورش کر رہا ہے۔"

"کیا مطلب' بتاؤ مجھے۔"

روبینہ نے اسے اپنے' چیف' اس کے بیٹے اور چیف کے ارادوں کے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا۔ وہ نوجوان یہ سن کر سوچ میں پڑ گیا تھا "تمہارے ساتھ تو واقعی زیادتی ہو رہی ہے' اب بتاؤ۔ میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں۔"

"مجھے یہاں سے نکال لو" روبینہ نے کہا "تم پہلے آدمی ہو۔ جو میرے اس حد تک قریب آیا ہے ورنہ اس نے تو مجھے اس طرح رکھا ہے جیسے کسی خفیہ خزانے کو رکھا جاتا ہے اور سانپ بن کر اس پر پہرا دیتے ہیں۔ اس نے بچپن سے اب تک میری پرورش صرف اپنے بیٹے کے لیے کی ہے۔"

"دیکھو' میں تمہیں یہاں سے نکال سکتا ہوں" عامر نے کہا "لیکن تمہارے اس چیف کے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔ اس کے آدمی پاگلوں کی طرح ہمیں پوری دنیا میں تلاش کرتے پھریں گے۔ اس لیے اس خزانے کو نکالنے کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے اس سانپ کو کچل دیا جائے پھر راستہ آسان ہو جائے گا۔"

"لیکن کیسے؟" روبینہ نے پوچھا "ہم کس طرح اسے کچل سکتے ہیں؟"

"اس کے خلاف ثبوت اکٹھا کر کے" عامر نے کہا "ایسے ٹھوس ثبوت کہ وہ پھڑ پھڑا کر رہ جائے لیکن قانون کی گرفت سے نہ نکل سکے۔ اس کے لیے ہمیں محنت کرنی پڑے گی۔"

"یہ تو کوئی بات ہی نہیں ہے" روبینہ مسکرا دی "مجھے چیف کے بارے میں سب کچھ معلوم ہے۔ اس کے تمام راز میرے پاس ہیں۔ اس کے سارے کرتوت' اس کی فائلیں' یہ سب اس نے مجھ پر اعتماد کر کے میرے حوالے کر رکھی ہیں۔"

"اوہ۔ پھر تو کام بہت آسان ہو جاتا ہے" عامر کی آنکھیں چمک اٹھیں "اب ہمیں ایک ہونے اور تمہارے چیف کو اس کے انجام تک پہنچانے سے کوئی نہیں روک سکتا۔"

روبینہ نے کچھ کہنا چاہا تھا کہ اسی وقت زور زور سے دستک ہونے لگی۔ روبینہ کے چہرے کا رنگ اڑ گیا تھا "میرا خیال ہے کہ کسی نے تمہیں دیکھ لیا ہے" اس نے بوکھلا کر کہا۔

"ہاں' بہر حال میں کھڑکی کے ذریعے نکل جاتا ہوں۔ تم سے پوچھا جائے تو یہ کہہ دینا کہ کوئی ڈاکو گھس آیا تھا۔"

عامر نے کھڑکی کی طرف دوڑ لگا دی۔ روبینہ نے اپنے بال بکھیر لیے اور چہرے پر دہشت طاری کرتے ہوئے.... دروازہ کھول دیا تھا۔ چیف کے محافظ اس کے سامنے کھڑے ہوئے تھے "وہ..... وہ....." روبینہ نے کھڑکی کی طرف اشارہ کیا "وہ کھڑکی سے نکل گیا ہے۔"

"کک..... کون تھا وہ؟"

"پتا نہیں" وہ سب کھڑکی کی طرف دوڑ پڑے۔

اب وہاں سوائے سناٹے اور اندھیرے کے اور کچھ نہیں تھا۔ البتہ چیف کے خونخوار کتے پورے لان میں غراتے پھر رہے تھے۔ نہ جانے وہ کس طرح نکل کر گیا ہوگا۔ اس دوران میں چیف بھی اس کمرے میں آ گیا تھا "اگر وہ مل جائے تو دھجیاں اڑا دوں اس کی" وہ غصے سے دہاڑ رہا تھا۔ پھر اس نے روبینہ کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا "جانِ من! تم نے اسے غور سے دیکھا تو ہوگا نا؟"

"جی..... جی بابا' دیکھ لیا تھا۔"

"کہیں مل جائے تو پہچان لوگی نا' اس کم بخت کو۔"

"جی..... جی ہاں' کیوں نہیں۔"

"اب آرام کرو اور بھول جاؤ سب کچھ۔ تمہاری کھڑکی کے نیچے گارڈز لگا دیے گئے ہیں۔ اب کوئی پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا۔"

اسی دوران میں تلاش کے لیے جانے والوں نے آ کر یہ خبر سنا دی کہ وہ ڈاکو ان کے ہاتھ نہیں آ سکا تھا۔

"چیف' اس کھڑکی کے برابر میں جو درخت ہے' اس کی شاخیں باؤنڈری وال سے باہر جا رہی ہیں" ایک محافظ نے بتایا "ایسا لگتا ہے جیسے وہ بندہ اسی درخت کے ذریعے باہر چلا گیا ہے۔"

اس وقت کسی نے روبینہ کے تاثرات نہیں دیکھے تھے۔ اس وقت اس کے ہونٹوں پر بہت پُرسکون سی مسکراہٹ تھی۔

☆☆☆

وہ نوجوان نائلہ کو ایک پارک کے ایک پُرسکون گوشے میں لے آیا تھا۔

"جانتی ہو کہ میں تمہیں دیکھ کر کیوں پاگل ہو گیا ہوں" اس نے کہنا شروع کیا "اس کی وجہ یہ ہے کہ اب سے بہت پہلے میں نے کسی سے بے پناہ محبت کی تھی۔ اتنی محبت کہ میں نے اپنے آپ کو اس کے لیے فراموش کر دیا تھا۔ کہانی بہت طویل ہے لیکن مختصر کر کے سنا رہا ہوں۔ وہ لڑکی ایک دن مر گئی۔ موت آ گئی اس کو اور میں بہت بری طرح ٹوٹ گیا، بکھر گیا اور میں نے سوچا کہ اب کیوں نہ کسی ایسے سے محبت کی جائے جس کے بچھڑنے کا کوئی امکان ہی نہ ہو۔ جو ہمیشہ میرے ساتھ رہے۔ جو مجھے سہارا دیتا رہے اور جو ہر قدم پر میری امیدوں اور آرزوؤں کا پالنے والا ہو اور ایسی ہستی تو صرف ایک ہی ہو سکتی ہے اور وہ ہے خدا۔ اس کے علاوہ ایسا کون محبوب ہے جس کا وجود زندگی کی پہلی سانس سے آخری سانس تک اور اس کے بعد تک ساتھ دیتا رہے۔"

"واقعی، ایسا تو اس کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا" نائلہ نے اس کی تائید کی۔

"میں نے محبت کے رخ تبدیل کر لیے" نوجوان نے کہا "زندگی کسی اور انداز سے گزارنی شروع کر دی۔ خود کو اس ذات کے لیے وقف کر دیا جو کسی سے بے وفائی نہیں کرتی اور اس کی تلاش میں بھٹکنے لگا اور اب تک اسے تلاش کیے جا رہا ہوں جبکہ وہ میرے بہت قریب ہے۔ رگِ جاں سے بھی قریب لیکن اس کو دیکھنے کے لیے جس قسم کی آنکھیں چاہئیں وہ میرے پاس نہیں ہیں۔ آنکھوں نے ایسی بصارت گم کر دی ہے۔ اس لیے میں اپنے آپ کو اور بھی زیادہ امتحانوں میں ڈال رہا ہوں اور جہاں تک تمہارا سوال ہے....."

"ہاں بتاؤ' تم میرے ساتھ ایسا والہانہ پن کیوں کرنے لگے ہو؟" نائلہ نے پوچھا۔

"اس لیے کہ تم اسی کی طرح ہو جس سے میں نے محبت کی تھی اور اسی لیے میں تمہارے قدموں میں پھول چڑھاتا ہوں تاکہ ایک طرف تو اپنی انا اور غرور کا سر کچل سکوں اور دوسری طرف خراجِ عقیدت پیش کر سکوں کہ تمہاری جیسی کسی لڑکی نے مجھ سے بے وفائی کر کے مجھے حقیقی محبت کا راستہ دکھایا ہے۔"

"لیکن یہ تو کوئی طریقہ نہیں ہوا۔ تم ویسے بھی اس ذات کو تلاش کر سکتے ہو۔"

"وہ تو ہے لیکن جتنی ناکامیاں اور جتنی ٹھوکریں ہوں گی۔ انسان اسی قدر خدا سے قریب ہوتا جائے گا۔ حضرت علیؓ نے فرمایا تھا کہ میں نے اپنے ارادوں کی شکست سے خدا کو پہچانا ہے۔ تو یہ ارادے اور یہ خواہشیں جتنی شکستہ ہوں گی۔ ہم اسی قدر خدا شناس ہوتے چلے جائیں گے۔"

"کیا تمہارا کوئی گھر وغیرہ نہیں ہے؟"

"سب کچھ ہے، گھر بھی اور خاندان بھی لیکن وہ سب کے سب مجھ سے لاتعلق ہو چکے ہیں۔ کیونکہ میں نے بزنس کی طرف توجہ نہیں دی۔ کوئی بڑا آفیسر نہیں بنا۔ دنیا نہیں کمائی اسی لیے وہ مجھے ناکارہ سمجھنے لگے ہیں یعنی آخرت کی کمائی ان کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ اصل چیز ہے دنیا کمانا۔"

"تم نے تو مجھے حیران کر دیا ہے، تمہارا نام کیا ہے؟"

"کامران!" اس نے بتایا "لیکن ابھی تک کامران نہیں ہو سکا ہوں۔ نہ تو خدا کو حاصل کر سکا ہوں اور نہ ہی اپنے محبوب کو۔ بس اپنے سینے میں ایک آگ لگا لی ہے اور اس آگ کی تپش بھٹکائے پھرتی ہے۔ اپنے آپ میں جھلستا رہتا ہوں۔"

"تم یہ بتاؤ کہ میں تمہارے لیے کیا کر سکتی ہوں؟"

"صرف دعا....." کامران نے کہا "بس یہ دعا کرتی رہو کہ خدا اسے سکون دے اور اسے اس قابل بنا دے کہ یہ کسی کے کام آ سکے۔"

"کامران۔ اگر میں زندگی کے راستے پر تمہارے ساتھ چلنا چاہوں تو....."

"نہیں، میں اس کا مشورہ نہیں دوں گا۔ میری حیات کی راہوں میں پیچ و خم ہیں بہت۔ میرے راستے میں انگارے بچھے ہوئے ہیں۔ مجھے صرف جلنا اور تڑپنا ہے اور ادھورا رہنا ہے۔ زندگی میں بھی اور محبت میں بھی۔"

☆☆☆

وہ تین آدمی تھے جو اپنی صورت ہی سے خطرناک دکھائی دے رہے تھے۔

وہ انور کمال کے اسٹوڈیو میں آ گئے۔ انور کمال اس وقت ایک پورٹریٹ پر کام کر رہا تھا۔ ان میں سے ایک نے انور کمال سے کہا "تمہیں ہمارے ساتھ چلنا ہے۔"

"تمہارے ساتھ..... کہاں؟"

"گھبراؤ نہیں۔ ہم تمہارا اچار نہیں ڈالیں گے۔" دوسرے نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا "تم سے وہی کام

لیا جائے گا جس کے تم چیمپین ہو۔ تم سے کسی کی تصویر بنوانی ہے۔"

"یہ میرے اصول کے خلاف ہے" انور کمال نے کہا "جس کی تصویر بنوانی ہے، اسے یہاں لے کر آؤ.... میں کہیں نہیں جاتا۔"

"لیکن اس بار تمہیں چلنا ہی ہوگا" پہلے والے نے کہا "اور ہم انکار سننے کے عادی نہیں ہیں۔"

ان کے تیور ایسے تھے کہ انور کمال کو ان کے ساتھ جانا ہی پڑا تھا۔ وہ اسے اپنے ساتھ ایک انتہائی شاندار مکان میں لے آئے تھے۔ وہ مکان کیا پورا ایک محل تھا۔ اس محل میں ایک قوی ہیکل قسم کے بارعب آدمی نے اس کا استقبال کیا "آؤ آرٹسٹ! تمہیں یہاں تک آنے میں کوئی پرابلم تو نہیں ہوئی؟"

"پرابلم تو نہیں ہوئی لیکن تمہارے آدمی جس طرح مجھے لائے ہیں، وہ ٹھیک نہیں ہے۔"

"یہ ان کی مجبوری ہے۔" وہ مسکرا دیا "یہ میرا آرڈر تھا کہ تمہیں ہر حال میں لایا جائے۔"

"بتاؤ، مجھے کس لیے بلایا گیا ہے؟ میں تو ایک معمولی آرٹسٹ ہوں" انور کمال نے کہا۔

"تمہاری بہت شہرت سنی تھی اسی لیے بلوایا گیا ہے تمہیں" اس نے بتایا "پچھلے دنوں میری بھتیجی کے کمرے میں ایک ڈاکو گھس آیا تھا۔ بھتیجی نے اس کی صورت اچھی طرح دیکھ لی ہے۔ اب تم اس سے پوچھ کر اس ڈاکو کی تصویر بناؤ گے۔"

"لیکن یہ کیس تو پولیس کا ہے جناب!"

"میں نے تمہیں مشورے دینے کے لیے نہیں بلایا ہے" اس نے کہا "تم سے جو کہا گیا ہے وہی کرو اور اپنا منہ مانگا معاوضہ لے کر روانہ ہو جاؤ۔"

"ٹھیک ہے" انور کمال ایک گہری سانس لے کر رہ گیا تھا "بلائیں اس لڑکی کو۔"

کچھ دیر بعد ایک بہت خوبصورت اسمارٹ سی لڑکی اس کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ انور کمال کی مصورانہ نگاہوں نے یہ محسوس کیا کہ وہ لڑکی کچھ پریشان سی تھی۔ کچھ الجھی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔

بہر حال اسے تو اپنا کام مکمل کر کے یہاں سے روانہ ہو جانا تھا۔

انور کمال کا ایزل برش اور دیگر چیزیں بھی ساتھ ہی آئی تھیں۔ اس نے اس لڑکی سے اس ڈاکو کے خدوخال کے بارے میں سوالات شروع کر دیے۔ یہاں بھی اسے وہ لڑکی الجھی الجھی محسوس ہوئی۔

وہ کبھی کچھ اور بتاتی، کبھی کچھ اور۔ جیسے اس ڈاکو کے خدوخال پوری طرح اس کے تصور میں نہیں ہوں یا وہ جان بوجھ کر انور کمال کو الجھا رہی ہو۔ بہر حال وہ جیسے جیسے بتاتی گئی، اسی طرح انور کمال کی انگلیاں کام کرتی چلی گئیں۔

اس دوران میں وہ بارعب ادھیڑ عمر دیوہیکل انسان کمرے سے باہر چلا گیا تھا۔ تصویر مکمل کرنے کے بعد انور کمال نے وہ تصویر اس لڑکی کے سامنے کرتے ہوئے پوچھا۔

"یہ بتاؤ، کیا یہ وہی آدمی ہے؟"

"اور تم مجھے یہ بتاؤ کہ کیا واقعی اس حلیے کا کوئی آدمی اس شہر میں ہوگا؟" لڑکی نے ایک عجیب سا سوال کیا تھا۔

"میں تمہاری بات نہیں سمجھ سکا۔"

"خدا کرے ایسا کوئی نہ مل سکے" لڑکی نے ایک گہری سانس لی "بہر حال تم نے اپنا کام ختم کر لیا ہے۔ تم واقعی ایک باکمال آرٹسٹ ہو۔"

انور کمال کو ایک معقول رقم دے کر روانہ کر دیا گیا تھا۔

انور کمال بہت ہی حیران ہو کر اپنے اسٹوڈیو واپس آیا تھا۔ اس کی پیشہ ورانہ زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ وہ کسی کی تصویر بناتے ہوئے اس بری طرح الجھ گیا تھا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ لڑکی اسے مس گائیڈ کیے جا رہی تھی۔

انور کمال نے فون کر کے برکی کو بلا لیا تھا۔ اس نے ساری کہانی برکی کو سناتے ہوئے کہا "میری الجھن کی وجہ یہ ہے کہ اس لڑکی نے جان بوجھ کر غلط چہرہ بتایا ہے۔ جیسے وہ اصل ڈاکو کو چھپانا چاہتی ہو۔"

"یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟"

"یہ میرا برسوں کا تجربہ ہے مائی ڈیئر!" انور کمال نے کہا "پھر جہاں مجھے لے جایا گیا تھا۔ وہ جگہ بذات خود بہت پراسرار تھی۔ مجھے لے جانے والے کرنل قسم کے بندے دکھائی دے رہے تھے۔"

"اور جس آدمی کے پاس تمہیں پہنچایا گیا تھا، تم اس کا حلیہ بتاؤ۔"

اور جب انور کمال نے اس گھر کے سربراہ کا حلیہ بتایا تو برکی اچھل پڑا تھا "مائی گاڈ! تم تو چیف کے پاس پہنچ گئے تھے۔"

"کون چیف!"

"وہی جس کے بارے میں بتا چکا ہوں اور جو درخشاں کے شوہر کا قاتل ہے اور جو انڈر ورلڈ کا بادشاہ ہے اور وہ لڑکی سوائے روبینہ کے اور کوئی نہیں ہو سکتی۔"

"کون روبینہ؟"

"وہی لڑکی، چیف نے اس کی پرورش کی ہے۔ یہ ساری باتیں ہمارے ریکارڈ پر ہیں کیونکہ ہم برسوں سے چیف کی نگرانی کر رہے ہیں لیکن ابھی تک اس پر ہاتھ نہیں ڈال سکے ہیں۔ چیف نے اس لڑکی کی پرورش کی ہے اور شاید پوری دنیا میں وہ لڑکی ہی واحد شخصیت ہے جس کے لیے چیف کے دل میں سافٹ کارنر موجود ہے اور شاید اسی کے گھر میں کوئی ڈاکو وغیرہ گھس آیا ہوگا۔"

"کوئی ڈاکو یا شاید اس لڑکی کا کوئی چاہنے والا؟" انور کمال نے کہا "کیونکہ مجھے مس گائیڈ کرنے کا یہی مطلب ہو سکتا ہے۔"

"یار! وہ لڑکی بہت کام کی ہو سکتی ہے" برکی کچھ سوچ کر بولا "اگر کسی طرح اس لڑکی کو قابو میں کر لیا جائے تو چیف کے سارے کرتوت سامنے آ جائیں گے۔ کیونکہ چیف اس پر بہت بھروسا کرتا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ چیف کے بے شمار راز اس کے پاس ہوں گے۔"

"لیکن مجھے تو ایک فکر کھائے جا رہی ہے" انور کمال نے کہا "میں نے جس حلیے کی تصویر بنا دی ہے، اگر اس جیسا کوئی آدمی ان لوگوں کو مل گیا تو وہ اسے پھاڑ کر رکھ دیں گے۔"

"ہاں، یہ تو ہوگا لیکن ضروری نہیں ہے کہ ایسا کوئی آدمی مل ہی جائے" برکی نے اس کی طرف دیکھا "یار۔ اگر تم چاہو تو کسی طرح اس لڑکی سے دوستی کر سکتے ہو۔"

"میں کس طرح دوستی کر سکتا ہوں۔"

"دیکھو، تمہارے پاس ایک مضبوط بہانہ ہے۔" برکی نے بتایا "تم فون کر کے اس لڑکی سے یہ کہہ سکتے ہو کہ تمہیں اس کا چہرہ بہت پسند آیا ہے۔ اور تم اس کا پورٹریٹ بنانا چاہتے ہو کیونکہ تم ایک آرٹسٹ ہو اور تمہارا یہی کام ہے اور میرا خیال ہے کہ نہ تو وہ لڑکی انکار کرے گی اور نہ ہی وہ چیف انکار کرے گا کیونکہ وہ اس لڑکی کی ہر خواہش پوری کرنے کی کوشش کرتا ہے۔"

"اس کے بعد کیا ہوگا؟"

"ظاہر ہے کہ پورٹریٹ ایک نشست میں تو نہیں بنتا" برکی نے کہا "چار پانچ دن لگا دینا اور اس دوران میں کوشش کرنا کہ وہ لڑکی تم سے کھل جائے۔ تم اس کو اپنے اعتماد میں لے سکو۔ ویسے یہ تمہارا ہنر ہوگا۔ دیکھنا یہ ہے کہ تم کس طرح کامیاب ہوتے ہو۔"

☆☆☆

وہ دونوں ایک عام سے ریستوران میں ایک دوسرے سے مل رہے تھے۔

عامر کا موبائل نمبر روبینہ کے پاس تھا۔ اسی نے فون کر کے عامر کو بلا لیا تھا اور اب وہ دونوں بیٹھے ہوئے صورتِ حال پر غور کر رہے تھے "مجھے تو یہ ڈر ہے کہ میں نے جو حلیہ بتایا تھا، کہیں اس قسم کا کوئی آدمی ان کو مل ہی نہ جائے پھر تو اس بے چارے کی شامت آ جائے گی۔"

"روبینہ! اب ہمیں یہ کھیل ختم کرنا ہے" عامر نے کہا "تم یہ بتاؤ کہ تم نے اب تک کتنا میٹر اکٹھا کیا ہے۔"

"بہت کچھ" روبینہ نے بتایا "چیف کے بہت سے ریکارڈ کی میں نے تصویریں اتار لی ہیں اور اب میں ان فائلوں کی تلاش میں ہوں، جو وہ مجھ سے بھی چھپا کر رکھتا ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ ان... فائلوں میں بہت کچھ ہوگا۔"

"ظاہر ہے" روبینہ نے ایک گہری سانس لی "لیکن وہ فائلیں بھی میری دسترس سے باہر نہیں ہیں۔ ذرا سی کوشش سے میں انہیں حاصل کر سکتی ہوں لیکن ایک بات بتاؤ، اس کے بعد میرا کیا انجام ہوگا؟"

"تمہیں کچھ بھی نہیں ہوگا۔"

"چیف تو مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا" روبینہ نے کہا۔

"وہ اس قابل ہی کہاں رہے گا کہ تمہارے خلاف کچھ کر سکے" عامر نے بتایا "اول تو تم قانون کی پناہ میں ہو گی۔ پھر خود چیف کو یا تو عمر قید ہو جائے گی یا پھانسی۔ کیونکہ اس کے گناہوں کی فہرست بہت طویل ہے اور جہاں تک اس کے آدمیوں کا سوال ہے تو وہ اپنی جانیں بچانے کی فکر میں ہوں گے۔"

"تم یہ سب کچھ اتنے اعتماد سے کس طرح کہہ سکتے ہو۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ تمہارا تعلق کسی ایجنسی وغیرہ سے ہو؟"

"ارے نہیں" عامر مسکرا دیا "میں غریب تو صرف تمہاری زلفوں کا اسیر ہوں۔ میرے پاس تمہاری محبت کی طاقت کے سوا اور کوئی طاقت نہیں ہے۔ لیکن مجھے بھروسا ہے کہ اگر چیف کا سارا ریکارڈ کسی اعلیٰ ذمے دار عہدے دار تک پہنچا دیا جائے تو پھر چیف کا سارا کھیل ختم ہو جائے گا۔"

"ایک بات اور..... اب تم میری طرف آنے کی حماقت مت کرنا۔"

"نہیں، اب نہیں آؤں گا۔ کیونکہ جس کے لیے یہ بہادری دکھا رہا تھا، وہ تو خود ہی میرے قریب آ چکی ہے" عامر نے کہا "تم یہ بتاؤ کہ تم یہاں تک کیسے آ گئیں۔ میرا مطلب ہے کہ تمہارے ساتھ تو مسلح محافظ چلا کرتے تھے، وہ کہاں

ہیں؟"

"میں ان سبھوں کو جل دے کر نکلی ہوں" روبینہ نے بتایا "میں نے اپنی گاڑی مارکیٹ کے سامنے کھڑی کی۔ مارکیٹ کے اندر گئی۔ پچھلی طرف سے باہر نکلی۔ ٹیکسی کی اور یہاں تک آ گئی۔ وہ محافظ مارکیٹ کے سامنے ہی ہوں گے۔ اب میں اسی طرح واپس چلی جاؤں گی۔"

"میرا تو دل چاہتا ہے کہ میں تمہیں اس خطرناک جگہ پر واپس نہ جانے دوں لیکن مجبوری ہے کیونکہ ابھی تمہیں بہت کام کرنے ہیں۔"

"کیا خیال ہے میں اب جاؤں؟"

"ہاں اب جاؤ لیکن بہت ہوشیاری سے اور ہر طرح اپنا خیال رکھنا" عامر نے کہا "اگر کسی طرح ان فائلوں تک نہیں پہنچ پاتی ہو تو لعنت بھیج دینا اور خود کو خطرے میں مت ڈالنا' سمجھ گئیں؟"

روبینہ کے جانے کے بعد بھی عامر بہت دیر تک اسی ریستوران میں بیٹھا رہا تھا۔ پھر وہ ریستوران سے باہر آ گیا۔ اس کی گاڑی سامنے ہی کھڑی ہوئی تھی۔

کچھ دیر بعد وہ ایک بوسیدہ سی عمارت میں داخل ہو رہا تھا۔ اینٹوں کی بنی ہوئی یہ عمارت انگریزوں کے زمانے کی یادگار تھی۔ اس کے باہر محکمۂ تحفظِ ماحولیات کا بورڈ لگا ہوا تھا لیکن بہت کم لوگ جانتے تھے کہ اس عمارت میں حکومت کی ایک خفیہ ایجنسی کام کر رہی ہے۔ یہ اس ایجنسی کا ہیڈ آفس تھا۔

اندر کئی لوگ اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے۔

عامر لوگوں سے سلام دعا کرتا ہوا ایجنسی کے چیف کے دروازے پر پہنچ گیا۔

ایجنسی کا چیف ایم ون کہلاتا تھا۔ وہ ایک پروفیسر ٹائپ انسان تھا۔ اور اسے دیکھ کر کوئی بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ شخص حکومت کی ایک اعلیٰ ترین خفیہ ایجنسی کا سربراہ ہے۔

لیکن اس نے بلا کا ذہن پایا تھا۔ انتہائی پیچیدہ معاملات اس ایجنسی کے حوالے کر دیے جاتے اور ایجنسی ان کا سراغ لگا کر حکومت کے خاص ذمے داروں کو آگاہ کر دیتی' یہ سارا کام دفاق کے تحت ہوتا تھا۔

عامر نے دروازے پر ہلکی سی دستک دی اور باس کی آواز سن کر کمرے میں داخل ہو گیا۔ ایم ون اس وقت کسی فائل میں الجھا ہوا تھا۔ عامر کو دیکھ کر اس نے فائل بند کر دی ..... "بیٹھ جاؤ" اس نے سامنے والی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

عامر اس کا شکریہ ادا کر کے کرسی پر بیٹھ گیا۔

"رپورٹ!" ایم ون نے اس کی طرف دیکھا۔

"سر' اب اس لڑکی پر افسوس ہونے لگا ہے" عامر نے کہا "وہ مجھے نہ جانے کیا سمجھنے لگی ہے اور....."

"میں جذباتی یا رومینٹک رپورٹ نہیں مانگ رہا" ایم ون خشک لہجے میں بولا "مجھے ٹھوس رپورٹ دو۔"

عامر نے اسے اس لڑکی کی رپورٹ دے دی تھی۔

"ہاں' اب تم اس کے بارے میں بات کر سکتے ہو" ایم ون نے کہا "اس لڑکی سے کہو کہ وہ جلدی کرے' کسی بھی دن اس شخص کو شبہ ہو گیا تو وہ اس کے ٹکڑے کروا دے گا۔ وہ اس کی بھی پروا نہیں کرے گا کہ اس نے لڑکی کی پرورش کی ہے۔"

"میں تو یہ سوچ رہا ہوں سر کہ اس کھیل کے خاتمے کے بعد اس لڑکی کا کیا ہو گا۔ وہ مجھے اپنے آپ سے بہت قریب محسوس کرنے لگی ہے۔ پیار کرنے لگی ہے مجھ سے۔"

"اور تمہارے ساتھ پرابلم یہ ہے کہ تم کسی اور سے محبت کرتے ہو؟" ایم ون نے کہا "اپنی منگیتر سے؟"

"یس سر۔"

"کوئی بات نہیں' اس لڑکی کو کسی طرح سمجھا دیا جائے گا' تم صرف اپنے فرض کی خاطر ایک ڈراما کر کے اس کے قریب ہوئے تھے۔ تم یہ چاہتے تھے کہ وہ تم سے متاثر ہو جائے اور وہ متاثر ہو گئی اور ہم نے اس کی مدد سے چیف پر ہاتھ ڈال دیا ہے۔"

☆☆☆

ایک لمحے کے لیے اسے بے پناہ حیرت ہوئی تھی۔ پھر بے نیازی کی کیفیت طاری ہو گئی۔

اسے ایک فٹ پاتھ سے اٹھایا گیا تھا۔

وہ اس وقت نہ جانے کس سوچ میں سر بسر اوڑے بیٹھا تھا کہ ایک وین اس کے سامنے آ کر رکی۔ اس میں سے چار آدمی اترے اور انہوں نے اسے زبردستی اٹھا کر ایک وین میں ڈال دیا تھا۔

ایک لمحے کے لیے وہ حیران ہوا تھا۔ پھر معمول کی طرح بے نیازی کی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔

کچھ دیر کے سفر کے بعد وین ایک شاندار مکان کے احاطے میں داخل ہو گئی۔ اسے وین سے اتار کر ایک ڈرائنگ روم میں لے جایا گیا تھا۔ جہاں ایک قوی ہیکل شخص اس کے انتظار میں کھڑا تھا۔ اسے اس قوی ہیکل کے سامنے لے جایا گیا تھا۔

"چیف! یہی ہے وہ آدمی" اس کو لانے والوں میں سے ایک نے کہا۔

"ہوں....." چیف نے ایک ہنکارا لیا "ہاں' لگتا تو وہی ہے۔ تصویر بھی یہی بتا رہی ہے۔ اب ذرا روبینہ کو بلا کر لے آؤ۔"

چند لمحوں بعد ایک خوبصورت سی لڑکی اس کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی تھی "روبینہ پہچانو اس کو۔ یہی ہے نادہ آدمی جو تمہارے بیڈروم میں داخل ہوا تھا۔"

روبینہ بری طرح ہچکچا رہی تھی۔

"گھبراتی کیوں ہو' یہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔"

"بابا! میرا خیال ہے کہ چھوڑ دیں اس کو۔"

"میں جو پوچھ رہا ہوں' اس کا جواب دو" چیف غرایا "یہ وہی آدمی ہے یا نہیں؟"

روبینہ نے ہچکچاتے ہوئے اپنی گردن ہلا دی۔ اس کے چہرے پر بلا کا تاسف تھا۔ اس شخص نے بس ایک نگاہ اس کی طرف دیکھا پھر اپنی گردن جھکا لی تھی۔ روبینہ کو ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے پورے وجود میں آگ سی لگ گئی ہو۔

اس کا دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔ اسے اس بات کا اندیشہ تھا کہ کوئی بے گناہ اس لپیٹ میں آ جائے گا اور ایک درویش صورت انسان اس لپیٹ میں آ گیا تھا "جاؤ تم اندر جاؤ" چیف نے روبینہ کو حکم دیا۔

"بابا!" روبینہ نے کچھ کہنے کی کوشش کی۔

"جاؤ" چیف کچھ بلند آواز میں بولا تھا۔

روبینہ اس آدمی پر ایک نگاہ ڈالتی ہوئی اندر چلی گئی۔

"ہاں' اب بتاؤ" چیف نے اسے مخاطب کیا "تم روبینہ کے کمرے میں کیوں گئے تھے' کیا تعلق ہے اس سے۔"

"اگر وہ یہ بات کہہ رہی ہے تو پھر ٹھیک ہی کہہ رہی ہو گی" وہ دھیرے سے بولا۔

"بکواس کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تجھے اپنی زبان کھولنی ہو گی۔ بتا کون ہے تو..... اور میرے گھر میں کیوں گھسا تھا" چیف اب غصے سے بول رہا تھا۔

"میرا خیال ہے کہ میں نے اگر سچ بول کر اپنی جان بچانے کی کوشش کی تو تمہیں یقین نہیں آئے گا اور اگر جھوٹ بول دیا تو اس لڑکی پر حرف آتا ہے۔ اسی لیے تم میری زبان بند سمجھو۔"

"چیف! یہ آدمی بہت ڈھیٹ معلوم ہوتا ہے" چیف کے ایک آدمی نے کہا "یہ اس طرح نہیں مانے گا۔ اس کی زبان کھلوانی ہو گی۔"

"تو پھر اس کو بیسمنٹ میں لے جاؤ' اس سے بعد میں نمٹا جائے گا۔"

اس آدمی نے ایک نظر چیف کی طرف دیکھا۔ ایک لمحے کے لیے چیف کے بدن پر کپکپی طاری ہو گئی۔ اس شخص کی آنکھوں میں بلا کی کشش تھی پھر اس نے اپنا چہرہ دوسری طرف کر لیا۔ اس کے آدمی اس نوجوان کو اس کمرے سے باہر لے گئے۔

اپنے کمرے میں آ کر روبینہ نے عامر کو موبائل پر فون کیا "عامر! کیا تم فوری طور پر مجھ سے مل سکتے ہو؟"

"خیریت تو ہے؟"

"نہیں" روبینہ نے بتایا "اس وقت دو بج رہے ہیں۔ تم تین بجے تک گرین پارک آ جاؤ۔ میں کسی نہ کسی طرح گھر سے نکل آتی ہوں۔"

"اوکے' لیکن احتیاط سے نکلنا۔"

آدھ گھنٹے بعد عامر اور روبینہ گرین پارک کی ایک بینچ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ عامر نے کچھ دیر بعد اپنی گردن اٹھائی "یہ اتفاق تھا کہ تمہارے بتائے ہوئے حلیے کا ایک آدمی اس شہر میں موجود تھا اور تمہارے چیف کے آدمی اسے اٹھا کر لے آئے ہیں۔"

"مجھے بہت دکھ ہو رہا ہے عامر! نہ جانے اس کے ساتھ کیا سلوک ہو رہا ہو گا۔ ویسے....." وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی تھی۔

"ویسے کیا.....؟"

"وہ بہت مختلف انسان ہے۔" روبینہ نے بتایا "میں نے اتنا سکون شاید ہی کسی کے چہرے پر دیکھا ہو اور اس کی آنکھیں..... خدا کی پناہ! کتنی روشن اور پُرکشش ہیں۔ وہ مجھے عام آدمیوں سے بالکل الگ دکھائی دیا ہے۔"

"تو پھر کیا چاہتی ہو تم؟"

"میں یہ چاہتی ہوں کہ کسی طرح اسے اس قید سے نکلوا دوں" روبینہ نے کہا "اس کی بے گناہی کی وجہ سے ہو سکتا ہے' ہم پر کوئی عذاب ٹوٹ پڑے۔"

"کیسے نکلواؤ گی؟"

"کیا تم کوئی تدبیر نہیں کر سکتے؟"

"دیکھو..... اس کے دو طریقے ہیں" عامر نے کہا "یا تو یہ ہو سکتا ہے کہ میں پولیس کا لشکر لے کر چڑھائی کر دوں لیکن یہ قبل از وقت ہو گا یا پھر دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اسے خاموشی سے فرار کروا دیا جائے۔"

"ہاں' یہی بہتر ہو گا لیکن کیسے.....؟"

"اس کے لیے خود تمہیں ہمت کرنی ہو گی۔ تم کو یہ تو معلوم ہی ہو گا کہ چیف ایسے لوگوں کو کہاں قید رکھتا ہے اور کون

کون لوگ اس کی نگرانی پر ہوں گے۔ یہ پتا چلا کر تم ہی اسے نکلوا سکتی ہو۔"

"ہاں، مجھے ہر حال میں یہ کام کرنا ہے عامر" روبینہ نے کہا "نہ جانے کیوں میں بے چین ہو کر رہ گئی ہوں۔"

☆☆☆

وہ تینوں ایس پی برکی کے سامنے گردنیں جھکائے بیٹھے تھے۔

"دیکھو! میں تم تینوں کی کھالیں اتروا کر بازار میں پھکوا دوں گا۔" برکی نے کہا "اس لیے بہتر یہی ہے کہ صاف صاف بتا دو کہ اس آدمی کو کہاں رکھا گیا ہے۔"

"کس آدمی کی بات کر رہے ہو" ایک نے پوچھا۔

"تمہارے باپ کی؟" برکی نے اس کے گال پر ایک تھپڑ رسید کر دیا تھا "جس کو تم نے اپنے باپ کے اشارے پر اٹھایا ہے۔"

"ہم نے کسی کو نہیں اٹھایا۔"

"پولیس اتنی بے وقوف نہیں ہے۔ اس آدمی کی قید تمہارے چیف کے خلاف بہت بڑا ثبوت ہے۔ ہم اس آدمی کو تمہارے چیف کے گھر سے برآمد کریں گے۔ اس کے بعد اس کے خلاف دوسری کارروائیاں بہت آسان ہو جائیں گی۔ اس لیے اپنے آپ کو شامت میں مت ڈالو اور صاف صاف بتا دو۔"

"تمہیں کیا معلوم کہ ہم نے کس کو اٹھایا ہے؟"

"کیونکہ ہم بہت دنوں سے تم تینوں کی نگرانی کر رہے ہیں" برکی نے بتایا "تم تینوں چیف کے خاص آدمی ہو۔ ہماری نگاہیں تم پر تھیں۔ تم نے جس وقت اس آدمی کو اٹھا کر وین میں ڈالا تھا۔ اس وقت بھی ہم تمہارے پیچھے لگے ہوئے تھے لیکن ہم یہ چاہتے تھے کہ وہ آدمی تمہارے چیف کے یہاں جا کر قید ہو جائے۔ تاکہ اس کی برآمدگی تمہارے چیف کے گھر سے ہو۔ اب بتاؤ اس بے چارے کو کہاں رکھا گیا ہے۔"

"اگر ہم نے یہ بتا دیا تو چیف ہمیں زندہ نہیں چھوڑے گا۔"

"اور اس سے پہلے میں تمہیں زندہ نہیں رہنے دوں گا" برکی نے کہا "تمہارے پاس صرف دو منٹ ہیں یا تم بتا دو یا پھر....."

ان تینوں نے اپنے ہونٹ جیسے سی لیے تھے لیکن برکی کی خاص تدبیروں نے انہیں چیخنے پر مجبور کر دیا۔ دو گھنٹوں کی محنت کے بعد برکی کو معلوم ہو گیا تھا کہ اس قیدی کو ان لوگوں نے کہاں رکھا ہے؟

ان تینوں کو لاک اپ میں ڈلوا کر برکی سیدھا ڈی آئی جی کے پاس پہنچ گیا "سر! آپ سے پرمیشن لینے آیا ہوں۔"

"کس بات کی پرمیشن؟"

"چیف نسیم کے یہاں ریڈ کرنی ہے۔"

"اوہ گڈ۔ تو اس کے خلاف ثبوت مل گیا؟"

"فی الحال صرف اتنا ہوا ہے سر کہ اس نے ایک آدمی کو کڈنیپ کروا لیا ہے" برکی نے بتایا "اور اس آدمی کو اپنے گھر کے تہ خانے میں رکھا ہے۔"

"کون ہے وہ آدمی؟"

"میرا خیال ہے کہ اس آدمی کی کوئی اہمیت نہیں ہے سر!" برکی نے بتایا "وہ دھوکے میں مارا گیا ہے۔"

"کیا مطلب؟"

برکی نے انور کمال کے خدشات کے بارے میں بتاتے ہوئے کہا "ہم تو پہلے ہی سے چیف کے خاص آدمیوں کی نگرانی کر رہے تھے۔ انور کمال کے بتانے کے بعد ہم نے نگرانی اور سخت کر دی اور جب اس کے آدمیوں نے اس آدمی کو اٹھایا تو ہم نے ان تینوں کو اٹھا لیا۔ اب وہ تینوں پولیس کی کسٹڈی میں ہیں اور انہوں نے بتا دیا ہے کہ اس آدمی کو کہاں رکھا گیا ہے؟"

"تو تم یہ چاہتے ہو کہ اس گھر پر ریڈ کر کے اس آدمی کو چھڑا لیا جائے؟"

"یس سر! اس کے دوسرے جرائم کے ثبوت نہ سہی لیکن اس آدمی کی برآمدگی بھی بہت بڑی بات ہو گی اور ہم نے اگر ایک دفعہ اس پر ہاتھ ڈال دیا تو پھر وہ خود بخود کھلتا چلا جائے گا۔"

"ٹھیک ہے، ہماری طرف سے پوری اجازت ہے۔ میں خود اس شخص کو سزا پاتے ہوئے دیکھنے کے لیے بے چین ہو رہا ہوں۔ وش یو گڈ لک۔"

"تھینک یو سر!"

ایک گھنٹے بعد پولیس کی کئی موبائلز چیف کے گھر کی طرف جا رہی تھیں۔

☆☆☆

تہ خانے کی سیڑھیوں پر قدموں کی آہٹیں گونج رہی تھیں۔

اس نوجوان نے گردن اٹھا کر آنے والوں کو دیکھا۔ ایک تو وہی لڑکی تھی، جس نے اس کے خلاف جھوٹ بولا تھا اور اس کے ساتھ ایک اور نوجوان تھا۔ وہ دونوں کامران کے پاس آ کر کھڑے ہو گئے تھے۔

''چلیں یہاں سے'' روبینہ نے کہا ''ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔''

''اس تماشے کو کیا نام دیا جائے؟'' کامران دھیرے سے بولا ''تم ہی نے مجھے یہاں قید کروایا ہے اور اب تم ہی آزاد کرانے چلی آئی ہو۔''

''آپ شرمندہ نہ کریں' جو کچھ ہوا وہ مجبوری میں ہوا تھا۔''

''ہوں..... اور شاید یہ ہے وہ نوجوان جو تمہارے کمرے میں داخل ہوا تھا؟'' کامران نے عامر کی طرف اشارہ کیا۔

''آپ ایک روشن ضمیر انسان معلوم ہوتے ہیں' عامر نے کہا ''جی ہاں' وہ میں ہی تھا۔ اور میں کسی خراب یا غلط نیت سے روبینہ کے کمرے میں داخل نہیں ہوا تھا بلکہ اپنی ڈیوٹی کے لیے آیا تھا۔''

اسی وقت وہ تہ خانہ روشن ہو گیا تھا۔

ان تینوں نے پلٹ کر دیکھا۔ چیف اپنے کچھ لوگوں کے ساتھ تہ خانے میں داخل ہو رہا تھا۔ عامر نے ایک لمحے کے انتظار کے بغیر گولی چلا دی تھی۔ لیکن جلدی میں اس کا نشانہ خالی چلا گیا تھا۔

جبکہ چیف کے چلائے ہوئے ایک آدمی کی گولی نے عامر کو زخمی کر دیا تھا۔ وہ کراہتا ہوا ایک طرف بیٹھ گیا تھا۔

''بس..... تم لوگوں کا کھیل ختم ہو گیا'' تہ خانے میں چیف کی آواز گونجی پھر اس نے روبینہ کو مخاطب کیا ''میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ تم میرے خلاف اتنی بڑی سازش کرو گی۔''

''سازش تو آپ نے کی ہے بابا! آپ نے میری پرورش ہی اس لیے کی کہ میں آپ کی سازش کا شکار ہو جاؤں۔ آپ مجھے اپنے معذور بیٹے کی معذوری پر بھینٹ چڑھا دیں۔ آپ نے اسی دن کے لیے مجھے اتنا خوش رکھا۔ کسی کو میرے قریب نہیں آنے دیا۔ میں زندگی میں کبھی کسی سے محبت نہیں کر سکی کیونکہ آپ کی آنکھیں میری نگرانی کرتی رہتی تھیں۔ آپ کو یاد ہے' آپ نے ایک بار ایک نوجوان کی ٹانگیں تڑوا دی تھیں' صرف اس جرم پر کہ اس بے چارے نے ایک بار مجھ سے دو چار باتیں کر لی تھیں۔''

''ہاں' میں یہ برداشت نہیں کر سکتا تھا'' چیف دہاڑا ''میں نے اپنے بیٹے کے لیے جس لڑکی کی خواہش کی ہے۔ اسے سوائے میرے بیٹے کے کسی اور سے کوئی دلچسپی نہیں ہونی چاہیے۔''

''تو کیا یہ ظلم نہیں ہے' کیا میں انسان نہیں ہوں۔ میرے احساسات اور جذبات نہیں ہیں؟''

''میں یہ سب نہیں جانتا۔ میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ میں اپنے بیٹے کے لیے بالکل معصوم سی لڑکی کا انتخاب کر چکا تھا۔ کسی غیر مرد کی نگاہوں کی ملاوٹ سے بھی پاک اور جانچ پرکھ..... تم پر کس وقت شبہ ہوا ہے مجھے' جس وقت وہ آرٹسٹ تم کو بنانے آیا تھا اور تم اصل حلیہ بتانے سے ہچکچا رہی تھیں کیونکہ اس طرح تمہارا اصل عاشق ہماری گرفت میں آ جاتا'' اس نے عامر کی طرف اشارہ کیا۔

''ٹھیک ہے' آپ اسے میرا عاشق کہہ لیں لیکن یہ پہلا انسان ہے جو خطروں کی پروا نہ کرتے ہوئے مجھ تک پہنچا ہے'' روبینہ نے کہا ''میرے نزدیک اس کی بہت اہمیت ہے۔''

''اور شاید اسی لیے تم نے اس کو بچانے کی خاطر اس آرٹسٹ کے سامنے الٹا سیدھا حلیہ بیان کر دیا اور یہ بے چارہ ہماری زد میں آ گیا لیکن میں بے وقوف نہیں تھا۔ جس وقت تم نے آ کر اس کی تصدیق کی تھی کہ ہاں' یہ وہی آدمی ہے تو یہ بات دوسری بار کنفرم ہو گئی کہ یہ وہ آدمی نہیں ہے۔ یہ کوئی اور ہے جو خواہ مخواہ اس لپیٹ میں آ گیا ہے۔''

''تو پھر اسے جانے دیں بابا! کیونکہ اب یہ جنگ میری اور آپ کی ہے' اسے کیوں قید کیا ہوا ہے؟''

''نہیں' اب یہ آ گیا ہے تو یہ پورا تماشا دیکھ کر جائے گا'' چیف مسکرا دیا تھا ''مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ دلچسپی تو تمہارے اس رستم سے ہے' جس نے تمہارے لیے جان کی بازی لگا دی ہے اور تم جس کے لیے میرے خلاف ثبوت اکٹھے کر رہی تھیں۔''

''آپ کو یہ بات معلوم ہے؟''

''میری ہزار آنکھیں ہیں بے بی! اور اب مجھے افسوس ہے کہ اس تہ خانے میں تین لاشیں ہوں گی۔ ایک اس رستم کی' ایک اس بے چارے کی اور ایک تمہاری کیونکہ میں اپنے خلاف کبھی کوئی ثبوت نہیں رہنے دیتا اسی لیے میں آج تک زندہ ہوں۔''

اسی وقت باہر سے گولیاں چلنے کی آوازیں آنے لگیں۔ ایک آدمی دوڑتا ہوا تہ خانے میں داخل ہوا تھا ''چیف' پولیس نے اٹیک کر دیا ہے۔''

''اوہ..... تو پولیس بھی پہنچ ہی گئی۔''

چیف نے اپنا پستول سیدھا کر لیا ''گڈ بائے بے بی! سب سے پہلے آستین کے سانپ کو مارنا ضروری ہوتا ہے۔''

لیکن اسی وقت کامران اچھل کر سامنے آ گیا۔ چیف کی

چلائی ہوئی گولی اس کے سینے کو ادھیڑتی چلی گئی۔ چیف نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔ اس دوران میں روبینہ نے عامر کا گرا ہوا پستول اٹھا لیا تھا ''گڈ بائے بابا!''

وہ ٹریگر پر انگلی کا دباؤ ڈالتی چلی گئی۔ چیف کے آدمیوں نے گولیاں چلانے کی کوشش کی لیکن اتنی دیر میں وہ تہ خانہ پولیس کے قدموں کی آہٹوں سے گونج اٹھا تھا۔

چیف کے آدمیوں نے اپنے پستول پھینک کر ہاتھ اوپر اٹھا دیے تھے۔ روبینہ دوڑتی ہوئی کامران کے پاس پہنچ گئی تھی۔ ''آپ نے ایسا کیوں کیا؟ میری خاطر اپنی جان کیوں دی؟''

''تمہاری خاطر نہیں.....'' کامران کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی ''عشق کی خاطر کیونکہ میری تخلیق ہی عشق کے لیے.....'' اس کی گردن ڈھلک گئی تھی۔

☆☆☆

دوسرے دن کے اخبارات میں ہنگامہ مچا ہوا تھا۔

انڈر ورلڈ کے سب سے بڑے آدمی کی موت اور چھاپے کی خبریں شائع ہوئی تھیں۔ روبینہ کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا تھا۔ چیف کے گھر سے ایسے بے شمار ثبوت ملے تھے کہ جن کی روشنی میں رات بھر پولیس اور دوسری ایجنسیاں چھاپے مارتی رہی تھیں۔ نہ جانے کتنی گرفتاریاں اور ہو گئی تھیں۔

اور ایک مختصر سی خبر کامران کی بھی تھی۔

ایک آوارہ گرد انسان۔ جو نہ جانے کس طرح چیف کے تہ خانے میں قید کر دیا گیا تھا اور چیف نے مرنے سے پہلے اسے گولی مار کر ہلاک کر دیا تھا۔

اب ساری کہانی ختم ہو چکی تھی۔

ایک طوفان تھا جو گزر چکا تھا۔ ایک آندھی تھم گئی تھی۔

اور اس کہانی کے تیسری شام عامر' روبینہ ایک ہوٹل میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ''تو اب کہانی کچھ یوں تھی کہ تم نے صرف اپنی ڈیوٹی انجام دینے کے لیے میرے سامنے اپنی بہادری دکھائی تھی تاکہ میں تم سے متاثر ہو کر تمہارے قریب آ جاؤں۔''

''ہاں'' عامر نے اپنی گردن ہلا دی ''میں ہر حال میں تمہاری توجہ چاہتا تھا۔''

''مبارک ہو کہ تم اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے'' روبینہ کے لہجے میں اداسی تھی۔

''یہ بتاؤ کہ اب تم کیا کرو گی؟'' عامر نے پوچھا ''کیا اس شہر میں تمہیں کوئی سپورٹ کرنے والا ہے؟''

''نہیں' اب میرا کوئی نہیں ہے'' روبینہ کی آنکھیں دھندلا گئی تھیں ''کچھ دنوں پہلے تک میں شہزادیوں کی طرح رہا کرتی تھی۔ شاندار گاڑیاں تھیں میرے پاس۔ مسلح محافظ میرے ساتھ چلا کرتے۔ لیکن اب صرف سناٹا رہ گیا ہے۔ چیف کی موت کے بعد یہ سارا کھیل اس طرح ختم ہو گیا جیسے کوئی فلم ختم ہو گئی ہو۔''

''تو پھر.....؟''

''پھر یہ کہ میری ایجوکیشن میرا ساتھ دے گی'' روبینہ نے کہا ''کچھ بھی ہو' چیف کیسا بھی سہی لیکن اس نے مجھ پر ایک احسان یہ بھی کیا کہ مجھے اعلیٰ تعلیم دلوا دی تو اب میں اسی کے سہارے زندگی گزار لوں گی۔''

''ایک سہارا اور بھی تو ہے؟''

''وہ کیا؟''

''میں ہوں نا تمہارے ساتھ؟'' عامر نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔

''تم.....؟''

''ہاں میں..... یہ درست ہے کہ میں تمہارے پاس ایک پلاننگ کے تحت آیا تھا لیکن آہستہ آہستہ تمہاری محبت میں گرفتار ہوتا چلا گیا اور جہاں تک میری منگیتر کا تعلق ہے تو اس کو اور بھی بہت لوگ مل جائیں گے اور خود اس نے بھی یہی کہا ہے کہ میں تمہیں اپنا لوں۔ روبینہ! وہ نوجوان تمہیں اپنانا چاہتا ہے جو ایک مارکیٹ میں تم سے ملا تھا۔ جس نے تمہاری گاڑی کا تعاقب کیا تھا اور جو جان پر کھیل کر تمہارے گھر میں گھس آیا تھا۔ بتاؤ' کیا تم اسے قبول کرتی ہو؟''

روبینہ نے مسکرا کر اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا تھا۔

اور اس ہوٹل سے بہت دور ایک قبرستان میں ایک تازہ قبر تھی۔ اس قبر پر گلاب کے دو پھول رکھے ہوئے تھے اور پھول رکھنے والی لڑکی اپنے آنسوؤں کو پونچھتی ہوئی قبرستان سے باہر جا رہی تھی۔

اور انور کمال اپنے اسٹوڈیو میں کسی شخص سے پوچھ پوچھ کر اس آدمی کی تصویر بنانے کی کوشش کر رہا تھا جس نے اس پر قاتلانہ حملہ کیا تھا۔ اس آدمی کو بھی اس کا ایس پی دوست بری کا لایا تھا۔

سب کچھ پہلے کی طرح تھا۔

زندگی کے معمولات جاری تھے اور اسی شہر میں کسی اور چیف کے یہاں شاید کوئی اور روبینہ پرورش پا رہی ہو گی کیونکہ یہ سلسلہ ازل سے ہے اور ابد تک جاری رہے گا۔

تیسرا رنگ

طلسم تماشا

نشور ہادی

آرٹ سے وابستہ افراد منفرد مزاج و طبیعت رکھتے ہیں۔ ان کی حساس طبیعت انہیں دوسروں سے ممتاز کرتی ہے..... اچھوتے جذبات و احساسات نزاکت اور انفرادیت کے حامل ہوتے ہیں۔ ان کی جمالیاتی حس انہیں در در بھٹکائے رکھتی ہے۔ کسی بھی شے میں حسن و ترتیب ان کی زندگی کی اولین شرط ہوتی ہے۔ کینوس پر رنگ بکھیرنے والے ایک ایسے ہی آرٹسٹ کی کہانی جس کی زندگی میں اچانک بھونچال آگیا تھا۔

حصول محبت اور ہوس محبت میں گرفتار کرداروں کی کشمکش کا عبرت آموز ماجرا

پینتیس سالہ بیوہ بیگم زرینہ کے گھر کی پارٹی میں شریک ہونے والا کوئی فرد سوچ ہی نہیں سکتا تھا کہ اس رات وہاں ایک ایسا واقعہ پیش آئے گا جو کئی افراد کی زندگی کے دھاروں کا رخ تبدیل کردے گا۔

پندرہ سال قبل وہ بیگم زرینہ وہاب کہلاتی تھی لیکن ایسا چند مہینے ہی رہا تھا۔ وہاب زماں شادی کے بعد چند مہینے ہی زندہ رہا تھا۔ اس کی موت کچھ عرصے تک پُراسرار بھی جانی رہی تھی۔ اخبارات سے لوگوں کو علم ہوا تھا کہ ایک صبح بیگم زرینہ سو کر اٹھی... تو اس نے اپنے پہلو میں وہاب زماں کو مردہ پایا..... پولیس کو اسی نے اطلاع دی تھی اور رو رو کر اپنے بیان میں کہا تھا کہ وہاب زماں کی موت اسے مشکوک لگی ہے۔ رات بارہ بجے وہ کسی دوست سے مل کر آیا تھا تو ہنس بول رہا تھا۔ دونوں میاں بیوی ڈیڑھ بجے کے قریب سوئے تھے۔

پوسٹ مارٹم رپورٹ سے پتا چلا تھا کہ وہاب زماں کی موت حرکتِ قلب بند ہوجانے سے ہوئی تھی۔ کسی بات سے بھی پولیس کو شبہ نہیں ہوسکا تھا کہ وہاب زماں کی موت طبعی نہیں تھی۔ اگر سازش کے امکان پر غور کیا جاتا تو سب سے زیادہ، بلکہ واحد شخصیت بیگم زرینہ ہی کی تھی۔ وہاب زماں کی کروڑوں کی دولت اسی کے ہاتھ لگی تھی۔ وہاب زماں اپنے خاندان کا آخری فرد تھا۔ اپنی زمینوں سے بھی اسے سالانہ خاصی آمدنی ہوتی تھی۔ وہ عیش و عشرت کا دل دادہ تھا۔ کوئی کاروبار اس نے اسی لیے نہیں کیا تھا کہ اپنا وقت ''دو اور دو، چار'' کے چکر میں پڑ کر ضائع نہ کرے۔ وہ شادی کرنے سے بھی بھاگتا تھا۔ خود کو کسی بندھن میں نہیں جکڑنا چاہتا تھا لیکن چالیس سال کی عمر میں وہ کوہستانی علاقے کی ایک خوب صورت لڑکی کی دہلیز پر اپنا دل ہار بیٹھا۔ وہ زرینہ تھی جو ایک معمولی گھر میں پیدا ہوئی تھی۔ ماں کا انتقال ہوچکا تھا اور باپ طویل علالت کے باعث موت کی چوکھٹ پر سسک رہا تھا۔ اپنی بیٹی کو ایک مال دار شخص سے بیاہ کر وہ دنیا سے رخصت بھی ہوگیا۔

لوگوں کے خیال کے مطابق زرینہ جو بیگم زرینہ وہاب بن گئی تھی، ایک نہایت ذہین لڑکی تھی۔ ایک معمولی گھر میں پیدا ہونے اور واجبی سی تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود اس نے بہت کم وقت میں خود کو متمول طبقے کے ماحول میں ڈھال لیا تھا۔ ایک ٹیچر ملازم رکھ کر تھوڑی بہت انگریزی بولنا بھی سیکھ لی تھی۔ خود وہاب زماں بھی اپنی بیوی کو ''ماڈرن'' دیکھنا چاہتا تھا۔ اس نے بھی کوشش کی تھی کہ اس کی بیوی جلد از جلد متمول طبقے کے طور طریق سیکھ لے۔

صرف چھ ماہ بعد کوئی بیگم زرینہ وہاب کو دیکھ کر گمان بھی نہیں کرسکتا تھا کہ وہ کوہستانی علاقے کے ایک غریب گھر کی لڑکی ہوگی۔

ساتویں مہینے میں وہاب زماں دنیا سے کوچ کرگیا.....

پولیس نے اسے قطعی طور پر ایک طبعی موت قرار دے کر اس سلسلے میں زیادہ چھان بین نہیں کی..... اس کے باوجود اس طبقے کے کچھ لوگوں میں سرگوشیاں ہوتی رہیں۔ ان سرگوشیوں کی بنیادی وجہ بیگم زرینہ وہاب کی عمر تھی۔ وہ وہاب زماں سے بیس سال چھوٹی تھی۔ سرگوشیاں کرنے والوں کا خیال تھا کہ کوہستانی علاقے کی ایک گرم مزاج جوان لڑکی وہاب زماں جیسے چالیس سالہ شخص کے ساتھ گزارا کرہی نہیں سکتی تھی۔

کچھ دن بعد ایک محدود حلقے میں یہ افواہ بھی پھیلی کہ کوہستانی علاقے کے جس تنومند جوان کو وہاب زماں نے نوکر کی حیثیت سے ملازم رکھا تھا، اس سے اس کی سفارش اس

کی بیوی ہی نے کی تھی۔

بعض لوگ ان افواہوں پر ناک بھوں بھی چڑھاتے تھے۔ ان کے خیال میں وہ افواہیں بے بنیاد الزام تراشیاں تھیں۔ ''جرم'' بس اس کی کم عمری بن گئی تھی۔ درحقیقت کسی نے بھی کچھ دیکھا نہیں تھا۔ دو سال تو اس طرح گزرے کہ زرینہ وہاب گھر سے ہی بہت کم نکلی، پھر جب اس نے زیادہ نکلنا شروع کیا تو سادگی کے ساتھ!

دھیرے دھیرے ان تمام افواہوں نے دم توڑ دیا۔ بیگم زرینہ وہاب کو عزت کی نظر سے دیکھا جانے لگا۔ بیوگی کے بعد اسے کسی نے بھی رنگین لباس میں نہیں دیکھا تھا۔ وہ ہمیشہ سفید لباس میں نظر آتی تھی۔ سوشل بن جانے کی وجہ سے اس کے حلقۂ احباب میں مرد بھی آگئے تھے جن سے گفتگو میں اس نے بے تکلفی کی ایک حد رکھی تھی۔ اگر کوئی بلا ارادہ بھی اس حد سے آگے نکلنے لگتا تو زرینہ وہاب کے تیور بدل جاتے تھے۔ ان تیوروں کو محسوس کر کے مخاطب محتاط ہو جاتا تھا۔

ابتدا میں وہ بیگم زرینہ وہاب ہی کہلاتی تھی۔ کبھی کوئی صرف بیگم زرینہ بھی کہہ دیتا تھا۔ اب پندرہ سال بعد وہ بیگم زرینہ ہی کہلاتی تھی۔ وہاب بھی بھلا دیا گیا تھا اور وہاب کی وہ موت بھی جسے اس وقت پُراسرار سمجھا گیا تھا۔ وہ ہر جگہ احترام کی نظر سے دیکھی جاتی تھی۔ لوگ مثالیں دیتے تھے کہ جوانی میں بیوہ ہونے کے بعد ایک پاکیزہ زندگی گزارنا کوئی بیگم زرینہ سے سیکھے۔

سوشل ہونے کی وجہ سے بیگم زرینہ شہر کی تمام اہم پارٹیوں میں شریک ہوتی تھی اور خود بھی سال میں دو تین بار کسی نہ کسی بہانے سوڈیڑھ سو چنیدہ افراد کو اپنے گھر میں مدعو کیا کرتی تھی جن میں عورتیں اور مرد بھی ہوتے تھے۔

☆☆☆

بیگم زرینہ کے گھر کی اس پارٹی میں اظفر بھی مدعو تھا۔ اگرچہ اس کا تعلق متمول طبقے سے نہیں تھا لیکن گزشتہ تین سال میں اس نے ایک منفرد پینٹر کی حیثیت سے جو شہرت حاصل کی تھی، شاید اسی کی وجہ سے پارٹی کا دعوت نامہ اسے بھی ملا تھا۔ سال بھر پہلے اس کی شادی ایک خوب صورت لڑکی زرقا سے ہوئی تھی جس کا تعلق متمول طبقے سے تھا۔ وہ اظفر کی پینٹنگز دیکھنے آرٹ گیلری میں آئی تھی اور اظفر اس پر فریفتہ ہو گیا۔ اس کے خیال کے مطابق وہ چغتائی آرٹ کا بہترین نمونہ تھی۔ اظفر ہمیشہ سے چغتائی آرٹ کا مداح رہا تھا۔ بعض کالم نگاروں نے شاید ٹھیک ہی لکھا ہو کہ اس کی پینٹنگز میں کہیں کہیں چغتائی آرٹ کی جھلک نظر آجاتی تھی۔ ممکن تھا کہ اظفر سے ایسا لاشعوری طور پر ہو جاتا ہو۔

ایک منفرد پینٹر کی حیثیت سے اظفر کے مالی حالات بہت اچھے ہو چکے تھے لیکن ایسا بھی نہیں تھا کہ اس کا شمار متمول طبقے میں کیا جا سکتا۔ اسی لیے اس نے زرقا کے لیے شادی کا پیغام ڈرتے ڈرتے بھیجا تھا۔ پیغام کی پذیرائی پر اسے حیرت آمیز مسرت ہوئی تھی۔ زرقا کے والد نے اس شادی کے سلسلے میں عجلت سے بھی کام لیا تھا۔ زرقا بہت جلد اس کی بیوی بن گئی۔

لڑکیوں کی توجہ اظفر کو ہمیشہ حاصل رہتی تھی کیونکہ وہ نہایت وجیہہ اور خوب رو تھا۔ خوب صورت لڑکیاں اظفر کو بھی پسند آتی تھیں لیکن اس نے خود کو اس قسم کے معاملات میں نہیں الجھایا تھا۔ عسرت کی زندگی اسے پسند نہیں تھی۔ اس سے چھٹکارا پانے کے لیے وہ پوری تن دہی سے اپنے نام میں لگا رہتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اس میں پینٹر بننے کی غیر معمولی صلاحیتیں تھیں جنہیں بس دنیا کے سامنے لانے کی دیر تھی۔

آخر اظفر کا خواب پورا ہوا۔ اس کے دن پھر گئے۔ وہ قیمتی فرنیچر سے آراستہ ایک اچھے فلیٹ کا مالک بن گیا، ایک کار بھی خرید لی، آسودہ حالی کے بعد وہ خوب صورت لڑکیوں کی طرف بھی توجہ دینے لگا۔ ان میں سے بعض نے اس سے شادی بھی کرنا چاہی لیکن اظفر نے ان کے ساتھ اس آخری حد تک جانے سے دامن بچا لیا۔ بیوی کی حیثیت سے اس کے ذہن میں ایک آئیڈیل لڑکی تھی۔ وہ آئیڈیل اسے اپنی آرٹ گیلری میں زرقا کے نام سے ملا۔

اس جوڑے کو ایک مثالی جوڑا کہا جاتا تھا۔ زرقا اگر چغتائی آرٹ کا ایک نادر نمونہ تھی تو اظفر بھی یونانی دیومالا کے کسی ہیرو سے کم نہ تھا۔ لڑکیاں کسی پر بلاوجہ فدا نہیں ہوتیں۔

شادی کے سات آٹھ ماہ بعد جب جذبات کا جوار بھاٹا ختم ہوا تو اظفر اپنی طرف متوجہ ہونے والی نئی لڑکیوں کی طرف پھر راغب ہونے لگا۔ اب شادی شدہ ہونے کی وجہ سے وہ بہت محتاط رہتا تھا۔ لڑکیوں سے خلوت میں ملاقاتیں وہ حد درجہ خفیہ رکھنے کی کوشش کرتا تھا لیکن کسی طرح زرقا کو اس کا پتا چل ہی گیا۔ اس کے دل پر ایک بھالا سا لگا۔ اس نے اپنے باپ کے حکم پر اپنی محبت کی قربانی دی تھی جس کے صلے میں اظفر نے اسے ایک زخم دیا تھا۔

زرقا نے اظفر سے کچھ کہا تو نہیں لیکن اس کے رویے میں جو کشیدگی آئی، وہ اظفر نے بھی محسوس کر لی۔ وہ فکرمند ہو گیا۔ اس کے دماغ میں اس اندیشے نے سر ابھارا کہ دوسری لڑکیوں سے اس کی ملاقاتیں شاید زرقا کے علم میں آگئی ہیں۔

اظفر نے کچھ دن بے چینی میں گزارے، پھر ایک صبح وہ

زرقا سے پوچھ ہی بیٹھا۔ ''سچ سچ بتاؤ زرقا! میں پندرہ دن سے محسوس کر رہا ہوں۔ تم کچھ بدلی بدلی سی ہو!''

زرقا شاید بھری بیٹھی تھی اور چاہتی یہ تھی کہ بات اظفر شروع کرے۔

''اگر میں بدلی بدلی سی ہوں تو اس کی وجہ آپ کو مجھ سے نہیں پوچھنی چاہیے تھی۔'' زرقا نے بڑے تلخ لہجے میں کہا۔ ''اب سیمیں اور فائزہ سے آپ کی تنہائی میں ملاقات ہوگی تو مقصد خود ہی آپ کی سمجھ میں آجائے گا۔ مجھے صرف یہی دو نام معلوم ہوئے ہیں۔ ممکن ہے کچھ اور نام بھی ہوں۔''

اس وقت اظفر کو اپنی سانسیں رکتی ہوئی سی لگی تھیں۔ سیمیں اور فائزہ وہ لڑکیاں تھیں جن سے وہ گزشتہ پندرہ دن میں دو دو بار مل چکا تھا۔ اب اس کے لیے اس کے سوا کوئی راستہ نہیں رہا کہ معافی تلافی کی طرف جائے۔ اس نے خود کو کسی حد تک بے قصور ظاہر کرنے کے لیے یہ بھی کہا کہ وہ لڑکیاں بری طرح اس کے پیچھے پڑ گئی تھیں، اور ایسا ہو تو بعض اوقات نازک لمحات میں مرد کے قدم بہک ہی جاتے ہیں۔ زرقا نے اس جواز کو محض ایک بہانہ قرار دیا اور اسے دھمکی دے دی کہ اب اگر اسے ایسی کوئی بات معلوم ہوئی تو وہ اسے چھوڑ کر اپنے باپ کے گھر چلی جائے گی۔ پھر جب تک اظفر اپنی روش نہیں بدلے گا، وہ واپس نہیں لوٹے گی۔ اس نے صاف الفاظ میں یہ بھی کہہ دیا کہ اس کے بعد اظفر نے زیادہ عرصے تک اپنی روش نہیں بدلی تو وہ طلاق کا مطالبہ بھی کر سکتی ہے۔ اس کا خیال تھا کہ وہ دور رہ کر بھی اظفر کی سرگرمیوں سے باخبر رہ سکتی ہے۔

طلاق کی بات پر اظفر بوکھلا گیا۔ وہ زرقا سے واقعی محبت کرتا تھا اور اس سے جدا ہونے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ دوسری لڑکیوں سے تعلقات رکھتے ہوئے اس کے ذہن میں یہ بات رہتی تھی کہ وہ ان لڑکیوں سے محبت نہیں کرتا۔ اس کی ان سرگرمیوں کی بنیاد محض تنوع پسندی تھی۔ محبت وہ زرقا ہی سے کرتا تھا۔

جب زرقا کے رویے میں سختی برقرار رہی تو اظفر کو وعدہ کرنا پڑا کہ اب وہ ایسی غلطیاں کبھی نہیں دُہرائے گا لیکن یہ وعدہ کرتے وقت بھی وہ سوچتا رہا تھا کہ اس وعدے پر قائم رہنا کیا اس کے لیے ممکن ہوگا؟

معافی تلافی اور وعدوں کے بعد زرقا نے کہا کہ اگر اظفر نے وعدہ شکنی نہیں کی تو وہ دھیرے دھیرے اپنے دل کا زخم مندمل کر لے گی۔

وقت گزرنے کے ساتھ زرقا نے محسوس کیا کہ اظفر اپنے

''یہ ہماری کمپنی کے سیلز منیجر ہیں، پچھلے ایک سال سے انہوں نے کمپنی کی بنی ہوئی کوئی چیز فروخت نہیں کی..... اس لیے اس حال میں یہاں سے رخصت ہو رہے ہیں۔''

وعدے پر قائم رہنا چاہتا ہے۔ فون پر بھی وہ اپنی مداح لڑکیوں کو دو تین جملوں میں ٹرخا دیتا تھا۔ اس کی یہ روش دیکھ کر زرقا میں تبدیلی آنے لگی اور میاں بیوی کے تعلقات پھر خوش گوار ہو گئے۔ دراصل زرقا اپنی ناکام محبت کے بعد اپنی شادی کو ناکام نہیں بنانا چاہتی تھی۔ اس کے والد کو یہ گمان ہو سکتا تھا کہ اس نے جان بوجھ کر اظفر سے اپنے تعلقات خراب کیے ہوں گے تاکہ دوبارہ اس کی شادی ریحان سے ہو جائے جس سے وہ محبت کرتی تھی لیکن اس کے والد ریحان سے اس کی شادی پر آمادہ نہیں تھے۔

جب ان دونوں میاں بیوی کو بیگم زرینہ کی پارٹی کا دعوت نامہ ملا تو زرقا نے کہا۔ ''اس پارٹی میں ہم ضرور چلیں گے اظفر!..... میری خواہش ہے کہ بیگم زرینہ کو دیکھوں۔ بہت شہرت سنی ہے اس کی۔ مجھے کسی نے بتایا تھا کہ وہ میری شادی میں بلائی گئی تھی لیکن وہ ماحول ایسا نہیں ہوتا کہ تمام مہمانوں کو توجہ سے دیکھا جا سکے۔''

☆☆☆

بیگم زرینہ نے ڈنر کا اہتمام کیا تھا جس سے دو گھنٹے قبل ''ڈرنک'' کا دور چلا جو اس طبقے کی پارٹیوں کا لازمہ بن چکا ہے۔

تمام اہتمام کوٹھی کے ہال میں کیا گیا تھا جہاں اتنی کشادگی تھی کہ تین لمبی میزیں لگائی گئی تھیں۔ وہاں سے ایک زینہ اوپری منزل کو بھی جاتا تھا۔ ابتدا میں مہمان کرسیوں پر بیٹھنے کے بجائے اِدھر اُدھر ٹہلتے اور ایک دوسرے سے باتیں کرتے ہوئے انواع و اقسام کی شرابوں سے لطف اندوز

ہو رہے تھے۔ ہال کے ایک گوشے میں بار کی طرز کا کاؤنٹر بنایا گیا تھا جہاں تین ملازم مہمانوں کی اس خاص خدمت کے لیے موجود تھے۔ تفریح طبع کے لیے آرکسٹرا کے ساتھ ایک گانے والی کو بھی بلایا گیا تھا۔ وہ ہال کے وسط میں "دل" کی طرح تراشے گئے ایک چبوترے پر سازندوں کے ساتھ بیٹھی تھی۔ اس کا نام نگار تھا۔ وہ کوئی بہت بڑی گلوکارہ نہیں تھی۔ شہر کے ایک بڑے ہوٹل میں رات کو آٹھ بجے سے دس بجے تک گیت اور ہلکی پھلکی غزلیں گایا کرتی تھی۔ اس کی عمر بائیس چوبیس سال کے لگ بھگ ہوگی۔ نقش و نگار بہت دلآویز نہیں تو برے بھی نہیں تھے۔ صرف اس کی تیکھی آنکھیں ایک خاص کشش رکھتی تھیں۔ شانوں تک کٹے ہوئے بال گھونگریالے تھے۔ پیشانی پر انہیں یکسانی سے تراشا گیا تھا۔ وہ اس وقت غالب کی ایک غزل شروع کر رہی تھی جب زرقا اور اظفر وہاں پہنچے۔

"بھی بلائی گئی ہے یہاں!" اظفر کی پیشانی پر ایک سلوٹ پڑ گئی۔

"کون؟" زرقا نے پوچھا۔

"یہ گلوکارہ! نگار نام ہے اس کا!"

"آپ کا انداز ایسا ہے جیسے اس کی موجودگی آپ کو اچھی نہیں لگی۔"

"ایک ہوٹل میں گاتی ہے۔" اظفر نے ناخوش گوار لہجے میں بتایا۔

"میں اسے دیکھ چکی ہوں۔"

"سال بھر سے یہ ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑی ہوئی ہے۔"

زرقا نے غور سے نگار کی طرف دیکھا، پھر مسکرا کر بولی۔ "میں سمجھ سکتی ہوں کہ یہ کیوں آپ کے دل کو نہیں چھو سکی۔ بات مجھ سے شادی کی ہو یا دوسری لڑکیوں کی، آپ کے آرٹسٹک مزاج کا ہمیشہ اس میں دخل رہا ہے۔"

اظفر کے چہرے سے تکدر کا اظہار ہوا۔

زرقا اس سے بے خبر، نگار کی طرف دیکھتے ہوئے بولتی رہی۔ "یہ آپ کے مزاج پر پوری نہیں اترتی۔ جن لڑکیوں کو میں دیکھ چکی ہوں، وہ آپ کے آرٹسٹک مزاج کے عین مطابق تھیں۔"

"گڑے مردے آج پھر اکھاڑو گی؟" اظفر کا لہجہ ناخوش گوار بھا۔

زرقا نے چونک کر اظفر کی طرف دیکھا، پھر اس سے بولی۔ "آئی ایم سوری اظفر! یقین کریں میرا وہ مقصد ہرگز نہیں تھا۔ چند جملے بس برسبیل تذکرہ زبان پر آ گئے۔ پلیز! مجھے معاف کر دیں۔"

زرقا کی معذرت دل سے تھی جو اظفر نے محسوس کر لی۔

"بس ٹھیک ہے۔" وہ مسکرایا۔ "اب میں بھول جاؤں گا کہ تم نے کیا کہا تھا۔"

"ہیلو مسٹر اظفر!" ایک آواز نے انہیں چونکایا۔ کوئی عورت اس طرح بولی تھی جیسے گنگنا رہی ہو۔

زرقا اور اظفر نے چونک کر اس عورت کو دیکھا۔ زرقا کے دماغ میں فوراً بیگم زرینہ کا نام آیا۔ اس کی منفرد وضع قطع خاصی مشہور تھی۔ وہ سادہ سی سفید جارجٹ کی ساڑی باندھے ہوئے تھی۔ بلاؤز بھی سفید تھا۔ پیروں میں سینڈلیں بھی سفید تھیں۔ کانوں میں پڑے ہوئے آویزے بھی سفید موتیوں کے تھے۔ گلے میں پڑا ہوا ہلکا سا لاکٹ پلاٹینم کا معلوم ہوتا تھا۔ ایک ہاتھ کی کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی کا چرمی اسٹریپ بھی سفید تھا۔ دوسرے ہاتھ میں پڑے ہوئے پلاٹینم کے کڑے پر چھوٹے چھوٹے پتھر جڑے ہوئے تھے۔ وہ ڈائمنڈ بھی ہو سکتے تھے۔

"آپ کی تصویریں اخبارات میں دیکھتی رہی ہوں۔" وہ مصافحے کے لیے اظفر کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولی۔ "ایک اخبار کے دفتر سے ہی آپ کا پتا معلوم کر کے دعوت نامہ بھیجا تھا۔ آپ کی پینٹنگز کی میں بہت دلدادہ ہوں۔"

جب اس نے اظفر سے مصافحہ کیا تو زرقا نے خاص طور پر چیک کیا کہ الفاظ میں جو گرم جوشی تھی، وہ مصافحہ کرنے میں نہیں تھی۔ زرقا نے کہیں سنا بھی تھا کہ مردوں سے مصافحہ تو وہ کر لیتی ہے لیکن اپنا ہاتھ بہت ڈھیلا رکھتی ہے۔

"آپ نے اندازہ تو لگا ہی لیا ہوگا کہ میں کون ہوں!" وہ اس حد تک کھل کر مسکرائی کہ اس کے خوب صورت سفید دانت، بقعۂ نور بنے ہوئے ہال کی روشنیوں سے جھلملا گئے۔

"آپ یقیناً ہماری میزبان ہیں۔" اظفر بھی مسکرایا، پھر زرقا کی طرف اشارہ کرتا ہوا بولا۔ "یہ میرے گھر کی حکمراں ہیں۔"

"بہت خوب!" بیگم زرینہ ہنسی۔ "تعارف بھی آپ نے آرٹسٹک انداز میں کرایا۔ ویسے میں تمہیں جانتی ہوں.... بے بی! اس نے مصافحے کے لیے زرقا کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ "تمہارے والد نے مجھے یہ عزت بخشی تھی کہ مجھے شادی میں مدعو کیا تھا۔"

زرقا سے اس نے پرجوش انداز میں مصافحہ کیا۔

"شادی میں آپ نے مجھے نہیں دیکھا تھا؟" اظفر بولا۔

"وہاں آپ کے چہرے پر پھولوں کی جھالریں لٹکی ہوئی تھیں۔ کسی مصروفیت کے باعث میں وہاں نکاح کے بعد رکی بھی نہیں تھی۔ ہاں مجھے یہ تو دعوت نامے ہی سے معلوم ہو گیا تھا کہ بے بی کا مستقبل آپ ہی سے وابستہ کیا جا رہا ہے..... اوہ! میں باتوں ہی میں لگ گئی۔ آپ لوگوں نے کچھ لیا بھی؟"

"لے لیں گے، جلدی کیا ہے۔ ہم ابھی تو آئے ہیں؟"

"نہیں، پہلے کچھ لیں تو سہی!" بیگم زرینہ نے بڑی محبت سے زرقا کا بازو پکڑا۔ "آیئے!" اس کا رخ بار کاؤنٹر کی طرف تھا۔

"کیا سب مہمان آ گئے ہیں؟" اظفر صرف بات کرنے کے لیے پوچھ بیٹھا۔

"تقریباً سبھی آ گئے ہیں..... دو چار باقی ہیں؟"

کاؤنٹر کے پاس رک کر اس نے زرقا اور اظفر سے پوچھا "آپ دونوں کیا لینا پسند کریں گے۔"

"میں تو صرف کوئی جوس لوں گی اگر....."

زرقا کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی بیگم زرینہ بولی۔ "ہاں ہاں، کیوں نہیں! میں بھی ایسے موقعوں پر صرف جوس ہی لیتی ہوں۔ باقی اہتمام صرف مہمانوں کے لیے ہے۔"

کاؤنٹر کے پیچھے، ان کے سامنے کھڑا ہوا ملازم فوراً حرکت میں آیا۔ جوس کا ایک گلاس زرقا کے سامنے آ گیا۔

"میں وہسکی لوں گا۔" اظفر نے کہا۔

"ان کے لیے ایک لارج وہسکی۔" بیگم زرینہ نے ملازم سے کہا۔

اظفر کچھ بولتے بولتے رک گیا۔

"میں نے ابھی ایک گلاس ختم کیا ہے بے بی!..... اب کچھ وقفے سے لوں گی۔" بیگم زرینہ نے جواب دیا، پھر بڑی سنجیدگی سے پوچھا۔ "تمہیں میرا یہ انداز تخاطب برا تو نہیں لگ رہا ہے؟ دراصل میں عمر میں تم سے کافی بڑی ہوں اس لیے....."

"یہ مجھے اچھا لگ رہا ہے بیگم زرینہ!" زرقا نے اس کی بات کاٹی۔ "میں آپ کا بہت احترام کرتی ہوں۔"

زرقا نے احترام کی بات میں کسی مبالغے سے کام نہیں لیا تھا، عمر میں بھی بیگم زرینہ اس سے پندرہ سال زیادہ تھی۔ یہ اور بات ہے کہ وہ اپنی صحت اور اپنے رکھ رکھاؤ کے باعث پچیس تیس سال کے درمیان معلوم ہوتی تھی۔

وہ کاؤنٹر کے پاس سے ہٹ آئے۔ اظفر کے ہاتھ میں

گھر صحرا سے بدتر ہے
جو اولاد نہیں ہے
آج بھی ہزاروں گھرانے اولاد کی نعمت سے محروم سخت پریشان ہیں۔ اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہوں کیونکہ مایوسی تو گناہ ہے۔ نقص چاہے خاتون میں ہو یا مردانہ جراثیم کا مسئلہ ہم نے ویسی طبی یونانی قدرتی جڑی بوٹیوں سے ایک خاص قسم کا بے اولادی کورس ایجاد کیا ہے جس کے استعمال سے آپ کے آنگن میں بھی خوشیوں کے پھول کھل سکتے ہیں آپ کے ہاں بھی خوبصورت بیٹا پیدا ہو سکتا ہے آج ہی گھر بیٹھے ہم سے فون پر رابطہ کریں اور بذریعہ ڈاک وی پی (V.P) بے اولادی کورس منگوا لیں۔
رجسٹرڈ
المُسلم دارُالحکمت
ضلع و شہر حافظ آباد ـــــ پاکستان
0300-6526061
0547-521787
0547-522468
اوقات فون: صبح 9 بجے سے دوپہر 2 بجے تک، عصر 4 بجے سے رات 11 بجے تک
آپ ہمیں صرف فون کریں۔ بے اولادی کورس آپ تک پہنچانا ہمارا کام ہے۔

وہسکی کا گلاس تھا۔

''میں اب ذرا دوسرے مہمانوں کو بھی دیکھوں۔'' بیگم زرینہ نے کہا، پھر بولی۔ ''کیا یہاں آپ لوگوں کے شناسا نہیں ہیں؟''

''میں نے دیکھا ہے اپنی دو ایک شناسا خواتین کو!'' زرقا بول پڑی۔

''پھر تو کوئی مسئلہ ہی نہیں۔'' بیگم زرینہ نے کہا۔ ''ایک سے دوسرا، اور دوسرے سے تیسرا! بات چلتی رہتی ہے۔ اس قسم کی پارٹیز کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ حلقۂ احباب وسیع ہوتا رہتا ہے۔''

''آپ ہماری فکر نہ کریں۔'' زرقا مسکرائی۔ ''اپنے مہمانوں کو دیکھیں!''

''کوئی تکلف نہ کیجیے گا مسٹر اظفر!'' بیگم زرینہ نے کہا۔ ''یہ گلاس ختم ہو جائے تو.....''

''میں تکلف نہیں کروں گا۔'' اظفر نے اس کی بات کاٹی۔

بیگم زرینہ کی باتوں میں جو روانی و بے ساختگی تھی، وہ اس کی چال میں نہیں تھی۔ جب وہ ایک طرف کھڑے، باتیں کرتے ہوئے اپنے کچھ مہمانوں کی طرف بڑھی تو اس کے چلنے کا انداز بڑا باوقار تھا۔

''تکلف تو آپ کو کرنا پڑے گا اظفر!'' زرقا بولی۔ ''گھر میں آپ زیادہ پی لیں تو کوئی حرج نہیں۔ پارٹیز میں احتیاط ہی کرنا چاہیے۔ ایک لارج پیگ کافی ہے۔''

''تم ٹھیک کہہ رہی ہو!'' اظفر نے اس سے اتفاق کر لینے میں کوئی حرج نہیں سمجھا۔ اسے اندازہ تھا کہ یہاں زرقا کو جب اپنی دو ایک شناسا بھی نظر آ گئی تھیں تو یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ مستقل اظفر کے ساتھ لگی رہتی۔ اظفر کو کسی وقت بھی ایک اور لارج پیگ پینے کا موقع مل سکتا تھا۔ اس نے شراب صرف تین سال پہلے پینا شروع کی تھی لیکن اب اس کا اتنا عادی ہو چکا تھا کہ چار پیگ پی کر بھی اپنے قابو میں رہتا تھا۔ بس ایک سرور کی سی کیفیت ہو جاتی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اس سرور کے بغیر اس قسم کی پارٹی سے لطف اندوز ہونا ممکن ہی نہیں تھا۔

''آیئے آپ کو اپنی ایک دوست اور اس کے شوہر سے ملاؤں۔'' زرقا بولی۔ اسی وقت اظفر ٹھٹکا۔ اس کی نظر کسی پر پڑی تھی۔

''وہ دیکھو!'' اس نے زرقا سے کہا۔

زرقا نے اس طرف دیکھا اور وہ بھی چونکی۔ ''شوکت بھائی۔''

''یہ یہاں کیسے؟'' اظفر اس طرح بڑبڑایا جیسے اپنے آپ سے سوال کر رہا ہو۔

شوکت سے اس کے تعلقات صرف سال بھر پرانے تھے لیکن اتنے عرصے میں بھی ان دونوں میں خاصی بے تکلفی ہو چکی تھی۔ وہ ہر دوسرے دن اظفر کے گھر آتا رہتا تھا۔ اسی لیے زرقا بھی اس سے واقف تھی۔

اس پارٹی میں شوکت کی موجودگی پر اظفر کی حیرت بے بنیاد نہیں تھی۔ شوکت اوسط درجے کے ایک گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کے باپ نے تو بہت کوشش کی تھی کہ بیٹا ایک اعلیٰ درجے کا آرکیٹیکٹ بنے لیکن شوکت کو حصولِ تعلیم سے بھی کچھ معقول حد تک بھی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ اس کا اعتراف وہ خود کیا کرتا تھا۔ مارے باندھے اسے کسی طرح آرکیٹیکٹ بننا تو نصیب ہو گیا تھا لیکن اس میں وہ صلاحیتیں نہیں تھیں جو کسی اچھے آرکیٹیکٹ میں ہونی چاہئیں۔ وہ دو سال سے اس میدان میں کام کر رہا تھا لیکن اس کی حیثیت اوسط درجے تک بہ مشکل پہنچ سکی تھی۔ وہ کام کرنے کے بجائے منصوبے زیادہ بنایا کرتا تھا۔ ایسے منصوبے جو اسے راتوں رات دولت مند بنا دیں۔ مزاحاً وہ خود کہا کرتا تھا کہ اب تک اس کے ایسے تیرہ منصوبے ناکام ہو چکے تھے۔

''شوکت بھائی!'' زرقا نے چند دن پہلے اس سے کہا تھا۔ ''جتنی محنت سے آپ یہ تیرہ منصوبے بنا چکے ہیں، اتنی محنت اگر آپ اپنی فیلڈ میں کرتے تو شاید زیادہ فائدے میں رہتے۔''

''نہیں بھابی! منصوبہ سازی تو میری ہابی ہے۔ میں آجکل چودھویں منصوبے پر کام کر رہا ہوں اور اس مرتبہ مجھے اپنی کامیابی کی بہت امید ہے۔ اگرچہ میں عورت نہیں ہوں لیکن ہمیشہ امید سے رہتا ہوں۔''

زرقا اس بات پر کچھ جھینپ گئی تھی اور شوکت جلد کل سے بولا تھا۔ ''معاف کیجیے گا بھابی! یہ زبان کم بخت!..... کبھی کبھی بہت غلط وقت پر پھسل جاتی ہے۔ میں کان پکڑتا ہوں۔ آئندہ آپ کے سامنے بات کرتے ہوئے بہت محتاط رہوں گا۔''

شوکت نے سچ مچ اپنے کان پکڑ لیے تھے۔ یہ باتیں اظفر ہی کے گھر میں کھانے کی میز پر ہوئی تھیں۔

''چلو کھانا کھاؤ۔ کان بعد میں پکڑ لینا۔'' اظفر نے ہنس کر دخل اندازی کی تھی۔

شوکت سر جھکا کر کھانا کھانے لگا تھا۔ اس رات رخصت

کے وقت تک وہ شرمندہ شرمندہ سا بھی نظر آتا رہا تھا۔

''یہ بولتا بہت ہے۔'' اس کے جانے کے بعد اظفر نے زرقا سے کہا۔ ''اور جب زیادہ بولا جائے تو کوئی غلط سلط بات بھی زبان سے نکل ہی جاتی ہے۔''

''یہ دل کے برے نہیں معلوم ہوتے!'' زرقا نے تبصرہ کیا۔

یہ ایک ہفتے پہلے کی بات تھی۔ دوسرے تیسرے دن ٹپک پڑنے والا شوکت اس دن کے بعد اظفر کے گھر نہیں آیا تھا۔

''آپ انہیں فون کر لیں۔'' زرقا نے ایک دن پہلے ہی اظفر سے کہا۔ ''شاید ان کی شرمندگی ابھی تک ختم نہیں ہوئی۔''

''فون کرنے کی ضرورت ہی نہیں پیش آئی۔'' پارٹی میں اظفر نے زرقا سے کہا۔ ''حضرت یہاں مل ہی گئے۔ دیکھو کتنے جوشیلے انداز میں باتیں کر رہا ہے۔''

شوکت ہاتھ میں شراب کا گلاس لیے پختہ عمر کے ایک جوڑے سے باتیں کر رہا تھا۔ گلاس ان دونوں کے ہاتھوں میں بھی تھے۔ شاید وہ میاں بیوی ہوں۔ وہ دونوں مسکراتے ہوئے شوکت کی باتیں سن رہے تھے۔

زرقا نے ہنس کر کہا۔ ''شوکت بھائی شاید ان لوگوں کو اپنے چودھویں منصوبے کے بارے میں بتا رہے ہیں۔''

اظفر اور زرقا کی طرف شوکت کی پشت تھی لیکن اس کا سر اس طرح دائیں بائیں حرکت کر رہا تھا کہ اسے پشت کی طرف سے بھی پہچانا جا سکتا تھا۔

اظفر نے اپنے کوٹ کے کالر سے گلاب کا پھول نکالا۔ گھر سے چلتے وقت وہ زرقا نے اس کے کالر میں لگایا تھا۔ اظفر نے وہ پھول شوکت کی طرف اس طرح اچھالا کہ وہ شوکت کے دائیں کان سے ٹکرا کر اس کے سینے پر پھسلتا ہوا فرش پر گرا۔

گلوکارہ نگار اس وقت غالب کی غزل ختم کر رہی تھی۔ اچانک اس نے غزل کا مطلع پھر اٹھایا۔

گل پھینکے ہے اوروں کی طرف بلکہ ثمر بھی
اے خانہ برانداز چمن کچھ تو ادھر بھی

اظفر نے چونک کر نگار کی طرف دیکھا اور پھر کچھ غصیلے انداز میں زرقا سے بولا۔ ''دیکھی تم نے اس کی یہ حرکت؟''

''دیکھی نہیں، سنی ہے۔'' زرقا نے ہنس کر بات ٹالنا چاہی۔ ''آپ اس کی طرف توجہ ہی کیوں دیتے ہیں۔''

دوسری طرف شوکت نے مڑ کر زرقا اور اظفر کو دیکھ لیا تھا۔ وہ اب تک جن سے مخاطب رہا تھا، ان سے ''ایکس کیوزمی!'' کہہ کر تیزی سے ان دونوں کی طرف آیا۔ قریب آتے ہی اس نے کہا۔ ''یہ حرکت تمہاری ہی ہو سکتی ہے۔ بھابی سے مجھے اس کی توقع نہیں۔'' وہ اظفر سے مخاطب تھا۔

''پھول تو محبت سے مارا جاتا ہے شوکت بھائی!'' زرقا نے کہا۔ ''پتھر تو نہیں مارا تھا انہوں نے!..... آپ اتنا احتجاج کیوں کر رہے ہیں!''

''ہاں!'' شوکت نے مفکرانہ انداز میں سر ہلایا۔ ''حمایت تو آپ اپنے شوہر ہی کی کریں گی۔''

اسی وقت زرقا نے کسی کی طرف دیکھتے ہوئے ہاتھ ہلایا، پھر اظفر کی طرف دیکھ کر جلدی سے بولی۔ ''وہ میری ممی کی ایک دوست ہیں۔ ان سے مل کر ابھی آتی ہوں۔ معاف کیجیے گا شوکت بھائی!''

''ارے نہیں بھابی! جلدی جائیں آپ!..... بلکہ سارے ہال میں گھومتی پھریں۔ اس پارٹی میں بس ایک آپ ہی تو نظر آ رہی ہیں!''

زرقا ہنس کر ایک معمر عورت کی طرف بڑھ گئی۔ اس عورت کے ساتھ دو عورتیں اور بھی تھیں۔ اسی کی عمر کا ایک مرد بھی تھا۔

''شعر تو اس نے بڑے موقع سے گایا ہے۔'' شوکت نے آنکھوں سے نگار کی طرف اشارہ کیا۔ ''شاید اس نے تمہیں میری طرف پھول پھینکتے ہوئے دیکھ لیا تھا!''

''شاید نہیں، یقیناً۔'' اظفر نے تیکھے انداز میں کہا۔ ''یہ مجھ سے کچھ سخت سست سننا چاہتی ہے۔ اب تک تو میں اسے ٹالتا ہی رہا ہوں۔''

شوکت نے اس دوران میں ایک بڑا گھونٹ لیا تھا، وہ بولا۔ ''اسی کے معاملے میں اتنی کٹھور کیوں بن گئے ہو تم! میں دعوے سے کہتا ہوں اظفر! یہ تمہیں دل سے چاہتی ہے۔''

''لعنت بھیجتا ہوں میں اس پر۔'' اظفر نے کہا، پھر جلدی سے بولا۔ ''موقع اچھا ہے، جلدی سے مجھے ایک لارج پیگ تو لا دو۔''

''یہ تو ختم کر لو!'' شوکت نے اظفر کے ہاتھ میں دبے ہوئے گلاس کی طرف اشارہ کیا۔

''یہ میں ابھی ایک سانس میں ختم کر دیتا ہوں۔ تم مجھے جلدی سے دوسرا لا دو۔ بس زرقا کی نظر نہ پڑے۔ وہ سمجھتی رہے کہ میں پہلا ہی پی رہا ہوں۔''

''تو کیا پابندی لگ گئی ہے؟'' شوکت ہنسا۔

''ہاں یار! کچھ ایسی ہی بات ہے۔ ذرا جلدی کرو۔''

شوکت مسکراتا ہوا تیزی سے بار کاؤنٹر کی طرف بڑھ

گیا۔ جب وہ اظفر کے لیے لارج پیگ لے کر لوٹا تو اظفر نے اس طرف پشت کر لی تھی جدھر زرقا کھڑی تھی۔ اس طرح اس نے زرقا سے اپنا خالی گلاس چھپایا تھا۔

شوکت نے لارج پیگ اظفر کو دیتے ہوئے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''کن انکھیوں سے بیگم زرینہ کو دیکھا جا رہا ہے!..... خیر دیکھنے کی بات تو ہے۔ بڑے باوقار حسن کی مالک ہے وہ!''

''واہیات!'' اظفر نے منہ بنایا۔ ''بڑا غیر آرٹسٹک جسم ہے اس کا!''

''گداز ہے اس میں!''

''برا لگتا ہے۔''

''اپنی اپنی نظر کی بات ہے۔''

اظفر نے ایک بار پھر کن انکھیوں سے بیگم زرینہ کی طرف دیکھا جو اپنے کچھ مہمانوں سے باتیں کر رہی تھی، اب اس کے ہاتھ میں بھی جوس کا گلاس تھا۔

شوکت ہنسا۔ ''واہیات جسم والی کو بار بار دیکھ رہے ہو!''

اظفر زیادہ زور سے ہنسا۔ ''میں اندازہ لگا رہا تھا کہ کہاں کچھ کمی بیشی کی جائے تو اس کا جسم آرٹسٹک لگنے لگے!''

''کیا زیادہ چڑھالی ہے!'' شوکت نے اسے تعجب سے دیکھا۔

''بس ایک لارج پیگ ختم کیا ہے۔''

''اور وہ شاید پورا ہی تھا جو تم ایک سانس میں چڑھا گئے ہو!''

اظفر نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے خود بھی محسوس کیا تھا کہ اس کے دماغ کو ایک جھٹکا سا لگا تھا۔ پہلے کبھی اس نے اس طرح نہیں پی تھی۔ اس نے شوکت کے لائے ہوئے نئے گلاس سے بس ایک چسکی لی اور ایک بار پھر کن انکھیوں سے بیگم زرینہ کی طرف دیکھا۔

''باز نہیں آ رہے ہو!'' شوکت نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ ''مجھے کچھ اور ہی اندازہ لگانے پر مجبور کر رہے ہو!''

''فضول بات!..... اس خوب صورت عورت کو مشورہ دیا جانا چاہیے کہ یہ اپنے جسم کو بھدا نہ بنائے، ورزشیں کیا کرے۔''

''یقیناً آج انگور کی بیٹی نے تم پر اثر کر دیا ہے۔ بڑی غیر آرٹسٹک باتیں کر رہے ہو۔''

اس وقت نگار نے عبدالحمید عدم کی ایک غزل چھیڑی تھی۔

ہم آہ بھر چکے ہیں، وہ مسکرا چکے ہیں
دو مختلف ارادے، تیور دکھا چکے ہیں

''لو سنو!'' شوکت بولا۔ ''یہ بھی شاید تم ہی سے کہا جا رہا ہے۔''

''راتوں کو فون کر کے بھی شعر ہی سنانے کی کوشش کرتی ہے۔'' اظفر نے ناخوش گوار لہجے میں کہا۔ ''میں ٹالتا رہا ہوں لیکن اب کے فون آئے گا تو میں اسے اچھی طرح لتاڑ دوں گا۔''

''بھابی آ رہی ہیں۔'' شوکت آہستہ سے بولا۔

اظفر نے فوراً موضوعِ گفتگو بدلا۔ ''تمہارا کام آج کل کیسا جا رہا ہے؟''

''وہی رفتار بیڈھنگی جو پہلے تھی سو اب بھی ہے۔'' شوکت گنگنایا۔

''ذرا اونچا سُر لگایئے شوکت بھائی!'' زرقا قریب آ گئی۔

''وہ بھی لگاؤں گا بھابی!'' شوکت نے سر ہلایا۔ ''بیگم زرینہ ایک ایسا ہاسپٹل بنوانا چاہتی ہیں جہاں غریب لوگوں کے سنگین امراض کا مفت علاج کیا جائے گا۔ میں نے کچھ پیس لگائی تھی۔ بیگم زرینہ اس ہاسپٹل کا نقشہ مجھ سے ہی بنوا رہی ہیں۔''

''اوہ!'' اظفر نے بے ساختہ کہا۔ ''اب اس پارٹی میں تمہاری موجودگی کا جواز سامنے آیا۔''

زرقا، بیگم زرینہ کی طرف متوجہ ہو گئی۔ وہ کچھ مہمانوں کے ساتھ اسی طرف آ رہی تھی۔ شوکت اور اظفر بھی اس طرف متوجہ ہو گئے۔ قریب آ کر بیگم زرینہ نے اپنے ان مہمانوں سے اظفر کا تعارف کرایا۔

''یہ ہمارے ملک کے مفرد پینٹر اظفر سالک ہیں۔''

☆☆☆

پارٹی اسی طرح چلتی رہی۔ لوگ ایک دوسرے سے ملتے رہے۔ ہلکی مذاق، خوش گپیاں، سنجیدہ گفتگو، کبھی کچھ چل رہا تھا۔ جام بھی گردش میں تھے۔ ایک سے دوسرے کا، دوسرے سے تیسرے کا تعارف ہو رہا تھا۔ بقول بیگم زرینہ حلقۂ احباب میں وسعت آ رہی تھی۔ بہت سی عورتیں اور مرد بھی اظفر سے متعارف ہوئے تھے۔ کبھی نے اظفر کی تعریفیں کی تھیں۔ اس وقت بھی اظفر کو دو آدمیوں نے گھیر رکھا تھا۔ وہ اظفر کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا رہے تھے۔ زرقا کو ان لوگوں سے اکتاہٹ ہونے لگی۔ وہ محسوس کر رہی تھی کہ وہ دونوں آرٹ کے بارے میں کچھ زیادہ جانتے بھی

نہیں تھے۔ شاید انہیں زیادہ چڑھ گئی تھی۔ اس وقت شوکت بھی کسی اور طرف نکل گیا تھا ورنہ زرقا اس سے باتیں چھیڑ کر ان دونوں کی بکواس سے اپنا ذہن ہٹا لیتی۔ تنگ آ کر زرقا نے کہا۔

''میں ابھی آتی ہوں اظفر! ذرا اپنی ایک دوست سے مل آؤں!''

وہ اظفر کا جواب سنے بغیر اس طرف بڑھتی چلی گئی جہاں اسے اپنی ایک شناسا نظر آئی تھی۔ کالج میں وہ اس سے سینئر تھی۔ عمر میں بھی تین چار سال زیادہ ہو گی۔ دو سال قبل اس کی شادی ہوئی تھی۔ نام روبینہ تھا۔ زرقا اس کی شادی میں شریک ہو چکی تھی۔ اس کا شوہر عباس کوئی کاروبار کرتا تھا۔ زرقا شادی کے بعد بھی ان دونوں سے کئی بار مل چکی تھی۔

''ارے زرقا!'' روبینہ چونکی۔ ''تم کب آئیں؟''

''مجھے تو ایک گھنٹے سے زیادہ ہو گیا۔ تم شاید ابھی آئی ہو۔''

دونوں بڑی گرم جوشی سے ملیں۔

''آپ کیسے ہیں؟'' زرقا نے عباس سے پوچھا۔

''آپ کی دوست کے سایۂ عاطفت میں خیریت سے ہوں۔'' عباس کے انداز میں بذلہ سنجی تھی۔

زرقا کے ساتھ روبینہ بھی ہنسنے لگی۔ پھر ان دونوں میں کالج کے زمانے کے قصے چھڑ گئے۔ جب بھی وہ دونوں ملتی تھیں، وہ قصے ضرور چھیڑے جاتے تھے۔ اس وقت تو زرقا وقت گزاری بھی چاہتی تھی۔

ذرا دیر بعد زرقا نے مڑ کر دیکھا۔ اظفر اور وہ دونوں آدمی اب اس جگہ نہیں تھے۔

''کسے دیکھ رہی ہو؟'' روبینہ نے پوچھا۔

''اظفر بھی آئے ہیں۔'' زرقا نے بتایا۔ ''تمہارے صاحب بہادر سے وہ نہیں ملے، آج ملا دوں۔ پتا نہیں کدھر نکل گئے۔ ابھی تو ادھر چھوڑ کے آئی تھی۔''

''اس قسم کی پارٹیز میں ایسا ہی ہوتا ہے۔'' عباس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''ابھی کوئی نظر میں ہے تو ابھی نظر سے اوجھل! ابھی اِدھر اُدھر آ جا رہے ہیں۔''

''لیکن ہم ایک ہی جگہ کھڑے ہیں۔'' روبینہ مسکرائی۔ ''چلیں اس طرف چلیں، ایک ایک ڈرنک تو لے لیں۔''

زرقا کو معلوم تھا کہ روبینہ پیتی تھی لیکن ذرا کم کم!

عباس نے اِدھر اُدھر نظر دوڑاتے ہوئے کہا۔ ''میں سوچ رہا تھا کہ پہلے بیگم زرینہ سے ملاقات ہو جاتی۔ انہیں معلوم تو ہو جاتا کہ ہم آئے ہیں۔''

''معلوم ہو جائے گا، ابھی کافی وقت ہے۔'' زرقا بولی۔ ''کوئی کہہ رہا تھا کہ ابھی کھانا شروع ہونے..... میں آدھا گھنٹا باقی ہے۔''

''پھر تو جلدی سے ایک ایک ڈرنک لے ہی لینا چاہیے۔'' روبینہ نے ہنس کر کہا۔

''چلو۔'' عباس نے بار کاؤنٹر کی طرف قدم بڑھائے۔

''ابھی تم سے ملوں گی۔'' زرقا نے کہا۔ ''ذرا اظفر کو ڈھونڈ لاؤں۔''

عباس اور روبینہ بار کاؤنٹر کی طرف بڑھ گئے۔ زرقا کی نظریں اظفر کی تلاش میں بھٹکنے لگیں۔ وہاں دو سو سے زیادہ مہمان نہیں تھے اس لیے اظفر کو نظر تو آنا چاہیے تھا۔

نگار اس وقت ایک فلمی گیت چھیڑے ہوئے تھی۔

تجھ بن جیا اداس رے
یہ کیسی ان بجھ پیاس رے

زرقا کو ایک جگہ شوکت نظر آ گیا۔ وہ تیزی سے اس کی طرف بڑھی۔

''آیئے بھابی!'' شوکت اسے دیکھ کر جلدی سے بولا۔ ''آپ کو ایک دلچسپ شخصیت سے ملاؤں۔'' اس کے سامنے ایک پچاس سالہ شخص کھڑا تھا۔ شوکت نے اس کی طرف اشارہ کیا۔ ''یہ ہیں تو اپنے وطن کے مگر آج کل ہالی ووڈ میں ایک کامیڈی فلم بنانے کی تیاری میں مصروف ہیں۔ کوئی گھریلو کام تھا جس کے لیے کل آئے ہیں امریکا سے۔ دو دن بعد پھر چلے جائیں گے۔''

زرقا کا ذہن الجھا ہوا تھا۔ ''میں اظفر کو ڈھونڈ رہی ہوں۔ کہیں دکھائی نہیں دے رہے ہیں۔''

''مخمصے کا شکار وہ بہت جلدی ہو جاتا ہے۔ پارٹی ڈیڑھ گھنٹے سے چل رہی ہے نا..... نکل گیا ہو گا باہر لان کی طرف!''

''میں دیکھتی ہوں باہر جا کے!''

''ارے آپ بھی کس الجھن میں پڑ رہی ہیں بھابی!'' شوکت نے اسے روکنے کی کوشش کی۔ ''وہ خود ہی آ جائے گا ذرا دیر میں..... آپ پارٹی انجوائے کریں۔''

نگار نے گیت ختم کیا۔ آرکسٹرا بھی خاموش ہو گیا۔ اس کی وجہ سے لوگ ذرا زور زور سے باتیں کر رہے تھے۔ انہوں نے فوراً اپنی آوازیں کم کیں۔ یک لخت ایسا لگا جیسے سناٹا چھا گیا۔ جب بھی نگار گیت یا غزل ختم کرتی تھی اور آرکسٹرا بند ہوتا تھا، ایسی ہی کیفیت ہوتی تھی۔

"یہ بھی کامیڈی ہے ایک قسم کی!" شوکت نے ہنس کر اپنے مخاطب سے کہا۔ "پارٹیز میں ایسا ہوتا ہے۔ بعض لوگ فوراً اپنی آواز کم نہیں کر پاتے۔"

اس وقت بھی چند افراد زور زور سے بول رہے تھے۔ جب دوسروں کی نظریں ان کی طرف اٹھیں تو انہیں احساس ہوا۔ انہوں نے اپنی آوازیں دھیمی کیں۔

"گیٹ لاسٹ!" وہ آواز اس حد تک چیختی ہوئی تھی کہ ہال میں موجود سبھی مہمانوں نے سنی اور چونک پڑے۔ ہال میں مکمل سناٹا چھا گیا۔

"چلے جاؤ یہاں سے!" چیختی ہوئی آواز پھر آئی۔

"ارے!" کوئی بولا۔ "یہ تو بیگم زرینہ کی آواز ہے۔"

سب کی نظریں زینے کی طرف اٹھ گئیں۔ اندازہ ہو گیا تھا کہ آواز اوپری منزل سے آئی تھی۔

"آواز دھیمی رکھ کر تم خود کو بچا نہیں سکتے۔" بیگم زرینہ کی آواز پھر سنائی دی۔ "تم بس چلے جاؤ اب!"

کچھ لوگ تیزی سے زینے کی طرف بڑھے۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ لوگ اوپر چڑھنا شروع کرتے، بیگم زرینہ تیزی سے نیچے اترتی دکھائی دی۔ وہ بہت غصے میں معلوم ہو رہی تھی۔

اس صورتِ حال نے سبھی کو پریشانی اور الجھن میں ڈال دیا تھا۔

زرقا اس وقت شدت سے چونکی جب زینے کے اوپر اظفر بھی دکھائی دیا۔ وہ بہت پریشان سا آہستہ آہستہ نیچے اتر رہا تھا۔

"کیا ہوا بیگم زرینہ؟" کسی نے پوچھا۔

بیگم زرینہ نیچے آ کر دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی۔ اس کی سانس بری طرح پھولی ہوئی تھی۔ اس کا سبب یہی تھا کہ وہ بہت تیزی سے نیچے اتری تھی۔

زرقا پلکیں جھپکائے بغیر اظفر کی طرف دیکھ رہی تھی اور اس کے دماغ میں ایک خیال کسی زہریلے سانپ کی طرح پھنکارنے لگا تھا۔

اظفر نے آہستہ آہستہ نصف زینے طے کر لیے تھے۔ اس کے اترنے کے انداز میں ہچکچاہٹ تھی۔ چہرے سے غصے اور بے بسی کا اظہار ہو رہا تھا۔

"کچھ بتایئے تو بیگم زرینہ!" لوگوں نے بیگم زرینہ کو گھیر لیا۔

"یہ شخص۔" بیگم زرینہ نے ہاتھ اٹھایا۔ اظفر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس کی انگلی کانپ رہی تھی اور آواز میں بھی ارتعاش تھا۔ "یہ اچھے کردار کا مالک نہیں ہے۔ مجھے معلوم ہوتا تو میں اسے پارٹی میں ہرگز نہ بلاتی۔"

"جھوٹ بول رہی ہو تم!" اظفر چیخا۔ "میں اخبارات کو بیان دوں گا۔ میں انہیں بتاؤں گا کہ تم دراصل کس قسم کی عورت ہو!"

"دیکھا! دیکھا!" بیگم زرینہ نے لوگوں سے جیسے فریاد کی۔ "اب یہ سینہ زوری بھی دکھا رہا ہے۔ میں اوپر فوٹو کاپی میں گئی تھی کہ پیچھے سے یہ آ گیا اور.....؟" بیگم زرینہ اپنی بات چھوڑ کر اپنا ہونٹ چبانے لگی۔

"شیم، شیم" کی آوازیں ہر طرف سے ابھریں۔ سبھی اظفر کو ناپسندیدہ نظروں سے دیکھنے لگے۔

"اسے تو پولیس کے حوالے کیا جانا چاہیے۔" کوئی بولا۔

"نہیں۔" بیگم زرینہ نے جلدی سے کہا۔ "میں یہ پسند نہیں کروں گی کہ اخبارات میں میرا نام بھی اچھلے!"

"وہ تو اچھلے گا بیگم زرینہ!" اظفر نے غصے کا مظاہرہ کیا۔ "میں سارے شہر کو بتاؤں گا کہ تم.....؟"

"چپ ہو جاؤ پینٹر صاحب!" کسی نے گرج کر کہا۔ "ایسا نہ ہو کہ ہم سب لوگ یہیں تمہاری پٹائی شروع کر دیں۔"

"نہیں نہیں۔" بیگم زرینہ نے پھر جلدی سے کہا۔ "بات بڑھنا میرے حق میں بہتر نہیں ہے۔ میں آپ لوگوں سے التجا کروں گی کہ اس بات کا ذکر بھی کہیں اور نہ کیجیے گا۔" پھر اس نے زرقا کی طرف دیکھا۔ "پلیز بے بی!..... تم اپنے شوہرِ نامدار کو یہاں سے فوراً لے جاؤ۔"

اظفر غصے سے بیگم زرینہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ مزید کچھ نہیں بولا۔ یہ احساس اسے بھی ہو گیا ہو گا کہ اب اس نے بیگم زرینہ کے خلاف کچھ کہا تو لوگ اسے سچ مچ مارنا شروع کر دیں گے۔

زرقا اس وقت شدید ندامت محسوس کر رہی تھی، جیسے خود اسی سے کوئی غلط حرکت ہوئی ہو۔ اس نے اظفر کے قریب جا کر اس کا بازو پکڑ لیا۔

"چلیے!" وہ آہستہ سے بولی۔

"یقین کرو زرقا!..... یہ عورت....."

"خاموش ہو جایئے اب!" زرقا کے لہجے میں سختی تھی۔ اسے یقین تھا کہ بیگم زرینہ کے خلاف اب ایک بھی لفظ اظفر کی شامت کو دعوت دے بیٹھے گا۔ بہت سے لوگوں کے چہروں پر شدید غصے کے آثار تھے۔ بیگم زرینہ کا اس طبقے میں

اتنا ہی احترام کیا جاتا تھا کہ اب کوئی اس کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں سننا چاہتا تھا۔

زرقا اظفر کو لیے ہوئے بڑھی تو لوگوں نے ان کے لیے راستہ چھوڑ دیا۔ اس وقت ہجوم میں زرقا کی نظر روبینہ اور عباس پر پڑی جو انہی دونوں کی طرف دیکھ رہے تھے۔ زرقا نے فوراً نظریں چرا لیں۔ اس میں اتنی تاب نہیں تھی کہ وہ کسی سے بھی نظریں ملا سکتی۔ شوکت سے بھی سامنا ہوا لیکن وہ اس سے بھی آنکھیں چار نہیں کر سکی۔

شوکت کے انداز سے ایسا ظاہر ہوا تھا جیسے وہ ہکا بکا رہ گیا ہو۔

زرقا، اظفر کو ہال سے نکال لائی۔

"لوگ ٹھیک ہی کہتے ہیں۔" زرقا نے اپنا اشتعال دبانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "چور، چوری سے جاتا ہے، ہیرا پھیری سے نہیں۔"

"یہ بات نہیں ہے زرقا!..... دراصل اس عورت نے پاک بازی کا لبادہ اوڑھ رکھا ہے۔"

"اور آپ وہ لبادہ اتارنے کے لیے اوپر گئے تھے!" زرقا نے تلخی سے کہا۔

"تم اسی وقت سمجھ سکو گی جب ساری بات سنو!"

"اب مجھے کچھ سننے کی ضرورت نہیں ہے۔" زرقا کے لہجے کی تلخی برقرار رہی۔

"سننا پڑے گا تمہیں!" اظفر نے جھٹکے سے رک کر زرقا کی کلائی مضبوطی سے پکڑی۔

"کیوں تماشا بننا چاہتے ہیں آپ!" زرقا روہانسی ہو گئی۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ ان کے پیچھے کچھ اور لوگ بھی بنگلے سے نکل آئے ہیں۔

ان لوگوں کو اظفر نے دیکھا تو دانت پیسنے لگا۔

"آپ نادم ہونے کے بجائے غصے کا اظہار کر رہے ہیں۔" زرقا نے اپنی بھرائی ہوئی آواز پر قابو پا لیا اور اظفر کا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھتے ہوئے بولی۔ "کچھ لوگ بہت غصے میں ہیں۔ اچھا ہو گا اگر آپ کم از کم میرے سامنے تو ان کے غصے کا نشانہ نہ بنیں۔"

لوگوں کی کاریں کوٹھی کے آگے ایک قطار سے کھڑی ہوئی تھیں۔ انہی میں اظفر کی کار بھی تھی۔ زرقا وہیں رکی۔

"چابی مجھے دیں۔" اس نے اظفر کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"کیوں؟"

اظفر نے ہونٹ بھینچ کر زرقا کو دیکھا اور جیب سے چابی نکال کر جھنجلائے ہوئے انداز میں زرقا کو دی۔ زرقا نے ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ "آپ دوسری طرف سے آ کر بیٹھیں۔"

کار میں بیٹھتے وقت بھی اظفر جھنجلایا ہوا نظر آ رہا تھا۔

زرقا نے کار قطار سے نکالی اور سڑک پر دوڑا دی۔

"تم کیا سمجھ رہی ہو؟" اظفر غصے سے بولا۔ "میں نشے میں ہوں؟ کار نہیں چلا سکتا؟"

"ذہنی طور پر آپ یقیناً نشے میں ہیں ورنہ یہ گری ہوئی حرکت نہ کرتے۔ دوسرا لارج پیگ تو آپ نے شوکت بھائی سے ہی منگوایا تھا۔ میری نظر پڑ گئی تھی لیکن میں کچھ بولی نہیں۔ آپ نے اس کے بعد اور بھی پی ہو گی۔"

"تم مجھ پر یقین کرنے کے بجائے اس ذلیل عورت کی باتوں پر یقین کر رہی ہو؟" اظفر جیسے تلملا کر بولا۔

"آپ خود کو بے قصور ثابت کرنے کے لیے ایک ایسی عورت پر الزام لگا رہے ہیں جو بیوگی کے بعد سے آج تک ایک صاف ستھری پاکیزہ زندگی گزارتی رہی ہے۔"

"اس کی پاکیزگی کا ڈھول تو اب میں بجاؤں گا۔ تم میری بات نہ سنو لیکن میں اخبارات کو فون کر کر کے انہیں حقیقت بتاؤں گا۔ کل کے اخبارات میں سب کچھ آ جائے گا۔"

"آپ کی باتوں پر کسی کو یقین نہیں آئے گا آپ اپنے بے قصور ہونے کے لیے کوئی بھی کہانی گھڑیں، اخبار والے بیگم زرینہ سے رابطہ ضرور کریں گے۔ ایک باعزت اور مشہور عورت کے خلاف وہ کسی کا یک طرفہ بیان شائع نہیں کریں گے۔ پھر اگر بیگم زرینہ نے جوابی بیان داغ دیا تو آپ ہی کی رسوائی ہو گی۔ ابھی تک تو بے چاری یہی چاہ رہی ہیں کہ اس معاملے میں خاموشی اختیار کریں۔"

"بے چاری!" اظفر نے تلخی سے کہا۔ "اگر تم میری باتیں سن لو تو اس کی بے چارگی تم پر اچھی طرح کھل جائے گی۔"

"آپ کی گزری ہوئی زندگی میری نظر میں آ چکی ہے اظفر! میں آپ کی باتوں پر نہیں، بیگم زرینہ پر اعتبار کروں گی۔"

"میں اس حرافہ کو....." اظفر نے پہلو بدلا۔

"پلیز اظفر!" زرقا نے جھنجلا کر اس کی بات کاٹی۔ "میرا دماغ اور پراگندہ نہ کیجیے! میں اپنے شناساؤں سے نظر ملانے کے قابل نہیں رہی ہوں۔"

"اچھی بات ہے، اب میں خاموش رہوں گا۔ بس کچھ

کروں گا، اور تم دیکھو گی کہ میں کیا کرتا ہوں۔"

زرقا ہونٹ بھینچے ڈرائیونگ کرتی رہی۔ اظفر پہلو بدلتا رہا۔ کبھی کبھی وہ زیرِ لب کچھ بڑبڑاتا تھا جو زرقا نہیں سن سکی۔

اظفر کا اپارٹمنٹ تیسری منزل پر تھا، گراؤنڈ فلور کے نیچے بیس منٹ میں کاریں کھڑی کی جاتی تھیں، زرقا نے کار وہیں کھڑی کی اور انجن بند کر کے اتری۔ دوسری طرف سے اتر کر اظفر نے اتنی زور سے دروازہ بند کیا کہ اچھا خاصا دھماکا ہوا۔ کچھ فاصلے پر کھڑے ہوئے واچ مین نے چونک کر ان دونوں کی طرف دیکھا۔

اظفر کی اس حرکت پر زرقا بہت جھنجلائی لیکن کچھ بولی نہیں۔

لفٹ سے وہ دونوں تیسری منزل پر پہنچے۔ اپارٹمنٹ کی ایک ایک چابی ان دونوں کے پاس رہتی تھی۔ زرقا نے اپارٹمنٹ کھولا اور دونوں اندر داخل ہوئے۔

خواب گاہ میں پہنچتے ہی زرقا نے ایک سوٹ کیس نکال کر کھولا، پھر وارڈوب سے اپنے کپڑے نکال نکال کر بے ترتیبی سے سوٹ کیس میں بھرنے لگی۔

"یہ کیا کر رہی ہو تم!" اظفر نے تیز لہجے میں کہا۔

"میں اپنے باپ کے گھر جا رہی ہوں۔ وارننگ میں نے آپ کو پہلے ہی دے دی تھی۔"

"تم غلط سمجھ رہی ہو زرقا! میں نے کچھ نہیں کیا!"

"مجھے یقین ہے کہ آپ کچھ نہیں کر سکے ہوں گے۔ بیگم زرینہ اس قسم کی عورت ہیں ہی نہیں کہ آپ انہیں شیشے میں اتار سکتے!"

اظفر جھپٹ کر زرقا کے قریب پہنچا اور جھٹکے سے سوٹ کیس بند کرتا ہوا بولا۔ "میں تمہیں اس طرح نہیں جانے دوں گا۔ پہلے تم مجھ سے حقیقت سن لو۔ اگر تم اس کے بعد بھی جانا چاہو تو میں تمہیں نہیں روکوں گا۔"

"مجھے کچھ نہیں سننا اظفر! مجھے جانے دیجیے..... زبردستی نہیں روک سکتے آپ مجھے! اگر آپ مجھے اپنا سامان نہیں لے جانے دیں گے تو میں یوں ہی چلی جاؤں گی مجھے کوئی خاص پروا نہیں ہے ان چیزوں کی۔"

"پلیز زرقا!" اظفر جذباتی ہو گیا۔ "تم مجھے چھوڑ جاؤ گی تو مر جاؤں گا میں!"

"قابلِ یقین نہیں ہے آپ کی یہ بات!" زرقا نے تلخی سے کہا۔ "آپ جس قسم کی زندگی گزارتے رہے ہیں، اس میں کوئی کسی کے بغیر نہیں مرتا۔ ہاتھ چھوڑیے میرا۔"

اظفر نے اس کا ہاتھ چھوڑا اور بستر پر دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

زرقا نے کپڑوں کے بعد کچھ اور ضروری چیزیں رکھ کر سوٹ کیس بند کیا اور اظفر پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالتے ہوئے سوچا، یہ آرٹسٹ ہی نہیں، اداکار بھی ہے۔

دوسری طرف اظفر اب اس طرح بیٹھا ہوا تھا جیسے شل ہو گیا ہو۔ یکبارگی وہ چونکا۔ زرقا خواب گاہ سے جا چکی تھی۔ اظفر اٹھ کر بیرونی دروازے کی طرف دوڑا اور چیخنے کے سے انداز میں پکارنے لگا۔

"زرقا!..... زرقا..... پلیز رک جاؤ!"

زرقا بیرونی دروازہ کھول چکی تھی۔ باہر کھڑا ہوا شوکت چونکا۔ اس کا ہاتھ کال بیل کے بٹن کی طرف بڑھ رہا تھا جو رک گیا۔

"کہاں جا رہی ہیں بھابی!" وہ حیرت سے بولا۔

"اپنے دوست سے پوچھ لیجیے گا۔ مجھے جانے دیجیے!" زرقا نے سپاٹ سے لہجے میں کہا۔

اظفر، شوکت کو دیکھنے کے بعد زرقا سے چند قدم پیچھے ٹھٹک کر رک گیا تھا۔

"زرقا کو روک لو شوکت! میرے دوست!" اظفر جیسے گڑگڑایا۔

"اگر کوئی بھی مجھے روکے گا تو میں شور مچا دوں گی۔ آس پاس رہنے والے باہر نکل آئیں گے۔" زرقا نے کہا، پھر تقریباً چیخ کر ہی بولی۔ "چھوڑیے میرا راستہ۔"

شوکت بوکھلائے ہوئے سے انداز میں اس کے سامنے سے ہٹ گیا اور اظفر کی بھی ہمت نہیں ہو سکی کہ آگے بڑھ کر زرقا کو روکنے کی کوشش کرتا۔ اگر زرقا کے زور سے بولنے کی وجہ سے آس پاس کے دو تین افراد بھی باہر آ جاتے تو خاصی شرمندہ کر دینے والی صورتِ حال بن جاتی۔

زرقا نے چھوٹے چھوٹے پیسے لگے ہوئے سوٹ کیس کو دھکیلا اور اس کے پیچھے خود بھی اپارٹمنٹ سے باہر نکل گئی۔ اظفر بے بسی سے دیکھتا رہ گیا۔

"بات تو سمجھ میں آ گئی۔" شوکت سر ہلاتا ہوا اندر آیا۔ اس نے دروازہ بند کیا اور مڑتا ہوا بولا۔ "وہ اسی واقعے پر ناراض ہو کر گئی ہیں نا؟"

اظفر چپ چاپ کھڑا رہا۔

"تم نے بھی تو حد کر دی یار!" شوکت نے اس کے قریب آ کر کہا۔ "یہ تو خیر میں مان سکتا ہوں کہ پندرہ سال تک ایک خشک زندگی گزارنے والی عورت کے جذبات بھڑکانا اور اسے شیشے میں اتارنا ممکن ہے لیکن اس کے لیے بڑی احتیاط

اور فنکاری کی ضرورت ہوتی ہے۔ تم اس پر ایک دم ہی.....؟"

"بکواس ہے یہ سب!" اظفر بھڑک کر بولا۔ "اس جیسی بھدے جسم کی عورت مجھے پسند آ ہی نہیں سکتی۔"

شوکت مسکرایا۔ "اب مجھ سے تو نہ اڑو! کیا میں نے دیکھا نہیں تھا کہ اس کا جسمانی گداز تمہیں کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھنے پر مجبور کر رہا تھا۔"

"اس وقت بھی تم غلط سمجھے تھے اور اب بھی غلط سمجھ رہے ہو۔" اظفر نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ "جب سے اب تک کوئی بھی میری بات سننے پر آمادہ نہیں ہوا ہے۔ کیا تم بھی نہیں سنو گے۔"

"کیا سناؤ گے؟" شوکت نے اکتائے ہوئے انداز میں کہا۔ "اِدھر اُدھر کے قصے کہانیاں چھوڑو۔ کم از کم مجھے تو کھل کر بتا دو کہ ہوا کیا تھا۔"

"کھل کر ہی بات کرنے کے لیے تو میں اتنی دیر سے بلک رہا ہوں۔" اظفر نے کہا۔ "اب تم ہی سن لو!"

اظفر نے شوکت کا ہاتھ پکڑا اور کھینچنے کے سے انداز میں اسے اندر لے جانے لگا۔

"ارے ارے! ہاتھ تو چھوڑو۔ چل تو رہا ہوں۔" شوکت جلدی سے بولا۔

اظفر نے جیسے اس کی بات سنی ہی نہیں۔ وہ اسے خواب گاہ کی طرف لے جا رہا تھا۔ خواب گاہ سے پہلے ایک چھوٹی سی راہ داری تھی۔ اسے زرقا نے عجیب انداز سے سجایا تھا۔ چھت سے نہایت اچھوتی طرز کے بنے ہوئے منقش پنجروں میں مقامی اور آسٹریلوی طوطوں کے علاوہ چند اور نایاب سے پرندے بھی تھے جو آدھی رات ہو جانے کے باعث اس وقت اونگھ سے رہے تھے۔ زرقا کو یہ عجیب سا شوق تھا، وہ یہ پنجرے اور پرندے ایک اعتبار سے جہیز میں ہی لائی تھی۔ یہ شادی سے پہلے ہی اس کے پاس تھے۔

اظفر اور شوکت کے زور زور سے چلنے پر اونگھتا ہوا ایک طوطا چونکا۔

"زرقا! زرقا!" وہ چیخا۔

"چلی گئی وہ!" اظفر بھی طوطے کو گھورتا ہوا پاگلوں کی طرح چیخا اور شوکت کا ہاتھ پکڑے ہوئے خواب گاہ میں لے آیا۔

"وحشت طاری ہو رہی ہے تم پر!" شوکت نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

اظفر نے اسے اپنے بستر پر دھکیلا اور خود بھی اس کے برابر میں بیٹھ گیا۔

"اب سنو، حقیقت کیا ہے!" اظفر بولا۔

"سناؤ!" شوکت کے لہجے میں ایسی بے بسی تھی جیسے وہ خود کو اظفر کی کہانی سننے پر مجبور پا رہا ہو۔

اظفر اس کے چہرے سے نظر ہٹا کر سوچ میں پڑ گیا۔ پارٹی کا سارا منظر اس کے تصور میں آ گیا تھا۔ دو آدمیوں سے پینٹنگز کے بارے میں اس کی باتیں ہو رہی تھیں کہ اس کے موبائل کی گھنٹی بجی۔ زرقا اس وقت اس کے ساتھ نہیں تھی۔

☆☆☆

اظفر نے موبائل جیب سے نکال کر کان سے لگایا۔ "ہیلو!"

دوسری طرف سے ایک مردانہ آواز سنائی دی۔ "مسٹر اظفر!"

"جی ہاں، میں بول رہا ہوں۔"

"میں آپ کے لیے اجنبی ہوں لیکن آپ سے چند خاص باتیں کرنا چاہتا ہوں، اگر آپ مجھے اجازت دیں!"

"ہاں ہاں، بولیں۔" اظفر نے کہا اور پھر اپنے مخاطبین سے "ایکسکیوز" کر کے ٹہلنے کے انداز میں ایک طرف بڑھ گیا۔ اسے الجھن بھی ہوئی تھی کہ اس سے کوئی اجنبی شخص کیا باتیں کرنا چاہتا تھا۔

"آپ کے قریب کوئی اور تو نہیں؟" دوسری طرف سے پوچھا گیا۔

"میں لوگوں سے ہٹ کر ایک طرف آ گیا ہوں۔ آپ کہیے!"

"آپ شاید چونک جائیں۔ نگار جو آپ کے پیچھے پڑی ہے تو اس کی ایک خاص وجہ ہے۔ آپ کے خلاف سازش کا ایک جال بنا جا رہا ہے مسٹر اظفر!"

"سازش؟" اظفر واقعی چونک گیا۔ "کیسی سازش؟"

"تفصیلات ایسی ہیں کہ فون پر نہیں بتائی جا سکتیں۔ کیا آپ ابھی مجھ سے مل سکتے ہیں؟"

"ابھی تو میں ایک پارٹی میں ہوں۔"

"میں بھی اس پارٹی میں شریک رہا ہوں۔ صرف آپ سے بات کرنے کے لیے اوپری منزل پر آ گیا ہوں۔ یہاں سناٹا ہے۔ بیگم زرینہ کے ملازمین بھی نیچے ہی ہیں۔ یہاں ہم بڑے اطمینان سے باتیں کر سکتے ہیں۔ آپ سے ہمدردی مجھے اس لیے ہے کہ آپ سے پہلے میں بھی نگار کی اس سازش کا شکار ہو چکا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ میرے بعد اب کوئی اور بھی اس عورت کی سازش کا شکار ہو۔"

''میرے خلاف کیا سازش کرسکتی ہے وہ!'' اظفر الجھ گیا۔

''تفصیلات تو میں آپ کو ملاقات پر ہی بتا سکوں گا۔ ہاں اگر آپ کو اس سے کوئی دلچسپی نہ ہو تو میں اصرار بھی نہیں کروں گا۔ اس میں میرا کوئی ذاتی فائدہ نہیں ہوگا۔ اگر آپ اس سازش سے بچ جائیں گے۔''

اظفر نے بے چینی محسوس کی۔ ''اوپر آپ کہاں ہیں؟'' اس نے پوچھا۔

''زینے تو آپ دیکھ ہی رہے ہوں گے۔ بس اوپر چڑھ آیئے۔ خود کو لوگوں کی نظر سے بچا سکیں تو اچھا ہے۔ ویسے پارٹی اب اپنے عروج پر ہے۔ سب اپنی اپنی دھن میں ہیں، کوئی بھی زینے کی طرف دھیان نہیں دے گا۔ اوپر چڑھ کر آپ دائیں جانب مڑیے گا۔ میں آپ کو وہیں مل جاؤں گا۔''

دوسری طرف سے رابطہ منقطع کر دیا گیا۔

اظفر نے اپنا موبائل جیب میں ڈالتے ہوئے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔ اس نے دیکھ لیا کہ زرقا اپنی ایک دوست روہینہ سے باتیں کر رہی تھی، روہینہ کے ساتھ کوئی مرد بھی تھا۔ اظفر نے قیاس کر لیا کہ وہ روہینہ کا شوہر ہوگا۔ روہینہ سے تو وہ مل چکا تھا۔

ایک جگہ شوکت بھی نظر آ گیا۔ اس کی توجہ بھی اظفر کی طرف نہیں تھی۔ موبائل پر کال کرنے والے کے مطابق سبھی اپنی اپنی دھن میں تھے۔

اظفر تیزی سے زینے کی طرف گیا اور ایک بار پھر ارد گرد نظر دوڑا کر تیزی سے اوپر چڑھتا چلا گیا۔ اوپر پہنچ کر وہ دائیں جانب مڑا۔ کال کرنے والے کو وہیں ملنا چاہیے تھا لیکن کوئی بھی دکھائی نہیں دیا۔ اظفر چند قدم اور آگے بڑھ گیا، وہاں ٹوائلٹ تھا، سناٹا وہاں بھی تھا، اظفر مڑا۔ اس کا دماغ الجھ گیا۔ اگر یہ کسی کی شرارت تھی تو بہت عجیب تھی۔ شرارت کرنے والا اس کے اور نگار کے معاملے سے بھی واقف تھا۔ یہ بات عجیب ہی نہیں بلکہ حیرت انگیز بھی اس لیے تھی کہ وہ معاملہ صرف شوکت ہی جانتا تھا یا آج ہی اس نے زرقا کو بتایا تھا۔

الجھن میں پڑا ہوا اظفر واپسی کے لیے آہستہ آہستہ قدم بڑھا رہا تھا کہ کسی طرف سے بیگم زرینہ اچانک اس کے سامنے آ گئی۔ اظفر ٹھٹک گیا۔

''اوہ، مسٹر اظفر!'' بیگم زرینہ مسکرائی۔ ''شاید آپ ٹوائلٹ آئے تھے۔''

''جی..... جی.....'' اظفر اس طرح بولا جیسے ہکلا گیا ہو۔

''چلیں اچھا ہوا آپ یہاں مل گئے۔ پارٹی ختم ہوتی تب بھی آپ کو اوپر لاتی۔ میرے پاس ایک تصویر ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ آپ اس پر اپنی ماہرانہ رائے دیں۔ کیا آپ اپنا کچھ قیمتی وقت دے سکتے ہیں؟''

''ہاں ہاں، ضرور!'' اظفر نے جلدی سے کہا۔

''آیئے!''

وہ بیگم زرینہ کے پیچھے چل پڑا۔ وہ ایک دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی۔ اظفر بھی اس کے ساتھ تھا۔ اس نے خود کو ایک ایسی کشادہ خواب گاہ میں پایا جسے نہایت قیمتی اور خوب صورت سامان سے آراستہ کیا گیا تھا۔

''کہاں ہے تصویر؟'' اظفر نے اِدھر اُدھر نظر دوڑانے کے بعد ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بیگم زرینہ کی طرف دیکھا۔

''ذرا آگے تو بڑھیے!''

اظفر نے چند قدم آگے بڑھائے۔ دیواروں پر بہت سی آرائشی چیزیں نظر آ رہی تھیں لیکن اسے کوئی تصویر نہیں دکھائی دی۔

''کہاں ہے تصویر بیگم زرینہ؟'' اظفر نے اپنا سوال دُہراتے ہوئے مڑ کر دیکھا بیگم زرینہ خواب گاہ کا دروازہ بند کر کے اس سے لگی ہوئی تھی۔ اس کی ساڑی کا آنچل اس کے شانے سے ڈھلک کر فرش پر بکھر گیا تھا۔ ہونٹوں پر نظر آنے والی مسکراہٹ کچھ عجیب سی تھی۔ اس نے ایک بھرپور انگڑائی میں خود کو پوری طرح نمایاں کرتے ہوئے نیم باز آنکھوں سے اظفر کی طرف دیکھا۔

''میں کیسی تصویر ہوں مائی ڈیئر پینٹر؟''

اظفر کو سکتہ سا ہو گیا۔ اس کی آنکھیں تسلیم نہیں کر رہی تھیں کہ وہ بیگم زرینہ کا ایک ایسا روپ دیکھ رہا ہے جس میں بھرپور دعوتِ سپردگی تھی۔ اپنے طبقے میں نہایت محترم سمجھی جانے والی بیگم زرینہ کو اس وقت کوئی بھی دیکھتا تو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں کرتا۔

''اُف!'' بیگم زرینہ نے سسکاری سی لی۔ ''میرے قریب آؤ میرے پینٹر! میں اک آگ ہوں لیکن تم اس میں جلو گے نہیں، مہکنے لگو گے۔ جب زرقا سے تمہاری شادی ہوئی تھی، اسی وقت میں نے تمہیں پہلی بار دیکھا تھا اور فیصلہ کر لیا تھا کہ تمہیں اپنی خلوت کا ساتھی بناؤں گی۔ مجھے یقین ہے کہ یونانی دیوتا اپالو نہ تو تم سے زیادہ خوبصورت ہوگا، نہ تم سے زیادہ خوبصورت جسم کا مالک ہوگا۔''

''آج آپ کیا پی گئی ہیں بیگم زرینہ!'' اظفر کے تنفس کی رفتار بڑھ گئی۔

''ابھی میں نے کچھ نہیں پیا۔ اب تمہاری قربت کا جام پیوں گی۔ تم میرے قریب کیوں نہیں آ رہے ہو پینٹر؟ میرا خیال تھا کہ مجھے اس عالمِ کیف میں دیکھ کر تم ہی نہیں، کوئی بھی اپنے جذبات کو قابو میں نہیں رکھ سکتا۔ تمہاری آرٹسٹک حس کو آخر اس وقت کیا ہو گیا ہے؟''

''آپ سامنے سے ہٹ جایئے! مجھے جانے دیجیے!'' اظفر کو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ اس صورتِ حال سے کچھ خوف زدہ ہو گیا ہو۔

''ایسی باتیں نہ کرو پینٹر کہ تمہاری جمالیاتی حس مشتبہ ہو جائے!'' بیگم زرینہ نے کہا اور پھر دونوں ہاتھ پھیلا کر بولی۔ ''آؤ!..... مجھے گلے سے لگا لو..... آؤ..... مجھے.....'' اس کی پھولتی ہوئی سانسیں اس کے برانگیختہ جذبات کی طرف اشارہ کر رہی تھیں۔

اظفر نے ذہنی طور پر سنبھالا لیا۔ ''کیا آپ دنیا کے سامنے دوسرے روپ میں آتی ہیں؟ مصنوعی روپ میں؟''

''ہاں۔'' بیگم زرینہ نے بڑی بے باکی سے اعتراف کیا۔ ''میں اسی طرح لوگوں کو خود سے دور رکھ سکتی ہوں۔ وہ چند ہی خوش نصیب ہیں جن کو میری خواب گاہ تک رسائی ملی۔ تمہیں کچھ دیر ہو گئی ہے یہاں آنے میں! دراصل تم مجھے نظر ہی دیر سے آئے۔ میں تمہیں اپنا.....'' وہ رک کر مسکرائی، پھر بولی۔ ''انگریزی میں عورت کے لیے تو کیپ کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے، مرد کے لیے کیا کہا جاتا ہے، یہ مجھے نہیں معلوم!''

اظفر کو اب غصہ آنے لگا تھا۔ اس نے کہا۔ ''تم جیسی دُہری زندگی گزارنے والی عورتیں مجھے اپنا کھلونا نہیں بنا سکتیں؟''

''کھلونا!'' بیگم زرینہ ہنس پڑی۔ ''یہ لفظ کچھ خوبصورت نہیں ہے مگر..... چلو یہی ٹھیک ہے۔ میں تمہیں دو سال کے لیے اپنا پابند کرنا چاہتی ہوں پینٹر!..... میں ان دو سالوں میں تمہیں کہیں سے کہیں پہنچا دوں گی۔ بین الاقوامی سطح کی آرٹ گیلریز میں تمہاری پینٹنگز کی نمائش کروا دی جائے گی۔''

''بہتر ہوگا کہ دروازے سے ہٹ جاؤ۔ مجھے جانے دو۔'' اظفر اپنا غصہ منبط کرنے لگا۔

''پینٹر!'' بیگم زرینہ یکا یک سنجیدہ ہو گئی۔ ''پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا کہ میں نے اپنی ساڑی کا آنچل شانے سے ڈھلکایا ہو اور میرے بپھرے ہوئے جذبات کا طوفان دیکھ کر کوئی اپنے ہوش و حواس پر قابو رکھ سکا ہو۔''

''میں آرٹسٹ ہوں بیگم زرینہ!'' اظفر نے تلخی سے کہا۔ ''بھدے جسم میرے جذبات کا کوئی تار نہیں چھیڑ سکتے!''

یک بارگی بیگم زرینہ کا چہرہ سرخ ہونے لگا۔ وہ اپنی یہ توہین برداشت نہیں کر سکی تھی۔ اس نے ایک جھٹکے سے اپنی ساڑی کا آنچل گھسیٹ کر اپنے شانے پر ڈال لیا۔

''میں اپنی یہ توہین یاد رکھوں گی پینٹر! اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا تم کو..... اور ایک بار تو میں تمہاری انا ضرور زخمی کروں گی۔ ایک بار تو تمہیں اپنا کرر ہوں گی۔ اگر بچا سکو تو بچا لینا خود کو!''

''ریپ کرو گی میرا؟'' اظفر نے طنز کیا۔

''جو کچھ میں کروں گی، سبھی کچھ دیکھنا ہوگا تمہیں۔ پہلی بار ایسا ہوا ہے کہ میں کسی کے سامنے اس طرح آئی ہوں اور اس نے مجھے مسترد کیا ہے۔''

''کسی آرٹسٹ کے سامنے اس طرح نہیں آئی ہو گی!''

''بہت محبت کرتے ہو نا اپنی بیوی سے؟..... آج کے بعد وہ تمہاری نہیں رہے گی۔''

اظفر حقارت سے ہنس دیا۔

بیگم زرینہ تیزی سے مڑی اور دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔

''ناقابلِ یقین'' اظفر سوچتا ہوا کمرے سے نکلا۔ اس نے بیگم زرینہ کو زینے کی طرف جاتے دیکھا۔ وہ بھی اس طرف بڑھتا رہا۔ اسے بھی نیچے ہی جانا تھا۔

زینے سے چند قدم کے فاصلے پر بیگم زرینہ رک گئی۔ اس نے پلٹ کر اظفر کی طرف دیکھا اور مسکرانے لگی۔

اب یہ کیا ڈراما کرنا چاہتی ہے، اظفر سوچتا ہوا اس کے قریب پہنچ گیا۔

''گیٹ لاسٹ!'' وہ یکا یک بڑے زور سے چیخی اور اس کے ہونٹوں سے مسکراہٹ غائب ہو گئی۔

اظفر کو ذہنی طور پر جھٹکا سا لگا۔

''چلے جاؤ یہاں سے!'' بیگم زرینہ پھر چیخی۔

اظفر کے دماغ میں بجلی کے کوندے کی طرح یہ خیال لپک گیا کہ بیگم زرینہ نے چیخ پکار کر کے اسے رسوا کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔

''اب تم اپنی صفائی پیش کرنا چاہو گے لیکن میرے سامنے تمہاری کوئی نہیں سنے گا۔'' بیگم زرینہ نے بہت آہستہ سے کہا، پھر چیخ کر بولی۔ ''آواز دھیمی رکھ کر تم خود کو بچا نہیں سکتے۔ تم بس چلے جاؤ اب!''

بیگم زرینہ مڑ کر لپکتی ہوئی زینے کے قریب گئی اور تیزی

سے نیچے اترنے لگی۔

اظفر بے اختیار ہی آگے بڑھ کر زینے کے قریب پہنچ گیا۔ اس نے دیکھا کہ پارٹی کے شرکا زینے کے نیچے جمع ہوگئے تھے اور بیگم زرینہ کو نیچے اترتے دیکھ رہے تھے۔

اظفر کو اپنے پیروں تلے سے زمین نکلتی محسوس ہوئی۔ یہ سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ اب کیا ہوتا۔ ان سبھی لوگوں کی نظر میں بیگم زرینہ ایک قابلِ احترام عورت تھی۔

☆☆☆

''اور ایسا ہی ہوا۔'' اظفر نے کہانی ختم کرتے ہوئے آہستہ سے کہا۔ ''سب نے بیگم زرینہ پر اعتبار کیا، میری کسی نے نہیں سنی۔ یہاں تک کہ زرتا نے بھی۔''

شوکت متفکر نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ بولا۔ ''موبائل پر کال کر کے تمہیں اوپر بلانے والا کون ہوسکتا ہے؟''

''میں کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا۔'' اظفر نے کھوئے کھوئے سے انداز میں کہا۔ ''شاید اس شخص کو بعد میں پتا چلا کہ بیگم زرینہ بھی اوپر تھی اسی لیے وہ میرے سامنے نہیں آیا۔''

''کیا یہ نہیں ہوسکتا کہ تمہیں اوپر بلانے کے لیے بیگم زرینہ ہی نے کسی سے تمہیں اس طرح کا فون کروایا ہو؟''

''آں!'' اظفر چونک کر شوکت کی طرف دیکھنے لگا۔ ''میں نے اس طرح نہیں سوچا تھا۔''

''سوچا تو جاسکتا ہے نا؟''

''اگر ایسا ہے تو یہ ماننا پڑے گا کہ بیگم زرینہ نے مجھے اپنے جال میں پھنسانے کے لیے باقاعدہ پلاننگ کی تھی۔''

اظفر نے شوکت کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں جکڑ لیے اور پُرجوش انداز میں بولا۔ ''اس کا مطلب ہے تم نے میری باتوں پر پوری طرح یقین کرلیا ہے؟''

''ہاں۔'' شوکت نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''مگر کوئی اور یقین نہیں کرے گا۔ اس نے ہر شخص کے دماغ میں اپنا ایک مقدس ہیولا بنالیا ہے۔ میں نے تو شاید اس لیے یقین کرلیا کہ میں بھی کبھی بیگم زرینہ کے بارے میں سوچتا رہا ہوں۔ میرا نظریہ ہے کہ ایک جوان لڑکی پندرہ سال تک ایسی زندگی نہیں گزار سکتی جس میں کوئی خوش بو، کوئی مہک نہ ہو، لیکن یہ ضروری نہیں کہ دوسرے بھی میری طرح سوچیں۔''

''اس نے میری زرتا کو مجھ سے جدا کردیا ہے شوکت!'' اظفر کے لہجے میں درد تھا۔

''بیگم زرینہ نے جو کچھ تم سے کہا تھا، وہی وہ کر گزری۔''

''میں اسے جان سے ماردوں گا۔'' اظفر نے دانت پیسے۔

''جذباتی نہ ہو۔'' شوکت اپنے مزاج کے برخلاف سنجیدہ رہا۔ ''ویسے فی الحال تو وہ تمہاری دسترس سے بھی نکلنے والی ہوگی!''

''کیسے؟''

''پارٹی اب ختم ہوچکی ہوگی۔ میں تمہاری طرف آنے کے لیے وہاں نہیں رکا تھا۔ پارٹی ختم ہوتے ہی وہ ائرپورٹ روانہ ہوگئی ہوگی۔ ذرا دیر بعد اسے امریکا جانے والی فلائٹ میں ہونا چاہیے۔''

غصے میں اظفر کے منہ سے کچھ بے معنی سے الفاظ نکلے اور اس نے بستر پر گھونسا مارا۔ شوکت پھر بولا۔

''ابھی میں نے اس کے ہاسپٹل کا نقشہ بھی نہیں بنایا ہے لیکن اس نے سرجیکل آلات دیکھنے کے لیے امریکا جانے کا پروگرام بنالیا۔ ایک ایڈوائزر کو بھی وہ اپنے ساتھ لے جارہی ہے۔''

''کبھی تو آئے گی نا وہاں سے!'' اظفر نے دانت پیسے۔

''پھر جذباتی ہونے لگے تم! وہ تم سے ہو نہیں سکتا جو تم کہہ رہے ہو۔ بہتر ہوگا کہ کسی طرح بھابی کو منانے کے بارے میں سوچو۔''

اظفر جھٹکے سے اٹھا اور کمرے میں ٹہلنے لگا۔ وہ مشتعل تھا۔

''بس۔'' شوکت نے فیصلہ کُن انداز میں کہا۔ ''صرف بھابی کے بارے میں سوچو۔ اور کچھ نہیں۔ میں اب چلتا ہوں۔ گھر پر میرا انتظار ہورہا ہوگا۔ کل آؤں گا میں۔'' شوکت کھڑا ہوگیا۔ ''میں دروازہ لاک کرتا جاؤں گا۔''

شوکت کے جانے کے بعد بھی اظفر ٹہلتا رہا۔ کبھی بیگم زرینہ کے خیال سے وہ مشتعل ہونے لگتا، کبھی زرتا کی یاد اسے کرب میں مبتلا کردیتی۔ اس نے موبائل نکالا اور زرتا کا نمبر ملانے لگا۔ وہ چاہتا تھا کہ زرتا کو کسی نہ کسی طرح حقیقت سننے پر آمادہ کرلے لیکن اس سے رابطہ نہیں ہوسکا۔ زرتا کا موبائل بند تھا۔ اظفر سمجھ گیا۔ زرتا اس سے بات نہیں کرنا چاہتی تھی اسی لیے اس نے اپنا موبائل بند کردیا تھا۔

اظفر نے غصے میں موبائل بستر پر پھینکا اور شراب کی بوتل نکالی۔ گھر میں بھی وہ پیتا تھا لیکن زرتا کی وجہ سے ذرا کم کم! اس نے شراب سے گلاس بھرلیا، اس میں پانی ملانے کے بارے میں نہیں سوچا اور بستر پر بیٹھ کر چھوٹے چھوٹے گھونٹ

لینے لگا۔

رات کا کھانا نہ کھانے کے باوجود اظفر کو بھوک محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ وہ بس پیتا رہا۔ پانی کے بغیر شراب اس کا سینہ چھلنی کرتی رہی۔ کبھی وہ ٹہلنے لگتا، کبھی بستر پر بیٹھ جاتا۔ وقت گزرنے کا اسے احساس ہی نہیں ہو رہا تھا۔ بغیر پانی کی ایک گلاس شراب پینے کے بعد اس نے اور نکالی، پھر اسے یاد بھی نہیں رہا کہ وہ کب کپڑے تبدیل کیے بغیر جوتوں سمیت بستر پر لیٹا تھا اور اسے نیند آ گئی تھی۔

دوسرے دن اس کی آنکھ دیر سے کھلی۔ وہ بھی اس طرح کہ کال بیل کی آواز اس کی سماعت پر جیسے برسنے لگی تھی۔ اظفر اٹھا تو جھنجلایا ہوا سا تھا۔ اچانک اسے خیال آیا کہ شاید زرقا واپس آ گئی ہو۔ اس کے دل کی دھڑکنیں کچھ خوش گوار ہو گئیں حالانکہ سر بہت بھاری ہو رہا تھا۔

راہ داری میں اسے دیکھ کر طوطے چیخے۔ ''زرقا! زرقا!''

''ہاں وہ آ گئی۔ اسے مجھ پر ترس آ گیا!'' اظفر بڑبڑاتا ہوا تیزی سے بیرونی دروازے کی طرف لپکا۔

دروازہ کھولتے ہی اظفر بری طرح ٹھٹھیا گیا۔ اس کے سامنے شوکت کھڑا تھا۔

''گیارہ بج چکے ہیں اور ابھی تک سو رہے ہو؟'' شوکت نے چھوٹتے ہی کہا اور پھر حیرت سے اس کے سراپا کا جائزہ لیتا ہوا بولا۔ ''اور یہ کیا حالت بنا رکھی ہے۔ کیا رات کو کپڑے بھی نہیں بدلے؟''

اظفر کوئی جواب دیے بغیر واپسی کے لیے مڑ گیا۔ وہ اپنی حالت کا صرف اس حد تک جائزہ لے سکتا تھا کہ اس کے سوٹ پر شکنیں ہی شکنیں تھیں اور وہ جوتوں سمیت ہی سو گیا تھا۔ ٹائی کی ناٹ اس نے بے اختیاری میں ڈھیلی کر لی ہوگی جو اس کے سینے پر جھول رہی تھی۔ اس کے بال بکھرے ہوئے اور آنکھیں سوجی ہوئی تھیں جو کثرت سے شراب پینے کا نتیجہ تھا۔

شوکت نے اندر آ کر دروازہ بند کیا اور اظفر کے پیچھے پیچھے اس کی خواب گاہ میں آیا۔ اظفر بستر پر بیٹھ کر شراب کی بوتل کھولنے لگا۔ سر کا بھاری پن دور کرنے کے لیے ضروری تھا کہ وہ ایک پیگ اس وقت بھی پی لیتا۔

''معلوم ہوتا ہے، رات کو بہت دیر تک پیتے رہے ہو۔'' شوکت نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ ''شاید کچھ کھایا بھی نہیں ہوگا۔ اب اس وقت تو نہ پیو۔''

''میرا سر، پتھر بنا ہوا ہے۔'' شراب ہی کے اثر سے اظفر کی آواز بھی بہت بھاری تھی۔ ''ایک پیگ تو لینا ہی پڑے گا۔''

''ایک ہی پینا۔'' شوکت نے زور دے کر کہا، پھر بولا۔ ''مجھے کچھ کچھ خیال تھا کہ تم نے یہ رات اپنے آپے میں رہ کر نہیں گزاری ہوگی اس لیے ابھی آ گیا ورنہ شام کو آتا۔''

اظفر نے اس وقت شراب میں پانی ملا لیا۔ جگ اس کے سرہانے ہی رکھا تھا۔

''کچن میں ہے کچھ کھانے کے لیے؟'' شوکت نے پوچھا۔

''مجھے نہیں معلوم۔''

''میں دیکھتا ہوں جا کر۔ انڈے تو ہوں گے۔ آملیٹ بنا دیتا ہوں۔ ڈبل روٹی نہ ہوئی تو نیچے سے جا کر لے آؤں گا۔ اب تو کچھ کھا لینا چاہیے تمہیں!''

اظفر نے اس سے نظریں ملائے بغیر ایک گھونٹ لیا اور کچھ سوچتا رہا۔

شوکت کمرے سے نکل آیا۔ وہ اپارٹمنٹ کے ایک ایک گوشے سے واقف تھا۔ اس کے جاتے ہی اظفر نے ایک ہی سانس میں گلاس خالی کیا، چند لمحے تک لمبی لمبی سانسیں لیتا رہا۔ پھر شراب سے نصف گلاس بھر لیا۔ اس مرتبہ اس نے پانی نہیں ملایا تھا۔

☆☆☆

زرقا اس وقت ایک ریسٹورنٹ میں ریحان کے ساتھ بیٹھی تھی۔

''کیا حاصل ہوا مجھے!'' وہ اداس لہجے میں کہہ رہی تھی۔ ''تمہیں چھوڑا، تمہارے جذبات زخمی کیے، باپ کے حکم کے آگے سر جھکایا، اپنے آپ کو مار لیا۔ پورے خلوص سے ایک اچھی بیوی بننے کی کوشش کی، لیکن اظفر صرف میرے نہ ہو سکے۔ یہ میں برداشت نہیں کر سکتی ریحان کہ میرا استحقاق دوسری لڑکیوں میں تقسیم ہو۔ تم نے مجھے سمجھایا تھا کہ میں اپنے باپ کی حکم عدولی نہ کروں۔ کچھ دن پہلے تم نے مجھ پر زور دیا تھا کہ میں اظفر کو ایک موقع اور دوں۔ میں سب کچھ مانتی رہی لیکن کل رات اظفر نے مجھے بہت سے لوگوں میں ذلیل کر دیا۔ بات ڈیڈی تک بھی پہنچ چکی ہے۔ پارٹی میں ان کے کئی جاننے والے تھے۔ اب وہ میرے فیصلے سے اختلاف نہیں کریں گے۔''

ریحان کچھ نہیں بولا۔ وہ سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔

''چپ کیوں ہو؟'' زرقا کچھ توقف سے بولی۔ ''کیا پھر سمجھاؤ گے مجھے اظفر کو ایک موقع اور دوں؟..... کب تک ریحان؟ کب تک تم ایک صاف ستھری محبت کے دعوے دار کا کردار ادا کرتے رہو گے؟ کب تک خود سے جھوٹ بولتے

رہو گے؟ کب تک خود کو فریب دیتے رہو گے؟'' زرقا جذباتی ہوتی چلی گئی۔

''میں کچھ اور سوچ رہا تھا۔'' ریحان نے آہستہ سے کہا۔ ''تم ہی مجھے بتا چکی ہو کہ اظفر نے کچھ عرصے سے خود کو بدل لیا تھا، پھر کل یہ اچانک.....؟''

زرقا نے اس کی بات کاٹی۔ ''چور، ہیرا پھیری سے نہیں جاتا۔''

''بیگم زرینہ جو اتنی قابلِ احترام سمجھی جاتی ہے، اس کے بارے میں اظفر کا یہ اقدام انتہائی احمقانہ لگتا ہے۔ میں اظفر کو اتنا احمق نہیں سمجھتا!''

''کیا مطلب!'' زرقا، ریحان کو گھورنے لگی۔ ''کیا بیگم زرینہ اتنا سنگین جھوٹ بول سکتی ہیں؟''

''تمہیں اظفر کی بات سننی تو چاہیے تھی!''

''بیگم زرینہ کی بات سننے کے بعد بھی؟''

''ہاں۔''

''تم کیا سوچ رہے ہو ریحان!'' زرقا حیرت سے بولی۔

''تاریخ میں ایسے لوگ کا ذکر بہت ملتا ہے جو درویش صفت تھے مگر اچانک پتا چلا تھا کہ وہ تو حد درجہ شیطان تھے؟''

''تم بیگم زرینہ کے بارے میں ایسا سوچ رہے ہو؟'' زرقا کی حیرت برقرار رہی۔

''ہر امکان پر غور ضرور کرنا چاہیے زرقا!''

''دراصل تم شک و شبے اور امکان ہی کے سائے میں زندگی گزارتے رہے ہو۔ تمہاری یہ فطرت میرے لیے اب کوئی نئی بات نہیں رہی۔''

''تم کچھ بھی کہو، اظفر کی بات سننی تو چاہیے تھی!''

''تو تم سن لو!'' زرقا نے ناراض لہجے میں کہا۔ ''فون کر لو اسے۔ اس کا موبائل نمبر میں بتا دیتی ہوں تمہیں!''

ریحان نے اپنا موبائل نکالا۔ ''میں اسپیکر کھول دوں گا۔ تم بھی سن لینا اس کی باتیں۔''

زرقا نے نمبر بتایا۔ ریحان نے نمبر ملانے کے بعد اسپیکر کھول دیا۔ آواز اتنی ہلکی رکھی تھی کہ آس پاس کی میزوں پر بیٹھے ہوئے لوگ صاف طور پر نہ سن سکیں۔

دوسری طرف سے گھنٹی بجنے کی آواز آ رہی تھی۔ پھر کال ریسیو کی گئی۔

''ہیلو!'' اظفر کی آواز میں بھاری پن تھا۔

''میں ریحان بول رہا ہوں اظفر! میں جاننا چاہتا ہوں کہ.....''

''تمہیں کچھ جاننے کی ضرورت نہیں ہے مجھ سے!'' اظفر نے غصے کہا۔ ''تم تو اسی پر یقین کرو گے جو تمہیں زرقا نے بتایا ہوگا۔''

''اس وقت بھی پیے ہوئے ہیں۔'' زرقا بڑبڑائی۔

''کون!'' دوسری طرف اظفر چونکا۔ ''یہ تو..... یہ تو شاید زرقا کی آواز تھی!''

ریحان نے زرقا کی طرف دیکھ کر مایوسانہ انداز میں سر جھٹکا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس وقت زرقا بولے اور اظفر سمجھ لے کہ وہ دونوں ساتھ ساتھ ہیں۔

''زرقا!'' اظفر نے پکارا۔

''ہاں اظفر!'' ریحان بولا۔ ''زرقا میرے ساتھ ہے اور.....''

''بہت بے تابی تھی تمہیں زرقا!'' اظفر نے زہریلے انداز میں کہا۔ ''مل لیں اپنے عاشق سے؟''

''اظفر!'' زرقا نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''آپ اس وقت بھی نشے میں ہیں ورنہ اتنے غیر مہذب انداز میں بات نہیں کرتے!''

''تم بڑی مہذب ہو کہ ایک بہانہ ملا اور پہنچ گئیں ملنے!..... بہت برائیاں ہیں مجھ میں لیکن تم کب کب کیا کیا گل کھلاتی رہی ہو، وہ پوشیدہ رہا ہے مجھ سے!''

''اظفر!'' زرقا کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ ''حد سے بڑھ رہے ہیں آپ!''

ریحان نے بے چینی سے پہلو بدل کر اس طرح زرقا کا ہاتھ تھپکا جیسے اسے بے قابو ہونے سے روکنا چاہتا ہو۔

''میں حد سے بڑھ رہا ہوں!'' اظفر کی آواز آئی۔ ''لیکن بدنصیبی سے مجھے نہیں معلوم کہ تم نے ریحان کے ساتھ کتنی بار اپنی حد پار کی ہے۔''

''بس بہت ہو گئی۔'' زرقا نے دانت پر دانت جمائے۔ ''اب میں برداشت نہیں کر سکتی۔ بہتر ہوگا کہ آپ دو دن کے اندر اندر مجھے طلاق نامہ بھیج دیں ورنہ میں اپنے وکیل سے آپ کو نوٹس بھجوا دوں گی۔''

اظفر کا جواب سننے سے پہلے ہی زرقا نے موبائل پر ہاتھ مار کر رابطہ منقطع کر دیا۔

رابطہ منقطع ہوتے ہی اظفر، ریحان کو گالیاں دینے لگا۔ کچھ تو شراب کا اثر تھا اور کچھ یہ جلا دینے والا احساس کہ زرقا ریحان کے ساتھ تھی۔

''اس کی محبت نہیں مل سکتی مجھے!'' وہ غصے میں بڑبڑایا۔ ''ریحان کو حاصل کرنا چاہتی ہے وہ! مجھ سے جھوٹ بولتی رہی

کہ باپ کے حکم پر اس نے اپنی محبت قربان کی ہے اور اب ریحان کو ہمیشہ کے لیے بھول جانا چاہتی ہے۔ اسے تو بہانہ چاہیے مجھ سے تعلق ختم کرنے کے لیے۔ میرا تو دماغ خراب ہے کہ اس ہرجائی کی محبت میں دیوانہ بنا ہوا ہوں۔''

وحشت میں اس نے اپنے لیے ایک پیگ اور بنایا۔

شوکت اس کے لیے ناشتا بنانے گیا تھا۔ اظفر کو اب اس کی بالکل خواہش نہیں رہی تھی۔ وہ صرف شراب پینا چاہتا تھا۔ وہ شوکت کو ناشتا بنانے سے روکنے کے لیے کمرے سے نکلا۔

''زرتا!'' راہ داری میں ایک طوطا چیخا۔

''مت نام لو اب اس گھر میں اس کا!'' ریحان نے دانت پیسے۔ ''ورنہ میں پاگل ہو جاؤں گا۔''

''پاگل..... پاگل.....'' کئی پرندے چیخے۔ ''زرتا..... زرتا.....!''

''جان سے مار دوں گا میں تم سب کو!'' اظفر بڑبڑاتا ہوا تیزی سے اپنی خواب گاہ میں آیا۔ ایک الماری سے اس نے ائرگن نکالی۔ چھرے ایک مٹھی میں بھر کر جیب میں ڈال لیے۔ ایک بار وہ چھوٹے پرندوں کے شکار کے لیے اندرون سندھ گیا تھا تو اس نے یہ ائرگن خریدی تھی۔

وہ ائرگن سنبھالے راہ داری میں آ گیا۔

''زرتا!'' ایک طوطا چیخا۔

''پاگل..... پاگل.....'' کئی پرندے چیخے۔

اظفر نے دانت پیس کر ایک طوطے کو نشانہ بنایا۔ وہ پنجرے میں اچھلا اور تڑپنے لگا۔ اس کے خون کے چھینٹے اِدھر اُدھر گئے۔ اظفر چھرے بھر بھر کر ایک ایک پرندے کو نشانہ بناتا رہا۔ پرندے پنجروں میں پھڑکتے اور مرتے رہے۔ ان کے خون کے چھینٹے اظفر کے کپڑوں اور چہرے پر بھی آئے۔

بوکھلایا ہوا سا شوکت راہ داری میں آیا۔

''یہ کیا کر رہے ہو!'' وہ چیخا۔

اسی وقت ایک چھرا پنجرے سے ٹکراتا ہوا شوکت کے گال پر آنکھ کے قریب جا لگا اور تکلیف سے اس کا منہ کھل گیا۔ وہ ایک ہلکی سی آہ بھر کے رہ گیا تھا۔

''تم کیوں آ گئے سامنے!'' اظفر گرجا۔

شوکت نے جلدی سے رومال نکال کر اپنے گال پر رکھا اور ہاتھ سے دبائے دبائے پنجرں کی طرف دیکھا جن میں کچھ پرندے مر چکے تھے، کچھ پھڑپھڑا رہے تھے۔

''یہ کیا پاگل پن ہے!'' شوکت نے آگے بڑھ کر اظفر سے ائرگن چھین لی۔ ''یہ معصوم تمہارا کیا بگاڑ رہے تھے؟''

''زچ کر رہے تھے!'' اظفر خواب گاہ کی طرف واپس مڑ گیا۔

یہ شوکت کی خوش قسمتی تھی کہ چھرا اس کی آنکھ میں نہیں لگا تھا اور گوشت میں بھی پیوست نہیں ہوا تھا۔ کھال اور شاید کچھ معمولی سا گوشت ادھیڑتا ہوا گزر گیا تھا۔ اظفر کے کمرے میں کچھ ایسی دوائیں تھیں جو معمولی زخم پر لگائی جا سکتی تھیں۔ شوکت نے فوری طور پر اسی سے کام چلایا۔ اوپر سے روئی رکھ کر ٹیپ لگا لیا۔ پھر اظفر کی طرف متوجہ ہوا۔

''صرف پیتے ہی رہو گے تو مر جاؤ گے۔'' شوکت نے کہا۔ ''انڈے تو کچن میں مل گئے تھے۔ ڈبل روٹی نیچے جا کر لے آیا ہوں۔ ٹوسٹر بند کر کے آیا ہوں۔ آملیٹ بنا دیا ہے۔ لے کر آتا ہوں۔'' شوکت نے جواب کا انتظار کیے بغیر دروازے کی طرف مڑنا چاہا۔

''کوئی ضرورت نہیں ہے۔'' اظفر نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روکا۔

''مر جاؤ گے اس طرح! سینہ آگ کی بھٹی بن جائے گا۔''

کال بیل کی آواز سنائی دی۔

''کون آ گیا؟'' شوکت چونکا۔ ''کہیں بھابی تو.....''

''وہ اب نہیں آئے گی۔'' اظفر نے تلخی سے کہا۔ ''وہ کوئی بہانہ تلاش کرتی رہتی تھی۔ کل وہ اسے مل گیا۔ اب وہ اسی کے ساتھ رہے گی۔ اچھا ہی ہوا کہ آج میری آنکھوں پر بندھی ہوئی پٹی اتر گئی۔''

''کیسی باتیں کر رہے ہو؟ کس کے ساتھ رہیں گی بھابی؟''

''اسی کے ساتھ جسے بھلا دینے کا دعویٰ کر کے مجھ سے شادی کی تھی۔''

''فضول بات کر رہے ہو تم! خود کو بھابی کی جگہ رکھ کر سوچو۔ بیگم زرینہ اپنا ایسا ہی امیج بنا چکی ہے کہ سب اسی پر اعتبار کریں گے۔''

''تم نے کیوں نہیں کیا؟''

''سب میری طرح نہیں سوچتے!''

کال بیل کی آواز پھر سنائی دی۔

''میں دیکھتا ہوں جا کر!'' شوکت نے کہا اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

اظفر نے اپنے گلاس کی شراب ختم کی اور پھر بوتل کھولنے لگا۔

شوکت تھوڑی دیر بعد لوٹا۔

''ملازمہ تھی۔'' اس نے اظفر کو بتایا۔ ''کہہ رہی تھی کہ آج اس کی بہو ماں بنی ہے اس لیے اسے دیر ہوئی۔ میں نے اسے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ بیگم صاحبہ کچھ دن کے لیے اپنے گھر چلی گئی ہیں اس لیے وہ بھی کچھ دن چھٹی کرے۔''

اظفر نے اس کی طرف توجہ دیے بغیر گلاس منہ سے لگا لیا۔

''پڑوس کے ایک صاحب بھی آ گئے تھے۔'' شوکت نے منہ بنا کر کہا۔ ''مجھے شبے کی نظر سے دیکھ رہے تھے۔ شاید انہوں نے ائرگن چلنے کی آواز سنی ہو۔ ویسے اس کا امکان کم ہے۔ میرا یہ خیال غلط بھی ہو سکتا ہے کہ وہ مجھے شبے کی نظر سے دیکھ رہے تھے۔ میں نے ان کی طرف توجہ دیے بغیر دروازہ بند کر لیا تھا۔''

اظفر اب بھی خاموش رہا۔

شوکت ایک طرف بیٹھ کر خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا، پھر ناگواری سے بولا۔ ''کپڑے تو بدل لو۔ منہ پر بھی خون کے چھینٹے ہیں۔ منہ بھی دھو لو!''

''میں خونی ہوں۔'' اظفر نے ابلتی ہوئی آنکھوں سے شوکت کو گھورتے ہوئے کہا۔ ''خونیوں کو ایسا نظر بھی آنا چاہیے۔'' اس نے نوچنے کے سے انداز میں اپنے سینے پر جھولتی ہوئی ٹائی اتار کر ایک طرف پھینکی، اٹھ کر کچھ ڈگمگاتے قدموں سے ایک شیلف کی طرف گیا۔ اس میں سے ایک ریوالور نکالتے ہوئے وہ بڑبڑایا۔ ''اس کتیا کی پارٹی میں جا کر میں نے اپنی محبت کا خون کیا ہے۔ اب میں اس کتیا کا بھی خون کروں گا۔ امریکا سے واپس تو آئے گی نا وہ!''

اظفر ریوالور ہاتھ میں لیے کمرے میں ٹہلنے لگا۔

''معلوم ہوتا ہے اس وقت تم نے بہت تیزی سے پی ہے۔'' شوکت نے بوتل کی طرف دیکھا جس میں بہ مشکل ایک پیگ شراب باقی تھی۔

''جشنِ مرگِ محبت منا رہا ہوں۔ اس جشن میں ایسے ہی پی جاتی ہے۔'' اظفر وحشیانہ سے انداز میں ہنسا، پھر بولا۔ ''ابھی میرے پاس دو بوتلیں اور ہیں۔ تمہارے لیے بھی نکالوں؟ دوست ہو میرے، اس جشن میں میرا ساتھ تو دو۔''

شوکت اٹھ کر اس کے قریب گیا اور اس کی طرف ہاتھ بڑھا کر بولا۔ ''ریوالور دو مجھے۔''

''تم لے لو۔ مجھے فوری طور پر ضرورت بھی نہیں ہے۔'' ہنستے ہوئے اظفر نے ریوالور فوراً ہی شوکت کو دے دیا۔ ''تمہیں کیا ابھی کسی کا خون کرنا ہے؟''

شوکت ریوالور لے کر شیلف کی طرف بڑھ گیا، ریوالور دراز میں رکھ کر مڑا اور سنجیدگی سے بولا۔ ''تمہاری حالت اب ایسی نہیں ہے کہ ریوالور ہاتھ میں رکھو۔ یہ کوئی کھلونا نہیں ہے۔''

''کھلونا۔'' اظفر کو کچھ یاد آ گیا۔ ''وہ سور کی بچی مجھے اپنا کھلونا بنانا چاہتی تھی۔''

''اس کے بارے میں نہیں، بھابی کے بارے میں سوچو۔ کیا گزر رہی ہوگی ان پر!''

''اس بے وفا پر؟..... وہ جواب ریحان کے ساتھ گھوم رہی ہے!''

''تم نے کیسے سمجھ لیا؟''

''ابھی فون آیا تھا اس کا۔ طلاق مانگ رہی ہے..... ہونہہ!'' اظفر نے سر جھٹکا۔ ''طلاق نہیں دوں گا اسے..... ایسے ہی وقت گزارے وہ ریحان کے ساتھ۔''

''برداشت کر لو گے تم؟''

''ہاں۔'' اظفر نے سر جھٹکا اور گلاس کا آخری گھونٹ لے کر اسے سائڈ ٹیبل پر اس طرح رکھا جیسے پٹخا ہو۔ ''میں بھی لڑکیوں کے ساتھ وقت گزاروں گا۔ بہت سی لڑکیوں کے ساتھ!'' اظفر نے جھومتے ہوئے بوتل کی ماندہ شراب بھی گلاس میں انڈیل لی۔

''اب اس کے بعد نہ پینا..... پلیز!..... آملیٹ بنا کر میں نے فریج میں رکھ دیا ہے..... اوون میں گرم کر لینا۔ ڈبل روٹی بھی رکھی ہے۔ کھا کے سو جانا اب! مجھے اب دفتر جانا ہے۔''

''جاؤ..... جاؤ!'' اظفر بے ڈھنگے انداز میں ہنسا۔ ''کچھ لوگ اپنے محلوں کے نقشے بنوانے کے لیے تمہارا انتظار کر رہے ہوں گے۔''

''میں رات کو آ سکوں گا۔'' شوکت کھڑا ہو گیا۔ ''شیلف میں سے چابی اٹھالی ہے۔ یہ اپارٹمنٹ ہی کی ہے نا؟'' شوکت نے اظفر کو چابی دکھائی۔

''ہاں۔'' اظفر نے اپنا سر سینے پر جھکا لیا۔ ''وہ بے وفا اپنی چابی چھوڑ گئی ہے۔''

''مجھے اس وقت جانا تو نہیں چاہیے تھا لیکن کام کچھ ضروری ہے۔''

''جاؤ، جاؤ۔ کام کرنا اچھی بات ہے۔'' اظفر نے اس طرح کہا جیسے کسی بچے کو بہلا رہا ہو۔

شوکت نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور کمرے سے چلا گیا۔

اظفر نے گلاس اٹھانا چاہا لیکن اب اس کے ہاتھ پیر قابو میں نہیں تھے۔ اس کا ہاتھ گلاس سے اس طرح ٹکرایا کہ وہ

سائڈ ٹیبل پر لڑھک گیا۔ شراب بہہ گئی۔

''لعنت۔'' اظفر بڑبڑایا، پھر خود بھی بستر پر لڑھک گیا۔ اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ وہ خود کو ہوا میں اڑتا محسوس کر رہا تھا پھر وہ جیسے بادلوں میں کہیں کھو گیا۔

☆☆☆

وہ نیند تھی یا غفلت؟ اظفر کو احساس نہیں ہو سکا۔ وہ آنکھیں کھولتا تھا تو نظر کے سامنے گنجان سے دائرے چکرانے لگتے تھے، کچھ مبہم سی آوازیں سنائی دیتی تھیں۔ آنکھیں بند کرتا تھا تو کچھ دھندلے دھندلے سے منظر دکھائی دینے لگتے تھے۔ کچھ ہیولے سے نظر آتے تھے۔ کبھی ایسا لگتا تھا جیسے وہ زرقا اور ریحان ہوں۔ وہ دونوں کچھ ایسی حالت میں نظر آتے تھے کہ ان کے لیے اظفر کے منہ سے گالیاں ابل پڑتی تھیں۔ وہ ایک دم اٹھ کر بیٹھنا چاہتا تھا لیکن اس کا سر چکرا جاتا تھا۔ معمول کے مطابق آنکھوں کے آگے گنجان دائرے گردش کرنے لگتے تھے۔ اس وقت کوئی اسے لٹا دیتا تھا یا وہ خود لیٹ جاتا تھا، اسے کچھ احساس نہیں ہوتا تھا۔

پھر ایک مرتبہ اس کی آنکھ کھلی تو اس نے شوکت کو اپنے قریب دیکھا۔

''شکر ہے۔'' شوکت نے اس طرح کہا جیسے اطمینان کی سانس لی ہو۔ ''آج تم نے آنکھیں کھولی ہیں تو تم پر دہشت طاری نہیں ہوئی۔'' اس نے اظفر کی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔ ''بخار تو اب بھی تیز ہے۔''

''میں کہاں ہوں شوکت؟'' اظفر نے خود محسوس کیا کہ اس کی آواز میں نقاہت تھی۔

''تم اپنے گھر میں ہی ہو۔ اپنے کمرے میں ہو۔''

اظفر نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔ ''دن معلوم ہو رہا ہے۔'' وہ بڑبڑایا۔ ''کیا میں کل دوپہر سے اب تک.....'' وہ چپ ہو گیا۔ اس کے چہرے پر الجھن کا تاثر تھا۔

''اظفر!'' شوکت نے متفکر لہجے میں کہا۔ ''تمہیں وقت کا بالکل احساس نہیں ہے؟''

''کیا مطلب؟''

''جب میں تمہیں شراب پیتا چھوڑ کر گیا تھا، کب کی بات ہے یہ؟''

اظفر اسے الجھی ہوئی نظروں سے دیکھتا رہا، پھر بولا۔ ''تم کہنا کیا چاہتے ہو؟''

''یہ چار دن پہلے کی بات ہے۔'' شوکت نے بتایا۔ ''چار دن تمہیں اتنا تیز بخار رہا ہے کہ تمہیں کسی چیز کا ہوش نہیں تھا۔''

''کیا کہہ رہے ہو؟'' اظفر حیرت سے بولا۔

شوکت نے قریب سے ایک اخبار اٹھا کر اظفر کے سامنے کیا۔ ''لو دیکھو!..... کیا تاریخ ہے اس میں!''

''اوہ!'' تاریخ دیکھ کر اظفر کے منہ سے اتنا ہی نکل سکا۔

''میں شام کو آیا تھا تو تم بخار میں بھن رہے تھے۔'' شوکت نے بتایا۔ ''اور نہ جانے کیا کیا بڑبڑا رہے تھے۔ میں نے فوراً ڈاکٹر کو بلایا۔ اس نے تمہارا معائنہ کرتے ہی کہا کہ تمہیں ہاسپٹل میں داخل کرا دیا جائے لیکن میں اس کے لیے تیار نہیں ہوا۔ تم ایک پبلک فیگر بن چکے ہو۔ ہاسپٹل میں داخل ہوتے تو یہ بات اخبار والوں سے چھپی نہ رہتی۔ وہ ضرور وہاں پہنچتے، اور پھر اخباروں میں نہ جانے کیا کیا کہانیاں چھپ جاتیں۔''

''کیا مطلب؟''

''سر سامی کیفیت تھی تمہاری! تم جو کچھ بڑبڑاتے رہے تھے، وہ اخبار والوں کے علم میں نہیں آنا چاہیے تھا۔ میں نے ہاسپٹل کی مخالفت کی تو ڈاکٹر نے گھر پر تمہارا علاج کرنے سے انکار کر دیا۔ پھر میں نے ایک ایسے ڈاکٹر کو بلایا جو میرا دوست ہے۔ اس سے میں نے اپنی بات منوالی۔ چار دن سے وہی تمہارا علاج کر رہا ہے۔ اس نے ایک نرس کی موجودگی ضروری سمجھی تھی۔ اس کا انتظام میں نے خود کیا۔''

اظفر نے پھر اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔

''وہ ابھی ٹوائلٹ گئی ہے۔'' شوکت نے بتایا۔ ''آتی ہوگی۔ ابھی تمہیں ایک انجکشن لگانا ہوگا اسے..... ڈاکٹر کی ہدایت تھی کہ وہ انجکشن تمہیں اس وقت لگایا جائے جب تمہارا بخار اس حد تک کم ہو جائے کہ تمہاری سرسامی کیفیت باقی نہ رہے۔ اس نرس نے جی جان سے تمہاری خدمت کی ہے، میرا مطلب ہے دیکھ بھال کی ہے۔ چار دنوں میں وہ بارہ گھنٹے سے زیادہ نہیں سوئی۔''

''میں بہت کمزوری محسوس کر رہا ہوں شوکت!'' اظفر نے آنکھیں بند کر لیں۔

''ٹھیک ہے، تم آنکھیں بند کیے لیٹے رہو۔ کمزوری تو ہوگی۔ بولنے میں بھی دقت محسوس کر رہے ہو گے۔ ابھی آرام ہی کرنا ہے تمہیں۔ اس وقت بھی تمہارا بخار ایک سو دو سے شاید زیادہ ہی ہے۔''

اظفر کچھ نہیں بولا۔ آنکھیں بند کیے پڑا رہا۔ جلد ہی اس نے اونچی ایڑیوں کی آواز سنی۔ اس نے آنکھیں کھولنا چاہیں مگر اس کا دل نہیں چاہا۔ اس کا سبب نقاہت ہی ہو سکتی تھی۔

''ابھی اظفر نے آنکھیں کھول کر مجھ سے باتیں کی ہیں

نرس!'' اظفر نے شوکت کی آواز سنی۔ ''اس وقت کوئی انجکشن لگانا ہے نا اسے؟''

ایک مدھم سی نسوانی آواز اظفر کے کانوں تک پہنچی، الفاظ اس کی سمجھ میں نہیں آسکے۔

مشکل سے ایک منٹ گزرا ہوگا کہ اظفر کے دائیں بازو کی آستین اوپر چڑھائی گئی۔ اظفر کے اندازے کے مطابق وہ ہاتھ شوکت ہی کے ہو سکتے تھے۔ ان ہاتھوں میں نسوانیت نہیں تھی۔ نسوانیت کا احساس اظفر کو ان ہاتھوں میں ہوا جنہوں نے اس کے بازو میں انجکشن لگایا تھا۔

اظفر نے ہلکی سے سسکاری لیتے اور آنکھیں کھولتے ہوئے اپنے بازو کی طرف دیکھا تو اسے مخروطی انگلیوں والے دو ہاتھ دکھائی دیے۔ اظفر نے نظر اور اوپر اٹھائی لیکن نرس کا چہرہ دکھائی نہیں دیا۔ انجکشن لگانے کے بعد وہ اس شیلف کی طرف واپس جا رہی تھی جہاں دوائیں اور ایسا ہی نہ جانے کیا کیا رکھا ہوا تھا۔ اظفر نے پھر آنکھیں بند کر لیں۔ اس نے اپنا ذہن ڈوبتا ہوا محسوس کیا۔ شاید اس انجکشن میں ایسی کوئی بات بھی تھی کہ اسے نیند آجائے۔

پھر جب اظفر کی آنکھ کھلی تو اندھیرا تھا۔ کمرے میں سوی شمعیں جل رہی تھیں،

''شوکت!'' اظفر کی آواز دھیمی تھی۔

''ہاں اظفر! میں یہاں..... تمہارے قریب ہی تو ہوں۔''

اظفر نے سر گھما کے دیکھا۔ شوکت اس کے بالکل سرہانے ایک آرام کرسی پر بیٹھا تھا۔

''کمرے کی لائٹس کیوں نہیں جلائیں؟ موم بتیاں کیوں جل رہی ہیں؟''

''بجلی چلی گئی ہے، ابھی کوئی پندرہ منٹ پہلے۔'' شوکت نے جواب دیا۔

''تمہاری آواز کچھ بھاری ہو رہی ہے۔''

''تمہاری آواز سن کر جاگا ہوں۔''

''اوہ! تم کب سے یہاں ہو؟''

''اسی دن سے میں اپنے گھر نہیں گیا۔ ڈیڈی کو فون کر دیتا ہوں۔ جب تم سو جاتے ہو تو میں بھی نیند پوری کر لیتا ہوں۔ بس یہ بے چاری نرس اس وقت جاگتی رہتی ہے۔ اس وقت شاید یہ نیند کا دباؤ برداشت نہیں کر سکی۔''

اظفر نے اس طرف دیکھا جدھر شوکت نے دیکھا تھا۔ نرس کی کرسی کچھ ہی فاصلے پر تھی۔ وہ اس طرح سوئی تھی کہ اس کا سر ایک طرف ڈھلک گیا تھا۔ اس کا چہرہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس کی وجہ روشنی کی حد درجہ کمی بھی تھی۔

''یہ اتنا کیوں جاگتی ہے شوکت؟ کیا اسے اوور ٹائم.....''

''نہیں۔'' شوکت نے اس کی بات کاٹی۔ ''یہ آرٹ کی شیدائی ہے۔ تمہاری پینٹنگز کی وجہ سے تمہاری مداح ہے۔ تمہاری خدمت کو عبادت سمجھ رہی ہے۔''

''اوہ!'' اظفر کے منہ سے نکلا۔ پھر اس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''کیا زرقا بھی میری اتنی خدمت کرتی؟''

''بھابی تمہاری بیوی تو ہیں اظفر! شیدائی نہیں..... یہ ان دنوں میں تمہارے لیے کئی مرتبہ رو بھی پڑی ہے جب تم تیز بخار کی وجہ سے اپنے ہوش حواس میں نہیں تھے۔''

''ہوں۔'' اظفر سوچنے لگا، پھر بولا۔ ''یہ نرس کی حیثیت سے کہیں ملازم تو ہوگی!''

''ایک ہاسپٹل میں کام کرتی ہے۔ وہاں سے چھٹی لے لی ہے اس نے تمہاری خاطر! مالی حالات بہت اچھے نہیں ہیں اس کے! چند ہزار روپوں کے لیے رات کو دو گھنٹے ایک ہوٹل میں گاتی بھی ہے۔''

اظفر چونکا۔

''ہاں میرے دوست!'' شوکت نے کہا۔ ''یہ نگار ہے۔ تم اسے پسند نہیں کرتے لیکن میں اسے بہت عرصے سے جانتا ہوں۔ مجھے یہ تمہارا ایک اچھا دوست سمجھتی ہے۔ مجھ سے اپنے دل کا درد اس نے اکثر بیان کیا ہے۔ میں نے تمہیں وہ سب کچھ کبھی نہیں بتایا لیکن یہ تو میں نے تم سے اکثر کہا ہے کہ وہ تم سے بہت محبت کرتی ہے۔''

اظفر نے اپنے اعصاب میں تناؤ محسوس کیا۔

شوکت کہتا رہا۔ ''جب سے تم ہوش حواس میں آئے ہو، یہ اس خیال سے بہت پریشان ہے کہ تم اسے پہچان لوگے تو اسے یہاں سے نکال دو گے۔ یہ مجھ سے التجا کرتی رہی ہے کہ میں تمہیں اسے برداشت کرنے پر آمادہ کر دوں۔ یہ چاہتی ہے کہ تم جب تک پوری طرح تن درست نہ ہو جاؤ، یہ تمہاری دیکھ بھال کرتی رہے۔ اس کے بعد یہ خود ہی یہاں سے چلی جائے گی۔''

اظفر دم بہ خود سا رہ گیا۔ زرقا تو خیر اس کی پسند تھی لیکن اور کئی لڑکیوں نے بھی اس کا دم بھرا تھا۔ بعض تو اس سے شادی کی خواہاں بھی تھیں مگر کسی لڑکی میں بھی اسے اپنے لیے ایسا جذبہ نظر نہیں آیا تھا جس کا اظہار نگار کی طرف سے ہوا تھا۔

''تم بالکل چپ کیوں ہو گئے اظفر؟'' شوکت بولا۔

اظفر نے آہستگی سے سر گھما کر اس کی طرف دیکھا، پھر دھیمی آواز میں کہا۔ ''کچھ سوچنے لگا تھا۔''

''مجھے خوشی ہوگی اگر تم یہ کہو کہ تم نگار کے بارے میں سوچنے لگے تھے۔'' شوکت نے کہا۔ ''اس لڑکی کا جسم آرٹسٹک نہ سہی لیکن اس کے جذبات تو آرٹسٹک ہیں نا!''

''ہاں..... شاید..... شاید یہ..... بری لڑکی نہیں ہے۔'' اظفر نے رک رک کر کہا۔

''چلو تم نے اس حد تک تو سوچا اس بے چاری کے بارے میں!''

اظفر نے آنکھیں بند کرلیں۔ زیادہ تر تو شوکت ہی بولتا رہا تھا لیکن اظفر کم بول کر بھی تھکن محسوس کرنے لگا تھا۔ اس نے آنکھیں تو بند کرلیں مگر دماغ میں خیالات کا ریلا بہتا رہا۔ اسے زرقا سمیت ان تمام لڑکیوں کا خیال آیا جو اس کی زندگی میں آتی رہی تھیں۔ وہ سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ نگار ان سب سے مختلف لڑکی تھی۔

''لو، لائٹ آگئی!'' شوکت کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

یہ اتفاق تھا کہ اظفر کی نگاہ پہلے نگار پر پڑی جو سیدھی ہوکر بیٹھ گئی تھی۔ شاید اس کی آنکھوں کے پپوٹوں پر روشنی کا اثر پڑا تھا، یا وہ شوکت کی آواز سے جاگ گئی تھی۔ اس نے اظفر کو اپنی طرف دیکھتے پایا تو ایسا لگا جیسے وہ گڑبڑا گئی ہو۔ اس کی نظریں جھک گئیں۔

''نگار!'' شوکت نے اسے پکارا۔ ''اس وقت کوئی دوا تو نہیں دینی ہے اظفر کو۔''

''جی..... جی..... دینی ہے۔'' نگار دیوار گیر کلاک کی طرف دیکھتی ہوئی جلدی سے کھڑی ہوگئی۔ ''بالکل صحیح وقت پر آنکھ کھلی ہے میری۔''

اس وقت اظفر کو ایک اور خیال آیا۔ کیا سوتے ہوئے بھی نگار کے دماغ میں یہ خیال کلبلاتا رہا تھا کہ اسے ساڑھے آٹھ بجے اظفر کو دوا دینی تھی؟ کیا اس کی آنکھ کھلنے کا سبب یہی تھا؟ وہ لائٹ یا شوکت کی پکار پر نہیں بلکہ اپنے دماغ میں کلبلاتے ہوئے خیال کی وجہ سے جاگی تھی؟

نگار دوا لے کر آئی تو اس کے انداز میں جھجک تھی۔ ٹیبل اسپون میں نکلا ہوا سرخ سا محلول تھا جو اس نے شوکت کی طرف بڑھاتے ہوئے آہستہ آہستہ سے کہا۔ ''یہ دے دیجیے انہیں!''

''تم خود ہی دے دو۔'' شوکت نے کہا۔

نگار نے اظفر کی طرف دیکھا۔ وہ متذبذب تھی۔ اظفر نے خود ہی ہاتھ بڑھا کر اس سے چمچہ لیا اور دوا پی لی جو کڑوی اور نہایت بدمزہ تھی۔ اس نے چمچہ نگار کو واپس کیا۔ نگار کے ہاتھ میں کپکپاہٹ تھی۔

''نگار!'' شوکت بولا۔ ''میں نے اظفر کو تمہارے بارے میں سب کچھ بتا دیا ہے؟''

نگار نے اس کی طرف دیکھا اور جھجکتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا انہوں نے اجازت دے دی ہے؟ کیا میں ان کی طبیعت ٹھیک ہونے تک یہاں رک سکتی ہوں۔''

''ہاں۔'' اظفر بول پڑا۔ ''تم رک سکتی ہو۔''

اس کا لہجہ بھی سپاٹ تھا اور چہرہ بھی۔ اس کے صرف الفاظ ہی سے نگار جیسے کھل اٹھی۔

''میں آپ کے لیے کارن فلیکس لے کر آتی ہوں۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا تھا کہ دوا کے پندرہ منٹ بعد آپ کو دیا جائے۔''

وہ لپکتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔

''دیکھی اس کی تڑپ؟'' شوکت بولا۔

اظفر نے اس کی بات سنی، ان سنی کردی اور کہا۔ ''میں نے ان چار دنوں میں کیا کچھ نہیں کھایا؟''

''تمہیں ہوش ہی نہیں تھا۔ تمہیں چمچوں سے سیال غذا دی جاتی رہی ہے۔''

تھوڑی دیر بعد اظفر کو تکیے کے سہارے اس حد تک بٹھا دیا گیا کہ وہ چمچے سے کارن فلیکس خود کھا سکے۔ پیالے کی ٹرے اس کے سینے کے قریب رانوں پر رکھ دی گئی تھی۔ نیپکن خود نگار نے اس کے سینے پر ڈالا تھا۔

''اظفر!'' شوکت بولا۔ ''میں نے ڈیڈی سے فون پر کہہ دیا تھا کہ تمہاری بیماری کی وجہ سے تمہارے گھر رک گیا ہوں۔ اب چار دن ہوگئے ہیں مجھے۔ نگار تم سے بہت سہمی ہوئی تھی۔ اس نے مجھے تھوڑی دیر کے لیے بھی یہاں سے نہیں جانے دیا۔ میرا خیال ہے کہ اب میں چلا جاؤں تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ صبح میں پھر چکر لگالوں گا۔ شاید ڈاکٹر ہی کے ساتھ آؤں۔'' شوکت نے نگار کی طرف دیکھا۔ ''کیا خیال ہے تمہارا؟ اب تم ڈری ہوئی تو نہیں ہوگی! اظفر نے تمہیں یہاں رکنے کی اجازت دے دی ہے۔''

نگار نے نظریں جھکالیں اور آہستہ سے کہا۔ ''جیسا آپ مناسب سمجھیں!''

''گڈ!..... تو مجھے اجازت ہے اظفر؟''

''میری وجہ سے تمہیں بھی تکلیف اٹھانا پڑی ہے۔''

''رسمی باتیں کرکے بور نہ کرو۔'' شوکت نے منہ بنالیا اور کھڑا ہوگیا۔

اظفر کچھ نہیں بولا۔

''صحت یابی کی طرف مریض کا پہلا قدم مبارک ہو۔'' شوکت نے جاتے جاتے نگار سے کہا۔

نگار نظریں جھکا کر تھوڑا سا مسکرادی۔

اظفر بھی نظریں جھکائے کارن فلیکس کھاتا رہا۔ کچھ توقف سے وہ نگار کی طرف دیکھے بغیر بولا۔ ''شوکت بتا رہا تھا کہ تم ان چار دنوں میں بہت کم سوئی ہو۔ اب میری طبیعت ٹھیک ہے۔ برابر کے کمرے میں جا کر سو جاؤ۔''

''ابھی کیسے سو سکتی ہوں۔ گیارہ بجے آپ کو ایک دوا دینی ہے۔ تین بجے ایک اور دینی ہے۔ پھر صبح سات بجے۔ میں کرسی پر بیٹھے بیٹھے تھوڑا سا اونگھ لیتی ہوں۔ دوسرے کمرے میں جا کر آرام سے سوئی تو آنکھ نہیں کھلے گی۔''

''لیکن اس طرح تم کب تک؟ کتنے دن جاگتی رہو گی؟''

''اس وقت آپ کا ٹمپریچر سو رہ گیا ہے۔''

کارن فلیکس دینے سے قبل نگار نے اس کا ٹمپریچر لیا تھا۔

''ڈاکٹر صاحب کو میں نے فون پر سب کچھ بتا دیا تھا۔'' نگار کہتی رہی۔ ''انہیں یقین ہے کہ صبح تک یہ ٹمپریچر بھی نہیں رہے گا۔ اس کے بعد آپ کو رات میں دوائیں نہیں دی جائیں گی۔ ویسے فیصلہ ڈاکٹر صاحب آپ کا معائنہ کرنے کے بعد سنائیں گے۔ مجھے امید ہے کہ فیصلہ یہی ہوگا۔ پھر میں سو سکوں گی۔''

''یعنی کل رات؟'' اظفر نے اس کی طرف دیکھا۔

''جی!'' نگار نے نظریں جھکالیں۔

''ہاسپٹل سے تو تم نے چھٹی لے لی تھی۔ ہوٹل کی ملازمت کا کیا رہا؟''

''وہ لوگ چھٹی نہیں دے رہے تھے لیکن میں نے پروا نہیں کی۔ وہ زیادہ سے زیادہ یہ کرسکتے ہیں کہ کسی اور گلوکارہ کا بندوبست کرلیں گے..... تو کرلیں۔''

''ملازمت چھوٹ گئی تو کیا کرو گی؟''

''جب آپ تندرست ہوجائیں گے تو سوچوں گی۔''

اظفر نے فوراً کچھ نہیں کہا۔ قدرے توقف سے بولا۔ ''بس اب اٹھا لو ٹرے۔ کھا چکا۔''

''تھوڑا سا تو اور لیں۔ آپ نے تو.....''

''بس اب جی نہیں چاہ رہا ہے۔ جو تم سے کہہ رہا ہوں، وہ کرو۔''

نگار نے پھر کچھ نہیں کہا، ٹرے اٹھا کر لے گئی۔ اب اظفر کو خیال آیا کہ اسے نگار سے اتنے سخت لہجے میں بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔ اس لڑکی نے تو اس کے لیے دن رات ایک کر ڈالے تھے۔

نگار جب واپس کمرے میں آئی تو اظفر نے کہا۔ ''آئی ایم سوری نگار!''

وہ چونک کر سوالیہ نظروں سے اظفر کی طرف دیکھنے لگی۔

اظفر بولا۔ ''ٹرے اٹھالے جانے کے لیے میں نے تم سے کچھ سخت لہجے میں کہا تھا۔''

''ارے نہیں۔'' نگار مسکرائی۔ ''آپ مجھ سے اس سے زیادہ سخت لہجے میں بات کریں گے تو بھی میں برا نہیں مانوں گی۔ یہ وقت تو میری زندگی کا سرمایہ ہوگا جو میں آپ کے ساتھ گزار چکی ہوں یا گزاروں گی..... ہاں البتہ..... جب یہ دن گزر جائیں گے تو.....'' نگار کی آواز بھرا گئی۔ وہ تیزی سے مڑ کر دواؤں کی شیلف کی طرف بڑھ گئی۔ اظفر نے محسوس کرلیا کہ نگار نے اس سے ان آنسوؤں کو چھپانے کی کوشش کی تھی جو اچانک اس کی آنکھوں میں آئے تھے۔

اظفر نے وہ بات بھی سمجھ لی جو نگار نے ادھوری چھوڑی تھی۔ وہ کہنا چاہتی تھی کہ جب یہ دن گزر جائیں گے تو اسے یہاں سے جانا ہوگا.....

''میری کوئی ڈاک آئی ان دنوں میں؟'' اظفر نے پوچھا۔

''جی..... جی نہیں۔'' نگار نے مڑ کر دیکھے بغیر جواب دیا اور کسی چھوٹے تولیے سے اپنی آنکھوں کے کنارے خشک کرنے لگی۔

اظفر اس دوران میں بستر پر سیدھا لیٹ چکا تھا۔ اس نے آنکھیں بند کرلیں۔ اسے تعجب تھا کہ اس کے لیے کوئی ڈاک نہیں آئی تھی۔ زرقا نے تو اسے دھمکی دی تھی کہ اگر اسے طلاق نہیں دی گئی تو وہ نوٹس بھیجے گی۔

جب دل چاہے بھیجے، اظفر نے کچھ مشتعل انداز میں سوچا، طلاق اسے میں دوں گا تو عدالت ہی میں دوں گا، اسے رسوا ضرور کروں گا۔ اب اس عورت کی محبت کا بھوت مجھے اپنے سر سے اتار دینا چاہیے۔ وہ کسی اور سے محبت کرتی ہے۔ مجھ سے اس کی نبھ ہی نہیں سکتی کیونکہ دوسری لڑکیوں کے بارے میں میرے مزاج سے وہ سمجھوتا نہیں کرسکتی اور میں اپنا وہ مزاج تبدیل نہیں کرسکتا۔

غلط یا صحیح؟ اظفر اسی انداز میں سوچتا رہا۔

دوسری صبح ڈاکٹر اسے دیکھنے آیا۔ شوکت بھی اس کے ساتھ تھا۔ ڈاکٹر نے اس کا معائنہ کیا اور مسکرا کر بولا۔ ''اس

وقت آپ کو بالکل بخار نہیں ہے لیکن آپ بہت کم زور ہو گئے ہیں۔ کل تک آپ کو تین ڈرپ لگیں گی جن میں طاقت کی دوائیں بھی ہوں گی۔ آپ کو تین چار دن تک بیڈ ریسٹ کرنا ہوگا۔ اگر آپ ذرا بھی تھکیں گے تو بخار آ سکتا ہے۔ احتیاط ضروری ہے..... اور ہاں! خالی پیٹ شراب پینا اور اتنی پینا کبھی بہت زیادہ خطرناک ثابت ہو جاتا ہے۔ احتیاط برتیے گا۔ اگر بالکل چھوڑ دیں تو اچھا ہے۔''

''بالکل تو شاید نہ چھوڑ سکوں۔'' اظفر نے صاف گوئی سے کام لیا۔

''شوکت نے مجھے بتایا ہے کہ آپ ذہنی دباؤ میں ہیں۔''

''اس دباؤ سے تو میں تقریباً نجات حاصل کر چکا ہوں۔''

''تو پھر شراب چھوڑنے میں کیا چیز مانع ہے؟''

''عادت۔'' اظفر کہنا چاہتا تھا مگر اس نے کچھ کہا نہیں۔

ڈاکٹر نے چند لمحے غور سے اس کی طرف دیکھا پھر نگار کی طرف متوجہ ہو کر اسے ڈرپ اور دواؤں کے بارے میں ہدایات دینے لگا۔ پھر شوکت سے بولا۔ ''اب مجھے آنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم نے بہت سمجھ دار نرس کا بندوبست کیا ہے۔ یہ مجھ سے فون پر ہدایات لیتی رہیں گی اور تمہارے دوست کی حالت بھی بتاتی رہیں گی۔ ہاں اگر کسی وقت میں نے ضروری سمجھا تو چکر لگا لوں گا۔''

ڈاکٹر نے اظفر سے بھی دو ایک رسمی باتیں کی۔ شوکت اسے چھوڑنے کے لیے باہر تک گیا۔ نگار دواؤں کی شیلف کے پاس جا کر ڈرپ تیار کرنے لگی۔ شوکت جلد ہی واپس آیا۔ اظفر پر ایک مسکراہٹ اچھالتا ہوا وہ نگار کے قریب جا کھڑا ہوا اور اس سے کچھ کہنے لگا۔ جب نگار ڈرپ تیار کر کے لوٹی تو شوکت اس کے ساتھ تھا۔

''کیا باتیں ہونے لگی تھیں؟'' اظفر نے یوں ہی پوچھا۔

''دواؤں کے بارے میں پوچھ رہا تھا لیکن جی چاہا... کہ نگار سے بھی اپنے چودھویں منصوبے پر بات کروں۔''

''کوئی خاص منصوبہ ہے آپ کا؟'' نگار نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔

''ہاں۔''

''کہاں تک پہنچا؟'' اظفر نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا۔

''ابھی تو چل رہا ہے۔ دیکھو، بات کہاں تک پہنچتی ہے۔''

نگار اظفر کے ہاتھ کی نس میں ڈرپ کی سوئی لگانے لگی۔ ڈرپ ایک طرف لٹکا دی تھی۔

تھوڑی دیر گپ شپ کے بعد شوکت شام کو آنے کا وعدہ کر کے چلا گیا۔

''ڈاکٹر صاحب روزانہ آ رہے ہیں؟'' اظفر نے پوچھا۔

''جی..... کیوں؟''

''وہاں بڑی گندگی تھی۔'' اظفر کو یاد آ گیا تھا کہ اس نے نشے میں ائرگن سے فائرنگ کر کے پرندے ہلاک کر ڈالے تھے۔

''میں نے تو کوئی گندگی نہیں دیکھی۔'' نگار نے جواب دیا۔

''وہاں پرندوں کے کچھ پنجرے تھے!''

''مجھے تو کوئی پنجرہ دکھائی نہیں دیا۔''

اظفر سمجھ گیا کہ شوکت نے ڈاکٹر کی آمد سے پہلے وہاں کی صفائی کر دی ہوگی۔

کچھ توقف سے اظفر نے اپنے ہاتھ کی طرف دیکھتے ہوئے آہستہ سے کہا۔ ''میں بہت دبلا ہو گیا ہوں۔ مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ میرا جسم بھی کچھ گھل گیا ہے۔''

''صحت تو گرنا ہی تھی۔ آپ کا بخار تھا کہ الامان! آپ کو کئی ماہ تک اپنا بہت خیال رکھنا ہوگا، تبھی شاید آپ کی وہ صحت واپس آ سکے۔''

''ذرا مجھے آئینہ دکھاؤ۔ میں نے کب سے آئینہ نہیں دیکھا۔''

''ابھی نہ دیکھیں تو اچھا ہے۔''

''پلیز!''

مجبوراً نگار ایک آئینہ اٹھا لائی۔ اظفر نے اس میں اپنا چہرہ دیکھا اور اسے ذہنی جھٹکا لگا۔ وہ خاصا دبلا ہو گیا تھا۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے نظر آ رہے تھے۔ گالوں کی ہڈیوں کا ابھار زیادہ تو نہیں لیکن کسی حد تک نمایاں ہو گیا تھا۔ جو لوگ اسے اپالو کا مجسمہ کہتے تھے، وہ اب اس قسم کے الفاظ اپنی زبان پر نہ لاتے۔

اظفر نے ٹھنڈی سانس لے کر نگار کو آئینہ واپس کر دیا۔ وہ کچھ افسردہ ہو گیا تھا۔

''اسی لیے میں نہیں چاہتی تھی کہ آپ آئینہ دیکھیں۔'' نگار نے افسردگی سے کہا۔

''کچھ خاص قسم کی لڑکیاں مجھے پسند آتی ہیں نگار! وہ اب مجھ پر توجہ نہیں دیں گی۔''

''مجھے تو آپ اب بھی اچھے لگ رہے ہیں۔'' نگار شاید بے اختیاری میں کہہ گئی، پھر جلدی سے بات بدل کر بولی۔ ''چند مہینے میں آپ بالکل تندرست ہو جائیں گے۔''

اظفر کو بالکل یقین نہیں آ سکا کہ وہ اب پہلے جیسا ہو سکے گا۔

''کیا آپ کی اپنی بیگم سے صلح نہیں ہو سکتی؟'' نگار نے پوچھا۔

اظفر نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ''تم اس بارے میں کیا جانتی ہو؟''

''شوکت صاحب نے بتایا تھا کہ وہ آپ سے ناراض ہو کر چلی گئی ہیں۔''

اظفر چپ ہو گیا۔ اس کی دانست میں نگار کو اس کی وجہ بھی سمجھ لینا چاہیے تھی۔ وہ کوئی بچی نہیں تھی کہ معاملہ اس کی سمجھ میں نہ آتا۔ بیگم زرینہ کی پارٹی میں وہ بھی موجود تھی۔

''معاف کیجیے گا۔'' نگار بولی۔ ''مجھے یہ سوال نہیں کرنا چاہیے تھا۔ یہ آپ کا نجی معاملہ ہے۔''

''نہیں مجھے اس کا جواب دینے میں کوئی جھجک نہیں ہے۔ زرقا سے میرا نباہ نہیں ہو سکتا۔ مرد کی فطرت وہ کبھی نہیں سمجھے گی۔ خاص طور پر آرٹسٹ کی جمالیاتی حس بہت زیادہ ہوتی ہے۔ وہ حسن پرست ہوتا ہے۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہے۔''

''میں اسے اپنے معاشرے کا المیہ سمجھتی ہوں۔'' نگار نے سنجیدگی سے کہا۔ ''ہمارے ہاں کی عورتوں کو مردوں کی اس فطرت سے ضد ہوتی ہے۔ یہ فطرت کسی اعتبار سے غلط ہو یا نہ ہو، ہوتی تو ہے اور اس فطری تقاضے کو نظر انداز کرنا مرد کے اختیار میں نہیں ہوتا۔''

اظفر اس کا منہ تکنے لگا۔ وہ نظریں چرا کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔

☆☆☆

دوسرے دن شام ہوئی تو اظفر کو ڈرپ سے بھی نجات مل گئی۔ وہ بستر سے اٹھا۔ گو کہ اسے چند دن بیڈ ریسٹ کرنا تھا لیکن دس پندرہ منٹ چہل قدمی کی بھی اجازت تھی۔ وہ کھڑا ہوا تو اسے احساس ہوا کہ کم زوری اب بھی تھی۔ وہ دس منٹ تک اپارٹمنٹ ہی کے مختلف حصوں میں گھومتا اور وہاں کا جائزہ لیتا رہا۔ نگار اس کے ساتھ ساتھ رہی۔ دس منٹ میں وہ تھکن محسوس کرنے لگا اور کمرے میں آ لیٹا۔

''میرا خیال ہے کہ اب میں ٹھیک تو ہو گیا ہوں، بس کم زوری ہے۔'' وہ بولا۔

''ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ'' نگار نے تائید کی۔ ''لیکن آپ کی توانائی جلد از جلد بحال کرنے کے لیے ڈاکٹر صاحب نے آپ کے لیے ایک ہفتے کا غذائی مینیو تیار کر کے دیا ہے۔ اس ہفتے میں آپ کو کتنا گوشت، کس کس قسم کی کتنی سبزیاں، کتنا دودھ اور کون کون سی دوسری چیزیں کھانی چاہئیں۔ مثلاً پھل وغیرہ، وہ سب اس مینیو میں لکھا ہے۔ اس کے علاوہ ملٹی وٹامنز بھی ہیں۔ یہ ذمے داری بھی مجھے ہی سونپی گئی ہے۔ کھانا پکانا مجھے آتا ہے۔ سامان شوکت صاحب لا کر دیتے رہیں گے۔''

اظفر اس کی طرف دیکھتے ہوئے پہلی بار خوش مزاجی سے مسکرایا اور بولا۔ ''ذمے داری تمہیں سونپی گئی ہے یا یہ تم نے خود لے لی ہے تاکہ یہاں ایک ہفتہ اور گزار سکو!''

نگار نے نظریں جھکا لیں۔

''خیر، ٹھیک ہے۔'' اظفر نے کہا۔

''میں کچن میں جا رہی ہوں۔ پہلے دن تو آپ کو صرف شوربہ ہی لینا ہوگا۔''

اظفر سر ہلا کر رہ گیا۔ نگار چلی گئی۔ اظفر آنکھیں بند کر کے لیٹ گیا اور سوچتا رہا۔ زرقا کی طرف سے نوٹس اسے ابھی تک نہیں ملا تھا۔ یہ اس کے لیے تعجب کی بات تھی۔

بیگم زرینہ کے بارے میں اسے شوکت سے معلوم ہوتا رہتا تھا کہ وہ ابھی امریکا..... سے نہیں لوٹی تھی۔ اس کے لیے اظفر کا غصہ کم نہیں ہوا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ کسی طرح اس عورت کی دُہری زندگی کا راز فاش کر کے رہے۔ وہ اپنی یہ توہین نہیں بھولا تھا کہ بیگم زرینہ اسے اپنا کھلونا بنانا چاہتی تھی۔

ایک ہفتہ گزر گیا۔ نگار اس سے خورد و نوش کے ٹائم ٹیبل پر عمل کرواتی رہی۔ یہ ہفتہ گزرنے پر اظفر کی کم زوری ختم ہو گئی۔

''اب آپ اپنی کسی پینٹنگ پر کام شروع کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں۔'' رات کے کھانے سے پہلے نگار نے اس سے کہا۔ ''لیکن ابتدا میں زیادہ کام نہ کیجیے گا۔ اپنے اوقاتِ کار میں آہستہ آہستہ اضافہ کیجیے گا۔ ابھی آپ کو کھانا کھلانے کے بعد میرا کام ختم ہو جائے گا۔ میں اپنے گھر چلی جاؤں گی۔''

اظفر نے نگار کے چہرے پر افسردگی دیکھی۔ اس کی نظریں بھی جھکی ہوئی تھیں۔

''تم لگ بھگ پندرہ دن یہاں رہی ہو۔'' اظفر نے سنجیدگی سے کہا۔ ''شوکت سے تمہیں اس کا معاوضہ ملا؟''

''وہ دینا چاہتے تھے، میں نے لیا نہیں۔''

''کیوں؟''

''معاوضہ مجھے آپ سے مل چکا ہے۔''

''مجھ سے؟'' اظفر نے اسے الجھی ہوئی نگاہوں سے دیکھا۔

''جی!'' نگار نے نظریں جھکالیں۔ ''میں پندرہ دن آپ کے قریب رہی۔ اس سے زیادہ معاوضہ مجھے کوئی نہیں دے سکتا۔ آپ بھی نہیں۔''

''میں تو شاید دے سکتا ہوں' یہاں بیٹھو!''

اظفر بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ نگار بستر کے کنارے بیٹھ گئی۔

''اس سے زیادہ معاوضہ مجھے آپ بھی نہیں دے سکتے۔'' وہ آہستہ سے بولی۔

''تمہیں اتنا معاوضہ تو ملنا ہی چاہیے جو تمہارا حق ہے۔'' اظفر نے اپنے سرہانے سے چیک بک نکالتے ہوئے کہا۔ چیک بک کھول کر اس نے ایک سادہ چیک پر دستخط کیے اور چیک پھاڑ کر نگار کی طرف بڑھایا۔ ''بلینک چیک ہے یہ۔ جو چاہو لکھ لو۔''

نگار اس کا منہ تکنے لگی۔

''لو!'' اظفر نے چیک نگار کے اور قریب کرتے ہوئے اصرار کیا۔ ''میری وجہ سے شاید تمہاری ملازمت بھی نہ رہی ہو۔ اس کا ازالہ تو ہونا چاہیے۔''

نگار نے آہستگی سے ہاتھ بڑھا کر چیک لے لیا۔ اظفر نے قلم بھی اسے دیا۔

''جو چاہوں لکھ لوں؟'' نگار نے آہستہ سے پوچھا۔

''ہاں۔'' اظفر نے کہا۔ ''بس میری استطاعت کا خیال رکھنا۔ میں تمہاری اس قربانی کا صلہ صرف چھ فیگرز میں ادا کرسکتا ہوں اس سے زیادہ فیگرز ہوں گی تو چیک، باؤنس ہوجائے گا۔''

''اور اگر.....'' نگار نے سوچتے ہوئے کہا۔ ''اگر صرف چار فیگرز ہوں؟''

''اس میں تو کوئی رکاوٹ ہی نہیں ہوگی لیکن.....''

نگار نے اس کی بات کاٹی۔ ''میں صرف چار فیگرز لکھوں گی۔''

وہ لکھنے لگی۔ اظفر اس کا چہرہ تکتا رہا۔ وہ کچھ جذباتی سی نظر آرہی تھی۔ اس نے کچھ لکھ کر چیک اظفر کی طرف بڑھایا۔ ''کیا یہ چیک کیش ہوجائے گا؟''

اظفر نے دیکھا۔ چیک پر چار فیگرز کا ایک لفظ لکھا دیکھا۔

''محبت''

اظفر کی نظر چند لمحے اس چیک پر جمی رہی پھر اس نے سر اٹھا کر نگار کی طرف دیکھا۔

''بہت گہری سوچ میں پڑ گئے آپ!'' نگار پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ ''یہ چیک شاید کیش نہیں ہوسکتا۔ میں نے اپنی اوقات سے زیادہ معاوضہ لکھ دیا ہے۔ میں غیر آرٹسٹک لڑکی ہوں۔ آپ جیسا حساس آرٹسٹ مجھے اتنا بڑا معاوضہ نہیں دے سکتا۔'' وہ کھڑی ہوگئی۔ اس کی آنکھوں میں پانی سا چمکا۔ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ''میں اچانک اتنی کمزوری محسوس کرنے لگی ہوں کہ آپ کے لیے کھانا بھی نکال کر نہیں لاسکتی۔ آپ خود ہی نکال کر کھا لیجیے گا۔ میں اب جارہی ہوں۔ یہ چیک آپ پھاڑ کر پھینک دیجیے گا۔''

وہ جانے کے لیے تیزی سے مڑی۔ اظفر نے اس سے زیادہ تیزی کے ساتھ اس کا ہاتھ پکڑا اور اسے اپنے قریب گھسیٹ کر اسے اپنے بازوؤں میں بھر لیا۔

''اب تم یہاں سے کبھی نہیں جاؤ گی۔ تمہارا چیک کیش ہوگا نگار!''

''اظفر!'' فرطِ مسرت سے نگار کی آواز کانپ گئی۔

''میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم اتنی زیادہ آرٹسٹک ہو۔'' اظفر نے کہا اور نگار کے گرد اپنے بازوؤں کا حصار پہلے سے زیادہ تنگ کرلیا۔

☆☆☆

صبح شوکت کا فون آیا کہ وہ کسی مصروفیت کے باعث اس وقت اظفر کے گھر کا چکر نہیں لگا سکے گا لیکن شام کو ضرور آئے گا۔

شام کو وہ آیا اور یہ سن کر ذرا دیر کے لیے دم بہ خود نظر آنے لگا کہ اظفر نے اسی دن صبح نگار سے نکاح کرلیا تھا۔

''مبارک ہو۔'' وہ کچھ توقف سے مسکرایا۔ ''اور یقین کرو کہ یہ دو لفظ میں نے سکتے کی کیفیت سے نکل کر کہے ہیں۔ ویسے مجھے امید تو تھی کہ نگار نے جس طرح تمہاری دیکھ بھال کی ہے، اس کا تم پر اثر تو ہوگا لیکن یہ یقین نہیں تھا کہ تم اتنی جلدی ایک غیر آرٹسٹک لڑکی کو ہمیشہ کے لیے اپنا لو گے!''

''یہ تو بہت ہی آرٹسٹک ہے شوکت۔'' اظفر نے پیار سے نگار کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور نگار نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ نظریں جھکالیں۔

اظفر نے شوکت کو چیک کا قصہ سنایا اور بولا۔ ''چیک پر کوئی لڑکی یہ لفظ صرف اسی صورت میں لکھ سکتی ہے جو ذہنی طور پر آرٹسٹک ہو، اور ذہنی طور پر آرٹسٹک ہونا جسمانی طور پر آرٹسٹک ہونے سے زیادہ بڑی بات ہے۔ آرٹسٹک جسم تو آخر کار ڈھلک جاتا ہے لیکن ذہن ارتقا کی منزلیں طے کرتا رہتا ہے۔''

''زرقا بھابی کو خبر ملی ہوگی اس کی؟'' شوکت سنجیدہ ہوا۔

''اسے کیسے اطلاع ہوگی۔ میں تو اب اس سے رابطہ کروں گا نہیں۔ وہ جس کے ساتھ چاہے رنگ رلیاں منائی پھرے۔ اسے شاید طلاق لینے کی فکر بھی نہیں ہے ورنہ اب تک نوٹس بھیج چکی ہوتی۔''

''وہ بہرحال تمہاری بیوی تو اب بھی ہے اظفر! یہ تو قطعی مناسب نہیں کہ وہ طلاق کے بغیر کسی کے ساتھ.....''

''ختم کرو اس کا ذکر شوکت!'' اظفر نے اس کی بات کاٹی۔ ''میرے لیے اس کی کوئی اہمیت نہیں کہ وہ طلاق لیتی ہے یا نہیں، اور اگر میں اسے طلاق دوں گا بھی تو عدالت میں اسے رسوا کر کے..... اب آج کے دن تم یہ ناخوش گوار باتیں چھوڑو۔'' وہ نگار سے مخاطب ہوا۔ ''شوکت کو دکھاؤ، آج میں نے تمہیں کیا کیا شاپنگ کرائی ہے۔''

نگار ہنس کر بولی۔ ''وہ سب میں یہاں کیسے اٹھالاؤں۔ آپ بیڈ روم میں چلیے شوکت صاحب! سب کچھ بیڈ پر بکھرا ہوا ہے۔ سلیقے سے رکھنے کا وقت ہی نہیں ملا ہے۔ ابھی تو آئے ہیں ہم بازار سے۔''

شوکت نے وہ سب چیزیں دیکھنے کا اشتیاق ظاہر کیا۔ نگار اور اظفر اسے بیڈ روم میں لے گئے۔ بستر پر انواع و اقسام کی ساڑیاں اور زیورات کے باکس نظر آرہے تھے۔

''اوہو!'' شوکت بولا۔ ''کیا اپنا سب بینک بیلنس صاف کر آئے ہو!''

''بڑی حد تک۔'' اظفر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''لیکن اب نگار کی وجہ سے مجھے جو سکون ملے گا تو میرے کام کی رفتار بہت بڑھ جائے گی۔ سب ٹھیک ہوجائے گا۔ نگار، تم شوکت کی خاطر مدارات کا انتظام تو کرو۔''

''ہاں بھئی! منہ تو میٹھا ہونا چاہیے۔''

شوکت کی خاطر مدارات میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی گئی۔ اس کا انتظام نگار اور اظفر نے پہلے ہی کرلیا تھا۔

ایک گھنٹے بعد شوکت کھڑا ہوتے ہوئے بولا۔ ''اب مجھے چلنا چاہیے۔ تم دونوں کو اپنی شبِ عروسی کا بھی بندوبست کرنا ہوگا ابھی۔''

''نہیں شوکت! وہ تو ہم.....''

نگار نے گھور کر اظفر کو دیکھا تو وہ مسکرا کر چپ ہوگیا۔

''خیر اب مجھے جانا تو ہے۔'' شوکت نے کچھ سمجھ بھی لیا تو اس کا اظہار نہیں کیا۔

''ایک بات کا خیال رکھنا۔'' اظفر نے سنجیدگی سے کہا۔ ''بیگم زرینہ جیسے ہی امریکا سے لوٹے، مجھے اس کی اطلاع کردینا۔''

''اب وہ سب کچھ بھول بھی جایئے اظفر!'' نگار نے کہا۔

''وہ ایسی بات نہیں ہے نگار کہ میں اسے بھول جاؤں۔ اس نے مجھے اس قابل نہیں رہنے دیا ہے کہ میں لوگوں سے نظریں چار کرسکوں۔ اس کی مکروہ شخصیت سے پاکیزگی کا لبادہ نوچ کر پھینکنا تو میرے لیے اشد ضروری ہے۔''

''آپ ہی انہیں سمجھایئے شوکت صاحب!'' نگار نے اپنی بے بسی کا اظہار کیا۔

''مجھے کچھ سمجھانے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔'' شوکت نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''تم میرے دوست پر اپنی محبت کی تہ گہری کرتی رہو۔ یہ سب کچھ بھول جائے گا۔''

شوکت چلا گیا۔

☆☆☆

پانچ چھ دن گزر گئے۔ نگار کے قرب میں کوئی ایسا جادو تھا کہ اظفر شدت سے اس پر فریفتہ ہوگیا۔ کسی بھی لڑکی کے قرب میں اس نے خود کو ایسی طلسماتی فضا میں نہیں پایا تھا۔ حتیٰ کہ زرقا کے قرب میں بھی نہیں جو اس کے نظریے کے مطابق آرٹسٹک تھی۔ وہ اس الجھن کا شکار ضرور ہوا کہ زرقا نے بالکل خاموشی اختیار کرلی تھی۔ نوٹس بھیجنا تو درکنار، اس نے فون پر بھی اظفر سے رابطہ نہیں کیا تھا۔ نگار اس کی الجھن سے واقف تھی۔

''اگر کبھی وہ اچانک لوٹ آئی تو؟'' ایک دن اظفر نے نگار سے کہا۔

''میں گرم جوشی سے اس کا استقبال کروں گی۔''

''وہ تم سے نفرت کرے گی۔ اس نے تو ان لڑکیوں کو بھی برداشت نہیں کیا تھا جو میری بیویاں نہیں بنی تھیں۔''

''میں اس سے محبت کروں گی۔ محبت سب کچھ جیت سکتی ہے۔ آپ کو جیتنے کے بعد محبت پر میرا اعتماد اور بڑھ گیا ہے۔''

''لیکن میں اسے اس گھر میں قدم نہیں رکھنے دوں گا۔''

''وقت آنے پر دیکھ لیں گے۔'' نگار نے مسکرا کر کہا۔ ''جایئے آپ کے کام کا وقت ہوگیا۔''

صبح کے ناشتے کے بعد اظفر اس وقت اخبار بھی پڑھ چکا تھا جب ان میں یہ باتیں شروع ہوئی تھیں۔ اس کا معمول تھا کہ وہ اخبار پڑھنے کے بعد کسی پینٹنگ پر کام کرنے کے لیے اپنے اسٹوڈیو میں چلا جاتا تھا جو اس نے اپارٹمنٹ کے ہی ایک بڑے کمرے میں بنا رکھا تھا۔ دوپہر کے کھانے تک نگار اسے بالکل ڈسٹرب نہیں کرتی تھی۔ وہ پینٹنگ کے دوران ہی وہسکی کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لیتا رہتا تھا۔ زرقا کی طرح

نگار نے بھی اس موضوع پر بات نہیں چھیڑی تھی کہ وہ زیادہ پیتا تھا یا اسے کم پینا چاہیے۔

اس دن گیارہ بجے کے قریب اظفر کے موبائل پر کال آئی۔ وہ بیرون ملک کی تھی۔ اظفر کی پیشانی پر شکن پڑ گئی۔ اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ کال کس کی ہوسکتی تھی۔ اس نے موبائل کان سے لگایا۔

''ہیلو!'' وہ سرد لہجے میں بولا۔

''دوسری شادی مبارک ہو پینٹر!''

اظفر کے ہونٹ بھنچ گئے۔ اس کے اندازے کے مطابق وہ کال امریکا سے بیگم زرینہ ہی کی تھی۔

''چپ کیوں ہوگئے پینٹر!'' بیگم زرینہ کا لہجہ بڑا خوشگوار تھا۔ ''مجھے بھی مبارک باد دو کہ میں نے جو کچھ کہا تھا، وہ ہوگیا۔ زرقا نے تم سے علیحدگی اختیار کرلی ہے۔ حیران نہ ہونا کہ مجھے امریکا میں ان باتوں کا علم کیسے ہوگیا۔ وہاں میرا ایک ایجنٹ ہے جو مجھے سب رپورٹس دیتا رہتا ہے۔''

''میں جانتا ہوں۔'' اظفر نے تلخی سے کہا۔ ''تمہارے اسی ایجنٹ نے فون کرکے مجھے اوپری منزل پر بلایا تھا۔''

''میں یہ نہیں کہوں گی کہ تم بہت سمجھ دار ہو۔ یہ تو بالکل سامنے کی بات ہے۔''

''اس وقت فون کرنے کا مقصد؟'' اظفر نے درشت لہجے میں پوچھا۔

''میں تمہیں بتانا چاہتی ہوں کہ جب تک میری بات نہیں مانو گے، تمہاری زندگی زیادہ دن تک پُرسکون نہیں رہنے دوں گی۔ نگار بھی تم سے چھین لی جائے گی۔''

''زرقا کے واقعے سے تم خوش فہمی کا شکار ہوگئی ہو۔ نگار دوسری قسم کی لڑکی ہے۔ تم کچھ بھی کرلو، وہ مجھ سے بدظن نہیں ہوگی۔''

''ہر قسم کی لڑکیوں کے لیے میرا دماغ مختلف تدابیر سوچ سکتا ہے۔''

''میں امریکا سے تمہاری آمد کا منتظر ہوں بیگم زرینہ! میں قسم کھا چکا ہوں کہ تمہارے چہرے سے نقاب نوچ کر رہوں گا۔''

بیگم زرینہ نے ایک ہلکا سا سریلا قہقہہ لگایا۔ ''میں بہت جلد آنے والی ہوں پینٹر! بے چینی تو مجھے خود بھی ہے۔ تم گڑگڑاتے ہوئے میرے پاس آؤ گے اور میری ہر بات مانو گے۔''

''تم دن میں بھی خواب دیکھتی ہو؟'' اظفر کے لہجے میں طنز تھا۔

بیگم زرینہ ہنسی۔ ''یہاں امریکا میں تو رات ہے پینٹر!''

اظفر نے دانت پیستے ہوئے رابطہ منقطع کردیا۔ شدید غصہ اور جھنجلاہٹ اس کے چہرے سے صاف ظاہر ہو رہی تھی۔ وہ اس عالم میں پینٹنگ جاری نہیں رکھ سکتا تھا۔ اس نے برش ایک طرف پھینکا اور گلاس اٹھا کر دو بڑے گھونٹ لیے۔ گلاس ہاتھ میں لیے وہ ٹہلنے لگا۔ غصے اور جھنجلاہٹ کے باوجود اس نے تھوڑا سا خوف بھی محسوس کیا تھا۔ بیگم زرینہ جیسی عورت کوئی بھی شیطانی تدبیر سوچ سکتی تھی، اس پر عمل بھی کرسکتی تھی۔ اظفر اسی خیال سے کچھ خوفزدہ ہوا تھا۔ ابھی اس کی شادی کو زیادہ دن نہیں گزرے تھے لیکن وہ محسوس کرنے لگا تھا کہ نگار نے اس کی زندگی کا ایک ایسا خلا پُر کردیا ہے جو زرقا نہیں کرسکی تھی۔ اس خلا کا تعلق اظفر کی جمالیاتی حس کی شدت ہی سے ہوسکتا تھا جو فطری آرٹسٹوں میں عموماً پائی جاتی ہے۔

نگار نے اس کی پریشانی اسی دن محسوس کرلی۔ اس کے استفسار پر اظفر نے اسے پریشانی کا سبب بتا بھی دیا۔

نگار ہنسنے لگی۔ ''کمال کرتے ہیں آپ بھی! اس نے فون پر دھمکایا اور آپ اتنے پریشان ہوگئے۔ مجھے سمجھنے میں آپ کو شاید دیر لگے گی۔ ابھی آپ کو خیال نہیں آسکتا کہ آپ میرے لیے کیا ہیں۔ آپ میری زندگی کا حاصل ہیں اظفر! بیگم زرینہ تو کیا، دنیا کی کوئی طاقت بھی مجھے آپ سے بدظن نہیں کرسکتی۔''

''صرف یہی نہ سوچو کہ وہ تمہیں مجھ سے بدظن کرنے کی کوشش کرے گی۔ وہ کوئی ایسی چال بھی چل سکتی ہے جو ابھی ہمارے وہم و گمان میں بھی نہیں ہے۔''

''میں اس کی کوئی چال کارگر نہیں ہونے دوں گی۔ مجھ پر اعتماد کیجیے۔ آپ سے دور ہوجانا تو اب میرے لیے بھی ممکن نہیں ہے۔ پریشانی جھٹک دیجیے اپنے دماغ سے۔ اس کا ذکر شوکت صاحب سے بھی نہ کیجیے گا۔ وہ آپ کے بے تکلف دوست سہی اور میں بھی انہیں بہت دن سے جانتی ہوں لیکن کسی پر بھی یہ کیوں ظاہر ہو کہ فون پر ملنے والی ایک دھمکی بھی آپ کو اتنا پریشان کرسکتی ہے۔ کل سے آپ پوری یکسوئی کے ساتھ اپنے کام پر توجہ دیں۔ آج کا دن تو آپ نے ضائع کر ہی دیا۔''

نگار کی ان باتوں سے اظفر کی بہت ڈھارس بندھی۔ اس نے دل ہی دل میں خود کو مطعون بھی کیا۔ وہ تو بیگم زرینہ کو بے نقاب کرنے کا عزم کیے ہوئے تھا لیکن خود ہی اس کی ایک دھمکی سے اتنا پریشان ہوگیا۔

دوسرے دن سے وہ پُرسکون ہوکر اپنے کام میں

مصروف ہوگیا۔ آئندہ چند ماہ میں اسے بہت کام کرنے تھے۔

دن پر دن گزرتے گئے۔ نگار سے اس کی ہم آہنگی کی اعتبار سے بڑھتی ہی رہی۔ اس کے ساتھ ایک خلش میں بھی اضافہ ہوتا رہا۔ زرقا کی طرف سے کوئی بات بھی سامنے نہیں آرہی تھی۔ وہ اب ہرگز نہیں چاہتا تھا کہ زرقا اس کی زندگی میں واپس آئے لیکن زرقا کی طرف سے اتنی خاموشی اس کی بے چینی بڑھاتی رہی۔ نگار سے اس کی یہ بے چینی بھی پوشیدہ نہیں رہ سکی۔ اس کے استفسار پر اس نے اس بارے میں بھی بتا دیا۔

''یہ واقعی عجیب بات ہے۔'' نگار نے سنجیدگی سے کہا۔ ''آپ خود انہیں فون کرکے دیکھیں، اندازہ تو لگائیں کہ آخر بات کیا ہے۔''

''کہوں گا کیا؟'' اظفر نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''یہی پوچھ لیجیے گا کہ ان کے نوٹس کے لیے آپ کو کب تک انتظار کرنا پڑے گا۔ بات طنزیہ ہوجائے گی۔ انہیں یہ خیال نہیں آئے گا کہ آپ ان سے بات کرنے کے لیے یا ان کی آواز سننے کے لیے بے تاب تھے۔''

''یہ ٹھیک ہے۔'' اظفر نے نگار سے اتفاق کیا اور اسی وقت اپنے موبائل پر زرقا کا موبائل نمبر ملایا۔

دوسری طرف تین مرتبہ گھنٹی بجی، پھر لائن کٹ گئی۔

''وہ مجھ سے بات بھی نہیں کرنا چاہتی۔'' اظفر نے نگار کی طرف دیکھتے ہوئے غصے سے کہا۔ ''میرا نمبر دیکھ کر لائن کاٹ دی اس نے۔''

''لائن بھی اتفاق سے بھی کٹ جاتی ہے۔ آپ دوبارہ کوشش کریں۔''

اظفر نے دوبارہ بھی کوشش کی لیکن اس بار بھی تین گھنٹیوں کے بعد لائن کٹ گئی۔ نگار کے اصرار پر اس نے ایک کوشش اور کی۔ اس بار بھی ایسا ہی ہوا۔ اظفر مشتعل ہوگیا۔

''وہ توہین کررہی ہے میری! شاید وہ اس وقت بھی ریحان کے ساتھ ہو۔ پہلے بھی وہ ریحان کے سامنے میری توہین کرچکی ہے۔''

''تو پھر لعنت بھیجیے اس پر۔ انتظار نہ کیجیے نوٹس کا۔ طلاق نامہ بھیج دیں۔''

''ہرگز نہیں۔'' اظفر نے سختی سے کہا۔ ''اس وقت تو اس نے میرا غصہ اور بڑھا دیا ہے۔ میں اسے عدالت میں ضرور گھسیٹوں گا۔''

''تو پھر سکون سے انتظار کیجیے۔ شاید وہ جلدی نوٹس بھیج کر آپ کو پریشان کرنا اور ستانا چاہتی ہیں۔ آپ ان کا مقصد پورا نہ ہونے دیں۔ آپ کو یہ تو برا نہیں لگ رہا ہے کہ وہ آپ کی بیوی... ہوتے ہوئے بھی کسی اور کے ساتھ.....''

''نہیں۔'' اظفر نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''میری سوچ کا انداز عام لوگوں کی سوچ سے بالکل مختلف ہے۔ جب میرے دل و دماغ نے اسے بیوی کی حیثیت سے مسترد کردیا ہے اور وہ مجھے شوہر کی حیثیت سے مسترد کرچکی ہے تو اب ہم میاں بیوی نہیں رہے۔ وہ کچھ بھی کرتی پھرے، مجھے اس کی پروا نہیں۔''

''تو پھر سکون سے ان کے نوٹس کا انتظار کیجیے۔ خلش میں مبتلا رہ کر تو آپ انہی کا مقصد پورا کریں گے۔''

اظفر نے پُرخیال نظروں سے نگار کی طرف دیکھا اور پھر اثبات میں سر ہلانے لگا۔

☆☆☆

شادی کو ایک ماہ سے کچھ زیادہ ہوچکا تھا جب اظفر کو شوکت سے اطلاع ملی کہ بیگم زرینہ دو ایک دن میں امریکا سے واپس آنے والی ہے۔

اظفر بے چین ہوگیا۔ وہ بیگم زرینہ کو بے نقاب کرنے کے لیے کچھ کرنا چاہتا تھا لیکن کوئی تدبیر اس کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ گزرے ہوئے دنوں میں بھی وہ سوچتا رہا تھا یا کام کی زیادتی کے باعث سوچنے کی مہلت اسے کم ہی ملی تھی۔ کوئی ایسا طریقہ اس کی سمجھ میں نہیں آسکا تھا کہ بیگم زرینہ کو بے نقاب کرسکے۔

اگلے دن وہ کام نہیں کرسکا۔ اس کا دماغ بیگم زرینہ میں اُلجھا رہا۔ اس سے اگلے دن بھی اس کا دل کام میں نہیں لگا تو وہ پینٹنگ سے متعلق کچھ ضروری اشیا خریدنے کے لیے بازار جانے کی تیاری کرنے لگا۔

''جلدی آیئے گا۔'' نگار نے اسے رخصت کرتے ہوئے کہا۔

''ایک ڈیڑھ گھنٹے سے زیادہ نہیں لگے گا۔'' اظفر نے محبت سے نگار کا گال تھپکا اور اپارٹمنٹ سے نکل آیا۔

بیس منٹ بعد اس کی کار شہر کی اس بڑی دکان کے سامنے رکی جہاں پینٹنگ سے متعلق بہترین سامان ملتا تھا۔ وہ کار سے اتر کر دکان میں داخل ہوا۔ دکاندار اسے جانتا تھا۔ وہ فوراً اس کی طرف متوجہ ہوا۔ علیک سلیک ہوئی۔ سامان کی لسٹ اظفر بنا کر لایا تھا۔ وہ اس نے دکاندار کے حوالے کی۔ دکاندار نے ملازمین کو وہ سب سامان نکالنے کی ہدایت کی۔

اظفر سرسری نظروں سے سڑک پر رواں دواں ٹریفک کا جائزہ لے رہا تھا کہ اس کے موبائل کی گھنٹی بجی۔ اس نے موبائل جیب سے نکالا اور کال کرنے والی کا نام دیکھ کر مسکرایا۔

''کیا بے چینی ہے نگار! میں ابھی تو.....''

''اظفر!'' نگار کی آواز چیختی ہوئی سی تھی۔ ''مجھے.....''

فوراً ہی نگار کی آواز گھٹ گئی یا موبائل اس سے دور ہوگیا۔

''نگار!'' اظفر نے جیسے پکارا۔ وہ بے حد پریشان ہوگیا۔

دوسری طرف سے ایسی آواز آئی جیسے موبائل بند کردیا گیا ہو۔

''نگار!'' اظفر چیخ پڑا۔

لائن بے جان ہوچکی تھی۔ اسے کوئی جواب نہیں مل سکتا تھا۔

دکاندار اور دکان کے چند گاہک بھی چونک کر حیرت سے اظفر کی طرف دیکھنے لگے۔ اظفر اس وقت اپنے ماحول سے بالکل بے خبر ہوچکا تھا۔ اس نے اپنے موبائل پر نگار کے موبائل سے رابطہ کرنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ نگار کا موبائل بند تھا۔

انجانے خدشات اور وسوسوں کے ناگ اظفر کے دماغ میں پھنکارنے لگے۔ وہ بہ عجلت دکان سے نکلا اور ''نگار، نگار'' بڑبڑاتا ہوا اپنی کار کی طرف لپکا۔ کار میں بیٹھ کر انجن اسٹارٹ کیا اور کار دوڑا دی۔

اظفر کی سانسیں تیزی سے چلنے لگی تھیں۔ سینے میں دل دھڑکنے کے بجائے اچھلنے سا لگا تھا۔ اظفر کی دانست میں کوئی بہت بڑی گڑبڑ ہوچکی تھی۔ کسی نے موبائل نگار سے چھین کر بند کردیا تھا۔

اظفر کو بیگم زرینہ کا خیال آیا۔ شوکت کے کہنے کے مطابق اسے آج کسی وقت امریکا سے واپس آنا تھا۔ غالباً وہ آتے ہی نگار کے خلاف کوئی قدم اٹھا چکی تھی۔

تیز رفتار کار کا اسٹیرنگ صرف ایک ہاتھ سے سنبھالنا خطرناک بات تھی لیکن اظفر نے اس وقت ایسا ہی کیا۔ دوسرے ہاتھ سے اس نے موبائل پر شوکت کا نمبر ملایا۔

''ہاں اظفر! خیریت؟'' رابطہ قائم ہونے پر شوکت کی آواز سنائی دی۔

''گھر پر کچھ گڑبڑ ہوئی ہے شوکت!'' اظفر نے گھبرائے ہوئے انداز میں کہا اور مختصراً سارا واقعہ بتادیا۔

''تم کہاں ہو؟'' شوکت نے جلدی سے پوچھا۔

''گھر ہی جارہا ہوں۔ راستے میں ہوں۔''

''تم پہنچو، میں ابھی آتا ہوں۔'' شوکت نے کہا اور رابطہ منقطع کردیا۔

اظفر نے ایک بار پھر نگار کے موبائل سے رابطہ کرنا چاہا مگر ناکام رہا۔

پندرہ منٹ بعد وہ اپنے اپارٹمنٹ میں تھا۔ گھر میں داخل ہوتے ہی اس نے نگار کو پکارنا شروع کردیا..... اسے اپنی پکار کا کوئی جواب نہیں ملا۔ وہ خواب گاہ میں داخل ہوا۔ نگار وہاں بھی نہیں تھی۔ اظفر وہاں سے فوراً پلٹا لیکن اس کی نظر نیلے رنگ کے ایک بڑے سے کاغذ پر گئی جو اس کے بستر پر پڑا ہوا تھا۔ اس نے لپک کر وہ کاغذ اٹھایا۔ اس پر جو عبارت ٹائپ کی گئی تھی وہ اسی کے لیے تھی۔

''اگر تمہیں نگار کی زندگی عزیز ہے تو صبر سے کام لو۔ چار بجے موبائل پر تم سے رابطہ کیا جائے گا۔ اسی وقت تم جان سکو گے کہ نگار کی زندگی کے لیے تمہیں کیا کرنا ہے۔ اگر تم نے اس سلسلے میں پولیس سے رابطہ کیا تو تمہیں نگار کی لاش ہی مل سکے گی۔''

اظفر سکتے کی سی حالت میں کھڑا رہ گیا۔ اس میں کسی شبے کی گنجائش نہیں رہ گئی تھی کہ نگار کو اغوا کیا جاچکا تھا۔

بیگم زرینہ! اظفر کے دماغ میں صرف یہی ایک نام کونج سکا۔

سکتے کی حالت سے نکل کر اظفر بستر کی سائیڈ ٹیبل کے قریب گیا۔ بیگم زرینہ کے گھر کی پارٹی کا دعوت نامہ وہیں پڑا ہوا تھا۔ دعوت نامے پر بیگم زرینہ کے گھر کے دو ٹیلی فون نمبر دیے گئے تھے۔

اظفر نے ایک نمبر ملایا۔ دوسری طرف سے کال کسی مرد نے ریسیو کی۔ اظفر کے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ وہ گھر کا ملازم تھا۔ اظفر نے بیگم زرینہ کے بارے میں پوچھا۔ اسے معلوم ہوا کہ بیگم زرینہ امریکا سے تو آگئی تھی لیکن اس وقت گھر پر نہیں تھی۔ اظفر نے اس کا موبائل نمبر جاننا چاہا لیکن ملازم نے معذرت کرلی۔

اظفر نے پٹخنے کے سے انداز میں ریسیور رکھا۔ بیگم زرینہ سے رابطے کے لیے اس نے کمرے میں رکھے ہوئے ٹیلی فون کا استعمال کیا تھا۔ وہ غصے میں ٹہلنے لگا۔ اس کے خیال کے مطابق یہ حرکت بیگم زرینہ ہی کی ہوسکتی تھی۔ یہ کام کرائے کے آدمیوں سے کرایا جاسکتا تھا۔ بیگم زرینہ اتنی گھٹیا عورت تھی کہ اس کا تعلق جرائم پیشہ لوگوں سے بھی ہوسکتا تھا۔ اظفر کو

پارٹی میں فون کرکے اوپر بلانے والا کوئی مرد ہی تھا۔

ٹہلتے ٹہلتے اور سوچتے سوچتے اظفر چونکا۔ شوکت کو اب تک آجانا چاہیے تھا۔ وہ صرف شوکت ہی کو اس واردات کے بارے میں بتا سکتا تھا اور اس سے مشورہ کرسکتا تھا۔ پولیس سے رابطہ کرنے کی اس میں ہمت نہیں تھی۔ وہ نگار کی زندگی خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔ اس نے موبائل پر شوکت سے دوبارہ رابطہ کرنے کی کوشش کی۔ اس مرتبہ وہ ناکام رہا۔ شوکت کا موبائل بھی اب بند تھا۔

اظفر کی پریشانی دوچند ہوگئی۔ اس کا دماغ ان خطوط پر کام کرنے لگا کہ شوکت کو بھی کسی طرح اس کے پاس پہنچنے سے روک دیا گیا تھا۔ بیگم زرینہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ اس معاملے میں کسی سے مشورہ بھی کرسکے۔ وہ بے بسی سے اپنے سر کے بال پکڑ کر کھینچنے لگا۔ اب اس کے سامنے اس کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا کہ وہ نگار کو اغوا کرنے والے کے فون کا انتظار کرے جو اس کے خیال کے مطابق بیگم زرینہ ہی کا کوئی غلام ہوگا۔ اس نے یہ بھی محسوس کیا کہ اگر اس وقت اس نے شراب کا سہارا نہ لیا تو سوچتے سوچتے اس کے دماغ کی شریانیں پھٹ جائیں گی۔ اس نے بوتل نکال لی۔ اسے یہ خیال بھی تھا کہ اس وقت اتنی زیادہ نہ پیے کہ ناکارہ ہوکر رہ جائے۔

چار بجے اس کے موبائل کی گھنٹی بجی۔ اس نے موبائل اٹھا کر کال کرنے والے کا نمبر دیکھا جو توقع کے مطابق اس کے لیے اجنبی ہی تھا۔ اس نے کال ریسیو کی۔

''ہیلو!'' اس کی آواز بھرائی ہوئی سی تھی۔

''اُمید ہے تم نے پولیس سے رابطہ نہیں کیا ہوگا۔'' دوسری طرف سے آواز آئی۔

اظفر چونک پڑا۔ وہ شوکت تھا۔ اس کے لہجے میں بڑی طمانیت تھی۔

''شوکت!'' اظفر کے لہجے میں حد درجہ حیرت تھی۔

''ہاں میرے دوست!'' دوسری طرف سے شوکت نے کہا۔ ''میں نے ہی نگار کو اغوا کیا ہے۔''

''دوست!'' اظفر نے دانت پر دانت جمائے۔ ''اپنی زبان سے اس لفظ کو گندہ نہ کرو۔''

''اچھا!'' شوکت ہنسا۔ ''چلو میں اب یہ لفظ اپنی زبان پر نہیں لاؤں گا تو اے میرے دشمن! اگر تم نگار کو زندہ سلامت واپس پانا چاہتے ہو تو تمہیں میرا ایک مطالبہ ماننا پڑے گا۔ مجھے ایک کروڑ روپے دینے ہوں گے۔''

''دماغ خراب ہے تمہارا۔'' اظفر نے غصے سے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''تم جانتے ہو کہ میرے پاس اتنے روپے نہیں ہیں۔''

''لیکن اتنے روپے آسکتے ہیں تمہارے پاس۔ بس ایک کام کرنا ہوگا تمہیں۔ ایک رات کے لیے بیگم زرینہ کے پاس چلے جاؤ۔ ایک کروڑ دے دے گی وہ تمہیں۔''

''تو تم نے یہ حرکت بیگم زرینہ کے لیے کی ہے؟'' اظفر نے دانت پیسے۔

''ایک اعتبار سے یہ درست بھی ہے لیکن دراصل میں نے جو کچھ کیا ہے، وہ صرف اپنے لیے کیا ہے۔'' شوکت ہنسا۔ ''یہ ہے میرا وہ چودھواں منصوبہ جس پر میں کام کررہا تھا۔ اب تم سے کیا پردہ میرے دشمن! میں ان دو تین افراد میں سے ایک ہوں جنہیں بیگم زرینہ کبھی کبھی نواز دیتی ہے۔ ہم چند افراد اس کے معیار کے مطابق نہیں ہیں یعنی اسے دل سے پسند نہیں ہیں لیکن وہ ہمیں اس لیے نوازتی ہے کہ ہم اس کے لیے کبھی کبھی کوئی چھوٹا موٹا کام کردیں لیکن اس کا راز کبھی کسی ایسے آدمی پر افشا نہ کریں کہ وہ قانون کی زد میں آجائے۔ وہ تمہیں پسند کرتی تھی اور پسند کرتی ہے۔ اس نے مجھ سے تمہارے بارے میں بات کی تھی۔ نہ جانے کیوں اسے شبہ بھی تھا کہ تم اس کی بات نہیں مانو گے۔ پھر بھی وہ ایک کوشش ضرور کرنا چاہتی تھی جو اس نے کی۔ اس واقعے سے پہلے میں نے اس سے کہا تھا کہ اگر وہ ناکام رہی تو میں کچھ سوچوں گا اور تمہیں اس کے قدموں میں لے جاڈالوں گا۔ اس کے عوض وہ مجھے پچاس لاکھ روپے دے گی۔ بعد میں جب وہ اپنی کوشش میں ناکام ہوگئی تو اس نے مجھ سے بات کی۔ میں نے اس سے کہا تھا کہ تمہیں کسی وقت ایک کروڑ روپے کی ضرورت پڑسکتی ہے۔ اس وقت تم اس کے پاس آؤ گے۔ وہ بڑی ضدی عورت ہے، میرے دشمن! تم نے اسے مسترد کرکے اس کی جو توہین کی تھی اس کا بدلہ لینے کے لیے وہ کچھ بھی کرسکتی ہے۔ مجھے اس کا اندازہ تھا جو درست بھی ثابت ہوا۔ وہ مجھے پچاس لاکھ دینے کے علاوہ تمہیں بھی ایک کروڑ روپے دینے کے لیے تیار ہوگئی۔ بس!..... یہ ہیں میرے چودھویں منصوبے کی تفصیلات..... پہلے تو میں نے سوچا تھا کہ زرتاج کو اغوا کرکے تم سے ایک کروڑ کا مطالبہ کروں گا لیکن حالات بدل گئے۔ میں بہت پریشان ہوا تھا لیکن حالات میرے حق میں اس طرح ہوگئے کہ نگار تمہاری بیوی بن گئی۔ اس کے لیے تھوڑی سی کوشش مجھے بھی کرنی پڑی تھی۔ پھر جب تم اس کی محبت کے اسیر بھی بن گئے تو مجھے اپنے منصوبے کی کامیابی کا سو فیصد یقین ہوگیا۔ نگار کی خاطر تم اپنی ایک رات تو بیگم زرینہ کو

دے ہی سکتے ہو۔"

اظفر بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے سب کچھ سنتا رہا۔ اس کے روئیں روئیں سے غیظ و غضب کی چنگاریاں پھوٹ رہی تھیں۔

"تو یہ ہے میرا ڈیڑھ کروڑ کا منصوبہ!" شوکت پھر بولا۔ "تم اپنی آج کی رات ایک کروڑ میں بیگم زرینہ کو بیچ سکتے ہو۔ تم وہ روپے مجھے دے دو گے تو نگار تمہیں مل جائے گی۔ میں کل اسی وقت تمہیں فون کروں گا۔ میں تمہیں بتاؤں گا کہ روپے تم مجھے کہاں اور کس طرح بھجواؤ گے۔ کل اگر مجھے یہ معلوم ہوا کہ تم میرا مطالبہ پورا نہیں کر رہے ہو تو نگار پر خوں خوار کتے چھوڑ دیے جائیں گے اور اس کی وڈیو فلم بنا کر میں تمہیں بھیج دوں گا اور ہاں! یہ بھی ممکن ہے کہ اس سے پہلے میں بھی ایک مرتبہ نگار سے فیض یاب ہو جاؤں۔"

"کتے!" اظفر بے قابو ہو کر چیخ پڑا۔

دوسری طرف شوکت نے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور رابطہ منقطع کر دیا۔

شراب کا گلاس سامنے رکھا تھا۔ اظفر اس کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لیتا رہا تھا شوکت سے بات ختم ہوتے ہی اس نے وحشت میں گلاس اٹھایا اور ایک ہی سانس میں خالی کر کے تپائی پر پٹخ دیا۔ صوفے کی پشت گاہ سے ٹیک لگا کر وہ لمبی لمبی سانسیں لینے لگا۔ اس کے دماغ میں سائیں سائیں ہونے لگی تھی۔ اس سنسناہٹ میں چکراتے ہوئے خیالات یہ تھے کہ نگار کو واپس پانے کے لیے اسے بیگم زرینہ کے ہاتھوں بکنا ہی ہوگا۔ یہ بات اس کے لیے بڑی اذیت ناک تھی کہ وہ مرد ہو کر ایک عورت کے ہاتھوں بکتا لیکن اس کے سوا اسے کوئی راستہ نہیں سوجھ رہا تھا۔ نگار کو بچانے کے بعد ہی وہ بیگم زرینہ اور شوکت سے انتقام لینے کے لیے کچھ سوچ سکتا تھا یا کر سکتا تھا۔

ایک گھنٹا تذبذب کے عالم میں گزر گیا۔ بیگم زرینہ سے رابطہ کرنے کا خیال اس کے لیے بڑا تکلیف دے تھا۔

موبائل کی گھنٹی نے اسے چونکایا۔ موبائل پر نظر آنے والا وہ نمبر بھی اس کے لیے اجنبی تھا۔ اس نے کال ریسیو کی۔

"ہیلو!" اس کا لہجہ بے حد سپاٹ تھا۔

"بیگم زرینہ بول رہی ہوں۔" دوسری طرف سے آواز آئی۔ "مجھے اطلاع ملی تھی کہ آج تم مجھ سے رابطہ کرنا چاہو گے۔ میں اس وقت گھر پر نہیں ہوں۔ شہر سے بہت دور ہوں اسی لیے میں نے تم سے خود ہی رابطہ کر لیا۔ کیا چاہتے ہو پینٹر؟" بیگم زرینہ کا آخری فقرہ چبھتا ہوا سا تھا۔

"یہ تم خود بھی جانتی ہو۔" اظفر نے زہریلے لہجے میں کہا۔

"میں کچھ نہیں جانتی پینٹر!" بیگم زرینہ نے بڑی معصومیت کا اظہار کیا۔

اظفر نے بحث میں پڑنا بیکار سمجھا اور کہا۔ "مجھے ایک کروڑ روپے کی ضرورت ہے۔"

"اوہ! تم نے تو بہت معمولی ڈیمانڈ کی ہے پینٹر! میں تو تمہیں آسمان کی بلندیوں تک پہنچانے کی خواہش مند ہوں۔"

"میں ذلت کی گہرائیوں میں گرنے کے لیے ایک کروڑ روپے مانگ رہا ہوں۔ اس کے عوض میں صرف ایک رات تمہاری ہوس کی بھینٹ چڑھ سکتا ہوں۔ تمہیں سودا منظور ہے یا نہیں۔"

"ایک رات..... تمہارے ساتھ!" بیگم زرینہ نے سسکاری لی۔ "ایک کروڑ کی تو کوئی اہمیت نہیں ہے پینٹر!"

"میں کب آ جاؤں؟" اظفر نے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔

"میں نے ابھی تمہیں بتایا تھا کہ میں شہر سے بہت دور ہوں۔ تمہیں میرے پاس آنے میں تین گھنٹے لگیں گے۔ آ جاؤ گے؟"

"آ جاؤں گا۔"

"گڈ!"

☆☆☆

اسی رات جب بارہ بجنے والے تھے، اظفر ایک نہایت تھکا دینے والے سفر کے بعد اپنی کار میں نواب شاہ سے کچھ آگے نکل آیا تھا۔ اس کی کار اب ایک کچے اور ناہموار راستے پر کم رفتار سے آگے بڑھ رہی تھی۔ اس راستے پر زیادہ رفتار سے کار چلانا ممکن ہی نہیں تھا۔

بیگم زرینہ نے موبائل پر اس کو راستہ سمجھایا تھا اور کہا تھا کہ اسی راستے پر دو میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد اسے تارکول کی ایک پتلی سی سڑک نظر آئے گی۔ اس سڑک پر مڑنے کے بعد وہ چند منٹ میں قدیم طرز کی ایک چھوٹی سی حویلی کے سامنے پہنچ جائے گا۔ بیگم زرینہ حویلی کے باہر ہی اسے اپنی منتظر ملتی۔

اظفر نے اس راستے پر دو میل طے کر لیے مگر اسے کوئی سڑک نہیں دکھائی دی۔ دو فرلانگ اور آگے نکلنے کے بعد اس نے کار روک دی۔ اسے خیال آیا تھا کہ اس سے کہیں کوئی غلطی ہو گئی تھی۔ وہ راستہ بھٹک گیا تھا۔ اس نے اپنی جیب سے موبائل نکال کر بیگم زرینہ سے رابطہ کیا۔

"میں اس کچے راستے پر دو میل سے زیادہ آگے نکل آیا ہوں۔" اس نے بتایا۔ "وہ پختہ سڑک مجھے دکھائی نہیں دی۔"

"یہ ناممکن ہے پینٹر!" بیگم زرینہ نے جواب دیا۔ "سڑک تو وہاں ہے۔ کہیں تم کسی اور کچے راستے پر تو نہیں مڑ گئے۔"

"شاید۔" اظفر نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔ "میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔"

"تم یقیناً بھٹک گئے ہو۔ اب کس جگہ ہو؟"

"یہ میں کیسے بتا سکتا ہوں۔ ہر طرف سناٹا اور اندھیرا ہے۔ اگر یہاں آس پاس کوئی حویلی ہوتی تو مجھے اس کی روشنیاں نظر آ جاتیں۔"

"نہیں۔" بیگم زرینہ نے کہا۔ "میں اس وقت حویلی کے کسی ایسے حصے میں روشنی نہیں کرنا چاہتی کہ وہ دور سے کسی کو نظر آ جائے۔ تم بھٹک گئے ہو لیکن ہو گے کہیں آس پاس ہی۔ تمہیں کوئی آتا جاتا نظر نہیں آیا؟ اس ویرانے میں رات کے وقت بھی کبھی کبھی کوئی مل جاتا ہے۔"

"تھوڑی دیر پہلے میں نے ایک دیہاتی کو دیکھا تھا۔ میں جس طرف آیا ہوں وہ اسی طرف آ رہا تھا۔"

"تو پھر اپنی کار موڑو۔" بیگم زرینہ نے جلدی سے کہا۔ "اگر وہ دیہاتی کسی اور جانب نہ مڑ گیا ہو تو تمہیں مل جائے گا۔ وہ تمہاری ٹھیک ٹھیک رہنمائی کر دے گا۔ یہ چھوٹی سی حویلی اس علاقے میں چھوٹی حویلی ہی کے نام سے مشہور ہے۔"

"میں دیکھتا ہوں۔"

"جلدی کرو۔ اگر وہ دیہاتی مل جائے تو اس سے بات کرنے کے بعد مجھے فوراً اطلاع دینا۔ اگر وہ تمہیں نہ ملا تو میں کچھ اور سوچوں گی۔"

اظفر رابطہ منقطع کر کے اپنی کار واپسی کے لیے موڑنے لگا۔ کار کے اندر روشنی تھی۔ اظفر کا چہرہ صاف دیکھا جا سکتا تھا لیکن اس کے تاثرات سے اس کی قلبی و ذہنی کیفیت بالکل ظاہر نہیں ہو رہی تھی۔

ناہموار راستے پر اس کی کار واپسی کا سفر طے کرنے لگی۔ جلد ہی اسے وہ دیہاتی دکھائی دے گیا۔ وہ کوئی چرواہا یا کسان ہو سکتا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک لاٹھی سی تھی جس کے سرے پر وہ ایک پوٹلی باندھے ہوئے تھا۔ لاٹھی اس کے شانے پر ٹکی ہوئی تھی۔ وہ مقامی زبان میں کوئی گیت گاتا جا رہا تھا۔

اظفر کو یہ بات عجیب سی لگی کہ وہ دیہاتی بھی اس وقت واپس جاتا نظر آیا تھا۔ پہلے بھی اظفر نے اس کی پشت دیکھی تھی اور اب بھی پشت دیکھ رہا تھا۔ وہ اس کے سوا کچھ نہیں سوچ سکا کہ دیہاتی بھی شاید بھٹک گیا ہو اور بھٹک جانے کا احساس ہونے کے بعد اب واپس لوٹ رہا ہو۔

کار اس کے بالکل قریب پہنچ گئی۔ انجن کی آواز سن کر اس نے پلٹ کر نہیں دیکھا تھا۔ اگر وہ بہرا ہوتا تو بھی اسے پلٹ کر دیکھنا چاہیے تھا۔ کار کی ہیڈ لائٹس تو اسے نظر آنی ہی چاہیے تھیں۔ وہ اندھا ہرگز نہیں ہو سکتا تھا۔ اندھے کسی راستے پر بھی اتنی بے باکی سے نہیں چل سکتے جس طرح وہ چل رہا تھا۔

اظفر نے کار اس کے بالکل قریب لے جا کر روکی اور بلند آواز میں بولا۔ "سنو بھائی! کیا تم مجھے چھوٹی حویلی کا راستہ بتا سکتے ہو؟"

دیہاتی اس طرح مڑا کہ اس کی لاٹھی سے بندھی ہوئی پوٹلی ڈرائیونگ سیٹ کی کھڑکی کی طرف آئی۔ اظفر نے چاہا کہ اپنا چہرہ پوٹلی سے بچا لے مگر وہ کامیاب نہیں ہو سکا۔ دیہاتی مڑا ہی اتنی تیزی سے تھا۔ پوٹلی اظفر کے چہرے سے ٹکرائی اور ساتھ ہی ایک بہت تیز بو نے اظفر کے حواس پراگندہ کر دیے۔ اس کا ذہن تاریکی میں ڈوب گیا۔ اس بے ہوشی سے ذرا ہی پہلے اسے حیرت سے بھی دوچار ہونا پڑا تھا۔ کار کی اندرونی روشنی دیہاتی کے چہرے پر منعکس ہوئی تھی اور اظفر نے اسے پہچان لیا تھا۔ وہ ریحان تھا۔ وہی ریحان جس سے زرقا محبت کرتی تھی۔

ہوش میں آنے پر اظفر کے لیے یہ اندازہ لگانا ممکن نہیں تھا کہ وہ کتنی دیر بے ہوش رہا تھا۔ اس کی کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی شاید اسی لیے اتار لی گئی تھی کہ وہ وقت کا اندازہ نہ لگا سکے۔ اس نے ہوش میں آنے پر خود کو ایک کمرے میں بستر پر پڑا ہوا پایا تھا۔ بستر کے بالکل سامنے ایک میز تھی جس پر ایک ٹیلی وژن رکھا ہوا تھا۔ سامان کی قسم کی کوئی اور چیز اس کمرے میں نہیں تھی۔ ٹیلی وژن روشن تھا لیکن اس کی اسکرین نیلی اور سپاٹ تھی۔

اظفر کو کچھ وقت اپنے حواس درست کرنے میں لگا اور کچھ لمحے یہ یاد کرنے میں گزرے کہ اس کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ پھر وہ بہ عجلت بستر سے اتر کر دروازے کی طرف لپکا۔ کمرے میں وہی ایک دروازہ تھا۔ کوئی کھڑکی نہیں تھی۔ دروازے کی بناوٹ غیر معمولی تھی۔ وہ بہت مضبوط لکڑی کا معلوم ہوتا تھا۔ اسے کھولنے کی کوئی صورت ممکن نہیں تھی۔ اس میں ہینڈل نہیں تھا۔ بس چابی کا ایک سوراخ نظر آ رہا تھا۔

''اس دروازے کو صرف باہر سے کھولا جاسکتا ہے پینٹر!''

اظفر نے بیگم زرینہ کی آواز سنی تو تیزی سے مڑا۔ ٹیلی وژن اسکرین پر اب بیگم زرینہ مسکراتی دکھائی دے رہی تھی۔ اس کا سر سے کمر تک کا جسم دکھائی دے رہا تھا۔ وہ گلابی رنگ کی حریری نائٹی پہنے ہوئے تھی جس سے اس کا جسم جھلک رہا تھا۔ اظفر کھوئے کھوئے سے انداز میں چلتا ہوا ٹیلی وژن کے سامنے پہنچ گیا۔

''کاش تم پہلے جیسے ہوتے پینٹر!'' بیگم زرینہ بولی۔ ''چند دن کی بیماری میں تمہارا جسم گھل گیا ہے۔ پہلے تم اپالو کی طرح حسین اور مضبوط نظر آتے تھے اسی لیے مجھے پسند بھی آئے تھے۔ میں ایک ہفتے پہلے امریکا سے واپس آ گئی تھی۔ تمہیں دیکھ کر بہت مایوس ہوئی تھی۔ تم نے بیمار پڑ کر میری خواہش کا گلا ہی گھونٹ دیا۔''

اظفر غصے سے اپنے ہونٹ کاٹتا ہوا اسکرین کی طرف دیکھتا رہا۔

بیگم زرینہ ہنسی۔ ''غصہ آ رہا ہے تمہیں! میں تمہیں دیکھ رہی ہوں پینٹر! بالکل اسی طرح جیسے تم مجھے دیکھ رہے ہو۔ اگر تم بولو گے تو مجھے تمہاری آواز بھی سنائی دے جائے گی۔ یہاں میں نے کسی وجہ سے کلوز سرکٹ ٹی وی کا نظام قائم کر رکھا ہے۔''

''کیا مطلب ہے اس حرکت کا؟'' اظفر کے تنفس کی رفتار بڑھ گئی۔ ''یہ سب کچھ کیوں کیا ہے تم نے میرے ساتھ؟''

''یہ میں تمہیں ضرور بتاؤں گی پینٹر! تمہیں دیکھنے کے بعد میری خواہش نے دم توڑ دیا تھا لیکن میں یہ بات نہیں بھول سکتی تھی کہ تم نے مجھے مسترد کیا تھا۔ میری توہین کی تھی۔ اس کا حساب تو مجھے تم سے لینا ہی ہے اسی لیے میں نے شوکت کو وہ سب کچھ کرنے سے نہیں روکا جس کا منصوبہ اس نے بنایا تھا۔ اب تم اس قابل نہیں رہے کہ میں تمہیں اپنے بازوؤں میں سمیٹنا چاہوں۔ اب تمہیں میرے بجائے میری ایک وفادار ملازمہ کا کھلونا بننا پڑے گا۔ اس کا نام پھلوا ہے۔ عرصے سے اس کا دماغی توازن بگڑا ہوا ہے۔ میرا مطلب یہ نہیں کہ وہ پاگل ہے۔ بس ایب نارمل سمجھ لو۔''

''نگار کہاں ہے؟'' اظفر غصے سے چیخ پڑا۔

''وہ بھی تمہارے قریب ہی کے ایک کمرے میں ہے۔'' بیگم زرینہ نے سکون سے جواب دیا۔ ''وہ تمہیں واپس مل جائے گی پینٹر! تمہیں بس ایک ہفتے تک اس کمرے میں پھلوا کا کھلونا بن کر رہنا ہوگا۔ بہت دن سے وہ بے چاری صرف تین چھچھوندروں کو نچوڑ رہی ہے۔ اسے ہفتے بھر کے لیے تم مل جاؤ گے تو وہ بہت خوش ہو جائے گی۔ میں اپنے وفادار لوگوں کا بہت خیال رکھتی ہوں پینٹر لیکن جو میرے ذرا بھی خلاف ہو جائیں انہیں ایک دردناک انجام سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ ان تین چھچھوندروں کو تم بھی دیکھ لو۔''

اسکرین سے بیگم زرینہ کی تصویر غائب ہو گئی اور ایک کمرے کا منظر دکھائی دینے لگا۔ کمرے میں تین آدمی تھے۔ ان کی حالت پاگلوں کی سی تھی۔ جسم پر لباس کے بجائے چیتھڑے جھول رہے تھے۔ بے تحاشا بڑھے ہوئے بال بکھرے ہوئے تھے۔ داڑھیاں بے ہنگم انداز میں بڑھی ہوئی تھیں۔ ان میں سے دو فرش پر اس طرح لیٹے ہوئے تھے کہ ان کے پیر ایک دوسرے کی طرف تھے۔ پیر سے پیر ملا کر وہ اپنی ٹانگوں کو اس طرح حرکت دے رہے تھے جیسے سائیکل چلا رہے ہوں۔ دونوں کے چہروں پر بلا کی سنجیدگی تھی۔ تیسرا آدمی ان کی طرف دیکھتا ہوا انگلیں بجا رہا تھا اور ہنس رہا تھا لیکن اس کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔

''دیکھا تم نے پینٹر!'' بیگم زرینہ کی صرف آواز سنائی دی۔ ''یہ تینوں اپنا دماغی توازن کھو چکے ہیں۔ گزشتہ بارہ سالوں میں جو لوگ میرا کھلونا بنے رہے ہیں، یہ ان میں سے تین ہیں۔ انہوں نے میرے ساتھ کچھ عرصہ گزارنے کے بعد میرے خلاف کچھ سوچا تھا لہٰذا اب ایک ایک کر کے یہ تینوں اس کمرے کے قیدی بن چکے ہیں۔ تم دیکھ ہی رہے ہو کہ ان میں سے ایک کی توندیاں نظر آنے لگی ہیں۔ جلد ہی یہ ڈھانچا بن کر رہ جائے گا اور باقی دو کی ہڈیاں نظر آنے لگیں گی۔ کئی برس سے پھلوا بے چاری انہی تینوں پر اکتفا کر رہی ہے۔ تم اس کے لیے ایک تازہ دم شکار ہو گے۔''

اظفر کو اپنے رونگٹے کھڑے ہوتے محسوس ہوئے۔ بیگم زرینہ کا یہ روپ اسے بہت ہی خوفناک لگا تھا۔ وہ غیر معمولی حد تک سفاک بھی تھی۔

اسکرین سے کمرے کا منظر غائب ہو گیا اور بیگم زرینہ دکھائی دینے لگی۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ''پھلوا کو میں نے تمہارے کمرے کی طرف بھیج دیا ہے۔ ایک ہفتے تک اسے خوش رکھو۔ اس کے بعد تمہاری نگار تمہیں مل جائے گی۔''

اظفر نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا۔ اس نے ایسی آواز سنی تھی جیسے سوراخ میں چابی گھمائی گئی ہو۔ پھر دروازہ کھلا اور وہ اندر آئی۔ اس نے خود ہی دروازہ بند کیا تھا اور اظفر کی طرف دیکھتے ہوئے اس کی باچھیں کھل گئی تھیں۔

''کیوں پھلوا؟'' بیگم زرینہ کی آواز سنائی دی۔ ''یہ

پسند آیا تجھے؟''

''ہاں، ہاں۔'' پھلوا زور زور سے سر ہلانے لگی۔ ''ہاں مالکن!''

''یہ ایک ہفتے کے لیے تیرا ہے۔'' بیگم زرینہ نے کہا۔

پھلوا اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرتی ہوئی اظفر کی طرف بڑھی۔ اظفر غصے میں ہونے کے باوجود کچھ بوکھلایا ہوا نظر آنے لگا۔ وہ پھلوا کو اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے کسی عجوبے کو دیکھ رہا ہو۔ اس کی عمر شاید پچیس چھبیس سال سے زیادہ نہ ہو لیکن اپنے غیر معمولی طور پر بھاری تن و توش کی وجہ سے وہ زیادہ عمر کی معلوم ہو رہی تھی۔ وہ اگر اظفر پر گر پڑتی تو شاید اظفر کی کراہ نکل جاتی۔ اس کا رنگ کالا تھا۔ چہرے پر زیادہ گوشت ہونے کی وجہ سے اس کے نقش و نگار بھی بھدے نظر آ رہے تھے۔

اظفر اس وقت چونکا جب پھلوا نے قریب آ کر اسے اپنے دونوں بازوؤں میں بھرنا چاہا۔ اظفر کا ہاتھ ایک دم اٹھا۔ وہ پھلوا کے منہ پر چانٹا رسید کر دینا چاہتا تھا۔

''رک جاؤ پینٹر!'' بیگم زرینہ غصیلی آواز میں بولی۔ ''کیا تم نے ان تین چھچھوندروں کو دیکھ کر عبرت حاصل نہیں کی۔ میں تمہیں ان کے کمرے میں بھی پہنچا سکتی ہوں لیکن ایسا کروں گی نہیں۔ تم ایک اور منظر دیکھ لو جس کے بعد تمہیں یقیناً پھلوا کا کھلونا بننے سے انکار نہیں ہوگا۔''

پھلوا کچھ سہم کر اظفر سے کچھ دور ہو گئی۔

''یہ تو مجھے مارے گا مالکن!'' وہ خوفزدہ آواز میں بولی۔

''نہیں مارے گا۔ بس ایک منٹ انتظار کرو۔''

اسکرین سے بیگم زرینہ غائب ہو گئی۔ اس کی جگہ اب ایک اور منظر دکھائی دینے لگا۔ اس کمرے میں نگار ایک بستر پر بندھی ہوئی تھی۔ چہرے سے خوف ظاہر ہو رہا تھا۔ بستر کے قریب ہی شوکت دکھائی دیا جو بڑے خوشگوار موڈ میں تھا۔

''بیگم زرینہ کی بات تو تمہیں ماننا ہی پڑے گی اے میرے دشمن!'' وہ استہزائیہ انداز میں بولا۔ ''ورنہ۔'' اس کا ایک ہاتھ نگار کے گریبان کی طرف بڑھا۔ ''میں اس کے جسم سے سارے کپڑے نوچ کر پھینک دوں گا اور پھر.....'' شوکت بڑی شیطنت سے ہنسا۔ ''اس کے بعد میں کیا کروں گا کیا تمہیں یہ بھی بتاؤں؟''

''کتے ہو تم شوکت! کتے ہو!'' اظفر نے دانت پیسے۔

شوکت ہنسا۔ ''کوئی اس طرح بھونکے تو مجھے اس پر غصہ نہیں آتا۔ اب جلدی سے فیصلہ کر لو کہ تمہیں بیگم زرینہ کا حکم ماننا ہے یا نہیں۔''

نگار کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے اور ہونٹ اس طرح کپکپا رہے تھے جیسے وہ کچھ کہنا چاہتی ہو لیکن شدید خوف کے باعث کچھ بولا نہ جا رہا ہو۔

اظفر نے خود کو بہت بے بس محسوس کیا۔

☆☆☆

بیگم زرینہ گلابی نائٹی پہنے ایک میز کے سامنے بیٹھی ہوئی تھی۔ میز پر تین ٹیلی وژن رکھے ہوئے تھے۔ ایک اس وقت بند تھا۔ دوسرے پر نگار اور شوکت کے کمرے کا منظر دکھائی دے رہا تھا۔ تیسرے پر اظفر اور پھلوا دکھائی دے رہے تھے۔

بائیں جانب ذرا سا ہٹ کر ریحان کھڑا ہوا تھا۔ اب وہ دیہاتی وضع قطع کے بجائے معقول لباس پہنے ہوئے تھا۔

بیگم زرینہ نے ایک بار کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھا پھر ٹی وی اسکرین پر اظفر کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''اب تم میری صرف آواز سن سکو گے۔ تمہارے ٹی وی اسکرین پر صرف نگار اور شوکت دکھائی دیتے رہیں گے۔ اب اگر تم نے پھلوا کو کسی بھی اقدام سے روکنا چاہا تو دیکھ لو گے کہ نگار کا کیا حشر ہوتا ہے۔'' پھر وہ کچھ رک کر بولی۔ ''پھلوا! آگے بڑھ۔ اب یہ تجھے نہیں مارے گا۔''

پھلوا، اظفر کی طرف بڑھتی نظر آئی۔ اظفر ٹی وی اسکرین پر نگار اور شوکت کی طرف دیکھ رہا تھا۔ شوکت کا ایک ہاتھ اب نگار کے شانے پر تھا۔ اظفر کے چہرے پر بے بسی کا تاثر بڑھنے کے ساتھ ساتھ آنکھوں میں آنسوؤں کی چمک بھی نظر آئی۔

بیگم زرینہ اب بڑی حقارت سے اظفر کی طرف دیکھ رہی تھی۔ یکایک اس نے سر گھما کر ریحان کی طرف دیکھا اور ہنس کر بولی۔

''تم اس وقت مجھے بڑی للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہے ہو ریحان!''

''بہت دن ہو گئے بیگم زرینہ!'' ریحان نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔ ''آج تو میں نے تمہارے لیے اتنا بڑا کام کیا ہے۔ مجھے انعام سے محروم نہ رکھو۔''

''بے شک تمہیں انعام ملے گا لیکن شوکت نے تم سے بڑا کام کیا ہے۔ میں اس سے وعدہ کر چکی ہوں۔ اپنا ایک ہفتہ اس کے لیے وقف کر دیا ہے۔ اس کے بعد تم بھی محروم نہیں رہو گے۔ تم جانتے ہو کہ میں اپنے وفاداروں کا بہت خیال رکھتی ہوں۔ کیا آج کل تم زرقا سے فیض یاب نہیں ہو رہے ہو؟''

''تم میں اور زرقا میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ میں

نے اسے خوامخواہ تو نہیں چھوڑ دیا تھا اظفر کے لیے۔''

بیگم زرینہ دھیرے سے ہنسی اور ٹی وی اسکرین کی طرف دیکھنے لگی۔ پھلوا نے اظفر کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے قریب بٹھالیا تھا اور اپنی بھدی انگلیوں سے اظفر کے ہونٹوں سے چھیڑ چھاڑ کر رہی تھی۔

''چوہے سے کھیلنے کی شوقین بلی ہے یہ پھلوا۔'' بیگم زرینہ مسکراتے ہوئے جیسے خود سے بولی۔

اس وقت اظفر بے بسی، اشتعال اور خجالت کی ایسی تصویر بنا ہوا تھا جس سے بیگم زرینہ بہت محظوظ ہوئی۔

''کیا تم اسے واقعی ایک ہفتے بعد چھوڑ دو گی؟'' ریحان نے پوچھا۔ ''میرا تو خیال تھا کہ تم اسے ان تینوں پاگلوں کے کمرے میں ڈال کر بھول جاؤ گی۔''

''نہیں ریحان! میں اسے بے بسی سے جلتا اور کڑھتا ہوا دیکھنا چاہتی ہوں۔ جب یہ پولیس کو نواب شاہ کے قریب کی کسی چھوٹی حویلی کی کہانی سنائے گا اور وہ پولیس کو نہیں ملے گی تو کیا کہا جائے گا اظفر سے؟ اسے لتاڑا جائے گا کہ اب وہ کبھی مجھ جیسی قابلِ احترام عورت کے خلاف اس قسم کی کوئی رپورٹ درج نہ کرائے۔'' بیگم زرینہ یہ سب کچھ کہتے ہوئے ٹی وی اسکرین پر نظر جمائے رہی تھی۔

''اس میں میرے لیے پریشانی ہوسکتی ہے۔'' ریحان نے تشویش کا اظہار کیا۔

''کیوں؟'' بیگم زرینہ نے اس کی طرف دیکھا۔

''میرا خیال ہے کہ جب میں نے پوٹلی اس کے چہرے پر ماری تھی تو اس نے بے ہوش ہونے سے پہلے مجھے پہچان لیا تھا۔ وہ بس ایک پل کی بات تھی جب میں نے اس کے چہرے پر حیرت کا تاثر دیکھا تھا۔''

''اس کی پروا نہ کرو ریحان!'' بیگم زرینہ بے پروائی سے کہتے ہوئے پھر ٹی وی اسکرین کی طرف دیکھنے لگی۔ ''جب میرے خلاف ہی اس کا بیان پولیس کے لیے ایک پاگل کا خواب بن کر رہ جائے تو شوکت اور تمہارے خلاف بھی اس کی کوئی بات پولیس کے لیے قابلِ اعتبار نہیں رہے گی۔''

''شاید تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔'' ریحان نے سوچتے ہوئے سر ہلایا۔ ''تمہارا یہ نواب شاہ والا منصوبہ اچھا تھا۔ یہ تو میرے خواب و خیال میں بھی نہ تھا کہ تمہارا خفیہ ٹھکانا یہاں ہوگا۔''

بیگم زرینہ ہنسی۔ ''تمہیں یہ دیکھنے کا موقع آج اتفاق سے مل گیا۔ پہلے کوئی ایسا کام نہیں پڑا تھا کہ میں تمہیں یہاں بلاتی۔ شاکر دس دن سے اسلام آباد گیا ہوا ہے ورنہ میں یہ کام اسی سے لیتی۔''

''شاکر کو میں نے ہی ایک کام کے بہانے سے اسلام آباد بھیجا ہے۔'' ریحان نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''مجھے گمان تھا کہ اس موقع پر شاکر نہ ہوا تو مجھے تمہاری یہ خفیہ جگہ دیکھنے کا موقع مل جائے گا۔''

''بہت اشتیاق تھا یہ دیکھنے کا؟'' بیگم زرینہ مسکرا رہی تھی۔

''اگر نہ دیکھتا تو اپنے مقصد میں کامیاب کیسے ہوتا۔''

''کیا مطلب؟'' بیگم زرینہ نے اُلجھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''محبت زیادہ خوبصورت ہوتی ہے بیگم زرینہ! تمہارا جسم محبت سے زیادہ خوبصورت نہیں ہے۔ میں زرقا کو برباد ہوتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ تم اسکرین پر پھلوا اور اظفر کو دیکھنے میں اتنی مگن ہو کہ تمہیں دروازے پر وہ آہٹ نہیں سنائی دے سکی جو تمہاری اس شیطانی زندگی کا خاتمہ کرنے والی ہے۔''

اسی وقت دروازہ کھلا اور پولیس کے مسلح جوان اندر گھستے چلے آئے۔ آگے آگے اس علاقے کا ڈی ایس پی خود تھا جس کے ریوالور کی نال بیگم زرینہ کی طرف تھی۔

بیگم زرینہ اچھل کر کھڑی ہوئی۔ اس کے چہرے کا رنگ متغیر ہوگیا تھا۔

''میں خفیہ دروازہ پولیس کے لیے کھلا چھوڑ آیا تھا بیگم زرینہ!'' ریحان بولا۔

بیگم زرینہ نے جھپٹ کر سوئچ بورڈ پر ہاتھ مارا جو اس کے قریب ہی تھا۔ کمرے کی روشنی ختم ہوگئی لیکن ٹی وی اسکرینز کا اُجالا اس سے ختم نہیں ہوسکتا تھا۔

''اب کوئی اور حرکت نہیں کرنا بیگم زرینہ!'' ڈی ایس پی نے ڈپٹ کر کہا۔

بیگم زرینہ کے چہرے پر وحشت چھا گئی۔ وہ اس کی دیوانگی ہی تھی کہ ڈی ایس پی پر جھپٹ پڑی۔ ڈی ایس پی کے ریوالور سے ایک گولی نکلی اور بیگم زرینہ لڑکھڑا گئی۔

☆☆☆

گولی چلنے کی آواز شوکت نے سنی تو بوکھلا گیا۔ وہ دروازے کی طرف جھپٹا۔ وہ دروازہ کھول کر باہر نکلنا چاہتا تھا لیکن جب اس نے دروازہ کھولا تو خود کو رائفلوں کی زد پر پایا جو پولیس کے جوانوں نے سنبھال رکھی تھیں۔

☆☆☆

گولی کی آواز اظفر نے بھی سنی اور جلدی سے کھڑا

ہوگیا۔ پھلوا نے اس کا ہاتھ پکڑنا چاہا اور پکڑنے میں کامیاب بھی رہی لیکن اظفر نے جھٹکے سے خود کو چھڑا لیا۔ ٹی وی اسکرین پر اس نے شوکت کو دیکھا جس نے کمرے سے نکل بھاگنے کی کوشش کی تھی لیکن پولیس کے جوانوں نے اس کی کوشش ناکام بنادی تھی۔

پھلوا نے گولی کی آواز سنی تو ہوگی لیکن اس کی نظر میں شاید اس کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ وہ غصے سے اظفر کی طرف دیکھنے لگی۔

''پولیس۔'' دروازے کی طرف سے آواز آئی۔

اظفر نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا۔

آواز پھر آئی۔ ''پولیس یہاں پہنچ چکی ہے۔ کمرے کا دروازہ کھولنے کے لیے چابی کے سوراخ پر گولی چلائی جائے گی۔ اگر کوئی اس سوراخ کے سامنے ہو تو ہٹ جائے۔ ہم صرف تین تک گنیں گے۔''

اظفر دروازے کے سامنے نہیں تھا۔ اس نے چونک کر پھلوا کی طرف دیکھا اور چیخا۔ ''اِدھر آجا پاگل لڑکی!''

''تم آؤ!'' پھلوا نے پیر پٹخ کر غصے سے کہا۔

پولیس کا کوئی آدمی گنتی گن چکا تھا۔ ایک دھماکا ہوا۔ رائفل کی گولی چابی کے سوراخ سے گزرتی ہوئی سامنے کی دیوار سے جا ٹکرائی۔ پھلوا بال بال بچی تھی۔ اس وقت وہ خوفزدگی سے چیخ پڑی۔

پُرشور آواز کے ساتھ دروازہ کھلا اور پولیس والے اندر گھستے چلے آئے۔

☆☆☆

نگار اس وقت بھی حواس باختہ سی تھی جب اظفر اسے سہارا دیے ہوئے باہر لایا۔ اس وقت صبح کے دس بج چکے تھے۔

اظفر کو پولیس سے سب کچھ معلوم ہوچکا تھا ورنہ وہ خود کو بیگم زرینہ کی کوٹھی کے تہ خانے سے نکلتا پا کر حیران رہ جاتا۔ ابتدا میں تو وہ یہی سمجھتا رہا تھا کہ وہ نواب شاہ کے گرد و نواح کی کوئی عمارت تھی جسے پرانی حویلی کہا جاتا تھا۔

بیگم زرینہ کو پولیس موبائل کی طرف لے جایا جارہا تھا۔ اس کی ٹانگ زخمی ہوئی تھی جس پر اس نے خود ہی کس کر پٹی باندھ لی تھی۔ زخم میں تکلیف اس کے باوجود بھی ہوگی لیکن اس کے چہرے سے اس کا اظہار نہیں ہورہا تھا۔ وہ کسی زخمی ناگن کی طرح مشتعل نظر آرہی تھی۔ کلائیوں میں پڑی ہتھکڑیاں اسے بے بس کیے ہوئے تھیں۔

''اس عورت کی حرکتوں پر شیطان کو بھی شرم آنا چاہیے۔'' ڈی ایس پی نے بیگم زرینہ کی طرف دیکھتے ہوئے ریحان سے کہا۔

شوکت اور پھلوا ایک اور پولیس موبائل کی طرف لے جائے جارہے تھے۔ ہتھکڑیاں ان کے بھی لگائی جاچکی تھیں۔ پھلوا بوکھلائی ہوئی سی تھی۔ اس کا غیر متوازن دماغ اس صورتِ حال کو سمجھنے سے قاصر ہوگا۔

☆☆☆

شام کے جو اخبارات اس وقت تک پریس نہیں گئے تھے، انہیں ایک سنسنی خیز اور تازہ خبر کی ''لیڈ'' مل گئی اور وہ اپنی اشاعت سے کئی گنا زیادہ فروخت ہوئے حالانکہ وہ بیگم زرینہ کی گرفتاری کے بارے میں تفصیل نہیں دے سکے تھے۔ اس وقت تک پولیس کی طرف سے کوئی واضح بیان نہیں دیا گیا تھا اسی لیے ان اخباروں میں بیگم زرینہ کی شیطانی حرکات کی طرف بس کچھ اشارے تھے۔ زرقا کو اس میں بس یہ خاص بات نظر آئی کہ بیگم زرینہ کو گرفتار کرانے میں ایک جرأت مند نوجوان ریحان نے پولیس کی رہنمائی کی تھی۔

زرقا دوڑی دوڑی ریحان کے گھر پہنچ گئی۔

''یہ سب کیا ہے ریحان!'' اس نے بوکھلائے ہوئے انداز میں پوچھا۔

''میں نے تم سے کہا تھا نا کہ ذرا صبر سے کام لو۔'' ریحان نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ''اگر تم اظفر کو نوٹس دے دیتیں تو وہ شاید تمہیں طلاق دے چکا ہوتا۔''

''تم نے یہ سب کچھ کیسے کیا؟'' زرقا کی حیرت میں کمی نہیں آئی تھی۔

ریحان فوراً جواب نہیں دے سکا۔ وہ اب تک فیصلہ نہیں کرسکا تھا کہ زرقا کو اپنے بارے میں کیسے بتائے گا۔ ایک بار اس کے قدم بہک گئے تھے۔ وہ شاید نشے ہی میں تھا۔ اس کے بعد وہ بیگم زرینہ کا اسیر ہوکر رہ گیا۔ وہ ایک معمولی انشورنس ایجنٹ تھا اسی لیے زرقا کے والد اپنی بیٹی کی شادی اس سے کرنے کے لیے تیار نہیں ہوئے تھے۔ ریحان نے اسی کو اپنے لیے آڑ بنالیا۔ اسے زرقا سے واقعی محبت تھی۔ وہ زرقا کو یہ دھوکا نہیں دینا چاہتا تھا کہ وہ اس کی زندگی میں آنے والی پہلی عورت ہوتی۔ اس نے مختلف جواز تراشے تھے اور دلیلیں دے کر زرقا کو آمادہ کیا تھا کہ وہ اپنے باپ کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے اظفر سے شادی کرلے۔

اس طرح زرقا سے ہمیشہ کے لیے دوری ریحان کے لیے ایک خلش تو بن گئی تھی لیکن اس کا ضمیر مطمئن تھا۔ بعد میں اسے یہ بے چینی ضرور رہی تھی کہ اظفر کی عادت و اطوار کے

باعث زرقا کی زندگی میں سکون نہیں رہا تھا۔ اس کے باوجود ریحان نے ہمیشہ کوشش کی تھی کہ زرقا کی شادی شدہ زندگی تباہ نہ ہو۔ پھر جب ایک ایسا موقع آیا کہ زرقا اور اظفر کی شادی شدہ زندگی کا خاتمہ یقینی نظر آنے لگا تو ریحان نے زرقا کو اس سے بچانے کے لیے بیگم زرینہ کو گرفتار کرانے کا فیصلہ کرلیا۔ وہ پولیس سے ملا اور اس کام کے لیے وعدہ معاف گواہ بن گیا۔ وہ جانتا تھا کہ آخر کار یہ بات اخبارات میں آجائے گی اور وہ زرقا سے نظریں ملانے کے قابل نہیں رہ جائے گا۔ بہت سوچ بچار کے بعد اس نے زرقا کی ازدواجی زندگی کو تباہی سے بچانے کے لیے یہ اذیت برداشت کرنا گوارا کرلی تھی کہ وہ زرقا کی نظروں سے گر جائے گا۔

☆☆☆

پانی کا گلاس خالی کر کے نگار نے ایک طرف رکھا اور اظفر کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرا کر بولی۔ ''اب ایسا لگ رہا ہے جیسے کوئی بھیانک خواب دیکھا تھا۔''

''شوکت نے تمہیں اغوا کیا کیسے؟'' اظفر کے دماغ میں بہت دیر سے چکراتا ہوا سوال اس کی زبان پر آ گیا۔

''وہ۔'' نگار سوچتے ہوئے بولی۔ ''جب آپ پینٹنگ کا سامان خریدنے گئے تھے تو وہ گھر آیا تھا۔ آپ کی عدم موجودگی میں آتا ہی رہتا تھا اس لیے میں نے اسے کوئی اہمیت نہیں دی تھی۔ پریشانی اس وقت ہوئی جب میں نے اسے کچھ مضطرب پایا۔ جیسے وہ کچھ کر گزرنے کے لیے بے چین ہو۔ میں اس کے لیے چائے بنانے کے لیے جانے لگی تو وہ مجھے کچھ عجیب سی نظروں سے دیکھنے لگا۔ سچ جانیے، اس وقت میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے تھے۔ میں نے کچن کے بجائے بیڈروم کا رُخ کیا اور موبائل پر آپ سے رابطہ کیا۔ مجھے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کرنے کا خیال نہیں رہا تھا۔ جیسے ہی آپ سے رابطہ ہوا شوکت کمرے میں گھس آیا۔ میں اتنی خوفزدہ ہوگئی کہ میں نے موبائل پر چیخ کر آپ کو پکارا۔ میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی شوکت اتنی تیزی سے مجھ پر جھپٹا کہ میں سنبھل نہیں سکی۔ اس نے موبائل میرے ہاتھ سے چھین کر میری ناک پر ایک گیلا رومال رکھ دیا۔ اس کی بو سے میں بے ہوش ہوگئی۔ میں نہیں جانتی کہ وہ اپارٹمنٹ سے مجھے کیسے لے گیا۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں اس بستر سے بندھی ہوئی تھی۔''

اظفر نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''سوچا بھی نہیں جاسکتا تھا کہ شوکت ایسا شخص ثابت ہوگا۔ حیرت مجھے ریحان کی وجہ سے بھی ہے۔ شوکت کی طرح وہ بھی بیگم زرینہ کا کارندہ تھا۔ وہ آخر بیگم زرینہ کو گرفتار کرانے کے لیے پولیس سے کیوں مل گیا۔ وہ عدالت میں پولیس کے وعدہ معاف گواہ کی حیثیت سے آئے گا۔''

''اب آپ مان لیجیے کہ آپ اس سے خواہ مخواہ بدظن رہے ہیں۔ اسے زرقا سے محبت ضرور ہے لیکن وہ آپ دونوں کے بیچ سے ہٹ گیا تھا۔ اب اس نے یہ سب کچھ صرف اس لیے کیا ہے کہ زرقا کو بیگم زرینہ کے معاملے میں آپ پر یقین آجائے۔''

''اب اس سے حاصل کیا نگار!..... وہ اب اگر میری طرف لوٹی بھی تو.....''

''شاید آپ بھول گئے۔'' نگار مسکراتے ہوئے بولی۔ ''میں نے آپ سے کہا تھا کہ میں اسے اپنے گلے سے لگالوں گی۔''

اور ایسا ہی ہوا۔

شام کو نگار اور اظفر نے کسی ہوٹل میں کھانے کا پروگرام بنایا تھا۔ جب وہ گھر سے نکلنے ہی والے تھے تو کال بیل کی آواز ہوئی تھی۔ وہ دونوں دروازے کے قریب پہنچ ہی گئے تھے۔ اظفر نے دروازہ کھولا اور ٹھٹک گیا۔ سامنے زرقا کھڑی تھی۔ اس نے نظر بھر کر اظفر کی طرف دیکھا اور نظریں جھکالیں۔

''میں تمہیں کوئی نوٹس دینے نہیں آئی ہوں اظفر!'' اس کی آواز ایسی تھی جیسے وہ بہت دل گرفتہ ہو۔ ''صرف دو باتیں ہیں۔ بیگم زرینہ کے معاملے میں مجھ سے جو غلطی ہوئی تھی، اس کے لیے اگر ہوسکے تو مجھے معاف کردینا۔ دوسری بات یہ کہ میں تمہیں مبارک باد دینا چاہتی ہوں۔'' اس نے نظر اٹھا کر نگار کی طرف دیکھا۔ ''تمہیں بھی اظفر مبارک ہوں۔''

اس وقت ایسا لگا جیسے اس کی آنکھوں سے آنسو اُبل پڑیں گے۔ اس نے تیزی سے مڑ کر چلا جانا چاہا لیکن نگار نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپارٹمنٹ میں گھسیٹ لیا۔

''یہ تمہارا گھر ہے زرقا! یہ تم سے میں بھی نہیں چھین سکتی۔''

زرقا کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ نگار نے اسے فوراً اپنے گلے سے لگالیا۔

ایک طرف دم بہ خود سا کھڑا اظفر سوچ رہا تھا کہ آرٹسٹک جسم رکھنے والی لڑکیاں ہی سب کچھ نہیں ہوتیں، آرٹسٹک ذہن رکھنے والی لڑکیاں ہی اپنی ازدواجی زندگی کو ہر بھنور سے نکال سکتی ہیں۔

اسماء الحسنٰی۔ کامیابی کا راستہ

دین اسلام کی روشنی میں آپ کے مسائل کا حل

ایس۔ ایم۔ قادری

تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ جل شانہٗ وحق سبحانہٗ کو زیبا ہیں۔ کہ جس نے کن فیکون سے اس عالم فانی کو کمال مہربانی سے تخلیق کیا۔ اور اس کو اپنی ذات کے نور سے منور کیا ہے۔ اس نے بہترین مذہب اور بہترین رسولؐ عطا کیا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ذات مقدس نے انسانی شعور کو ہدایت کی ان بلندیوں کی جانب گامزن کیا کہ جہاں ذات باری تعالیٰ کا عرفان حاصل ہوتا ہے۔ انسان کیلئے آج بھی راہ ہدایت موجود ہے۔ کتاب الٰہی ابدتک ہمارے روشن مستقبل کی جانب رہنمائی کرتی رہے گی۔ اور اسی طرح سنت رسول کریم ﷺ آج بھی قائم و دائم ہے۔ اور تا قیامت عالم انسانیت کے لئے روشنی کا مینار رہے گی۔ تو پھر آیئے ہم اپنی کوتاہ نظری اور بیماری، تفکرات کو اسماء الحسنٰی اور اسوۂ حسنہ سے تر و تازگی بخشیں اور اللہ جارک وتعالیٰ کے نام سے اپنی عقل وقلوب کو روشن کریں۔ دکھوں پریشانیوں اور مشکلات کے حل کے لئے اس معبود برحق کی جانب رجوع کریں۔ جو کل عالمین کا رب ہے۔ جس کے خزانوں میں کوئی کمی نہیں جو ملکیت، اقتدار، ترقی، آسائش، شعور وآگاہی اور انسانی ضروریات کے تمام وسائل کا خالق ومالک ہے۔

جناب محترم ایس۔ ایم۔ قادری صاحب معروف روحانی سکالر، اسماء الحسنٰی کے محقق ودیگر دینی اور روحانی علوم پر گہری نظر رکھنے والے عرصہ بارہ سال سے اندرون اور بیرون ملک عوام کو اپنے مشوروں سے مستفید فرما رہے ہیں۔ انتہائی قابل قدر کتب کے مصنف ہیں۔ ان کے کالم ملک کے تمام قومی اخبارات، جرائد میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ان کے مداحوں میں ملکی وغیر ملکی معروف اہل علم، دانشور، بیوروکریٹس اور اہم سیاسی شخصیات شامل ہیں۔ اندرون اور بیرون ملک ایک وسیع تر حلقہ محترم ایس، ایم، قادری صاحب کے مشوروں سے فیضیاب ہو کر سکون اور اطمینان کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ ہر سال بارہ سے پندرہ ہزار افراد بذریعہ خط وکتابت روحانی تسکین اور جسمانی امراض میں شفا کے حصول کے لئے رہنمائی حاصل کررہے ہیں۔ یہ طرۂ امتیاز بھی محترم ایس۔ ایم۔ قادری صاحب کو ہی حاصل ہے کہ وسطی ایشیا، عرب ممالک، کنیڈا، امریکہ اور یورپ میں بسنے والے ہزاروں افراد بھی آپ سے بذریعہ خط وکتابت فیض حاصل کررہے ہیں۔

ایس۔ ایم۔ قادری صاحب کی شخصیت اس لحاظ سے بھی ممتاز ومنفرد ہے۔ کہ ان کے پروگرام بعنوان اسماء الحسنٰی 1998ء سے پی ٹی وی ورلڈ پر ٹیلی کاسٹ ہونا شروع ہوئے۔ ان پروگرام کی مقبولیت اور افادیت کا یہ عالم ہے کہ نہ صرف یہ کہ پاکستان میں 'ARY ڈیجیٹل' سے آپ کے پروگرام اسماء الحسنٰی بعنوان ''کامیابی کا راستہ'' ہر جمعۃ المبارک کو نشر ہوتا رہا تھا۔ یہ ہی نہیں بلکہ روزانہ دنیا میں کسی نہ کسی چینل کے حوالے سے پروگرام اسماء الحسنٰی ٹیلی کاسٹ ہوتے رہتے ہیں۔

☆☆----------☆☆

خالق اللہ داد۔ پنڈ دادنخان ضلع منڈی

○ محترم! مسئلہ یہ ہے کہ میں بہت بری طرح قرض کے نیچے دبا ہوا ہوں۔ میرا ٹرانسپورٹ کا کاروبار ہے بظاہر کئی بسیں ہیں لیکن ساری آمدنی قرض کی ادائیگی اور اور سود میں نکل جاتی ہے سمجھ میں نہیں آتا کہ کیسے اس جنجال سے نکلوں گا۔ دنیا یہ سمجھتی ہے کہ میں نے بڑا پیسہ بنایا ہوا ہے۔ حالانکہ خدا شاہد ہے کہ بعض اوقات ایسی صورت حال ہوجاتی ہے کہ جان پر بن آتی ہے کوئی حل تجویز فرمادیجئے۔

☆ عزیز بھائی! اللہ تعالیٰ آپکی تمام معاشی مشکلات کو دور فرمائے اور سود کی لعنت سے نجات عطا فرمائے (آمین) ''یا وہاب یا فتاح'' ہر نماز کے بعد 102 مرتبہ پڑھ کر دعا کیا کریں اول آخر 7 مرتبہ درود شریف۔ لوح مشتری ارسال ہے حسب توفیق صدقہ دیا کریں۔ نماز کی پابندی فرمائیں۔

عذرا مشتاق۔ راولپنڈی

○ محترم! میری بیٹی کو اس کے شوہر نے بے گناہ ہی طلاق دے دی ہے۔ اور یہ سب انہوں نے اپنی والدہ اور بہن کے کہنے میں آکر کیا ہے انہوں نے پہلے ہی دن سے کوئی نہ کوئی مسئلہ کھڑا کیے

رکھا تھا۔ میری بیٹی کو نہ تو کھانا صحیح ملتا تھا اور نہ ہی اس کی صحت کا کوئی خیال رکھا جاتا تھا۔ جب تیسرے ماہ کا حمل ضائع ہوا تو ساس نے الزام لگایا کہ میری بیٹی بچہ پیدا ہی نہیں کرنا چاہتی ہے اور یہ سب اس کی لاپرواہی کا نتیجہ ہے میری آٹھ ماہ کی دلہن بیٹی طلاق کا لیبل لگائے گھر پر آگئی ہے کس کس کو بتائیں کہ طلاق کی کیا وجہ ہے اس معاشرے میں تو قصور سارا عورت کا ہی گنا جاتا ہے کوئی ایسی دعا ،اسم الٰہی تجویز فرمادیجئے کہ میری بیٹی کا نصیب کھل جائے اور اس کا آئندہ گھر ہنستا بستا رہے آپ کی ہمیشہ شکر گزار ہوں گی۔

☆عزیز بہن! اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کی خصوصی ہدایت فرمائے جو کہ بیوی کے حقوق کا خیال نہیں رکھتے اور ایسی ماؤں کی اصلاح فرمائے جو اپنی ہی جیسی عورت کا گھر اجاڑ دیتی ہیں۔(آمین) ''یا کریم یاسلام یالطیف یافتاح'' بعد نماز عشاء 313 مرتبہ اول آخر 11 مرتبہ درود شریف پڑھ کر دعا کریں۔ لوح زہرہ ارسال ہے۔ نماز کی پابندی فرمائیں۔ اور ہمیشہ اللہ کی رحمت پر بھروسہ رکھئے گا۔

ریحانہ کلثوم حیدری۔ فیصل آباد

O محترم! اللہ تعالیٰ ہمیشہ آپ پر اپنے فضل و کرم کے سائے رکھے۔ میری داستان مختصراً مگر بہت دکھ بھری ہے تیرہ برس کی عمر میں ماں نے شادی کر دی چودھویں برس ایک بیٹی پیدا ہوئی۔ اور پندرہویں برس شوہر کچی شراب پیتے پیتے مر گیا۔ میری ساس نے میری شادی میرے دیور سے کر دی وہ ایک بلڈنگ میں چھت ڈالتے ہوئے اوپر سے گر کے فوت ہو گیا۔ میں ایک بیٹی اور بیٹے کے ساتھ پھر تنہا رہ گئی۔ بیس برس کی عمر تک میری سسرال میں میری ساس اور میرے علاوہ کوئی نہ رہا۔ میری ساس اللہ اسے جنت نصیب کرے وہ بہت بھلی مانس عورت تھی۔ ایک مضبوط چھت میرے ساتھ رہی۔ ان کی فوتگی کے بعد مجھے یوں لگا کہ جیسے میں پہلی بار دنیا میں اکیلی رہ گئی ہوں آزمائش کے دن گزرتے رہے۔ بچے جوان ہو گئے ہیں میں صرف یہ ڈرتی ہوں کہ کہیں میری بیٹی پر بھی میری نحوست کے سائے نہ پڑ جائیں اس کے ایک منگیتر کا انتقال ہو چکا ہے۔ دوسرا منگیتر جہاد کشمیر کے لئے گیا تھا آج تک واپس نہیں آیا۔ اب تیسری جگہ بات چیت ہو گئی ہے کوئی ایسا اسم کوئی ایسا وظیفہ عطا کر دیجئے کہ جس سے میری زندگی کا عکس میری بیٹی پر نہ پڑے۔ آدمی اپنے دکھ تو سہہ لیتی ہوں لیکن بچوں کے دکھ نہیں سہہ پاتا ہے۔

☆بہن! اللہ تعالیٰ آپ کو صبر اور استقامت عطا فرمائے۔ اور آپ کے بچوں کو تمام تکالیف اور پریشانیوں سے محفوظ اور مامون رکھے۔(آمین) ''یا کریم یاسلام یاحفیظ یافتاح'' عشاء کی نماز کے بعد 313 مرتبہ پڑھ کر دعا کیا کریں۔ اول آخر 11 مرتبہ درود شریف بھی پڑھیں۔ لوح ناسار ارسال ہے۔

محمود اسلم۔ منڈی بہاؤالدین

O محترم! آپ جس خلوص محبت اور اپنائیت سے جواب سے نوازتے ہیں آدھا دکھ تو آپ کا جواب ہی دور کر دیتا ہے۔ آپ کی نرمی اور محبت دلوں کو فتح کرنے والی ہوتی ہے۔ اسی نرمی نے میرے دل کو بھی آپ کا بنا دیا ہے ہماری طرف بھی محبت کی نگاہ فرمائیے۔ میری ہمشیرہ کی منگنی تین سال رہ کر ٹوٹ گئی ہے لڑکے والے نہایت کماتے، پیتے اور اچھے لوگ ہیں لیکن میری بہن کے منگیتر کو شراب اور جوئے کی لت ہے ایک دن وہ میرے پاس آیا اور بڑے اطمینان سے بولا بھائی جی میں بہت برا ہوں۔ شراب پیتا ہوں۔ جوا کھیلتا ہوں اور یہ میں آپ کو بتا دوں کہ یہ عادتیں میری کوشش کے باوجود چھوٹ نہیں پا رہی ہیں میرے ماں باپ نے میری اصلاح کی بہت کوشش کی لیکن کچھ بھی نہ بنا آپ بھی یہ نہ سمجھئے گا کہ شادی کے بعد سب ٹھیک ہو جائے گا۔ آپ کی بہن ایک شرابی کے ساتھ گزارہ کر سکتی ہے تو بتائیے ورنہ بعد میں گلہ نہ کیجئے گا۔ ہم نے اس کی باتیں سن کر منگنی توڑ دی مگر بہن کا کہنا ہے کہ میں شادی وہیں کروں گی۔ آپ بتائیے کہ ہم کیا کریں اور کیا اس منگنی قائم کو رکھیں انکار ہم نے کیا ہے وہ ابھی تک منتظر ہیں آپ کی رائے اور مشورے کے منتظر ہیں۔ فون پر گفتگو نہ ہو سکی تھی۔

☆عزیزم! محبتوں اور دعاؤں کا شکریہ۔ میں آپ سب سے نہایت ادب اور احترام سے درخواست گزار ہوں کہ مہربانی فرما کر فون پر مسائل نہ ڈسکس کریں۔ خط لکھ دیں جوابی لفافے کے ہمراہ کیونکہ فون پر طویل گفتگو ممکن نہیں ہوتی ہے آپ اللہ تعالیٰ پر کامل بھروسہ کرتے ہوئے شادی کر دیجئے۔ انشاء اللہ ٹھیک رہے گا۔ صاحبزادے کی اصلاح ضرور ہو گی ہر نماز کے بعد 141 مرتبہ ''یاہادی یاقدوس'' پڑھ کر دعا کیجئے۔ اول آخر 7 مرتبہ درود شریف۔ لوح تسخیر خاص برائے اصلاح ارسال ہے۔ نماز کی پابندی فرمائیں۔

نوید قمر۔ راولپنڈی

O محترم! اللہ تعالیٰ آپ کو دونوں جہانوں میں کامیابی عطا فرمائے۔ آپ جیسے لوگوں کی محبت ہے کہ جو کہ دکھی دل اطمینان سے اپنے دکھ کا مداوا ڈھونڈ لیتے ہیں۔ میری شادی کو نو سال گزر

چکے ہیں۔ پہلی مرتبہ پر یکمشتی شادی کے ڈیڑھ سال کے بعد ہوئی تھی۔ اس کے بعد پھر کوئی امید نہیں بندھی ہے کئی بزرگوں کو دکھایا سب یہی بتاتے ہیں کہ آپ کی بیگم کی کوکھ باندھی ہوئی ہے۔ شدید جادو ہے۔ ڈاکٹرز کہتے ہیں کہ طبی اعتبار سے آپ دونوں میاں بیوی سو فیصد تندرست ہیں۔ آپ اب اللہ سے دعا کریں اور کسی روحانی بزرگ سے مدد لیں۔ ہم آپ کی شہرت اور اسماء الحسنیٰ پر یقین رکھتے ہوئے آپ کی خدمت میں حاضر ہو گئے ہیں۔ ہمیں بھی آپ کی عطا کی ضرورت ہے۔

☆عزیز بھائی! اللہ تعالیٰ جل شانہٗ آپ کی اور تمام بہن بھائیوں کی اولاد کی آرزوؤں کو پورا فرمائے۔ اور ان کے صحن چمن میں اولاد کے پھول کھلائے۔(آمین) آپ مریخ اور زحل کی نحوست کے زیر اثر ہیں، تاہم اولاد کے امکانات یقینی طور پر موجود ہیں۔ ''یا کریم یاسلام یاخالق یامصور'' بعد نماز عشاء 313 مرتبہ پڑھ کر دعا کیا کریں اول آخر 11 مرتبہ درود شریف۔ علاج درختیم ارسال ہے پھلوں میں انار شوق سے کھایا کریں۔ اللہ تعالیٰ کرم فرمائے۔ نماز کی پابندی کیجئے گا۔

خولہ اسلام۔ چک جمیرہ

O محترم! اللہ تعالیٰ ہمیشہ ہم مظلوموں کے حق میں آپ کی دعاؤں کو قبول فرماتا رہے (آمین) میری تین بیٹیاں ہیں چار سال کے بعد اب اللہ تعالیٰ نے دوبارہ امید دی ہے ہماری شدت سے خواہش ہے کہ اس مرتبہ اولاد نرینہ کی آرزو پوری ہو جائے ہمیں اولاد نرینہ کے لئے دعا اور علاج عطا فرمائیے۔ تاکہ ہماری بیٹے کی خواہش مکمل ہو جائے۔

☆عزیز بیٹی! اللہ تعالیٰ شکر کرنے والوں کو نوازتا ہے اور مجھے اپنے رب بے نیاز سے پوری امید ہے کہ وہ آپ کو ایک چاند سا بیٹا عطا فرمائے گا۔ اس کے حضور خلوص قلب سے کی گئی دعا رد نہیں ہوتی ہے۔ ''یاباقی یامصور'' بکثرت پڑھا کریں۔ علاج درختیم بیٹے کے لئے ارسال ہے۔ نماز کی پابندی فرمائیں۔

میمونہ تسلیم۔ بہاولپور

O محترم! ہم چار کزنوں کی شادیاں ایک ہی ماہ میں ہوئی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے میری تین کزنوں کو پہلے ہی سال پر امید کر دیا جبکہ میرے آنگن میں سوائے اداسی کے اور کچھ بھی نہیں ہے یوں لگتا ہے کہ جیسے میری زندگی میں یہ خوشی نہیں آئے گی۔ میری ساس مجھے جگہ جگہ لئے پھرتی ہیں۔ جتنے لوگ اتنی باتیں مگر کہیں سے بھی کوئی اچھی خبر نہیں

جناب ایس۔ ایم۔ قادری صاحب کی تصانیف

اسماء الحسنیٰ۔ کامیابی کا راستہ

اللہ تعالیٰ کے ناموں کی انتہائی خوبصورت تفسیر

عملیات اسماء الحسنیٰ

اللہ تعالیٰ کے ناموں کے وظائف

ہاتھوں میں تقدیر

دست شناسی پر ایک خوبصورت کتاب

خوب صورت نام

اپنے بچوں کے خوبصورت نام خود تجویز کیجئے

سیدنا غوث اعظمؒ

دنیائے تصوف کے سب سے بڑے ولی کا تذکرہ

جادو اور جنات

جنات کی حقیقت اور اس کا علاج

خواب اور تعبیر

خوابوں کے ذریعے راہنمائی حاصل کیجئے

دعائیں

دُعائیں

قرآنی دعاؤں کا حسین گلدستہ

زیر طبع

تمام مسائل اور مواقع کی دعائیں

ہر اچھے بکسٹال پر دستیاب ہیں، نہ ملنے کی صورت میں فی کتاب بذریعہ منی آرڈر 175 روپے ارسال کر کے منگوائیں۔ (کتاب V.P نہیں کی جاتی) B-359 فیصل ٹاؤن لاہور۔ فون 5167842

ملتی۔ اپنی اس بیٹی کی مدد کیجئے۔ اللہ مجھے بھی اولاد کی نعمت سے سرفراز فرمائے۔ (آمین) آپ کی راہ نمائی کی منتظر۔ بیٹی۔

☆ عزیز بیٹی! مایوسی کی باتیں اچھی نہیں ہوتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ یقیناً آپ کی سنے گا بس شرط یہ ہے کہ آپ اس سے مایوس نہ ہوں۔ رات میں سوتے وقت ایک بادام ایک چھوہارہ خود بھی کھائیں اور میاں کو بھی کھلائیں ہر نماز کے بعد "یا خالق یا غنی" ایک تسبیح پڑھا کریں۔ اول آخر 7 مرتبہ درود شریف بھی پڑھیں۔ علاج درعقیم ارسال ہے۔ حسب توفیق صدقہ دیا کیجئے۔

☆نقش شب قدر☆

ماہ رمضان المبارک خیروبرکت اور انسانی ترقی اور درجات کے لئے مخصوص ہے۔ اس ماہ مبارک میں جس قدر عبادت الٰہی اور درود شریف کا معمول اختیار کیا جائے خیروبرکت، آخرت کی ترقی اور نجات کے لئے بہترین ہے۔ اس ماہ مبارک میں نماز تراویح تہجد کا خصوصی اہتمام کرنا چاہیے۔ اور زیادہ سے زیادہ درود شریف کا ورد کیا کریں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی رحمتیں اس مبارک ماہ میں بطور خاص عالم انسانیت کی جانب متوجہ ہوتی ہیں۔ ماہ رمضان المبارک میں جس قدر ذکر الٰہی کا بندوبست کیا جائے اتنا ہی بہتر ہوتا ہے۔ ذیل میں ہم ایک تجربہ شدہ عمل لکھتے ہیں۔ یہ عمل شب قدر کے نام سے مشہور و معروف ہے۔ گزشتہ سالوں میں جن بہن بھائیوں نے اس عمل کو پوری شرائط کے ساتھ عمل کیا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب پاک احمد مصطفےٰ ﷺ کے طفیل ان کی حاجات پوری کیں۔ میرا ایمان ہے کہ جب بھی اللہ تعالیٰ کا نام خلوص نیت سے لیا جائے گا۔ کاموں میں آسانی اور مشکلات سے نجات ہوگی۔ جو بہن بھائی جس مقصد کے لئے بھی کریں گے۔ آئندہ رمضان تک وہ مقصد ضرور پورا ہوگا۔ انشاء اللہ۔ یہ عمل رمضان المبارک کا چاند دیکھ کر شروع کریں۔ یہ عمل سورۃ القدر کا انتہائی جلیل القدر عمل ہے۔ جو کہ تیسویں پارے میں ہے۔

طریقہ: اول سب سے پہلے دو رکعت نماز حاجت ادا کیجئے، پہلی رکعت میں ۱۳ مرتبہ سورۃ القریش اور دوسری رکعت میں ۱۳ مرتبہ سورۃ نصر پڑھیں اور اپنے مقاصد کے لئے دعا کریں۔ (یہ نماز حاجت پہلے دن پڑھیں) اس کے بعد مغرب اور عشاء کے درمیان اس سورہ مبارک کو یعنی سورۃ القدر صحت قرات کے ساتھ 286 مرتبہ پڑھیں اور اول و آخر ۱۱ مرتبہ درود ابراہیمی کا ورد کریں۔ اور یہی عمل نماز فجر کے بعد کیجئے۔ 28 روز اس عمل کو بلاناغہ کیجئے۔ 29 ویں روز بعد نماز عصر زعفران اور عرق گلاب کو ملا کر سیاہی بنائیں اور اس سورۂ مبارکہ کو اعراب کی صحت کے ساتھ ایک سفید کاغذ پر لکھ کر محفوظ کر لیں۔ اور مغرب کے وظیفے کے بعد دم کر کے حفاظت سے رکھ لیں۔ اور اللہ تعالیٰ جل شانہ کے رحم و کرم کا نظارہ کیجئے۔ بعد عمل اس سورہ کو ہمیشہ ۱۱ مرتبہ اول و آخر ۱۱ مرتبہ درود شریف ابراہیمی کے ساتھ صدق میں رکھیں۔ انشاء اللہ جملہ مقاصد حل ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ایسی دست غیب کھلے گا کہ دنیا دیکھے گی۔ اس عمل میں یہ خیال رہے کہ کوئی ناغہ نہ ہو۔ جگہ تبدیل نہ ہو اور وقت وظیفہ خوشبو کا استعمال رہے۔ اس وظیفے کی اجازت عام ہے۔ یہ زندگی میں درپیش تمام مقاصد کے لئے پڑھا جا سکتا ہے۔ اگر آپ اپنی مصروفیات کے باعث اس عمل کو خود نہیں کر سکتے تو 992 روپے بذریعہ منی آرڈر ارسال کریں۔ نقش عید کے بعد کوئیر کے ذریعے ارسال کر دیا جائے گا۔

شازیہ خلیجی۔ رائے ونڈ

O محترم! آپ کی محفل گیارہویں شریف اور اجتماعی دعا میں حاضر ہوئے تھے۔ آپ کی پراثر دعا نے بے اختیار ہچکیاں بندھا دیں۔ مجھے یقین ہو گیا ہے کہ آپ کی دعا میں اثر ہے۔ میری لئے بھی یہی دعا کر دیجئے۔ کہ میری شادی کا مسئلہ حل ہو جائے۔ آپ سے مختصراً گفتگو میں میں والدہ صاحبہ نے یہی عرض کیا تھا مزید دعا کی درخواست ہے۔

☆ عزیز بیٹی! بندے کا فرض اولین اپنے مالک اپنے خالق سے دست طلب دراز کرنا ہے۔ اور اس یقین کے ساتھ کہ اس کا مالک اس سے غافل نہیں ہے۔ یقین ہی دعا کو پورا کرنے میں بڑا سبب ہے آپ "یا سلام یا لطیف" ہر نماز کے بعد 425 مرتبہ پڑھ کر دعا کیا کیجئے۔ اول آخر 9 مرتبہ درود شریف آپ کی فرمائش پر لوح زہرہ ارسال کی جا رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کا حامی و ناصر ہو۔

راحیلہ شریف۔ ملک دال

O محترم! بہت طویل عرصے سے بیمار ہوں۔ سر سے پاؤں تک بیماری کا انبار ہوں ایک بیمار جاتی ہے دوسری جگہ لینے کو تیار کھڑی ہوتی ہے بھوک نہیں لگتی ہے پیٹ خراب رہتا ہے ماہواری کی شکایت ہے بعض اوقات شدت سے آتی ہے اور بعض مرتبہ چار چار مہینے نہیں ہوتی ہے وزن بڑھ گیا ہے اختلاج قلب رہتا ہے آنکھوں کے آگے پتنگے سے اڑتے نظر آتے ہیں۔ جگنو سے جلتے ہیں کوئی روحانی علاج تجویز کیجئے۔ ڈاکٹری علاجوں سے تنگ آ چکی ہوں۔ اب تو جی چاہتا ہے خودکشی کر لوں۔

☆ عزیز بہن! اللہ تعالیٰ آپ کو صحت اور سلامتی سے نوازے آپ ملتانی مٹی کا اپنے پیٹ پر لیپ کیا کریں۔ اور ہلکی چادر اوڑھ کر دھوپ میں لیٹیں۔ جب لیپ سوکھ جائے تو نیم کے پتوں کے گرم پانی سے غسل کریں۔ روزانہ چار سو قدم صبح اور شام "یا مقیت" پڑھتے ہوئے چلیں۔ مقدار کا خیال رکھیں۔ اگر

مقدار کم یا زیادہ یا بھول جائیں تو دوبارہ کریں۔ لوح شفاء نقش زعفران ارسال کیے جا رہے ہیں۔ نماز کی پابندی کیجئے انشاء اللہ 120 روز میں آپ مکمل صحت یاب ہو جائیں گی۔

یاسمین تاج۔ حیدرآباد

O آپ کا کالم ہر ماہ انتہائی باقاعدگی سے پڑھتی ہوں۔ بے حد خوشی ہوتی ہے کہ آپ جیسے لوگ اس دنیا میں موجود ہیں جو ہم جیسے دکھی دلوں کا سہارا ہیں میری شادی کو سات سال ہو گئے ہیں لیکن ابھی تک میری ساس اور نند نے مجھے تسلیم نہیں کیا ہے کوئی نہ کوئی پریشانی شکایت ہمیشہ ان کو مجھ سے لازم رہتی ہے میری شوہر اکثر تو میری بات سمجھتے ہیں لیکن بعض اوقات برداشت سے باہر ہو جاتے ہیں تو پھر لڑنے جھگڑنے اور ہاتھ اٹھانے سے گریز نہیں کرتے ہیں۔ میں صرف یہ چاہتی ہوں کہ ہمارے گھر میں سکون ہو جائے اور میری ساس اور نند مجھے بھی پیار کریں اس سے زیادہ کی مجھے کوئی خواہش نہیں ہے۔

☆ عزیز بیٹی! اللہ تعالیٰ آپ پر اور آپ کے اہل خانہ پر فضل و کرم فرمائے۔ آمین۔ "یا کریم یا سلام یا عزیز یا جامع" بعد نماز عشاء 313 مرتبہ اول آخر 11 مرتبہ درود شریف پڑھ کر دعا کریں۔ لوح تسخیر خاص ارسال ہے۔

خواجہ محمد ارسلان۔ کراچی

O محترم! گزشتہ آٹھ سالوں سے شدید کاروباری مسائل میں گرفتار ہوں میرا ہول سیل میں ہر مل میڈیسن کا بزنس ہے لیکن جس قدر بھی محنت کروں کوئی نتیجہ نہیں آ رہا ہے یہاں ایک مشہور پروفیسر کو دکھایا تھا انہوں نے کہا کہ میرے کاروبار پر بندش کی گئی ہے اور یہ بندش سفلی علم سے ہوئی ہے برائے مہربانی میری راہ نمائی کیجئے اور اسم الٰہی اور دین اسلام کی روشنی میں حل تجویز کیجئے۔

☆ عزیزم! اللہ تعالیٰ آپ کو اور تمام افراد کو معاشی مسائل سے محفوظ اور مامون رکھے (آمین) آپ کے معاملات میں خصوصاً معاشی مسائل میں بندش اور نظر بد کا اثر موجود ہے ہر نماز کے بعد 13 مرتبہ سورۃ القریش پڑھا کریں بکثرت "یا فتاح" کا ورد کیا کریں۔ کاروباری بہتری اور ترقی کے لئے لوح مشتری ارسال کی جا رہی ہے۔ نماز کی پابندی فرمائیں۔

میمونہ صدیق۔ لاہور

خواب ☆ میں نے دیکھا کہ میں ایک عمارت میں ہوں جو کہ بہت بڑی ہے اور بہت ہی پرانی ہے بہت سے لوگ اسے دیکھنے آتے ہیں میں بھی اسے دیکھنے گئی ہوں کہ میں راستہ بھول جاتی ہوں۔ میں پھرتی رہتی ہوں عمارت میں لیکن مجھے راستہ نہیں ملتا اور میں پریشان ہو جاتی ہوں ایک جگہ بیٹھ کر رونا شروع کر دیتی ہوں کہ ایک لڑکا آتا ہے اس نے بادشاہوں کا سا لباس پہنا ہوا ہے اور اس کے بولنے کا انداز بھی ویسا ہی ہے۔ وہ مجھ سے پوچھتا ہے کہ آپ کو کیا ہوا آپ کیوں رو رہی ہیں میں اسے بتاتی ہوں کہ مجھے اپنے گھر جانا ہے مجھے راستہ نہیں مل رہا تو وہ مجھے کہتا ہے چلو میں تمہیں اس عمارت سے باہر نکالتا ہوں میرا ہاتھ پکڑو میں اس کا ہاتھ پکڑ لیتی ہوں تو وہ مجھے باہر لے آتا ہے میں حیران ہوتی ہوں کہ باہر کی دنیا ہی بدلی ہوئی ہے میں اس سے پوچھتی ہوں کہ تم مجھے کہاں لے آئے ہو وہ بتاتا ہے کہ اپنی دنیا میں۔ اس کے بعد میری آنکھ کھل گئی۔

تعبیر ☆ اپنی صحت کا خیال رکھیں۔ کسی بیماری کو معمولی نہ سمجھیں۔ حسب توفیق صدقہ خیرات دیا کریں۔ نماز کی پابندی فرمائیں۔ "یا سلام یا غفار" بکثرت پڑھا کریں۔

مہ جبین۔ لاہور

O میری خواہش ہے کہ میں اس قدر خوبصورت ہو جاؤں کہ لوگ مجھ کو حسن کی دیوی سمجھیں میں نے بے شمار عمل کیے لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا کیا کوئی ایسا عمل ہے کہ میں بے پناہ حسین ہو جاؤں۔

☆ بیٹی! زیادتی ہر شے کو بری ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو خوش شکل بنایا ہے اسی پر اکتفا کیجئے اللہ تعالیٰ صحت کے ساتھ ساتھ آپ کی

ماہنامہ "اسماء الحسنیٰ" کامیابی کا راستہ شائع ہو گیا ہے
اپنے قریبی بکسٹال سے طلب فرمائیں۔

ملاقات: روزانہ صبح 9 تا مغرب "جمعۃ المبارک تعطیل" (براہ راست جواب کیلئے جوابی لفافہ بھیجئے۔)
ایس۔ ایم۔ قادری B-359 فیصل ٹاؤن لاہور۔ فون نمبر: 042-5167842,5168036
ختم گیارہویں شریف اور اجتماعی دعا ہر انگریزی مہینے کی پہلی جمعرات کو بعد نماز عصر تا مغرب منعقد ہوتی ہے۔

سیرت بھی بہتر بنائے۔ خوش مزاجی اور تحمل دو ایسے وصف ہیں جو چہرے پر نور بن کر چمکتے ہیں۔ آپ ہر نماز کے بعد 133 مرتبہ "یا معصومؑ" پڑھ کر چہرے پر ہاتھ پھیر لیا کریں آپ کی خواہش پوری ہو جائیگی۔

آمنہ بشیر۔ کراچی

O محترم! ماہنامہ "اسماء الحسنٰی۔ کامیابی کا راستہ" جولائی کا شمارہ دیکھ کر دل خوش ہو گیا اتنی کم قیمت کلر فل میگزین کبھی نہیں دیکھا میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسماء الحسنٰی۔ کامیابی کا راستہ کو مزید ترقی و کامرانی عطا فرمائے۔ (آمین) اگلے شمارے کا شدت سے انتظار۔

☆ دعاؤں کا شکریہ۔ یہ سب اس ذات باری تعالیٰ کے بابرکت ناموں کی بدولت ممکن ہوا۔ اس شمارے پر بھی آپ کے تبصرے کا انتظار رہے گا۔

ضروری گزارش

☆☆ خط لکھتے وقت اپنا نام اور پتہ معہ شہر کے مکمل لکھئے۔ مختلف نام والے خطوط قابل جواب نہ ہوں گے۔ براہ راست جواب کے لئے پتا لکھا ہوا جوابی لفافہ ارسال کیجئے اور ف، ک، ٹائپ کے نام لکھنے سے گریز کیجئے۔ اگر آپ اپنا نام نہ شائع کروانا چاہیں تو فرضی نام لکھ کر واضح ہدایت کر دیجئے۔ فون پر مسئلہ ڈسکس نہیں کیا جاتا جوابی لفافے کے ہمراہ خط لکھ دیں۔

O آمنہ بشیر، صائمہ صادق، امین، سہیل، محمد اصغر۔ سہیل، عارف چوہدری۔ بلال محمود۔ متفرق شہر

☆ آپ سب نے ختم شریف میں قرآن حکیم، کلمہ شریف، سورۂ ملک، سورۂ یٰسین، آیت کریمہ کی جو پڑھائیاں ایصال ثواب کے لئے تحریر کئے تھے۔ وہ سب محفل ختم شریف میں حضور اکرم نور مجسم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، انبیاء علیہ السلام صحابۂ اجمعینؓ، سیدنا غوث الاعظمؒ جملہ مسلمین و مسلمات کیلئے ہدیہ کر دیئے گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہماری کاوشوں کو قبول و مقبول فرمائے۔ جو بہن بھائی ایصال ثواب حصول خیر و برکت کیلئے قرآن حکیم، مختلف سورتیں۔ کلمہ شریف، درود شریف شریف پڑھتے ہیں۔ اور چاہتے ہیں کہ ان کی طرف سے ہادی عالم کی بارگاہ میں، بزرگان دین کے لئے پڑھائیں کے ہدیئے بھیجنا چاہیں وہ بذریعہ خط، ٹیلی فون مطلع فرمایا کریں۔

☆☆☆

اس مرتبہ ختم گیارہویں شریف اور اجتماعی دعا انشاء اللہ 3 اگست کو ہوگی۔
تمام بہن اور بھائیوں اور مریدین سے شرکت کی استدعا ہے۔

شرفِ ستارگان کی الواح

اپنے نام اور ستارے کے مطابق لوح بنوا کر کامیاب زندگی بسر کریں۔

لوح شرفِ مریخ

دل کی گھبراہٹ، ڈپریشن، مردانہ امراض، خواتین کے امراض، خون کی کمی، آسیب سے نجات، افسران بالا کی توجہ اور رجوع خلق کے لئے تیار کی جاتی ہے۔

لوح شرفِ زہرہ

تسخیر خلق، پسند کی شادی، ڈاکٹر و حکیم، سیاستدان، عورتوں کے امراض، انیز ٹرڈ کیوریشن، مصوروں، خطاطوں اور ادیبوں کے لئے تیار کی جاتی ہے۔

لوح شرفِ عطارد

علمی ترقی، حافظے میں اضافہ، تعلیم میں کامیابی، یادداشت میں اضافہ، بچوں کا خواب میں ڈرنا، ٹرانسپورٹ تجارت اور کمیونیکیشن سے منسلک افراد کیلئے تیار کی جاتی ہے۔

لوح شرفِ قمر

پرانی جسمانی بیماریاں، نسوانی امراض، تسخیر، ترقی، زراعت اصباغیانی کے لئے مفید ہے۔ دماغی قوتوں میں اضافہ روحانی علوم میں کامیابی، تسخیر خلق کے لئے تیار کی جاتی ہے۔

لوح شرفِ شمس

ترقی، عروج، سحر، جادو سے حفاظت، روپے پیسے کی آمد، سماجی مرتبے میں اضافے کے لئے تیار کی جاتی ہے، جن کے ذائچے میں شمس کمزور ہے ان کیلئے مفید ہے۔

لوح شرفِ مشتری

مالی خوش بختی، حصول دولت، آمدنی کے مختلف ذرائع کو ترقی دینا، انعامی اسکیموں میں فائدہ، مستقبل کی بہتری، کیریئر اور ترقی کے استحکام کے لئے تیار کی جاتی ہے۔

لوح شرفِ زحل

کاموں میں رکاوٹ، جائیداد کے تنازعات، پرانے امراض، ضدی امراض، نحوست، جادو، آسیب سے نجات کیلئے تیار کی جاتی ہے۔

لوح شرفِ سبع ستارگان

ساتوں ستاروں کا یکجا نقش

خیر و برکت، مالی خوش بختی، تسخیر خلق، مرد اور عورتوں کے پرانے امراض، شادی میں تاخیر اور رکاوٹ، علمی ترقی، تعلیم میں کامیابی، گھریلو پریشانیاں، جادو آسیب سے نجات کے لئے تیار کی جاتی ہے۔

اپنی پسند کی لوح بنوانے کیلئے رابطہ کیجئے۔ B-359 فیصل ٹاؤن لاہور۔ پاکستان۔ فون نمبر: 5168036-5167842